بھارت میں جاسوسی کرنے والے
پاکستانی سرفروش کی سچی داستان

غازی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ابو شجاع ابو وقار

غازی

قسط نمبر 1

رائل نیپال ایئر لائنز کے جہاز نے کھٹمنڈو ایئر پورٹ پر ٹھیک چار بجے رن وے کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ میں کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس وقت میں حقیقتاً ڈرا ہوا تھا۔ خوف کی لہریں میرے جسم کے آر پار ہو رہی تھیں۔ میری نظریں ایئر پورٹ بلڈنگ کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک لگی ہوئی تھیں۔ ہر لمحے یہی خیال گزرتا کہ اب پولیس کی جیپ نمودار ہوگی۔ پائلٹ جہاز کو ٹیکسی وے پر ہی روک لے گا اور پولیس مجھے گرفتار کر کے لے جائے گی۔ اگرچہ ایسے مرحلے پہلے بھی کئی بار مجھ پر گزر چکے تھے۔ لیکن ساڑھے تین سال تک مسلسل زندگی اور موت کا کھیل کھیلنے کے بعد میں اب ذہنی طور پر ٹوٹ پھوٹ چکا تھا اور اب تو بات یہاں تک آن پہنچی تھی کہ ایک طرف آزادی، اپنا وطن، اپنا گھر اور گھر والے اور دوسری طرف تھرڈ ڈگری ٹارچر کے ساتھ اذیت ناک موت اور ان دونوں کے بیچ محض چند منٹوں کا فرق تھا۔ محض چند منٹوں کا۔ قسمت نے زندگی کی بازی کھیلتے ہوئے مجھے ہمیشہ تین اکے دیئے لیکن ہر بار تو تین اکے نہیں ملتے اب تو یہ آخری داؤ تھا۔ اگر بازی الٹی پڑ گئی تو...... خوف کی لہر نے مجھے ایک جھٹکا دیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سب کچھ اس قادر مطلق پر چھوڑ دیا جس کی طاقت اور قدرت کی کوئی حد نہیں۔ انسان اس کے سوا کر بھی کیا سکتا ہے۔ انسانی جدوجہد کی ایک حد ہوتی ہے اور اس کے بعد وہ رب ذوالجلال والاکرام کی رضا کا محتاج اور طلبگار ہوتا ہے۔ مجھ پر ایک غنودگی سی چھا گئی تھی۔ اچانک ایئر ہوسٹس کی مدھر آواز مجھے غنودگی سے باہر لے آئی۔ سیفٹی بیلٹس کھولنے کی اجازت مل گئی تھی۔ جہاز ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں کو نیچے چھوڑتا ہوا بلند ہو رہا تھا۔ ماؤنٹ ایورسٹ دائیں طرف صاف دکھائی دے رہی تھی۔ جہاز کے اکثر مسافر یہ چوٹی دیکھنے کیلئے جہاز کی اس جانب کی کھڑکیوں کی طرف آ چکے تھے لیکن میرا ذہن ماضی کی طرف جا رہا تھا۔ ساڑھے تین سال (یعنی 1158 دن) اور ان 1158 دنوں میں بیتے ہوئے ان گنت واقعات ایک تیز رفتار فلم کی طرح میرے ذہن کے پردے سے گزر گئے۔ جلد ہی پہاڑ ختم ہو گئے۔ ایئر ہوسٹس نے بتایا کہ اب ہم بنگلہ دیش پر سے گزر رہے ہیں اور دریائے کرنافلی کا ڈیلٹا ہمارے نیچے ہے۔ ڈیلٹا درجنوں پاٹوں میں تقسیم میلوں تک پھیلا ہوا تھا اور شام کے ڈھلتے ہوئے سورج کی ترچھی شعاؤں نے دریائے کرنافلی کی درجنوں شاخوں میں ایک آگ سی لگا رکھی تھی۔ شاید ایسے ہی کسی منظر کی وجہ سے شیخ مجیب الرحمان کو مشرقی پاکستان علیحدہ کر کے بنگلہ دیش بنانے کیلئے ہمار دیش، تمار دیش، سنار دیش کہنا پڑا۔ لیکن یہ تو محض عکس تھا فریب نظر تھا جسے سچ سمجھ کر دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کو دولخت کر دیا گیا۔ اس وقت بنگلہ دیش بنے کئی سال بیت چکے تھے۔ لیکن مشرقی پاکستان کے لئے لفظ بنگلہ دیش میرے دماغ میں کہیں فٹ نہیں ہوتا تھا اور آج بھی یہی حال ہے کہ چاہے کتنوں کو برا لگے میں اس خطہ زمین کو سابق مشرقی پاکستان ہی کہتا ہوں۔ جیسے دوری اور جدائی سے خون کے رشتے نہیں ٹوٹتے، ویسے ہی اس خطہ زمین کو سابق مشرقی پاکستان کہنے سے اپنائیت کا ایک ان دیکھا رشتہ محسوس ہوتا ہے اپنا تھا پھر سابق ہو گیا...... رشتہ قائم رہے تو سابق پھر اپنا ہو سکتا ہے...... انشا اللہ۔

بنکاک تک کا سفر چھ گھنٹے کا تھا۔ ذہن نے ماضی میں چھلانگ لگائی اور جہاں آن کے رکا، وہ 16 دسمبر 1971ء کا منحوس دن تھا۔

میں تربیلہ ڈیم بنانے والی کمپنی TJV (تربیلہ جوائنٹ وینچر) میں اسسٹنٹ پبلک ریلیشنز آفیسر تھا۔ معقول تنخواہ تھی، کمپنی نے بہت سی سہولتیں دے رکھی تھیں اور زندگی نہایت سکون سے گزر رہی تھی۔ بھارت سے ہماری جنگ جاری تھی، ذرائع ابلاغ کامیابی کے بڑے بڑے دعوے کر رہے تھے۔ کبھی چینی امداد اور کبھی چھٹے امریکی بحری بیڑے کی عنقریب آمد کے مژدے سنائے جا رہے تھے۔ UNO میں ہزاروں سال تک جنگ جاری رکھنے کے دعوے کئے جا رہے تھے۔ جنگ بند کرنے کیلئے پولینڈ کی قرارداد جسے عالمی طاقتوں کی حمایت حاصل تھی، ہمارے وفد کے سربراہ نے پھاڑ دی تھی۔ یہ محسوس کرایا جا رہا تھا کہ چند دنوں میں بھارت گھٹنے ٹیک دے گا اور جنگ بندی کے عوض مقبوضہ کشمیر طشتری میں رکھ کر ہمیں پیش کر دے گا۔ جنرل نیازی ان دنوں مشرقی کمان کے سربراہ تھے ان کے اس دعوے کی بڑی تشہیر کی گئی کہ بھارتی افواج کو واپس ان کی سرحدوں میں دھکیل دیا گیا ہے اور بھارتی ٹینک میری لاش پر ہی سے گزر کر ڈھاکہ میں داخل ہو سکتے ہیں۔ ان خوش کن دعوؤں سے بہلائے گئے دل پر بی بی سی کی یہ خبر بجلی بن کر گری کہ 16 دسمبر 1971ء کو پاکستانی افواج ہتھیار ڈالنے کا معاہدہ کر چکی ہیں اور جنرل نیازی نے اس رسم کی ادائیگی کے لئے اپنے پرانے ساتھی بھارتی جنرل اروڑہ کو دعوت دی ہے۔

یقین جانیے کہ پہلے تو اس خبر کو سچ ماننے پر دل ٹکا ہی نہیں کہ مسلمان ہندوؤں کے آگے ہتھیار ڈال دیں گے۔ محمد بن قاسم کا چند ہزار جوانوں کے ساتھ راجہ داہر کو شکست دینا، محمود غزنوی کے 17 حملے، جن میں سواروں کی تعداد کبھی بھی 10 ہزار سے زیادہ نہ تھی ہندوستان بھر کے راجاؤں کی لاکھوں کی افواج کو ہر بار شکست دینا اور سومنات تک جا پہنچنا اور بے شمار زر و جواہر کو ٹھکرا کر سومنات کے بت کو پاش پاش کر کے تاریخ میں خود کو بت فروش کے بجائے بت شکن کہلانا، ہندوؤں کی سب سے بہادر ذات راجپوتوں کی سب سے اعلیٰ نسل سورج بنسی کی جودھا بائی سے شہنشاہ اکبر کا شادی کرنا، جبکہ ہندوؤں کے دھرم کے مطابق ان پر مسلمان کا سایہ پڑنے سے بھی وہ ناپاک (بھرشٹ) ہو جاتے ہیں۔ احمد شاہ ابدالی کا راجہ جے چند کو 4 مرتبہ شکست دینا اور ہر بار اس سے اپنے پاؤں دھلوا کے اسے چھوڑ دینا۔ وہ قوم جو مدینہ کی گلیوں سے نکل کر ایک طرف افریقہ کو فتح کر کے یورپ میں اسپین اور البانیہ تک جا پہنچی اور دوسری طرف ایران، افغانستان، ہندوستان، مشرقی روس کی ریاستوں کو فتح کر کے ملائیشیا اور انڈونیشیا تک اپنی حکمرانی کے جھنڈے گاڑے، وہ قوم جس میں حضرت خالد بن ولید، طارق بن زیاد، موسیٰ بن نصیر، نورالدین زنگی، صلاح الدین ایوبی، محمد بن قاسم، محمود غزنوی اور ٹیپو سلطان جیسے دلیر جرنیل پیدا ہوئے جن کا نام سنتے ہی غیر مسلم حکمران خوف سے کانپنے لگ جاتے تھے اس قوم کی سب سے بڑی سلطنت میں مسلمان افواج کی سب سے بڑی تعداد اس قوم کے سامنے ہتھیار ڈالنے کو مجبور ہوئی جس پر ہزاروں سال تک مسلمانوں نے حکمرانی کی تھی۔ مسلمانوں کی تاریخ میں 1400 برس کی کامیابیوں کے تسلسل میں یکلخت یہ ناکامی اور اتنی بڑی ناکامی جس نے پاکستان کو دولخت کر دیا۔ یہ ناکامی بلا جواز نہ تھی اس کی وجہ ہمیشہ کی طرح غداروں کا کردار تھا۔

جعفر از بنگال، صادق از دکن

ننگ دیں، ننگ ملت، ننگ وطن

مسلمان کو جب کبھی ہزیمت کا سامنا ہوا اس کی وجہ محض اور محض غداروں کا کردار تھا اور 1971ء میں تو مشرقی پاکستان کے بھولے بھالے عوام کو غدار لیڈروں نے کچھ ایسا بہکا دیا تھا کہ وہ مغربی پاکستانیوں کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھنے لگے اور پھر سب کچھ لٹ جانے کے بعد جب انہیں ہوش آیا تو انہی غدار لیڈروں کا جو حشر کیا گیا، وہ سب جانتے ہیں۔

اصل موضوع سے میں کافی دور آ گیا ہوں لیکن اپنی داستان لکھنے کا میرا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اپنی نوجوان نسل کو بتاؤں کہ مذہب سے دوری ہمیں کہاں لے آئی ہے۔ ہم بھٹکتے ہوئے کہیں اتنی دور نہ نکل جائیں کہ واپسی ممکن نہ ہو، آپس میں دست و گریباں ہونے کے بجائے ہمیں ان طاغوتی طاقتوں کی گرفت سے نہ صرف نکلنا ہے بلکہ انہیں نیست و نابود بھی کرنا ہے اور اسی میں ہماری بقا ہے۔ غیر مسلم قوتیں اپنے ہر ہر حربے سے ہمیں اسلام سے دور لے جا رہی ہیں جس طرح اسپین جہاں مسلمانوں نے 8 سو برس حکمرانی کی وہاں آج ایک بھی اسپینی مسلمان نہیں ہے۔ اسی طرح غیر مسلم قوتیں چاہتی ہیں کہ دنیا بھر سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹ جائے یا پھر وہ صرف نام کے ہی مسلمان رہ جائیں۔ نام کے بھی کہاں وقار سے وکی، جمیل سے جمی اور عقیل سے اکی بن جائیں۔ صرف ایک واقعہ کی مختصر سی تشریح کے بعد اصل موضوع پر آ رہا ہوں۔ خانہ کعبہ میں بعثت رسول ﷺ کے وقت سینکڑوں بت رکھے ہوئے تھے جن میں دو بڑے بت لات اور منات تھے یہ دوسرے بتوں کے سردار سمجھے جاتے تھے۔

بت پرستی ہند سے نکل کر حجاز اور مکہ تک جا پہنچی تھی۔ سو کے عدد کو فارسی میں صد، عربی میں میت اور انگریزی میں ہنڈرڈ کہتے ہیں سو سنسکرت زبان کا لفظ ہے۔ ایک منات نامی بت خانہ کعبہ میں تھا، اس سے سو گنا طاقتور (ہندوؤں کے مطابق) سومنات تھا۔ سومنات کا بت مندر کے ایک خاص کمرے میں ہوا میں معلق تھا اور اس کمرے کا فرش، چھت اور دیواریں مقناطیسی لوہے کی بنی ہوئی تھیں اور سومنات کے بت کو اس طرح معلق کیا گیا تھا کہ چھت اور فرش کی مقناطیسی کشش سے وہ ہوا میں بغیر کسی سہارے کے نظر آئے۔ اسی وجہ سے اسے بتوں کا سردار کہا جاتا تھا۔ ہندومت جو طاقت کو اپنا دھرم سمجھتا ہے سومنات ان کا خدا تھا اور اس کا سواں حصہ خانہ کعبہ میں منات نام سے تھا۔ محمود غزنوی نے جو گناہ کئے تھے۔ سومنات کو توڑ کر اس نے ان گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ محمود غزنوی واپسی پر اپنے ہمراہ سومنات کا دروازہ لے گیا تھا جو کابل کے عجائب گھر میں 1948ء تک موجود تھا۔ بھارتی وزیر اعظم نہرو کی خواہش پر کابل کے اس وقت کے بادشاہ ظاہر شاہ نے وہ دروازہ بھارت کو واپس کر دیا اور اس دروازے کو لگا کر بھارت نے سومنات مندر کی تعمیر شروع کی جس کی بہت تشہیر کی گئی۔ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان شہید نے بھی ایک پریس کانفرنس میں پاکستانی قوم سے اپیل کی کہ جس تاریخ کو سومنات کی تعمیر نو شروع ہوئی، اس روز پیدا ہونے والے ہر بچے کا نام محمود رکھا جائے۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اب آتا ہوں اپنی داستان کی طرف۔ دنیا بھر میں صرف مسلمانوں کو مارشل ریس یعنی جنگجو قوم کہا جاتا ہے۔ اسی مارشل ریس کی سب سے بڑی سلطنت کے دولخت ہونے اور دنیا بھر میں مسلمان فوجیوں کی سب سے بڑی تعداد کے ہندوؤں کے آگے ہتھیار ڈالنے کا واقعہ کوئی معمولی صدمہ نہ تھا۔ اس صدمے کا اتنا اثر ہوا کہ میں حالت جنون میں انتہائی تیز رفتاری سے اپنی گاڑی میں بغیر کسی منزل کے (تربیلہ سے) نکل گیا۔ جب ذرا حواس سنبھلے تو میں جہلم سے بھی آگے آ چکا تھا۔ اس وقت میری ایک ہی خواہش تھی کہ میری گاڑی ٹکرا جائے اور میں مر جاؤں۔ حواس ذرا سنبھلے تو سوچا کہ مایوسی گناہ ہے۔ بجائے اس کے کہ میں اپنی جان بلا مقصد ضائع کروں کیوں نہ اسے ملک و ملت کے مفاد پر نچھاور کروں۔

کمپنی کا جنرل منیجر اور میں چونکہ ایک ہی دفتر میں بیٹھتے تھے اس لئے دن میں کئی بار اس سے ملنے کا موقع ملتا تھا۔ غالباً 20 یا 21 دسمبر کو وہ میرے کمرے میں آیا اور کہا کہ میں تمہیں لڑکے کے پیدا ہونے کی مبارک باد دوں یا پاکستان کے دولخت ہونے اور شکست کھانے کا افسوس کروں۔ میں نے اسے جواب دیا کہ قوموں کی تاریخ میں اتار چڑھاؤ میں 34 برس کا عرصہ کوئی حقیقت یا فیصلہ کن اثر نہیں رکھتا۔ 6 برس قبل اسی بھارت کو ہم نے ایسی شکست دی کہ دوران جنگ اس کے نمائندے نے اقوام متحدہ میں کہا تھا کہ ہم ابھی اور اسی وقت جنگ بندی کے لئے تیار ہیں۔ جنگ بندی کے فوراً بعد معاہدہ تاشقند پر دستخط ہونے کے بعد بھارتی وزیر اعظم اپنی مکمل شکست سے بچنے کی خوشی برداشت نہ کرتے ہوئے وہیں مر گیا۔ 65ء کی جنگ میں پاکستانی سرحد سے 240 میل دور بھارتی حکومت نے اپنا دارالحکومت دہلی سے الہ آباد منتقل کر دیا۔ بغیر اعلان جنگ کے حملہ کرنے والے بھارتی بارڈر سے صرف 14 میل کے فاصلے پر لاہور اور 8 میل کے فاصلے پر سیالکوٹ جیسے اہم شہروں تک بھی نہ پہنچ سکے جبکہ اس وقت ان کے کمانڈر انچیف نے اعلان کیا تھا کہ 6 ستمبر 65ء (جس کی صبح 4 بجے بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تھا) کی سہ پہر کو لاہور جیم خانہ میں چھوٹا پیگ پیوں گا۔ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں چھمب جوڑیاں کی چھاؤنی پر ہمارا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ قصور سیکٹر میں بھارتی سرحد میں 11 میل اندر ہم نے ان کے خاصے بڑے شہر کھیم کرن (اس شہر میں 4 سنیما تھے) پر قبضہ کر لیا تھا۔ ہم نے بھارتی ایئر فورس کے 300 سے زیادہ جہازوں کو ہوائی جنگ میں یا ہوائی اڈوں پر کھڑے کھڑے ہی تباہ کر دیا تھا۔ ہمارے ایک اکیلے ہوا باز محمود عالم نے سرگودھا کے ہوائی اڈے پر حملہ کرنے والے چھ گ 19 جہازوں کو 45 سیکنڈ میں نگ 19 سے کمتر جہاز F-86 سے تباہ کر دیا تھا۔ اس وقت ہماری ساری قوم ایک تھی۔ جیسے ہاتھ کی چار انگلیاں اور انگوٹھا مل کر گھونسہ بن جاتا ہے۔ ہم اس وقت الگ الگ نہیں تھے بلکہ پوری قوم ایک گھونسہ بن چکی تھی۔ بھارتی تو پاکستانی گھونسے سے ایسا ڈرتا ہے کہ شہید ملت لیاقت علی خان نے بھارت کو صرف گھونسہ دکھایا ہی تھا کہ بھارت ڈر کر اپنی فوجوں کو بارڈر سے بہت پیچھے ہٹا کر لے گیا لیکن افسوس اب ہماری قوم سیاسی لیڈروں کے بہکاوے میں آ کر تقسیم ہو گئی تھی جس کا نتیجہ ہمیں اس شکست کی صورت میں ملا۔ میں نے جنرل منیجر کو کہا کہ تم مجھے بچے کی پیدائش کی مبارک دو کیونکہ یہ بچہ ایک نئی سحر کی نوید لے کر آیا ہے۔

کہنے کو تو میں دل کو بہت ڈھارس دیتا تھا لیکن قابو میں آ ہی نہیں رہا تھا۔ بالآخر جنوری 72ء کے دوسرے عشرے میں، میں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ ایک ماہ کا نوٹس پیریڈ پورا کر کے میں اپنی فیملی کو اپنے آبائی گاؤں میں چھوڑ کر راولپنڈی اور افواج پاکستان کے ایک انتہائی حساس ادارے میں جا کر خود کو کسی بھی قسم کے خطرناک کام کو کرنے کے لئے رضاکارانہ طور پر پیش کر دیا۔

ادارے کے حکام پہلے تو حیران ہوئے کہ اس مایوسی کے دور میں ایک سویلین اس طرح خود کو بطور رضاکار پیش کر رہا ہے۔ قریب 20 روز میرے مختلف اقسام کے انٹرویو ہوتے رہے۔ اس دوران انہوں نے اپنے ذرائع سے میرے پورے ماضی کو کھنگال ڈالا۔ جب وہ پورے طور پر مطمئن ہو گئے۔ تو انہوں نے مجھے درپیش آنے والی مشکلات، زندگی کے خطرے اور پکڑے جانے کی صورت میں انتہائی تشدد سے ڈرانا چاہا، کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ اس ادارے کے لئے کام کرنے کا میرا ارادہ اگر محض ایک وقتی جنون ہے تو میں واپس لوٹ جاؤں۔ لیکن میری ثابت قدمی سے جب انہوں نے دیکھا کہ میں وقتی جنون کا شکار نہیں بلکہ اپنے وطن کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو دل کی گہرائیوں سے تیار ہوں تو پہلی ملاقات سے ایک ماہ کے اندر مجھے باقاعدہ طور پر ادارے میں شامل کر لیا گیا اور ایک ہفتے کے اندر میری تربیت شروع کر دی گئی۔

میری تربیت کیلئے چھ ماہ کی مدت مقرر کی گئی تھی جو میں نے چار ماہ اور چند روز میں مکمل کی۔ ملکی سلامتی کے پیش نظر تربیت کی تفصیلات میں نہ جا سکوں گا۔ مختصراً صرف یہ عرض کر سکتا ہوں کہ بے پناہ جسمانی مشقت، جوڈو اور Static and Mo bile Survilance کے طریقے سکھائے گئے۔ اور اگر خود پھنس جاؤں تو ان سے بچنے کے طریقے بھی۔ اور سب سے اہم کہ اس دوران مجھے مکمل طور پر ایک بھارتی شہری بنا دیا گیا۔ ان کے طور طریقے، رسم و رواج، زبان اور سیاسی اور معاشرتی زندگی کے علاوہ بھارتی افواج کے متعلق تمام معلومات بھی ازبر کرا دی گئیں۔ ان کی ٹرینوں، بسوں کے اڈوں، شہروں، صوبوں غرض کہ ہر وہ بات جس کی ایک پڑھے لکھے بھارتی سے توقع کی جا سکتی ہے وہ اس طرح میرے دماغ میں بٹھا دی گئی کہ میں ایک مکمل بھارتی شہری کا روپ دھار گیا۔ اس کے بعد تشدد برداشت کرنے کی تربیت اور جسمانی اور ذہنی اذیت پوری کی گئی یہ دیکھنے کے لئے کہ میں کس حد تک تشدد برداشت کر سکتا ہوں۔ پھر وائرلیس Operate کرنا، چھاؤنیوں اور فوجی پڑاؤ پر حملے، معلومات کے حصول کے طریقے، غرض کہ ہر پہلو سے مجھے اپنے فرائض کی انجام دہی کے لئے تیار کر دیا گیا۔

میری زندگی کی سب سے پہلی ملازمت سابق مشرقی پاکستان چٹاگانگ میں ایک معروف چائے کی کمپنی میں چائے کی بلینڈنگ کی تھی۔ مجھے بھارت میں پوشیدگی فراہم کرنے کے لئے وہ بہت کام آئی۔ میں کھلی چائے کے ایک تاجر کے طور پر ہر چھاؤنی میں جا سکتا تھا۔ میں بمبئی میں بیوٹا گ یا ڈر کا رہائشی تھا۔ یہاں تک مکمل انتظام تھا کہ اگر کوئی میرے دیئے ہوئے ایڈریس سے میرا پوچھے تو اسے پتہ چلتا کہ ونود چوپڑا (میرا کور کے دوران نام) یہاں رہتا ہے اور چائے کا کاروبار کرتا ہے۔

تربیت کا آخری حصہ پاکستانی چھاؤنی سے مطلوبہ معلومات حاصل کرنا تھیں اور یہی میرا امتحان تھا۔ جس میں، میں نے نہ صرف مطلوبہ معلومات ہی حاصل کیں بلکہ اس کیلئے بعض حساس خفیہ راز بھی معلوم کر کے اپنے اساتذہ کو دیئے۔ چنانچہ مجھے گروپ لیڈر کے طور پر سلیکٹ کر لیا گیا۔ میرے گروپ میں 4 ساتھی تھے جو افواج پاکستان میں مختلف کاموں کے ماہر تھے۔ یہ وائرلیس ٹیکنیشن، بلاسٹنگ کے ماہر، دوران مشن خطرے کو بھانپنے والے یعنی ہماری نگرانی کرنے اور کہیں پھنس جائیں تو دشمن کو زیر کرنے یا ہلاک کرنے والے تھے۔ غرض کہ یہ ایک مکمل گروپ تھا۔ بحیثیت گروپ لیڈر کے وہ میرا ہر حکم ماننے کے پابند تھے اور خود اپنے فیصلے سے کوئی کام سرانجام دینے کی انہیں اجازت نہ تھی۔ ہم سب نے الگ الگ رہنا تھا اور وہ میرے بغیر آپس میں رابطہ نہ کر سکتے تھے۔ مجھے ان سب کی رہائش کا علم رکھنا تھا لیکن انہیں میری رہائش کا علم نہیں ہونا چاہیے تھا، بھارت میں اپنے ہمدردوں سے رابطہ کرنے کی صرف مجھے اجازت تھی۔ غرض کہ ہم پانچ افراد کی یہ چھوٹی سے فوج اپنے مشن کے لئے بالکل تیار تھی اور ہمیں 24 گھنٹے کے نوٹس پر اپنے مشن پر روانہ ہونا تھا۔ ایک بات مزید کہ ہم پانچوں کو پہلی بار تربیت مکمل ہونے کے بعد ہی چند لمحوں کیلئے ملایا گیا۔ ایک دوسرے کے متعلق تفصیلی معلومات کسی کو نہ تھیں۔ یہ ایسی مہم کیلئے انتہائی اہم ہوتا ہے تاکہ اگر کوئی دشمن کی گرفت میں آ جائے تو تشدد برداشت نہ کرنے کی صورت میں بھی باقی ساتھیوں کے متعلق نہ بتا سکے۔

قسط نمبر 2

غازی

آخری کام جو اپنے رازوں اور ساتھیوں کی حفاظت کیلئے کیا گیا تھا وہ ہماری ایک ایک داڑھ نکال کر اس کی جگہ سخت پلاسٹک کی داڑھ لگا دی گئی تھی کہ جب تشدد برداشت کرنے کی سکت نہ رہ جائے تو داڑھ کو نکال کر چبا جاؤ، داڑھ میں سائنائڈ بھرا ہوا تھا۔ دشمن کو راز بتا کے غدار کہلانے سے بدرجہا بہتر ہے کہ موت کو گلے لگا کے شہید ہو جاؤ تا کہ آئندہ نسلیں تم پر فخر کر سکیں۔ یہ تھی ہماری تربیت اور جذبہ جس کے تحت ہمیں اپنے مشن کی تکمیل کیلئے تیار کیا گیا تھا۔

ہم جسمانی اور ذہنی طور پر اپنے مشن پر جانے کیلئے بالکل تیار تھے۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد بھارت اپنی 80 فیصد سے زیادہ فوج مغربی پاکستان کے بارڈر پر لے آیا تھا۔ انٹیلی جنس رپورٹس سے معلوم ہوا تھا کہ سابقہ مشرقی پاکستان کے بعد بھارت پاکستان کے اس مشکل دور سے فائدہ اٹھا کر مغربی پاکستان کو بھی نگل جانا چاہتا ہے۔ بھارت کو اپنی افواج سے زیادہ اس وقت کے روس سے کئے گئے دفاعی معاہدے پر بہت غرور اور بھروسہ تھا جس کے تحت بھارت پر حملہ روس پر حملہ سمجھا جانا تھا۔ پاکستانی افواج نے دوران جنگ اسی بھارت اور روس کے مابین اسی معاہدے کی وجہ سے محض دفاعی جنگ لڑی اور بھارت کو اسی وجہ سے بھرپور موقع مل گیا کہ وہ مغربی پاکستان کے دفاعی لحاظ سے کمزور مقامات پر بھرپور حملہ کر کے پاکستانی حدود میں داخل ہو جائے۔ چنانچہ جنگ بندی کے وقت مغربی پاکستان کا پانچ ہزار مربع میل علاقہ بھارت کے قبضے میں جا چکا تھا۔ افواج پاکستان ہی نہیں بلکہ پوری پاکستانی قوم مایوسی کا شکار تھی۔

ہمارا گروپ اسٹینڈ بائی پوزیشن میں تھا کہ ہمیں تین دن کی رخصت دی گئی اور ہدایت کی گئی کہ اپنا سب سامان گھر چھوڑ کر آئیں۔ صرف جوتوں کا ایک جوڑا جو پہنا ہوا اور دو جوڑے پینٹ قمیص لائیں جن پر کوئی بھی ایسا نشان نہ ہو کہ وہ پاکستان کے بنے ہوئے ہیں۔ یہ چھٹی ہمارے لئے روانگی کا گرین سگنل تھی۔ مجھ سے کاغذات پر اپنے ورثا کے نام لکھوائے گئے۔ جن کی ایک کاپی مجھے اپنے ورثا کو دینے کیلئے دے دی گئی۔ میرے باقی چاروں ساتھی تو باقاعدہ فوجی تھے اور پہلے سے ہی یہ کاغذات مکمل کر چکے تھے۔ کاغذات میں دوران مشن مرنے کی صورت میں ورثا کیلئے معقول رقم اور مزید سہولتیں دینے کا وعدہ تھا۔

اس وقت میری والدہ بقید حیات تھیں۔ بیوی اور چند ماہ کا لڑکا تھا۔ میں نے ورثا میں پہلے والدہ کا نام لکھا اور بعد میں بیوی اور بچے کا اور تین روزہ چھٹی پر روانہ ہو گیا۔ گھر پہنچ کر میں نے خود کو نارمل رکھنے کی پوری کوشش کی۔ میری بیوی تو کچھ نہ سمجھ سکی لیکن والدہ نے میری اندرونی کیفیت کو کچھ کچھ بھانپ لیا۔ میں نے اپنے گھر والوں کو بھی یہ نہ بتایا تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں اور کہاں جا رہا ہوں۔ انہیں تو صرف یہ علم تھا کہ میں لاہور میں ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازم ہوں۔

روانگی سے چند لمحے قبل میں نے والدہ کو بند لفافے میں کاغذات دیئے اور کہا کہ انہیں سنبھال کر رکھیں۔ والد مرحوم کی قبر پر حاضری دی اور گھنٹوں بیٹھا رہا۔ روانگی کے وقت والدہ، بیوی اور بچے سے اس طرح ملا جیسے شاید آئندہ ملاقات نصیب نہ ہو۔ میری جو اندرونی کیفیت تھی اس کا آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں لیکن میں نے حتی الامکان یہ کوشش کی کہ چہرے پر کوئی تاثر ظاہر نہ ہونے پائے۔ والدہ اور بیوی کو میں نے یہ بتایا تھا کہ کمپنی کی طرف سے مجھے شاید چند ماہ کے لئے سری لنکا جانا پڑے۔ اس لئے میری طرف سے خطوط آنے میں دیر ہو سکتی ہے۔ میں فون پر دفتر والوں سے آپ کی خیریت معلوم کر لیا کروں گا اور میرے دفتر کے آدمی میری تنخواہ پہنچا کریں گے اور میری خیریت سے آپ کو آگاہ کر دیا کریں گے۔

یہ سب باتیں میں نے اپنے سینئرز کی ہدایت کے عین مطابق کی تھیں۔ گھر والوں کو یہ انتظام عجیب سا لگ رہا تھا، لیکن میں نے انہیں سوال کرنے کا موقع نہ دیا اور شام کو سات بجے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا کیونکہ اگلی صبح 8 بجے ہمیں رپورٹ کرنی تھی۔

لاہور میں ہمیں ایک بند جیپ میں آنکھوں پر پٹی باندھ کے لے جایا گیا اور جب پٹی کھلی تو ہم ایک ہال میں موجود تھے جہاں بہت سی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہاں ہمارے سینئرز بھی تھے۔ چند ہی لمحوں بعد سویلین ڈریس میں ایک صاحب داخل ہوئے جنہیں ہمارے سینئرز نے ایڑیاں بجا کر سلیوٹ کیا۔ ان صاحب نے فرداً فرداً ہم سب سے مصافحہ کیا۔ ٹریننگ کی کامیاب تکمیل پر مبارکباد دی اور کہا کہ آپ 5 افراد جس مشن پر جا رہے ہیں اس کی کامیاب تکمیل سے پاکستان کو بہت مدد ملے گی۔ اس لئے روح کی گہرائیوں سے اپنے مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچانا اور اس دوران اگر غداری کی زندگی اور شہادت میں سے کسی کو چننا پڑے تو شہادت کو قبول کرنا کیونکہ موت تو یقیناً ایک روز آنی ہے۔ ہمارا دشمن اتنا مکار ہے کہ زندہ رکھنے اور عیش و عشرت کے جھوٹے وعدے کر کے راز اگلوا لینا اس کا مذہب ہے اور سب راز جاننے کے بعد وہ تمہیں چھوڑے گا نہیں بلکہ اذیت ناک موت سے ہمکنار کرے گا۔ ایک واقعہ جو انہوں نے بیان کیا میں انتہائی مختصر الفاظ میں بیان کروں گا۔

سلطان ٹیپو شہید کے ساتھ غداری کرنے والے میر صادق کو انگریزوں نے جاگیر اور ساتویں پشت تک وظیفے سے نوازا تھا۔ وظیفے کی ادائیگی سرنگا پٹم کے خزانے سے ہوتی تھی۔ انگریز تو صرف حکومت میں اعلیٰ افسر ہوتے تھے۔ دیگر امور حکومت کیلئے ہندوستانی ملازم ہی ہوتے تھے۔ برسبیل تذکرہ یہ حقیقت کتنی عجیب اور افسوسناک ہے کہ 1857ء میں جنگ آزادی سے لے کر 1947ء میں آزادی ملنے تک پورے برصغیر میں انگریز سول ملازمین کی تعداد کبھی بھی 2500 سے زیادہ نہ رہی اور یہ 2500 انگریز اپنے ہندوستانی ملازموں کے بل بوتے پر (جن میں 80 فیصد ہندو ہوتے تھے) پورے برصغیر پر دھڑلے سے حکومت کرتے رہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ میر صادق کے ورثا کو وظیفے کی ادائیگی کے لئے جب پکار پڑتی تھی تو چپراسی (بالکل آج کل کی عدالتوں میں رائج طریقے کے مطابق) اونچی آواز میں پکارتا تھا کہ میر صادق غدار کے ورثا حاضر ہوں، جیسے شہید ہمیشہ زندہ رہتا ہے ویسے ہی غدار کی غداری اس کے مرنے سے ختم نہیں ہو جاتی بلکہ یہ پشت در پشت اس کی اولاد کو یاد کراتی رہتی ہے کہ تمہارے اجداد میں ایک غدار تھا۔ انہوں نے ایک مثال دی کہ بہادر شاہ ظفر کا سسر حکیم احسن جس نے بہادر شاہ کو گرفتار کروایا تھا اس کی اولاد تقسیم ہند کے بعد نقل مکانی کر کے کراچی آ گئی ہے اور سرکاری ملازمت اور تجارت میں مصروف ہے لیکن وہ لوگ اپنے جد امجد حکیم احسن کا نام نہیں لیتے اور اگر کسی کو اس کا علم ہو تو اسے نہایت عاجزی سے کہتے ہیں کہ اس بات کی تشہیر نہ کریں۔

اس مختصر سی تقریر یا نصیحت کے بعد وہ ہم پانچوں سے بغل گیر ہوئے اور کمرے سے باہر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ہم سب کی جسمانی اور ساتھ لائے ہوئے ایک ایک جوڑے کی بھرپور تلاشی لی گئی۔ سگریٹ، ماچس، بٹوے سب لے لئے گئے اور بھارتی سگریٹ، ماچس اور بٹوے دیئے گئے۔ ہمارے ایئر بیگ لے کر ایسے ایئر بیگ دیئے گئے جن پر میڈ ان انڈیا لکھا ہوا تھا۔ ہماری نقلی داڑھیں دو ڈاکٹروں نے پنوں کے ساتھ لگائیں۔ ان کے ساتھ کچھ ایسا کیمیکل بھی لگا ہوا تھا جس سے وہ نہایت مضبوطی سے چپک گئیں۔ ہم سب کو پانچ پانچ ہزار کی بھارتی کرنسی دی گئی اور مجھے ایک کاغذ دیا گیا۔ جس پر دلی، آگرہ اور بمبئی کے کچھ پتے درج تھے۔ کوڈ ورڈ بھی لکھا ہوا تھا۔ یہ ان بھارتی ہمدردوں کے پتے تھے جن سے رابطہ کرنے پر مجھے روپے اور دیگر مطلوبہ اشیا مل سکتی تھیں۔ مجھے یہ ایڈریس اور نام یاد کرنے تھے۔ جس مشن پر ہم جا رہے تھے اس میں ایک نہیں بلکہ درجنوں کام تھے۔ اس کے علاوہ کوئی بھی اہم نوعیت کی معلومات اور وہاں کے حالات کو دیکھتے ہوئے جو کام بھی ملکی بھلائی کے لئے مناسب نظر آئے وہ کرنے کی اجازت دی گئی تھی یعنی ہمارا کوئی ایک مخصوص مشن نہ تھا بلکہ ہمیں دشمن کے متعلق ہر قسم کی معلومات حاصل کرنی تھیں اور موقع ملنے پر اسے زچ کرنا تھا۔

مزید برآں مجھے ایک خصوصی مشن دیا گیا تھا اور وہ تھا انڈین آرمی ہیڈ کوارٹر دہلی میں چیف آف انڈین آرمی کے دفتر کے کسی ملازم کو پلانٹ کرنا۔ ان دنوں فوٹو کاپی مشینیں نہیں تھیں اس لئے جو کچھ بھی ٹائپ کیا جاتا تھا کاربن پیپر سے اس کی کاپیاں بنائی جاتی تھیں۔ کاربن کو اگر ایک یا دو بار استعمال کیا جائے تو اس پر ٹائپ کی گئی عبارت بخوبی پڑھی جا سکتی ہے۔ اگر اس طرح استعمال شدہ کاربن ردی کی ٹوکری میں پھینک دیئے جائیں اور صفائی کرنے والا دفتر کے اوقات کے بعد دوران صفائی وہ کاربن نکال کر ہمیں دے دے تو بہت ہی اہم معلومات ہمیں مل سکتی تھیں۔ علاوہ ازیں بریگیڈیئر اور اس سے اوپر کے عہدے دار تحفظ کے لئے رف پیڈ پر جو کچھ بھی لکھتے تھے اس سے اگلا خالی صفحہ ضائع کر دیتے تھے تا کہ قلم کے زور سے تحریر کے نقوش جو خالی صفحے پر آ جاتے ہیں وہ کسی کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ یہ بڑے رینک کے افسران خالی صفحے دو یا تین ٹکڑے کر کے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتے تھے اور وہ ردی کی ٹوکریاں ہمارے لئے خزانے سے کم نہ تھیں۔ میرے خصوصی مشن میں چیف آف آرمی اسٹاف کے ٹائپسٹ اور دفتر کے دوسرے ٹائپسٹ کلرکوں اور صفائی کرنے والوں کو دامے درمے یا کسی بھی جائز یا ناجائز طریقے سے پلانٹ کرنا اور مطلوبہ کاربن، پھٹے ہوئے سادہ کاغذ حاصل کرنا شامل تھا۔ ایک بار جب کوئی یہ کام کر لے تو پھر آئندہ اس سے مکمل معلومات حاصل کرنا مشکل نہ تھا۔

بھارت اور پاکستان میں اس وقت حساس محکموں میں یہ طریقہ رائج تھا کہ جاسوس کو شکل اور جسمانی لحاظ سے ایسا ہونا چاہئے کہ ضرورت پڑنے پر 100 افراد میں بھی گم ہو سکے۔ اس دور میں دونوں ممالک کے جاسوس فقیر، مجذوب، ملنگ یا بالکل نچلے درجے کا کام کرنے والوں کا روپ دھار کر دشمن ملک میں کام کرتے تھے۔

پاکستان اور بھارت کے حساس محکموں کے افسران کی تربیت اسکاٹ لینڈ یارڈ میں اور اکثر ایک ہی وقت میں ہوتی تھی۔ نتیجتاً دونوں ممالک کے افسران ایک ہی طرز کی تربیت دیتے تھے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے آج کل امریکہ پاکستان اور بھارت دونوں کی افواج کے ساتھ جنگی مشقیں کرتا ہے اور اس کا اندرونی مقصد ہماری افواج کی صلاحیت جاننا ہوتا ہے۔ پاکستانی افواج کے متعلق اہم معلومات اسرائیل کو دی جاتی تھیں جو بالواسطہ بھارت کو پہنچ جاتی ہیں۔ تین دہائی پہلے تک یہ انتہائی حساس فریضہ پاکستانی سول افسر انجام دیتے تھے۔ بعد میں یہ کام پاکستانی سیاست دانوں نے سنبھال لیا یعنی دشمن کو اپنی خفیہ معلومات مہیا کرنا، ورنہ کسی فوجی نے سکھ قوم پرستوں کی فہرست بھارت کو نہیں دی اور نہ ہی کسی فوجی نے بھارتی ٹینکوں پر بیٹھ کر پاکستان میں داخل ہونے کی بات کی۔ کسی فوجی نے یہ اعلان نہیں کیا کہ پاکستان کے پاس ایٹم بم موجود ہے اور نہ ہی کسی فوجی نے بھارت انتہائی پسندیدہ قوم کا درجہ دیا۔ یہ ''نیک کام'' صرف سیاستدان ہی کر رہے ہیں۔

میں اپنے قد کاٹھ اور شکل و صورت سے کسی پہلو سے بھی بھارتی نہیں لگتا تھا اور سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں میں مجھے ڈھونڈ لینا بہت آسان تھا۔ مجھے بھارت کی اونچی سوسائٹی میں گھل مل جانا اور نیچے درجے کے ہوٹل میں قیام کرنا تھا۔ غالباً میں پہلا شخص تھا جسے یہ مشن سونپا گیا کیونکہ اپنے غیر معمولی قد کاٹھ اور شکل و شباہت کی وجہ سے مجھے پاکستانی جاسوس سمجھے جانے کا کم سے کم امکان تھا۔ پاکستان کی طرح بھارتی پولیس اور سی بی آئی والے بھی صرف نچلے درجے کے ہوٹلوں پر ہی ریڈ کرتے ہیں۔ فور یا فائیو اسٹار ہوٹلوں میں داخل ہونے کی ان میں بھی جرأت نہیں ہوتی۔ تربیلا میں ملازمت کے دوران وہاں غیر ملکی افسران اور ان کی فیملیوں کے لئے بنے کلبوں میں میری رسائی تھی۔ میں اس دور کے مقبول ترین بال روم ڈانس جیسے اسکوائر، والز اور راک اینڈ رول میں مہارت حاصل کر چکا تھا۔ بھارت میں قیام کے دوران ان خرافات سے مجھے بڑی مدد ملی۔

بھارت میں چوپڑا فیملی بڑی مشہور ہے۔ یہ پنجابی، بڑے قد کاٹھ والے اور نسبتاً سفید رنگ کے ہیں اس لئے مجھے ونود چوپڑا کا نام دیا گیا۔ اس فیملی نے کاروبار، صنعت اور فلم انڈسٹری میں خاصا نام کمایا ہے اور یہ سارے بھارت میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اسی طرح میرے دیگر ساتھیوں کو بھی مختلف ہندو نام الاٹ کئے گئے۔

آئندہ سطور میں مشن کے واقعات ایک تسلسل کے ساتھ آ رہے ہیں۔ اس سے پہلے چند سطور میں ایک وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ایک جاسوس کے لئے اپنی زندگی سے زیادہ اہم اپنے مشن کی تکمیل ہے۔ بھارت میں ہندو نام کے ساتھ داخل ہو کر مجھے خالصتاً ایک ہندو کے روپ میں اپنا کام کرنا تھا اور اس کے لئے مجھے وہ بھی کرنا پڑا جس کی اسلام میں ممانعت ہے۔ مجھے وطن عزیز کی سلامتی کے لئے جو مشن سونپے گئے تھے، انہیں ہر قیمت پر مکمل کرنا تھا۔ اس دوران مجھ سے جو غیر شرعی اور غیر اسلامی حرکات ہوئیں ان کے لئے میں صرف اس ذات کے سامنے جوابدہ ہوں جو رحمٰن اور رحیم ہے۔

ہمیں دوران تربیت والی رہائش گاہ پر لایا گیا۔ وہاں ایک بار پھر مشن کی بریفنگ اور احتیاطی تدابیر دہرائی گئیں۔ سہ پہر 3 بجے ہمیں دو پرائیویٹ کاروں میں لاہور اسٹیشن لایا گیا۔ بصیر پور براہ قصور ٹکٹ پہلے ہی خرید لئے گئے تھے۔ ہم سب سیکنڈ کلاس کے ایک ڈبے میں بالکل اجنبی بن کر داخل ہوئے۔ ہمارے دو سینئرز بھی ہمارے ہمراہ تھے۔ ایک دوسرے سے بات چیت کی قطعاً ممانعت تھی۔ رات تقریباً ساڑھے گیارہ بجے ہم بصیر پور پہنچے، وہاں ایک سیف ہاؤس میں ہمارے کھانے اور سونے کا انتظام تھا۔ اس سیف ہاؤس کے ایک حصے میں چیخ و پکار کی آوازیں آتی تھیں۔ سینئرز نے ہمیں بتایا کہ کچھ بھارتی ہیں جو بارڈر کراس کرتے ہوئے پکڑے گئے ہیں۔ ان کی تفتیش کی جا رہی ہے۔

سیف ہاؤس کے مستقل رہائشی بالکل خاموشی سے ہماری مطلوبہ اشیا ہمیں پہنچا رہے تھے اور اگر ہم کوئی سوال کرتے تو محض مسکرا کر خاموش ہو جاتے تھے۔ دوسری صبح نو بجے ہم نے بصیر پور سے کوچ کیا اور تین جیپوں میں ہمارا قافلہ روانہ ہوا۔ ہمیں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ ہمیں کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ سفر مسلسل جاری رہا۔ یہ کبھی نہر کی پگڈنڈی پر اور کبھی کچی اور ٹوٹی پھوٹی سڑکوں پر جاری رہا۔ غروب آفتاب کے قریب ہم خیموں کے ایک پڑاؤ میں پہنچے جہاں پاکستانی بارڈر فورس کے جوانوں نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ وہاں ہمیں ہمارے سینئرز نے بتایا کہ ہم بہاولنگر میں منڈی صادق گنج کے قریب بارڈر سے صرف 2 کلومیٹر کی دوری پر ہیں۔

وہاں دو اجنبی دیہاتیوں سے ہمیں ملایا گیا۔ ٹھیک دس روز بعد دلی میں گیارہ بجے دن ان میں سے ایک نے مجھے ملنا تھا۔ میٹنگ کا مقام تفصیلاً مجھے سمجھا دیا گیا۔ یہ دونوں دیہاتی لاہور کے ایک معروف اسمگلر کے کارندے تھے اور ہفتے میں دو بار اسی راستے سے بھارت جاتے تھے اور پان، کاجو اور الائچی وغیرہ لاتے تھے۔ پاکستان کی طرف سے انہیں بارڈر سے گزرنے اور واپس آنے کی سہولت دی گئی تھی جس کے عوض وہ پہلے سے گئے ہوئے گروپس کی ڈاک وغیرہ لاتے اور لے جاتے تھے۔ یہ دو اجنبی محض ہمارے گروپ کے لئے وقف تھے اور ان کو یہ ڈیوٹی سونپی گئی تھی کہ ہمیں وقت مقررہ پر سرحد پار کرائیں اور قریب ترین بھارتی ریلوے اسٹیشن ہنومان گڑھ تک پہنچا دیں۔ انہیں پیسے بھی دیئے گئے کہ وہ ہنومان گڑھ سے اجمیر شریف تک کے ٹکٹ خرید کر ہمیں دے دیں۔ ہمیں ٹکٹ دے کر وہ فوراً واپس ہندوستانی بارڈر کے قریب گاؤں مرزا پور پہنچ جائیں۔ جہاں دو افراد انہیں ملیں گے جو اگلی شام تک ان کے ہمراہ رہیں گے۔ ادھر ہمیں علیحدگی میں ہنومان سے بھٹنڈہ کے ٹکٹ دیئے گئے تا کہ مخالف سمت میں جانے والی گاڑی میں سوار ہوں جو اجمیر شریف جانے والی گاڑی سے پندرہ بیس منٹ پہلے ہی آ جاتی ہے۔ یہ سب احتیاط در احتیاط کی تدابیر ہماری حفاظت کے لئے کی گئی تھیں۔ ہم سے گھڑیاں بھی لے لی گئی تھیں اور صرف ایک گھڑی مجھے دی گئی تھی جو بھارت میں مہیا تھی۔ اس وقت اس کی قیمت بھارت میں تقریباً تین سو روپے تھی۔

رات کا کھانا ساڑھے آٹھ بجے تک کھا لیا گیا تھا۔ کھانے کے فوراً بعد ہمیں ایک ایک سیاہ لمبا انڈرویئر اور ایک ایک سیاہ رنگ کی پورے بازوؤں کی بنیان دی گئی۔ ہم نے بوٹ بھی اتارے اور کپڑوں کے ہمراہ اپنے بیگوں میں رکھ لئے۔ اب ہمارے سینئرز ہمارے ساتھ خوش گپیاں کر رہے تھے لیکن وہ محض ہماری ٹینشن دور کرنے کے لئے تھیں ورنہ ان کے چہروں سے بھی پریشانی عیاں تھی۔

ان دنوں جنگ کے بعد ہم سیز فائر کی حالت میں تھے۔ پاسپورٹ اور ویزا نام کی کوئی شے نہ تھی۔ بارڈر پر دونوں اطراف افواج کا اجتماع تھا، عین ممکن تھا کہ بارڈر کراسنگ کے دوران ہی دشمن ہمیں گولیوں سے اڑا دیتا۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ بھارت نے بارڈر کے قریب پاکستانی بی آر بی نہر کی طرح ایک نہر بنائی ہے جو خاصی گہری ہے۔ پاکستان کی طرف وہ ڈھلوان ہے جبکہ بھارت کی طرف وہ بالکل سیدھی ہے۔ ہمیں وہ نہر بغیر آواز پیدا کئے تیر کر عبور کرنی ہے۔ اس کی ٹریننگ ہمیں خوب اچھی طرح دی گئی تھی۔ ہنومان گڑھ اسٹیشن بارڈر سے 8 میل کے فاصلے پر تھا۔ راستے میں دو تین گاؤں پڑتے تھے۔ ہمیں ان سے دور رہ کر اور گاؤں کے کتوں سے بچ کر بھاگتے ہوئے جانا تھا اس وقت مجھے احساس ہوا کہ دوران تربیت مجھے گیارہ میل مسلسل دوڑنے کی پریکٹس کیوں کرائی گئی تھی۔ اسٹیشن کے قریب پہنچ کر ہمیں بنیان اور انڈرویئر اتار کے عام شہری لباس پہن لینا تھا اور دونوں اجنبی گائیڈز کو فوری واپس بھیج دینا تھا۔ بھٹنڈہ تک دوران سفر دو الگ الگ ڈبوں میں بیٹھنا تھا اور ایک دوسرے سے بات چیت ہرگز نہیں کرنی تھی۔ یہ آخری ہدایات تھیں۔ ٹھیک دس بجے ہمیں مسلسل گولیاں چلنے کی آوازیں آئیں۔ ہماری بارڈر فورس نے پڑاؤ سے دونوں طرف تقریباً 1/2 کلومیٹر کے فاصلے سے دشمن پر فائرنگ شروع کر دی تھی اور دشمن کو جوابی فائرنگ میں مصروف کر دیا تھا۔ یہ فائرنگ ہمارے لئے گرین سگنل تھی۔ سینئرز نے ہمیں گلے لگایا۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ ان کے آخری الفاظ کچھ اس طرح تھے۔

غازی

"Wish You Gods Help and best of luck

اپنی ذہنی حالت کے بارے میں، میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ بارڈر کراس کرنے کی ٹینشن اور مشن کی اہمیت دونوں یکساں تھیں۔ گھر اور فیملی کا خیال ذہن سے بالکل نکل چکا تھا۔ ہمیں ایک ایک 30 بور کا ریوالور اور ایک ایک سو گولیاں واٹر پروف پیکٹ میں دی گئی تھیں۔ جنہیں ہم نے اپنے بیگوں میں رکھ لیا تھا۔ نہر عبور کرنے کے دوران بیگوں کو سر پر باندھنے کیلئے رساں بھی دی گئی تھیں۔ سوا دس بجے ہمیں بارڈر کی جانب بڑھنے کا حکم ملا اور ہم سب کو خدا حافظ کہتے ہوئے اپنے گائیڈز کے ہمراہ بارڈر کی طرف چل پڑے۔

یہ تقریباً 100 کلومیٹر کا علاقہ پانی، سرکنڈوں اور کیچڑ سے بھرا ہوا تھا۔ ہم نے تقریباً 80 میل کا علاقہ بھاگتے ہوئے طے کیا اور بقیہ رینگتے ہوئے۔ کیچڑ اور سرکنڈوں سے ہمارے جسم مٹی اور خراشوں سے بھر گئے تھے۔

ہمیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ ہم کب بھارت میں داخل ہوئے کیونکہ سرحد کا کوئی نشان موجود نہ تھا۔ ہم بس آگے ہی بڑھتے جا رہے تھے کہ گائیڈ نے کہا کہ نہر آ گئی ہے۔

ہم ایک ایک کرکے نہر میں اتر گئے۔ گولیاں دونوں طرف سے تڑاخ تڑاخ چل رہی تھیں۔ نہر کو ہم نے کھڑی پوزیشن میں تیر کر عبور کیا۔ بھارت کی طرف سے کنارا پانی سے خاصا اونچا اور 90 درجے کا تھا۔ اس پر چڑھنے میں دقت ہوئی۔ اس کنارے پر پگڈنڈی بنی تھی جس پر بی ایس ایف (بھارت کی بارڈر سیکورٹی فورس) گشت کرتی تھی۔ ہمیں جلد از جلد اس پگڈنڈی کو عبور کرکے کھیتوں کی طرف دوڑنا تھا۔ احتیاطی تدابیر کے مطابق پگڈنڈی پر ہمیں الٹے قدموں چلنا تھا تا کہ اگر کوئی ہمارے پاس کے نشان دیکھے بھی تو یہ سمجھے کہ کچھ لوگ بھارت سے پاکستان کی طرف گئے ہیں۔ پگڈنڈی سے الٹے قدموں گزر کر ہم کھیتوں کی طرف بھاگے۔ کھیتوں کی منڈیروں پر ہم تیز سے تیز بھاگتے گئے۔ کھیتوں میں ڈیرے بنے ہوئے تھے۔ ہم ان ڈیروں سے حتیٰ الوسع دور رہنے کی کوشش کر رہے تھے اس وجہ سے ہمیں کئی بار ایک کھیت عبور کرکے کبھی دائیں اور کبھی بائیں جانب جانا پڑتا کیونکہ ڈیروں پر پالتو کتے ہوتے ہیں۔

غرضیکہ صرف یک جگہ دس منٹ آرام کرکے ہم نے اپنا سفر جاری رکھا اور ہنومان گڑھ اسٹیشن سے تقریباً آدھا کلومیٹر پہلے ایک نہر آئی۔ ہم نہر میں کود پڑے۔ اچھی طرح سے نہائے اور جسم کی آلودگی دور کی، انڈرویئر اور بنیان سے جان چھڑائی اور سویلین لباس پہن لئے۔ گائیڈز نے ہمارے لئے ٹکٹ لینے جانا تھا لیکن میں نے انہیں روک دیا اور کہا کہ پیسے تم رکھ لو اور اندھیرے میں واپس اس گاؤں میں پہنچ جاؤ جہاں تمہارا انتظار کیا جا رہا ہے۔ اس دوران میں نے اپنا ریوالور لوڈ کر لیا تھا۔ وہ دونوں اسی وقت واپس روانہ ہو گئے۔ میں نے اپنے ایک ساتھی کو ان کے پیچھے یہ دیکھنے کیلئے بھیجا کہ وہ واقعی واپس جا رہے ہیں یا کہیں چھپ گئے ہیں۔ اسمگلروں سے ہر بات ممکن ہے۔ میں نے ساتھی کو بھی ریوالور لوڈ کرنے کو کہا کہ اگر یہ ذرا بھی ادھر ادھر ہونے کی کوشش کریں تو فوراً گولی مار دینا۔ تقریباً بیس منٹ کے بعد میرا ساتھی واپس آیا اور بتایا کہ وہ اسی راستے پر بھاگتے ہوئے جا رہے تھے۔

اسی اثنا میں دوسری گاڑی کے وسل کی آواز آئی اور ہم نے اسٹیشن کی راہ لی۔ یہ بھٹنڈہ جانے والی گاڑی تھی۔ بالکل چھوٹا سا اسٹیشن تھا، ابھی ہلکا ہلکا اجالا ہوا تھا۔ ہم چار ساتھی اسٹیشن سے ذرا فاصلے سے پٹری کی دوسری جانب چلے گئے اور پانچواں ساتھی ٹکٹ لینے اسٹیشن کی طرف چلا گیا۔ گاڑی غالباً ایک یا دو منٹ وہاں رکی۔ ہمارے ساتھی نے ٹکٹ لیکر گاڑی کی دوسری طرف سے ہمیں اشارہ کیا اور ہم دوسری جانب سے گاڑی میں سوار ہو گئے۔ ہمارا ساتھی دروازے کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ اس نے ایک ایک کرکے دروازے سے گزرتے ہوئے ساتھیوں کو ٹکٹ تھمایا اور ہم چاروں اجنبی بن کے ایک ہی ڈبے میں بیٹھ گئے۔ تقریباً پون گھنٹے بعد گنگا نگر آیا۔ یہ خاصا بڑا اسٹیشن تھا۔ ہم ایک ایک کرکے اترے۔ اسٹال سے پوریاں اور چائے کا ناشتہ کیا اور دو الگ الگ ڈبوں میں بیٹھ گئے۔ اب ہماری منزل بھٹنڈہ جنکشن تھا، جہاں سے ہم نے دہلی کیلئے گاڑی پکڑنی تھی۔

بھٹنڈہ مغربی بھارت کا بہت بڑا جنکشن ہے۔ گاڑی بھٹنڈہ پہنچی تو ہم اسٹیشن سے ایک ایک کرکے باہر آ گئے۔ اب ہم سرحد سے خاصی دور آ گئے تھے اور بارڈر کراس کرنے کی ٹینشن بھی کچھ کم ہو گئی تھی۔ شہر چھوٹا سا تھا۔ ہم نے بازار سے سگریٹ اور شیونگ کا سامان وغیرہ خریدا۔ وائرلیس سیٹ بھی پریشانی کا موجب بن رہا تھا۔ وائرلیس اور باقی سامان ایک ہی بیگ میں تھا اور اسے سنبھالنے کے ذمہ دار کو ہر بار بیگ کھولتے وقت گھبراہٹ ہوتی تھی۔ لہٰذا ہم نے ایک بیگ وائرلیس سیٹ رکھنے کیلئے خریدا اور دہلی تک کے سفر کے دوران اس بیگ کی نگرانی ہم سب نے بانٹ لی۔ شہر کے ایک ہوٹل سے ہم نے کھانا کھایا اور پھر اسٹیشن کی طرف پلٹ آئے۔ ویٹنگ روم میں ہم نے شیو بنائی، نہائے اور حلیہ درست کیا۔ میں نے ساتھیوں کے مشوروں سے فیصلہ کیا کہ بجائے کسی ایکسپریس یا پنجاب میل کے ہم فاسٹ پسنجر میں دہلی تک کا سفر کریں گے تا کہ راستے میں مختلف اسٹیشنوں پر رکتے ہوئے جہاں تک ممکن ہو وہاں کے حالات سے باخبر ہو سکیں۔

فاسٹ پسنجر سہ پہر 3 بجے دہلی کیلئے چلتی تھی۔ ہم نے سیکنڈ کلاس کے ٹکٹ لئے۔ بھٹنڈہ اسٹیشن سے ہم نے ایک ملٹری ٹرین دیکھی جو یقیناً بارڈر کی طرف جا رہی تھی۔ ہماری گاڑی پلیٹ فارم پر آ لگی اور ہم ایک ڈبے کا انتخاب کرکے اسی میں اکٹھے بیٹھ گئے۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ وائرلیس کا بیگ اوپر کی برتھ پر رکھا جائے اور جس کی ڈیوٹی ہو وہ اس پر سر رکھ کر خود کو سوتا ظاہر کرے۔ ٹرین مقررہ وقت پر روانہ ہوئی۔ پسنجر ٹرین ہونے کی وجہ سے سکھ مسافروں کی اکثریت تھی۔ ایک عجیب بات محسوس ہوئی کہ سکھ مسافر بھی خاموش اور مایوس سے دکھائی دے رہے تھے۔ ورنہ سکھوں کی تو عادت ہے کہ جہاں بھی دو سکھ موجود ہوں وہاں قہقہے اور اونچی آواز میں باتیں لازمی ہو جاتی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ بھارتی پنجاب کے سکھ بھی اپنی آزادی کی منزل 71ء کی جنگ سے وابستہ کر بیٹھے تھے اور ان کا یہ خواب پورا نہ ہو سکا یا پھر وہ ہمیں ہندو سمجھ کے محتاط اور متنفر سے تھے۔ میں نے دو تین بار ان سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن ہر بار نہایت مختصر جواب ملا۔ ہم نے بھٹنڈہ سے براہ راست دہلی جانے کیلئے پہلے جالندھر اور پھر دہلی جانے کو ترجیح دی کیونکہ ہمارے سفر کے دوران تین بڑی چھاؤنیاں جالندھر، لدھیانہ اور انبالہ آتی تھیں۔ ان چھاؤنیوں کے اسٹیشنوں پر کافی چہل پہل تھی۔ دہلی سے امرتسر جانے والی ٹرینوں میں بھارتی ایف آئی یو (Field Intelligence Unit) کے آدمی مسافروں کی چیکنگ کرتے بھی دکھائی دیئے۔ اس کی لازماً وجہ مشرقی پاکستان سے قید ہونے والے پاکستانی جنگی قیدیوں کے بھارت کے POW کیمپس سے فرار کے درجنوں واقعات تھے۔ 16 دسمبر 1971ء کو پاکستان کے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں فوجیوں نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ ان میں سے کچھ برما کی طرف اور بیشتر بھارتی سرحدوں میں داخل ہو گئے تھے اور چھپتے چھپاتے پاکستان کے پنجاب بارڈر کی طرف جا رہے تھے۔ انہیں ہی پکڑنے کیلئے بھارتی پنجاب میں امرتسر کی جانب جانے والی ٹرینوں کی چیکنگ کی جاتی تھی۔

بھٹنڈہ سے دہلی کے سفر کے دوران ہم نے تین اور ملٹری اسپیشل ٹرینیں دیکھیں۔ ایک تو بھٹنڈہ اسٹیشن پر کھڑی تھی دو ٹرینوں پر فرانس کے بنے ہوئے AMX-13 اور روسی PT-76 ٹینک، دور مار توپیں، ہوٹیزر اور CAT TIGER میزائل کی بیٹریاں لدی ہوئی تھیں۔ ان ٹرینوں کو باقی سب ٹرینوں پر فوقیت دے کر TROUGH کیا جاتا تھا۔ ان ٹرینوں کے پاکستانی سرحد کی جانب جانے سے بھارتی عزائم کا صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ مغربی پاکستان پر فوجی دباؤ بڑھا رہا ہے اور سابقہ مشرقی پاکستان سے فوجیں ہٹا کر مغربی پاکستان کی سرحد پر جمع کر رہا ہے۔ روسی ساختہ PT-76 ٹینک AMPHIBIOUS یعنی پانی میں تیرنے والے ٹینک ہیں۔ سیز فائر کے بعد ان مخصوص ٹینکوں کو پاکستانی بارڈر پر لانے سے بھارتی ارادے صاف ظاہر ہو رہے تھے۔ ایک ٹرین میں بھارتی فوجی سوار تھے۔ صرف آدھے دن میں ہم نے 4 فوجی ٹرینیں دیکھی تھیں۔ میں نے ان ٹرینوں اور ان کے کارگو کو اچھی طرح ذہن میں بٹھا لیا تا کہ اپنی پہلی رپورٹ میں ان کا ذکر کر سکوں۔

رات تقریباً ساڑھے نو بجے ٹرین شاہدرہ اسٹیشن پر رکی (دہلی میں بھی جمنا کے مغربی جانب شاہدرہ اسٹیشن ہے۔ بالکل لاہور والے شاہدرہ اسٹیشن کی طرح) ہم نے اسی اسٹیشن پر گاڑی کو چھوڑا اور دو ٹیکسیاں لے کر دہلی کی طرف روانہ ہوئے۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق سبزی منڈی اسٹیشن کے قریب گھنٹہ گھر چوک میں ہم نے دو معمولی ہوٹلوں میں قیام کیا۔ چونکہ بھارت میں شناختی کارڈ رائج نہیں ہیں اس لئے ان ہوٹلوں میں کمرے حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں آئی۔ وہاں ہم سب نے خود کو معمولی کاروباری کی حیثیت سے متعارف کرایا اور بتایا کہ ہم گردونواح کے چھوٹے شہروں سے خریداری کیلئے آئے ہیں۔

ہماری بارڈر کراس کرنے کی ٹینشن میں بھی خاصی کمی آ چکی تھی۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو دو دو کی ٹولیوں میں دہلی میں گھومنے پھرنے کی اجازت دی۔ ہوٹلوں میں ہم نے داخلے کے راستے کے علاوہ کسی ایمرجنسی کے لئے دوسرے راستے بھی تلاش کر لئے تھے۔ ہمارا قیام پہلی منزلوں پر تھا اور ایک منزل سے کودنا ہمارے لئے کوئی دشوار نہ تھا۔

دوسرے روز میرے چاروں ساتھی گھومنے پھرنے نکل گئے۔ میں نے انہیں ہدایت کی کہ وہ کم از کم چار عدد ریڈی میڈ پتلونیں، قمیضیں اور جوتے ضرور لیں اور ضرورت کا دیگر سامان بھی جو انہوں نے شام تک خرید لیا۔ دشواری مجھے پیش آئی، میرے لمبے قد کی وجہ سے مجھے ریڈی میڈ کپڑے نہ مل سکے۔ میں نے کناٹ پیلس میں بھی تقریباً سب دکانیں چھان ماریں۔ صرف ایک سفاری سوٹ میرے سائز کا مل سکا۔ چنانچہ میں نے چار عدد تھری پیس سوٹ ایک ڈنر سوٹ اور قمیضوں کا کپڑا خرید کر اسی دکان سے ارجنٹ سلوانے کا آرڈر دیا۔ بوٹ میرے سائز کے بڑی مشکل سے ملے۔ پاکستان میں طے شدہ پروگرام کے مطابق اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں قیام کرنا اور مختلف کلبوں خصوصاً جیم خانہ اور سروسز کلب میں بھی جانا تھا، لہٰذا وہاں کے ماحول کے مطابق مجھے کپڑے خریدنے تھے۔

ہم نے دو دن دہلی میں گھوم پھر کر گزارے اور نئی دہلی اور پرانی دلی کے مختلف رہائشی علاقے دیکھے۔ میرے ساتھیوں کو پرانی دہلی میں اور مجھے نئی دہلی میں قیام کرنا تھا۔ پاکستان سے آنے والے کانٹیکٹ سے ملنے کی جگہ بھی دیکھیں اور وہاں سے نکلنے کے مختلف راستے بھی ذہن نشین کر لئے۔

دو روز بعد میں نے ساتھیوں کو مختلف اوقات میں کارونیشن ہوٹل میں چیک ان ہونے کا کہا اور خود لودھی ہوٹل کا رخ کیا۔ یہ فور اسٹار ہوٹل پاکستان سے ہی ہمارے قیام کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ نئی دہلی میں اس ہوٹل کے قریب ہی فائیو اسٹار اشوکا اور اکبر ہوٹل تھے اور بھارتی بری، بحری اور ہوائی افواج کے ہیڈ کوارٹرز بھی اسی علاقے میں تھے۔

ہم سب مختلف اوقات میں پاکستانی سفارت خانے کے سامنے سے بھی گزرے۔ پاکستانی سفارت خانہ اسلامی طرز تعمیر کا بہت اچھا نمونہ تھا تاہم ان دنوں بالکل اجڑا ہوا تھا۔ لوگوں نے پتھر مار مار کر بیشتر شیشے وغیرہ توڑ دیئے تھے۔ سفارت خانہ بند تھا اور پولیس کا ایک ہی سپاہی رسمی سا پہرہ دے رہا تھا۔

ہمیں اب انتظار تھا اپنے کانٹیکٹ کا جسے ہماری روانگی کے دسویں دن مجھ سے ملنا تھا اور ڈاک دینی تھی جس میں مزید ہدایات ہمیں ملنی تھیں۔ اس دوران ہمیں اپنا ہوم ورک کرنا تھا۔

میں نے اپنے دو ساتھیوں کو جھانسی بھیجا۔ جھانسی سے پہلا اسٹیشن بابینا ہے۔ ان دو اسٹیشنوں کے درمیان بھارت کی فرسٹ آرمرڈ کور کا ایک ٹینک ڈویژن اور نمبر 10 آرمرڈ بریگیڈ بیس تھی۔ میرے ساتھیوں کے ذمے یہ کام تھا کہ جھانسی میں کوئی معقول ہوٹل دیکھیں اور معلوم کریں کہ کور ہیڈ کوارٹر تک جانے کے لئے ٹیکسی یا کوئی سواری مل سکتی ہے۔ جھانسی کا پرانا قلعہ بھی فوج کے زیر استعمال تھا۔ اس کے متعلق بھی اگر کوئی مفید اطلاع مل سکتی ہو تو حاصل کریں۔

میں نے اپنے دوسرے دو ساتھیوں کو آگرہ بھیجا کہ وہاں پر فوجی چھاؤنی کے متعلق جو بھی معلومات مل سکتی ہوں وہ حاصل کریں۔ خود اپنے لئے میں نے آرمی، نیول اور ایئر ہیڈ کوارٹرز میں داخل ہونے کا راستہ ڈھونڈنا تھا۔ یہ ہمارا ایک طرح سے ہوم ورک تھا جسے ہم نے کانٹیکٹ کے آنے سے پہلے مکمل کرنا تھا۔ اس کے علاوہ اپنے ہمدرد دوستوں کے ٹھکانے بھی دیکھنے تھے تا کہ بوقت ضرورت ان ٹھکانوں کو تلاش نہ کرنا پڑے۔ غرضیکہ دلی میں دو دن کے قیام کے بعد ہم نے اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ اپنے ساتھیوں کو میں نے چار دن کے اندر واپس آنے کا کہا تھا۔ چوتھے روز مقررہ وقت پر ہمیں کناٹ سرکس کے ایک ریسٹورنٹ میں طے شدہ وقت پر ملنا تھا۔

میں نے اپنی اکثر شامیں اشوکا ہوٹل میں گزارنی شروع کر دیں۔ وہاں شام گہری ہوتے ہی ملکی وغیر ملکی لوگ آنا شروع کر دیتے ہیں۔ گرمی کی وجہ سے ان مکمل ایئر کنڈیشنڈ ہوٹلوں میں گہما گہمی بڑھ جاتی تھی اور میں نے ان ہی لوگوں میں سے اپنے مطلب کے لوگ تلاش کرنے تھے۔

میرا کام اونچی سوسائٹی کے ان ہوٹلوں میں کسی سے جان بوجھ کر ٹکرا جانا اور آئی ایم سوری کہہ کر تعارف حاصل کرنا اور پھر ان کی دعوت پر ان ہی لوگوں میں سے اپنے مطلب کے لوگ تلاش کرنا تھا۔

یہاں اس طور سے راہ رسم پیدا کرنا ایک معمولی بات تھی۔ خاص طور پر جبکہ وہ مخمور ہوں۔ ایک آدھ گھنٹے میں ہی بالکل اجنبی لوگ خاصے فری ہو جاتے ہیں۔ میں نے وہاں خود کو کھلی چائے کا ایک بیوپاری ظاہر کیا جو کلکتہ سے چائے بمبئی منگواتا تھا اور اپنی کمپنی میں بلینڈ کرکے چائے کے بیوپاریوں کو بیچتا تھا۔ میں نے چائے کی بلینڈنگ چٹاگانگ میں ملازمت کے دوران سیکھی تھی۔ بلینڈنگ کا مطلب ہے مختلف اقسام کی چائے کی درجہ بندی کرکے اور مختلف وزن میں انہیں ملا کر چائے کا ایک مخصوص معیار تیار کرنا۔ لپٹن، بروک بانڈ اور اصفہانی اسی طرح اپنے بلینڈ تیار کرتے ہیں۔ دارجلنگ کی اورنج پیکو چائے کا شمار دنیا کی بہترین چائے میں ہوتا ہے۔ یہاں پر میرا کام یہ تھا کہ ایک برانڈ اپنی چائے کا بناؤں اور اسے تقریباً نصف قیمت پر چھاؤنیوں میں فروخت کروں۔ چھاؤنیوں میں فوجی جوانوں اور NCO's کے لئے لنگر کی چائے کھلی چائے ہی استعمال کی جاتی ہے۔ ڈویژن ہیڈ کوارٹر میں (ADOS) یعنی اسسٹنٹ ڈائریکٹر آف سپلائیز تک رسائی کی صورت میں، میں پورے ڈویژن کے لنگروں کے لئے چائے کی فروخت کا آرڈر لے سکتا تھا۔ اسی طرح بریگیڈ ہیڈ کوارٹرز میں بھی لوکل سپلائی کے تحت مجھے آرڈر مل سکتے تھے اور اسی طرح میری رسائی افسران اعلیٰ تک ہو سکتی تھی۔

اشوکا اور اکبر ہوٹل میں، میں کسی ایسے موقع کی تلاش میں جاتا تھا کہ کسی اعلیٰ فوجی افسر تک رسائی ہو جائے اور اس طرح چھاؤنیوں میں چائے کے آرڈر حاصل کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہ آئے اس اعلیٰ سوسائٹی میں افسران اعلیٰ بننے تک شوہر کا دل اپنی بیوی سے بھر جاتا ہے اور بیوی ڈھلتی جوانی کی آخری بہاریں لوٹنے کے لئے بے تاب ہوتی ہے۔ اعلیٰ ہندو معاشرے اور خصوصاً فوج میں مغربی اثرات اتنے بڑھ چکے تھے کہ اکثر جوڑے آتے تو اکٹھے تھے لیکن واپس الگ الگ جاتے تھے اور ان کی یہی کمزوری میری کامیابی کا راستہ آسان کرنے والی تھی۔

اس دوران میرے چاروں ساتھی بھی واپس لوٹ آئے اور نہایت مفید معلومات لائے۔ آگرہ چھاؤنی تقریباً خالی تھی اور چھاؤنی میں مقیم بیشتر فوجی مغربی پاکستان کی سرحد پر گئے ہوئے تھے۔ جاٹ رجمنٹ اور سکھ رجمنٹ کی دو دو بٹالین موجود تھیں۔ ادھر جھانسی اور بابینا کے درمیان آرمرڈ ڈویژن کے علاقے میں کسی سویلین کا داخلہ کافی خطرناک تھا اور مکمل تحقیق اور تلاشی کے بعد ہی کسی کو اس علاقے میں جانے کی اجازت تھی۔ جھانسی کے قلعے میں ایمونیشن ڈپو تھا اور وہاں سیکورٹی بہت سخت تھی۔ بہرحال ہم فلمیں دیکھنے اور محض سیر و تفریح کے لئے تو دشمن ملک میں آئے نہیں تھے۔ اپنے مشن کی تکمیل میں جو بھی رکاوٹیں تھیں ہمیں انہیں بہرحال دور کرنا تھا۔

اب ہم اپنے کانٹیکٹ کے منتظر تھے۔ مقررہ تاریخ کی رات میں مقررہ جگہ پر پہنچ گیا۔ مجھے سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ کانٹیکٹ سے صرف میں ہی ملوں اور زیادہ سے زیادہ 15 منٹ تک مقررہ جگہ پر انتظار کروں۔ اگر کانٹیکٹ نہ آئے تو فوراً وہاں سے غائب ہو جاؤں اور ٹھیک ایک ہفتے بعد اسی جگہ اور اسی وقت پھر 15 منٹ انتظار کروں۔

غازی

میں طے شدہ وقت سے قریب 10 منٹ پہلے اس مقررہ جگہ کے قریب پہنچ گیا۔ وہ جگہ خاصی گنجان تھی۔ میں نے قریب ہی ایک بک اسٹال پر مختلف رسالے دیکھنے شروع کیے۔ مقررہ وقت سے 5 منٹ پہلے ہی مجھے کانٹیکٹ دکھائی دیا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی پہچان اور سب خیریت کے لئے لباس پر مخصوص رنگ کے رومال لگائے ہوئے تھے۔ دوسری چیکنگ کے لئے نظریں ملنے کے بعد مجھے اپنے دائیں بازو کو ایک مخصوص حرکت دینی تھی جس کے جواب میں کانٹیکٹ نے بھی ایک مخصوص حرکت کرنی تھی۔ دونوں طرف سے مثبت حرکات کا مطلب "سب اچھا" تھا جبکہ کسی خطرے کی صورت میں ہمیں رومالوں کو ہاتھ میں پکڑنا اور دوسری قسم کی جسمانی حرکات کرنا تھیں۔ میں ان طریقوں کی وضاحت اس لئے نہیں کروں گا کہ بہت ممکن ہے کہ اب بھی یہی طریقے رائج ہوں اور یہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ میں نے ایک رسالہ خریدا اور واپس چل پڑا۔ کانٹیکٹ مجھ سے چند قدم پیچھے تھا۔ آگے ایک فروٹ کی دکان تھی۔ میں نے مختلف فروٹ دیکھنے اور دام پوچھنے شروع کیے۔ کانٹیکٹ میرے بالکل قریب آن کھڑا ہوا اور اس نے بھی پھلوں کے دام پوچھنا شروع کیے۔ میں کپڑے کا ایک تھیلا ہمراہ لے گیا تھا (ان دنوں پلاسٹک کے شاپرز نہیں ہوتے تھے) میں نے پہلے دو کلو آم لئے، دکاندار نے کاغذ کے لفافے میں ڈال کر مجھے دیئے جو میں نے تھیلے میں ڈال لئے۔ میں اب بائیں ہاتھ میں تھیلا پکڑے ہوئے تھا۔ (کانٹیکٹ میری بائیں جانب کھڑا تھا) میں نے لیچی دکھانے کو کہا۔ جونہی دکاندار لیچی اٹھانے کو واپس گھوما، کانٹیکٹ نے ایک پیکٹ انتہائی تیزی اور پھرتی سے میرے تھیلے میں ڈال دیا۔ میں نے کچھ لیچی لی اور دام دے کر واپس چل پڑا۔ کانٹیکٹ نے بھی یقیناً میرے جانے کے بعد کچھ فروٹ ضرور خریدا ہوگا۔ قریب ہی سے میں ایک ٹمپو میں سوار ہو گیا۔ کچھ دور جانے کے بعد ٹمپو چھوڑا اور بس پکڑ لی۔ پھر بس چھوڑی اور دوبارہ ٹمپو میں بیٹھ گیا اور اپنی رہائش تک پہنچتے پہنچتے میں نے تقریباً تین گنا زیادہ سفر کیا تاکہ اگر میری نگرانی ہو رہی ہو تو وہ بھٹک جائیں۔

ہوٹل پہنچ کر میں نے دروازہ اچھی طرح سے بند کر لیا اور پیکٹ کھولا۔ پیکٹ میں 5 صفحات تھے جن کی ایک طرف ہندی میں لکھا ہوا تھا اور 10 ہزار بھارتی روپے تھے۔ میں نے موم بتی جلائی اور صفحات کے سادہ اطراف کو موم بتی سے گرمی پہنچائی۔ آہستہ آہستہ نارنجی رنگ کے حروف ابھرنے شروع ہوئے اور 15 منٹ میں سارے صفحات کی خفیہ روشنائی سے لکھی عبارت نمایاں ہو گئی۔ یہ 5 صفحات ہم پانچوں کے لئے تھے۔ خیریت سے بارڈر کراس کرنے اور دہلی پہنچنے کی مبارکباد دی گئی تھی، حوصلے بڑھانے کے لئے الفاظ کی تھپکی تھی اور مجھے ایک نئے مشن کو سب پر فوقیت دے کر فوری طور پر مکمل کرنے کا حکم ملا تھا۔ ڈاک ملنے کی رسید اور حالات کا سرسری جائزہ اور اب تک کے کام کو لکھنے کی ہدایت تھی۔ میں نے جواب لکھنے کے لئے پہلے سے تیار کردہ خفیہ روشنائی سے دو صفحات لکھے اور دو ورقوں کی دوسری جانب انگلش نظموں کے کچھ حصے لکھے۔ خفیہ روشنائی اب کوئی بھید نہیں اور آج کل تو Micro Films کے ذریعے کامن پن کے سرے جتنی جگہ میں چالیس سے زائد صفحات منتقل کئے جا سکتے ہیں۔ جو خفیہ روشنائی ہم استعمال کرتے تھے وہ پیاز یا لہسن یا لیموں کا پانی ہوتا تھا۔ اس سے کاغذ پر لکھا جائے تو سوکھنے کے بعد کاغذ پر کوئی نشان نہیں رہتا اور جب اسی کاغذ کو گرمی پہنچائی جائے تو لکھے ہوئے الفاظ نمایاں ہو جاتے ہیں۔

مجھے اگلے دن کانٹیکٹ کو ایک دوسری جگہ 10 بجے ملنا اور اپنا پیکٹ اس کے حوالے کرنا تھا۔ دوسرے دن ٹھیک 10 بجے ہم مقررہ جگہ پر ملے اور میں نے اپنا پیکٹ اس کے حوالے کر دیا۔ ساتھیوں کے لئے خط میں نے کانٹیکٹ کے واپس جانے کے بعد دیئے۔ ہم سب اپنے وطن سے اس پہلے رابطے پر بہت خوش تھے۔ ان پانچ ورقوں نے ہمارے حوصلے اور بڑھا دیئے تھے۔ ہم نے پھر ایک بار اپنے مشن کی تکمیل کے لئے تجدید عہد کیا۔

میں واپس اپنے ہوٹل آ گیا اور نئے مشن کی تکمیل کیلئے تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ میں نے لپٹن گرین لیبل اور بروک بانڈ ریڈ لیبل کے چھ چھ ٹن لئے اور رات کو ان کی بلینڈنگ کی اور انہیں اندازاً آدھا کلو کے پیکٹوں میں باندھ کر سلوشن ٹیپ سے بند کر دیا۔ میں مشن کی عملی تکمیل کیلئے دہلی سے باہر جا رہا تھا اور رات بھر مختلف ترکیبیں سوچتا رہا۔ دوسرے دن میں نے ساتھیوں کو الوداع کیا۔ ٹرانس میٹر جوان کے آگرہ اور جھانسی جانے کے دوران میں نے اپنے پاس رکھ لیا تھا انہیں واپس کیا۔ ہوٹل واپس آ کر میں جلد ہی گہری نیند سو گیا...... اگلے روز صبح مجھے روانہ ہو جانا تھا۔

میں نے کانٹیکٹ کو ایک نئی جگہ اور بعد دوپہر کا وقت دیا اور بارہویں روز ملنے کو کہا۔ میں چاہتا تھا کہ ان 12 دنوں میں اپنی نئی ذمہ داریوں کی مفصل رپورٹ بنا کر بھیج دوں۔ اپنی غیر موجودگی میں، میں نے ٹرانس میٹر والے ساتھی کو نائب مقرر کیا۔ یہ چاروں مختلف ہوٹلوں میں ٹھہرے تھے اور پھر میں نے انہیں کارونیشن میں منتقل کر دیا تھا، اس لئے انہیں ہوٹل کے باہر ایک دوسرے سے رابطہ کرنے کی بھی اجازت دے دی تھی۔

آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ مجھے جو ہدایات پاکستان سے روانگی کے وقت دی گئی تھیں میں نے ان میں کچھ ردوبدل کر دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پاکستان میں بیٹھ کر بھارت کے اندرونی حالات کا صحیح اندازہ بالکل نہیں ہو سکتا تھا۔ 71ء میں سابق مشرقی پاکستان میں بھارت کی ناقابل یقین کامیابی نے انہیں کچھ زیادہ ہی خود اعتماد بنا دیا تھا۔ دلی میں چند روزہ قیام کے دوران میں نے محسوس کیا تھا کہ وہاں سیکورٹی زیادہ سخت نہیں تھی۔ یہ ایک کاسموپولیٹن شہر ہے اور یہاں بھارت کے ہر علاقے کے لوگ رہتے ہیں۔ جن سے انہیں خطرہ ہو سکتا تھا انہیں وہ شکست دے کر تقریباً مردہ سمجھ بیٹھے تھے۔ مختصراً یہ عرض کروں کہ میں نے حالات کو دیکھتے ہوئے ہدایات سے ہٹ کر کچھ تبدیلیاں کی تھیں۔ یہ تبدیلیاں محض رہائش اور بارڈر کے گائیڈز کو واپس بھیجنے تک تھیں کیونکہ بارڈر کراس کرنے کے بعد مشن کی کامیابی اور ساتھیوں کا تحفظ میری ذمہ داری تھی۔

مجھے احمد نگر جانا تھا۔ پاکستان میں بریفنگ میں بھی بتایا گیا تھا کہ احمد نگر بھارت آرمڈ کور یعنی ٹینکوں کی ٹریننگ کا مرکز ہے۔ اس ٹریننگ سینٹر میں آرمڈ کور کے جوانوں کو نہ صرف موجودہ ٹینکوں اور ان کی گنوں کے چلانے کی مشق کرائی جاتی ہے بلکہ روس سے درآمد شدہ ٹی۔ سیریز کے نئے ٹینکوں کا استعمال بھی سکھایا جاتا ہے۔

شادیوں میں ہوائی فائرنگ کرنے والے ماہر نشانچی ہرگز نہیں ہو سکتے۔ دوران جنگ سامنے سے آتی ہوئی ہزاروں لاکھوں گولیوں، بموں، گردوغبار، دھواں، رات یا دن کی تمیز کے بغیر پانی، کیچڑ اور بارش میں اسلحہ کا ٹھیک ٹھیک استعمال اور نشانہ لگانا، اسلحہ کو کھولنا، صاف کرنا اور پھر جوڑ کر ٹھیک ٹھیک نشانہ لگانے والا ہی ماہر کہلا سکتا ہے۔ اس حقیقت کو ماننے سے میں کبھی انکار نہیں کروں گا کہ بھارتی افواج اگر تربیت میں ہم سے بہتر نہیں تو کمتر بھی نہیں۔ لیکن برصغیر پر مسلمانوں کی ہزار سالہ حکمرانی نے انہیں کم ہمت بنا دیا تھا۔ 65ء کی جنگ میں عددی لحاظ سے بہت کم پاکستانی افواج نے ان کے چھکے چھڑا دیئے تھے لیکن 71ء کی جنگ میں پاکستان کو دولخت کر کے اور 90 ہزار پاکستانی افواج کو قیدی بنا کر ان کے مردہ حوصلوں میں پھر جان پڑ گئی تھی اور اکھنڈ بھارت کا خواب وہ پھر دیکھنے لگ گئے تھے۔

میرا مشن یہ تھا کہ میں احمد نگر کے ٹریننگ سینٹر میں جا کر نئے درآمدی ٹینکوں کے متعلق مکمل معلومات حاصل کروں کہ آرمڈ کی کون کون سی رجمنٹ یہاں ٹریننگ حاصل کر رہی ہے اور کن ٹینکوں پر۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم کروں کہ ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد یہ رجمنٹس کہاں جائیں گی اور کن انفینٹری ڈویژنز کے ساتھ ان کو شامل کیا جائے گا۔

مجھے پوری طرح احساس تھا کہ یہ معلومات پاکستان کیلئے کتنی اہم ہیں۔ بھارت کے پاس ملک میں ساختہ وجینت نامی ٹینک بھی تھے جو بہت وزنی اور نقل و حرکت میں سست تھے۔ 65ء میں بھارتی کمانڈر ان چیف جنرل چوہدری کو ان ٹینکوں پر بہت غرور تھا اور انہیں "سیاہ ہاتھی" کا نام دیا گیا تھا۔ دیکھنے میں یہ پہاڑ جیسا ٹینک "دیٹھی ہوئی بطخ" ثابت ہوا۔ بھارت کے پاس ان کے علاوہ فرانسیسی ساختہ AMX-13، روسی PT-76 اور روسی ٹی۔ سیریز کے بہتر کارکردگی کے ٹینک تھے۔

ٹریننگ کے بعد ان ٹینکوں کی رجمنٹس کو ہند پاک بارڈر پر تعینات کیا جانا تھا۔ پاکستان کے لئے ان ٹینکوں کی کارکردگی سے متعلق معلومات اور سرحد پر ان کی تعیناتی کی جگہ سے آگاہی بہت ضروری تھی۔ مثلاً اگر ٹی-57 بھارتی ٹینک کے سامنے ہم اپنے جنگ عظیم دوئم کے فرسودہ شرمن ٹینک رکھیں تو سوائے اپنے ٹینکوں کی تباہی کے کچھ حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ اس وقت ٹی-57 کے سامنے پاکستان کو امریکہ سے ملے ہوئے "M" سیریز کے نئے ٹینک اور پیٹن ٹینک لانے تھے اور اسی وجہ سے مجھے یہ اہم مشن سونپا گیا تھا۔

احمد نگر، بمبئی سے تقریباً پانچ سو کلومیٹر پہلے گوداوری دریا کے قریب بالکل الگ تھلگ جگہ پر واقع ہے۔ اس کے گردونواح میں بھی کوئی بڑی صنعت یا بڑا شہر نہیں ہے۔ گوداوری دریا کی ایک نہر احمد نگر کے بالکل قریب سے گزرتی ہے۔ یہ علاقہ ٹینکوں کی تربیت کے لئے بہت موزوں ہے۔ یہاں اونچے نیچے ٹیلے، ریت، کیچڑ اور پانی کی موجودگی سے ٹینکوں کے استعمال کی ہر طرح کی تربیت ہو سکتی ہے۔

قریب بیس بائیس گھنٹے کے سفر کے بعد میں احمد نگر پہنچا اور ایک ٹھیک ٹھاک ہوٹل میں کمرہ لے لیا۔ میرا اہم مسئلہ ان ممنوعہ حدود میں داخل ہونا تھا جہاں بریگیڈ ہیڈ کوارٹر اور ڈویژن ہیڈ کوارٹر تھے۔ ٹریننگ کے علاقے میں داخل ہونا اول تو فضول تھا اور دوسرے تقریباً ناممکن۔ میں نے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر اور پھر اس کے توسط سے ڈویژن ہیڈ کوارٹر میں پہنچنے کے لئے اپنی بلینڈڈ چائے کا سہارا لیا اور دونوں جگہوں پر 2-IC اور ADOS تک پہنچ گیا اور لنگر کیلئے اپنی چائے پیش کی۔ میں نے انہیں اپنا بمبئی کا نیوناگ پاڑے کا ایڈریس (بزنس کارڈ میں نے دہلی سے ہی بنوائے تھے) دیا اور احمد نگر میں ہوٹل میں رہائش کا بھی بتا دیا۔ مجھے یقین تھا کہ میری چائے کی کوالٹی اور قیمت ان کے لئے باعث کشش ہوگی۔

ان دونوں ہیڈ کوارٹرز میں جاتے ہوئے میں نے ڈویژن اور رجمنٹ کے نشانات کی شناخت کی۔ وہ سب تقریباً ایک ہی ڈویژن اور رجمنٹ کے لئے تھے جن کا وہ ہیڈ کوارٹر تھا اور مجھے تلاش تھی ٹریننگ لینے والوں کی۔

شام کو میں شہر میں گھومنے نکل گیا۔ میں نے سائیکل رکشہ لے لیا اور سارا شہر گھمانے کا کہا۔ ٹریننگ سینٹر کی جانب جہاں شہر کی حدود ختم ہوتی ہیں وہاں میں نے چھاؤنی سے باہر شراب خانے دیکھے اور فوجی جوانوں کو اندر جاتے اور باہر نکلتے دیکھا۔ میں ایک شراب خانے میں داخل ہوا اور ٹریننگ کے دوران چونکہ مجھے بھارت کی سب رجمنٹوں کے نشانات ازبر کرائے گئے تھے اس لئے میں نے فوراً پہچان لیا کہ یہ سب مختلف ٹینک رجمنٹوں کے جوان تھے۔

بھارت میں اس وقت فوجیوں کو ہر روز 2 اونس شراب راشن میں مفت ملتی تھی۔ ظاہر ہے دو اونس شراب سے ان کا نشہ پورا نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے چھاؤنی کے گرد شراب خانے بنے ہوئے تھے جہاں دیسی شراب ملتی تھی اور وہیں پر یہ فوجی اپنی بقیہ ضرورت پوری کرتے تھے۔ میں نے ان شراب کے نشے میں جھومتے فوجیوں سے اپنے مطلب کی باتیں اگلوانے کا منصوبہ بنایا اور واپس ہوٹل لوٹ آیا۔

اگلے دن میں پھر اے ڈی او اور آئی سی کے دفاتر میں گیا۔ میری چائے کے نمونے ابھی وہیں پڑے تھے۔ دونوں جگہوں سے مجھے کہا گیا کہ ایک ہفتے کے اندر وہ فیصلہ کریں گے کہ میری چائے خریدی جائے یا نہیں۔ اور اگر فیصلہ میرے حق میں ہو گیا تو مجھے سپلائی جاری رکھنے کی ضمانت کے طور پر زر بیعانہ بھی جمع کروانا پڑے گا۔ اور میرے ساتھ باقاعدہ معاہدہ کیا جائے گا کہ کب سے میں سپلائی شروع کروں۔ دفتر کے کلرکوں وغیرہ کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ ڈویژن ہیڈ کوارٹر میں ADOS اور بریگیڈ میجر ہیڈ کوارٹر میں (یہ بریگیڈ وہاں کے ڈویژن کے تحت نہیں تھا) 2-IC اور ایڈ جوائنٹ سے رابطہ بڑھانا یوں کہہ لیجئے کہ انہیں خوش کرنا ہوگا۔

ڈویژن ہیڈ کوارٹر میں نقب

میں نے اے ڈی او کے دفتر کے ایک ذرا زیادہ ہی کھلنڈرے قسم کے کلرک کو شام کو اپنے ہوٹل میں گپ شپ کرنے کے علاوہ خوش کرنے کے حوالے سے بات چیت کرنے کی دعوت دی۔ اس نے ہوٹل میں آنے سے معذرت کر لی کیونکہ شہر میں کئی قحبہ خانے ہونے کی وجہ سے کئی ہوٹل فوجیوں کے لئے علاقہ ممنوعہ قرار دیئے گئے تھے اور F.I.U اور ملٹری پولیس والے فوجیوں کو ان ممنوعہ علاقوں سے پکڑنے کے لئے گھومتے پھرتے تھے اور ایک فوجی کلرک کو شہر کے ایک ہوٹل میں ایک اجنبی سویلین کے ساتھ دیکھ کر وہ شک کر سکتے تھے۔ میں نے اسے کہا کہ پھر چھاؤنی کے باہر شراب خانوں میں سے کسی ایک پر مل لے۔ وہ مان گیا اور مجھے ایک شراب خانے کی لوکیشن سمجھائی کہ وہاں 8 بجے شام ملے گا۔ اسے دعوت دینے سے میرا ایک مقصد حل ہو گیا کہ میں ان شراب خانوں میں اجنبی بن کر نہ جاؤں بلکہ کوئی فوجی بھی ہمراہ ہو۔ ایک بار وہاں متعارف ہو گیا تو پھر وہاں دوسروں سے اپنے مطلب کی باتیں اگلوانے میں زیادہ دشواری نہیں ہوگی۔

شام پونے آٹھ سے بھی پہلے میں وہاں پہنچ گیا اور باہر ٹہلنے لگا۔ دروازے سے اندر دیکھا تو وہ پہلے ہی بیٹھا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہوا اور اس کی میز پر پہنچ گیا۔ اس نے پرتپاک خیر مقدم کیا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ آرڈر کرے میں نے وہاں پر مہیا سب سے اچھی شراب کی پوری بوتل لانے کو کہا۔ چند لمحے تو اس نے رسمی سا احتجاج کیا جس پر میں نے کہا کہ تم فوجی، ملازم پیشہ اور قلیل تنخواہ پانے والے ہو، جبکہ میں کاروباری آدمی ہوں۔ دوران مے نوشی اس کے دو تین واقف کار بھی آ گئے اور انہیں بھی میں نے اپنی ٹیبل پر بلا لیا۔ شراب خانے کے اس ہال میں مختلف ٹینک رجمنٹوں کے جوان اور NCO موجود تھے اور بہت غل غپاڑا کئے ہوئے تھے۔ مجھے ایسے ہی ماحول کی تلاش تھی۔ میں خاصا چوکنا بھی تھا لہٰذا اس رات سوائے ادھر ادھر کی باتوں اور ہنسنے ہنسانے کے کوئی بات نہ کی۔ وہاں پر معلوم ہوا کہ یہ سب سے معقول شراب خانہ ہے اور تمام شراب خانے رات بارہ بجے لازمی طور پر بند ہو جاتے ہیں۔ کھانے کے لئے بھی سب کی پسند کا آرڈر میں نے دیا اور جب ہم اٹھے تو وہ 3 بوتلیں ڈکار چکے تھے۔

اکا دکا رکشے آ جا رہے تھے۔ وہ اپنی موج ترنگ میں چھاؤنی کی طرف چلے گئے جبکہ میں نے ایک رکشے پر ہوٹل کی راہ لی۔ وہاں کا ماحول دیکھ کر میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ اگلی شام سے میں اپنے کام کا آغاز کر دوں گا۔

اگلی شام میں 7 بجے ہی وہاں پہنچ گیا۔ اس وقت بھی شراب خانے میں خاصے گاہک تھے۔ گزشتہ رات کی بڑی ٹپ کی وجہ سے ویٹر نے بڑی خوش اخلاقی سے مجھے خالی ٹیبل پر لا بٹھایا اور اسی شراب کی بوتل لے آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں گلاس ہاتھ میں تھامے اٹھا اور ایک ٹیبل کے پاس سے گزرتے ہوئے جان بوجھ کر لڑکھڑایا اور گلاس ایک فوجی پر انڈیل دیا۔ اس ٹیبل پر پانچ فوجی بیٹھے تھے۔ وہ مجھے گھورنے لگے، میں نے معذرت کی، مسکرایا اور پھر کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولیں میں نے کہا کہ بمبئی سے آیا ہوں آپ ہی کی چھاؤنی میں ADOS سے کاروباری سلسلے میں مل چکا ہوں۔ آپ کا مہمان ہوں لیکن اب آپ پانچوں میرے مہمان ہیں۔ شرابی انداز میں، میں نے بیرے کو کہا کہ میری ٹیبل سے میری بوتل اور دو اور بوتلیں اسی ٹیبل پر لے آئے۔

ہر جگہ پر نچلے درجے کے رینک کے فوجی اور جوان عموماً بہت محدود سوچ رکھتے ہیں اور پھر جب ADOS جو کہ لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے کا ہوتا ہے، سے ملنے والے کاروباری شخص ایسے رینکس میں بے تکلفی سے بیٹھ جائے تو وہ خاصے مؤدب ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے پہلے تو میرا مہمان بننے سے انکار کیا لیکن جب میں نے بے تکلفی سے انہیں "یار۔ یار" کہنا شروع کیا تو ان کی جھجک ختم ہو گئی اور دوستانہ ماحول پیدا ہو گیا اور تھوڑی دیر میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ میرے ساتھ ٹھٹھا مذاق کرنے لگے۔ میں نے نہایت ہوشیاری سے گفتگو کا رخ اپنے چائے کے کاروبار، بھارتی بنگال کی چائے اور پھر سابقہ مشرقی پاکستان سے چائے بھارت میں اسمگل ہونے کی طرف پھیرا۔

غازی

میں نے انہیں کہا کہ میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ ہماری فوج نے پاکستانی فوج سے ڈھاکہ میں ہتھیار کیوں ڈلوائے اگر وہ پورے مشرقی پاکستان پر قبضہ کر لیتے تو اکھنڈ بھارت کا آدھا خواب سچ ہو جاتا اور ہمارے دیس کی سرحدوں میں وسعت بھی آجاتی۔ آپ 90 ہزار پاکستانی فوجیوں کو قیدی بنا کے لے آئے۔ نہ معلوم پاکستان انہیں واپس لے گا یا نہیں، اب تو وہ آپ پر محض خوراک وغیرہ کا بوجھ بن کر رہ گئے ہیں۔ وہ ہنسنے لگے۔ ان میں سے جو ذرا سمجھدار دکھائی دیتا تھا وہ بولا۔ ”صاحب ہم نقصان میں ہرگز نہیں بلکہ بہت فائدے میں ہیں۔ 90 ہزار پاکستانی فوجی ہماری قید میں ہیں۔ اس شکست سے باقی ماندہ مغربی پاکستان کی کمر ٹوٹ چکی ہے اور آپ کو ہم بہت جلد دکھا دیں گے کہ وہ پاکستان بھی ہمارے قبضے میں آجائے گا۔ میں اجنالے کا رہنے والا ہوں، فوج میں 9 سال سے ٹینک رجمنٹ میں ہوں ہم شرنارتھی ہیں اور پشاور کے رہنے والے ہیں۔ میرے سورگباشی پتا بھی فوجی تھے جو 65ء کی جنگ میں امر ہو گئے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ پوربی (مشرقی) پاکستان کے مقابلے میں پچھمی (مغربی) پاکستان کو فتح کرنا آسان ہے۔ اسلئے کہ پچھمی پاکستان کے مغرب میں افغانستان ہمارا دوست ہے۔ آدھے سے زیادہ کشمیر پر ہمارا قبضہ ہے جہاں ہم بلندی پر ہیں۔ ہم نے اسی مقصد کے حصول کیلئے 65ء میں پچھمی پاکستان میں جنگ لڑی تھی، کہ افغانستان اٹک تک آگے بڑھ کر قبضہ کر لے گا اور اپنے بارڈر سے آگے بڑھ کر ہم گوجرانوالہ تک کا علاقہ فتح کر لیں گے۔ ادھر کشمیر سے ہماری فوجیں گجرات، میرپور اور مری کے راستے آگے بڑھ کر سارے پاکستان کا تیاپانچہ کر دیں گی۔ پاکستان کی فوجیں بیک وقت تین محاذوں پر لڑنے کے قابل نہیں، اس کے مقابلے میں پوربی پاکستان میں دریاؤں کی بہتات اور دلدلی علاقوں کی وجہ سے لڑنا اور فتح حاصل کرنا زیادہ مشکل ہے۔ پھر برما بھی ہمارا ایسا دوست نہیں جو اس وقت ہماری مدد کرے۔ اب پوربی پاکستان میں پاکستانی فوجوں سے ہتھیار ڈلوا کر اور قیدی بنا کر ہم انہیں اپنے دیش میں لے آئے۔ پوربی پاکستان سے ہمارا فوجی معاہدہ ہے کہ وہ 20 سال تک 2 ڈویژن سے زیادہ فوج نہیں رکھے گا۔ ہمارے زیر احسان مجیب کی وہاں حکومت ہے۔ اب پچھمی پاکستان کی فوج ہم سے لڑنے سے پہلے سو بار سوچے گی کہ بھارت کے علاقے میں 90 ہزار مسلح فوجی قید میں ہیں اور عنقریب آپ کو ہم ایک اور بڑی فتح کی خبر دیں گے“۔

شراب کے نشے میں اس نے خاصی واہی تباہی بکی اور میں سوچ رہا تھا کہ محض چند ہزار غیر ملکی مسلمان فوجیوں کے بل بوتے پر ہزار سال تک حکومت کرنے والی قوم کو یہ ہزار سالہ غلام قوم کا فرد ایسے بڑھ چڑھ کر للکار رہا ہے۔ اپنوں کی غداری کی وجہ سے ایک شکست نے ہماری ہزار سالہ فتوحات اور حکمرانی کی دہشت کو چور چور کر دیا تھا۔ جوش سے میرا خون تو ابلنے لگا تھا کہ بوتل کو توڑ کر اس کے ٹکڑے سے اسے جہنم واصل کر دوں لیکن مصلحت اور حصول مقصد کی وجہ سے میں نا صرف خاموش رہا بلکہ اس کا ان بڑھکوں میں ساتھ بھی دیتا رہا۔

بات اب جنگ کی طرف آچکی تھی تو میں نے پوچھا کہ مشرقی پاکستان کو جو تمہارے سورگباشی پتا کے کہنے کے مطابق فتح کرنا مشکل تھا تم نے اتنی آسانی سے کیونکر فتح کر لیا۔ اس نے کہا کہ ”جس ملک کا صدر شرابی کبابی اور زانی ہو۔ جنگی علاقے کا کور کمانڈر بجائے جنگی چالیں سوچنے کے رقیہ ہوسٹل ڈھاکہ میں رہائش پذیر لڑکیوں کو جبراً اٹھواتا ہو اور جس کی وجہ سے دو درجن سے زائد لڑکیوں نے دو منزلہ چھت سے کود کر اجتماعی خودکشی کی ہو۔ جس ملک میں جمہوریت نام کی کوئی چیز نہ ہو، اسے شکست نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگا۔ وہ فوجی پڑھا لکھا اور جنگی معلومات پر خاصی دسترس رکھتا تھا۔ میں نے اس کی گفتگو کی بڑی تعریف کی، نشے میں ہونے کی وجہ سے اور ایک سویلین سے اپنی تعریف سن کر وہ خوشی سے پھول گیا اور کہنے لگا کہ ہماری سرکار غیر ملکوں سے جو اسلحہ لیتی ہے وہ خاصی چھان پھٹک کر اور اپنے اولین مقصد (اکھنڈ بھارت) کے حصول کے لئے کارآمد جان کر لیتی ہے۔ روس ہمارا سچا دوست ہے۔ جنگ سے عین قبل اس نے ہمارے ساتھ دفاعی معاہدہ کیا۔ U.N.O میں کشمیر کے مسئلے کو ہمیشہ ویٹو کیا۔ 62 میں چین کے ساتھ ہماری جنگ محض ہماری ایک چال تھی کہ امریکی اسلحہ مفت میں مل سکے۔ روس سے دوستی کے باوجود ہم نے صرف کسی ایک ملک سے اپنے ہتھیاروں کے حصول کی وابستگی نہیں رکھی۔ ہم نے برطانیہ، فرانس، پولینڈ اور یوگوسلاویہ سے بھی ہتھیار لئے۔ اس نے کہا کہ 65ء کی جنگ کے بعد روس نے ہمیں میزائل بوٹس دیں جو ہم نے فوراً ہی لے لیں۔ ویسی ہی میزائل بوٹس چین نے پاکستان کو دینی چاہیں جسے پاکستان نیوی کی اعلیٰ سطحی ٹیم نے لینے سے صرف اس لئے انکار کر دیا کہ ان میں افسروں اور جوانوں کے رہائشی کمرے الگ الگ نہ تھے بلکہ ایک ساتھ تھے۔ انہی روسی میزائل بوٹس نے ہی پاکستان کے Destroyer خیبر کے چند لمحوں میں ٹکڑے کر دیئے۔ فرانسیسی AMX-13 کی گولہ پھینکنے کی رینج 16 کلومیٹر ہے۔ PT-76 قسم کے پانی میں تیرنے والے ٹینک فرانس نے بھی بنائے ہیں لیکن پاکستان صرف ایک ملک امریکہ پر انحصار کرتا ہے اور امریکہ خود غاصب ہے۔ ریڈ انڈینز کے ملک پر اقوام یورپ نے قبضہ کیا اور پھر خانہ جنگی کے بعد مختلف 51 ریاستوں میں بٹ کر حکومت کرنے لگے اور ریڈ انڈین کو Preservation تک محدود کر دیا اور آج ریڈ انڈین صرف فلموں یا قومی تہواروں پر سیاحوں کا دل بہلاتے نظر آتے ہیں ہم نے اپنی دفاعی انڈسٹریز لگائیں اور بحری جہاز، ہوائی جہاز اور ٹینک تک بنانے لگے۔ جبکہ پاکستان ایک جیپ تک نہ بنا سکا“۔

اس کی یہ سب باتیں خنجروں کی طرح میرے سینے میں پیوست ہو رہی تھیں لیکن میں خاموش تھا۔ وہ تو کامیابی اور شراب کے نشے میں بول رہا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مجھے آئینہ دکھا رہا ہے اور ان سطور میں وہی آئینہ میں قوم کو دکھانا چاہتا ہوں۔ ہم بھی وہی ہیں، دشمن بھی وہی ہے اور اس کے عزائم بھی وہی ہیں۔ پرتھوی اور اگنی میزائل اس کے جارحانہ عزائم کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ تو رب ذوالجلال ولاکرام کی ذات پاک ہے جس نے اس آدھے پاکستان کو اپنی پناہ میں رکھا ہوا ہے ورنہ ہم نے تو اپنی بربادی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو دعائیں دیتا ہوں جس نے وطن کی محبت میں انتھک محنت کر کے جان کی پروا کئے بغیر اور اربوں ڈالر کی پیشکش کو مسترد کر کے پاکستان کو ایٹمی طاقت بنا دیا ورنہ بھارت تو 74ء میں ایٹمی دھماکہ پاکستانی سرحدوں کے قریب کر چکا تھا۔ ہمارے نیوکلیئر پاور بننے کی وجہ سے ہی بھارت تلملا رہا ہے۔ ورنہ اس نے تو مغربی پاکستان کو بھی سابقہ مشرقی پاکستان کی طرح تر نوالہ سمجھ لیا تھا۔

اپنی طرف سے بھی چند سطور پیش کرتا ہوں۔ پاکستان جیسا معاشی طور پر تقریباً دیوالیہ ملک قرض لے لے کر جو عیاشی کر رہا ہے کیا ہم اس کے متحمل ہو سکتے ہیں؟ حکومت جو گاڑیاں منگواتی ہے وہ مرسیڈیز 550 اور بلٹ پروف ہوتی ہیں۔ کیا سویڈن کسی اور دنیا کا ملک ہے جہاں کا وزیراعظم سائیکل پر دفتر جاتا ہے۔ جس کی بیوی لوکل بسوں میں بیٹھ کر شاپنگ کرنے جاتی ہے۔ ویتنام کا آنجہانی صدر ہوچی منہ کھڑاویں پہن کر غیر ملکی وفد سے ملتے ہوئے شرم محسوس نہیں کرتا تھا کیونکہ اس نے اپنی سال بھر کی تنخواہ ملکی خزانے کو دے دی تھی اور جوتے خریدنے کے لئے اس کے پاس پیسے نہ تھے۔ وہ صدارتی محل کے باغ میں ایک جھونپڑا بنوا کر اس میں رہائش پذیر تھا اس لئے کہ اس کا ملک صدارتی محل کے اخراجات پورے کرنے کا متحمل نہ تھا۔

اپنے ہمسایوں کی طرف ہی دیکھئے۔ تیل اور معدنی وسائل سے مالا مال ایران امریکہ اور یورپی ممالک کی پابندیوں کے باوجود نا صرف زندہ ہے بلکہ خوش حال بھی۔ میں نے خود سابق صدر اکبر ہاشمی رفسنجانی کو تہران کے ہماشیرٹن ہوٹل کی لابی میں دو تین ساتھیوں کے ہمراہ Snacks کھاتے دیکھا تھا اور مجھے انتہائی تعجب ہوا کہ نہ تو پولیس نے ہوٹل کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور نہ ہی سیکورٹی کا کوئی فرد وہاں موجود تھا۔ ہوٹل کے باہر ایک سیاہ کار کھڑی تھی، مرسیڈیز 200 جس پر ایران کے قومی اور صدارتی جھنڈے لہرا رہے تھے۔ ایک ڈرائیور تھا اور ایک باوردی فوجی غالباً ملٹری سیکریٹری۔ نہ ٹریفک روکی گئی اور نہ کوئی اور حفاظتی بندوبست تھا۔ عام لوگوں کی طرح وہ ہوٹل آئے کھانا کھایا، بل ادا کیا اور واپس چلے گئے۔ تہران میں کئی شاہی محلات ہونے کے باوجود صدر مملکت ایک عام سے 4 کمروں کے مکان میں رہتا تھا۔

دوسری طرف بھارت میں دیکھئے۔ آزادی اور خود مختاری کے 50 سال گزرنے کے باوجود وہاں کوئی پرائم منسٹر ہاؤس نہیں بنایا گیا۔ جواہر لعل نہرو، اندرا گاندھی، سنجے گاندھی ایک عام سی پرائیویٹ کوٹھی میں رہتے تھے۔ وہاں کوئی نیا پارلیمنٹ ہاؤس نہیں بنایا گیا۔ انگریزوں کے دور کا پارلیمنٹ ہاؤس ہی زیر استعمال ہے۔ نیا صدارتی محل بھی کوئی نہیں بنا۔ راشٹرپتی بھون یعنی صدارتی رہائش گاہ انگریزوں کے دور کا وائسریگل لاج ہے جو کسی طرح بھی لاہور کے گورنر ہاؤس اور کراچی کے سابق گورنر اور صدر کی رہائش گاہ سے بہتر نہیں۔

وہاں صدر ہو یا وزیراعظم، غیر ملکی سربراہ ہو یا کوئی وی آئی پی، سب بھارت کی بنی ہوئی ماروتی یا ہندوستان نام کی گاڑی میں سفر کرتے ہیں۔ وہاں سرکاری ٹریفک گزرتے وقت عوامی ٹریفک روکی نہیں جاتی۔ صرف ایک سوال جس کا جواب آپ کا دل اور ضمیر دے سکتا ہے۔ آزادی کے باون برسوں میں ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ اور بھارت نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ پاکستان کا ہر فرد غیر ممالک کا تیرہ ہزار روپے کا مقروض ہے۔ جبکہ 900 ملین کی آبادی والے ہمارے ہمسائے ملک بھارت کے افراد کے ذمے کتنا قرض ہے؟ خدارا اپنے گریبان میں جھانکئے جواب آپ کو خود مل جائے گا۔

اس حوالدار نے مجھے بتایا کہ وہ بی اے ہے اور عنقریب اس کی ترقی ہونے والی ہے۔ اس کی جنرل نالج اور تاریخ سے وابستگی کی وجہ سے میں نے اس سے اپنے مطلب کی بات نہ پوچھنے ہی میں عافیت سمجھی۔ اسی اثنا میں کل والے کلرک صاحب بھی تشریف لے آئے اور میں ان سے معذرت کر کے کل والے کلرک کے ساتھ جا بیٹھا تا کہ ADOS کے کلرک کے ساتھ مجھے دیکھ کر اس حوالدار کو میرے متعلق اگر کوئی شک ہو تو وہ ختم ہو جائے۔ آج کی شام بھی مجھے بیکار جاتی دکھائی دی۔ اب تک میری اتنی ہی کامیابی تھی کہ اس شراب خانے میں، میں جانا پہچانا جاتا ہوں۔ اگلے دن میں نے ADOS کے دفتر میں کچھ وقت گزارا اور ہوٹل واپس لوٹ آیا۔ آج کی شام میرا ارادہ تھا کہ میں کسی دوسرے شراب خانے میں جاؤں۔ شام کے 6 بجے کے قریب میں رکشہ لے کر چل پڑا اور ایک دوسرے شراب خانے میں داخل ہو گیا۔

اس شراب خانے میں، میں نے فوجیوں کی خاصی تعداد دیکھی، سکھ ہو اور شراب پی رہا ہو تو اس سے کوئی بات اگلوانا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ پھر پنجابی زبان بھی ان کے قریب ہونے کا بڑا ذریعہ ہے۔ یہاں سستی قسم کی شراب مہیا تھی۔ میں نے اسی کی بوتل منگوالی۔ کوئی خالی میز نہ تھی لہٰذا ایک ٹیبل پر جہاں 4 سکھ بیٹھے ہوئے پی رہے تھے میں نے خالی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پنجابی میں پوچھا کہ اگر اجازت ہو تو بیٹھ جاؤں۔ دو تین سکھ بیک وقت بولے، جم جم بیٹھو جی اور میں چند منٹوں میں ان کے ساتھ گھل مل گیا۔

پنجابی زبان نے ہمیں بہت جلد بے تکلف کر دیا۔ میں نے دو مزید بوتلوں کا آرڈر دیا۔ انہوں نے بہت انکار کیا اور کہا کہ آپ ہمارے مہمان ہیں لیکن میں نے دو بوتلوں کا آرڈر دے ہی دیا۔ میں نے مختصراً انہیں بتایا کہ میں بمبئی سے کس کام کے لئے یہاں آیا ہوں۔ ساتھ ہی انہیں یہ بھی بتا دیا کہ میں پنجاب کی چوہڑا فیملی سے ہوں اور میری مادری زبان پنجابی ہے اور ہم دراصل لدھیانہ کے رہنے والے ہیں۔ درحقیقت میرا ننھیال بھی تقسیم ہند سے قبل لدھیانہ میں رہتا تھا اور میں نے لدھیانہ کے محلوں اور سڑکوں کے نام یاد کر لئے تھے۔ بمبئی میں تو سب بمبئی کی مخصوص اردو نما ہندی بولتے ہیں چاہے وہ پنجابی ہی کیوں نہ ہوں۔ آپ یہاں ٹھیٹھ پنجابی میں بات کر رہے تھے اور مجھے اپنے ہم زبانوں سے مل کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔

بس جی پھر کیا تھا، چاروں سکھ ”جئے نونہال اور ست سری اکال“ ہو گئے۔ اب جو باتیں شروع ہوئیں تو میں نے ان کے گلاس لبالب بھر دیئے۔ پانی ملائے بغیر سردار صاحبان انہیں ڈکار گئے۔ میں نے پھر گلاس بھرے، میری خواہش تھی کہ یہ جلد نشے میں ہو جائیں تو میں ان سے اپنے مقصد کی باتیں جان سکوں۔ جب انہیں اچھی خاصی چڑھ گئی تو میں نے کہا کہ ”آپ یہاں کتنے عرصے کی ٹریننگ کے لئے آئے ہیں“۔ ان میں سے دو کی وردیوں کے نشانوں سے معلوم ہوا کہ وہ دونوں ایک ہی رجمنٹ سے تھے۔ باقی دو مختلف رجمنٹوں سے تھے۔ ایک ہی رجمنٹ کے دو سکھوں نے کہا کہ ”وہ 3 ماہ کی ٹریننگ کیلئے آئے ہیں اور صرف 25 دن کے بعد ان کی ٹریننگ مکمل ہو جائے گی“۔ میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا کہ ”صرف 3 ماہ میں ٹینک چلانے کی ٹریننگ مکمل ہو جاتی ہے“۔ انہوں نے کہا کہ ”نہیں جی نئے رنگروٹ کے لئے تو ٹریننگ بہت وقت لیتی ہے ہم تو نئے ٹینکوں کی ٹریننگ حاصل کرنے آئے ہیں“۔ میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا کہ ”نئے ٹینکوں سے آپ کی مراد کیا ہے۔ میری معلومات کے مطابق تو ہمارے پاس روسی ٹینک ہیں“۔ وہ نشے میں جھومتے ہوئے کہنے لگا کہ ”بادجی جیسے موٹروں کے ماڈل ہر سال بدلتے ہیں لیکن نام وہی رہتا ہے۔ اسی طرح سال دو سال بعد نئی قسم کے ٹینک بن جاتے ہیں“۔ میں نے کہا کہ ”ہمارے پاس تو روسی ٹی ٹینک ہیں“۔ وہ کہنے لگا ”بے شک ہمارے پاس ٹی سیریز کے ٹینک ہیں اور اب نئے ٹی سیریز کے ٹینک آئے ہیں، شراب کے نشے میں اس نے ٹی سیریز کے نئے ٹینکوں کے نمبر بھی بتا دیئے“۔ میں نے فوراً ہی یہ نمبر ذہن میں محفوظ کئے اور گفتگو جاری رکھتے ہوئے پوچھا کہ ”آپ کیا ٹریننگ ختم کر کے اپنے رجمنٹل سینٹر میں جائیں گے یا چھٹی پر گھر جائیں گے“ جواب آیا کہ ”پہلے رجمنٹل سینٹر میں جائیں گے اور پھر وہاں سے جہاں رجمنٹ Deploy ہوگی“۔

میں نے کہا کہ ”سردار جی میں چائے کا کاروباری آدمی ہوں۔ مجھے آپ کی بات سمجھ میں نہیں آئی“۔ میں خود کو بھی نشے میں چور ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تا کہ میرا کوئی سوال انہیں شک میں نہ ڈال دے۔ اسی سکھ نے کہا ”بھولے بادشاہو، ہر انفنٹری ڈویژن کے ساتھ ایک یا دو ٹینک رجمنٹس ہوتی ہیں۔ جس انفنٹری ڈویژن کے ساتھ ہماری رجمنٹ منسلک ہے وہ فاضلکا ہیڈ ورکس کے قریب ہے“۔ اس نے مزید سمجھاتے ہوئے کہا کہ ”آرٹلری والے پہلے ہمارا راستہ صاف کرتے ہیں اور پھر کبھی ہم ٹینک والے آگے اور انفنٹری پیچھے اور کبھی انفنٹری والے آگے اور ہم پیچھے، یوں دشمن کی صفوں میں گھس جاتے ہیں“۔

یوں میں نے باقی تینوں سے بھی خاصی اچھی معلومات حاصل کیں کہ T-57 کے علاوہ اسی سیریز کے جدید روسی ٹینک اور فرانسیسی AMX-13 اور P.T-76 ٹینک بھی مغربی پاکستان کے بارڈر پر متعین انفنٹری ڈویژنز کے ساتھ منسلک ہیں۔ جو تفصیلات میں نے حاصل کیں۔ وہ بوجوہ میں یہاں بیان نہیں کر سکتا۔ بہر حال بہت کارآمد معلومات حاصل ہوئیں۔ میں نے ان کے کھانے کا آرڈر دیا اور رات ساڑھے گیارہ بجے ہم اگلے روز پھر ملنے کا وعدہ کر کے اپنی اپنی راہ پر چل دیئے۔ میں نے ہوٹل پہنچ کر ان سب اہم اطلاعات کو اپنے کوڈ میں درج کر لیا۔ یہ میری پہلی کامیابی تھی اور میں بہت خوش تھا۔ اگلی شام مزید معلومات حاصل کرنے کا پروگرام بنا کے سو گیا۔ میں چاہتا تھا کہ اپنی پہلی مفصل رپورٹ ایسی بھیجوں کہ میرے سینئرز خوشی سے اچھل پڑیں۔

اگلی صبح میں نے جب گزشتہ رات کی معلومات کا دوبارہ جائزہ لیا تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ یہ کامیابی بہت معمولی تھی۔ میں اب تک صرف 3 ٹینک رجمنٹوں کے متعلق جان سکا تھا۔ اول تو مجھے ان شرابی سکھوں سے حاصل شدہ معلومات کا موازنہ کرنا تھا تا کہ میری رپورٹ شک و شبہ سے بالاتر ہو اور اس کے علاوہ سب سے اہم بات یہ تھی کہ مجھے نہ صرف ان رجمنٹوں کے متعلق معلومات حاصل کرنی تھیں جو 71ء کی جنگ کے بعد یہاں سے ٹریننگ حاصل کر کے جا چکی تھیں بلکہ ان تین رجمنٹوں کے علاوہ وہاں جو دوسری رجمنٹس ٹریننگ لے رہی تھیں، ان کے متعلق بھی مکمل جانکاری حاصل کرنی تھی۔ جب میں نے اپنے پورے مشن کا جائزہ لیا تو یہ معلومات بہت معمولی محسوس ہوئیں۔

احمد نگر میں زیر تربیت رجمنٹس صرف تین ماہ میں ٹریننگ مکمل کر کے واپس چلی جاتی تھیں۔ ان کی واپسی سے پہلے ہی نئی رجمنٹس کے جوان وہاں پہنچ جاتے تھے اور یہ سلسلہ 71ء کی جنگ کے بعد مسلسل جاری تھا۔ اس سلسلے کی کڑیاں شروع سے ملا کر ایک مفصل رپورٹ تیار کرنی تھی۔

بریگیڈ ہیڈکوارٹر جو اس ٹریننگ کا ذمہ دار تھا، اس کے دفتر میں یا ڈویژن ہیڈکوارٹر میں یقیناً کوئی ایسی فائل ہونی چاہئے تھی جس سے مجھے تمام معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ احمد نگر ایک طرح سے Transit Camp کی طرح تھا اور وہاں آنے والوں کی فائل یا معلومات مجھے اول دونوں ہیڈکوارٹرز کے دفاتر سے، دوئم کیمپ کمانڈنٹ کے دفتر سے اور سوم لنگر سے ملنے کی امید تھی۔ میں نے ان تینوں ذرائع میں سے کیمپ کمانڈنٹ کے دفتر کا انتخاب کیا کیونکہ ڈویژن اور بریگیڈ ہیڈکوارٹر میں بیسیوں دیگر کام ہوتے ہیں جبکہ کیمپ کمانڈنٹ صرف وہاں آنے والوں کی رہائش، آمد، واپسی اور خوراک کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ میرے تجزیئے کے مطابق مجھے اس دفتر سے معلومات سے بھری ایک مکمل فائل ملنے کی امید تھی۔

غازی

کیمپ کمانڈنٹ کے دفتر تک رسائی کیلئے میں نے ADOS کے کلرک کا انتخاب کیا۔ جب ایک بار فیصلہ کرلیا تو فوراً ہی تیار ہوکر ADOS کے دفتر کی طرف روانہ ہوگیا۔ سیکورٹی اور چیکنگ کے مرحلے سے گزر کر میں اس کلرک بادشاہ کے پاس جا پہنچا۔ گزشتہ رات نہ ملنے کا عذر یہ کیا کہ طبیعت ناساز تھی۔ ADOS کے دفتر میں چونکہ مقامی ٹھیکیدار ٹینڈر دینے، سپلائی اور رقم کی وصولی کیلئے اکثر آتے رہتے ہیں اور کلرک صاحبان سے دوسرے ٹینڈر دینے والوں کے متعلق معلومات حاصل کرتے ہیں، اس لئے یہ دفتر غیر فوجی افراد سے بھرا رہتا ہے۔ مجھ پر بھی کوئی شک نہیں کرسکتا تھا۔ چونکہ میں ظاہراً چائے کی فروخت کیلئے وہاں آیا تھا، لہٰذا متعلقہ کلرک سے دفتر کی اوقات میں ملنے اور رابطہ بڑھانے میں مجھے کوئی خطرہ محسوس نہ ہوا۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ میں موقع کی تلاش میں تھا اور جلد ہی مجھے وہ موقع مل گیا، جب کھانے کے وقفے میں وہ مجھے کینٹین لے گیا۔ وہاں ہم ایک الگ تھلگ ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ میں نے اسے کہا کہ میں تم سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا تھا۔ میں اپنی چائے یہاں بیچنے آیا ہوں اور ہرگز مایوس واپس نہیں جانا چاہتا۔ تم نے مجھ سے پہلی ملاقات میں کہا تھا کہ بغیر روابط بڑھائے اور افسران کو خوش کئے کام نہیں ہوسکتا۔ مجھے کھل کر بتاؤ کہ یہاں کن کن کو خوش کرنا پڑے گا۔ وہ کہنے لگا کہ آپ یہ تو جانتے ہی ہوں گے کہ جہاں ایک ہی چیز کی سپلائی کرنے والے کئی ہوں گے تو پھر وہاں افسران کی خوشنودی تو حاصل کرنا ہی ہوتی ہے یہاں پر ADOS اور DADOS کے علاوہ لنگر انچارج اور...... میں نے فوراً ہی لقمہ دیا کہ کیمپ کمانڈنٹ کو بھی خوش کرنا ہوگا۔ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے اسے کہا کہ یہ سب میں تمہارے ذمہ لگاتا ہوں کہ مجھے لنگر انچارج اور کیمپ کمانڈنٹ سے ملوا دو۔ اگر میں اپنی چائے یہاں فروخت کرنے میں کامیاب ہوگیا تو اس کا سہرا تمہارے سر ہوگا اور تم بھی بہت فائدے میں رہو گے۔ یہ کہتے کہتے میں نے دو ہزار روپے چپکے سے اس کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ وہ پہلے تو انکار کرتا رہا لیکن اس کا انکار محض رسمی تھا۔ میں نے ذرا زور دیا تو اس نے وہ روپے جیب میں ڈال لئے۔ میں نے اسے کہا کہ یہ محض پیشگی ہے، تم میرا کام کرو اور میں تمہیں مستقل خوش کرتا رہوں گا۔ اس نے مجھ سے سوال کیا کہ آپ کے کہنے کے مطابق آپ کی چائے کی کوالٹی بہت اعلیٰ ہے اور قیمت کم ہے۔ اگر آپ کو چائے کی سپلائی کا آرڈر مل جائے تو آپ کو سپلائی برقرار رکھنے کیلئے لوگوں کو ہر 3 ماہ بعد خوش کرنا پڑے گا۔ اس طرح تو آپ کا منافع نقصان میں بدل جائے گا۔ میں ہنس پڑا اور کہا کہ یہ کاروباری راز ہے لیکن میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں آہستہ آہستہ اپنی چائے کی کوالٹی کم کرتا جاؤں گا اور غیر محسوس انداز میں یہ نقصان نفع میں بدل جائے گا۔ میں نے اسے کہا کہ میں ایک بڑے کاروباری خاندان یعنی چوپڑا فیملی سے ہوں اور ہمیں سمجھایا گیا ہے کہ ہر کام میں فوری منافع کا نہ سوچو بلکہ اگر شروع میں کچھ نقصان بھی اٹھانا پڑے تو اٹھاؤ کیونکہ یہی نقصان بعد میں بڑے منافع میں بدل جاتا ہے۔ غرضیکہ میں نے اسے اس طرح ذہنی طور پر اپنے قابو میں کیا کہ اس نے مجھے اسی وقت لنگر کے انچارج اور کیمپ کمانڈنٹ سے ملوانے کی حامی بھری اور مجھے لنگر کی طرف لے گیا۔

لنگر انچارج اس وقت فوجیوں میں کھانے کی تقسیم کا جائزہ لے رہا تھا اور خاصا مصروف تھا۔ کلرک نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ صوبیدار تھا اور خاصا پرانا گھاگ دکھائی دیتا تھا۔ میرا تعارف کروانے کے بعد کلرک نے اسے کہا کہ ان کی چائے آپ کے پاس آئے گی۔ اسے پاس کرنا آپ کا کام ہے۔ یہ میرے دوست ہیں اور ان کا کام ہونا چاہئے۔ یہ آپ کی سیوا کریں گے۔ لنگر انچارج نے میرا جائزہ لیا اور کہا کہ صاحب مال ٹھیک ہو تو ہم کیوں ان فٹ کریں گے۔ ساتھ ہی اس نے کلرک سے کہا کہ وہ مجھے شام کو اس کے کوارٹر میں لے آئے۔ وہ مع فیملی وہاں رہتا تھا۔ میں نے حامی بھر لی اور پھر ہم کیمپ کمانڈنٹ کے دفتر کی طرف چل پڑے۔

کیمپ کمانڈنٹ کا دفتر کوارٹر گارڈ سے منسلک تھا۔ کیمپ کمانڈنٹ ایک فل کرنل تھا اور اس وقت کھانے کے وقفے میں میس گیا ہوا تھا۔ اس کے دفتر میں تقریباً سارے کلرک میرے ہمراہی کلرک کے خاصے جاننے والے تھے۔ ان کی بے تکلفی دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ اندر ہی اندر ADOS کے دفتر سے لے کر لنگر اور کیمپ کمانڈنٹ تک ایک زنجیر بنی ہوئی ہے اور یہ سب مل بانٹ کر کھاتے ہیں۔ کیمپ میں ٹریننگ کیلئے فوجی جوان صرف تین ماہ کیلئے آتے ہیں۔ اس لئے ان کی خوراک، صابن اور تمام وہ اشیا جوان کو مفت مہیا کی جاتی ہیں، ان کی کوالٹی میں ہیر پھیر کرکے اور ٹھیکیداروں سے ملی بھگت کرکے زیادہ قیمت کے ٹینڈر منظور کئے جاتے ہیں، اسی لئے ان تینوں دفاتر کے کلرک آپس میں خاصے بے تکلف تھے۔

تمام حالات کا مکمل جائزہ لینے کے بعد میں ADOS کلرک کے ہمراہ واپس لوٹ آیا۔ شام کو مجھے لنگر انچارج کے گھر جانا تھا۔ ADOS کے کلرک کو اب میں آئندہ شیام لکھوں گا۔ شیام نے واپس آتے ہوئے مجھے کہا کہ لنگر انچارج کو خوش کرنے کے لئے مناسب رقم ہمراہ لے آؤں۔ شام 6 بجے کے قریب میں ہوٹل سے چھاؤنی کی طرف پھر روانہ ہوا۔ شیام مقررہ جگہ پر میرا منتظر تھا۔ ہم دونوں لنگر انچارج کے گھر 7 بجے پہنچ گئے۔

لنگر انچارج فیملی کوارٹرز میں رہتا تھا۔ اس نے ہمیں ایک کمرے میں بٹھایا، رسمی گفتگو اور خاطر تواضع کے بعد اس نے خود چائے کی بات چھیڑی اور اپنی اہمیت جتانے کیلئے کہنے لگا کہ اگر میں چائے کو پاس نہ کروں تو ADOS والے کچھ نہیں کرسکتے۔ آخر مجھے بارہ تیرہ سو افراد کو خوراک کے معاملے میں مطمئن کرنا ہوتا ہے۔

صوبیدار بنتے بنتے ایک فوجی کو بائیس تیئس سال لگ جاتے ہیں اور وہ ریٹائرمنٹ کے قریب ہوتا ہے۔ بھارتی فوج میں ایسا صوبیدار اگر کسی "پیدا" کرنے کی جگہ پر لگ جائے تو پھر بہت ہی کم ایسے ہوتے ہیں جو اپنے ہاتھ صاف رکھتے ہیں۔ صوبیدار نے صاف الفاظ میں کہا کہ آپ کی چائے میں نا صرف پاس کروں گا بلکہ تعریف بھی کروں گا لیکن تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ صوبیدار کو "راہ راست" پر لانے کا میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے خود میری مشکل آسان کردی۔ اس نے کہا کہ صرف جوانوں اور NCO's کیلئے روزانہ 4 ہزار سے زائد بڑے کپ کی چائے بنتی ہے۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوسکتا ہے کہ آپ کی کتنی چائے ہم استعمال کریں گے۔ چائے کی منظوری کے دوسرے مرحلے میں آپ خود طے کریں گے کہ جس تاریخ سے آپ کی چائے لنگر میں استعمال ہونی شروع ہوگی۔ میں 5 ہزار روپیہ ماہوار آپ سے لوں گا۔ میں نے منظور کرلیا اور پیشگی اسے دو ہزار روپے دیئے اور تھوڑی دیر بعد ہم اس کے گھر سے لوٹ آئے۔ شیام نے مجھے رات کو 8 بجے شراب خانے میں ملنے کا کہا۔ اب 8 بجنے میں وقت ہی کتنا رہ گیا تھا۔ میں نے ہوٹل جانے کا ارادہ ترک کیا اور شراب خانے میں پہنچ گیا۔

شیام نے جس طرح مجھے خرچ کرتے اور پیسے لٹاتے دیکھا تھا اس سے وہ مجھے ایک موٹا شکار سمجھ بیٹھا تھا اور جلد از جلد اپنی موجودگی میں مجھے کیمپ کمانڈنٹ کے دفتر کے کلرکوں سے ملوانا چاہتا تھا۔ تاکہ میری کوئی Deal اس کی غیر موجودگی میں نہ ہو۔ رات 8 بجے وہ دو فوجیوں کو اپنے ہمراہ لایا اور مجھے بتایا کہ وہ کیمپ کمانڈنٹ کے دفتر میں کام کرتے ہیں۔ وہ شام ہم نے کچھ گپ شپ اور کچھ کام کی باتوں میں گزاری۔ مجھے کچھ یونہی شک سا پڑ گیا کہ شیام اتنی جلدی کیسے سب سے ملوا رہا ہے اگرچہ ان دونوں فوجیوں کو میں دوپہر کو کیمپ کمانڈنٹ کے دفتر میں دیکھ چکا تھا لیکن پھر بھی اپنی تسلی کے لئے میں نے کام کی بات کو اس شام زیادہ آگے نہ بڑھایا اور کہا کہ کل میں شیام کے دفتر میں آؤں گا اور اس کے ہمراہ کیمپ کمانڈنٹ کے دفتر میں ان سے ملوں گا۔ جب وہ مے نوشی کررہے تھے تو میں ان کے چہروں سے ان کے دلی جذبات کا اندازہ لگا رہا تھا۔ شراب کے نشے میں انسان اندر کی بات بھی زبان پر لے آتا ہے اور اس کا چہرہ اس کے دلی جذبات کی عکاسی بھی کرتا ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ شیام اور ایک فوجی تو شراب پی کر خوب ہنس بول رہے تھے جبکہ دوسرا فوجی بار بار گہری سوچ میں غرق ہو جاتا تھا۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوا اور کہا کہ کیا بات ہے یار۔ بیوی یاد آرہی ہے جو یوں خاموش بیٹھے ہو۔ وہ کھسیانی سی ہنسی ہنس کر چپ ہوگیا۔ میں نے دو تین بار اسے ٹٹولنے کی کوشش کی لیکن وہ دل کی بات زبان پر نہ لایا اور نہ ہی اس کی خاموشی اور سوچ میں ڈوبنے میں فرق آیا۔

شراب خانے میں کوئی ٹائلٹ وغیرہ نہیں تھا۔ میں نے چھوٹی انگلی کا اشارہ دے کر اپنی حاجت کا اظہار کیا۔ شیام نے کہا کہ باہر سڑک کی دوسری جانب۔ میں نے اس سوچ میں ڈوبے فوجی کا ہاتھ تھاما اور کہا کہ میرے ہمراہ چلیے، وہ میرے ساتھ باہر آگیا۔ سڑک کی دوسری جانب میں نے فارغ ہوکر اسے کہا کہ تم ایسے ماحول میں جہاں انسان سب غموں سے آزاد ہو جاتا ہے، یوں غمگین بیٹھے ہو۔ پریشانیاں مجھے بھی ڈھیر ساری ہیں لیکن ہر پریشانی کا کوئی نہ کوئی حل نکل آتا ہے۔ اگر تم چاہو تو میں تمہاری ہر ممکن مدد کرنے کو تیار ہوں اور اگر چل سکتے ہو تو یہاں سے واپسی پر میرے ہمراہ ہوٹل چلو۔ وہاں سکون سے باتیں کریں گے۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر بولا کہ صاحب آپ پہلی بار ملے ہیں اور میری پریشانی کو بھانپ گئے ہیں اور یہاں میرے ساتھی جو سارا وقت میرے ساتھ رہتے ہیں انہوں نے کبھی بھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ کیا بات ہے۔ آپ میں مجھے ایک ہمدرد انسان کا دل دکھائی دیتا ہے۔ میں واپسی پر آپ کے ہمراہ ہوٹل چلنے کو تیار ہوں۔ شراب خانے سے میں آدھے گھنٹے بعد اٹھ جاؤں گا اور آپ کے ہوٹل میں سویلین لباس میں پہنچ جاؤں گا۔ آپ بھی میرے آنے کے بعد جلد آنے کی کوشش کیجئے گا۔ میں نے اسے دلاسہ دیا اور ہم واپس آگئے۔ میں نے اس کے گلاس میں زیادہ شراب انڈیلی تاکہ وہ اور زیادہ نشے میں ہو جائے۔ کچھ دیر بعد اس نے سر درد کی شکایت کی اور سب سے معذرت کرکے باہر چلا گیا۔ ہمارے ٹیبل پر محفل اس وقت شباب پر تھی۔ دوسروں نے اس کے جانے کا خاص نوٹس نہ لیا۔ قریب ساڑھے گیارہ بجے ہماری محفل برخواست ہوئی۔ مجھے یقین تھا کہ میری طرح شیام اور اس کا ساتھی بھی مستقبل کے سنہرے خیالوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔

یہاں میں ایک مختصر سی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ سوائے بنگال اور مدراس کے دور دراز دیہاتوں کے جہاں مقامی زبان بولی جاتی ہے، سارے بھارت کے شہروں اور افواج میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ اردو ہے جس میں بمشکل تیس چالیس الفاظ سنسکرت کے شامل کئے گئے ہیں۔ ٹھیٹھ اور کڑک سنسکرت صرف سیاسی جلسوں میں استعمال ہوتی ہے۔ سارے بھارت کی عوامی زبان وہی ہے جو بھارتی فلموں اور گانوں میں استعمال ہوتی ہے۔ یہ تیس چالیس سنسکرتی لفظ یاد کرکے اور انہیں صحیح جگہ پر استعمال کرکے بلا شک وشبہ آپ ہندی زبان بخوبی جاننے والے کہلا سکتے ہیں۔ دوران تربیت مجھے ساٹھ سے زیادہ ایسے الفاظ اور ان کا صحیح استعمال بخوبی ازبر کرائے گئے تھے۔

میں شراب خانے سے نکل کر رکشے پر بیٹھا اور ہوٹل کی راہ لی۔ وہ کلرک جس کا نام اشوک سنہا تھا، ہوٹل کی لابی میں میرا منتظر تھا۔ میں اسے ہمراہ لے کر اپنے کمرے میں آگیا اور شراب خانے سے ہمراہ لائی ہوئی بوتل کھولی اور اسے ایک پیگ بنا کر دیا۔ میں نے اسے کہا کہ اگر انسان انسان کے کام نہ آئے گا تو کیا جانور اور پرندے کام آئیں گے۔ میں نے اسے کہا کہ میں بالکل اکیلا ہوں۔ اپنی ضرورت سے زیادہ آمدنی ہے۔ بمبئی میں رہائش ہے۔ کاروبار بڑھانے کیلئے یہاں آیا ہوں۔ پنجابی ہوں اور ذات پات پر یقین نہیں رکھتا۔ انسان دوست ہوں۔ تمہیں پریشان دیکھ کر رہ نہ سکا اور تمہیں یہاں بلا لیا۔ اب صاف صاف بتاؤ کس بات نے تمہیں پریشان کر رکھا ہے جو کچھ میرے بس میں ہوا، میں تمہارے لئے کروں گا۔

شراب کے نشے میں اشوک ضبط کے سب بندھن توڑ بیٹھا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ زیادہ نہ روئے کیونکہ دکھ میں رونے سے نہ صرف سکون ملتا ہے بلکہ ڈھارس بھی ملتی ہے۔ میں اشوک کے بہت قریب بیٹھ گیا اور کہا کہ مرد رویا نہیں کرتے اور تم مرد بھی ہو اور فوجی بھی ہو۔ تمہیں تو ہرگز رونا نہیں چاہئے بلکہ اپنی پریشانی کو دور کرنے کی تدبیر کرنی چاہئے اور پھر میرا وعدہ ہے کہ تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔

میں نے اسے تسلی دی تو وہ بولا، صاحب میرے پتا سورگ باش ہو چکے ہیں۔ میری تین بہنیں ہیں اور کسی کی بھی شادی صرف اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ میری آمدنی اس قدر نہیں کہ جہیز دے سکوں۔ سب سے بڑی بہن کی ایک جگہ سگائی ہوئے دو سال ہو چکے ہیں لیکن محض جہیز نہ ہونے کی وجہ سے پھیرے نہیں ہو پائے۔ اب لڑکے والوں نے سگائی توڑنے کی دھمکی دی ہے۔ ماتا جی اس غم میں گھل گھل کر بیمار ہو چکی ہیں۔ میں نے ہر طرح سے کوشش کرکے دیکھ لیا ہے لیکن کہیں سے رقم کا انتظام نہیں ہوا۔ میں ہر مشکل سے مشکل کام کرنے کو تیار ہوں لیکن اپنی بہن کی سگائی ٹوٹتے نہیں دیکھ سکتا۔

اس کی دکھ بھری کہانی برصغیر کے اسی فیصد گھرانوں کی داستان تھی۔ لاکھوں لڑکیاں جہیز نہ ہونے کی وجہ سے شادی کی عمر کو عبور کرکے بوڑھی ہو چکی ہیں۔ والدین کی مجبوری کو لڑکے والے سننا بھی پسند نہیں کرتے اور لڑکے کا باقاعدہ بھاؤ تاؤ کرکے اسے بیاہتے ہیں اور جن لڑکی والوں کے پاس دینے کو کچھ نہیں ہوتا ان کی بیٹیاں یا تو جھوٹی آس لگائے بوڑھی ہو جاتی ہیں یا جو ذرا ماڈرن ذہن رکھتی ہیں وہ گھر سے بھاگ جاتی ہیں اور ان کا انجام بالآخر قحبہ خانے میں ہوتا ہے۔

میں نے اشوک سے پوچھا کہ اسے کتنی رقم کی ضرورت ہے۔ اس نے کہا کہ بڑی بہن کی شادی کے لئے اسے پچیس ہزار روپے مل جائیں تو وہ بآسانی اپنی بہن کی شادی کرسکتا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ اگر اسے 25 ہزار مل بھی جائیں تو وہ صرف ایک بہن کی ذمہ داری سے عہدہ برا ہوسکتا ہے۔ دوسری دو بہنوں کی تو ذمہ داری باقی رہے گی۔ میں نے اسے کہا کہ میں تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں۔ مجھے بھی ایک مخلص دوست کی تلاش ہے اور شاید تم ہی وہ دوست ثابت ہوگے۔ بہرحال فکر نہ کرو۔ میں تمہاری اس مجبوری میں تمہارا پورا ساتھ دوں گا۔ میں نے اسے کہا کہ بمبئی میں ہم نے ایک کلب بنایا ہوا ہے۔ جس کے ممبر صرف غیر شادی شدہ مرد اور عورت ہی بن سکتے ہیں۔ اس کلب میں ہم ہر طبقے کے لوگوں کو ممبر بناتے ہیں، ان کیلئے نا صرف موزوں رشتے تلاش کرتے ہیں بلکہ شادی کے وقت بھرپور مالی اعانت بھی کرتے ہیں میں تمہاری بڑی بہن کی شادی کیلئے اپنی طرف سے اور کلب کی طرف سے پورے 25 ہزار کا بندوبست کروں گا بلکہ تمہاری دوسری دو بہنوں کیلئے بھی کلب کی مدد سے موزوں رشتے تلاش کروں گا۔ میں نے اسے خاصی تسلی دی۔ اور پھر اچانک جیسے کچھ یاد آگیا ہو میں نے اسے کہا کہ بہت سارے فوجی بھی ہمارے کلب کے ممبر ہیں اور ان ممبروں میں جہاں تک مجھے یاد ہے ٹینک رجمنٹوں کے کچھ جوان اور افسران بھی شامل ہیں۔ پھر یادداشت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ جہاں تک مجھے یاد ہے، ٹینک کی ہی کسی رجمنٹ کا ایک جوان جو ہمارا ممبر تھا وہ یہاں ٹریننگ حاصل کرنے آیا تھا اس کی ایک بہن کی شادی بھی اسی وجہ سے رکی ہوئی تھی۔ وہ غالباً پنجاب کے علاقے کا تھا اور ہمارے کلب کی دہلی کی شاخ سے ممبر بنا تھا۔ اس کی بہن کی شادی بھی ہمارے کلب کی مالی اعانت سے ہوئی تھی۔ کلب کے قواعد وضوابط کے مطابق اسے کلب سے حاصل شدہ رقم نہایت معمولی اقساط میں واپس کرنی تھی۔ دو تین اقساط کی ادائیگی کے بعد پھر اس نے رابطہ نہیں کیا۔ میں نے ماتھے پر مارتے ہوئے کہا کہ اس کا نام اور رجمنٹ ذہن سے نکل گئی ہے۔ لیکن اس کا نام سامنے آتے ہی فوراً پہچان لوں گا اور اس سے رابطہ کرکے اس سے بقایا اقساط کی ادائیگی کا تقاضہ کروں گا۔ میں نے اسے کہا کہ مالی اعانت حاصل کرنے والے اگر اقساط کی ادائیگی بھی بند کریں تو اس نیک مقصد کیلئے قائم کلب آخر کیسے چل سکتا ہے میں نے دوبارہ کہا کہ اگر نام اور رجمنٹ کی لسٹ سامنے ہو تو فوراً اسے پہچان لوں گا۔

اشوک کو اپنی مشکل حل ہوتی ہوئی سامنے نظر آرہی تھی اور اس کیلئے اسے میری خوشنودی کی ضرورت تھی۔ اس نے کہا صاحب آپ کی بڑی مہربانی کہ آپ نے اس مشکل وقت میں میرا ساتھ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ یہ ہے تو خلاف ضابطہ اور پکڑے جانے پر قانون کے مطابق میرا کورٹ مارشل بھی ہوسکتا ہے لیکن میں پھر بھی مکمل فائل جو کہ میرے دفتر کے ایک کلرک کے پاس ہے، کسی طرح حاصل کرکے کل رات آپ کو ہوٹل میں لا دوں گا اور آپ اس سے اپنے مطلوبہ شخص کو تلاش کر لیجئے گا۔ اگلی صبح دفتر کے وقت سے پہلے میں وہ فائل آپ سے واپس لے جاؤں گا اور آپ اس کا ذکر کسی سے بھی نہ کیجئے گا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے اسے رخصت کرتے وقت ایک ہزار روپیہ اس کی جیب میں ڈال دیا۔

اس فائل کا حصول میرے لئے کسی JACK POT سے کم نہ تھا اور اشوک کو میں نے اپنے مکمل قابو میں کرلیا تھا۔

دوسری طرف میں ADOS کے دفتر میں گیا اور ADOS سے ملا۔ لیفٹیننٹ کرنل گپتا ADOS تھا۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے یہاں آئے ہوئے کئی روز ہو چکے ہیں اور میری چائے کے سمپل ابھی تک آپ کے دفتر میں ہی پڑے ہیں۔ میں بمبئی کی پررونق زندگی سے دور یہاں ہوٹل میں ایک طرح سے مقید ہو چکا ہوں اور بہت بور ہو رہا ہوں۔ اس لئے آپ میرے سمپل متعلقہ لوگوں تک بھجوائیں تاکہ جلد کچھ فیصلہ ہو سکے۔

غازی

ADOS سے میری ساری گفتگو انگلش میں ہوئی تھی ۔ وہ میری شخصیت ،لباس اور ٹپی تلی انگریزی سے متاثر ہوا یا اس کے پیش نظر بھی ''چمک'' تھی ۔ اس نے میرے سامنے اپنے دفتر کے ایک کلرک کو میرے سیمپل لنگر بھجوانے کا آرڈر دیا اور پھر مجھے کہا کہ یہ محض ایک رسمی کارروائی ہے کہ سیمپل لنگر میں استعمال کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔ میں بغیر لنگر میں بھیجے بھی فیصلہ کرسکتا ہوں اور جہاں تک تمہاری بوریت کا سوال ہے تو کل شام تم میرے مہمان ہو گے اور میں تمہیں اپنے ہمراہ آفیسرز میس میں لے چلوں گا۔

میں نے کرنل گپتا کا شکریہ ادا کیا اور اس سے اجازت لے کر اس کے دفتر میں کلرکوں کے پاس آ گیا ۔شیام سے کچھ دیر گپ شپ کی ۔ اس نے بتایا کہ گپتا نے آپ کے سیمپل لنگر میں بھجوانے کا آرڈر کیا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ میں ابھی سے مل کر آرہا ہوں ۔ اب چونکہ ہمیں جلد کام کرنا ہے اس لئے کیمپ کمانڈنٹ کے دفتر تک مجھے لے چلو ۔وہاں جانے کا عذر میں نے یہ بتایا کہ چونکہ سیمپل لنگر میں جا رہے ہیں تو شاید آج یا کل وہاں استعمال کئے جائیں۔ کیمپ میں رہنے والے لنگر کے متعلق کوئی شکایت بھی ڈائریکٹ لنگر میں نہیں کر سکتے بلکہ اپنے سینئر کے ذریعے کمانڈنٹ سے کر سکتے ہیں اور کیمپ کمانڈنٹ کا دفتر اس شکایت کی چھان بین کرتا ہے ۔ یہ فوجی ڈسپلن کا لازمی حصہ ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد شیام مجھے لے کر کیمپ کمانڈنٹ کے دفتر میں چلا آیا ۔ میں اشوک سے ملنا چاہتا تھا۔ اشوک نے مجھے دیکھا ۔ اس کے چہرے پر ایک اطمینان مجھے نظر آیا ۔ اس نے آنکھوں آنکھوں میں ہی مجھے بتا دیا کہ کام ہو گیا ہے ۔ وہاں رسمی بات چیت ہی ہوئی ۔ شیام نے ایک دوسرے کلرک کو کہا کہ ان کے سیمپل لنگر میں آج بھجوائے جا رہے ہیں اگر کوئی شکایت وہاں سے آئی تو مجھے بتا دینا ۔ یہ دوسرا کلرک وہی تھا جو گزشتہ رات شیام اور اشوک کے ہمراہ آیا تھا۔ وہاں سے ہم جب واپس لوٹنے لگے تو کیمپ کمانڈنٹ سے اچانک آمنا سامنا ہو گیا۔

شیام نے اسے سیلوٹ کیا ۔میری طرف اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو میں نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف کروایا ۔ اپنے احمد نگر آنے کی وجہ بتائی اور کہا میری چائے کے سیمپل آج لنگر میں بھیجے جائیں گے ۔ ہم دونوں انگریزی میں بات کر رہے تھے ۔ کالروں پر سرخ پٹی لگائے اور کیمپ کمانڈنٹ کی پوسٹ پر متعین اکڑا ہوا فل کرنل مجھے ایک معمولی کلرک کے ہمراہ دیکھ کر خوش نہ ہوا اور کہا کہ اگر آپ مجھ سے ملنے آئے ہوئے ہیں تو میرے دفتر میں آ جائیں ۔ میں نے شیام کو اشارہ کیا اور کرنل کے پیچھے ہی اس کے دفتر میں داخل ہو گیا۔

بہت سجا سجایا دفتر تھا ۔ کرنل نے مجھے بیٹھنے کو کہا ۔ میں چاہتا تھا کہ کرنل کو بھی متاثر کرلوں ۔ INITIALS کے ساتھ اس کا نام ملہوترا تھا ۔ میں نے اسے کہا کہ کرنل صاحب میں دو مرتبہ آپ سے ملنے یہاں تک آ چکا ہوں ۔ لیکن آپ دفتر میں موجود نہ تھے ۔ میری چائے ٹیسٹ کیلئے ADOS کے آفس سے لنگر تک پہنچ چکی ہے ۔ اصولاً مجھے پہلے آپ سے ملنا چاہئے تھا کیونکہ سارے کیمپ اور اس میں رہنے والے آفیسرز اور جوانوں کے آپ انچارج ہیں اور ان کی مکمل دیکھ بھال آپ کے ذمہ ہے ۔ آپ کے دفتر تک آنے کے لئے میں نے ADOS کے ایک کلرک کو ہمراہ لے لیا تھا کیونکہ مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ کے دفتر میں آنے اور آپ سے ملنے کیلئے درخواست دینی پڑتی ہے چونکہ میں یہاں ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں اور زیادہ دن یہاں نہیں رہ سکتا اس لئے یہ شارٹ کٹ استعمال کیا ۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنا بزنس کارڈ کرنل کو پیش کیا ۔ موسم ابھی خاصا گرم تھا ۔ کیمپ کے راؤنڈ کی گرمی کمرے میں لگے ایئر کنڈیشنڈ نے کم کر دی تھی ۔ کرنل بھی ٹھنڈا ہو چکا تھا ۔ بغیر وقت طے کئے آنے کی جب میں نے دوبارہ معذرت کی تو کرنل بالکل ٹھنڈا پڑ چکا تھا ۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں چائے پیئوں گا یا کافی ۔ میں نے کہا چائے بشرطیکہ آپ میری چائے کے سیمپل سے چائے بنوائیں ۔ میرے بریف کیس میں دو سیمپل کے پیکٹ پڑے تھے ۔ وہ دونوں نکال کے میں نے میز پر رکھ دیئے ۔ کرنل نے اپنے بیٹ مین کو بلایا اور اسے میری دی ہوئی چائے بنانے کو کہا۔

تھوڑی ہی دیر میں چائے بن کر آ گئی ۔ کرنل نے چائے کا گھونٹ لیا تو پوچھا کہ اس کے دام کیا ہیں ۔ میں نے قیمت بتا دی ۔ چائے کا کپ ختم کرتے ہی اس نے انٹرنل فون پر لنگر انچارج کو فون کیا اور کہا کہ آج جو چائے تمہارے پاس آ رہی ہے وہ میں نے پی ہے اور مجھے بہت پسند آئی ہے ۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا ۔ چند لمحے ادھر ادھر کی بات کی ۔ پھر میں نے اس سے اجازت چاہی اور چلتے چلتے کہا کہ کل میں کرنل گپتا کے ہمراہ آفیسرز میس میں آ رہا ہوں ۔ امید ہے وہاں آپ سے ملاقات ہو گی ۔ کرنل ملہوترا نے اثبات میں سر ہلایا اور مسکراتے ہوئے کہا ۔ YOUNGMAN YOU LOOK LIKE AN OFFICER SO TRY TO REMAIN AMONG OFFICERS. میں نے دوبارہ اس کا شکریہ ادا کیا ۔ کرنل نے اچانک کچھ سوچا اور مجھے کہا کہ میری ٹرانسپورٹ تمہیں ہوٹل تک چھوڑ آئے گی ۔ 10 منٹ کے اندر ایک جیپ دفتر کے سامنے آن رکی جس پر میں اپنے ہوٹل آ گیا۔

کرنل ملہوترا اور کرنل گپتا کو کیا معلوم کہ جو کام ان کے دفاتر کے کلرک میرے لئے کر رہے تھے وہ کسی صورت بھی افسروں کے درمیان رہنے سے نہیں ہو سکتے تھے ۔ ہوٹل آ کر میں نے کھانا کھایا اور رات کو اشوک سے ملنے والی فائل کے خیالوں میں گم ہو گیا۔

شام 7 بجے کے قریب اشوک نے استقبالیہ سے مجھے فون کیا ۔ میں نے اسے کمرے میں آنے کو کہا ۔ وہ سویلین لباس میں تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک ہینڈ بیگ تھا ۔ میں نے گزشتہ رات کی بچی ہوئی شراب اس کے سامنے رکھی ۔ وہ گھبرایا ہوا سا تھا ۔ اس نے بغیر پانی ملائے شراب کا آدھا گلاس چڑھا لیا ۔ ہینڈ بیگ کھول کر اس نے دو فائلیں نکال کر مجھے دیں اور کہا کہ ایک فائل میں گزشتہ 8 ماہ میں آنے والی رجمنٹوں اور ٹریننگ کے بعد ان کے واپس جانے کی تفصیل موجود ہے اور دوسری فائل میں ہر رجمنٹ کے ٹریننگ لینے والے جوانوں اور افسران کے نام درج ہیں ۔ اس نے میری آنکھوں میں گہرائی تک جھانکتے ہوئے کہا کہ ''ان دو فائلوں سے جو معلومات (معلومات پر اس نے خاصا زور دے کر کہا) بھی چاہئیں، حاصل کر سکتے ہیں'' ۔ میں یہ فائلیں ایک کلرک کی الماری سے چرا کر لایا ہوں ۔ میں اب جاتا ہوں اور صبح 7 بجے سے پہلے یہاں آ کر یہ فائلیں آپ سے لے جاؤں گا ۔ آپ یہ یاد رکھئے گا کہ میں نے یہ فائلیں نکال کر ایک بڑا جرم کیا ہے اور اگر پکڑا جاؤں تو لمبی سزا ہو سکتی ہے ۔ میں نے یہ سارا خطرہ محض اپنی بہنوں کی شادی کے لئے مول لیا ہے ۔ میں نے اسے دلاسا دیا اور کہا کہ یہ فائلیں تمہاری حفاظت میں تو تھیں نہیں ۔ ان کے متعلق اگر کسی کو پتہ بھی چل گیا تو متعلقہ کلرک ہی پھنسے گا اور کل صبح تو تم انہیں واپس لے ہی جاؤ گے ۔ میں نے اسے دو ہزار روپے اور دیئے اور کہا کہ جلد از جلد اس کے لئے روپے کا انتظام کروں گا۔

اشوک نے باقی شراب بھی گلاس میں انڈیلی اور غٹا غٹ پی گیا ۔ اتنی پینے کے باوجود وہ گھبرایا ہوا تھا ۔ اس نے ہینڈ بیگ وہیں چھوڑا اور صبح 7 بجے آنے کا کہہ کر واپس چلا گیا۔

میں نے فائلوں کا سرسری جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ یہ ہمارے لئے بیش قیمت معلومات سموئے ہوئے تھیں ۔ ایک فائل میں 71ء کی جنگ کے بعد تربیت کیلئے آنے والی تمام رجمنٹوں کے نمبر، افسران اور جوانوں کی تعداد، کن ٹینکوں پر ٹریننگ دی گئی اور پھر واپس کہاں گئیں ۔ یہ سب تفصیلات درج تھیں ۔ دوسری فائل خاصی موٹی تھی ۔ اس میں ہر رجمنٹ کے جوانوں کے نام، رینک، نمبر اور میڈیکل سہولتیں جو دی گئیں وہ درج تھیں ۔ اسی طرح افسران کی فہرست اور رینک اور دیگر تفصیلات درج تھیں ۔ فائلیں دیکھنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ کتنی اہم تھیں ۔ میں نے فوری فیصلہ کیا کہ بجائے ان فائلوں کی تفصیلات نقل کرنے کے کیوں نہ یہ دونوں فائلیں ہی پاکستان بھجوا دوں ۔ مجھے یقین تھا کہ میرے سینئرز میری اس کامیابی پر اچھل پڑیں گے، جب انہیں اصل فائلیں مل جائیں گی میں نے فوری طور پر سامان پیک کیا ۔ ہوٹل کا بل ادا کیا اور بسوں کے اڈے کی طرف روانہ ہو گیا ۔ اب میں کچھ گھبرایا ہوا تھا کہ خدانخواستہ کامیابی کا یہ کھیل کہیں بگڑ نہ جائے ۔ یہ تو مجھے یقین تھا کہ اشوک صبح مجھے ہوٹل میں موجود نہ پا کر میرے متعلق بہت کچھ سمجھ جائے گا لیکن چونکہ وہ خود اس میں ملوث تھا اس لئے کسی کو بھی میرے بارے میں نہ بتائے گا ۔ ADOS اور کیمپ کمانڈنٹ میرے متعلق کسی طرح بھی شک کا شکار نہ ہوں گے اور نہ ہی شیام، احتیاطاً میں نے ہوٹل سے چلتے ہوئے استقبالیہ کلرک کو بتا دیا کہ ایک ایمرجنسی کی وجہ سے فوری طور پر بمبئی جا رہا ہوں اگر کوئی میرے متعلق پوچھے تو یہی بتا دینا۔

بسوں کے اڈے پر معلوم ہوا کہ ایک بس اڈے سے ابھی نکلی ہے اور نہر کے پل کے پاس سواریاں لینے کے لئے کھڑی ہو گی ۔ اڈے سے ہی میں نے دو سائیکل رکشے لئے ۔ ایک پر سامان اور دوسرے پر خود بیٹھ کر انہیں پوری رفتار سے نہر کے پل کی طرف چلنے کو کہا ۔ میں نے انہیں کہا کہ دونوں کو پچاس پچاس روپے دوں گا اگر وہ بس کی روانگی سے پہلے نہر پر مجھے پہنچا دیں ۔ پچاس روپوں کے لالچ میں انہوں نے سائیکل رکشوں کو موٹر سائیکل رکشہ بنا دیا ۔ نہر کے پل پر بس ابھی کھڑی تھی ۔ میں نے ٹکٹ لیا اور سیٹ پر بیٹھ کر یہ دعائیں کرنے لگا کہ کسی انہونی سے پہلے ہی محفوظ مقام تک پہنچ جاؤں ۔ بس ٹوٹی پھوٹی سڑک پر ہچکولے کھاتی روانہ ہوئی اور تقریباً پانچ گھنٹے کے سفر کے بعد اورنگ آباد پہنچی ۔ دلی جانے والی گاڑی کی آمد میں قریب ایک گھنٹہ باقی تھا میں نے جان بوجھ کر تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیا اور گاڑی کے انتظار میں ایک خالی اور اندھیری جگہ پر بیٹھ گیا ۔ گاڑی صحیح وقت پر آ گئی اور میں نے ایک خالی سیٹ پر قبضہ جما لیا ۔ اس وقت میں بالکل خالی الذہن تھا ۔ بس ایک دھن ہی دل و دماغ کا احاطہ کئے ہوئے تھی کہ یہ فائلیں جلد از جلد پاکستان پہنچ جائیں۔

ایک بات یہاں تحریر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میری ایجنسی دشمن ملک میں انتہائی گہرائی بلکہ آخری کونے تک جا کر کام کرتی ہے جبکہ بارڈر پر تعینات ڈویژن کے فیلڈ انویسٹی گیشن یونٹ بارڈر کے دوسری طرف دشمن کے ڈویژنوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ ان فائلوں کے ذریعے جہاں تک دشمن کے آرمڈ ڈویژن 10-INDEPENDENT BRIGADE کا تعلق ہے ۔ ان کی رجمنٹوں کی ٹریننگ کن نئے ٹینکوں کی کن رجمنٹوں کو سپلائی کے متعلق 71ء کی جنگ کے بعد ہر بات روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی تھی اور F.I.U کا کام بہت سہل ہو گیا تھا۔

جوں جوں گاڑی دلی کی طرف بڑھتی گئی ۔ میں نارمل ہوتا گیا کہ میں ڈینجر زون سے باہر آ گیا تھا ۔ اگرچہ پورا بھارت ہی میرے لئے ڈینجر زون تھا ۔ لیکن احمد نگر سے اتنی اہم معلومات اور CLASSIFIED FILES کے ساتھ خیریت سے نکل آنا بالکل سانپ کے بل سے بخیر و عافیت نکل آنے کے مترادف تھا ۔ روانگی کے وقت سے لے کر اب تقریباً 24 گھنٹے سے زیادہ ہو چکے تھے اور صبح صادق کا وقت تھا ۔ جب گاڑی دلی پہنچی ۔ میں نے ٹیکسی لی اور سیدھا لودھی ہوٹل جا کر کمرہ لے لیا ۔ دن چڑھے تک سوتا رہا ۔ پھر ناشتہ وغیرہ کر کے کارونیشن ہوٹل فون کیا ۔ ٹرانسمیٹر والے ساتھی کو شام کے 4 بجے کناٹ پیلس کے ایک ریسٹورنٹ میں ملنے کا کہا ۔ باقی ساتھیوں کی خیریت اس لئے فون پر نہ پوچھی کہ ہوٹل میں وہ اجنبیوں کی صورت میں ٹھہرے ہوئے تھے ۔ صرف یہ پوچھا کہ اور سب ٹھیک ہیں اور اس نے کہا ہاں......

مجھے اشوک کا بار بار خیال آتا تھا کہ اپنی کتنی مجبوری کے باعث اس نے خطرہ مول لیا اور اگر اس کے افسران کو اس کی اس حرکت کا پتہ چل گیا تو اس کا کیا حشر ہو گا ۔ اس خیال کے ساتھ ہی مجھے سقوط ڈھاکہ، بھارتی فوج اور مکتی باہنی کے مشرقی پاکستان کے بے گناہ شہریوں اور فوجیوں کے ساتھ بربریت کی انتہا سے بھی زیادہ مظالم کے مناظر ایک تیز فلم کی طرح میرے دماغ میں گھوم گئے ۔ وہ لاکھوں زخم جو ہمارے دل اور ہماری روحوں پر لگ چکے تھے ان میں سے میں نے صرف ایک پر مرہم رکھا تھا اور ساتھ ہی مجھے یہ مقولہ یاد آ گیا کہ جنگ اور محبت میں ہر چیز جائز ہے اور ہماری ایجنسی کا ایک مقولہ تھا کہ ہم زمانہ امن میں جنگ کرتے ہیں اور جنگ کے دوران اپنی کی ہوئی جنگ کے نتائج دیکھتے ہیں اور میں اس وقت (حالت جنگ) میں تھا۔

شام کو جب میں ریسٹورنٹ پہنچا تو ٹرانسمیٹر والا ساتھی پہلے سے ہی موجود تھا ۔ میں نے مختصراً اسے بتایا کہ میں اپنے مشن سے کامیاب لوٹا ہوں ۔ میں نے باقی ساتھیوں کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا کہ آپ کی غیر موجودگی میں ہم نے کئی مفید معلومات اکٹھی کی ہیں ۔ جن کے متعلق ہم سب آپ کو اپنی کارکردگی کے بارے میں بتانا چاہتے ہیں ۔ میں نے اسے کہا کہ باقی تینوں اور تم اگلے روز ٹھیک اسی وقت اسی ریسٹورنٹ میں آ جانا ۔ اس وقت تو سب سے ضروری اور اہم کام یہ ہے کہ ٹرانسمیٹر پر پیغام بھیجنا ہے ۔ کیا تم نے اپنے ہوٹل سے ٹرانسمیٹر پر آزمائشی رابطے کی کوشش کی ہے ۔ اس نے اثبات میں جواب دیا تو میں نے اسے کہا کہ ابھی ہوٹل چلو ۔ میں پیغام لکھ کر دیتا ہوں اسے میرے سامنے ٹرانسمٹ کرو۔

ہم دونوں اکٹھے کارونیشن ہوٹل پہنچے ۔ باقی ساتھیوں کو پتہ بھی نہیں چلا اور ہم ٹرانسمیٹر والے کمرے میں داخل ہو گئے ۔ کمرہ احتیاط سے بند کیا ۔ یہ کمرہ ہوٹل میں دوسری منزل پر کونے میں تھا ۔ ہم نے کھڑکیاں کھول دیں ۔ میرے ساتھی نے ٹرانسمیٹر نکالا اور کمرے کی بجلی سے اسے چالو کرنے لگا ۔ میں نے پیغام لکھا کہ اشد ضروری علاوہ ڈاک کے، دو انتہائی اہم فائل بھیجنا ہیں ۔ ایک کے بجائے دو کوریئر CORRIER بھیجیں ۔ مجھ سے صرف پہلے والا کوریئر ہی ملے جبکہ دوسرا نیا اس کی نگرانی کرے۔

جب یہ پیغام دیا گیا اور جواب ''پیغام موصول ہوا'' بھی مل گیا تو مجھے تسلی ہوئی ۔ اس دوران میں ایک نہیں دسیوں خفیہ پیغامات پاکستان بھیجے ۔ ہر ایک کیلئے مختلف کوڈ ورڈ تھا ۔ اور جواب بھی ۔ ہر ایک کو خفیہ کوڈ جو ہر ٹرانسمیٹر کے لئے مختلف تھا، بتا دیا جاتا تھا ۔ شاید پہلے بھی کہیں تحریر کر چکا ہوں کہ انتہائی ضرورت اور ایمرجنسی کے لئے ٹرانسمیٹر استعمال کرنے کی اجازت تھی اور بہت ہی تھوڑے وقت کیلئے ۔ بھارتی ایجنسیوں کو بھی علم تھا کہ پاکستان سے بھارت پیغامات ٹرانسمٹ ہوتے ہیں ۔ انہیں شاید ہماری ایک دو فریکوئنسز تک رسائی بھی ہو چکی تھی ۔ اسلئے ٹرانسمیٹر کے استعمال میں انتہائی احتیاط برتنی لازمی تھی ۔ بھارت کے پاس ایسے آلات تھے جن سے ٹرانسمیٹر کے محل وقوع کا پتہ چلایا جا سکتا تھا۔

پیغام بھیجنے کے بعد میں اسی ریسٹورنٹ میں آ گیا اور ٹرانسمیٹر والے ساتھی کو کہا کہ آدھے گھنٹے میں وہ باقی تینوں کو بھی وہیں پہنچنے کا کہہ دے ۔ اس نے مجھے بتایا کہ ہم چاروں ہوٹل میں مختلف کاروباری لوگوں کی حیثیت سے ٹھہرے ہوئے ڈائننگ ہال میں ایک دوسرے سے ''متعارف'' ہو چکے ہیں اور یہ تعارف کچھ ''دوستانہ'' رنگ میں بدل کر ہم اکثر نہ صرف لابی اور ریسٹورنٹ میں ملتے ہیں بلکہ چند منٹ کا وقفہ دے کر باہر بھی اکٹھے جاتے ہیں۔

آدھ پون گھنٹے میں ہم پانچوں کناٹ پیلس کے ایک ریسٹورنٹ میں اکٹھے ہوئے ۔ سب سے پہلے تو میں نے انہیں مختصراً بتایا کہ میں اپنے مشن میں کامیابی حاصل کر کے لوٹا ہوں ۔ پھر میں نے ٹرانسمیٹر والے ساتھی سے گروپ لیڈر کا چارج واپس لیا اور انہیں کہا کہ میری غیر موجودگی میں اپنی کارکردگی مجھے بتائیں۔

سب سے بڑی خبر جو انہوں نے بتائی وہ یہ تھی کہ محلّہ فراش خانہ، پرانی دہلی میں انہوں نے ایک تین کمرے کا مکان تلاش کیا ہے جو ایک مسلمان کی ملکیت ہے اور اس دو منزلہ مکان کی دوسری منزل کرائے کیلئے خالی ہے ۔ کسی ایک ہوٹل میں زیادہ دن قیام ہوٹل والوں کو شک میں ڈال سکتا ہے ۔ مکان کے دو اطراف اور سامنے بھی مسلمانوں کے مکان ہیں ۔ مالک مکان کو یہ بتایا ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور کاروبار کے سلسلے میں دہلی میں ایک ہوٹل میں ہماری ملاقات ہوئی ۔ چونکہ ہمیں اکثر دہلی آنا ہوتا اور کافی روز رہنا ہوتا ہے ۔ اس لئے ہم چاروں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ایک مکان کرائے پر لے لیا جائے ۔ مالک مکان مان گیا ہے ۔ کرایہ اور پیشگی طے کر چکے ہیں ۔ صرف آپ کی اجازت کی ضرورت ہے۔

مجھے یہ تجویز پسند آئی کیونکہ دشمن ملک میں مسلمان جاسوسوں کا ہندو بن کر رہنا اور خصوصاً ہوٹل میں زیادہ عرصہ قیام نا صرف انہیں مشکوک بنا دیتا ہے بلکہ ایک مسلمان کے مستقل طور پر ہندو کے روپ میں رہنے سے احتیاط کے باوجود اس سے غیر ارادی طور پر ایسی غلطی ہونے کا امکان ہے جس سے اس کی اصلیت ظاہر ہو سکتی ہے ۔ ہم اس قسم کا کوئی رسک لینے کو تیار نہ تھے ۔ آگے آپ پڑھیں گے کہ نادانستہ طور پر مجھ سے بھی دو تین ایسی غلطیاں ہوئیں جن کی وجہ سے میں دشمن کی گرفت میں آتے آتے بچا ۔ میں نے انہیں مکان کرائے پر لینے کی اجازت دے دی ۔ ایک اور کامیابی جو انہوں نے حاصل کی وہ یہ تھی کہ بھارتی آرمی چیف کے ہیڈ کوارٹر کے باہر STATIC اور MOBILE نگرانی کر کے انہوں نے ہیڈ کوارٹر میں کام کرنے والے چند سویلین اہلکاروں کی دفتری پوزیشن اور رہائش گاہوں کا پتہ چلایا تھا ۔ یہ خاصی اہم معلومات تھیں جو ہمارے آئندہ مشنوں میں بہت مفید ثابت ہو سکتی تھیں ۔ تربیت یافتہ فوجی تو خاصے محتاط ہوتے ہیں لیکن سویلین ملازمین بالکل ہمارے سویلین ملازمین کی طرح بے پروائی برتتے ہیں اور انہیں قابو کرنا نسبتاً آسان ہوتا ہے ۔ کچھ اور معلومات بھی انہوں نے مجھے دیں اور تقریباً ایک گھنٹے کی میٹنگ کے بعد ہم نے اپنی اپنی راہ لی ۔ میں نے انہیں دو دن بعد اسی جگہ پر اسی وقت ملنے کو کہا ۔ ان دو دنوں میں انہوں نے مکان کرائے پر لے کر شفٹ کرنا تھا۔

غازی

فائلیں تو میرے قبضے میں آ چکی تھیں لیکن ایک پریشانی ایسی تھی جس کا کوئی حل نظر نہ آتا تھا۔ میں نے یہ فائلیں اپنے CONTACT کے حوالے کرنی تھیں۔ اور CONTACT نے یہ فائلیں لاہور میں میرے سینئرز کو پہنچانی تھیں۔ بارڈر کراس کرنے میں وہی خطرات تھے۔ اگر خدانخواستہ CONTACT پکڑا جاتا تو اتنی اہم معلومات جن کی نہ صرف پاکستان کو بے حد ضرورت تھی بلکہ جن کے حصول کے لئے میں نے اپنی جان موت کے منہ میں ڈال دی تھی، اپنی منزل تک نہ پہنچ پاتیں۔ ان دنوں فوٹو اسٹیٹ ایجاد نہیں ہوا تھا اور اگر تھا بھی تو صرف مغربی ممالک میں تھا۔ میرے پاس نہ تو کوئی کیمرہ تھا اور نہ ہی میں اتنا قیمتی کیمرہ لے سکتا تھا جس سے ان فائلوں کے مواد کی تصویریں اتار سکتا۔

بہت سوچ سمجھ کر میں نے فیصلہ کیا کہ ہے تو یہ دقت طلب کام لیکن اسے فائلیں CONTACT کو دینے سے پہلے پورا ضرور کرنا ہے۔ تربیلہ میں ملازمت کے دوران کمپنی کی طرف سے ہم ایک ہفت روزہ ”آواز“ نکالتے تھے جو جنگ پریس راولپنڈی میں چھاپا جاتا تھا۔ کتابت تو لیتھو میں ہوتی تھی لیکن چھپتا یہ آفسٹ پر تھا۔ رسالے میں چھپنے کے لئے جو تصویریں ہم دیتے تھے انہیں فوٹو فلم پر منتقل کیا جاتا تھا۔ فوٹو فلم بالکل فلم نگیٹو کی طرح ہوتی ہے جس کے آر پار دیکھا جا سکتا ہے لیکن اس پر تصویر پازیٹو ہوتی ہے اور وہی فوٹو فلم چھپائی کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ اب مجھے کسی ایسے اخبار یا رسالے کی تلاش تھی جو دہلی سے فوٹو آفسٹ پر چھپتا ہو۔ میں نے ایک بک اسٹال پر جا کے رسالے اور اخبار دیکھنے شروع کئے۔ بالآخر ایک مشہور فلمی ماہنامہ ایسا ملا جو آفسٹ پر چھپتا تھا۔ اس رسالے کا ایڈریس بھی میں نے نوٹ کر لیا اور آصف علی روڈ پر اس کے دفتر جا پہنچا۔

بجائے مالکان اور چیف ایڈیٹر سے ملنے کے میں نے ایک چپڑاسی سے کاتبوں کا پوچھا اور ایک کاتب کا پوچھا۔ ایک کاتب سے جو شکل سے مسلمان لگتا تھا فوٹو فلم بنانے والے کا پوچھا۔ اس نے اس کا نام اور پتہ بتا دیا۔ یہ دفتر کا ملازم نہ تھا بلکہ اس کی اپنی دکان اور اپنے آلات تھے اور وہ مختلف رسالوں اور اخبارات کے لئے فوٹو فلم بناتا تھا۔ میں اس کے پاس پہنچا اور ارجنٹ فوٹو فلم بنانے کی بات کی۔ میری دونوں فائلوں میں دو سو سے زیادہ صفحات تھے۔ میں نے اسے سائز بتایا تو اس نے کہا کہ بجائے فل سائز کے آپ پوسٹ کارڈ سائز میں بنوالیں تو لاگت بھی کم آئے گی اور وقت بھی نسبتاً کم صرف ہوگا۔ میں نے اسے مطلوبہ رقم سے زیادہ دینے کا وعدہ کیا لیکن دو شرائط کے ساتھ۔ اول زیادہ سے زیادہ 48 گھنٹے میں تمام کام ختم کرنا ہوگا۔ دوئم فوٹو فلم بنانے کے دوران میں موجود رہوں گا۔ پیسوں کے لالچ میں اس نے دونوں باتیں مان لیں۔ اس کے 3 اسسٹنٹ بھی تھے جنہیں اس نے روک لیا۔ میں فوراً لودھی ہوٹل آیا۔ فائلوں میں سے کاغذات نکال کر ان پر نمبر لگائے اور اس کے اسٹوڈیو جا پہنچا۔

میں نے فائل کا ایک ایک کاغذ اپنی نگرانی میں REDUCE کروایا اور فوٹو فلم کے تمام مرحلوں میں موجود رہا۔ غرض کہ جب تک ان میں کام کرنے کی سکت رہی وہ کام کرتے رہے۔ کاغذات کو REDUCE کرنے کا مرحلہ سب سے پہلے طے کر کے کاغذات اپنے قبضے میں کئے۔ باقی مراحل بعد میں طے کئے جو باقی رہ گیا تھا وہ اگلے دن مکمل کیا گیا۔ نہ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کاغذات کس قسم کے ہیں اور میں اتنی تعداد میں فوٹو فلم کیوں بنوا رہا ہوں اور نہ ہی میں نے انہیں کچھ بتایا۔ یہ سارا کام محض روپے کی چمک سے ہوا۔ انہوں نے یہ جاننے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔ یہ بالکل اسی طرح سے ہوا جیسے آج کل ہمارے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ کے دفاتر میں بنگالیوں، برمیوں کو ”مشرف بہ پاکستان“ کیا جاتا ہے۔ غیر ملکی دہشت گردوں کے پاس بھی پاکستانی شناختی کارڈ اور پاسپورٹ ہیں۔ صرف کراچی میں ایک لاکھ سے زیادہ بنگالیوں کو پاکستانی بنایا جا چکا ہے۔ سعودی عرب میں منشیات لے جانے والے جو لوگ پکڑے گئے اور جن کے سر قلم کئے گئے ان سب کے پاس پاکستانی پاسپورٹ تھے جبکہ وہ پاکستانی باشندے نہ تھے بلکہ ”چمک“ کے زور پر انہوں نے پاکستانی پاسپورٹ بنوائے تھے۔

میں نے تمام فوٹو فلم ترتیب وار ایک ڈبے میں رکھ کر محفوظ کر لیں اور فائلوں کے کاغذات کو بھی دوبارہ ترتیب دیکر فائل کر دیا اور دونوں فائلوں کو پلاسٹک میں اس طرح باندھ دیا کہ پانی میں گرنے سے وہ خراب نہ ہو جائیں۔ مکمل واٹر پروفنگ کے بعد میں نے انہیں جوٹ کے ایک تھیلے میں رکھ کر سی دیا۔ اب میں مطمئن تھا کہ اول تو انشاء اللہ یہ فائلیں بحفاظت میرے سینئرز تک پہنچ جائیں گی اور اگر خدانخواستہ نہ پہنچ سکیں تو ان کی فوٹو فلم میں پاکستان پہنچانے کا انتظام کروں گا۔

میں نے خفیہ روشنائی سے احمد نگر میں مشن کی کامیابی اور مزید معلومات تحریر کیں۔ وقت مقررہ پر میرے ساتھی اسی ریسٹورنٹ میں مجھے ملے۔ وہ مکان میں شفٹ ہو چکے تھے۔ کچھ فرنیچر انہیں مالک مکان نے دیا تھا اور کچھ انہوں نے خرید لیا تھا۔ میں نے اپنی ڈاک میں اخراجات کی تفصیل لکھ دی تھی۔ اب مجھے اور میرے ساتھیوں کو مزید رقم کی ضرورت تھی۔ کیونکہ اب مجھے دہلی میں اونچے طبقے کے لوگوں سے میل جول بڑھانا تھا اور میرے ساتھیوں کو بھی اپنے مشنز کے اہداف کی طرف بڑھنا تھا۔

ہم سب کو اب CONTACT کی آمد کا انتظار تھا۔ ٹرانسمیٹر پر ہمارے پہلی بار رابطے کے بعد امکان تھا کہ نئی ہدایات ملیں گی۔ میرے دو ساتھی جھانسی اور بابینا دوبارہ جانے کو بے تاب تھے تا کہ اپنا مشن پورا کر سکیں لیکن میں نے انہیں ڈاک ملنے تک اس ارادے سے باز رکھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی فوجی علاقے میں ایک دو دھماکے کر کے ہم بھارتی سیکورٹی کو چوکس کر دیں۔ علاوہ ازیں دھماکہ خیز مادہ اور ہینڈ گرنیڈ ز ہمیں بھارت سے اپنے ”ہمدردوں“ سے حاصل کرنے تھے۔ جن کے حصول کیلئے مجھے ان سے رابطہ کرنا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ یہ کام موخر کر دیا جائے۔ بہر حال میرے چاہنے نہ چاہنے کی بات نہ تھی بلکہ ہمیں اوپر کے احکامات کی تکمیل کرنی تھی۔

CONTACT کی آمد میں صرف دو دن رہ گئے تھے۔ میں نے ان دنوں کی شامیں اشوکا اور اکبر ہوٹل میں گزاریں۔ اب میں نے اپنی پوری توجہ سرونٹس کلب میں داخل ہونے اور وہاں راہ و رسم بڑھانے پر مرکوز کر دی تھی۔

مقررہ دن اور وقت پر CONTACT ملا۔ اس نے مجھے اشارے سے بتایا کہ اس کے ہمراہ ایک اور آدمی بھیجا گیا ہے اور وہاں کھڑا ہے۔ اپنی تسلی کیلئے میں ٹہلتے ٹہلتے اس نئے آدمی کے قریب سے گزرا اور سگریٹ جلانے کیلئے اس سے ماچس مانگی۔ جواباً اس نے کہا ماچس تو لیجئے لیکن ایک سگریٹ آپ مجھے دیں۔ یہ ہمارا نئے آدمی کیلئے مستقل کوڈ تھا۔ صحیح جواب ملنے پر میں نے اسے سگریٹ دیا اور اپنا سگریٹ سلگا کر ٹہلتے ٹہلتے واپس آ گیا۔ CONTACT وہیں تھا۔ میں نے اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا جو مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ وہ میرے سامنے سے گزر کر دوسری جانب کھڑا ہوا جہاں CONTACT اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ڈاک اس کے پاس تھی۔ میں نے CONTACT سے اپنی ڈاک لی اور اسے کہا کہ اب اس جانب چلے جدھر میرا ساتھی تھا۔ پیچھے پیچھے میں بھی چل پڑا۔ ادھر CONTACT کا ساتھی بھی فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے چل پڑا۔ میں نے اپنے ساتھی کے پاس سے گزرتے ہوئے ڈاک اسے تھمائی اور بھیجنے والی ڈاک کا پیکٹ اس سے لے لیا۔ میرا ساتھی فوراً وہاں سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ادھر ڈاک کا پیکٹ لئے میں CONTACT کے پاس پہنچ گیا۔ کسی کی نظروں میں آئے بغیر میں نے پیکٹ اس کے حوالے کیا۔ اس سے پہلے میں CONTACT کو اگلی ملاقات کے لئے نئی جگہ، دن اور وقت کا بتا چکا تھا۔ پیکٹ لیکر CONTACT فوری وہاں سے چل پڑا۔ میں نے دیکھا کہ اس کا ہمراہی بھی کچھ فاصلہ دے کر اس کے پیچھے جا رہا تھا۔ دہلی کی گنجان آبادی میں، میں CONTACT سے سیدھا بھی مل سکتا تھا اور ڈاک کا تبادلہ کر سکتا تھا لیکن کسی بھی خطرے کے امکان کو پیش نظر رکھ کر یہ احتیاطی تدابیر اختیار کرنی پڑتی ہیں۔ بہر حال یہ مرحلہ بخیر و عافیت طے ہوا۔ ڈاک لے کر میرا ہمراہی اپنے گھر پہنچ چکا تھا۔ وہ پہلے سے مقررہ وقت پر گھر سے باہر آ کر مقررہ جگہ پر میرا منتظر تھا۔ میں نے ڈاک کا پیکٹ اس سے لے لیا اور اپنے ہوٹل آ گیا۔ ڈاک میں کچھ نئی ہدایات تھیں اور بیس ہزار روپے میرے ساتھیوں کے لئے اور دس ہزار روپے میرے لئے تھے۔ ہمیں رقم تو خاصی مل رہی تھی لیکن ایک ایک پیسے کا حساب ہم رکھتے تھے۔

غالباً یہ ہفتے کی شام تھی جب اشوکا ہوٹل میں ایک تفریحی پروگرام ترتیب دیا گیا تھا جس میں فلور ڈانس بھی تھا۔ ٹکٹ پر اس پروگرام میں داخلہ تھا۔ میں نے ٹکٹ لینا چاہا تو معلوم ہوا کہ صرف جوڑوں کو داخلے کی اجازت ہے۔ مجھے خاتون ساتھی کی ضرورت تھی جو اشوکا کی لابی میں پوری ہو گئی۔ اونچی سوسائٹی میں داخل ہونے کی خواہشمند غریب گھرانوں کی لڑکیاں ان فائیو اسٹار ہوٹلوں کی لابی میں اکثر شام کو بیٹھی مل جاتی ہیں جو ایسے لوگوں کی تلاش میں آتی ہیں جو ان کی شام کا خرچ بھی اٹھا سکے۔ میں نے ایسی ہی ایک لڑکی کو دعوت دی۔ وہ فوراً ہی مان گئی۔ میں نے ٹکٹ لیا، ہال میں داخل ہوئے اور ایک ٹیبل پر قبضہ جما لیا۔ آہستہ آہستہ مختلف جوڑے ہال میں داخل ہو رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد فلور پر ڈانس شروع ہو گیا۔ اکبر ہوٹل میں دو تین بار دیکھا ہوا ایک جوڑا بھی وہاں موجود تھا۔ شوہر بوڑھا اور بیوی جوان۔ دونوں مے نوشی میں مصروف تھے۔ میں نے اپنی ساتھی لڑکی سے پوچھا تو وہ تیار ہو گئی اور ہم فلور پر آ گئے۔ SOUARE ڈانس کے لئے شروع ہوئی آرکسٹرا کی دھن تیز ہوتی گئی اور بالآخر اس دور کے مشہور ترین ROCK-N-ROLL پر ختم ہوئی۔ بوڑھے شوہر پر بھی مے اثر کر چکی تھی۔ وہ بھی اپنی ساتھی کے ہمراہ فلور پر آ گیا۔ ROCK-N-ROLL میں تیز دھن پر ناچتے ہوئے جلد ہی وہ ہانپ گیا۔ میں ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھا۔ مغربی اصول کے مطابق میں نے اس بوڑھے کی پیٹھ پر آہستہ سے انگلیاں بجائیں۔ وہ اس عورت سے الگ ہو گیا اور وہ عورت میرے ساتھ ناچنے لگی۔ ناچ میں وقفہ ہوا تو میں اس عورت کو اس کی ٹیبل پر چھوڑنے گیا۔ اپنا تعارف کروایا۔ دونوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس عورت نے مجھے اپنی ٹیبل پر بیٹھنے کی دعوت دی جو میں نے قبول کر لی۔

دوران گفتگو معلوم ہوا کہ موصوف ایک ٹھیکیدار ہیں اور خاتون ان کی بیگم ہیں۔ آرکسٹرا کی تیز آواز اور مے نوشوں کی اونچی آواز میں گفتگو نے خاصا شور مچا رکھا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ٹھیکیدار صاحب نے ٹیبل پر میری موجودگی اور اپنی بیگم کے ساتھ میرے ناچنے کو پسند نہیں کیا۔ میں ان سے اجازت لے کر اٹھنے ہی والا تھا کہ ڈانس پھر شروع ہو گیا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ آرکسٹرا نے میری پسندیدہ دھن Come September بجانی شروع کی یہ اس دور کی بات ہے جب ”آتش جواں“ تھا۔ میرے پاؤں بے اختیار فرش پر بجنے شروع ہوئے ٹھیکیدار کی بیوی جو جوان اور خاصی پرکشش تھی اس نے مخمور آنکھوں سے مجھے اشارہ کیا۔ میں کرسی سے اٹھا۔ میرے ساتھ ہی وہ بھی کھڑی ہو گئی اور ہم فلور پر آ کر ناچنے لگ گئے۔ اس دھن پر Square یعنی Slow ناچ کیا جاتا ہے اور ناچنے والوں کے جسم ایک دوسرے کے بہت قریب آ جاتے ہیں۔ کچھ ماحول کا اثر، کچھ مے کا نشہ اور جوانی کا جوش چند قدم لینے کے بعد ہی اس عورت نے اپنا سر میرے سینے سے لگا دیا۔ میں نے سرگوشی میں اس کا نام پوچھا تو اس نے آشا بتایا۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے محسوس ہوا ہے کہ تمہارے شوہر نے میرے تمہارے ساتھ ناچنے کو پسند نہیں کیا۔ ”وہ سوائے ناپسند کرنے کے اور کر بھی کیا سکتا ہے“۔ اس نے بڑے ذو معنی انداز میں جواب دیا۔ میں نے اسے کہا کہ میں نے اکبر ہوٹل میں تمہیں دو تین بار دیکھا تھا اور تمہارے حسن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ آج اشوکا میں اس پروگرام میں تمہیں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو رہ نہ سکا۔ لابی سے ایک لڑکی لی اور اس کے ہمراہ اندر آیا کیونکہ صرف جوڑوں کو آنے کی اجازت ہے۔ اس نے کہا کہ میں تو سمجھی تھی کہ وہ تمہاری بیوی ہے۔ وہ ہنس پڑی اور اسی مخمور لہجے میں کہنے لگی۔ تم مرد بڑے شیطان ہوتے ہو۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ٹھیکیدار صاحب کی پہلی بیوی مر چکی ہے اور اس بیوی کی اولاد عمر میں اس سے بڑی ہے میں نے اسے کہا کہ شاید تم اسے (بہت جلد) سمجھو لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں تم سے بہت متاثر ہوں۔ میں بمبئی سے آیا ہوا ہوں اور لودھی ہوٹل میں مقیم ہوں۔ کاروبار کے سلسلے میں دہلی میں چند ماہ رہنا ہے۔ غیر شادی شدہ ہوں محض اس لئے کہ اب تک پسند کی کوئی عورت ملی نہیں۔ بالکل تنہا ہوں۔ میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد اس سے بہت سی باتیں کر کے اسے اپنی جانب راغب کر لوں، ممکن ہے بعد میں ایسا موقع نہ ملے۔ اس نے اسی مخمور لہجے میں کہا کہ پہلے تنہا تھے اب تنہا نہیں ہو۔ اس نے لودھی ہوٹل میں میرا کمرہ نمبر پوچھا اور ذہن نشین کرنے کیلئے دوبارہ نام بھی پوچھا اور ناچتے ہوئے پھر میرے سینے پر سر ٹکا دیا۔

جن قارئین کو ایسی اونچی سوسائٹی میں جانے کا موقع نہ ملا ہو انہوں نے سنا تو ضرور ہو گا کہ برصغیر سے رخصت ہوتے ہوئے انگریز اپنی لعنتی زندگی کی روایات یہاں چھوڑ گئے اور اس معاشرے کے لوگ مغرب کی نقل میں اتنا آگے بڑھ گئے کہ مغرب کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ بھارت میں تو اب شہر کی آدھی آبادی اسکرٹ اور جینز پہنتی ہے۔ یہ مڈل کلاس لوگ ہیں جبکہ اپر کلاس تو مغرب نوازی میں ان حدوں کو بھی پار کر چکی ہے۔ بھارتی فلموں کے ویڈیو کیسٹ میری بات کی گواہی دیں گے کہ جو عریانیت ہم مغربی فلموں میں دیکھ نہیں پاتے وہ بھارتی فلموں میں ہمیں ملتی ہے۔

ناچ ختم ہوا اور میں آشا کو اس کی ٹیبل پر چھوڑ کر اپنی ٹیبل پر آ گیا۔ میری PAID FRIEND اس دوران بیئر اور وہسکی کے نشے میں مدہوش ہو چکی تھی۔ میں خود بھی اس ماحول سے اب نکلنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اشوکا اور اکبر جیسے فائیو اسٹار ہوٹلوں میں صرف دو سو روپے میں کوئی جوڑا اپنی شام گزارنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ محض تفریحی پروگرام اور ٹکٹ کی وجہ سے نچلی کلاس کے شور و غل مچانے والے لوگ وہاں طوفان بدتمیزی برپا کئے ہوئے تھے۔

میں نے بل ادا کیا اور PAID FRIEND کو لابی میں کوئی اور شکار ڈھونڈنے کے لئے چھوڑ کر اپنے ہوٹل چلا آیا۔

اگلے روز صبح 11 بجے میرے فون کی گھنٹی بجی۔ میں حیران تھا کہ مجھے فون کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔ میں نے فون اٹھایا تو آشا تھی۔ اس کی آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ ابھی تک اس کا نشہ نہیں اترا۔ رسمی کلمات کے تبادلے کے بعد اس نے کہا کہ میں تم سے ملنے تمہارے ہوٹل آ رہی ہوں اور لنچ تمہارے ساتھ ہی کروں گی۔ میں نے اسے لابی میں ملنے کو کہا اور تیار ہو کر لابی میں آ بیٹھا۔ تھوڑی دیر میں وہ بھی پہنچ گئی اور ہم کافی شاپ کے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ رات بھی تمہارا شوہر ہمارے ناچنے پر ناراض دکھائی دیتا تھا اور اب تم اکیلی یہاں آ گئی ہو۔ وہ ہنسنے لگی اور بولی کہ جے چند (یہ اس کے شوہر کا نام تھا) کی ناراضگی اور غصہ شراب کا نشہ اترتے ہی غائب ہو جاتا ہے۔ HE IS NOT A HE MAN اس نے کہا کہ وہ اب بھی اچھی طرح محسوس کرتا ہے کہ میرے ساتھ اس کا نباہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ اگر HE KEEPS HIS EYES AND EARS SHUT اونچی سوسائٹی کی جوان بیوی اور بوڑھے شوہر کی ازدواجی زندگی کو آشا نے انگریزی کے سات لفظوں میں بیان کر دیا تھا۔

ہم دونوں ایک ٹیبل پر بیٹھے اپنے اپنے منصوبوں اور خواہشات کی تکمیل کے متعلق سوچنے لگے۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔ I BELIEVE I AM NOT THE FIRST MAN IN YOUR LIFE OTHER THAN YOUR HUSBAND، (میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے شوہر کے علاوہ تمہاری زندگی میں داخل ہونے والا میں پہلا مرد نہیں ہوں) وہ پھر ہنسنے لگی اور کہا IF YOU THINK SO, YOU ARE A FOOL (اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو تم ایک احمق ہو)۔ وہ بلا جھجک مجھے بتانے لگی کہ میرا شوہر ٹھیکے لینے کیلئے صاحب اختیار افسران کو اکثر پارٹیاں دیتا ہے اور انہیں خوش کرنے کے لئے مجھے آگے کرتا ہے۔ صاحب اختیار بنتے بنتے یہ لوگ عمر کی اس حد میں داخل ہو چکے ہوتے ہیں کہ جسمانی طور پر ”بیکار“ ہو چکے ہوتے ہیں۔ میرے والد بھی ٹھیکیدار تھے اور ایک ٹھیکے میں انہیں اتنا نقصان ہوا کہ وہ سنبھل نہ سکے اور جے چند نے میرے والد کی مالی امداد کر کے مجھے خرید لیا۔ اگر جے چند مجھ سے مخلص ہوتا تو میں عمروں کے اتنے تفاوت کے باوجود ایک اچھی بیوی ثابت ہوتی لیکن جے چند نے ٹھیکوں کے حصول کے لئے مجھے بیچنا شروع کر دیا۔ اب ہم دونوں میں ایک سمجھوتہ سا ہو گیا ہے کہ اس کی دی ہوئی پارٹیوں میں، میں اس کے لئے ٹھیکے حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہوں اور وہ میری ذاتی ACTIVITIES کے متعلق کچھ نہیں پوچھتا۔ شراب کے نشے میں اگر اسے کبھی کبھار غصہ آ بھی جاتا ہے تو میں اس کی کمزوریاں اس کے سامنے لے آتی ہوں اور وہ خاموش ہو جاتا ہے۔

کافی دیر باتیں کرنے کے بعد جب میں نے اسے لنچ کے لئے ڈائننگ ہال چلنے کو کہا تو اس نے کہا کہ کافی شاپ میں SNACKS سے ہی پیٹ بھر چکا ہے۔ وہ بار بار مجھے کہہ رہی تھی کہ اپنے کمرے میں چلو اور میں ہر بار اس کا دھیان کسی دوسری طرف پلٹ دیتا تھا۔

قارئین کی خدمت میں عرض ہے کہ میں متقی یا فرشتہ نہیں۔ ایک حسین اور جوان عورت کی ایسی کھلی دعوت کو ٹھکرانا بہت مشکل تھا لیکن میں عورت کی فطرت سے بخوبی واقف تھا کہ جب تک اس قماش کی عورت کی خواہش پوری نہیں ہوتی وہ تسکین خواہش کے لئے نہ صرف تڑپتی رہتی ہے بلکہ اپنے مقصد کیلئے خطرناک حد تک آگے جا سکتی ہے۔ ایک بار خواہش پوری ہو جائے تو وہ اس شخص کو اپنے ”فتح شدہ“ مردوں کی فہرست میں شامل کر کے کسی نئے ADVENTURE کی تلاش شروع کر دیتی ہے اور اس نے اپنی زندگی کے جو پہلو مجھے بتائے تھے، ان کے مطابق وہ میرے بڑے کام آ سکتی تھی۔

غازی

بالآخر میں نے اسے کہا کہ میں RECEPTION پر جا کر بتا دوں کہ شام تک نہ تو کوئی ملنے والا مجھے ڈسٹرب کرے اور نہ ہی کوئی فون کال مجھے ٹرانسفر کی جائے۔ RECEPTION پر جا کے میں نے 50 روپے کلرک کی مٹھی میں دیئے اور کہا کہ ٹھیک پندرہ منٹ بعد وہ مجھے فون کرے اور میری آواز سنتے ہی فون بند کر دے۔ یہ انتظام کر کے میں آشا کے پاس آیا اور اسے لے کر کمرے میں آ گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی آشا بے تکلفی سے میرے بیڈ پر نیم دراز ہو گئی۔ میں نے ''فوری حملے'' سے بچنے کے لئے اسے کہا کہ کیوں نہ اس موقع کو اور پرلطف بنائیں۔ میں نے فون پر بارمین سے کہا کہ ایک بوتل اسکاچ وہسکی اور برف بھیجے۔ یہ فون کر کے میں نے اسے اشارے سے بتایا کہ میں باتھ روم میں جا رہا ہوں۔ ابھی میں باتھ روم سے نکلا بھی نہیں تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ فون آشا نے اٹھایا اور ریسیور میز پر رکھ دیا۔ میں اس دوران باتھ روم سے باہر آ چکا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ میرا فون ہے۔ دوسری طرف ریسپشنسٹ تھا۔ میری آواز سن کر اس نے فون بند کر دیا۔ ادھر میں نے فون پر یکطرفہ بات شروع کر دی کہ رمیش صاحب آپ؟ آپ نے آنے کی کیوں زحمت کی۔ مجھے فون کر دیا ہوتا۔ میں فوراً حاضر ہو جاتا۔ اچھا تو کیا آپ کے پارٹنر بھی ساتھ ہیں۔ آپ براہ کرم لابی میں بیٹھیں۔ میں فوراً حاضر ہوتا ہوں۔ یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ آشا نیم باز آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ غضب ہو گیا۔ دہلی میں میری چائے کے پنجاب اور ہریانہ کے ایجنٹ اپنے پارٹنر کے ساتھ آئے ہیں۔ میں نے ریسپشنسٹ کو کوسا کہ میری ہدایت کے برعکس اس نے انہیں کیوں بتا دیا کہ میں کمرے میں ہوں۔ اب مجھے ان سے ملنا اور ان کے ہمراہ ان کے دفتر جانا پڑے گا۔

آشا کچھ مایوس سی ہو گئی۔ میں نے بڑھ کر اسے گلے لگایا اور کہا کہ آج تو رنگ جمنے سے پہلے ہی بھنگ پڑ گئی لیکن آنے والے دنوں میں آج کی کوفت کی پوری طرح سے تلافی کریں گے۔ آشا نے میک اپ درست کیا۔ میں نے اسے کہا کہ اگر وہ مجھے اپنا فون نمبر دے دے تو میں اسے فون پر نئے پروگرام سے آگاہ کروں گا۔ آشا نے خاموشی سے میز پر پڑے پیڈ پر نمبر لکھا اور اچانک مجھ سے کہنے لگی۔ VINOD I PROMISE I WILL WIN YOU اس نے دوبارہ اپنا میک اپ ٹھیک کیا اور ہم کمرے سے نکل کر لفٹ میں نیچے آ گئے۔ میں اسے چھوڑنے کیلئے باہر تک آیا۔ پارکنگ میں وہ ایک غیر ملکی CONVERTIBLE گاڑی میں بیٹھی اور تیز رفتاری سے ڈرائیو کر کے چلی گئی۔ میں واپس کمرے میں آیا اور خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے کرتے سو گیا۔

آشا سے میں اپنا میل جول نہ صرف برقرار رکھنا بلکہ بڑھانا چاہتا تھا۔ اس قسم کی عورتوں کے تعلقات اونچی سوسائٹی کے ہر طبقے کے لوگوں سے ہوتے ہیں۔ آشا کے ذریعے میں بہت سے کام کے لوگوں سے مل سکتا تھا۔ آشا کو میں ایک قیمتی مہرہ کی طرح سنبھال کر استعمال کرنا چاہتا تھا۔

وہ شام میں نے ہوٹل میں ہی گزاری۔ صرف اپنے کپڑے لینے کناٹ پیلس گیا۔ ٹرائی کیلئے کپڑے تیار تھے۔ میں نے ٹرائی دی اور دو دن بعد اپنے کپڑے لے آیا۔ اب میں پوری طرح سے اس اونچی سوسائٹی میں داخل ہونے کے لئے تیار تھا جس میں سینئر سول اور فوجی افسران کی بہتات تھی۔

ادھر میرے ساتھی بھی بیکار نہیں بیٹھے تھے۔ انہوں نے آرمی ہیڈ کوارٹر کے جن سول افسروں اور کلرکوں کے گھر اور دفتر میں ان کی پوزیشن کا پتہ لگایا تھا۔ ان کے گھریلو حالات، گھر میں رہنے والے افراد خصوصاً بچوں اور جوان بچیوں اور غیر شادی شدہ بہنوں کے متعلق بھی معلومات حاصل کیں۔ یہ تمام معلومات انہوں نے مجھے دیں اور میں نے اپنی ڈائری میں کوڈ ورڈز میں نوٹ کر لیں۔ یہ معلومات ہمارے لئے بہت کارآمد ثابت ہو سکتی تھیں۔

پیسے تو ہمارے پاس خاصے تھے۔ میں نے لودھی ہوٹل میں ایک امریکی جوڑا دیکھا جن سے بات چیت میں معلوم ہوا کہ وہ کھٹمنڈو جا رہے ہیں۔ میں نے ایک بات نوٹ کی کہ وہ جوڑا تقریباً ہر رات ہوٹل کے باغ کے ایک کونے میں اندھیرے میں بیٹھتا تھا۔ میں ایک رات جھاڑیوں کے پیچھے ان کے قریب پہنچا تو چرس کی بو آئی مجھے فوراً ایک بات سوجھی اور میں اچانک ان کے سامنے آ گیا اور کہا کہ یہاں حشیش پینا سخت ممنوع ہے اور تم کھلے عام پی رہے ہو۔ تم کو پکڑوا دوں تو کئی سال کی جیل ہو جائے گی۔ وہ ڈر گئے۔ میں نے انہیں کہا کہ میں انہیں پکڑوانا نہیں چاہتا۔ میری نظر ان رولر فلیکس کیمرے پر تھی۔ میں نے انہیں کہا کہ یہ کیمرا میں خریدنا چاہتا ہوں لیکن اپنی قیمت پر۔ بولو اب کیا صلاح ہے۔ وہ اتنے خوف زدہ تھے کہ فوراً مان گئے۔ میں نے انہیں اسی وقت لے کر ریسپشن پر آیا۔ وہ عورت کمرے سے اپنا کیمرا لے آئی اور میں نے چھ سو روپے کے عوض ان کا کیمرا خرید لیا اور فرنٹ آفس منیجر اور کیشیئر کے رسید پر دستخط لے لئے تاکہ بعد میں وہ شور نہ مچا سکیں۔ وہ تو کچھ ایسے ڈرے کہ دوسرے دن ہی ہوٹل سے چیک آؤٹ ہو گئے۔ میں نے کیمرا اپنے نمبر 2 یعنی ٹرانسمیٹر آپریٹر کو دیا اور کہا کہ اس کیمرے سے آرمی ہیڈ کوارٹر کے سول ملازمین جن کا وہ تعاقب کر چکے ہیں ان کی تصویریں اتاریں اور ان کے گھر کے افراد کی تصویریں بھی بنائیں اور گھر والوں کے نام معلوم کریں اور تصویروں کے پیچھے ان کے نام انگلش میں لکھ دیں اور ان کے متعلق جو مزید معلومات حاصل کریں۔ وہ مجھے لکھ کر دیں۔ علاوہ ازیں ہیڈ کوارٹرز کے صفائی کرنے والے خاکروبوں کا پیچھا کریں اور ان کے گھروں کے ایڈریس اور نام وغیرہ معلوم کریں اور ان کی بھی تصویریں حاصل کریں۔

بھارت میں شودر یعنی ہریجن صفائی کا کام ہزاروں برس سے کرتے آئے ہیں۔ آزادی کے بعد ان کا خیال تھا کہ شاید اب ذات پات کی تمیز ختم ہو جائے گی لیکن ہوا اس کے الٹ۔ انگریزوں کے راج میں اونچی ذات کے ہندو ان نیچ ذات والوں پر اتنا ظلم نہیں کر سکتے تھے لیکن آزادی ملنے کے بعد تو انہیں ہر طرح کی آزادی مل گئی۔ شودر کو ہریجن کا نام تو دے دیا گیا لیکن ہر گاؤں میں باقی گاؤں سے الگ انہیں رہنے کی جگہ دی گئی اور ایک سرخ جھنڈا ان کو اپنی بستی پر لازماً لہرانے کا حکم دیا گیا۔ ان کے کنوئیں اور مندر تک الگ ہیں اور کوئی ہریجن اونچی ذات کے ہندوؤں کے کنوؤں سے نہ تو پانی پی سکتا ہے اور نہ ہی ان کے مندروں میں جا سکتا ہے۔ اس صورت حال کو ہریجن زیادہ عرصہ برداشت نہ کر سکے اور ہریجن مرد ڈاکوؤں کے علاوہ پھولن دیوی جیسی درجنوں ڈاکوؤں کی ٹولیاں بنیں جنہوں نے اونچی ذات کے ہندوؤں سے اپنی ذلت کا خوب خوب بدلہ لیا۔ ہندو اب ہریجنوں پر بہت کم اعتبار کرتے ہیں۔ صفائی کرنے والے ہریجنوں کے علاوہ عیسائی بھی ہیں۔ بھارتی افواج میں صفائی کیلئے عیسائی رکھے جاتے ہیں اور میرے منصوبے کے مطابق مجھے ان ہی صفائی کرنے والوں سے بہت کام لینا تھا۔ اس لئے میں ان کے متعلق تمام ممکنہ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

میں نے اپنے چاروں ساتھیوں کو اس کام پر لگا دیا۔ اس دوران مجھے آشا کے دو تین فون آئے اور میں نے اسے فون پر اپنی تڑپ اور محبت کا کچھ ایسا یقین دلایا کہ اس کی آتش شوق کچھ اور بھڑک اٹھی۔ میں نے اسے کہا کہ میری چائے کی بہت بڑی کھیپ بمبئی پہنچ چکی ہے۔ بمبئی کی مون سون اور نمی میں وہ چائے زیادہ دیر وہاں اسٹور نہیں کی جا سکتی اور میں اسے اس علاقے میں بیچنے کے لئے کوشش کر رہا ہوں۔ اس لئے اس سے نہ مل سکا اور مزید چند روز مصروف رہوں گا۔

ایک روز میں دوپہر سے ذرا پہلے سروسز کلب چلا گیا۔ وہاں ریسیپشن میں بورڈ پر وہاں رہائش پذیر افسروں کے نام اور رینک لکھے ہوئے تھے۔ میں نے جلدی جلدی وہ نام اور رینک نوٹ کئے اور کلب سیکریٹری کے کمرے میں چلا گیا اور لکھے ہوئے ناموں میں سے ایک کرنل کا پوچھا۔ اس نے جواب دیا کہ اس وقت تو وہ ڈیوٹی پر گئے ہوئے ہیں اور شام کو 7 بجے کے بعد مل سکیں گے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں نے کرنل صاحب کو پہلے سے نہیں دیکھا۔ ایک دوست کے REFERENCE سے ملنا چاہتا ہوں۔ سیکریٹری نے کہا کہ شام کو وہ بھی یہیں ہو گا اور مجھے کرنل کے پاس لے جائے گا۔ اور اسی شام اچھی طرح ڈریس اپ ہو کر میں سروسز کلب نئی دہلی پہنچ گیا۔

سیکریٹری اپنے دفتر میں موجود نہ تھا۔ میں کلب کے لان میں ٹہلنے لگا۔ کلب میں ممبروں کی آمد شروع ہو چکی تھی۔ ٹہلنے کے دوران میں ان پر بھی نظر رکھ رہا تھا۔ سول اور یونیفارم میں کچھ جوان آفیسرز لان میں ایک الگ گروپ بنائے کھڑے تھے۔ جبکہ ان سے کچھ فاصلے پر ادھیڑ عمر ٹاپ براس کا اپنا الگ گروپ تھا۔ میں نے دیکھا کہ ان سے بالکل علیحدہ لان کے دوسرے کونے کے قریب ایک بڑی بڑی مونچھوں والا ادھیڑ عمر شخص ایک کرسی پر بیٹھا ہے۔ سامنے میز پر اعلیٰ غیر ملکی وہسکی اور برف کا Bowl اور میز کی دوسری جانب ایک خالی کرسی پڑی ہے۔ محض تجسس کی وجہ سے میں ٹہلتا ٹہلتا اس کی طرف گیا۔ وہ آہستہ آہستہ شراب کی چسکیاں لے رہا تھا۔ اس کے پیچھے ذرا فاصلے پر ایک شخص جو صورت سے BATMAN لگتا تھا مودب طریقے سے کھڑا تھا۔ میں اس سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑا ہو گیا اور ادھر ادھر اچٹتی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ کبھی کبھی اس کی طرف بھی دھیمے مسکراتے ہوئے دیکھتا اور کبھی اپنی گھڑی پر وقت دیکھنے لگتا۔ میں ظاہر کر رہا تھا جیسے مجھے کسی کا انتظار ہو۔ اس کا انداز دیکھ کر مجھے جنرل (ر) گل حسن یاد آ گئے جو دوران سروس بھی راولپنڈی میں ہمیشہ فلیش مین ہوٹل میں رہتے تھے اور ہر شام ہی لان میں اپنی محفل سجاتے تھے اور کراچی میں بریگیڈیئر (ر) نصیر الدین ہمایوں جو KDA کے سابق چیئرمین کراچی جیم خانے میں سب سے الگ تھلگ اسی طرح شام گزارتے تھے۔ یہاں ایک بات شاید قارئین کی دلچسپی کا باعث ہو کہ جنرل گل حسن نے ہی صدر جنرل یحییٰ خان کا استعفیٰ لیا تھا اور بھٹو صاحب کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر بنایا تھا اور صرف 6 ہفتے فوج کا سربراہ رہنے کے بعد صدر سے اختلاف کی وجہ سے انہیں اس عہدے سے ہٹا دیا گیا۔

میں سوچنے لگا کہ شاید یہ مونچھوں والا بھی مجرد زندگی گزار رہا ہے اور میرا یہ قیاس سو فیصد درست نکلا۔ چند ہی منٹ گزرے ہوں گے جب اس نے مجھے مخاطب کیا اور اپنے پاس آنے کو کہا۔ اس کی آواز کے رعب اور دبدبے سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ بریگیڈیئر سے کم رینک کا نہیں ہے۔ میں اس کے قریب گیا تو اس نے کہا ARE YOU WAITING FOR SOME ONE I ARE YOU FROM ARMED FORCES? (کیا تم کسی کا انتظار کر رہے ہو۔ کیا تم مسلح افواج میں ہو)۔ میں نے اسے کہا کہ جناب آپ نے آدھا درست کہا ہے۔ میں ایک صاحب کے انتظار میں ہوں لیکن میں سویلین ہوں۔ وہ سر تا پا ایک فوجی تھا۔

اس نے میرے سراپے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا WHAT A SHAME کہ تم جیسا انسان فوج میں نہ ہو۔ اگر تم چاہو تو میرے ساتھ بیٹھ سکتے ہو اور میں خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو اس نے کہا کہ میں فوج میں کرنل ہوں اور جنرل ہیڈ کوارٹر میں کام کرتا ہوں۔ میں نے اسے کہا کہ آپ نے ایک بات نہیں بتائی کہ آپ غیر شادی شدہ ہیں۔ وہ چند سیکنڈ مجھے گھورتا رہا پھر بولا۔ ''یہ تم کیسے جانتے ہو''۔ میں نے جواب دیا SIR, THIS IS OBSERVATION AND FACE READING میں نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی کہ ''آپ کا چہرہ بتا رہا ہے کہ آپ انتہائی قوت ارادی اور فیصلہ کن شخصیت کے مالک ہیں۔ آپ نے صرف ایک بار محبت کی اور اس میں ناکامی کے بعد آپ نے فوج اور ڈسپلن سے شادی کر لی اور شام کا وقت جو آپ کے ماضی کی تلخ یادوں کو تازہ کر دیتا ہے، آپ شراب میں ڈوب کر گزارتے ہیں''۔ کرنل ہکا بکا چند لمحے مجھے تکتا رہا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے کرنل بڑی مشکل سے اپنے آنسوؤں کو ضبط کر رہا ہے۔ وہ کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک پیگ بنا کر میرے سامنے رکھا اور کہا سوڈا یا پانی میں نے جواباً ON THE ROCKS کہا۔ اس نے میرے گلاس میں برف کے چند ٹکڑے ڈال دیئے۔ کرنل نے میری باتوں کا تو کچھ جواب نہ دیا لیکن یہ کہا کہ مجھے تم سے مل کر مسرت ہوئی اور جب بھی جی چاہے شام کو میرے پاس آ جایا کرو۔ IN THE VERY LIMITED CIRCLE OF MY FRIENDS YOU ARE AN ADDITION کرنل نے کچھ دیر بعد اپنے BAT MAN کو بلانے کے لئے سر پیچھے کیا تو میں نے اپنا گلاس لان کی گھاس پر انڈیل دیا اور تھوڑی دیر کے بعد معذرت چاہتے ہوئے اس کے پاس سے اٹھ آیا۔

اس کرنل کا نام شنکر تھا اور بعد کے صفحات میں آپ پڑھیں گے کہ اس کرنل کی وجہ سے کتنی کامیابی ہوئی۔ میں کلب سیکریٹری کے دفتر میں گیا۔ وہ دفتر میں موجود تھا۔ وہ مجھے لے کر کلب کی بار میں صوفوں پر بیٹھے ایک گروپ کی طرف لے گیا اور ایک شخص کی طرف اشارہ کر کے کہا وہ کرنل ''مدن بیٹھے ہیں'' پھر اس کے قریب جا کر اسے کہا ''سر یہ صاحب دن کو بھی آپ سے ملنے آئے تھے''۔ کرنل مدن نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے کہا کہ ''میں جوشی کے Reference سے آپ کے پاس آیا ہوں'' جوشی کا نام میں نے خود گھڑ لیا تھا کیونکہ بھارت میں جوشی نام کے آخر میں بہت استعمال ہوتا ہے۔ کرنل مدن نے چند لمحے ذہن کو کریدا اور کہا YOU MEAN COL.JOSHI OF IT PUNJAB? میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا کہ میری ان سے دور کی رشتہ داری ہے۔ میں چونک پڑا ہوں کرنل ہنستے ہوئے اٹھا۔ مجھ سے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور کہا کہ جوشی اور میں جیسور میں اکٹھے تھے (سابقہ مشرقی پاکستان کی ایک چھاؤنی جہاں 71ء کی جنگ میں گھمسان کا رن پڑا تھا اور پاکستان اور بھارت کی پنجاب رجمنٹوں نے انتہائی بہادری سے دوبدو لڑتے ہوئے بھاری جانی نقصان اٹھایا تھا) کرنل نے صوفے پر مجھے بٹھایا اس دوران میں نے اپنا کاروباری تعارف اس سے کرایا۔ کرنل نے مجھے پینے کی دعوت دی جو میں نے قبول کر لی اور کہا کہ آپ سے ملنے کا میرا مقصد یہ تھا کہ میں یہاں دہلی میں بہت بور ہو چکا ہوں۔ خصوصاً شام گزارنی تو ایک عذاب ہے۔ اسی لئے آج دن کو بھی آپ سے ملنے آیا تھا اور اب بھی اس لئے آیا ہوں کہ کم از کم ایک شام تو ستھرے ماحول میں گزر جائے۔ کرنل نے جواباً کہا کہ BE MY GUEST میں یہاں کلب میں ہی رہتا ہوں اور میں کلب سیکریٹری کو ابھی بلا کر کہے دیتا ہوں کہ تم جب بھی کلب میں آنا چاہو تمہیں میرے مہمان کی صورت میں ٹریٹ کرے۔ اس کے ساتھ ہی سرگوشی میں مجھے کہا کہ جب اکیلے آؤ تو اپنا بل ضرور ادا کر دیا کرنا۔ میں نے کہا I WILL AND THANKS FOR YOUR HOSPITALITY۔ کرنل نے اپنے ساتھیوں سے میرا تعارف کرایا۔ ان کی گفتگو کا سلسلہ جو میری آمد سے ٹوٹ گیا تھا۔ پھر شروع ہو گیا اور میں بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لینے لگا۔ میں چاہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ افسران سے روشناسی اور بے تکلفی ہو جائے۔ اس دوران کرنل مدن نے کلب سیکریٹری کو بلا کر میرے لئے ہدایات دے دیں اور تھوڑی ہی دیر میں، میں ان میں گھل مل گیا۔ کلب میں آفیسرز ایوننگ جیکٹس یا ایوننگ سوٹ میں آ رہے تھے۔ وہاں پر فوجی افسران کی پہچان بہت آسان ہوتی ہے۔ آفیسر چاہے کسی بھی رینک کا ہو بار کے دروازے سے داخل ہوتے ہوئے اٹینشن ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے بغیر ٹوپی کے سلیوٹ کیا جاتا ہے اور جو اکا دکا سویلین آ رہے تھے وہ سیدھے داخل ہو جاتے تھے۔ اس دوران کلب کی عمارت کے اندر سے زیادہ باہر لان میں رونق تھی۔ لان میں درجنوں میزیں اور کرسیاں رکھ دی گئی تھیں اور نوجوان آفیسر اور چند جوڑے وہاں بیٹھے تھے۔ کرنل مدن نے قریب ایک گھنٹے بعد کارڈ روم میں مجھے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ میں نے انتہائی معذرت کرتے ہوئے کہا کہ مجھے تاش کے کھیل خصوصاً برج کھیلنا نہیں آتا۔ کرنل کے ہمراہ اس کے دو تین ساتھی بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ سب میجر اور لیفٹیننٹ کرنل تھے جو باقی بیٹھے رہے میں نے تھوڑی دیر بعد ان سے اجازت لی اور لان میں چلا آیا۔

ٹریننگ کے دوران مجھے بتایا گیا تھا کہ کیپٹن اور نئے میجر تک کے افسران بہت محتاط ہوتے ہیں جبکہ HIGH BRASS یعنی میجر سے اوپر کے افسران زیادہ احتیاط نہیں کرتے۔ اگر ان HIGH BRASS سے میل جول ہو جائے تو پھر نوجوان افسر بھی سینئرز کے ساتھ ملنے جلنے والوں پر شک نہیں کرتے۔ میں کچھ دیر لان میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک گلاس ہاتھ میں پکڑے ٹہلتا رہا اور پھر واپس اپنے ہوٹل چلا آیا۔ دہلی میں برسات کا آغاز ہو چکا تھا۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہی بوندا باندی شروع ہو گئی اور پھر گھٹائیں ٹوٹ کر برسیں کہ ہر طرف جل تھل ہو گیا۔

یہاں میں قارئین کی خدمت میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ہم 5 افراد جو پاکستان سے مشن کی تکمیل کیلئے بھارت آئے تھے کوئی غیر معمولی انسان نہ تھے۔ یہ تو ہمارا جذبہ تھا جس کے تحت ہم نے اس خطرناک کام کو سرانجام دینے کا بیڑا اٹھایا تھا اور خود کو والنٹیر کیا تھا۔ بھارت میں کامیابیوں کے ساتھ ساتھ ہمیں کچھ ناکامیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ جن کا ذکر بعد میں آئے گا۔ دہلی میں آشا سے ملنا، سروسز کلب میں کرنل شنکر اور کرنل مدن سے ملنا، میرے ساتھیوں کا آرمی ہیڈ کوارٹرز کے سول ملازمین کے دفتری اور گھریلو حالات کی چھان بین کرنا اور اس کے علاوہ ہماری مزید بھاگ دوڑ اور کوششوں کا صرف ایک مقصد تھا کہ ہم ہیڈ کوارٹرز میں نہ صرف داخل ہو سکیں بلکہ وہاں رابطے بھی پیدا کریں تاکہ اہم معلومات حاصل کر سکیں۔ ایک رابطے کو تلاش کرنا اور اگر اس میں ناکامی ہو تو پھر دوسرے رابطے کی تلاش کے بجائے میری حکمت عملی یہ تھی کہ ''دشمن یا اپنے ہدف'' پر چاروں طرف سے حملہ کیا جائے اس میں نہ صرف وقت کی بچت تھی بلکہ دشمن کا کوئی WEAK POINT ملنے کا بھی قوی امکان تھا۔ ہمیں تازہ ترین معلومات اور ان کا تسلسل قائم کرنے کی ضرورت تھی اور اس کیلئے ہم چند نہیں بلکہ سینکڑوں رابطے تلاش کرنے کو تیار تھے، چاہے وہ اعلیٰ ترین ہوں یا کمترین۔ ہم اپنے مقصد کے حصول کیلئے انتہائی بلندی اور پستی کی انتہائی گہرائیوں میں گرنے کو بھی تیار تھے۔ اسے آپ جنون کہہ لیں، وطن سے محبت یا سقوط ڈھاکہ کے لگے ہوئے زخموں کا درد کہ ہم ہر خطرے اور اس کے انجام سے بے پروا اپنے مقاصد کے حصول کے لئے کوشاں تھے۔

غازی

اگلا دن بارش کی نذر ہو گیا اور اس سے اگلے چند روز میں نے سروسز کلب میں گزارے لیکن کامیابی کی کوئی صورت دکھائی نہ دی۔ مونچھوں والے کرنل شنکر سے بھی لان میں دو بار ملاقات ہوئی۔ اس کا میرے ساتھ رویہ تضاد کا مجموعہ تھا۔ ایک طرف وہ پہلی ملاقات میں میری گفتگو سے کچھ محتاط سا لگتا تھا شاید وہ سمجھ بیٹھا تھا کہ میں اس کے ماضی سے واقف ہوں یا اس کے اندر جھانکنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ دوسری طرف وہ میری کمپنی سے خوش ہوتا تھا۔ ہر ملاقات کے خاتمے کے بعد آئندہ ملنے کے لئے زور دیتا تھا۔ اس کے محتاط رویئے کے پیش نظر میں نے بھی اس سے کبھی ہیڈ کوارٹر سے متعلق بات نہیں کی۔ ایک روز میں اس کے پاس 7 بجے شام گیا تو وہ اپنے کمرے میں تھا۔ میں نے دروازہ KNOCK کیا تو بیٹ مین نے اسے میرے متعلق بتایا اور مجھے SITTING ROOM میں بٹھا دیا۔ کرنل شنکر کے پاس دو کمروں کا سیٹ تھا۔ بیڈ روم اور سٹنگ روم تھوڑی دیر بعد کرنل وردی پہنے بیڈ روم سے باہر آیا۔ اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ اس نے کہا کہ اسے ایک ارجنٹ میٹنگ کے لئے ہیڈ کوارٹر جانا ہے۔ اس لئے وہ میرا ساتھ نہ دے سکے گا اور میں سوچ رہا تھا کہ اس بریف کیس میں نجانے کتنی اہم فائلیں ہوں گی۔ اتنی مختصر بات کے بعد ہم دونوں باہر آ گئے۔ پارکنگ میں ایک ہندوستانی گاڑی ہیڈ کوارٹرز کی نمبر پلیٹ کے ساتھ کھڑی تھی۔ کرنل نے ہاتھ ملایا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے تیزی سے چلا گیا۔ اگر مجھے پہلے سے اس شام کے حالات کا علم ہوتا تو میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بریف کیس کے حصول کے لئے کرنل کو ختم کرنے سے بھی گریز نہ کرتا، لیکن اب یہ بے سود تھا۔ اب اس بریف کیس کے حصول کے لئے مجھے شیر کی طاقت کے ساتھ ساتھ لومڑی کی چالاکی کو بھی استعمال کرنا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ کرنل کے بیٹ مین کو پھانسنے کی کوشش کروں گا۔

ان چند دنوں میں، میں اپنے ساتھیوں سے ایک بار ملا۔ وہ سب اپنی کوششوں میں مصروف تھے لیکن کوئی خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی تھی۔ ہم نے حساب لگایا کہ جتنے کم عرصے میں ہم نے احمد نگر کی فائلیں پاکستان بھجوائی ہیں۔ اس بڑی کامیابی سے ہمارے سینئرز ہمارا خاصا بلند امیج بنا چکے ہوں گے۔ لہٰذا اسے قائم رکھنے کیلئے ہم نے اپنی کوششیں تیز کر دیں۔ ہمارے CONTACT کی آمد میں بھی کم وقت رہ گیا تھا۔ فائلوں کے حصول میں کامیابی پر اپنے سینئرز کا ردعمل بھی دیکھنے کی خواہش تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اس بار بھی اپنے CONTACT کے ذریعے مزید مواد بھیجوں۔ اس کے لئے میں کرنل شنکر کے بیٹ مین کو ایک بار ٹٹولنا چاہتا تھا۔ اگر وہ ہاتھ نہ آتا تو پھر گھی تو نکالنا ہی تھا۔ چاہے ٹیڑھی انگلی سے نکالنا پڑتا۔

اس دوران آشا کا پھر فون اور اس نے مجھ سے کہا کہ شام کو 4 بجے اکبر ہوٹل کی کافی شاپ میں اس سے ملوں۔ میں 4 بجے اکبر ہوٹل چلا گیا کافی شاپ میں آشا ایک خوبرو جوان کے ساتھ بیٹھی تھی۔ میں ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ ان کی ٹیبل پر جاؤں یا نہ کہ آشا نے آواز دے کر مجھے بلایا اور اس جوان سے متعارف کرایا وہ M.E.S کے ایک بریگیڈیئر کا لڑکا تھا اور زیر تعلیم تھا۔ آشا نے یا تو میرا قرب حاصل کرنے کیلئے مجھے جلانے کی کوشش کی تھی یا پھر وہ اس کے شوہر کیلئے ایک اور ٹھیکہ حاصل کرنے کا ذریعہ تھا۔ وہ جوان فون کرنے کے لئے لابی کی طرف گیا تو آشا نے بتایا کہ میرا دوسرا خیال درست تھا۔

میں ان کے ساتھ قریباً آدھ گھنٹہ بیٹھا رہا۔ اس دوران آشا کبھی اس نوجوان کے قریب ہو کر سرگوشی میں اس سے بات کرتی اور کبھی بے تکلفی سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتی اور اس نوجوان کو میرے چائے کے کاروبار کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتی اور کبھی مجھے اس کی شاہ خرچیوں کا بتاتی۔ مجھے بہت جلد ہی محسوس ہو گیا کہ آشا کا مجھے یہاں بلانے کا مقصد بیک وقت دو شکار کرنا تھا۔ وہ ہم دونوں میں رقیبانہ جذبات پیدا کرنا چاہتی تھی تا کہ ہم دونوں سے اپنے مقاصد پورے کر سکے۔ آشا سے دوبارہ جلد ملنے کا وعدہ کر کے میں ان کی ٹیبل سے اٹھ آیا۔ آشا نے مجھ سے تعارف کے بعد اپنی نجی زندگی کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا میرے خیال میں اس کی وجہ اس کی ازدواجی زندگی کی محرومیاں اور اس کے شوہر کا اسے محض ٹھیکے حاصل کرنے کیلئے استعمال کرنا تھا۔ جے چند جیسے بوڑھے سے اس کی شادی کی وجہ اسکے والد کی مالی مجبوریاں تھیں لیکن جے چند نے بھی اپنے کاروبار میں اسے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا اور یہ پڑھی لکھی جوان حسین عورت اپنے شوہر اور اپنے سماج سے باغی ہو چکی تھی۔ جب میں نے کہا کہ میں غیر شادی شدہ ہوں۔ بمبئی میں خاصا بڑا کاروبار ہے اور اس کے حسن سے بہت متاثر ہوا ہوں، تو عین ممکن ہے کہ آشا نے اپنے مستقبل کو میرے ساتھ وابستہ کر کے سنہرے سپنے دیکھنے شروع کر دیئے ہوں۔ بہر حال آشا کے رویئے سے میں نے محسوس کیا کہ وہ فی الحال میرے کام نہیں آ سکتی اور اپنے ہوٹل پہنچتے پہنچتے میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ آشا کو STAND. 2 پوزیشن پر رکھ کر دیگر ممکن ذرائع کو استعمال کروں جن میں میرے ساتھیوں کی مہیا کردہ معلومات، کرنل شنکر کا بیٹ مین، اشوکا اور اکبر ہوٹل میں شامیں گزارنے والے فوجی افسران اور ان کی بیگمات شامل تھیں۔

میں اگلی صبح محلہ فراش خانہ گیا ساتھیوں کے مکان کے سامنے مخصوص آواز نکالی اور واپس بڑی سڑک پر آ گیا۔ تھوڑی دیر میں ٹرانسمیٹر والا ساتھی وہاں پہنچ گیا۔ میں نے شام کو ایک ریسٹورنٹ میں میٹنگ کیلئے کہا جس میں وہ چاروں اپنی اپنی کارکردگی مجھے بتائیں۔ اس میٹنگ میں چاروں نے کہا کہ فی الحال کوئی پیش قدمی نہیں ہو سکی۔ بارش کی وجہ سے دہلی کی بھیڑ بھاڑ میں خاصی کمی آ چکی تھی اور ایسے حالات میں کسی کا پیچھا کرنا شک پیدا کر سکتا تھا۔

ساتھیوں کے ساتھ میٹنگ کے تیسرے روز CONTACT سے ملاقات کا دن تھا۔ مقررہ وقت پر CONTACT سے ڈاک وصول کی اور اپنا پیکٹ اسے دے دیا۔ جلد جلد ZIG ZAG رستہ اختیار کر کے اپنے ہوٹل پہنچا تا کہ اگر کوئی پیچھا کر رہا ہو تو اسے جھٹک سکوں۔ اس بار ساری ڈاک "سفید" صفحات پر مشتمل تھی۔ میں نے ان سفید صفحات کو گرمی پہنچائی تو الفاظ ابھر آئے۔ میری بھیجی ہوئی دونوں فائلیں بحفاظت انہیں مل چکی تھیں۔ میری اس کامیابی کو بہت سراہا گیا تھا۔ بہترین الفاظ میں مجھے شاباش اور مبارک دی گئی تھی۔ میرے ساتھیوں کیلئے بھی علیحدہ علیحدہ تعریفی اور شاباشی کے خطوط تھے۔ ہمارے گھروں میں سب خیریت کا مژدہ بھی تھا۔ میرے خط میں لکھا تھا کہ میری کارکردگی کے عوض 20 ہزار روپیہ میرے گھر والوں کو پہنچا دیا گیا ہے۔ ان دنوں پاکستان میں چائے، چینی اور بناسپتی گھی کی بہت کمی تھی، اس لئے ہم پانچوں کے گھروں میں یہ اشیا وافر مقدار میں بھیج دی گئی تھیں۔ پہلے مشنوں کو جاری رکھتے ہوئے مجھے ایک نیا اور انتہائی اہم مشن سونپا گیا تھا۔ ہماری ایجنسی کا ایک گروپ پہلے ہی اس مشن پر کام کر رہا تھا۔ (یہ مجھے اس ڈاک کے ذریعے معلوم ہوا) احمد نگر میں میری کامیابی کے بعد میرے گروپ کو بھی یہی مشن اپنے طور پر کرنے کے احکام ملے تھے۔ یہ مشن تھا کہ تارا پور کے ایٹمی بجلی گھر سے ENRICHED (افزودہ کردہ) یورینیم کہاں بھیجا جا رہا ہے اور یورینیم کس کام میں لایا جا رہا ہے، اس کے متعلق ہر ممکن معلومات حاصل کروں۔ اس ڈاک میں بھی ہمارے لئے تیس ہزار بھارتی روپے تھے۔ دس ہزار میرے لئے اور پانچ پانچ ہزار میرے ساتھیوں کے لئے۔ جو ڈاک میرے لئے تھی اسے میں نے پڑھ کر ہمیشہ کی طرح نذر آتش کر دیا۔ فائلوں کی فلم بھی ضائع کر دی اور ساتھیوں کی ڈاک اور ان کے روپے ان کے حوالے کئے۔ انہوں نے جب اپنی ڈاک پڑھ لی تو میں نے ان کی ڈاک واپس لے کر وہیں جلا ڈالی۔ ہم کسی بھی صورت خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھے۔

مجھے احساس ہو رہا تھا۔ احمد نگر میں میری کامیابی سے میرے سینئرز نے مجھ سے بہت توقعات وابستہ کر لی تھیں اور اسی لئے تارا پور کا مشن بھی مجھے سونپا گیا۔ تربیلہ میں ملازمت کے دوران غیر ملکی ملازمین سے مجھے اتنا تو معلوم ہو چکا تھا کہ تارا پور ایٹمی بجلی گھر بجلی پیدا کرنے کے علاوہ کچھ اور بھی تیار کر رہا ہے۔ لیکن نیوکلیئر انرجی کے متعلق میری معلومات صفر تھیں۔ لہٰذا میں نے دہلی کے مختلف بک اسٹالوں سے نیوکلیئر انرجی کے متعلق ابتدائی کتابوں سے لے کر وہ کتابیں بھی خرید لیں جن میں زیادہ ٹیکنیکل معلومات تھیں۔ میں نے فارغ وقت میں ان کا مطالعہ شروع کر دیا تا کہ جب میں اس مشن پر جاؤں تو نیوکلیئر انرجی کے متعلق بالکل کورا نہ ہوں۔

میرے ساتھی اس بار کی ڈاک میں شاباشی پا کر تر و تازہ ہو چکے تھے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ اچھی کارکردگی کے اعتراف میں ایک تھپکی وہ کام کر دیتی ہے جو ہزاروں لاکھوں روپے نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے تفویض کئے ہوئے کام زیادہ تندہی سے کرنے لگے اور چند روز میں ہی مکمل معلومات اور تصاویر مجھے لا دیں۔ آرمی ہیڈ کوارٹر میں کام کرنے والے ایک سپرنٹنڈنٹ کا نام لیشونت تھا اس کا گھر پرانی دہلی میں ایک تنگ گلی میں تھا۔ اور اس کی دو بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ بڑی بیٹی ایک اسکول میں ٹیچر تھی اور دوسرے بچے اسکول اور کالج کے طالب علم تھے۔ لیشونت ہفتے میں ایک دو بار گانا سننے مخصوص بازار میں جاتا تھا۔ اس کی بیوی مر چکی تھی۔ ان اطلاعات کے ساتھ ان سب کی چلتے پھرتے تصویریں بھی اتار لی گئی تھیں۔ ایک سویلین کلرک تھا جو لیشونت کے گھر کے قریب رہتا تھا۔ وہ جوان اور غیر شادی شدہ تھا اور لیشونت کی بڑی بیٹی سے اس کا AFFAIR چل رہا تھا۔ اس کلرک کا نام مدھوک تھا۔ اس کلرک کی لیشونت کی لڑکی کے ساتھ بھی ایک تصویر اتار لی گئی تھی۔ لڑکی کا نام شانتی تھا۔ آرمی ہیڈ کوارٹرز کے دو صفائی کرنے والوں کی دو تصاویر بھی اتاری گئی تھیں۔ یہ دونوں عیسائی تھے اور ان کے گھروں کا ایڈریس بھی حاصل کر لیا گیا تھا۔ میرے ساتھیوں کے اس ہوم ورک سے ہمیں ہیڈ کوارٹرز میں پہنچنے کے نئے رستے دکھائی دیئے۔ چونکہ یہ سارا کام میرے ساتھیوں نے کیا تھا اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ انہیں آئندہ کی پلاننگ میں پوری طرح شامل کروں۔ مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ بطور گروپ لیڈر میرا ان کو اپنے منصوبوں کی تفصیل نہ بتانے کا یہ اثر ہو رہا ہے کہ وہ مجھ سے کھل کر بات نہیں کرتے۔ یہ تو ان کی فوجی ٹریننگ اور ڈسپلن کی وجہ سے تھا کہ وہ میرا ہر حکم بلا چوں چرا بجا لاتے تھے۔ ورنہ دشمن ملک میں اگر وہ میری بات ماننے سے انکار کر دیتے تو میں ان کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ مجھے ان سے بڑی حکمت عملی سے کام لینا تھا اور اب وہ موقع آن پہنچا تھا کہ میں انہیں اپنے مکمل اعتماد میں لوں اور ہیڈ کوارٹرز تک رسائی کیلئے ہم سب اکٹھے بیٹھ کر منصوبہ بندی کریں۔

میں آج تک ان کے گھر کے اندر نہیں کیا گیا تھا اور اس کی وجہ محض سیکورٹی تھی۔ میں نے انہیں کہا کہ کل شام میں ان کے گھر آؤں گا اور وہیں ہم سب اس مشن کی منصوبہ بندی کریں گے۔ انہیں ابھی تک چونکہ کوئی مکمل مشن سونپا نہیں گیا تھا اور عین ممکن تھا کہ ان کی یہ سوچ ہوتی کہ ان کی مدد سے مشن مکمل کر کے سارا کریڈٹ میں لینا چاہتا ہوں۔ اگر انہیں یہ غلط فہمی تھی تو میں اسے بھی دور کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہ تھی۔ میں صرف ایک بات سے خوف زدہ تھا کہ وہ جونیئر رینکس سے تھے۔ جن کا کام صرف احکامات کی تعمیل کرنا ہوتا ہے اور وہ دماغ سے ذرا کم ہی کام لیتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ کہیں حالات بگڑ گئے تو وہ سنبھال نہ سکیں گے اور سارا کھیل ہی نہ بگڑ جائے۔ دوسرے ان کا گروپ لیڈر بنا کر سارے مشن کی اور ان کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی تھی۔ بہر حال اب حالات کا تقاضہ تھا کہ میں انہیں اس مشن میں شامل کروں۔

اگلی شام میں حسب وعدہ ان کے گھر گیا۔ وہاں اس مشن کا تفصیلی جائزہ لیا گیا اور یہ فیصلہ ہوا کہ دو خاکروبوں کو میرے دو ساتھی الگ الگ سنبھال لیں گے اور سپرنٹنڈنٹ لیشونت کے بارے میں میرے باقی ساتھی پتا چلائیں گے کہ وہ کسی مخصوص بالا خانے پہ جاتا ہے یا مختلف بالا خانوں پر۔ لیشونت کے متعلق مطلوبہ معلومات ملنے پر میں اسے سنبھال لوں گا۔ یہ فیصلہ ہونے پر سب مطمئن تھے۔ میں نے خاکروبوں سے رابطہ کرنے والے ساتھیوں کو مزید ہدایات دیں اور رات کا کھانا کھانے کے بعد میں واپس لوٹ آیا۔ اگلی تین شامیں میں نے اکبر ہوٹل اور اشوکا ہوٹل میں گزاریں۔ میں چوتھے روز دن کے 10 بجے سروسز کلب میں کرنل شنکر کے کمرے میں چلا گیا۔ اس کا بیٹ مین کمرے کی صفائی میں مصروف تھا۔ اس نے یہ بتا کر کہ کرنل صاحب دفتر گئے ہیں، مجھے باہر سے ہی رخصت کرنا چاہا۔ مجھے اور کچھ نہ سوجھا تو میں نے اس سے پانی مانگا اور کہا کہ سر میں بہت درد ہے اگر اسپرین وغیرہ ہو تو پانی کے ساتھ دو گولیاں بھی دے۔ بیٹ مین نے مجھے SITTING ROOM میں بٹھایا۔ اسپرین اور پانی لینے کے بعد میں نے اس کا نام پوچھا تو اس نے عبدالکریم بتایا اور کہا کہ وہ کرنل کے ساتھ 8 ماہ سے ہے۔ میں نے کہا کہ عبدالکریم اپنے متعلق کچھ اور بھی بتاؤ۔ میں سر درد کے بہانے کرسی پر نیم دراز ہو گیا اور عبدالکریم نے بولنا شروع کیا۔

"صاحب میں 4 سال سے بھارتی فوج میں ہوں۔ میں ہوں تو انفینٹری میں لیکن عملی طور پر اب تک مختلف افسران کا بیٹ مین ہی رہا ہوں۔ کرنل صاحب کے پاس آنے سے پہلے میں آگرہ چھاؤنی میں ایک میجر صاحب کا بیٹ مین تھا۔ کرنل صاحب اپنی سخت طبیعت کی وجہ سے نہ تو کسی سے مطمئن ہوتے ہیں اور نہ ہی کوئی ان کے بیٹ مین بننے پر خوشی سے رضامند ہوتا ہے۔ جب سے میں یہاں آیا ہوں کرنل صاحب کی میں بھرپور خدمت کرتا ہوں لیکن ہر روز ہی مجھے گالیوں سے نوازا جاتا ہے۔ کرنل صاحب جب موڈ میں ہوتے ہیں تو کچھ پیسے وغیرہ بھی دے دیتے ہیں اور جب ناراض ہوتے ہیں تو بے تحاشہ گالیاں دیتے ہیں۔ 4 سال سے، پہلے ٹریننگ کے دوران اور بعد میں مختلف افسروں کا بیٹ مین ہونے کے دوران مجھے اتنی گالیاں پڑ چکی ہیں کہ اب میں ان کا عادی ہو چکا ہوں اور اپنی قسمت پر شاکر ہوں۔ فوج چھوڑنے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ نہ ماں باپ زندہ ہیں اور نہ شادی کی ہے۔ عبدالکریم بڑی ستھری اردو بول رہا تھا۔ میں نے پوچھا کہ تم رہنے والے کہاں کے ہو؟ اس نے کہا "حضور! لکھنؤ میرا آبائی وطن ہے۔ والدین کے گھر میں تو غربت ہی دیکھی لیکن وہ کہا کرتے تھے کہ میرے دادا نواب تھے۔ والد مرحوم نے بھی خاندانی روایات اور اپنی وضع داری کا بھرم قائم رکھنے کیلئے تھوڑی بہت جائیداد اور رہائشی حویلی پہلے رہن رکھی اور بعد میں بیچ ڈالی۔

جب میں نے ہوش سنبھالا تو گھر میں غربت ہی دیکھی۔ ابھی 10 سال کا بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک سال کے اندر چند ماہ کے وقفے سے والدین کا انتقال ہو گیا۔ میں بالکل بے آسرا رہ گیا۔ والد مرحوم کے جاننے والے ایک دکاندار نے مجھے اپنے گھر میں پناہ دی اور میٹرک تک تعلیم دلوائی۔ انہوں نے ہی مجھے فوج میں بھرتی کروا دیا کہ یہاں عزت سے روٹی کما سکوں گا۔ یہاں روٹی تو مل گئی لیکن مسلسل گالیوں سے ماں باپ، خاندان اور مذہب کی دھجیاں اڑ گئیں۔ عبدالکریم بولے جا رہا تھا اور میرا ذہن کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ چند نکتے تھے جن کے گرد میرا ذہن گھوم رہا تھا۔ فوجی، مسلمان، ہندو افسران کی گالیوں سے بیزار بلکہ کسی حد تک باغی، کوئی رشتہ دار نہیں اور ہیڈ کوارٹر کے ایک اہم سینئر افسر کا بیٹ مین۔ حالات نے اس کا پہلے ہی خاصا برین واش کر رکھا تھا اور باقی کام میں کر سکتا تھا۔ ایک بڑی دشواری تھی کہ میں نے ہندو ہونے کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ اپنی اصلیت ظاہر کرنے میں ففٹی ففٹی چانس تھا۔ ایک یہ کہ وہ میرا ساتھ دے گا اور دوسرے یہ کہ میرا بھید کھول کر ہندو افسران کی نظر میں خود کو وفادار اور بھارت ماتا کا سپوت ثابت کرنے کی کوشش کرے گا۔

میں اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا لیکن اس کیلئے مناسب منصوبہ بندی اور مزید سوچ و بچار کی ضرورت تھی۔ میں نے اٹھتے ہوئے عبدالکریم سے کہا کہ میں اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ میں اس کیلئے یقیناً کچھ کروں گا۔ میں نے اسے کہا کہ میری آمد کا کرنل صاحب کو نہ بتائے۔ باتیں تو وہ کر چکا تھا لیکن اس ڈر سے سہم بھی گیا تھا کہ میں کرنل کو اس کی گفتگو کے بارے میں نہ بتا دوں۔ اس نے کہا کہ صاحب آپ کرنل صاحب کو کچھ نہ بتائیں۔ میری زبان تو ہرگز نہ کھلے گی۔ میں نے اس سے لکھنؤ کے اس دکاندار کا نام اور دکان کا نام اور محل وقوع پوچھا جو اس نے بتا دیا۔ میں چاہتا تھا کہ اس کی کہی ہوئی باتوں کی سچائی جان سکوں۔ اسے 5 سو روپے دے کر میں وہاں سے رخصت ہوا اور میرا دماغ اس سلسلے میں مزید کچھ کرنے کے تانے بانے بننے لگا۔

بہت سوچ بچار کے بعد بالآخر میں نے فیصلہ کر لیا کہ عبدالکریم سے کام لینے کی کوشش ضرور کرنی چاہئے لیکن کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے اس کے متعلق مکمل چھان بین کی جائے۔ شام کو میں اپنے ساتھیوں سے ملنے ان کے گھر گیا۔ اتفاق سے مالک مکان گھر میں ہی تھا۔ مکان کی اوپر کی منزل کی سیڑھیاں اگرچہ ڈیوڑھی میں ہی تھیں لیکن گلی میں مکان کے دروازے سے گزر کر ہی سیڑھیوں تک پہنچا جا سکتا تھا۔ دروازہ مالک مکان نے ہی کھولا۔ میں نے اسے اپنا نام اظہر علی بتایا اور کہا کہ میرا ایک کاروباری واقف یہاں رہتا ہے (اس نے ساتھیوں میں سے ایک کا نام بتایا۔ وہ یہاں اپنے اصلی ناموں سے ٹھہرے ہوئے تھے تا کہ مختلف ناموں کے چکر میں کبھی غلط نام نہ بتا بیٹھیں)۔ مالک مکان نے مجھے اوپر جانے دیا۔ میں نے ساتھیوں کے ساتھ ایک کمرے میں میٹنگ کی اور کہا کہ ایک شخص کے کوائف معلوم کرنے کیلئے لکھنؤ جانا ہے۔ سبھی جانے کو تیار تھے لیکن میں نے دو کا انتخاب کیا اور انہیں لکھنؤ میں ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر رہنے کی ہدایت کی۔ اس دکاندار سے جس نے بقول عبدالکریم، اس کی پرورش کی تھی، عبدالکریم کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنا اور اگر اس کا کوئی قریبی رشتہ دار موجود ہو تو اس کا پتہ لگانا اور ان کی چھان بین کرنی تھی۔

میرے دونوں ساتھی رات کو ہی ٹرین سے روانہ ہونے کیلئے تیار ہو گئے۔ میں نے انہیں 3 دن دیئے تا کہ تمام معلومات حاصل کر کے چوتھے روز واپس آ جائیں۔ کئی بار احتیاطی تدابیر کو نظر انداز نہ کرنے کا کہہ کر انہیں اللہ حافظ کہا اور واپس اپنے ہوٹل چلا آیا۔

قسط نمبر 11

غازی

اگلے روز شام کو میں کرنل شنکر کے پاس گیا۔وہ حسب معمول لان میں مے کی محفل سجائے بیٹھا تھا۔عبدالکریم برآمدے میں حکم بجالانے کیلئے مودب کھڑا تھا۔عبدالکریم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اور سر کو ذرا جھکا کر مجھے سلام کیا۔آج کرنل بھی موڈ میں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا۔ہیلو مسٹر پامست PLEASE COME AND JOIN ME(آئیں اور میرا ساتھ دیں)۔میں نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کی تا کہ جو موضوع کرنل کو پسند آئے اسی پر بات کریں۔وہ شاید میرا نام بھول چکا تھا اس لئے بار بار مسٹر پامست کہہ رہا تھا۔میں نے ہنستے ہوئے کہا کرنل صاحب میں چائے بیچتا ہوں اور میرا نام ونود ہے اور آپ مجھے پامست کہہ رہے ہیں۔کرنل نے صاف گوئی سے کہا کہ مجھے تمہارا نام یاد نہیں آرہا تھا لیکن پامست میں تمہیں اس لئے کہہ رہا تھا کہ پہلی ملاقات میں ہی تم نے میرے ماضی کے متعلق صحیح باتیں بتادیں۔میں نے کہا میں پامسٹری (دست شناسی) کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہوں البتہ FACE READING (چہرہ شناسی) میں کچھ شدبد رکھتا ہوں اور وہ بھی اپنے کاروبار میں مختلف لوگوں سے ملنے کی وجہ سے۔ان کے موڈ کو دیکھ کر چہرے کے تاثرات سے کچھ اندازہ لگالیتا ہوں۔کرنل کہنے لگا لیکن میرے متعلق تم نے کیسے اندازہ لگایا؟ میں نے کہا کہ سروسز کلب میں آپ کی رہائش سے اندازہ لگایا کہ آپ کی فیملی نہیں ہے۔ورنہ آپ کو سرکاری بنگلہ مل سکتا تھا۔کلب کی رونقوں کو چھوڑ کر آپ اپنی الگ محفل سجاتے ہیں۔بقول آپ کے آپ کا حلقہ احباب بہت چھوٹا ہے۔آپ اپنی شام مے نوشی میں گزارتے ہیں اور تنہائی پسند ہیں اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ماضی کی کچھ ایسی یادیں ہیں۔جو آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتیں اور آپ بھی ان یادوں کو خود سے الگ نہیں کرنا چاہتے اور ایسی یاد جوانی میں محبت میں ناکامی کی ہی ہو سکتی ہے۔کرنل غور سے میری باتیں سن رہا تھا۔میں نے سلسلہ برقرار رکھتے ہوئے کہا کہ چونکہ میں خود بھی ماضی میں ایسی ہی ناکامی کا شکار ہوا ہوں،اس لئے آپ کے اس اندرونی درد کو بخوبی سمجھ گیا۔آپ کو دیکھ کر مجھے ایک شعر یاد آیا ہے۔

کچھ اس طرح سے سجائے ہیں ہم نے ویرانے
کہ اہل شہر بھی آتے ہیں جی کو بہلانے

میں تو چاہتا ہوں کہ ہر شام آپ کے ساتھ گزاروں لیکن محض اس لئے روز نہیں آتا کہ ایسی یادوں میں کھونے والا اپنی تنہائی میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتا۔اسی موضوع پر یاد نہیں میں نے اور کیا کچھ کہا لیکن جب میں خاموش ہوا تو یہ سخت گیر کرنل موم کی طرح پگھل چکا تھا۔لان میں جلتی نیلگون لائٹس میں اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز نظر آتی تھیں۔کرنل کچھ دیر کرسی کی بیک سے سر لگائے خاموش بیٹھا رہا۔جب وہ خود پر قابو پا چکا تو بولا۔میں نے اپنے ماضی کے بارے میں آج تک صرف دو تین دوستوں کو بتایا ہے اور آج تمہیں اس لئے بتا رہا ہوں کہ تم بتائے بغیر میرے ماضی کو کرید چکے ہو۔میں لاہور کا رہنے والا ہوں اور راوین ہوں۔میں نے اسے ٹوکتے ہوئے انجان بن کر پوچھا،راوین سے آپ کی مراد کیا ہے (حالانکہ میں خود گورنمنٹ کالج لاہور (ضلع کچہری کے پاس) کا اسٹوڈنٹ رہ چکا ہوں۔یہ کالج تقسیم ہند سے پہلے برصغیر کا بہترین کالج مانا جاتا تھا اور اس کے طلبا خود کو راوین کہتے ہیں)۔کرنل نے مجھے بتایا کہ کالج میں شیلا بھنوٹ نامی ایک کرسچن لڑکی سے اسے محبت ہوگئی۔وہ اس کی کلاس فیلو تھی اور یہ یکطرفہ محبت نہ تھی بلکہ یہ آگ دونوں طرف یکساں بھڑکی ہوئی تھی۔وہ کالج کے نمایاں طلبا میں تھا اور پیرا کی میں کالج ٹیم کا کیپٹن تھا۔اس نے فیصلہ کیا تھا کہ گریجویشن کے بعد ICS (انڈین سول سروس) کا امتحان دے گا۔شیلا بھی یہی چاہتی تھی۔دونوں نے بی اے کا امتحان اکٹھے دیا تھا۔دونوں کے گھر کوپر روڈ پر تھے۔اس کے پتا جی پنجاب گورنمنٹ میں ملازم تھے۔ہم دونوں کے گھر والے اس محبت سے آگاہ تھے اور ایک دوسرے سے اکثر ملتے رہتے تھے۔اپریل 47ء میں لاہور بھی ہندو مسلم فساد کی لپیٹ میں آگیا۔ایک شام فسادیوں نے اس کے گھر کے سامنے والے گھر کو آگ لگادی۔وہ گھر مسلمانوں کا تھا۔اس کے پتا جو دل کے مریض تھے،یہ منظر دیکھ کر انہیں دل کا دورہ پڑا اور وہ سورگ باش ہوگئے۔

اس نے بتایا کہ ’’فسادیوں کی شرانگیزی پر تو چند روز میں قابو پالیا گیا لیکن پتا جی کی موت نے ہمیں اجاڑ دیا۔ ہمارے پاس جمع پونجی نہ ہونے کے برابر تھی۔گھر کا سارا بوجھ مجھ پر آن پڑا تھا۔میں نے رنگ محل میں ایک دکان پر جز وقتی ملازمت کرلی۔امید تھی کہ پتا جی کے فنڈ وغیرہ مل جائیں گے تو میں ICS کی تیاری شروع کردوں گا۔شیلا کے گھر والوں پر ہماری مالی کمزوری کا راز کھل چکا تھا اور وہ کچھ کھنچے کھنچے سے رہنے لگے۔اسی دوران شیلا کیلئے ایک انڈین کرسچین کیپٹن کا رشتہ آیا۔شیلا نے بھی اب مجھ سے دور رہنا شروع کردیا تھا۔میں نے شیلا کو لاکھ سمجھانے کی کوشش کی لیکن بے سود۔میں نے اسے گزرے دنوں کی باتیں اور قسمیں وعدے یاد دلائے لیکن بے سود۔اور ایک دن شیلا اس کیپٹن کی دلہن بن کر چلی گئی لیکن میرے دل سے نہ نکل سکی۔میں اپنی بے سروسامانی کے بوجھ تلے دبا ہوا شیلا کو گرجے سے کیپٹن کی دلہن بن کر نکلتے ہوئے دیکھتا رہا لیکن کچھ نہ کر سکا۔مجھے ایک چپ سی لگ گئی تھی۔اسی دوران تقسیم ہند ہوگئی۔میں اپنی ماتا اور دو بہنوں کو لے کر بھارت چلا آیا۔لاہور میں ہمارا مکان میرے پتا کے ایک دوست نے مناسب داموں پر ہم سے خرید لیا تھا۔اس مکان کی جو رقم ملی تھی اس سے میں نے اپنی بہنوں کے ہاتھ پیلے کئے۔کچھ عرصے بعد میری ماتا جی بھی چل بسیں۔اب میں یکا و تنہا تھا۔میں نے فوج جوائن کرلی۔ڈیرہ دون میں ڈھائی سال کی تربیت کے بعد سیکنڈ لیفٹیننٹ بنا۔میں نے پوری کوشش کی کہ شیلا کو دل سے نکال دوں لیکن اس کی محبت اور یاد کی جڑیں دل میں کچھ اتنی گہرائی تک پہنچ چکی تھیں کہ ناکام رہا۔

کرنل کی دکھتی رگ پر میرا ہاتھ کچھ ایسا پڑا تھا کہ اس کے جذبات کے سارے بند ٹوٹ چکے تھے۔وہ بولتا چلا گیا۔’’65ء کی بھارت پاکستان جنگ کے دوران ایک انفنٹری کمپنی کا کمانڈر تھا اور لاہور سیکٹر پر میری کمپنی تعینات تھی۔میرے ریکی کرنے والے جوانوں نے بتایا کہ پاکستان کی ایک بڑی توپ (غالباً رانی یا شیرنی جو 250 پاؤنڈ کا گولہ 22 میل تک پھینک سکتی ہے) کی لوکیشن انہوں نے دیکھ لی ہے۔میں اگر چاہتا تو اپنی آرٹلری کو بتا کر اس توپ کو تباہ کروا سکتا تھا لیکن میں ڈیٹی آرٹلری کو نہ بتا سکا۔اگرچہ ہمارا مواصلاتی رابطہ اپنی آرٹلری (توپ خانے) سے کٹ چکا تھا لیکن ان تک پیغام پہنچانے کے اور ذرائع بھی تھے۔یہ شاید لاہور سے میری محبت اور شیلا کی وجہ سے ہوا جو لاہور میں رہتی تھی کہ میں اپنا فرض نہ نبھا سکا۔جس کی پاداش میں مجھے دفتری امور پر لگادیا گیا۔میں نے شادی نہیں کی۔اپنے دفتری اوقات کے بعد میرا بیشتر وقت تنہائی اور شراب نوشی میں گزرتا ہے‘‘۔

کرنل شنکر نے اور بہت سی باتیں کیں۔جن سے میں نے اندازہ لگایا کہ کرنل بھارتی فوج سے بھی نالاں ہے اور غیر محسوس طور پر اپنی ذاتی وجوہات کی وجہ سے پاکستان کے بھی اتنا خلاف نہیں جتنا دوسرے بھارتی فوجی تھے۔رات قریب بارہ بجے ہماری یہ محفل برخاست ہوئی اور میں کرنل شنکر کے متعلق متضاد خیالات کے ہجوم میں گھرا ہوا اپنے ہوٹل واپس پہنچا۔

یہاں پاکستان کی رانی اور شیرنی توپوں کے متعلق قارئین کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔یہ دو سپر ہیوی ہوٹیزر (توپوں کی ایک قسم) امریکہ نے ’’اچھے وقتوں‘‘ میں پاکستان کو دی تھیں۔ان میں چلنے والا گولہ 250 پاؤنڈ کا ہوتا ہے اور 22 میل تک اس کی رینج ہے۔

65ء اور 71ء کی جنگوں میں ان دو توپوں نے لاہور کے تحفظ میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔بھارتی فوج ان کے گولوں کی آواز سنتے ہی دہشت سے کانپنے لگتی تھی اور الٹے قدموں واپس اپنے مورچوں میں دبک جاتی تھی۔

کرنل شنکر نے شراب کے نشے میں اپنا دل کھول کر میرے سامنے رکھ دیا تھا۔لیکن مجھے ٹریپ کرنے کیلئے یہ اس کی ایک چال بھی ہو سکتی تھی۔عبدالکریم کی درد بھری کہانی اور کرنل شنکر کی باتیں۔یہ دونوں سچی بھی ہو سکتی تھیں اور غلط بھی۔ان حالات میں مجھے اپنا ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھانا تھا۔میں نے دونوں کی باتوں کے ہر فقرے اور ہر لفظ کا تجزیہ کرنا شروع کیا اور بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ جب تک میرے ساتھی لکھنؤ سے واپس آ کر عبدالکریم کے بیان کی تصدیق نہ کردیں میں کوئی قدم نہ اٹھاؤں۔تارا پور کے ایٹمی بجلی گھر کے متعلق چونکہ ہمیں پاکستان میں بریف نہیں کیا گیا تھا اور یہ مشن انتہائی اہم نوعیت کا تھا اس لئے میں نے ہر ممکن ذریعے سے معلومات اکٹھی کرنے کا فیصلہ کیا۔نیوکلیئر انرجی سے متعلق کتابیں تو میں پہلے ہی لے چکا تھا اور ان کا مطالعہ بھی شروع کردیا تھا۔اب میں چاہتا تھا کہ وہاں کے سیکورٹی سسٹم کے متعلق بھی جان کاری حاصل کروں۔

یشونت پھنس گیا

قارئین نا صرف میری بلکہ میرے ساتھیوں کی ذہنی کیفیت کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔دشمن ملک میں ہندو بن کر رہنے اور اس کی دفاعی نوعیت کی حساس اور CLASSIFIED معلومات حاصل کرنے اور ہر وقت پکڑے جانے کے خوف نے ہم پر شدید ذہنی دباؤ ڈال رکھا تھا۔ہمارے چہروں سے مسکراہٹ غائب اور ہماری ہنسی بالکل مصنوعی ہو چکی تھی۔راتوں کو نیند میں ہم اکثر چونک اٹھتے تھے۔اپنی کیفیت تو میں جانتا تھا۔میرے ساتھیوں نے بھی اپنی ذہنی حالت مجھے بتادی تھی۔پاکستان میں دوران تربیت ایسی حالت پیش آنے پر ذہنی تناؤ کم کرنے کیلئے ایک مسکن دوا کے استعمال کرنے کی ہدایت دی گئی تھی۔ہم نے یہ دوا استعمال کرنی شروع کی اور ایک ہفتہ استعمال کے بعد ہمارے ذہنی تناؤ میں خاصی کمی آچکی تھی۔

لکھنؤ جانے والے میرے دو ساتھی چوتھے دن لوٹ آئے۔وہ عبدالکریم کے متعلق معلومات لے کر آئے تھے۔دکاندار نے عبدالکریم کی کہی ہوئی تمام باتوں کی تصدیق کی تھی۔دکاندار نے عبدالکریم کے متعلق یہ بھی بتایا تھا کہ اس کے دور پار کے رشتہ داروں کے علاوہ ایک حقیقی چچا بھی ہیں لیکن وہ سب عبدالکریم کے والدین کے مرنے کے بعد بجائے اس یتیم کو محبت،شفقت دینے کے ان کے گھر میں جو بچا کھچا سامان تھا،وہ بھی اٹھا کر لے گئے اور عبدالکریم بے آسرا اور بے سہارا رہ گیا تھا۔اس کے والد سے دوستی کی وجہ سے اس دکاندار نے اسے اپنے گھر میں پناہ دی اور وہ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ دکان پر بھی اس کا ہاتھ بٹاتا تھا۔میٹرک کے بعد عبدالکریم مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا۔لہٰذا سال بھر وہ دکان پر ہی کام کرتا رہا اور جونہی اسے موقع ملا،وہ فوج میں بھرتی ہوگیا۔

دکاندار نے میرے ساتھیوں سے اس پوچھ گچھ کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے کہا کہ عبدالکریم کی ان کے خاندان کی ایک لڑکی سے شادی کی تجویز زیر غور ہے اور وہ اسی سلسلے میں یہاں آئے ہیں۔دکاندار نے کہا کہ عبدالکریم ایک شریف اور نواب خاندان کا چشم و چراغ ہے۔سوائے غریب اور بے آسرا ہونے کے اس میں کوئی خامی نہیں۔دکاندار نے یہاں تک کہا کہ اگر اس کی کوئی بیٹی ہوتی تو وہ اسے عبدالکریم سے بیاہنے میں فخر محسوس کرتا۔غرضیکہ عبدالکریم کی بیان کردہ سب باتوں کی سچائی کی تصدیق ہو چکی تھی۔اب مجھے اس کا تعاون حاصل کرنے کی منصوبہ بندی کرنی تھی۔ابھی تک عبدالکریم کا جو خاکہ میرے سامنے تھا،وہ ایک خاندانی بے آسرا تنہا مسلمان بھارتی سپاہی کا تھا جو اپنے افسران کی مسلسل گالم گلوچ اور سخت رویئے کا شاکی تھا۔یہ اس خاکے کا مثبت رخ تھا۔دوسرا رخ جو منفی تھا۔وہ کچھ یوں تھا کہ وہ اپنی ذاتی شکایات اور رنجش کے باوجود اپنے ملک کا خیر خواہ ہو سکتا تھا۔اس کی عزت نفس جو کچلی جاچکی تھی اسے DEFECTOR (باغی) بنا سکتی تھی یا پھر اسی کچلی ہوئی عزت نفس کی بحالی کیلئے وہ ہمارا راز جاننے کے بعد اپنے افسران کو ہمارے متعلق بتا کر بھارت ماتا کا ’’سپوت‘‘ بن سکتا تھا اور اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرسکتا تھا۔دونوں صورتیں ممکن تھیں۔

یہاں پاکستان میں ہی دیکھ لیجئے۔کہنے کو تو ہم سب پاکستانی اور ایک قلیل اقلیت کے سوا مسلمان ہیں لیکن ہم میں مادر وطن کی عزت،حرمت اور بقا کو پیچھے دھکیل کر اپنے ذاتی مفاد کو پورا کرنے والے غدار اور وطن فروش بھی لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ورنہ بھارتی ٹینکوں پر بیٹھ کر آنے کا دعویٰ کرنے والے،پاکستان کا قومی پرچم جو ہماری آزادی اور غیرت کا نشان ہے اسے مزار قائد پر نذر آتش کرنے والے،پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے اور کھلے عام اس کا اعلان کرنے والے ابھی تک زندہ نہ ہوتے۔میں سمجھتا ہوں کہ ایسے غداروں کی باتیں سن کر خاموش رہنے والے بھی وطن کی محبت سے اتنی ہی دور ہیں جتنے وہ غدار۔سمجھ میں نہیں آتا کہ ماں بہن کی گالی سن کر طیش میں آنے اور مرنے مارنے پر تل جانے والوں کی غیرت اس وقت کیوں سو جاتی ہے جب کوئی ان کی مادر وطن کو گالی دیتا ہے۔شاید یہ وہ لوگ ہیں جنہیں آزادی کی قدر و قیمت معلوم نہیں اور وہ اپنے آزاد وطن میں درپیش وقتی مشکلات کا حل دشمن کی غلامی میں ڈھونڈتے ہیں۔یہ ساری سیاسی پارٹیاں،یہ لسانی تنظیمیں،چاہے اقتدار میں ہوں یا حزب اختلاف میں صرف اور صرف اپنے ذاتی فوائد کے حصول میں لگی رہتی ہیں۔کوئی بھی سیاسی پارٹی ہو،ان کیلئے اقتدار کا حصول صرف پاکستان کو لوٹنے کیلئے ہوتا ہے۔پاکستان کی افواج پاکستان کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کی محافظ ہیں۔انہوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ افواج پاکستان کے جوان اور افسران اپنے سے 8 گنا بڑے دشمن کے سامنے یوں سینہ سپر،جان ہتھیلی پر لئے ایک سیسہ پلائی دیوار کی طرح ڈٹے ہوئے ہیں کہ دشمن کا ’’اکھنڈ بھارت‘‘ کا خواب چکنا چور ہو چکا ہے اور اسے خود اپنی بقا کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔پاکستان میں دہشت گردی اور دھماکے کرنے والے اگر پاکستانی ہیں تو وہ سو فیصد یقیناً دشمن کے ایجنٹ ہیں۔عبرت ناک موت ان کا مقدر ہے اور انشاء اللہ بہت جلد ہم ان طاعونی چوہوں سے نجات حاصل کرلیں گے۔

اس الجھی ہوئی صورت حال میں،میں نے ساتھیوں سے مشورہ کرنا مناسب سمجھا اور ان کے ساتھ میٹنگ میں ہر ایک کا نقطہ نظر جاننے کی کوشش کی۔دو ساتھیوں کا خیال تھا کہ رات کو عبدالکریم کو اٹھالیا جائے اور اسے سمجھایا جائے یا مجبور کیا جائے کہ وہ ہمارا ساتھ دے۔اور اگر وہ نہ مانے تو اسے وہیں ختم کردیا جائے۔ایک ساتھی کا کہنا تھا کہ کرنل شنکر کے کمرے میں رات کو گھس کر اسے ہلاک کردیا جائے اور اس کے کمرے سے اس کا بریف کیس اور اہم کاغذات اٹھالئے جائیں۔یہ دونوں تجاویز تھوڑی سی بحث کے بعد رد کردی گئیں۔پہلی اس لئے کہ عبدالکریم اپنی ذاتی حیثیت میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔اٹھائے جانے کے بعد وہ اپنی جان بچانے کے لئے ہمارا ساتھ دینے کا وعدہ کرکے اس سے نا صرف مکر سکتا تھا بلکہ ہمیں پکڑوا کر اپنے نمبر بنا سکتا تھا۔کرنل کو اگر ہلاک کردیا جاتا تو اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ اسکے کمرے میں موجود کاغذات وغیرہ اہمیت کے حامل بھی ہوتے۔ہر دو صورتوں میں بھارتی سیکورٹی نا صرف بہت چوکس ہو جاتی بلکہ میرے پکڑے جانے کا بھی امکان بڑھ جاتا کیونکہ کرنل شنکر سے ملنے والوں میں میرا نام سرفہرست ہوتا۔بالآخر فیصلہ ہوا کہ ان دونوں کو بھی فی الحال STAND BY پوزیشن میں رکھ کر مزید CULTIVATE کیا جائے اور اپنے مشن یعنی آرمی ہیڈکوارٹرز میں پہنچنے اور وہاں معلومات کے حصول کیلئے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ اب اپنا پورا دھیان ہیڈکوارٹرز کے سپرنٹنڈنٹ یشونت اور ان دو عیسائی سوئیپرز پر دیں۔اگلے روز ہی اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ چھٹی کے وقت ہم ہیڈکوارٹرز کے قریب بس اسٹاپ پر پہنچ گئے ہم یشونت کے ساتھ ایک ہی بس میں سوار ہوئے اور میں نے اس کا گھر بھی دیکھ لیا۔میں نے اپنے دو ساتھیوں کو دونوں صفائی کرنے والوں کے پیچھے لگادیا کہ ان سے واقفیت پیدا کریں اور اس طرح دفتر کے بعد ان کی سرگرمیوں کا نا صرف پتہ چلائیں بلکہ اگر ضرورت پڑے تو ان میں شریک بھی ہوں۔دوسرے دو ساتھیوں کی ڈیوٹی لگائی کہ دفتر کے بعد وہ یشونت کی SURVEILLANCE نگرانی کریں اور جس شام وہ گانا سننے کے لئے جائے تو ان میں سے ایک اس کا پیچھا کرتا رہے تا کہ اس بالا خانے کی نشاندہی ہو سکے جہاں وہ موجود ہو اور دوسرا ساتھی مجھے بتانے کیلئے اس علاقے چاوڑی بازار کے شروع میں ایک ریسٹورنٹ میں آئے جہاں میں ہر شام 7 بجے پہنچ جایا کروں گا۔

غازی

یہ مہینے کی شروع کی تاریخیں تھیں۔ اس ریسٹورنٹ میں مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ غالباً تیسرا یا چوتھا دن تھا جب میرے ساتھی نے ریسٹورنٹ میں آکر مجھے اشارہ کیا اور تھوڑی دیر کے بعد ہم اس بالا خانے کے نیچے کھڑے تھے جس میں لیشونت گیا تھا۔ میں نے ایک ساتھی کو رخصت کیا کیونکہ اس شام میرا پروگرام صرف لیشونت سے ملنے اور اس سے تعلقات پیدا کرنے کا تھا۔ میں بالا خانے کی سیڑھیاں چڑھ کر اس سجے سجائے کمرے میں پہنچ گیا جہاں ناچ گانا ہوتا تھا۔ نشست فرشی تھی۔ چاروں طرف گاؤ تکیے قرینے سے رکھے ہوئے تھے۔ ابھی محفل شروع نہیں ہوئی تھی۔ نائیکہ نے مجھے خوش آمدید کہا۔ میں لیشونت کے ساتھ کی نشست پر بیٹھ گیا۔ چند منٹوں کے اندر مجھے ایک نقرئی طشتری میں چاندی کے ورق میں لپٹا پان پیش کیا گیا۔ میں نے پان اٹھا کر بیس روپے طشتری میں رکھ دیئے۔ تھوڑی دیر بعد سازندے آگئے اور اپنے ساز درست کرنے لگے۔ ابھی گانے کی تیاریاں ہی ہو رہی تھیں کہ لیشونت اور دو تین دوسرے لوگوں کے سامنے گلاس اور سوڈے کی بوتلیں آگئیں۔ لیشونت نے جیب سے آدھے کی بوتل نکالی۔ دوسرے گاہکوں کیلئے بوتلیں نائیکہ نے پچھلے کمرے سے منگوا لیں۔ بڑے مودب انداز میں نائیکہ نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں بھی ''شوق'' کروں گا۔ ''ہمارے پاس آپ کی خدمت میں پیش کرنے کیلئے سب کچھ موجود ہے۔ آپ حکم کریں''۔ میں نے اسے کہا کہ آج موڈ میں نہیں ہوں اس لئے صرف کوئی ٹھنڈا مشروب پیوں گا۔ تھوڑی دیر میں یخ بستہ کوکا کولا کی دو بوتلیں میرے سامنے رکھ دی گئیں۔ محفل کا آغاز نیم کلاسیکی گانوں سے ہوا۔ لیشونت اس دوران اپنے آدھے کا آدھا حصہ پی چکا تھا۔ میں لیشونت پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھا کہ اس کی ''نظر کرم'' کس طوائف پر ہے۔ نیم کلاسیکی موسیقی کا دور ختم ہوا۔ اس دوران تین نوجوان طوائفیں اپنے پیروں میں گھنگھرو باندھنے لگیں۔ لیشونت نے بوتل میں بچی ہوئی شراب گلاس میں انڈیل لی۔ تھوڑا سا پانی ملایا اور غٹا غٹ چڑھا گیا۔ ان تینوں طوائفوں نے تماش بینوں کے درمیان میں آکر سب کو فرشی سلام کئے۔ ابھی وہ طبلے اور دوسرے سازوں کے ساتھ اپنے قدم ملا ہی رہی تھیں کہ لیشونت نے اپنی دوسری جیب سے ایک آدھا اور نکالا۔ وہ بھارت کی بنی ہوئی رم (شراب کی ایک قسم) پی رہا تھا۔ چونکہ پوری بوتل گول اور آدھے چپٹے ہوتے ہیں۔ اس لئے بآسانی جیبوں میں آجاتے ہیں۔ لیشونت نے دوسری بوتل سے بھی کچھ رم گلاس میں انڈیلی اور اسے چڑھا گیا اب وہ پوری طرح سے نشے میں چور تھا۔ جب گانا شروع ہوا تو ویل ایک روپے کی تھی۔ ناچنے والی تینوں لڑکیوں نے رقص شروع کیا۔ ان تینوں کے قدم اور رقص کے زاویئے ایک دوسرے سے اتنے ملے ہوئے تھے کہ وہ ایک ہی جسم کے تین حصے دکھائی دیتی تھیں۔ ان کے رقص نے محفل کو گرما دیا۔ ویل اب ایک روپے سے بڑھ کر 5 روپے ہو چکی تھی۔ مجھے چونکہ وہاں پر لیشونت کو اپنی طرف متوجہ کرنا اور طوائفوں پر اپنی امارت کا رعب ڈالنا تھا لہٰذا میں نے 10 روپے کی ویل شروع کی۔ بالا خانوں کا رواج ہے کہ جو زیادہ ویل پیش کرے اسی کے سامنے جا کر ناچنا یا ناچتے ہوئے بیٹھ کر ویل لینا ہوتا ہے۔ دس روپے کی ویل پر دوسرے تماش بین کچھ چونک سے گئے اور روپے روپے کے دس نوٹوں کا پیکٹ بنا کر ویل دینی شروع کی لیکن ویل دینے میں وقفہ بڑھا دیا۔ یہی وقت تھا جب مجھے اپنی امارات کا سکہ بٹھانا تھا۔ میں نے ویل 20 روپے کر دی۔ بالا خانوں کا اصول ہے کہ بیک وقت اگر دو یا زیادہ تماش بین ویل پیش کریں تو زیادہ ویل دینے والے کے پاس طوائف پہلے آتی ہے۔ میں اپنے ہمراہ خاصی رقم لے گیا تھا۔ بیس روپے کے نوٹوں کی ایک گڈی کے علاوہ 100 روپے کے 60 نوٹ میرے پاس تھے۔ بیک وقت میں نے اور لیشونت نے مخصوص طوائف کو ویل دینے کے لئے اشارہ کیا۔ میرے پاس 20 روپے کا نوٹ تھا اور لیشونت نے 10 روپے آگے کر رکھے تھے۔ طوائف میرے پاس آئی اور نوٹ لے کر اٹھنے لگی تو میں نے 20 کا ایک اور نوٹ نکال کر اسے پھر بٹھا لیا۔

20 والے نوٹوں کی گڈی میں نے اپنے سامنے قالین پر رکھی ہوئی تھی اور ایک کے بعد ایک نوٹ دے کر اس طوائف کو اٹھنے نہیں دیتا تھا۔ لیشونت نے اپنا ہاتھ جس میں دس کا نوٹ پکڑا ہوا تھا پیچھے کر لیا۔ میں نے اپنا سلسلہ جاری رکھا۔ لیشونت مایوس ہو کر اٹھنے لگا تو میں نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے اسے بٹھا لیا اور کہا لیشونت بابو یہ کیا۔ وہ ایک اجنبی کے منہ سے اپنا نام سن کر کچھ حیران سا ہوا۔ میں نے بے تکلفی سے اپنا ایک ہاتھ اس کی کمر میں ڈال کر اسے اپنے نزدیک کر لیا اور دوسرے ہاتھ سے ویل پہلے لیشونت کے سر پر اور پھر اس کے ماتھے اور گالوں پر رکھ کر دینی شروع کر دی۔ طوائف کا کیا تھا اسے تو نوٹ اکٹھے کرنے تھے۔ وہ میری دی ہوئی ویلیں لیشونت کے سر پر اور چہرے سے اٹھا رہی تھی۔ شراب کے نشے میں مدہوش لیشونت نے ایک دو بار مجھے رسمی طور پر روکنے کی کوشش کی لیکن حسن و شباب کی گرمی اور اٹھکیلیاں اسے اتنا من بھائیں کہ اس نے ہتھیار پھینک دیئے۔

اس دوران دوسری دو طوائفیں مسلسل ناچ رہی تھیں اور بے دلی سے دوسرے تماش بینوں کی دی ہوئی ویلیں لے رہی تھیں۔ کچھ تماش بین مقابلے کی سکت نہ ہونے کی وجہ سے اٹھ کر جا چکے تھے۔ سازندوں نے بھی اس دوران دو نئی دھنیں شروع کیں لیکن میں نے لیشونت کی پسندیدہ لڑکی کو اس کے سامنے سے اٹھنے نہ دیا۔ میری گڈی میں جب چار پانچ نوٹ باقی رہ گئے تو میں نے سو روپے کے 20 نوٹ نائیکہ کو مخاطب کر کے اس کی طرف پھینک دیئے اور اس سے پہلے کہ میرے باقی چار پانچ نوٹ ختم ہوتے، 20 روپے والے نوٹوں کی ایک نئی گڈی میرے سامنے رکھ دی گئی تھی۔ نائیکہ نے مجھ سے اب اکٹھی رقم اینٹھنے کا سوچ کر رقص بند کروا دیا اور ایک طرح کا وقفہ ہو گیا۔ نائیکہ نے سب سے کھانے کا پوچھا۔ میں نے سیخ کباب اور پراٹھے منگوائے۔ لیشونت نے بھی کباب اور پراٹھے منگوائے۔ میں نے ایک ہزار روپے نائیکہ کی طرف اچھالتے ہوئے کہا کہ لیشونت، میں اور اس کی محبوبہ ہم تینوں کھانا پچھلے کمرے میں اکٹھے کھائیں گے۔ نائیکہ نے سر ہلا کر حامی بھر لی۔ ہم تینوں نے پچھلے کمرے میں کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد اب محفل کا دوسرا حصہ شروع ہونا تھا۔ لیشونت اتنی زیادہ پی چکا تھا کہ لڑکھڑا کر کبھی ادھر گرتا کبھی ادھر۔ میں نے نائیکہ کو کہا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں اس لئے اب ہم چلتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے میں نے نائیکہ کو مزید 5 سو روپے دیئے اور لیشونت کو سنبھالتے ہوئے نیچے لے آیا۔ میرا ساتھی ریسٹورنٹ میں میرا منتظر تھا۔ میں نے اسے ٹیکسی لانے کو کہا۔ جلد ہی ٹیکسی آگئی۔ چاوڑی بازار کے پیچھے ہی دو تنگ گلیوں میں جسم فروشی کا دھندا ہوتا ہے۔ میں نے وہاں ٹیکسی رکوائی۔ لیشونت تو ٹیکسی میں ہی خراٹے بھرنے لگ گیا تھا۔ میں اس گلی میں گیا۔ گلی میں داخلے کی جگہ پر پولیس کا ایک ہیڈ کانسٹیبل اور سپاہی کھڑے تھے۔ میں نے ان کی طلب نگاہی سے اندازہ لگا کر 50 روپے ہیڈ کانسٹیبل کی مٹھی میں تھما دیئے۔ اس نے ہنستے ہوئے مجھے آگے جانے کا گرین سگنل دے دیا۔ میں نے گلی کا ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگایا۔ ایک نسبتاً جوان اور صاف ستھری عورت کے قریب گیا تو وہ فوراً بولی ''30 روپیہ''۔ میں نے کہا میں 3 سو دوں گا اور ایک گھنٹے میں واپس چھوڑ جاؤں گا۔ وہ کچھ سوچنے لگی۔ میں نے کہا اچھا 5 سو دوں گا۔ اس نے دلاور نام کے کسی آدمی کو بلا لیا اور اسے میری آفر بتائی۔ دلاور پوچھنے لگا کہ کہاں لے جانا ہے۔ میں نے کہا دریا گنج، اس نے کہا کوئی چکر ہے؟ میں نے جواب دیا۔ ہاں ایک ہندو کو رسوا کرنا ہے جس نے کئی مسلمان لڑکیوں کو خراب کیا ہے۔ اس نے پوچھا آپ مسلمان ہیں؟ میں نے کہا ہاں، اس نے کہا کہ آپ نے بجائے ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے سیدھی اور سچی بات کی ہے۔ آپ شکل سے بھی بھلے آدمی دکھائی دیتے ہیں۔ میں زری کو آپ کے ساتھ بھیج دیتا ہوں۔ ایک گھنٹے کے بجائے اسے بے شک صبح تک اپنے ساتھ رکھیں لیکن اسے صحیح سلامت واپس چھوڑ جائیں۔ میں نے اسے کہا کہ ایک آدمی بھی پاس نہیں جائے گا۔ ہمیں صرف اس ہندو کو رسوا کرنا ہے اور بس۔ اس نے زری کو میرے ہمراہ جانے کو کہا اور خود کمرے کے اندر چلا گیا۔ زری پانچ سات منٹ میں میک اپ درست کر کے باہر آ گئی۔ میں اسے لے کر گلی کے باہر آ گیا۔ میں ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور پچھلی سیٹ پر لیشونت، بیچ میں زری اور پھر میرا ساتھی بیٹھ گئے۔ ٹیکسی ڈرائیور سکھ تھا۔ میں نے اسے دریا گنج جانے کے لئے کہا۔ دریا گنج جاتے ہوئے آدھا میل تک کوئی آبادی نہ تھی۔ صرف درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ اس جگہ رک جائے۔ اپنے ساتھی کو میں نے سوئے ہوئے لیشونت کو سہارا دیکر جھاڑیوں کے پیچھے لے جانے اور زری کو بھی ان کے پیچھے جانے کو کہا۔ ڈرائیور کو میں نے 100 کا نوٹ دیا اور کہا کہ ٹیکسی کا بونٹ اٹھا کر یوں ظاہر کرے جیسے انجن میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہو۔ ہم پندرہ بیس منٹ میں واپس آتے ہیں۔ وہ ہنسنے لگا۔

لیشونت نشے میں چور زمین پر ڈھیر پڑا تھا۔ میرے ساتھی کو بھی علم نہ تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ میں اور میرا ساتھی دونوں مسلح تھے۔ میرے ساتھی کے پاس تقریباً دو ہزار روپے تھے۔ میں نے اس سے ساری رقم لے لی اور اپنے سارے روپے اکٹھے ملا کر مدہوش لیشونت کے ہاتھ میں پکڑا دیئے۔ لیشونت کو میرے ساتھی نے زمین پر بیٹھے بیٹھے سہارا دے کر کھڑا کیا۔ میں نے زری کو کہا کہ وہ لیشونت کے بالکل ساتھ کھڑی ہو کر لیشونت کے سینے پر سر رکھ دے۔ اب یہ پوز کچھ یوں تھا کہ دونوں جھاڑیوں میں کھڑے تھے اور لیشونت نے نوٹوں والا ہاتھ اس کی گردن کے پیچھے سے گزار کر سامنے اس کے جسم پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے ساتھی سے کیمرا لے کر اس کی پوری 12 تصویریں اتاریں۔ اس کے بعد میں نے نوٹ لیشونت کے ہاتھ سے لے کر اپنی جیب میں رکھ لئے۔ اس کام سے فارغ ہو کر جب ہم واپس ٹیکسی کی طرف لوٹے تو بمشکل آدھ گھنٹہ ہی گزرا ہو گا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو واپس چوڑی بازار چلنے کو کہا۔ اس گلی کے قریب پہنچ کر میں نے زری کو واپس جانے کیلئے کہا تو وہ کہنے لگی کہ مجھے میرے کمرے تک چھوڑ جائیں ورنہ پولیس والے مجھے زبردستی ہمراہ لے جائیں گے۔ میں زری کو اس کے کمرے تک چھوڑ کر واپس پلٹا تو وہی دونوں پولیس والے وہاں موجود تھے۔ 50 روپے رشوت کی گرمی میں وہ ہمارے گلی میں جانے اور میرے واپس آنے پر صرف مسکرائے۔ اب میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو ریلوے اسٹیشن کی طرف چلنے کیلئے کہا۔ ریلوے اسٹیشن پر یہ ٹیکسی چھوڑ کر ہم نے ایک دوسری ٹیکسی لی اور لیشونت کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ لیشونت کے گھر کی گلی سے چند قدم کے فاصلے پر میں نے ٹیکسی روکی۔

میں ٹیکسی میں بیٹھا رہا اور میرا ساتھی ادھ سوئے لیشونت کو سہارا دے کر اس کے گھر تک لے گیا۔ بقول اس کے لیشونت کے لڑکے نے دروازہ کھولا۔ میرے ساتھی نے لیشونت کو اس کے حوالے کیا اور تیز قدموں سے واپس لوٹ آیا۔ لیشونت کے لڑکے نے میرے ساتھی سے کوئی سوال نہیں کیا۔ شاید یہ اس کے روز کے معمولات میں تھا کہ نشے میں چور واپس لوٹتا تھا۔ میں نے اپنے ساتھی کو محلّہ فراش خانے کے قریب اتار دیا۔ اس سے لی ہوئی رقم واپس لوٹا دی اور کہا کہ فلم ڈیولپ کرا کے ارجنٹ ہر تصویر کی تین تین کاپیاں بنوا لے۔ میں اگلی شام 7 بجے اسے چاوڑی بازار کے اسی ریسٹورنٹ میں ملوں گا۔ اپنے ساتھی کو رخصت کر کے میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو نئی دہلی چلنے کو کہا۔ لودھی ہوٹل سے آگے گزر کر ٹیکسی کو فارغ کیا اور ٹہلتا ہوا واپس ہوٹل چلا آیا۔

اگلے روز شام کو میرے دو ساتھی مقررہ وقت پر مجھے چاوڑی بازار کے اسی ہوٹل میں ملے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی ہنستے ہوئے میرے پاس بیٹھ گئے اور گزشتہ رات کی کھینچی ہوئی 12 تصویروں کا ایک سیٹ میرے سامنے رکھ دیا۔ تصویریں بالکل صاف آئی تھیں اور فلیش گن نے پس منظر میں جھاڑیوں کو بھی نمایاں کر دیا تھا۔ باقی دو سیٹ اور نگیٹو وہ احتیاطاً اپنے گھر چھوڑ آئے تھے۔ ان تصویروں کی وجہ سے لیشونت مجھے بالکل بے دست و پا نظر آ رہا تھا۔ اس کی کمزوری میرے ہاتھ آ چکی تھی۔ اب مجھے یہ کرنا تھا کہ لیشونت سے مل کر اور اسے یہ تصویریں دکھا کر اس کے بھیانک انجام کی ایسی تصویر کشی کروں کہ وہ میری ہر بات ماننے پر مجبور ہو جائے۔ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ لیشونت سے ملنے میں دو تین دن کا وقفہ دیا جائے۔ گزشتہ رات وہ اتنا مدہوش تھا کہ ہماری ''کارروائی'' کے دوران اس نے کوئی مزاحمت نہ کی تھی۔ اگر اسے کوئی بات یاد آئی بھی تو وہ اسے شاید خواب سمجھے اور اگر اسے سب کچھ یاد آ بھی گیا تو اپنے ساتھ گزری ہوئی ''واردات'' کے اثر سے سنبھل جائے۔ اس سے فوری ملنے اور تصویریں دکھانے سے یہ بھی ممکن تھا کہ گھبراہٹ میں وہ اپنے افسران کے سامنے خود ہی سب کچھ بک نہ دے۔ میں اسے چند روز شش و پنج میں اور ہمارے اگلے اقدام (اگر اسے سب یاد آ گیا ہو تو) کے انتظار میں رکھنا چاہتا تھا۔ ہم ریسٹورنٹ میں دو تین گھنٹے بیٹھے رہے لیکن اس رات لیشونت نہیں آیا۔ لیشونت کے ساتھ اس رات جو گزری وہ ہمارا پہلے سے تیار کردہ منصوبہ نہ تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ پہلے روز ہی یہ سب کچھ ہو گیا لیکن اب مجھے بازی جیتنے کیلئے اپنے پتے نہایت ہوشیاری سے کھیلنے تھے۔ میں نے ساتھیوں سے کہا کہ عیسائی خاکروبوں کے پیچھے لگے ہوئے دونوں ساتھیوں کو کہیں کہ وہ اپنا کام جلدی لیکن ہوشیاری سے مکمل کریں۔ میں چاہتا تھا کہ اگر لیشونت کو میں نے قابو کر لیا تو خاکروبوں کے ذریعے کام فوری شروع ہو جائے۔ میں نے اٹھتے ہوئے دونوں ساتھیوں سے کہا کہ اگلی صبح وہ لیشونت کی نگرانی کریں اور دیکھیں کہ وہ دفتر جاتا ہے یا نہیں۔ اس کے چہرے کے تاثرات کا اندازہ لگائیں اور ہر شام اسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر لیشونت کی وہاں آمد کا انتظار کریں اور جونہی وہ بالا خانے کی طرف جائے تو ایک اس کا پیچھا کرے اور دوسرا مجھے اکبر ہوٹل کی لابی میں اطلاع دے۔

غرضیکہ ان انتظامات کے تحت چار روز میں نے لیشونت کا انتظار کیا لیکن وہ چاوڑی بازار کی طرف نہیں گیا۔ دوسری طرف خاکروبوں پر کام کرنے والے ساتھی بھی ابھی تک کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہ کر سکے تھے۔ ان حالات میں، میں نے فیصلہ کیا کہ لیشونت کی آمد کے انتظار میں مزید وقت ضائع کرنے کے بجائے خود اس سے رابطہ قائم کیا جائے۔ میں نے اپنے ایک ساتھی کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ لیشونت کے دفتر سے واپسی کے وقت کسی بس اسٹاپ کے قریب ایک چٹ اسے تھما کر فوراً بس سے اتر کر غائب ہو جائے۔ دوسرا ساتھی لیشونت کے گھر اترنے کے اسٹاپ پر اس کی خفیہ نگرانی کرے اور دیکھے کہ لیشونت گھر جاتا ہے یا چٹ پر لکھی ہدایت کے مطابق سرائے بیرم خان کے پہلے بس اسٹاپ کے بالکل سامنے ایک ریسٹورنٹ کی طرف جاتا ہے اور یہ بھی دیکھے کہ لیشونت کا پیچھا تو نہیں کیا جا رہا۔ چٹ پر میں نے انگریزی میں لکھا تھا (تحریر بگاڑ کر) کہ وہ بالا خانے کے حوالے سے اور بعد میں پیش آنے والے واقعات کی روشنی میں اپنی اور اپنے گھر والوں کی بھلائی کیلئے اس ریسٹورنٹ میں اپنے گھر جانے سے پہلے پہنچ جائے۔ میں نے چٹ میں یہ بھی لکھا تھا کہ اس چٹ کے اسے ملنے کے بعد ہمارے ساتھی اس کی مسلسل نگرانی کر رہے ہیں اور اگر اس نے چٹ پر درج ہدایت کی کوئی بھی خلاف ورزی کی تو اسے اور اس کے گھر والوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔

یہ سارا کام آئندہ روز ہونا تھا۔ میں اس مشن کی تکمیل کیلئے بس میں چٹ دینے والے ساتھی اور خود کو لیشونت کے سامنے EXPOSE کرنے کا خطرہ مول لے رہا تھا۔ لیکن اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ میں نے چاروں ساتھیوں کے سامنے یہ تجویز رکھی۔ فیصلہ تو میں کر چکا تھا۔ انہیں تو رسمی طور پر بتانا تھا۔ سب نے میری تجویز مان لی اور ایک اضافہ کر دیا کہ لیشونت کے ساتھ ملاقات کے دوران وہ میری نگرانی اور حفاظت کیلئے مسلح ہو کر ہمارے ارد گرد ہی منڈلاتے رہیں گے۔ یہاں پر مجھے احساس ہوا کہ میرے ساتھی مشن کی کامیابی کے علاوہ میری زندگی اور تحفظ کیلئے کتنے مستعد ہیں۔ میں اسی لئے اپنے گروپ کو FIVE MEN ARMY کہا کرتا تھا۔

میں نے کیمرے والے ساتھی سے کہا کہ جب لیشونت اور میں ریسٹورنٹ سے باہر نکلیں تو ہماری ایک تصویر خفیہ طور پر اتارے۔ اس وقت تک شام گہری ہو چکی ہو گی اس لئے حسب سابق جھاڑیوں والی تصاویر کی طرح فلیش گن استعمال کرے۔

یہ تمام ہدایات دے کر میں اپنے ہوٹل واپس آیا۔ بھارت میں آنے کے بعد یہ ہمارا پہلا موقع تھا کہ میں خود کو بطور مسلمان اور پاکستانی، ایک اہم شخص کے سامنے ظاہر کر رہا تھا۔ اس میں کامیابی اور ناکامی کے برابر کے مواقع تھے۔ میں نے اپنی طرف سے ہر ممکن پیش بندی کر لی تھی۔ چٹ ملنے کے بعد لیشونت کو کوئی موقع نہیں دیا گیا تھا کہ وہ ہماری اس متوقع ملاقات کا اپنے افسران کو بتا سکے لیکن یہ بھی عین ممکن تھا کہ لیشونت کو نیم بے ہوشی کی حالت میں جھاڑیوں میں اپنے ساتھ پیش آنے والا واقعہ یاد آ گیا ہو اور اس نے اسے اپنے افسران کو بتا کر انہیں چوکنا کر دیا ہو اور واقعے کے دوسرے روز سے ہمارے آئندہ اقدام کو ناکام بنانے اور ہمیں ٹریپ کرنے کیلئے لیشونت کی حفاظت اور نگرانی پر کچھ لوگ مامور کر دیئے گئے ہوں۔ ایسی صورت میں پیش آنے والے حالات سے میں بخوبی باخبر تھا۔ لیکن میری چھٹی حس یہ کہہ رہی تھی کہ اپنے مقصد کے حصول میں ہمیں کامیابی ہو گی۔ تربیت کے خاتمے پر میرے سینئرز نے جو رپورٹ BIG BOSS کو بھیجی تھی وہ مجھے بھی دکھائی گئی تھی۔ اس رپورٹ کی آخری سطر مجھے ابھی تک یاد ہے IN MY OPINION HE IS INDESTRUCTIBLE OPTIMIST (میرے خیال میں یہ ایک پر امید نہ ٹوٹنے والا شخص ہے) مجھے اپنے سینئرز کے ان الفاظ کی لاج بھی رکھنی تھی اور سب سے زیادہ مجھے اپنے قادر مطلق پر مکمل یقین اور اعتماد تھا کہ وہ دلوں کے بھید جاننے والا ہے۔ اس کے نام پر بنائے ملک کی بقا کی خاطر میں نے جو بھی فعل کئے ہیں وہ ان کی ''اصلیت اور مقصد'' بخوبی جانتا ہے اور مجھے کامیابی نصیب ہو گی۔

غازی

میں نے اگلی صبح لیفٹیننٹ کے گھرانے کے افراد اس کی بیٹی کے اسکول اور آشنا کی تصویریں اور کوائف اکٹھے کیے۔ ان کوائف کی سمری بنائی۔ لیفٹیننٹ کی تصاویر کو الگ لفافے میں رکھا۔ اپنا اسلحہ لوڈ کیا اور فالتو راؤنڈ بھی رکھ لئے۔ یہ سب تیاریاں کرنے کے بعد میں ساتھیوں کے گھر گیا۔ وہ بھی اپنی تیاریوں میں مشغول تھے۔ میں نے اپنے پکڑے جانے کی صورت میں حسب سابق چارج اپنے ایک ساتھی کو دیا۔ میرے ساتھی کچھ مرجھائے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ میں نے انہیں تسلی دی اور ہنسی مذاق کی باتوں سے ان کا دل بہلایا۔ ہوٹل سے اپنے ہمراہ میں احمد نگر کی فائلوں کی فوٹو فلم اور لیفٹیننٹ کی تصویروں کے دو بقیہ سیٹ اور نگیٹو بھی لے آیا تھا۔ وہ بھی اپنے نمبر ٹو کے حوالے کیے۔ اب میرے کمرے میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جو مجھے قابل مواخذہ ثابت کر سکے۔ آخری ہدایات دینے کے بعد میں نے ساتھیوں سے رخصت چاہی۔

شام کے 4 بجے میں سرائے بیرم خان کے اس ریسٹورنٹ کے قریب جا پہنچا جہاں لیفٹیننٹ کو ملاقات کیلئے بلایا گیا تھا۔ تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ میرے دو ساتھی بھی نظر آ گئے۔ ایک کے پاس ایک بیگ میں کیمرا اور فلیش گن تھی۔ ہم ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر چھپر نما چائے خانوں میں بیٹھ گئے۔ جلد ہی میرا وہ ساتھی بھی آ گیا جسے لیفٹیننٹ کو بس میں چیٹ دینی تھی وہ اس چائے خانے کے قریب ایک جگہ کھڑا ہو گیا اور اشارے سے مجھے اپنے قریب بلایا۔ میں ٹہلتے ہوئے اس کے پاس سے گزرا تو اس نے کہا کہ بس میں بہت رش ہونے کی وجہ سے لیفٹیننٹ کو چیٹ دینے کے بعد وہ بس میں کھڑے مسافروں میں اس طرح چھپ چھپا کر اترا کہ یقینی طور پر لیفٹیننٹ اسے دیکھ نہ سکا اور دوسرا ساتھی اسی بس میں سوار لیفٹیننٹ کی نگرانی کر رہا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ دو ساتھی پہلے ہی آ چکے ہیں اور اب لیفٹیننٹ اور چوتھے ساتھی کا انتظار ہے۔

اب ہم سب امید و بیم کی کیفیت میں لیفٹیننٹ کا انتظار کر رہے تھے اور میں دل ہی دل میں اس گفتگو کا اعادہ کر رہا تھا اور اسے مزید پر اثر بنا رہا تھا جو مجھے لیفٹیننٹ سے کرنی تھی۔ اسی گفتگو پر ہمارے اس مشن کا دارومدار تھا۔ میں چاہتا تھا کہ لیفٹیننٹ کو ہمارے ساتھ تعاون نہ کرنے کی صورت میں اسے مستقبل کی (جو اسی ریسٹورنٹ کے باہر سے شروع ہو گا اور اس کے گھر کے تمام افراد کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا) ایسی بھیانک صورت دکھاؤں کہ اس کا BREAKING POINT (ٹوٹنے اور مدافعت کے خاتمے کا نقطہ) آ جائے اور وہ ہمارے ساتھ تعاون پر آمادہ ہو جائے۔ ایسی صورت میں اس کی حفاظت کے علاوہ مالی فوائد کا بھی لالچ دیا جائے۔ میں اپنی ہونے والی گفتگو کے پیچ و خم کو مزید درست کرنے کیلئے اسی چھپر ہوٹل میں ایک اوٹ میں بیٹھ گیا۔ 6 بجے کے قریب میرے ایک ساتھی نے ہوٹل کے سامنے سے گزرتے ہوئے سیٹی بجائی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے سر ہاں کے انداز میں ہلایا۔ یہ لیفٹیننٹ کی آمد کی اطلاع تھی۔ شام کے بڑھتے ہوئے سایوں میں، میں نے لیفٹیننٹ کو مردہ قدموں سے ریسٹورنٹ میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر میرا ساتھی جو اس کے تعاقب میں تھا، نظر آیا۔ میں چھپر ہوٹل سے اٹھا اور اس ساتھی کے قریب سے گزرا۔ اس نے سرگوشی میں کہا کہ لیفٹیننٹ اپنے گھر سے بہت پہلے ایک اسٹاپ پر اتر کر سرائے بیرم خان کی بس پر سوار ہو گیا تھا۔ میرا ساتھی بھی اسی بس میں سوار ہوا۔ کوئی نگرانی نہیں ہو رہی۔

سب اچھا کی رپورٹ ملنے کے بعد میں ریسٹورنٹ کی طرف گیا۔ ریسٹورنٹ میں لیفٹیننٹ کونے کی ایک میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ پریشانی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ میں جب اس کی میز کے بالکل سامنے پہنچ گیا تو لیفٹیننٹ نے مجھے دیکھا اور ایک دم چونک گیا۔ اس کی گھبراہٹ اور بڑھ گئی اور اسی گھبراہٹ میں پانی کا گلاس اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ میں لیفٹیننٹ کے ساتھ کی کرسی پر بیٹھ گیا اور ویٹر کو کافی اور کچھ SNACKS لانے کا آرڈر دیا۔ لیفٹیننٹ اپنی گھبراہٹ میں نمستے اور رسمی کلمات بھی بھول چکا تھا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتا جا رہا تھا۔ میں نے اسے کہا لیفٹیننٹ بابو میں نے ہی آپ کو یہاں بلوایا ہے اور آپ سے کچھ بہت اہم باتیں کرنی ہیں۔ ''لیفٹیننٹ نے مجھے ٹوکا اور پوچھا کہ آپ وہی ہیں نا جو اس روز بالا خانے میں میرے ہمراہ بیٹھے تھے۔ آپ کا شبھ نام کیا ہے؟'' میں نے ذرا تحکمانہ لہجے میں کہا۔ دیکھو لیفٹیننٹ! جب میں بات کر رہا ہوں تو مجھے ہرگز مت ٹوکو۔ یہ شمی کا بالا خانہ نہیں ہے (شمی اس کی پسندیدہ رقاصہ تھی) میری باتیں دھیان سے سنو اور مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کرو۔ وہ حیران اور سراسیمہ مجھے تکے جا رہا تھا۔ میں نے ایک، ایک کر کے اس کے لڑکے اور لڑکیوں کی تصاویر اس کے سامنے رکھ دیں اور ان کے نام بھی بتا دیئے۔ پھر اس کی لڑکی کے اسکول اور اس کی استانی لڑکی کے آشنا کی تصویر بھی سامنے رکھ دی۔ ان تصاویر کے دیکھنے کے بعد میں اس کا ردعمل دیکھنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولے میں نے کہا۔ ''لیفٹیننٹ میں تمہارے اور تمہارے گھر کے افراد کے بارے میں اتنا کچھ جانتا ہوں جتنا شاید تم بھی نہیں جانتے اور تمہارے بارے میں ایک خاص بات''...... اور اس کے ساتھ ہی جھاڑیوں کی اوٹ میں لی گئی 12 تصویریں اس کے سامنے رکھ دیں۔

لیفٹیننٹ ایک ایک تصویر دیکھتا جاتا تھا اور اس کی پریشانی اور گھبراہٹ بڑھتی جاتی تھی۔ آدھی تصویریں دیکھ کر ہی وہ حوصلہ چھوڑ بیٹھا۔ اس کی پیشانی پسینے سے بھیگ چکی تھی۔ فی الحقیقت اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ میں نے تصویریں اس کے سامنے سے اٹھا لیں۔ لیفٹیننٹ کہنے لگا ''اس عورت (زری) کو میں بالکل نہیں جانتا۔ بھگوان کی سوگند ہے میں بالکل نہیں جانتا''۔ وہ لڑکھڑاتی زبان میں اٹک اٹک کر کہنے لگا۔ ''میں تو غریب آدمی ہوں۔ سرکاری دفتر میں ملازم ہوں۔ بس اندازنہ ہونے کے برابر ہے۔ پھر بھی آپ بتائیں آپ کی ڈیمانڈ کیا ہے؟'' وہ سمجھ رہا تھا کہ میں اس سے رقم وصول کرنے کیلئے اسے بلیک میل کر رہا ہوں۔ میں نے اسے اسی تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''اگرچہ میں تمہارے متعلق سب کچھ جانتا ہوں لیکن تمہارے منہ سے سچائی سننا چاہتا ہوں۔ جس دفتر میں کام کرتے ہو، وہاں اپنے ڈیپارٹمنٹ اور اپنی پوزیشن کے متعلق بتاؤ''۔ اس نے کہا کہ ''وہ ملٹری ہیڈ کوارٹرز میں COPYING برانچ میں سپرنٹنڈنٹ ہے''۔ تو پھر اس تنخواہ میں بالا خانوں کی عیاشی کیسے کرتے ہو۔ میں نے پوچھا تو وہ گڑگڑا کر کہنے لگا کہ گھر کا خرچ تو میری بیٹی جو ٹیچر ہے وہ اٹھاتی ہے۔ باقی بچے جو پڑھتے ہیں ان کی فیس وغیرہ میں ادا کرتا ہوں۔ وہ پھر گڑگڑا کر کہنے لگا کہ میں غریب آدمی ہوں۔ پھر بھی آپ اپنی ڈیمانڈ بتائیں۔ ساتھ ہی اس نے پوچھا اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو بتائیں کہ کیا آپ ملٹری انٹیلی جنس کے آدمی ہیں؟ میں نے کہا ایک طرف تم مجھ سے میری ڈیمانڈ پوچھتے ہو اور ساتھ ہی میری شناخت بھی جاننا چاہتے ہو؟ میں نے اسے زوردار لہجے میں کہا۔ لیفٹیننٹ میں یہاں تمہارے سوالوں کا جواب دینے نہیں آیا۔ تم چاروں طرف سے گھر چکے ہو۔ تمہاری یہ تصویریں (یہ کہتے ہوئے میں نے تصویریں جیب سے دوبارہ نکال کر میز پر رکھ دیں) تم کو تباہ و برباد کر سکتی ہیں۔ تم اپنی زندگی کا بقیہ حصہ جیل میں گزارو گے۔ اس عورت کے ساتھ تمہاری اس حالت میں ہاتھوں میں نوٹ پکڑے ہوئے یہ تصویر ہی تمہیں جیل میں بقیہ زندگی چکی پیس کر گزارنے کیلئے کافی ہے۔ تمہاری اولاد اور تمہارے رشتے دار جب تمہاری زندگی کا یہ گھناؤنا رخ دیکھیں گے تو تم پر نفرین بھیجیں گے۔ تمہاری لڑکیاں بن بیاہی رہ جائیں گی اور بالآخر بھاگ جائیں گی۔ تمہاری ٹیچر بیٹی کو ملازمت سے فوری نکال دیا جائے گا اور سب سے بڑی اور اہم بات کہ اگر تم نے میرے ساتھ تعاون نہ کیا تو تمہیں ریسٹورنٹ سے نکلتے ہی گولی مار کر ہلاک کر دیا جائے گا''۔

گولی کی بات سنتے ہی لیفٹیننٹ تھر تھر کانپنے لگ گیا۔ میں نے اسے کہا ''یہ علاقہ مسلمانوں کی اکثریت کا ہے۔ یہاں پر تمہاری لاش تک غائب کر دی جائے گی۔ دفتر سے نکلنے کے بعد تمہارے یہاں آنے کا کسی کو علم نہیں''۔ اپنی ان باتوں کا اس پر ردعمل دیکھنے کیلئے میں ذرا رکا۔ لیفٹیننٹ کی حالت دیدنی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ وہ کانپتے کانپتے بار بار ادھر ادھر دیکھ رہا تھا جیسے ابھی کہیں سے گولی چلے گی اور اس کا کام تمام کر دے گی۔ جب میں نے محسوس کیا کہ خوف سے کہیں اس کے دل کی دھڑکن ہی نہ بند ہو جائے تو میں نے پانی کا گلاس اسے دیا۔ اس نے پانی پیا، لیکن اس کی گھبراہٹ اور کانپنے میں کوئی کمی نہ ہوئی۔

میں نے اسے کہا ''دیکھو لیفٹیننٹ جو کچھ میں نے کہا ہے یہ سب کچھ بھی ہو سکتا ہے اور اگر تم ہمارے ساتھ تعاون کرو تو نہ صرف تمہارے ساتھ یہ سب کچھ نہیں ہو گا بلکہ تمہیں تعاون کرنے کا خاطر خواہ معاوضہ بھی دیا جائے گا''۔ امید کی کرن دیکھ کر وہ فوری بولا ''مجھے بتایئے مجھے کیا تعاون کرنا ہو گا؟'' میں نے اسے کہا کہ ''سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ کس حد تک تعاون کر سکتے ہو اور دوبارہ کہتا ہوں کہ مجھ سے کوئی سوال نہ کرنا۔ صرف میرے سوالوں کے جواب دیتے جاؤ اور بالکل صحیح جواب''۔

تم COPYING BRANCH میں سپرنٹنڈنٹ ہو۔ تمہارے پاس آرمی ہیڈ کوارٹرز سے بھیجی جانے والی ڈاک کے علاوہ آنے والی ڈاک کی بھی کاپیاں بنانے کیلئے آتی ہے''۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے پوچھا ''عموماً روزانہ کتنی ڈاک تمہارے سیکشن میں آتی ہے اور کتنی ڈاک جاتی ہے اور یاد رکھنا مجھے تمہارے دفتر میں آنے اور جانے والی ڈاک کی تمام تفصیل معلوم ہے۔ صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ تم کتنا سچ بولتے ہو۔ یہ باتیں تم سے پوچھ رہا ہوں''۔ لیفٹیننٹ میں اب قوت مدافعت بالکل نہیں رہی تھی۔ میں نے اسے مزید ڈرانے کے لئے کہا کہ تمہاری زندگی کا دارومدار اب صرف تمہارے سچ بولنے اور ہم سے تعاون کرنے پر ہے۔ اس لئے ہر جواب دینے سے پہلے میری بات کو یاد رکھنا۔ لیفٹیننٹ BREAKING POINT پر تو آ ہی چکا تھا اب میں اسے مزید ''جھٹکے'' دینا چاہتا تھا۔

ہندو اگر کسی بات سے زیادہ ڈرتا ہے تو وہ موت ہے۔ اسی موت کے ڈر سے چند ہزار غیر ملکی مسلمان فوجیوں کے ساتھ غوری، تغلق، غلاماں، لودھی اور مغل حکمرانوں نے کروڑوں کی تعداد میں ''نڈر اور باہمت'' ہندوؤں کے مہا بھارت پر دھڑلے سے حکومت کی۔ ان سے بھی پہلے محمد بن قاسم اور محمود غزنوی نے ہندوؤں کی اس ''پوتر'' دھرتی کا تیا پانچہ کیے رکھا اور اس کی وجہ ہندو کی ازلی بزدلی اور موت کا خوف تھا۔ زندہ انسانوں کی قربانی دے کر وہ ''کالی ماتا'' سے طاقت حاصل کرنے کی پراتھنا کرتے ہیں۔ کالی ماتا کا بت بھی انہوں نے اپنی بزدلی کو دور کرنے کیلئے بنایا ہوا ہے لیکن پتھر کی یہ مورتیاں بھی ان کا خوف دور نہ کر سکیں۔ جبکہ مسلمان کیلئے درجہ شہادت اس کی دنیا اور آخرت میں معراج کا نام ہے۔ رب ذوالجلال والاکرام نے درجہ شہادت کو نہ صرف مسلمان کی زندگی اور آخرت کی معراج قرار دیا ہے بلکہ شہید کا رتبہ اتنا بلند ہے کہ رب کریم نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ شہیدوں کو مردہ مت کہو۔ وہ زندہ ہیں اور ہم انہیں رزق دیتے ہیں۔ قیامت کے روز شہید بلا حساب کتاب کے داخل جنت ہوں گے''۔ شہادت کے بعد شہید کو جو اعلیٰ و ارفع مقام ملتا ہے تو وہ خداوند کریم سے بار بار دنیا میں جانے اور شہادت پانے کی التجا کرتے ہیں اور ہندو جن کے ہاں سورگ (جنت) اور نرک (جہنم) کا تصور تو ہے اور ان کے یقین کے مطابق بھی نرک میں آگ ہی آگ ہے شاید اسی آگ کا عادی بنانے کے لئے وہ مردہ ہندوؤں کو اس دنیا میں شمشان میں آگ کی نذر کر دیتے ہیں۔

لیفٹیننٹ نے مجھے بتایا کہ اوسطاً تیس سے چالیس خطوط روزانہ مختلف ڈویژنوں سے آتے ہیں۔ رجمنٹس اور بریگیڈیئرز کو ہیڈ کوارٹرز کو ڈائریکٹ CONTACT کرنے یا خطوط لکھنے کی اجازت نہیں ہوتی اور تقریباً اتنے ہی خطوط ہیڈ کوارٹرز سے باہر بھیجے جاتے ہیں۔ میں نے CLASSIFIED خطوط کے متعلق پوچھا تو لیفٹیننٹ نے بتایا کہ CLASSIFIED فائلوں میں لگنے کے لئے بھیج دیئے جاتے ہیں۔ ''اور ان سب کے انچارج تم ہو''۔ میرے اس سوال پر لیفٹیننٹ نے سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا اور CLASSIFIED اور ''اہم خطوط تم ہی ٹائپ کرتے ہو گے''۔ میں نے یونہی سوال جڑ دیا۔ ''ایسے خطوط ایک کلرک ٹائپسٹ ٹائپ کرتا ہے لیکن CORRECTION کے لئے پہلے میرے پاس آتے ہیں'' لیفٹیننٹ نے جواب دیا۔ میں نے چند لمحے تامل کے بعد لیفٹیننٹ سے پوچھا کہ کیا وہ میرے ساتھ تعاون کے لئے تیار ہے؟ لیفٹیننٹ نے جواب دیا ''اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے؟'' میں نے کہا کہ ایک دوسری صورت بھی ہے۔ ریسٹورنٹ کے باہر تمہیں گولی مار کر تمہارا کام تمام کر دیتے ہیں اور تم تعاون کے جھنجھٹ سے بچ جاؤ گے۔ لیفٹیننٹ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور التجائی لہجے میں کہنے لگا ''نہیں، نہیں سر، ایسا نہ کیجئے گا، میں آپ کے لئے ہر کام کرنے کو تیار ہوں''۔

میں نے لیفٹیننٹ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ''اگر تم اپنی جان بچانے کیلئے میرے ساتھ تعاون کرنے کی جھوٹ موٹ بات کر رہے ہو تو تمہارا اور تمہارے خاندان کا وہ بھیانک حشر کروں گا جس کا تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ اپنے تعاون کے ثبوت کے طور پر کل دفتر سے واپسی پر CLASSIFIED فائلوں میں سے گزشتہ 3 ماہ کی ڈاک نکال کر اور ایک بڑے لفافے میں بند کر کے اپنے ہمراہ لے آنا۔ وہ ڈاک تم سے کون اور کہاں لیتا ہے۔ وہ تمہیں ابھی نہیں بتاؤں گا۔ میرے علاوہ جو بھی تم سے ڈاک وصول کرے گا۔ وہ تمہیں آدھی تصویر دکھائے گا، میں نے اس کی تصویروں میں سے ایک تصویر اسے دہرا کر کے اوپری حصہ اسے دکھایا اور کہا کہ جو بھی یہ اوپری حصہ تمہیں دکھائے وہ لفافہ اس کے حوالے کر دینا۔ اس عمل کے دوران میرے کم از کم ایک درجن آدمی تمہاری نگرانی اور تمہاری نقل و حرکت کو دیکھتے رہیں گے۔ اگر کوئی بھی چالاکی کرنے کی کوشش کی تو تمہیں وہیں ہلاک کر دیا جائے گا۔ ان فائلوں میں ہماری دلچسپی ویسٹرن کمانڈ سے آئے ہوئے اور بھیجے ہوئے خطوط میں ہے۔ فائلوں کا لفافہ تمہیں اگلے روز شام کو واپس مل جائے گا''۔ ویسٹرن کمانڈ نے لیفٹیننٹ کو چونکا دیا۔ ''کیا آپ پاکستانی ہیں؟'' لیفٹیننٹ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ''نہیں، میں بھارتی ہوں اور اس سے زیادہ سوال کرنے کی تمہیں اجازت نہیں۔ جب تم ہمارا اعتماد حاصل کر لو گے تو تمہیں سب کچھ بتا دیا جائے گا۔ میں نے جواباً کہا۔ لیفٹیننٹ نے ڈرتے ڈرتے پھر سوال کیا ''سر میرے اس تعاون کا معاوضہ کیا ہو گا؟'' میں نے کہا دیکھو لیفٹیننٹ اب یہ تمہاری ہمت اور قابلیت پر ہے کہ تم مجھے کتنے اہم خطوط دیتے ہو۔ اس وقت اتنا کہہ سکتا ہوں کہ معاوضہ معقول ہو گا اور اگر کوئی بہت اہم خط تم نے ہمیں دیا تو اس کا معاوضہ کئی گنا ہو گا۔ میں نے تنبیہ کے طور پر اسے کہا ''اس کے دفتر اور اسی COPYING ROOM میں جہاں وہ بیٹھتا ہے ہمارا آدمی موجود ہے۔ وہ تمہاری دفتر کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھے گا۔ لہٰذا دفتر میں بھی کوئی چالاکی کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ کل شام کو تمہارا پہلا امتحان ہے اور اس میں کامیابی ہی ہمارا اعتماد حاصل کرنے کی جانب پہلا قدم ہو گا۔ کوئی کوتاہی یا عذر نہیں ہونا چاہیے''

غرضیکہ تقریباً دو گھنٹے کی ملاقات میں لیفٹیننٹ کو میں پوری طرح سے اپنے جال میں پھانس چکا تھا۔ میں نے بل ادا کیا اور لیفٹیننٹ کو کہا کہ وہ ٹھیک دس منٹ کے بعد باہر آئے۔ دس منٹ کے بعد جب لیفٹیننٹ باہر آیا تو میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ چھپر ہوٹل کے قریب اندھیرے میں چھپا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہی بس آ گئی اور وہ اس میں سوار ہو گیا۔ ادھر ہم نے ایک ٹیکسی لی اور پرانی دلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ ٹیکسی ڈرائیور کو زائد رقم دیکر ہم نے اسے 5 سواریاں بٹھانے پر رضامند کر لیا تھا۔ راستے میں ہمارا ایک ساتھی اتر گیا اور تھوڑے فاصلے پر ایک ایک کر کے سارے ساتھی اتر گئے۔ میں بھی محلہ فراش خانے سے پہلے ہی اتر گیا اور ایک گلی کا یونہی چکر کاٹ کر واپس سڑک پر آ کر ایک ٹیکسی لی اور اپنے ہوٹل جا پہنچا۔ میں نے ساتھیوں میں سے ان دو کی جو خاکروبوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے یہ ڈیوٹی لگائی کہ ایک لیفٹیننٹ کے گھر کی گلی کے باہر نگرانی کرے اور کوئی غیر معمولی بات دیکھے تو اسے نوٹ کرے اور 4 بجے سے پہلے گھر پہنچ جائے۔ دوسرے ساتھی کو بھی انہیں ہدایات کے ساتھ آرمی ہیڈ کوارٹرز کے باہر لیفٹیننٹ کی نگرانی کیلئے کہا کہ اگر لیفٹیننٹ چھٹی سے پہلے اکیلا یا کچھ اور آدمیوں کے ساتھ باہر نکلے تو اس کا فاصلہ رکھ کر پیچھا کرے۔

ہوٹل میں بستر پر دراز میں اگلے دن لیفٹیننٹ سے لفافہ لینے کی منصوبہ بندی کرنے لگا۔ ایک دوسرا مسئلہ یہ بھی تھا کہ میں لیفٹیننٹ سے حاصل کردہ خطوط کی کاپیاں کس طرح بناؤں گا۔ اگر فوٹو فلم بنوانے، اس فوٹوگرافر کے پاس گیا جس نے احمد نگر کی فائلوں کی کاپیاں بنائیں تھیں تو اسے شک پڑ سکتا تھا۔ ایسا کوئی طاقتور لیزر کیمرہ بھی ہمارے پاس نہیں تھا جن سے ان خطوط کی تصویریں اتار کر پاکستان بھیجی جا سکتیں۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ مجھے چاندنی چوک میں ایک ٹھیلے والا یاد آیا جو بڑی سلیٹوں کے سائز کے دو ٹکڑے جن کے فریم کے اندر کوئی چکنا مسالہ بھرا ہوا تھا ان میں ایک لکھا ہوا کاغذ ایک فریم میں رکھ کر دوسرے فریم سے اسے دباتا تھا اور پھر ان فریموں کو علیحدہ کر کے ایک سادہ کاغذ پہلے فریم میں رکھتا تھا اور دوسرے فریم سے اسے پھر دباتا تھا اور تحریر کا عکس نمایاں طور پر دوسرے کاغذ پر آ جاتا تھا۔ میں نے کافی دنوں پہلے اس ٹھیلے والے کے پاس سے گزرتے ہوئے سرسری طور پر اسے عکس اتارتے دیکھا تھا اور اسے محض ایک تماشہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ اب میں نے فیصلہ کیا کہ صبح سے پہلے پہلا کام اس ٹھیلے والے سے عکس اتارنے والی سلیٹوں کو دیکھنا ہے۔

غازی

اگلی صبح 10 بجے میں چاندنی چوک جا پہنچا۔ ٹھیلے والا کھڑا تھا۔ میں نے اسے ایک انگریزی رسالے کا ورق دیا جو میں ہمراہ لے گیا تھا۔ اس نے دو منٹ میں عکس اترا ہوا کاغذ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے اس کاغذ پر زور سے انگلیاں پھیر کر دیکھا کہ کہیں عکس اتر تو نہیں جاتا۔ عکس زعفرانی رنگ کا پختہ تھا۔ ٹھیلے والے نے مجھے ایک محلول سے بھری بوتل دی کہ جب عکس دھندلا ہو کر اترنے لگے تو بوتل کے محلول سے روئی بھگو کر پہلے والی سلیٹ پر پھیروں اور اس کے خشک ہونے کا انتظار کروں۔ ایک دفعہ محلول سے تر سلیٹ سے 40 سے زیادہ عکس اتر سکتے تھے۔ غرضیکہ جب میں مطمئن ہو گیا تو میں نے سلیٹوں کے چار سیٹ اور 4 بوتل محلول خریدے جن کی مجموعی قیمت 250 روپے ادا کی اور واپس ہوٹل چلا آیا۔ میرا ایک مسئلہ تو حل ہو چکا تھا لیکن دوسرا مسئلہ لیثونت سے لفافہ وصول کرنا تھا۔ جس کے متعلق میں کوئی قطعی فیصلہ نہ کر سکا تھا۔ اس عمل میں ہر طرح کی احتیاطی تدابیر کے باوجود خطرہ تھا کہ لیثونت نے ہمیں پکڑوانے کا کوئی انتظام نہ کر رکھا ہو۔ لیثونت کے سامنے صرف میں ظاہر ہوا تھا۔ میرے ساتھیوں کے متعلق اس کی معلومات صفر تھیں۔ لہٰذا اپنے ساتھیوں کے بچاؤ کیلئے میں نے بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ لیثونت سے لفافہ میں ہی وصول کروں گا۔ میرے ساتھی میرے تحفظ کیلئے ادھر ادھر موجود ہوں گے لیکن سامنے نہیں آئیں گے۔

آج کا دن میرے لئے بہت اہم تھا۔ لیثونت کے سامنے میں خود کو ظاہر (EXPOSE) کر چکا تھا اور فائلوں کے لفافے کی وصولی بھی مجھے ہی کرنی تھی۔ مجھے بار بار یہ خیال آتا کہ اگر لیثونت نے "چھوٹی برائی" یعنی اپنی ذاتی غلطیاں اور کوتاہیاں اپنے افسران کو بتا کر "بڑی برائی" یعنی اہم فائلیں ہمیں دینے اور تعاون کرنے کی بات اپنے افسران بالا کو بتا دی تو پھر کیا ہو گا۔ نا صرف ہمارا مشن ناکام ہو جائے گا بلکہ میں پکڑا بھی جاؤں گا۔ اس صورت حال میں میرا کیا حشر کیا جائے گا اس کا مجھے بخوبی اندازہ تھا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ پکڑے جانے کی صورت میں بھارتی تشدد کی سوچ ہی سے خوف کی لہر ریڑھ کی ہڈی تک اترتی محسوس ہوتی تھی۔ جان جانے کا خوف، یقین جانیے ہرگز نہ تھا کیونکہ ہم تو سروں پر کفن باندھ کر ہی سرحد پار آئے تھے۔ خوف تھا تو صرف یہ کہ میں تشدد کس انتہا تک سہہ سکوں گا۔ بہر حال اس بے چینی پر میں نے قابو پا لیا۔ پسٹل کو اچھی طرح چیک کر کے لوڈ کر لیا اور سائیڈ کی داڑھ کے تاروں کو ڈھیلا کر لیا تا کہ ضرورت پڑے تو اسے جلد از جلد نگل سکوں۔

میں ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ لیثونت سے پیکٹ کہاں پر لوں۔ لیثونت کے دفتر سے گھر جانے والی بس میں پیکٹ لینا خارج از بحث تھا۔ اسلئے کہ لیثونت کو اگر "ڈبل رول" کرنا تھا تو اس بس میں پہلے ہی سے بھارتی کمانڈو بیٹھے ہوں گے جو مجھے بڑی آسانی سے پکڑ سکتے تھے۔ اب باقی رہ گیا تھا لیثونت کا بس سے اتر کر گھر جانے کے دوران کا فاصلہ۔ بس اسٹاپ اس کے گھر کی گلی سے قریب پچاس ساٹھ میٹر کے فاصلے پر تھا۔ اس راستے پر بھی بھارتی کمانڈو پہلے سے موجود ہو سکتے تھے اور اس کے گھر کی گلی تو ایک پھندا ثابت ہو سکتی تھی۔ اگرچہ میرے چاروں ساتھی بس میں، سڑک اور گلی میں میری ہدایت کے مطابق موجود ہونے تھے لیکن ہم پانچوں اپنے سائیڈ آرمز کے ساتھ کمانڈوز کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ سوچ سوچ کر بالآخر ایک تجویز کچھ بہتر نظر آئی اور میں نے اس کے مطابق عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میری روانگی کا وقت ہو چلا تھا۔ میں نے دو نفل بارگاہ رب العزت میں اپنی کامیابی کی التجا کے پڑھے اور اپنی ساری تیاری کے ساتھ ہوٹل سے باہر آ گیا۔

میں نے ہوٹل کے باہر کھڑی ٹیکسیوں میں سے ایک ٹیکسی لی اور اسے کناٹ پیلس لے گیا۔ وہاں اس ٹیکسی کو چھوڑ کر ایک دوسری ٹیکسی لی اور لیثونت کے گھر کی گلی کے سامنے سے رفتار آہستہ کروا کے آگے بڑھ گیا۔ میرے دو ساتھی وہاں موجود خوانچے اور ٹھیلے والوں کے ساتھ مصروف تھے۔ آگے جا کر میں نے یہ ٹیکسی بھی چھوڑ دی اور ایک اور ٹیکسی لے کر لیثونت کی گلی والی سڑک پر آ گیا اور اسے ایسی جگہ پارک کروایا جہاں سے بس اسٹاپ اور میری ٹیکسی کے بیچ میں لیثونت کی گلی پڑتی تھی۔ ٹیکسی کا رخ میں نے بس روٹ کے مخالف سمت رکھا۔

مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا دفتر کے روٹ والی بس آ گئی۔ تین چار مسافروں کے ساتھ لیثونت بھی اترا اور میرے دو ساتھی بھی۔ دوسرے اترنے والے مسافر بے ضرر دکھائی دے رہے تھے۔ بس آگے بڑھ گئی۔ میرے پہلے سے موجود دو ساتھی مجھے اپنے مخصوص اشاروں سے سب اچھا کی رپورٹ دے چکے تھے۔ بس سے اترنے والے ساتھیوں نے بھی اشاروں میں سب اچھا کی رپورٹ دی تو میں نے ٹیکسی اسٹارٹ کرنے اور آہستہ آہستہ آگے بڑھانے کا کہا۔ لیثونت بوجھل قدموں سے اپنی گلی کی طرف آ رہا تھا اس کے ہاتھ میں کپڑے کا بنا ہوا ایک بڑا تھیلا تھا جسے وہ دوپہر کے کھانے کا ٹفن کیریئر رکھنے کے لئے استعمال کرتا تھا۔ لیثونت ابھی گلی سے کچھ فاصلے پر ہی تھا کہ میں نے ٹیکسی اس کے بالکل قریب رکوا دی۔ لیثونت نے مجھے دیکھا اور اشارہ کیا کہ باہر آ جاؤں۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ گلی میں داخل ہوتے ہی اس نے تھیلے میں سے ایک بڑا پیکٹ مجھے نکال کر دیا اور کہا کہ صبح 7 بجے تک اسے واپس پہنچا دوں۔ یہ سارا عمل آٹھ دس سیکنڈ میں ہوا۔ پیکٹ لے کر میں تیزی سے پلٹا۔ میرے چاروں ساتھی اس دوران گلی کے قریب پہنچ چکے تھے۔ انہیں بھی یہی خدشہ تھا کہ کہیں میں ٹریپ نہ ہو جاؤں۔

ٹیکسی تک پہنچتے پہنچتے میں نے پیکٹ ایک ساتھی کو تھما دیا اور کہا کہ گھر پہنچو میں وہیں آ رہا ہوں۔ کناٹ پیلس پر میں نے پھر ٹیکسی بدلی اور اپنے ہوٹل آ گیا۔ ہوٹل تک پہنچتے پہنچتے میں بار بار پیچھے دیکھتا رہا کہ کہیں میرا پیچھا تو نہیں ہو رہا لیکن سب ٹھیک تھا۔ ہوٹل پہنچ کر میں نے سکون کا ایک گہرا سانس لیا۔ اب تک سب کام ہمارے منصوبے کے عین مطابق ہو رہے تھے۔ میں ایک ڈیڑھ گھنٹہ آرام کر کے فریش ہو گیا اور سلیٹوں کے چاروں سیٹ اور کیمیکل کی ایک بوتل لے کر ساتھیوں کی طرف چل پڑا۔

میرے ساتھی میرے منتظر تھے۔ انہوں نے پیکٹ کھولا نہیں تھا۔ میں نے پیکٹ کھولا، اس میں ایک بڑی فائل میں آنے والی ڈاک اور دوسری فائل میں جانے والی ڈاک کے کل ملا کے دو سو سے اوپر خطوط تھے۔ میں نے خطوط پڑھنے سے پہلے اچھی طرح سے جانچ کی کہ آنے والی ڈاک کے خطوط پر دفتری طریقے کے ڈبل فولڈنگ کے نشان ہیں یا نہیں۔ سب پر یہ نشان موجود تھے جس سے انکے صحیح ہونے کا پتہ چلتا تھا جبکہ جانے والے ڈاک فولڈ نہیں تھی ہر خط پر TOP PRIORITY اور CONFEDENTAIL کی مہر لگی ہوئی تھی۔ جانے والی ڈاک کاربن کی کاپیاں تھیں۔ جبکہ آنے والی ڈاک اصلی خطوط پر مشتمل تھی اور ان کے لیٹر ہیڈز پر مختلف CORPS اور ڈویژنز کے نشان اور نمبر چھپے ہوئے تھے۔ جبکہ جانے والی ڈاک پر خط بھیجنے والے افسر کا نام اور رینک دستخطوں والی جگہ کے نیچے درج تھا اور اس کے نیچے ٹائپسٹ اور آفس سپرنٹنڈنٹ کے نام کے پہلے حروف درج تھے۔ جب میں ہر طرح سے ڈاک کے صحیح ہونے پر مطمئن ہو گیا تو میں نے ساتھیوں کو بتایا۔ انہوں نے خوشی کا نعرہ لگایا اور بڑھ بڑھ کر مجھے اس کامیابی پر مبارکباد دینے لگے۔ میں نے انہیں اسی گرم جوشی سے مبارک دی اور کہا کہ اتنی بڑی کامیابی ٹیم ورک کے بغیر ممکن نہ تھی اور مبارکباد کے ہم سب برابر کے مستحق ہیں۔

حقیقتاً یہ ہماری بہت بڑی کامیابی تھی۔ ہم آرمی ہیڈ کوارٹرز میں دراڑ ڈالنے اور رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور اب ہمیں مسلسل اہم نوعیت کی معلومات وصول کرنے کا راستہ تلاش کرنا تھا۔

میں نے چاروں ساتھیوں کو سلیٹوں سے کاپی بنانے کی ترکیب سمجھائی اور دونوں فائلوں کے کاغذات ان میں بانٹ دیئے اور وہ پوری مستعدی سے کاپیاں بنانے میں لگ گئے۔ چار گھنٹے سے زیادہ کی مسلسل عرق ریزی سے تمام کاپیاں تیار ہو گئیں۔ میں نے لیثونت کی دی ہوئی فائلوں میں خطوط اسی ترتیب سے لگا دیئے۔ جو کاپیاں ہم نے بنائی تھیں، وہ الگ محفوظ کر دی گئیں۔ کامیابی کی خوشی میں ہم رات کا کھانا بھی بھول چکے تھے۔ جب سب کام ختم ہو گیا تو ایک ساتھی نے چائے بنائی۔ چائے پیتے ہوئے مجھے ایک خیال سوجھا۔ میں نے کیمرے والے اور ایک دوسرے ساتھی کو تیار ہونے کے لئے کہا۔ تیار تو وہ پہلے ہی تھے اور مسلح بھی۔ کیمرہ اور فلیش گن بیگ میں ڈال کر وہ میرے ساتھ ہو لئے۔

رات کے قریباً ساڑھے 11 بجے ہوں گے جب ہم لیثونت کی گلی میں پہنچے۔ ٹمٹماتے ہوئے ایک دو سرکاری بلب اس تنگ گلی کا اندھیرا دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ میں نے کیمرے والے ساتھی سے کہا کہ لیثونت کے گھر کے دروازے کے باہر وہ میری اور لیثونت کی ایسے پوز میں تصویر اتارے کہ میری پشت ہو اور لیثونت کا چہرا اور میں فائلیں اسے دیتے ہوئے اس طرح پکڑوں گا کہ فائل کور اور اس پر لکھا ہوا صاف پڑھا جائے۔ دراصل ساتھیوں کے گھر چائے پیتے ہوئے میرا خیال اچانک ایک فائل کور پر گیا۔ لیثونت نے اپنے دفتر میں جلدی یا گھبراہٹ میں بھیجے جانے والے خطوط کی کاربن کاپیز ایسے فائل کور میں لگا دی تھیں جس پر اوپری کونے سے نیچے دوسرے کونے تک ایک موٹی سرخ پٹی بنی ہوئی تھی اور اس پٹی پر بڑے حروف میں CONFEDENTIAL اور فائل کور کے اوپری حصے پر بھی بڑے حروف میں ARMY HEAD QUARTERS لکھا ہوا تھا۔ اسی فائل کور نے مجھے یہ کام کرنے پر اکسایا تھا۔ میرے ساتھی نے لیثونت کے گھر کے سامنے پہنچ کر کیمرے کو فوکس کر کے اپنی جگہ سنبھال لی۔

دوسرے ساتھی نے پسٹل نکال کر ہمیں کور کیا اور میں نے لیثونت کے گھر کے دروازے پر لگی گھنٹی بجائی۔ تھوڑی دیر بعد لیثونت کی بڑی ٹیچر لڑکی نے دروازہ کھول کر پوچھا۔ میں نے کہا "ایک ضروری کام سے لیثونت صاحب سے ملنا ہے"۔ وہ لڑکی غالباً سوئی ہوئی تھی اس لئے بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی گئی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ہی لیثونت دھوتی سنبھالتا ہوا باہر آیا۔ مجھے دیکھ کر اس کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ گم صم سوالیہ نشان بنا کھڑا تھا۔ میں نے اسے کہا "دیر سے آنے کی معافی چاہتا ہوں۔ علی الصباح مجھے ایک ضروری کام سے آگرہ جانا ہے اس لئے فائلیں لوٹانے آیا ہوں"۔ یہ کہتے کہتے میں نے سرخ پٹی والی فائل پیکٹ سے نکالی اور لیثونت کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا "آپ کا تعاون ہمیں بروقت ملتا رہے تو آپ کو ہماری وجہ سے کوئی پریشانی نہیں ہو گی"۔ ٹھیک اسی وقت فلیش لائٹ چمکی۔ لیثونت کے منہ سے بے اختیار چیخ نکلی اور وہ اچھل پڑا۔ میں نے لیثونت کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے دلاسہ دیا۔ وہ بار بار میرے کیمرے والے ساتھی کی جانب اشارہ کر رہا تھا جو تصویر اتارتے ہی تیز قدموں سے سڑک کی طرف چل دیا تھا اور صرف اس کا سایہ ہی دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے دوسری فائل اور پیکٹ کو لیثونت کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ کوئی بات نہیں، اپنا ہی آدمی تھا۔ لیثونت نے گھبراہٹ میں اٹکتے اٹکتے کہا۔ اس نے تصویر اتاری ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں اس نے تصویر اتاری ہے۔ صرف ہمارے تعاون کو مضبوط بنانے کے لئے"۔

لیثونت کے ساتھ گزشتہ 30 گھنٹوں میں جو کچھ ہوا تھا اس سے اس کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ وہ سر جھکائے، نگاہیں اپنے پاؤں پر جمائے خاموش کھڑا تھا۔ میں نے اسے کہا "پرسوں شام سات بجے میں سرائے بیرم خان کے اسی ہوٹل میں آپ کا منتظر ہوں گے۔ آپ اپنے ہمراہ TOP PRIORTY اور انتہائی CLASSIFIED اہم معلومات کے کاغذ لائیں۔ آپ نے اب جب ہم سے تعاون کرنا شروع کر دیا ہے تو پھر جھجک کیسی۔ پرسوں ملاقات کے بعد آپ کے شمی کے بالا خانے پر جانے کا مالی بندوبست کر دیا جائے گا"۔ لیثونت کے چہرے پر مایوس سی مسکراہٹ آئی۔ میں نے فوراً ہی کہا "مسٹر لیثونت مجھے انتظار کرنا بالکل پسند نہیں لہٰذا ٹھیک وقت پر پہنچ جائیں اور دوسری بات یہ ہے کہ ہم دوست ہیں لیکن میری ہدایات پر عمل کرتے وقت مجھے باس سمجھنا اسی میں تمہاری بھلائی ہے"۔ وہ ہلکی سی مسکراہٹ جو لیثونت کے چہرے پر چند لمحے پہلے نمودار ہوئی تھی۔ وہ ختم ہو گئی اور میں اسے مزید کچھ کہے بغیر واپس چل دیا۔ ہمیں کور دینے والا ساتھی بھی اوٹ سے نکل کر تیز تیز چلتا ہوا مجھ سے پہلے سڑک پر پہنچ گیا تھا۔ کچھ دیر انتظار کے بعد ہمیں ٹیکسی مل گئی۔ ساتھیوں کو ان کے گھر قریب اتار کر میں نے لودھی ہوٹل کے قریب ٹیکسی کو فارغ کر دیا اور ٹہلتے ہوئے ہوٹل جا پہنچا۔ اپنے مشن میں کامیابی کے بعد میری ساری بے چینی اور تھکن دور ہو چکی تھی۔ ہوٹل لاؤنج میں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد میں اپنے کمرے میں چلا آیا اور مشن میں کامیابی کے بعد اس کے تسلسل اور رابطے کے مختلف ذرائع کے متعلق سوچتا ہوا سو گیا۔

اگلے روز صبح ہی میں اپنے ساتھیوں کے گھر چلا گیا اور وائرلیس پر کوڈ پیغام لاہور بھیجا کہ اس بار دو کیریئرز کو بھیجا جائے۔ آرمی ہیڈ کوارٹرز میں رابطہ پیدا کر لیا گیا ہے۔ اہم کاغذات کی کاپیاں بھیجنی ہیں، اگر ممکن ہو تو ایسا کیمرا بھیجا جائے جس سے کاغذات کی تصویر اتاری جا سکیں۔ کیمرے کے لئے فالتو فلمیں بھی خاصی تعداد میں بھیجی جائیں۔ یہ پیغام بھیجنے کے بعد میں نے خاکروبوں کے پیچھے لگائے ہوئے دونوں ساتھیوں سے کہا کہ اب جب کہ لیثونت ہمیں صرف Copying Office میں موجود کاغذات مہیا کر سکتا ہے جبکہ ہیڈ کوارٹرز میں جنرل اور دوسرے سینئر افسران کے کمروں تک اس کی رسائی نہیں۔ وہاں صرف خاکروب ہی دفتری اوقات کے بعد صفائی کیلئے جاتے ہیں اور ان کے ذریعے ہی ان کے لکھے ہوئے نوٹ جنہیں وہ دو تین ٹکڑے کر کے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتے ہیں، ہمیں لا کر دے سکتے ہیں۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ ہیڈ کوارٹرز میں بیسیوں صفائی کرنے والے ہوتے ہیں۔ جنرل اور دوسرے سینئر افسران کے کمرے کون صاف کرتا ہے ان کے متعلق معلومات لیثونت ہی ہمیں دے سکتا ہے۔ لہٰذا پہلے لیثونت سے ان خاکروبوں کے نام معلوم کئے جائیں اور پھر ان پر کام کیا جائے۔ دراصل حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے آئندہ کے منصوبوں میں بھی تبدیلی کرنی پڑتی تھی۔

لیثونت کا تعاون حاصل ہونے سے پہلے ہم ہیڈ کوارٹرز تک رسائی کے لئے چاروں طرف ہاتھ پاؤں مار رہے تھے لیکن اب صورتحال حال بدل چکی تھی۔ اب ہمیں صحیح افراد تک لیثونت پہنچا سکتا تھا یا کم از کم ان کی نشاندہی کر سکتا تھا۔ میرے ساتھی جان دینے کو تو ہر وقت تیار رہتے تھے۔ لیکن نہ تو ان کی سوچ میں گہرائی تھی اور نہ ہی وہ اپنے گروپ لیڈر سے اختلاف کرتے اور مشورے دیتے تھے۔ شاید یہ ان کی ٹریننگ اور سخت ڈسپلن کی وجہ سے ہو۔ میں نے کئی بار ان سے مشورہ کرنا چاہا لیکن وہ صرف میری ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے فیصلہ کر لیا کہ فی الحال سوئیپرز پر کام کرنے والے ساتھیوں کو روک دوں۔ میں نے کچھ دیر پہلے ہی ساتھیوں کو سوئیپرز پر کام کو تیز کرنے کا کہا تھا اور اب جب انہیں روک دیا اور اس کی وجہ بتائی تو انہوں نے میرے فیصلے سے اتفاق کیا اور یہیں پر میں نے ایک اور فیصلہ کر لیا کہ آئندہ انہیں مشورے میں ضرور شامل کیا کروں گا لیکن حتمی فیصلہ خود کروں گا۔ اپنی ہدایات کے تحت ہمیں بارڈر پار بھیجا گیا تھا۔ فوجی جوانوں کی ٹریننگ میں اپنے افسر کے حکم ماننے کی نہایت سختی سے ہدایات کی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ دوران جنگ اپنے افسر کا حکم مانتے ہوئے جوان ہزاروں لاکھوں گولیوں اور گولوں کے درمیان کود جاتے ہیں۔ ٹریننگ اور بعد میں ساری سروس کے دوران اس مقولے پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے کہ Think Later Obey First اور میرے ساتھی اسی ٹریننگ کے باعث بے چوں چرا ان عمل کر رہے تھے۔

لیثونت سے رابطہ قائم ہو جانے کے بارے میں سوچتا تھا، تو میرے خدشات بڑھتے جاتے تھے۔ جب تک ہم "تہی دامن" تھے۔ ہمیں کوئی فکر نہ تھی لیکن لیثونت سے کامیاب رابطہ ہمارے لئے بہت قیمتی تھا اور اسے برقرار رکھنے کے لئے پھونک پھونک کر قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔ میرے خدشات اس نوعیت کے تھے۔ (1) لیثونت سے ہر بار کاغذات لینے اور پھر لوٹانے کے دوران پکڑے جانے کا خطرہ جس کی وجوہات میں (الف) لیثونت کی پہلے سے ہی بھارتی جاسوسوں کی نگرانی جس کی وجہ ایک حساس محکمے کے محدود آمدنی والے شخص کی Out of Bound علاقے میں بالا خانوں پر اکثر جانا۔ (ب) شراب کے نشے میں اپنا راز اگل دینا۔ (ج) لیثونت کی جوان اولاد کو باپ کی اس "ڈیل" کا پتہ چل جانا اور وطن پرستی کے جذبے کے تحت ان کا اس ڈیل کو طشت از بام کرنا۔ (د) لیثونت کو مجھ سے جو رقم ملتی تھی اسے بے احتیاطی سے خرچ کرنا اور پکڑے جانا۔ غرضیکہ کئی خدشات تھے جن سے نپٹنے کے لئے مجھے فیصلہ کرنا تھا۔ میرا پہلا فیصلہ تو یہ تھا کہ ذاتی طور پر لیثونت سے کاغذات لینے اور دینے کے بجائے DROP کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ یعنی کسی پبلک پیلس پر کسی ایسی محفوظ جگہ کو تلاش کرنا جہاں لیثونت مقررہ وقت پر کاغذات کا پیکٹ رکھ دیا کرے اور میں اور میرے ساتھی باری باری وہاں سے وہ پیکٹ لیثونت کی واپسی کے فوری بعد اٹھا لیا کریں اور اسی طرح مقررہ وقت پر ہم پیکٹ رکھ دیا کریں اور لیثونت اٹھا لیا کرے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو یہ تجویز بتائی تو حسب معمول انہوں نے بالکل صحیح اور بہت اچھا کہا۔

قسط نمبر 15

غازی

اگلے روز شام کو لیثونت نے مجھے سرائے بیرم خان کے ریسٹورنٹ میں ملنا تھا۔ اس دوران مجھے DROP کے لئے محفوظ جگہوں کا انتخاب کرنا تھا اور دوسرے مجھے اب خاصی رقم کی ضرورت تھی تا کہ لیثونت کو روپوں کی نکیل ڈالے رکھوں۔ ایسی اشد ضرورت کے وقت مجھے اپنے ''ہمدردوں'' سے رابطہ کرنے کی اجازت تھی۔ میں ساتھیوں سے رخصت ہو کر کپڑے کی مارکیٹ (مصلحتاً نام نہیں لکھ رہا) پہنچا۔ دہلی پہنچتے ہی شروع کے دنوں میں، میں اپنے ''ہمدردوں'' کے ٹھکانے دیکھ چکا تھا۔ تا کہ بوقت ضرورت تلاش کرنے میں دقت نہ ہو۔ مارکیٹ میں، میں اپنے ہمدرد کی دکان پر گیا۔ میں نے چٹ پر رقم اور اپنا کوڈ نمبر لکھ رکھا تھا۔ یہ تھوک کپڑے کی مارکیٹ تھی۔ دکان کے مالک کا حلیہ مجھے پہلے ہی بتا دیا گیا تھا اور ''شناختی نام'' بھی، پھر بھی تسلی کیلئے میں نے دکان کے مالک کا پوچھا۔ دکان کے اندر ایک کیبن میں وہ بیٹھا تھا۔ میں اس کے پاس گیا اور رسمی سی گفتگو کے بعد میں نے ''شناختی'' نام لیا۔ وہ ایک دم چونک اٹھا اور کہا فرمایئے کیا حکم ہے؟ میں نے چٹ اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ چٹ پڑھتے ہی اس نے ایک ڈائری نکالی۔ شاید اس میں میرا کوڈ اور حلیہ درج تھا۔ اس نے چٹ ڈائری میں رکھ لی اور دراز کھول کر بیس ہزار روپے مجھے دے دیا اور میں فوراً ہی شکریہ ادا کر کے دکان سے باہر آ گیا۔ شاید پہلے بھی کہیں عرض کر چکا ہوں کہ ان ہمدردوں کو ہمارا محکمہ غیر ملکی کرنسی میں ہمارا لیا ہوا پیسہ ادا کرتا تھا اور ہر ہمدرد کے پاس ہمارے محکمے کی خاصی رقم محفوظ ہوتی تھی۔

مارکیٹ سے باہر آ کر میں نے ٹیکسی لی اور ممکنہ محفوظ جگہوں کے انتخاب کے لئے لیثونت کے دفتر اور گھر والی سڑک کے کئی چکر لگائے لیکن کوئی محفوظ جگہ نظر نہ آئی۔ ادھر لیثونت کا دفتر سے گھر واپسی کے دوران بس سے اکثر اترنا بھی اس کے ہمسفر دفتر کے ساتھیوں کو شک میں مبتلا کر سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے DROP کی جگہ کا تعین لیثونت سے آئندہ شام ملاقات پر باہمی رضامندی پر چھوڑ دیا۔

میں اپنے ہوٹل واپس آ گیا اور شام کو سروسز کلب میں کرنل شنکر سے ملنے چلا گیا۔ کرنل شنکر لان کے اسی مخصوص گوشے میں مے نوشی میں مشغول تھا۔ اس نے خاصی بے تکلفی سے مجھے خوش آمدید کہا اور کئی روز کی غیر حاضری کی شکایت کی۔ میں نے ضروری کام سے بمبئی جانے کا عذر پیش کیا۔ کرنل شنکر نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ عبدالکریم اپنی مخصوص جگہ پر باادب کھڑا تھا۔ اس نے کئی بار آنکھوں اور چہرے کی حرکت سے مجھے اشارے کئے جنہیں شام کے دھندلکے میں میں سمجھ نہ سکا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے کرنل شنکر کو کہا کہ مجھے ٹوائلٹ جانا ہے۔ اس نے عبدالکریم کو بلا کر کہا اور یوں میں عبدالکریم کے ہمراہ کرنل کے بیڈروم کے ٹوائلٹ میں چلا گیا۔ عبدالکریم نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا کہ اگر آپ ناراض نہ ہوں تو مجھے علیحدگی میں آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ میں نے کہا عبدالکریم جو باتیں بھی کرنی ہیں کل 11 بجے لودھی ہوٹل میں میرے کمرے میں آ کر کرنا۔ عبدالکریم نے اثبات میں سر ہلایا اور میں پھر کرنل کی محفل میں شامل ہو گیا۔ کرنل شنکر آج میری گزشتہ زندگی کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ میں نے کہا کہ کرنل صاحب صرف ناموں اور جگہوں کا فرق ہے ورنہ میری اور آپ کی داستان ایک ہی ہے۔ آپ نے بھی محبت میں شکست کھائی اور میں نے بھی۔ آپ نے اپنے غم شراب میں سموئے اور میں نے بمبئی کی رنگینیوں میں۔ لیکن یہ دل ہے کہ سنبھلتا ہی نہیں۔ تنہائی میں دل کے زخم پھر رسنے لگتے ہیں۔ کرنل مجھ سے تفصیلاً پوچھنا چاہتا تھا۔ مجھے کہانی کا کوئی سرا ملتا ہی نہ تھا۔ میں نے جھوٹ موٹ آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ کرنل صاحب آپ نے دبی ہوئی راکھ کرید کر مجھ پر بڑا ظلم کیا ہے نجانے اب کتنا وقت اس چنگاری کو دوبارہ راکھ بننے میں لگے گا۔ آپ تو فوجی ہیں جذبات پر قابو پا سکتے ہیں لیکن میرے لئے یہ بڑا مشکل ہے۔ میں اب اجازت چاہوں گا۔ یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ کرنل نے مجھے کئی بار بیٹھنے کیلئے کہا اور آخر میں خود اٹھ کھڑا ہوا لیکن میں نے ایسی ایکٹنگ کی کہ کرنل بھی چکرا گیا اور میں قریباً روتے ہوئے اس سے رخصت ہوا۔

میرا آج کا دن خاصا مصروف گزرا تھا۔ میں ہوٹل واپس آ گیا ریسپشن پر میرے لئے آشا کا پیغام موجود تھا۔ اس نے مجھے گھر پر فون کرنے کا کہا تھا۔ میں نے ہوٹل میں لابی سے ہی آشا کو فون کیا وہ گھر پر ہی تھی۔ اس کی طبیعت ناساز تھی اور جے چند اپنے کاروباری سلسلے میں چندی گڑھ گیا ہوا تھا ڈھیر سارے شکوے شکایتوں کے بعد آشا نے مجھے گھر آنے کی دعوت دی۔ میں نے فوراً اپنی طبیعت کے ناساز ہونے کا بہانہ کر کے معذرت کر لی۔ آشا نے بالآخر جب کوئی چارہ نہ دیکھا تو بولی ''میں آپ سے آپ کی بہتری کے لئے ہی ملنا چاہتی تھی'' اس کی یہ بات سن کر میں کچھ پریشان سا ہو گیا۔ بھلا آشا میری بہتری کے لئے کیا کر سکتی تھی۔ میں نے اس سے بہتیرا پوچھا لیکن اس نے ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی کہ ملنے پر ہی بتائے گی۔ اگلا دن میری مصروفیت کا تھا گیارہ بجے عبدالکریم آ رہا تھا، شام کو لیثونت سے ملنا تھا اور اس دوران اپنے ساتھیوں سے بھی ملنا اور سرائے بیرم خان کا پروگرام سیٹ کرنا تھا۔ عام حالات میں آشا کی بات کو میں اہمیت نہ دیتا۔ لیکن دشمن ملک میں ہندو بن کر رہنے اور جاسوسی کرنے والے کو چھوٹی سے چھوٹی بات کو اہمیت دینی پڑتی ہے اور پھر آشا کے تعلقات تو فوجی اور سول افسران سے تھے لہٰذا میں نے آشا سے اشوکا ہوٹل میں ایک بجے اکٹھے لنچ کرنے کا کہا۔ لیکن آشا نے کہا کہ اشوکا میں اسٹاف کے اکثر لوگ اسے مسز جے چند کی حیثیت سے جانتے ہیں اس لئے کناٹ سرکس میں چائنیز ریسٹورنٹ میں وہ دوپہر ایک بجے مجھے ملے گی۔ میں آشا کی اس ''بہتری'' والی بات سے اپ سیٹ ہو چکا تھا بہرحال موقع محل کی مناسبت سے آئندہ قدم اٹھانے کا سوچ کر میں کمرے میں چلا گیا۔

دوسرے دن ٹھیک 11 بجے ریسپشنسٹ نے مجھے عبدالکریم کی آمد کی اطلاع دی۔ میں نے اسے کمرے میں بلا لیا۔ عبدالکریم نے سول لباس پہنا ہوا تھا۔ اس نے نہایت مودبانہ انداز میں مجھے سلام کیا۔ میں نے اسے صوفے پر بیٹھنے کا کہا تو وہ جھجکا اور کہنے لگا نہیں صاحب میں قالین پر بیٹھوں گا۔ میں نے اسے کہا کہ اگر مجھ سے بات کرنی ہے تو جیسا میں کہوں ویسا کرو اور عبدالکریم صوفے پر جھجکتے ہوئے سمٹ کر بیٹھ گیا۔

عبدالکریم کا رویہ کوئی غیر معمولی نہ تھا سارے بھارت میں مسلمانوں کی یہی حالت ہے۔ انہیں دوسرے درجے کے شہری کی حیثیت دی جاتی ہے۔ بھارت میں مسلمان ہونا ہی بہت بڑا جرم ہے۔ میں نے بھارت میں اپنے قیام کے دوران محسوس کیا کہ گنتی کے چند مسلمان خاندانوں کے سوا جنہیں بھارتی حکومت، مراعات دے کر DECORATION PIECE کے طور پر عالمی رائے کو اپنے سیکولر نظام کا جھوٹا پروپیگنڈا کرنے کے لئے استعمال کرتی ہے، عام مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ مسلمانوں کو بھارت میں ملازمتیں نہیں ملتیں۔ اگر کوئی مسلمان معمولی دکان سے بھی کاروبار شروع کرے تو اردگرد کے ہندو دکاندار اپنی اشیائے فروخت کی قیمتوں میں کمی کر کے اس مسلمان کی دکان بند کروا دیتے ہیں۔ یہاں میں ایک واقعہ مختصراً بیان کرنا چاہتا ہوں جس کا میرے مشن سے کوئی تعلق نہیں لیکن یہ بھارتی مسلمانوں کی حالت زار کا عکاس ہے۔ الٰہ آباد کے جنگی قیدیوں کے کیمپ نمبر 2 میں بھارت کے ایک کاروباری اور سیاسی مراعات یافتہ سربراہ کو تقریر کرنے یا برین واش کرنے کیلئے لایا گیا۔ اس نے پاکستانی فوجیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آپ خوامخواہ بھارت سے جنگ کر کے اپنی جانیں ضائع کرتے ہیں۔ بھارت ہو یا کشمیر بھارتی مسلمان اور ہندوؤں سے یکساں سلوک کیا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بھارتی لوک سبھا (نیشنل اسمبلی) میں بھارتی مسلمان جو اقلیت میں ہیں ان کے لئے کوئی علیحدہ کوٹہ مقرر نہیں جبکہ پاکستان میں ایسا نہیں ہے۔ یہاں مسلم اور غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں۔ سب سے برابر کا سلوک کیا جاتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت میں خود ہوں۔ میں مسلمان ہوں، میں صنعت کار بھی ہوں اور سیاست میں بھی ہوں۔ اگر بھارت میں مسلمانوں کے ساتھ یکساں سلوک نہ کیا جاتا تو آج میں اس مرتبے پر نہ ہوتا۔ غرضیکہ اس نے خاصی لمبی تقریر جھاڑی۔ باقی تو سب خاموشی سے اس کی بکواس سنتے رہے لیکن ایک پاکستانی صوبیدار P.O.W سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ کھڑا ہو گیا اور سوال کرنے کی اجازت چاہی۔ اس صوبیدار سے بعد میں، میں پاکستان میں مل چکا ہوں اور خود اس کی زبانی مکالمہ کچھ یوں ہوا۔

صوبیدار: جناب بھارت میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب کیا ہے؟

صنعت کار: مسلمان بھارت کی کل آبادی کا آٹھواں حصہ ہیں۔

صوبیدار: کیا آپ مسلمانوں کو MARTIAL RACE (جنگجو قوم) تسلیم کرتے ہیں؟

صنعت کار: یقیناً مسلمان MARTIAL RACE ہیں۔

صوبیدار: اور آپ کے کہنے کے مطابق بھارت میں مسلمانوں سے یکساں سلوک کیا جاتا ہے؟

صنعت کار: یہ بات بالکل صحیح ہے۔

صوبیدار: تو جناب یہ بتایئے کہ آپ کے ملک کی آبادی کا آٹھواں حصہ جنگجو قوم مسلمانوں پر مشتمل ہے تو پھر 47ء سے آج 25 برس میں آپ کی فوج میں کتنے مسلمان جنرل بنے ہیں؟ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کوئی نہیں۔

صنعت کار شرم سے پسینے میں شرابور ہو گیا اور تقریر ادھوری چھوڑ کر واپس چلا گیا اور پاکستانی صوبیدار کو سچ بولنے کی پاداش میں 21 روز کی قید تنہائی ملی اور اس کا راشن آدھا کر دیا گیا۔

میں نے بھارت میں قیام کے دوران اچھی طرح سے محسوس کیا کہ بھارتی ہندو مسلمانوں سے خدا واسطے کا بیر رکھتے ہیں اور انہیں بلاوجہ ذلیل و خوار کرنے اور بلا سبب قتل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ہندو خود وہی بات کریں تو ہرج نہیں لیکن اگر وہی بات بھارتی مسلمان کرے تو ہندو دھرم پر ''حملہ'' کرنے کا بے بنیاد الزام لگا کر ہندو مسلم فسادات شروع کر دیئے جاتے ہیں۔ جن میں مرنے والے مسلمان جو کل آبادی کا آٹھواں حصہ ہیں، کی تعداد ہندوؤں سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔

دہلی میں اشوکا اور اکبر ہوٹل بھارت سرکار کی ملکیت ہیں۔ ان ہوٹلوں میں یورپین اور امریکی گاہکوں کو ''گاؤ ماتا'' کا گوشت کھلے بندوں پیش کیا جاتا ہے لیکن اسی گاؤ ماتا کو اگر کوئی مسلمان سبزی فروش اپنی سبزی بچانے کے لئے ہلکا سا ڈنڈا بھی مار دے تو ہندو دھرم کی پوتر گاؤ ماتا کی بے عزتی کو جواز بنا کر ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ ہنومان کی نسبت سے بندر ہندو دھرم کا ایک اہم دیوتا ہے۔ بھارت سرکار ہی اپنے اسی دیوتا کو ہر سال چالیس ہزار سے زیادہ تعداد میں ڈاکٹری تجربات کے لئے غیر ممالک کو فروخت کرتی ہے جو اس دیوتا کی چیر پھاڑ کرتے ہیں۔ میں نے بمبئی سے بارہ چودہ میل سمندر کے اندر ایلیفینٹا (ELEFHANTA) جزیرے پر چٹانوں میں جہاں کوروؤں کی بنائی ہوئی رہائش گاہیں اور سرنگیں ہیں اور لاتعداد بندر موجود ہیں جو پکنک منانے والوں کا کھانا جھپٹ لیتے ہیں، ایک مسلمان کو بندر کو کنکر مارنے کی پاداش میں بے تحاشہ پٹتے دیکھا ہے اسی سے آپ بھارت میں مسلمانوں کی حالت زار کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔

عبدالکریم کا میرے کمرے میں صوفے پر بیٹھنے سے جھجکنا اس کی ذہنی حالت کی عکاسی کرتا تھا، ایک ''ہندو چائے کے بیوپاری'' کے ساتھ جبکہ وہ بیوپاری اس کے کرنل کا دوست بھی ہو ایک معمولی مسلمان سپاہی صوفے پر ایک ساتھ بیٹھنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں نے عبدالکریم کی جھجک دور کرنے کیلئے اس سے بے تکلفی کی باتیں شروع کیں۔ اس کیلئے ٹھنڈے مشروب منگوائے اور جب کچھ دیر میں عبدالکریم نے نارمل رویہ اختیار کیا تو میں نے اس سے پوچھا کہ کیا ضروری بات کرنی ہے۔ عبدالکریم نے اپنے حواس کو مجتمع کرتے ہوئے جو کچھ کہا اس کا لب لباب یہ تھا کہ ذلت سہتے سہتے وہ بے حال ہو چکا ہے اور اب اس میں اس صورتحال کو مزید برداشت کرنے کی سکت نہیں۔ وہ روتے روتے میرے پاؤں میں گر گیا۔ میں نے اسے فوری اٹھایا اور صوفے پر بٹھا دیا۔ ہندو افسر کی گالیوں اور رویئے سے یہ مسلمان سپاہی اتنا مایوس ہو چکا تھا کہ مجھے موم کرنے کیلئے ہندو رسم و رواج کے مطابق اس نے میرے پاؤں چھونے چاہے۔ ''میں تو گھٹ گھٹ کر مرنے لگا تھا۔ آپ کے رویئے نے ڈھارس بندھائی تو آپ سے بات کرنے کا حوصلہ ہوا۔ آپ کی کرنل صاحب سے گفتگو سے مجھے معلوم ہوا کہ آپ کا بمبئی میں چائے کا کاروبار ہے۔ خدارا مجھے یہاں سے بمبئی لے چلیئے۔ میں زندگی بھر آپ کی خدمت کرتا رہوں گا اور آپ کو مجھ سے کبھی شکایت کا موقع نہیں ملے گا''۔ عبدالکریم کو میں نے پھر دلاسہ دیا اور کہا کہ میں تمہاری ہر مدد کرنے کو تیار ہوں اور میں متعصب بھی نہیں ہوں۔ لیکن فوج سے بھاگ کر جانے کی وجہ سے تم DESERTER مفرور فوجی بن جاؤ گے۔ پولیس تمہیں تلاش کرے گی اور یا تو تم پکڑے جانے پر لمبے عرصے کے لئے جیل چلے جاؤ گے۔ ورنہ ساری زندگی مفروری کی حیثیت میں گزار دو گے اور پولیس تمہارے رشتے داروں کو وقت بے وقت تنگ کرتی رہے گی۔ یہ کہہ کر میں خاموش ہوا اور ذرا توقف کے بعد اسے کریدنے اور ٹٹولنے کیلئے کہا۔ ''تم نے تو اچھی طرح سے دیکھ لیا ہو گا کہ ہمارے ملک میں مسلمانوں کے ساتھ کیسا ذلت آمیز سلوک کیا جاتا ہے۔ میں بہت کھلے دل کا آدمی ہوں اور اپنے دھرم کی تنگ نظری سے نالاں ہوں۔ بمبئی میں میرے اکثر دوست مسلمان ہیں اور ان سے مذہبی گفتگو کے دوران اسلام کی وسعت نظری اور فراست کا قائل ہو چکا ہوں۔ ایک دو سماجی مجبوریاں ہیں۔ جن کی وجہ سے ابھی تک خاموش ہوں ورنہ میں کب کا اسلام قبول کر چکا ہوتا''۔ میری بات سن کر عبدالکریم کی باچھیں کھل گئیں اور وہ مجھے اسلام کی خوبیاں بتانے لگا۔ میں نے اسے ٹوک دیا اور کہا کہ میں نے اسلام کا بہت گہرائی تک مطالعہ کیا ہے لہٰذا تم اس موضوع کو چھوڑو اور اپنی بات کرو۔ تم ایک اچھے اور شریف خاندان کے فرد ہو اور حالات کا شکار ہو۔ میں تمہاری بھرپور مدد کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن اس کے لئے تمہیں مجھ سے اپنی وفاداری کا ثبوت دینا ہو گا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ انگریزی تو نہیں لیکن ہندی اور اردو لکھ سکتا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو وہ سب کچھ لکھ سکے جو اس کے ذہن میں ہو۔ تم یوں کرو کہ اپنے خیالات، جذبات اور کام کے متعلق جو کچھ بھی تمہارے علم میں ہے وہ لکھ دو۔ میں تین چار روز بعد تمہارے کرنل کے پاس جاؤں گا اور وہیں پر موقع دیکھ کر اپنی تحریر مجھے دے دینا اور خیال رکھنا کہ تمہارے کرنل یا کسی کو بھی اس کا علم نہ ہونے پائے۔ تمہاری تحریر سے میں اندازہ لگاؤں گا کہ تم میرے کتنے کام کے آدمی ہو۔ اس کے بعد ہی میں تمہارے متعلق فیصلہ کروں گا۔ اگر تم میرے امتحان میں پورے اترے تو تمہاری سوچ سے بھی بڑھ کر میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ غرضیکہ اسی طرح کی امید و بیم کی باتوں کے بعد میں نے عبدالکریم کو پانچ سو روپے دے کر رخصت کیا۔ ایک بجنے کے قریب تھا اور مجھے چائنیز ریسٹورنٹ میں آشا سے ملنا تھا۔

جب میں ریسٹورنٹ میں پہنچا تو آشا میری منتظر تھی۔ رسمی کلمات کے بعد آشا نے میری بے اعتنائی کے شکوے شروع کر دیئے۔ کہنے لگی۔ ''آپ ملے تو میں سمجھی کہ میری منزل مجھے مل گئی۔ شاید یہ میری بھول تھی۔ بھلا بمبئی کی رنگین زندگی سے مانوس شخص کی نظروں میں میری کیا وقعت۔ یونہی میں نے آپ سے اپنی امیدیں وابستہ کر لی تھیں''۔ آشا کافی دیر بولتی رہی اور میں سوچتا رہا کہ وہ ''میری بہتری'' والی بات کیوں نہیں کہتی جس کے متعلق اس نے گزشتہ شام مجھے ٹیلی فون پر بتایا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ جب تک آشا کو پرامید باتوں سے رام نہ کر لوں وہ مجھے کچھ نہ بتائے گی۔ میں نے آشا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور محبت بھرے لہجے میں بولا۔ دیکھو آشا ہر انسان میں کچھ خوبیاں اور خامیاں ہوتی ہیں اور میری خامیوں میں سے ایک بڑی خامی یہ ہے کہ میں اظہار محبت میں الفاظ کا سہارا لینے میں ہمیشہ ناکام ہوتا ہوں۔ میں نے تمہیں شاید پہلے بھی بتایا تھا کہ میں جس لڑکی سے محبت کرتا تھا اس سے بھرپور اظہار محبت نہ کر سکا جس کے نتیجے میں وہ کسی اور کی جیون ساتھی بن گئی۔ اس لڑکی کے بعد جیون میں ایک بہت بڑا خلا رہا۔ جب تم ملیں تو میں سمجھا کہ میرے جیون میں بھی شاید بہار آ جائے۔ لیکن تم شادی شدہ ہو تم کیونکر میری جیون ساتھی بن سکتی ہو۔ میں فطرتاً بہت (POSSESSIVE) ہوں۔ اگر تم میری بیوی ہوتیں تو میں تمہارے بغیر کسی کلب یا پارٹی میں نہ جاتا اور تمہارے سوا کسی کے ساتھ نہ ناچتا اور نہ ہی تمہیں ناچنے دیتا''۔ میں نے اسے کہا کہ بچپن میں، میں نے فارسی کے کچھ اشعار پڑھے تھے۔ میں تمہیں وہ شعر اور ان کا مطلب سناتا ہوں۔ ''من تو شدم، تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی، تا کس نہ گوید بعد ازیں، من دیگرم تو دیگری''۔ (ترجمہ) میں تم بن جاؤں اور تم میں بن جاؤ۔ میں جسم بن جاؤں اور تم جان بن جاؤ۔ تا کہ بعد میں کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ میں الگ ہوں اور تم الگ ہو۔

غازی

یہ ایک نا قابلِ تردید حقیقت ہے کہ عورت کی سب سے بڑی کمزوری اس کا کسی مرد کی زبان سے اپنے لئے اظہار محبت اور اس کے حسن کی تعریف سننا ہے۔میں شعروں کا مطلب سناتا گیا اور آشا کے ہاتھ کی میرے ہاتھ پر گرفت مضبوط ہونے لگی۔ میں نے کہا ’’دیکھو آشا میرے جذبات اور خیالات کی راہ میں تمہاری زندگی کے لمحات کس بری طرح سے حائل ہیں۔تم آج ایک مرد کی بغل میں ہوتی ہو تو کل دوسرے کی بانہوں میں۔کبھی شوہر کے ساتھ اور کبھی دوستوں کے ہمراہ۔ان حالات میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ میں تمہیں اپنی منزل سمجھوں اور تم مجھے‘‘۔آشا کی آنکھیں اپنی حقیقت کی تلخی برداشت نہ کر سکیں اور چھلکنے لگیں۔میں نے اپنے رومال سے اس کے آنسو صاف کئے۔وہ ذرا سنبھلی تو کہنے لگی۔’’ونود جی،برسوں سے میرا ضمیر جس بات پر مجھے قائل نہ کر سکا۔آپ نے چند منٹ میں وہ بات مجھے سمجھا دی۔یقین جانئے میں دل سے آپ کی پوجا کرتی ہوں۔پہلی ملاقات کے وقت سے ہی میں آپ کو دل کی گہرائیوں سے چاہنے لگی ہوں۔آپ کو پانے کیلئے میں نے کتنے جتن کئے۔ہوٹل میں آپ کے کمرے میں آئی۔بریگیڈیئر کے بیٹے سے آپ کو محض اس لئے ملوایا کہ آپ میں جذبہ رقابت پیدا ہو۔لیکن یہ میری بھول تھی اور آپ مجھ سے دور ہوتے چلے گئے۔اب میں آپ کو اور ’’سچائی‘‘ کو سمجھ چکی ہوں۔اگر آپ میرے ماضی کو فراموش کر دیں تو میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ آج سے بلکہ ابھی سے ہی آپ ایک نئی اور بدلی ہوئی آشا کو دیکھیں گے‘‘۔میں نے کہا ’’آشا یہ سب کہنا آسان ہے اور کرنا مشکل اور پھر تم شادی شدہ ہو۔کیا تمہیں جے چند اتنی آسانی سے چھوڑ دے گا؟‘‘ آشا کہنے لگی ’’یہی تو بتانے کے لئے میں نے آپ کو یہاں بلایا تھا۔جے چند نے Mess کے بریگیڈیئر سے جس کے لڑکے سے میں نے آپ کو ملوایا تھا۔ایک بہت بڑا ٹھیکہ انتہائی کم ریٹ پر حاصل کیا ہے اور بریگیڈیئر کو 25 لاکھ روپے رشوت دی ہے اور اس ٹھیکے کے حصول میں ایک منسٹر بھی شامل ہے جس کا ٹھیکے سے حاصل ہونے والے منافع میں آدھا حصہ ہے‘‘۔میرے پوچھنے پر آشا نے بتایا کہ ’’اس کے پاس ایک چھوٹا ٹیپ ریکارڈر ہے۔جس پر اس نے جے چند،بریگیڈیئر اور منسٹر کی ساری گفتگو ریکارڈ کر لی ہے کیونکہ کنٹریکٹ کے سلسلے میں بریگیڈیئر،منسٹر اور جے چند کی ملاقاتیں جے چند کے عالی شان بنگلے میں ہوتی تھیں‘‘۔میں نے کہا ’’آشا تم نے کل مجھے میری بہتری کا کہا تھا۔بھلا اس ٹھیکے کے اندرونی حالات جاننے سے میری کیا بہتری ہوگی‘‘۔آشا نے بڑے معصومانہ انداز میں کہا۔’’کیا میں آپ کی بہتری نہیں؟‘‘ اور میں کوئی جواب نہ دے سکا۔آشا نے کہا کہ ’’اس ریکارڈ گفتگو کی وجہ سے جے چند نہ صرف مجھے آزاد کر دے گا بلکہ میری زبان بند رکھنے کے عوض بھاری رقم بھی دے گا۔اور پھر آپ کے ساتھ میں آپ کی مرضی کے مطابق زندگی گزاروں گی‘‘۔مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آشا کو کیا جواب دوں۔میں نے یونہی کہہ دیا ’’آشا اگر تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہے تو وہ کیسٹ مجھے سنوا سکتی ہو۔آشا نے فوراً ہی اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے ایک درمیانے سائز کا ٹیپ ریکارڈر نکال کر مجھے دیا اور کہا۔یہ ٹیپ ریکارڈر بھی آپ کا اور کیسٹ بھی آپ کی۔اب تو میں آپ کی اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گی‘‘۔ادھر میری حیرانی اور پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔نامعلوم انداز میں آشا نے مجھ سے اپنی ساری امیدیں وابستہ کر لی تھیں اور اسے میری حقیقت کا ذرا بھر علم نہ تھا۔میں نے آشا کو کہا کہ وہ مجھ سے CONTACT کرنے میں احتیاط برتے۔اور اگر کبھی اتفاقاً اس کا اپنے شوہر کے ہمراہ میرا آمنا سامنا ہو جائے تو مجھے نظر انداز کرے۔جواباً آشا نے کہا کہ اب وہ اپنے شوہر یا کسی دوسرے کے ہمراہ کبھی باہر نہ جائے گی۔لیکن مجھے ہر روز فون کرے گی اور یہ کہ میں ہر دوسرے تیسرے دن اسے ضرور ملوں گا۔کھانا تو ہم کبھی کا کھا چکے تھے۔ریسٹورنٹ سے پہلے آشا باہر نکلی اور اپنی گاڑی میں چلی گئی۔چند منٹ بعد میں باہر نکلا اور ٹیکسی لے کر اپنے ساتھیوں کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔میں ہوٹل سے پوری تیاری سے نکلا تھا۔پسٹل اور روپے میرے ساتھ تھے۔ساتھی میرے انتظار میں تھے۔تھوڑی دیر بعد ہم دو ٹیکسیوں میں سرائے بیرم خان کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہم لیفٹیننٹ سے مقررہ وقت سے پہلے ہی وہاں پہنچ گئے تھے۔بجائے چھپر ہوٹل میں انتظار کرنے کے میں نے سوچا کہ اس علاقے میں گھوما جائے۔ہم دو دو کی ٹولیوں میں آگے پیچھے چل پڑے۔یہ مسلمانوں کی آبادی کا علاقہ تھا۔چھوٹے چھوٹے ایک منزلہ گھر اور چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں۔ایک دکان پر ہم نے ٹھنڈے دودھ کی بھری بوتلیں پیں اور پھر واپس لوٹ پڑے۔پہلے کی طرح میں نے چھپر ہوٹل میں اپنا مورچہ سنبھالا اور میرے ساتھی بھی ادھر ادھر مختلف جگہوں پر ڈٹ گئے اور لیفٹیننٹ کا انتظار ہونے لگا۔اس انتظار کے دوران پولیس کی ایک گاڑی چھپر ہوٹل کے سامنے آ کر رکی اور پولیس اہلکاروں نے چائے پی۔دہلی پولیس کے ماتحت عملے کے لوگ کمزور اور غربت کے مارے ہوئے نظر آتے تھے۔جو اس معمولی ہوٹل میں چائے پینے چلے آئے تھے۔ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد لیفٹیننٹ آتا دکھائی دیا۔وہ آج نسبتاً بہتر حالت میں تھا۔اس کے ریسٹورنٹ میں پہنچنے کے تقریباً 10 منٹ بعد میں بھی ریسٹورنٹ میں داخل ہو گیا۔لیفٹیننٹ کونے کی ٹیبل پر بیٹھا تھا۔اس نے چائے کا آرڈر دے رکھا تھا۔چائے پیتے پیتے اس نے ایک پیکٹ مجھے تھما دیا۔یہ پیکٹ اس نے کپڑوں سے نکالا تھا۔میں نے بھی وہ پیکٹ اپنی قمیض کے اندر ڈال دیا اور پینٹ کی جیب سے روپوں کا لفافہ نکال کر اسے دیا۔اس نے دھیرے سے پوچھا کتنے ہیں۔میں نے کہا 5 ہزار۔لیفٹیننٹ کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔اس نے لفافہ جیب میں ڈال لیا۔میں نے کہا آج تو شمی کے ہاں جاؤ گے۔وہ جھینپ سا گیا اور دھیمے سے کہا۔ہاں۔میں نے کہا۔پیکٹ کی واپسی پہلے کی طرح ہو گی۔کہنے لگا۔میں وہاں 12 بجے تک رہوں گا۔واپسی پر گھر کے پاس اگر واپس مل جائیں تو بہت بہتر ہو گا۔کیونکہ میرے گھر والے پہلے ہی میرے دیر سے گھر آنے سے نالاں ہیں۔اور میرے آنے کے بعد اگر کوئی مجھے ملنے آئے تو بہت برا مانتے ہیں۔رازداری کے لہجے میں کہنے لگا۔اولاد جوان ہو جائے تو بوڑھے والدین کو یکسر نظر انداز کر دیتی ہے اور ان کے اسی رویے نے مجھے شمی کے ہاں جانے پر مجبور کر دیا۔آخر میں بھی تو انسان ہوں۔سارا دن دفتر میں کام کرتے کرتے تھک جاتا ہوں۔گھر آتا ہوں تو بچے بات نہیں کرتے۔دفتر میں دفتر کا کام اور گھر میں کوئی بات تک نہ کرے۔ایسا آخر کب تک چل سکتا تھا۔میں نے اٹھتے ہوئے لیفٹیننٹ کو تھپکی دی اور کہا کہ یہ بالا خانے آباد کرنے میں گھر کے افراد کا بڑا دخل ہے۔ورنہ کوئی شخص اپنا روپیہ اور وقت ان گھنگھروؤں کی آواز میں صرف نہ کرتا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان بالا خانے والیوں کی مسکراہٹ،ہنسی اور ادائیں سب مصنوعی ہوتی ہیں اور یہ صرف روپیہ بٹورنے کے ڈھنگ ہیں۔کوئی شخص بھی یوں بیوقوف نہ بنتا۔لیفٹیننٹ کے اٹھنے سے پہلے ہی میں باہر نکل آیا۔میرے ساتھیوں کو علم تھا کہ یہ میٹنگ مختصر ہو گی۔انہوں نے دو ٹیکسیاں پہلے ہی روک رکھی تھیں۔ہم ان میں سوار ہو کر ساتھیوں کے گھر کے قریب اتر گئے۔

اس بار لیفٹیننٹ کے پیکٹ میں پہلے کی طرح CONFI- DENTIAL اور TOP PRIORTY کی مہروں والے خطوط تھے۔ہم نے خطوط کی کاپیاں بنانی شروع کر دیں۔یہ کل پچاس کے قریب خط تھے۔میرے ساتھی کاپیاں بناتے رہے اور میں پلنگ پر دراز ہو گیا۔آج میں کافی تھک چکا تھا اور رات کو پیکٹ واپس کرنے بھی مجھے ہی جانا تھا۔یہ جمعہ کی رات تھی اور لیفٹیننٹ سے میں نے ہفتے کے روز 3 بجے بعد دوپہر گولچہ سینما کے ریسٹورنٹ میں ملنے کو کہا تھا۔جہاں اس سے نیا پیکٹ وصول کرنے کے علاوہ میں اس سے مفصل بات چیت کرنا چاہتا تھا اور آئندہ پیر کو مجھے پاکستانی CONTACT سے ملنا تھا۔

رات کو ساڑھے گیارہ بجے میں کاغذات کا پیکٹ لیکر لیفٹیننٹ کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔حسب معمول میرا ایک ساتھی میری حفاظت کیلئے میرے ہمراہ تھا۔پرانی دہلی کا یہ علاقہ ہندوؤں کی آبادی کا تھا اور رات کو جلد ہی بے رونق ہو جاتا تھا۔میں نے یہ بات اچھی طرح محسوس کی تھی کہ بھارتی ہندوؤں کی اکثریت سقوط ڈھاکہ اور اپنی کامیابی پر بجائے خوش ہونے کے پژمردہ تھی۔شیر کو انہوں نے زخمی تو کر دیا تھا لیکن اب اس بات پر خوف زدہ تھے کہ نجانے زخمی شیر کب اچانک بدلہ لینے کیلئے حملہ کر دے۔بھارتی فوج کے محکمہ جاسوسی کو بھی اس وقت تک یقیناً علم ہو چکا تھا کہ پاکستان نے اپنے جنگی قیدیوں کی کمی پوری کرنے کے لئے چار نئے ڈویژن بھی قائم کرائے تھے جو جدید ترین اسلحہ سے لیس تھے۔پھر پاکستان کی افواج کو سابقہ مشرقی پاکستان کا بھی اب دفاع نہیں کرنا تھا اور ان کی تمام تر طاقت مغربی پاکستان کے دفاع پر مرکوز تھی۔دہلی میں اس طرح کی کئی افواہیں گردش کر رہی تھیں کہ پاکستان پوری طاقت سے دہلی پر حملہ آور ہو گا۔پاکستان کی چھاتہ بردار فوج دہلی میں اتاری جائے گی اور علیحدگی پسند سکھ پاکستان کیلئے ففتھ کالمسٹ کا کام کریں گے۔دہلی میں ہر اتوار کو ہوائی حملے سے بچاؤ کے سائرن ٹیسٹ کئے جاتے تھے۔بھارتی ہندوؤں کا یہی خوف دور کرنے کیلئے بھارتی حکومت نے غالباً 74ء میں پاکستانی سرحد کے قریب ایٹمی دھماکہ کیا تھا۔حالانکہ وہ کئی سال پہلے ایٹمی طاقت بن چکا تھا اور اپنی اس کامیابی کو پوشیدہ رکھے ہوئے تھا۔بھارتی دھماکہ کے فوری بعد پاکستان نے بھی اپنی ایٹمی ریسرچ میں تیزی پیدا کر دی اور بھارتی اندیشوں کے عین مطابق تیل کی دولت سے مالا مال مسلم ممالک نے پاکستان کی اس معاملے میں بھرپور مدد کی،جن میں نمایاں لیبیا تھا۔کرنل قذافی کے احکام پر یورینیم 238 کے خام مواد سے بھرے ہوئے 20 ٹرک جنوبی افریقہ میں سفر کے دوران غائب کر دیئے گئے۔جن پر لدا خام یورینیم پاکستان پہنچا دیا گیا۔یہ خبر عالمی ذرائع ابلاغ نے بڑے زور شور سے جاری کی اور اسی کی بنیاد پر ’’اسلامی بم‘‘ کا شوشہ چھوڑا گیا۔جس کی پاکستان نے کبھی قطعی؟ تردید نہیں کی۔یہی خوف تھا جو بھارتی ہندوؤں میں سما چکا تھا۔پاکستانی چھاتہ برداروں کے خوف سے مڈل کلاس ہندو سر شام ہی اپنے گھروں میں دبک جاتے تھے۔

ہم جب لیفٹیننٹ کے گھر والی سڑک پر پہنچے تو اکا دکا ٹیکسی اور رکشا نظر آتے تھے۔دکانیں سب بند تھیں۔ہم نے اس بار ٹیکسی نہیں چھوڑی اور ٹیکسی میں ہی بیٹھے رہے۔تھوڑی ہی دیر بعد لیفٹیننٹ کی گلی کے سامنے ایک رکشا رکا اور اس میں سے جھومتا جھامتا لیفٹیننٹ برآمد ہوا۔میں پیکٹ لئے تیزی سے اس کے پیچھے گیا۔شراب اور شمی کے رقص نے اس کا نشہ دوبالا کر دیا تھا۔وہ جھومتا اور گنگناتا ہوا اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا میں اس کی مصنوعی خوشی اس سے چھیننا نہیں چاہتا تھا لہٰذا اسے پیکٹ تھما کر اور اگلے دن گولچہ سینما میں ملنے کی یاددہانی کروا کر واپس پلٹ آیا۔اپنے ساتھی کو اس کے گھر کے پاس اتارا اور کناٹ پیلس پر ٹیکسی بدل کر اپنے ہوٹل آ گیا۔

اگلے روز صبح میں نے آشا کی دی ہوئی کیسٹ کئی بار سنی۔اس میں تین افراد کی آواز گلاسوں کی کھنک اور کبھی کبھی آشا کی آواز ابھری ہوئی تھی۔ٹھیکے سے متعلقہ امور پر گفتگو اور بجٹ کے متعلق اندازے بیان کئے گئے تھے صرف ایک بات ایسی تھی جس سے آشا کی سچائی کا ثبوت ملتا تھا۔غالباً بریگیڈیئر نے کہا تھا۔’’سر ٹھیکہ تو میں دے دیتا ہوں لیکن دوسرے ٹھیکیداروں نے شور مچایا اور بات انکوائری تک پہنچ گئی تو پھر کیا ہو گا‘‘۔اس کی بات کو دوسری آواز نے کاٹ دیا۔’’بریگیڈیئر اس کی تم چنتا نہ کرو۔یہ میری ذمہ داری ہے اور جے چند تمہارا حصہ تمہیں ٹھیکہ ملتے ہی ادا کر دے گا۔میری تو جے چند کے ساتھ حصہ داری ہے اور جب تک ٹھیکے کا تمام کام مکمل نہیں ہو جاتا،مجھے منافع کا حصہ نہیں ملے گا۔یہ غالباً منسٹر صاحب،بریگیڈیئر کو تسلی دے رہے تھے۔ہمارے لئے یہ کیسٹ کارآمد ثابت ہو سکتی تھی لیکن اس کیلئے آشا کا تعاون ضروری تھا۔اگر وہ ہمیں ٹھیکے کی تمام تفصیلات مہیا کر دے تو پھر جے چند کے علاوہ،بریگیڈیئر اور منسٹر کو بھی ہم قابو کر سکتے تھے۔میں نے سوچا کہ اس معاملے پر آشا سے آئندہ پیر یا منگل کو فون پر بات کروں گا۔پیر کے دن مجھے پاکستانی CONTACT سے بھی ملنا تھا۔اس کے بعد ہی آشا کو فون کر سکتا تھا مجھے ٹھیکے کے معاملے میں جلدی نہیں تھی کیونکہ یہ ابھی ابتدائی مراحل میں تھا۔

ٹھیک دو بجے میں گولچہ سینما چلا گیا اس سینما میں مشہور بھارتی فلم بوبی نئی نئی ریلیز ہوئی تھی اور سینما شائقین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔گولچہ سینما کی بلڈنگ میں ایک نہایت ہی اعلیٰ درجے کا ریسٹورنٹ بنا ہوا ہے۔مجھے لیفٹیننٹ سے وہیں پر ملنا تھا میں ریسٹورنٹ میں داخل ہوا تو لیفٹیننٹ پہلے ہی ایک ٹیبل پر قبضہ جمائے دکھائی دیا۔کئی قسم کے کھانے اس کے سامنے پڑے تھے۔آج وہ بہت نکھرا ہوا تھا۔رسمی علیک سلیک کے بعد وہ کہنے لگا۔’’گھر والے تو اکثر دال اور سبزی ہی پکاتے ہیں۔کبھی کبھار کسی ریسٹورنٹ میں جا کر من پسند کھانا کھاتا ہوں یا پھر شمی کے ہاں اچھا کھانا ملتا ہے‘‘۔میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا شمی کے ہاں کا کھانا تو یقیناً تمہیں بھاتا ہو گا کیونکہ شمی کا ساتھ اسے مزید لذیذ بنا دیتا ہو گا۔لیفٹیننٹ کچھ جھینپ گیا۔اب چونکہ ہم دونوں دوست بن چکے تھے اسلئے وہ بے تکلفی سے کہنے لگا۔’’شمی رات بھی آپ کا پوچھ رہی تھی۔کبھی ادھر کا بھی چکر لگا لیں‘‘ میں نے کہا ’’لیفٹیننٹ صاحب کیوں اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کا کہہ رہے ہیں اس بالا خانے پر صرف شمی ہی نمایاں ہے اگر میں وہاں جانے لگا تو پھر آپ کی دال نہیں گلے گی۔اس کا حسن اور ادائیں تماش بینوں سے صرف روپیہ اینٹھنے کے لئے ہیں جس طرح پیسے کے زور پر پہلے دن میں نے تمام تماش بینوں کو کھسکنے پر مجبور کر دیا تھا اب میرے وہاں جانے سے آپ کو بھی کھسکنا پڑے گا۔اس لئے آپ اکیلے ہی وہاں جا کر اپنی تنہائی دور کرتے رہیں اور اس میں مناسب حد تک میرا امالی تعاون جاری رہے گا۔آپ میری ضرورت پوری کریں میں آپ کی ضرورت پوری کروں گا اور دوسری بات یہ ہے کہ طوائف کے کوٹھے سے اربوں روپے لٹانے والے بھی پیسہ ختم ہونے پر ذلیل و رسوا کر کے نکال دیئے جاتے ہیں۔اس لئے اپنا پیسہ ہوش و حواس میں رہ کر اور ہاتھ کھینچ کر خرچ کریں۔خرچ کم کریں لیکن ظاہر یہ کریں کہ آپ کے پاس بہت دولت ہے۔اس طرح طوائفیں بھوکی بلی کی طرح آپ کے گرد چکر کاٹتی رہیں گی‘‘۔لیفٹیننٹ خاموشی سے میری بات سن رہا تھا لیکن اس کے چہرے سے صاف عیاں تھا کہ بڑھاپے کے اس عشق سے بچنا اس کے بس میں نہیں رہا۔اور میں چاہتا بھی یہی تھا کہ شمی کی وجہ سے لیفٹیننٹ ہماری ہر ضرورت پوری کرنے پر مجبور رہے۔میں نے موقع غنیمت جان کر کہا۔’’ویسے لیفٹیننٹ صاحب آپ کی پسند بھی لاکھوں میں ایک اور لاجواب ہے۔شمی پر تو دل و جاں ہی نہیں،دونوں جہاں بھی نچھاور کرنے پڑیں تو سودا مہنگا نہیں‘‘ لیفٹیننٹ کھل اٹھا اور کہنے لگا ’’ونود بھائی اب تو یہ بھگوان کے اور آپ کے ہاتھ میں ہے کہ میں شمی کو حاصل کر سکوں۔کل کی ڈاک آپ کو کیسی لگی؟‘‘ میں نے جواب دیا ’’کوئی خاص نہیں۔معمول کی ڈاک سے ایک درجہ اوپر تھی‘‘۔حالانکہ یہ بہت ہی اہم ڈاک تھی آرمی ہیڈ کوارٹرز کے ایک خط کے ذریعے بھارت کے نمبر 7 اور نمبر 10 ڈویژن کمانڈروں کو مطلع کیا گیا تھا کہ سکھ لائٹ انفنٹری کی تمام رجمنٹوں کو جن کی نفری 35 ہزار سے زیادہ تھی،ایک ماہ کے اندر ان ڈویژنوں سے ہٹا کر تری پورہ میں مقیم جاٹ رجمنٹوں (نفری تقریباً 30 ہزار) کی جگہ تعینات کیا جائے۔بھارت کے نمبر 7 اور نمبر 10 ڈویژن پاکستانی سرحد کے قریب تعینات تھے۔لیفٹیننٹ کہنے لگا ’’اب جبکہ میں نے آپ کے لئے اتنا بڑا رسک لیا ہے تو میں انتہا تک جانے کو تیار ہوں۔بس آپ حکم کرتے جائیں میں تعمیل میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا‘‘۔

غازی

مجھے اچانک خیال آیا اور میں نے یشونت سے کہا تاراپور کے ایٹمی بجلی گھر سے RADIATION سے محفوظ ٹرک ٹاٹا ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو باقاعدگی سے جاتے ہیں اور ان کی سیکورٹی فوج کے کمانڈوز کے سپرد ہے۔ تاراپور کا ایٹمی پلانٹ بھی ان کی نگرانی میں ہے اسی باعث ایٹمی پلانٹ اور ٹاٹا ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے متعلق ہیڈ کوارٹرز میں یقیناً کچھ فائلیں ہوں گی۔ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی کارکردگی سے بھی ہیڈ کوارٹرز کو مطلع کیا جاتا ہوگا۔ ایسی تمام فائلیں مجھے درکار ہیں" یشونت ایسے خاموش ہو گیا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ میں نے بے رغبتی برتتے ہوئے کہا کہ میں نے تو یونہی آپ سے یہ بات کردی ورنہ ایٹمی بجلی گھر اور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ دونوں میں ہمارا رابطہ ہے اور ہمیں مفصل معلومات مل رہی ہیں۔ میں نے تو محض ان معلومات کو Tally کرنے کیلئے آپ سے پوچھا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کام کے عوض آپ کو خاصی بڑی رقم مل سکتی تھی"۔ میں خاموش ہو گیا تو یشونت بولا۔ "ایسی دو فائلیں ہیں جو جنرل صاحب اپنے کمرے کی سیف میں رکھتے ہیں چونکہ میں COPYING BRANCH میں سب سے سینئر اور سپرنٹنڈنٹ ہوں۔ اس لئے ان فائلوں سے متعلقہ ڈاک ٹائپ کروانے کے لئے اور آئی ہوئی ڈاک فائل کروانے کیلئے جنرل صاحب مجھے بلاتے ہیں۔ جنرل صاحب کے کمرے میں پڑے ٹائپ رائٹر پر میں ٹائپ کرتا ہوں۔ اور کاپیاں فائل میں لگا دیتا ہوں۔ یہ دونوں فائلیں الگ الگ نہیں ہیں بلکہ ایک فائل مکمل ہونے کے بعد دوسری فائل زیر استعمال ہے۔ جنرل صاحب کے حکم کے مطابق ہر آنے والی ڈاک کے جواب کی کاپی اسی کے ساتھ اسٹیپل کر دی جاتی ہے۔ جنرل صاحب کا ٹائپ رائٹر بجلی سے چلتا ہے اور ان کے کمرے میں فوٹو اسٹیٹ مشین بھی ہے لہٰذا کاربن کاپی نہیں بنائی جاتی"۔ میں نے کہا "کوئی بات نہیں۔ آپ کی ان فائلوں تک محض رسائی ہمارا مقصد نہیں ہے۔ لہٰذا اس بات کو بھول جائیں۔ اب یہ بتائیں کہ جنرل صاحب اور بریگیڈیئر اور دوسرے سینئر افسران کے دفتروں کی صفائی کون کون سے سوئیپر کرتے ہیں۔ ہمیں ان کی ردی کی ٹوکریوں میں پھینکے ہوئے کاغذ اور ان کے ٹکڑے چاہئیں"۔ یشونت فوری بولا۔ "آپ کا یہ کام میں کروا دوں گا اور ایسے تمام کاغذات میں آپ کو مہیا کروں گا"۔ میں نے اسے ٹوکا اور کہا "نہیں یشونت بابو دفتر میں جو کام ایک روٹین میں چل رہا ہے اس میں آپ کی مداخلت شک پیدا کر سکتی ہے۔ آپ صرف ان سوئیپرز کے نام مجھے دے دیں۔ یہ سوئیپرز کا کام ہے اور انہی سے ہم یہ کام لیں گے۔ دوسرے اس کام کا معاوضہ نہایت قلیل ہوگا جو آپ کے شایان شان نہیں۔ بڑا کام اور بڑا معاوضہ جنرل کی سیف میں بڑی فائلوں کا حصول تھا جو آپ کے لئے ممکن نہیں"۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد میں نے یشونت سے اگلی ڈاک کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا کہ آئندہ وہ ڈاک ہفتے میں دو دن منگل اور ہفتے کے روز دیا کرے گا۔ ڈلیوری کے لئے دونوں دن دفتر سے واپسی پر اس کی گلی کے باہر سڑک پر دودھ دہی کی دکان پر ایک جیسے تھیلوں کی تبدیلی کے ذریعے اور ڈاک کی واپسی کے لئے منگل کو رات 12 بجے جب وہ چہل قدمی کے لئے گلی کے باہر تک آجایا کرے گا اور ہفتے کوٹھی کے بالا خانے سے واپسی پر ساڑھے گیارہ بجے سے بارہ بجے کے دوران سڑک پر۔ میں نے کہا کہ اول تو میں خود آیا کروں گا ورنہ میرا ایک ساتھی جس کی بڑی بڑی مونچھیں ہوں گی اور نظر کی عینک لگائی ہوئی ہوگی۔ تمہارے قریب آکر تم سے سگریٹ جلانے کیلئے ماچس مانگے گا اور اس کا کوڈ ورڈ ڈان ہوگا۔ ڈان سنتے ہی تم اس سے تھیلے تبدیل کر لینا اس دوران یشونت نے ڈاک کا پیکٹ ٹیبل کے نیچے سے ہی مجھے تھما دیا جسے میں نے اپنے لباس میں چھپا لیا۔ یہ سب سمجھا کر جب میں کرسی سے اٹھنے لگا تو یشونت نے رکتے رکتے پوچھا کہ جنرل کے دفتر کی فائلوں کا کتنا معاوضہ مل سکتا ہے۔ میں نے کہا یشونت بابو جو کام آپ نہیں کر سکتے اس کے متعلق پوچھنے کا کیا فائدہ ہے آپ دوست ہیں لہٰذا آپ کو بتاتا ہوں کم از کم پچاس ہزار روپیہ۔

پچاس ہزار کا سنتے ہی یشونت کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ 70ء کی دہائی میں پچاس ہزار روپے بہت بڑی رقم تصور ہوتی تھی۔ آج کل کے نوجوان اس دور کے پچاس ہزار کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ پاکستان میں اس دور میں بکرے کا صاف ستھرا گوشت چار روپے کلو دستیاب تھا اور سب چیزوں کی قیمت اسی نسبت سے آج کل کے مقابلے میں بہت کم تھی اور بھارت میں اندرون ملک بننے اور پیدا ہونے والی اشیا کی قیمتیں پاکستان سے بھی نسبتاً کم تھیں۔ یشونت کو وہیں چھوڑ کر میں ریسٹورنٹ سے باہر آگیا۔

میرے ساتھیوں نے بازاروں میں گھومتے ہوئے ایک دکان سے اسکول ڈراموں میں گیٹ اپ کے لئے بنی مصنوعی مونچھیں اور سکھوں کی رول کی ہوئی داڑھیاں خرید لی تھیں۔ انہوں نے تو یہ محض تفریحاً خریدی تھیں لیکن میں نے ان سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ بال تو ان کے پہلے ہی خاصے بڑھے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں سکھ طرز کی بندھی بندھائی پگڑیاں بھی خریدنے کا کہا تھا۔ اور اب میرے چاروں ساتھیوں کے پاس سکھ گیٹ اپ کا مکمل سامان تھا۔ یشونت کے ساتھ رابطے کا میں نے "مضبوط پل" بنا دیا تھا۔ اب ڈاک لینے اور واپس لوٹانے کا روٹین کا کام میں انہیں سونپنا چاہتا تھا۔ کیونکہ غیر ارادی طور پر میں کئی جگہ بیک وقت INVOLVE ہو چکا تھا۔ اور میرے پاس وقت کی کمی تھی۔ سینما سے نکل کر میں ایک چشموں کی دکان پر گیا اور سادہ سفید شیشوں والی چار عینکیں خرید لیں۔

یشونت کی حالت دیکھ کر مجھے یکایک ایک منصوبہ سوجھا تھا لہٰذا میں سیدھا چاوڑی بازار، شمی کے بالا خانے پہ چلا گیا۔ صبح بنارس اور شام اودھ کے حسن کی طرح طوائفوں کے بالا خانے بھی شام ڈھلنے کے بعد رنگین اور پرکشش ہوتے ہیں۔ ابھی شام کے 4 بھی نہیں بجے تھے۔ میں نے اپنی آمد کی اطلاع دی تو ایک ادھ سویا میراثی مجھے اندر لے گیا۔ رات کا سجا ہوا ہال کمرہ سگریٹ کے ٹکڑوں، اوندھے پڑے اگالدانوں، بکھرے سازوں اور میلی چاندنیوں سے اٹا پڑا تھا۔ میں نے میراثی سے کہا کہ مجھے ڈیرہ دارنی سے ملنا ہے۔ تھوڑی دیر بعد مجھے اندر کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں شمی دو تین اور لڑکیوں کے ساتھ اوندھی ترچھی پڑی سو رہی تھی اور ایک پلنگ پر نیم دراز ڈیرہ دارنی سگریٹ پی رہی تھی۔ اس کی نظریں سوالیہ انداز میں بے وقت آنے کا سبب پوچھ رہی تھیں۔ میں نے اسے کہا کہ میں شمی کے متعلق کچھ بات کرنے آیا ہوں لیکن اس کی سوالیہ نگاہ ہی ختم نہ ہوئی۔ میں نے ایک ہزار روپے اسے دیئے اور کہا کہ میری بات غور سے سنے اور صحیح جواب دے۔ ہزار روپے نے میری بے وقت آمد کا احساس اس کے چہرے سے غائب کر دیا اور وہ میراثی کو گالی دے کر پکارنے لگی کہ ابھی تک میرے لئے ٹھنڈا نہیں لایا۔ اتنی دیر میں شمی اور دوسری لڑکیاں بھی اٹھ بیٹھی تھیں۔ ڈیرہ دارنی نے انہیں اشارہ کیا اور وہ دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ ساری لڑکیوں میں صرف شمی نے چھوٹی سی نتھنی پہن رکھی تھی۔

میں نے ڈیرہ دارنی سے پوچھا کہ شمی کی بات کہیں طے ہوئی ہے تو ڈیرہ دارنی نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے پوچھا نذرانہ کیا ہوگا۔ تو ڈیرہ دارنی نے مجھے خریدار سمجھتے ہوئے کہا۔ "بیس ہزار سے ایک پائی کم نہیں" میں نے پھر پوچھا، یشونت بابو سے بھی اس مسئلے پر کبھی بات ہوئی ہے تو وہ کہنے لگی۔ وہ بڈھا تو میری بچی کا دیوانہ ہو رہا ہے۔ یہاں پر کئی ہزار میری بچی کے قدموں میں نچھاور کر چکا ہے۔ لیکن میں نے اسے صاف کہہ دیا ہے کہ بیس ہزار سے کم ہوں تو ان سیڑھیوں پر اس مقصد کے لئے نہ چڑھنا۔ پھر ایک آہ بھر کر کہنے لگی۔ کیا زمانہ تھا وہ بھی۔ میری اماں بتایا کرتی تھیں کہ اس چوکھٹ پر بڑے بڑے رئیس اور نواب زادے لوٹتے رہتے تھے۔ اب تو کلجگ ہے کلجگ۔ جس کی جیب میں بھی سو روپیہ ہوتا ہے بلا دھڑک اندر چلا آتا ہے۔ میری بچیوں کے نازک پاؤں ناچتے ناچتے سوج جاتے ہیں۔ لیکن پانچ روپے سے زیادہ ویل کوئی نہیں دیتا۔ میں نے اسے کہا کہ دیکھو اگر تمہیں شمی کے 35 ہزار مل جائیں......؟ تو ڈیرہ دارنی میری بلائیں لے کر کہنے لگی۔ جوہری ہی ہیرے کی قدر پہچانتا ہے۔ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی کہ میں نے اسے ٹوک دیا اور کہا کہ تم ایسے کرو کہ جب یشونت آئے تو اسے کہنا کہ ایک رئیس نے 35 ہزار روپے کی پیشکش کی ہے۔ میں نے اس سے ایک ہفتے کی مہلت مانگی ہے۔ آپ چونکہ ہمارے پرانے شناسا ہیں اس لئے پہلا حق آپ کا۔ اس سے پہلے بھی آپ نے ہمارے بیس ہزار کے مطالبے کو پورا نہ کر کے اپنا نقصان اور ہمارا فائدہ کیا ہے۔ اب 35 ہزار کی آفر کو بھی آپ سوچ بچار میں ضائع نہ کر دیں۔ وہ رئیس زادہ تو اس سے بھی زیادہ دینے پر آمادہ ہو جائے گا۔ آپ کے پاس ایک ہفتے کی مہلت ہے۔ ورنہ بعد میں ہم سے شکوہ نہ کیجئے گا۔ اس معاملے میں میرا ذکر ہرگز ہرگز نہ کرنا۔ غرضیکہ میں نے ڈیرہ دارنی کو خوب پٹی پڑھائی۔ لیکن وہ بھی گرگ باراں دیدہ تھی۔ کہنے لگی، حضور آپ کی ہر بات درست لیکن اگر یشونت بابو 35 ہزار پر راضی نہ ہوئے تو ہم بیس ہزار سے بھی جائیں گے۔ میں نے اسے ایک ہزار اور دیا اور کہا کہ اگر یشونت ایک ہفتے میں 35 ہزار نہ دے سکا تو میں بیس ہزار ویسے ہی دے دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ میرے کہے پر حرف بحرف عمل کرو۔ یہ کہہ کر میں وہاں سے چلا آیا۔

میں نے ایک طرح سے یہ جوا کھیلا تھا۔ یشونت سے مجھے امید تھی کہ جب اسے شمی کے حصول کے اوقات کار کا پتہ چلے گا تو وہ بڑے سے بڑا رسک لے لے گا۔ میرے خیال میں ان دو فائلوں کا پچاس ہزار روپے میں حصول میرے سینئرز کے لئے بہت سستا سودا تھا۔ ہمارا ایک گروپ پہلے ہی اپنے اس مشن میں ناکام ہو چکا تھا جبکہ مطلوبہ معلومات ہمارے لئے بہت ضروری تھیں۔

چاوڑی بازار سے واپسی پر میں ساتھیوں کے گھر چلا گیا اور آج کی ڈاک کی کاپیاں بنوا کر گزشتہ ڈاک کی کاپیاں بھی لے لیں۔ میں نے ساتھیوں سے کہا کہ آج سے یشونت کو ڈاک لوٹانے اور وصول کرنے کی ڈیوٹی ان کے ذمہ ہے۔ کاپیاں بھی وہ خود ہی بنایا کریں۔ منگل اور ہفتے کو ڈاک کی وصولی اور واپسی کے اوقات اور جگہ بھی انہیں بتا دی۔ اور کہا کہ بدھ اور اتوار کی صبح 10 بجے ڈاک کی کاپیاں مجھے لودھی ہوٹل کے قریب مغل محل ریسٹورنٹ میں پہنچا دیا کریں۔ یشونت سے ڈاک لینے اور واپسی کے لئے دو ساتھی جایا کریں۔ جن میں سے ایک مونچھیں اور عینک لگائے جبکہ دوسرا اپنی اصلی حالت میں اسے کور کرے۔ اسی وقت میں نے ایک فیصلہ کیا جو کہ میرے سینئر کی ہدایات کے خلاف تھا (حالات کے تقاضے کے مطابق دی گئی ہدایات میں تبدیلی کا مجھے اختیار دیا گیا تھا)۔ میں نے ساتھیوں کو لودھی ہوٹل میں اپنی رہائش اور ٹیلی فون نمبر بتا دیئے اور انہیں کہا کہ کسی ایمرجنسی یا ضرورت کے تحت وہ مجھ سے ہوٹل میں رابطہ کر سکتے ہیں۔ میرے اس فیصلے کی تین وجوہات تھیں۔ اول یہ کہ میرا تقریباً ہر روز ان کے گھر جانا مناسب نہ تھا اور مالک مکان اور محلے داروں کو شک میں مبتلا کر سکتا تھا۔ دوم میرے ساتھیوں کو میرے متعلق کوئی علم نہ تھا اور کسی ایمرجنسی کی صورت میں وہ مجھ سے رابطہ نہ کر سکتے تھے اور تیسری وجہ یہ تھی کہ اگر کہیں میں پکڑا جاؤں تو وہ میرے متعلق بالکل اندھیرے میں ہی نہ رہیں۔ میں آہستہ آہستہ انہیں ذمہ داریاں سونپنا چاہتا تھا تاکہ میری گرفتاری کی صورت میں وہ طے شدہ امور کو جاری رکھ سکیں۔

اگلا سارا دن میں نے ہوٹل میں ہی گزارا بھیجنے والی ڈاک تیار کی اور تازہ کارروائیوں کی کامیابیوں کی مفصل رپورٹ، نہ دکھائی دینے والی سیاہی سے لکھی۔ ہمدرد سے 20 ہزار روپے لینے اور یشونت کیلئے مزید روپوں کی ضرورت بھی لکھی۔ تاراپور مشن کی اب تک کی جانے والی کوشش اور اس کے متوقع نتائج کے بارے میں بھی لکھا۔ غرضیکہ شام ڈھلنے سے پہلے ڈاک کا پیکٹ بالکل تیار کر دیا۔

میں اگلے روز مقررہ وقت پر اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ CONTACT سے ملنے پہنچ گیا۔ میرے مطالبے کے مطابق اس بار دو CONTACT بھیجے گئے تھے جو ڈاک کا خاصہ بڑا تھیلا لائے تھے۔ میرے ساتھی مجھے کور کئے ہوئے تھے۔ تھیلہ لے کر میں نے فوراً اپنے نمبر 2 کے حوالے کیا جو اسے اپنے گھر لے گیا۔ CONTACTS کو مجھ سے کوئی بات کرنے کی اجازت نہ تھی۔ لہٰذا مجھ سے ڈاک لے کر وہ بھی فوراً چلے گئے۔ اپنے بقیہ دو ساتھیوں کے ہمراہ میں تین ٹیکسیاں بدل کر اور مختلف علاقوں کے بے فائدہ چکر لگا کر اور راستے میں ساتھیوں کو الگ الگ جگہ اتار کر تقریباً دو گھنٹے بعد ان کے گھر پہنچا۔ ٹیکسیوں کو بدلنا، مختلف جگہوں کے چکر لگانا اور ساتھیوں کو راستے میں الگ الگ اتارنا ہمارے لئے لازمی تھا تاکہ اگر CONTACTS کا پیچھا کیا جا رہا ہو تو نگرانی کرنے والے ہمارے ٹھکانوں تک بھی نہ پہنچ جائیں اور انہیں راستے میں ہی جھٹک دیا جائے۔

اس بار ہماری ڈاک کے پیکٹ میں ہمارے گھریلو خطوط کے علاوہ دو عدد کیمرے اور کیمرے کے لئے بارہ بارہ فلموں کے رول تھے۔ ایک تھیس بور کا پسٹل سائیلنسر کے ساتھ، تین فالتو میگزین اور دو سو گولیاں تھیں۔ پچاس ہزار بھارتی روپے تھے۔ سینئرز کے خط میں ہماری کارکردگی کو بہت سراہا گیا تھا اور یشونت سے حاصل ہونے والی ڈاک کا شدت سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ ایک کیمرہ سائز میں سگریٹ لائٹر جتنا تھا اور ڈاک کی تصویریں بنانے کی صلاحیت رکھتا تھا جبکہ دوسرا کیمرہ CANNON آٹومیٹک تھا اور اس میں بلٹ ان فلیش گن تھی۔ سینئر کا ایک خط صرف میرے لئے تھا جس میں مختلف ہدایات کے علاوہ یہ درج تھا۔ "تمہاری کارکردگی اور صلاحیت نے ہمیں بہت متاثر کیا ہے تم چاہے اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہو لیکن ہمارے لئے تمہاری زندگی بیش قیمت ہے۔ لہٰذا ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھاؤ۔ سائیلنسر والا پسٹل تمہارے لئے ہمارا تحفہ ہے۔ اگر ضرورت کا موقع پیش آجائے تو بے دریغ استعمال کرنا۔ آئندہ ہر اتوار اور بدھ کو ٹھیک دو بجے بعد دوپہر ہم وائرلیس پر تمہیں CONTACT کیا کریں گے۔ تاکہ ضروری ہدایات کے علاوہ آپ سب کی خیریت معلوم ہو سکے۔ آپ جواب میں صرف MESSAGE RECEIVED اور ALL O.K کہیں"۔ یہ انتظام میرے خیال میں اس لئے کیا گیا تھا کہ ہم اپنے ٹرانسمیٹر پر لاہور سے رابطہ کرنے اور پیغام بھیجنے میں جو وقت صرف کرتے تھے۔ اس دوران ہمارے ٹریس TRACE ہونے کا خاصا امکان تھا۔ جبکہ لاہور سے TRANSIMT ہونے والے پیغام چاہے کتنا وقت لیں RECEIVE کرنے اور مختصر ترین جواب بھیجنے میں "پکڑ" کا خدشہ بہت کم تھا۔ مجھے اس نئے انتظام کی وجہ کہیں کچھ گڑبڑ ہونے کا احساس دلا رہی تھی۔ میں اسے محض اپنا وہم سمجھ کر بھلا دینا چاہتا تھا لیکن دو تین روز بعد کے اخبارات میں جلی سرخیوں میں الہ آباد میں ایک پاکستانی میجر جاسوس کی گرفتاری اور بعد ازاں اس کے تین ساتھیوں کی ٹرانسمیٹر کے مسلسل استعمال کی وجہ سے آگرہ سے گرفتاری کی خبروں نے میرے خدشے کی تصدیق کر دی۔ اخبارات تو پاکستانی میجر اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری اور سنسنی خیز انکشافات کی توقع سے بھرے ہوئے تھے۔ لیکن کیا انکشافات ہوئے۔ اس کے متعلق کبھی کچھ نہ چھپا۔ یہ تو کرنل شنکر نے ہفتہ دس دن بعد ایک ملاقات میں تفصیلاً بتایا کہ احسن نام کا ایک پاکستانی میجر 39 ماؤنٹین ڈویژن کی وردی پہنے الہ آباد میں کسی اسپیشل ڈیوٹی کے بہانے ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ میس میں مقیم ایک بھارتی کرنل کی ڈائری کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ میس میں کئی دنوں کی لاحاصل کوشش کے بعد اس نے کرنل کے مسلمان بیٹ مین کو پیسے کے زور پر رام کرنا چاہا اور اسے اعتماد میں لینے کے لئے یہاں تک بتا دیا کہ وہ پاکستانی اور مسلمان ہے۔ کرنل کی ڈائری لا کر دینے کے عوض اس نے بیٹ مین کو خاصی بڑی رقم کی پیشکش کی اور آدھی رقم پیشگی دے دی۔ یہ بیٹ مین کچھ زیادہ ہی "محب بھارت" تھا۔ اس نے کرنل کو سب کچھ بتا دیا۔ میجر احسن کو فوراً گرفتار کر لیا گیا اور یہ تصدیق ہونے پر کہ اس کا 39 ماؤنٹین ڈویژن سے جو پونا میں STATOINED تھا کوئی واسطہ نہیں اس پر انتہائی تشدد کیا گیا لیکن اس نے سوائے اپنے نام، رینک اور نمبر کے کچھ نہ بتایا۔

بھارتی انٹیلی جنس نے جلد از جلد اپنے ساتھیوں اور ہمدردوں کے نام اگلوانے کی خواہش میں اس میجر کو Break کرنے کیلئے تشدد کی انتہا کر دی۔ اس کے دونوں پاؤں کی انگلیاں کاٹی گئیں۔ ہاتھ کاٹے گئے اور دونوں بازو بھی کاٹ دیئے گئے لیکن میجر احسن کی زبان سے ایک لفظ تک نہ نکلا۔ حتیٰ کہ وہ شہید ہو گیا۔ اس کے ساتھی آگرہ میں تھے۔ میجر احسن جب مقررہ وقت سے چند دن بعد تک وہاں نہ پہنچا تو وہ بوکھلا گئے اور بار بار ٹرانسمیٹر پر لاہور سے رابطے شروع کر دیئے۔ Tracer نے ان کے سگنل کیچ کئے اور جگہ کا تعین کیا اور وہ تینوں بمعہ ٹرانسمیٹر پکڑے گئے۔ کرنل شنکر نے جو کچھ مجھے بتایا میں سنتا گیا۔ میں نے خود کوئی ایسا سوال نہ کیا جو کرنل کو میرے متعلق شک میں ڈال سکے۔ یہ ساری روداد میں نے اپنی ڈاک میں لاہور بھیج دی۔ بہت بعد میں مجھے پتا چلا کہ میجر کے تینوں ساتھیوں کو بھی تشدد سے شہید کر دیا گیا لیکن انہوں نے بھی اپنی زبان نہ کھولی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

قارئین! شاید آپ سوچ رہے ہوں کہ پاکستان سے اس فراوانی سے بھارتی کرنسی کی آمد کی وجہ سے ہمیں اسے خرچ کرنے کی کھلی اجازت تھی۔ یہ بات ہرگز نہ تھی بلکہ میرے ہوٹل اور ساتھیوں کے مکان کے کرائے کی ادائیگی کے علاوہ میرے چار ہزار روپے اور میرے ساتھیوں کے تین تین ہزار روپے ماہوار ذاتی اخراجات کیلئے مقرر کئے گئے تھے۔ ان رقوم کے علاوہ ہمیں ایک ایک پیسے کا حساب رکھنا پڑتا تھا۔ مشن کی مد میں اخراجات کی تفصیلات Justification دینی پڑتی تھی۔ میرے ساتھیوں کے پاس چونکہ ذاتی اخراجات کی مد میں رقم ایڈوانس میں جا رہی تھی اس لئے میں نے اس بار انہیں کچھ نہ دیا اور ہمدرد سے لی ہوئی رقم کا بقیہ اور اب ملنے والے پچاس ہزار روپے ہوٹل میں اپنے لاکر میں رکھ دیئے۔ یہ سب روپیہ ملک اور قوم کی امانت تھا اور ہم نے جبکہ اپنی زندگیاں اپنے وطن کیلئے داؤ پر لگا رکھی تھیں تو اس امانت میں خیانت کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

غازی

میں نے اپنے ساتھیوں کو میجر احسن اور اس کے ساتھیوں کی شہادت کا بتایا اور کہا کہ اب ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ میں نے انہیں سختی سے ہدایت کی کہ کبھی بھی اکیلے باہر نہ جائیں ہمیشہ دو جائیں۔ دونوں مسلح ہوں اور ایک دوسرے سے فاصلہ رکھ کر چلیں۔ اگر محسوس ہو کہ آپ کا پیچھا کیا جا رہا ہے تو جھٹکنے کی پوری کوشش کریں اور اگر جھٹکنے میں ناکام ہو جائیں اور بچنے کی کوئی صورت نظر نہ آئے تو پھر پیچھا کرنے والے کو گولی مار کر ہلاک کر دیں اور وہاں سے غائب ہو جائیں۔ میری یہ ہدایت سن کر ساتھیوں نے بتایا کہ سرائے بیرم خان میں گھومنے کے دوران انہوں نے چاقو چھری اور خنجروں کی ایک دکان سے ایسی پانچ چھریاں خریدی ہیں جو آدھا انچ سے بھی کم چوڑی اور ایک فٹ لمبی ہیں اور ہاتھ میں پکڑنے والے عام موٹے بید میں چھری کے دستے میں بنے اسکریو کے ذریعے فٹ ہو جاتی ہیں۔ انہوں نے ایسا ایک بید مجھے بھی دیا۔ چھری واقعی بے حد سخت اور بہت تیز تھی۔ بید کے اندر فٹ ہونے پر چھری کا دستہ بید کا حصہ دکھائی دیتا تھا۔ واقعی یہ کارآمد ہتھیار تھا جس سے آواز نکالے بغیر دشمن کو ہلاک کیا جا سکتا تھا۔ پاکستان سے بھیجے گئے سائیلنسر والے پسٹل کو رکھنے کیلئے کور اور ایسی بیلنس بھیجی گئی تھیں جن سے پسٹل لباس کے اندر بالکل چھپ جاتا تھا۔ میں نے ساتھیوں کو دوبارہ تنبیہ کی کہ اسلحہ اور چھری کا استعمال صرف انتہائی خطرناک صورت حال میں گھر جانے پر کیا جائے جب دوسرا کوئی راستہ نہ رہے۔

ساتھیوں کو میجر احسن کی شہادت کا بتانے اور چھریاں لینے کا واقعہ ہمارے گزشتہ تسلسل سے تقریباً 12 روز بعد کا ہے ورنہ گزشتہ پیر کے روز ہم نے پاکستانی Contacts سے ڈاک وصول کی اور بھیجی تھی اور اگلے روز لیشونت سے میرے ساتھیوں نے دودھ دہی کی دکان پر اس کی ڈاک کا تھیلا وصول کرنا تھا۔ منگل کو میرے ساتھیوں نے لیشونت سے ڈاک وصول کی اور کاپیاں بنا کر بدھ کو مغل محل ریسٹورنٹ میں میرے حوالے کر دیں۔ کاپیوں کے علاوہ لیشونت کا دیا ہوا ایک لفافہ بھی مجھے دیا۔ جس پر Most Urgent لکھا ہوا تھا۔ خط میں لکھا ہوا تھا۔ ''ایک بہت ہی اہم مسئلہ درپیش ہے آپ سے فوری ملنا چاہتا ہوں۔ بدھ کو رات آٹھ بجے گولچہ سینما کے ریسٹورنٹ میں آپ کا منتظر رہوں گا۔'' میں نے اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا کہ رات پونے آٹھ بجے گولچہ سینما کے ریسٹورنٹ میں الگ الگ جا بیٹھیں اور میری لیشونت سے ملاقات کے دوران چوکنا رہیں۔

میں جان بوجھ کر پندرہ منٹ لیٹ ریسٹورنٹ میں پہنچا۔ پہلے سے وہاں بیٹھے ہوئے میرے دونوں ساتھیوں نے مجھے گرین سگنل دیا۔ لیشونت کونے کی ایک میز پر سر جھکائے بیٹھا اور پریشان حال دکھائی دے رہا تھا۔ میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے سر اٹھایا۔ مجھے دیکھ کر اس کی باچھیں کھل اٹھیں۔ ''بہت انتظار کروایا آپ نے۔ میں تو مایوس ہو چلا تھا'' میں نے کہا کہ میں تو صرف پندرہ منٹ لیٹ ہوا ہوں۔ بہر حال بتائیں کیا ضرورت آن پڑی۔ لیشونت نے میرے آگے فی الحقیقت ہاتھ باندھ دیئے۔ میری عزت اور زندگی اب آپ کے ہاتھ میں ہے'' میں نے کہا ''لیشونت بابو بتاؤ تو سہی کیا بات ہے'' یہاں میں بتاتا چلوں کہ لیشونت کو میں نے اپنا ہندو نام بھی ابھی تک نہیں بتایا تھا اس لئے وہ مجھے صرف صاحب کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ چند سیکنڈ موزوں الفاظ سے گفتگو کا آغاز کرنے کیلئے وہ چپ رہا اور پھر بولا'' صاحب آپ سے تو اب میری کوئی بات پوشیدہ نہیں۔ میں شمی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کل شام میں اس کے ہاں گیا تھا تو اس کی ماں نے مجھے الگ بلا کر کہا کہ شمی کا ایک خریدار اس کے 35 ہزار دینے کو تیار ہے۔ نا معلوم وہ سچی ہے یا جھوٹ بول رہی تھی۔ لیکن مجھے اس نے صرف ایک ہفتے کی مہلت دی ہے۔ روپوں کا بندوبست کر لوں۔ ورنہ وہ شمی کو دوسرے خریدار کے حوالے کر دے گی۔ یہ کہہ کر لیشونت میری طرف امید بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا ''لیشونت بابو اس معاملے میں میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے'' لیشونت اور زیادہ گڑگڑانے لگا۔ ''آپ جانتے ہیں کہ میں کسی صورت بھی اتنی رقم کا بندوبست نہیں کر سکتا۔ آپ میری آخری امید ہیں۔ بھگوان کیلئے مجھے یہ رقم ایڈوانس دے دیں۔ میں آئندہ اپنی ڈاک کا معاوضہ اس ایڈوانس سے منہا کرواتا رہوں گا'' ''دیکھو لیشونت بابو'' میں نے بے نیازی سے کہا ''آرمی ہیڈ کوارٹرز کی ساری ڈاک ہمارے مطلب کی نہیں ہوتی۔ آپ کے بھیجے ہوئے بیشتر خطوط ہم ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتے ہیں۔ میں نے اب تک جو رقم آپ کو دی ہے وہ آپ کی دی ہوئی ڈاک کے مناسب معاوضے سے کہیں زیادہ ہے۔ آپ سے دوستی ہو گئی ہے اس لئے میں نے یہ سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔ اب آپ کو 35 ہزار روپیہ درکار ہے تو وہ اس قسم کی ڈاک کے عوض ایڈوانس نہیں دے سکتا۔ میں بھی آگے جواب دہ ہوں۔ اس کی صرف ایک صورت ہو سکتی ہے کہ تاراپور کی فائلیں اگر آپ مجھے لا دیں تو پھر یہ رقم آپ کو مل سکتی ہے۔'' ''لیکن وہ فائلیں تو جنرل صاحب کی سیف میں رکھی ہیں اور سیف کی چابیاں جنرل صاحب کے پاس ہوتی ہیں'' لیشونت نے مایوسی سے جواب دیا اور خاموش ہو گیا۔ میں نے فوراً ہی اس سکوت کو توڑ دیا اور کہا ''لیشونت بابو ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ آپ کے بقول جنرل صاحب کی سیف کھولتے بھی آپ ہیں اور بند بھی آپ کرتے ہیں۔ یہ دو مواقع ایسے ہیں جن میں آپ چابیوں کا عکس صابن کی ٹکیوں پر لے سکتے ہیں۔ آپ عکس لے لیں اور چابیاں بنوا لیں۔ جنرل صاحب کے دفتر سے جانے کے بعد آپ آسانی سے سیف کھول کر فائلیں نکال سکتے ہیں۔ دفتر سے واپسی پر فائلیں آپ میرے آدمی کے حوالے کریں اور اسی رات کو فائلوں کے ساتھ آپ کو 35 ہزار روپے مل جائیں گے۔ لیشونت سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی خاموشی ڈر کی وجہ سے تھی میں نے اسے سوچنے کی مہلت نہ دی اور کہا کہ چابیوں کے نقش اتارنے میں زیادہ سے زیادہ ایک منٹ صرف ہوگا اور فائلیں نکالنے میں بھی کم و بیش اتنا ہی وقت لگے گا۔ رسک تو آپ پہلے ہی لے رہے ہیں۔ یہ تو کل دو منٹ کی بات ہے۔ جس کے عوض آپ اپنی بڑی سے بڑی حسرت پوری کر سکیں گے۔ ورنہ اگر اسی آرزو کو دل میں لئے آپ کا دیہانت ہو گیا تو آپ کی یہ آتما بھی بھٹکتی رہے گی اور مرنے کے بعد بھی اسے شانتی نہ ملے گی۔

لیشونت کا کچھ خوف تو میں نے دور کیا اور کچھ اس کی خواہش نے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بولا'' صاحب جب زندگی میں کوئی خوشی ہی نہیں تو پھر ایسی بے رنگ زندگی کو رنگین بنانے کیلئے میں یہ رسک بھی لے لوں گا۔ دیسی صابن کی ٹکیاں تو میں آج ہی لے لوں گا جن پر نرم ہونے کی وجہ سے عکس نمایاں طور پر لیا جا سکتا ہے۔ سیف کھولتے اور بند کرتے وقت میری پیٹھ جنرل صاحب کی طرف ہوتی ہے۔ اس لئے نقش بھی آسانی سے اتار لوں گا۔ جنرل صاحب چونکہ ٹائپنگ کیلئے مجھے ہی بلواتے ہیں۔ اس لئے ان کے جانے کے بعد صفائی ہونے سے پہلے کوئی بہانہ بنا کر اس کمرے میں جا سکتا ہوں اور فائلیں نکال سکتا ہوں۔ کسی کو بھی شک نہیں ہوگا۔ لیکن ایک اڑچن ہے کہ جنرل صاحب اس محدود مدت میں اگر مجھے نہیں بلواتے تو پھر کیا ہوگا۔'' محدود مدت سے لیشونت کی مراد شمی کی ماں کی دی ہوئی مہلت تھی۔ میں نے کہا کہ اگر اس دوران جنرل نے تمہیں نہ بلوایا تو تم اپنا قلم سیف میں بھول جانے کا کہہ کر بھی جنرل سے چابیاں لے سکتے ہو۔'' اگر لگن سچی ہے تو بھگوان خود رستہ بنا دے گا۔ آپ روپیہ تیار رکھیں میں فائلیں لانے کی پوری کوشش کروں گا۔'' یہ کہہ کر لیشونت نے مجھے نمستے کہا اور رخصت چاہی اور میں سوچ رہا تھا کہ لیشونت کا بھگوان تو اس کا رستہ بنائے یا نہ بنائے میرا اللہ یقیناً ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی دے گا۔ اچانک مجھے ایک خیال آیا اور میں نے لیشونت کو کہا کہ چونکہ تمہاری ''ایمرجنسی'' ہے اس لئے میرا ایک آدمی ہر روز دفتر سے تمہاری واپسی کے وقت دودھ دہی کی دکان پر تمہارا انتظار کرے گا۔ کیونکہ ڈاک کی وصولی کیلئے تو منگل اور ہفتہ کے دن مقرر تھے۔ لیشونت نے شکرانے کے انداز میں دوبارہ مجھے نمستے کہا اور چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں بھی اپنے منصوبے کی اب تک کامیابی اور آئندہ کامیابی کے خیالات میں کھویا ریسٹورنٹ سے باہر آ گیا اور اپنے ساتھیوں کے گھر چلا گیا اور انہیں کہا کہ آئندہ منگل تک روز دو ساتھی دودھ دہی کی دکان پر لیشونت کی واپسی کے وقت اس کا انتظار کریں اور عام ڈاک کے علاوہ جو کچھ بھی وہ دے اسے لے کر فوراً مجھے ٹیلی فون بوتھ سے فون کر کے مقرر کردہ وقت پر مغل محل ریسٹورنٹ میں مجھے دے دیں۔

میں نے اپنی طرف سے تمام انتظامات مکمل کر لئے تھے اور اب ہمیں لیشونت کی کامیابی کی خبر سننے کا بے تابی سے انتظار تھا۔ میرے دو ساتھی ہر روز دودھ کی دکان پر لیشونت کی دفتر سے واپسی کے وقت موجود رہتے تھے اور اسے اپنی موجودگی کا احساس بھی دلاتے تھے اسی صورتحال میں کئی دن بیت گئے۔ اس دوران لیشونت نے مقررہ دن انہیں ڈاک کا لفافہ دیا تھا۔ اس ڈاک میں ہیڈ کوارٹرز کے خطوط کے علاوہ تین سویپرز کے نام اور گھریلو ایڈریس بھی تھے۔ ہر ایک کے نام کے ساتھ لکھا ہوا تھا کہ وہ کس سینئر افسر کے کمرے کی صفائی کرتا ہے۔ اس بار ہم نے لیشونت کی دی ہوئی ڈاک کی مناسب روشنی میں تصویریں بھی اتاریں اور اپنی کاپی کرنے والی سلیٹوں سے کاپیاں بھی بنا لیں کیونکہ فلموں کے رول تو پاکستان جا کے ہی ڈیولپ ہونے تھے اور تب ہی ان کے رزلٹ کا پتہ چلنا تھا۔ کاپیاں ہم نے حفظ ماتقدم کے طور پر بنا لی تھیں۔ اس انتظار بیم کی کیفیت میں ایک روز عبدالکریم میرے ہوٹل میں آیا اور اپنے کرنل کے متعلق اپنے خیالات پر مبنی چار صفحات دے کر چلا گیا۔ عبدالکریم اردو بولتا تو صاف ستھری تھا لیکن اس کی تحریر بہت معمولی تھی۔ کرنل شنکر کے متعلق اس نے جو کچھ لکھا تھا اس کا لب لباب یہ تھا کہ کرنل شنکر اگرچہ ایک سخت گیر شخص تھا کہ اسے گالیاں بھی دیتا تھا لیکن دل کا وہ بہت نرم تھا۔ اپنڈکس کے آپریشن کیلئے عبدالکریم کو CMH میں داخل کیا گیا تو کرنل نہ صرف یہ کہ ہر روز اس کی تیمارداری کو آتا تھا بلکہ اس کیلئے پھل فروٹ بھی لاتا تھا۔ عبدالکریم کی تحریر کی ایک بات نے مجھے چونکا دیا کہ کرنل شنکر کبھی کبھی نشے کی حالت میں بھارت اور بھارتی افواج کو گالیاں بکتا تھا اور کہتا تھا کشمیر کے معاملے میں بھارت کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے پاکستان اور بھارت ایک دوسرے کے جانی دشمن بن چکے ہیں۔ بقول عبدالکریم کے کرنل سمجھتا تھا کہ بھارت نے مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش تو بنا دیا لیکن اب بھارت کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی باری ہے اور یہ کہ آئندہ جو پاکستان بھارت جنگ ہوگی وہ ایٹمی جنگ ہوگی۔ ایٹمی جنگ کے نتیجے میں دونوں ملکوں میں جو تباہی ہوگی وہ پاکستانی مسلمان تو برداشت کر جائے گا لیکن بھارتی ہندو ہرگز برداشت نہ کر سکے گا اور جنگ کے بعد بھارتی ہندو خود بھارت کی اکائی کو توڑ کر چھوٹی چھوٹی مختلف ریاستوں میں تقسیم کر لیں گے۔ ان ریاستوں کے پاس نہ اتنی طاقت ہوگی اور نہ وسائل کہ جنگ کرنے کا سوچ بھی سکیں۔ عبدالکریم نے لکھا تھا کہ کرنل شنکر سر پیٹ کر کہتا تھا کہ ایسا ضرور ہوگا لیکن تباہی و بربادی کے بعد۔ کاش بھارت کے ٹکڑے جنگ سے پہلے ہی ہو جائیں اور ایک بڑی اور بھیانک تباہی و بربادی سے بچا جا سکے۔ کرنل شنکر کے مطابق دنیا بھر کے مسلمان ممالک پاکستان کی ڈھال بن جائیں گے جبکہ بھارت یکہ و تنہا رہ جائے گا۔

عبدالکریم نے لکھا تھا کہ رات کو نشے میں کرنل شنکر جو کچھ کہتا ہے وہ اگلی صبح مجھ سے ضرور پوچھتا ہے کہ کسی اور نے تو نہیں سنا۔ مجھ سے تسلی کر لینے کے بعد مجھے دس پندرہ روپے دے کر کہتا ہے ''جان بناؤ، بھارتی مسلمانوں کو آئندہ جنگ میں بہت بڑا رول ادا کرنا ہے اس کی تیاری کرو''۔

کرنل شنکر کے متعلق عبدالکریم کی تحریر کو میں نے کئی بار پڑھا بہت سوچا اور بالآخر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ عبدالکریم کی نگاہ میں، میں بھارتی ہندو اور کرنل شنکر کا دوست ہوں اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ درست ہوگا۔ اگر عبدالکریم کو معلوم ہوتا کہ میں مسلمان یا پاکستانی ہوں یا کرنل شنکر کا دشمن اور اس کا افسر ہوتا تو وہ پہلی صورت میں مجھے خوش کرنے اور دوسری صورت میں کرنل شنکر سے بدلہ لینے اور اسے نقصان پہنچانے کے لئے غلط بیانی کر سکتا تھا۔ یہ تحریر خود اسے بھی بے حد نقصان پہنچا سکتی تھی۔ لہٰذا اسے درست سمجھا جانا چاہئے۔ کرنل شنکر خود مجھے ایک شام باتوں باتوں میں بتا چکا تھا کہ 65ء کی جنگ کے دوران اس کے جوان ریکی کرتے ہوئے پاکستان کی سپر ہیوی گنوں رانی اور شیرنی کی صحیح نشاندہی کر چکے تھے اور کرنل شنکر نے یہ اطلاع نہ دے کر ان گنوں کو بھارتی توپ خانے اور ہوائی بمباری سے بچایا تھا۔ کرنل شنکر کی گفتگو لاہور سے اس کی دلی وابستگی اپنی کلاس فیلو سے محبت میں ناکامی اور دل شکستگی، اب تک غیر شادی شدہ ہونا، ان سب باتوں کو پس منظر میں رکھ کر عبدالکریم کی تحریر کو میں نے درست سمجھا۔ میں نے کرنل شنکر کا جو خاکہ کھینچا وہ جنگ سے نفرت کرنے والے، کشمیر کے مسئلے پر بھارت کی ہٹ دھرمی کو غلط سمجھنے والے اور مسلمانوں کے لئے دل میں نرم گوشہ رکھنے والے ایک ایسے شخص کا تھا جو بامر مجبوری بھارتی فوج میں ملازمت کر رہا تھا اور وقت پڑنے پر بھارتی مسلمانوں کو ایک اکائی بنا کر ہندوؤں کے تعصب کا مقابلہ کرنے اور ممکنہ پاک بھارت جنگ میں پاکستان کی مدد کرنے کا خواہاں تھا۔ ان پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر میں کرنل شنکر کے زیادہ قریب ہو کر اور اسے کرید کر بہت مفید معلومات حاصل کر سکتا تھا۔ میں نے کرنل شنکر کو اپنی ویٹنگ لسٹ میں سرفہرست رکھ لیا لیکن جب تک لیشونت کا معاملہ طے نہ ہو جاتا میں نے کسی اور ایشو کو نہ چھیڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔

لیشونت کے دیئے ہوئے سویپرز کے نام اور ایڈریس میں نے ان دو ساتھیوں کو دے دیئے جو پہلے ہی ہیڈ کوارٹرز کے سویپرز کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ اب انہیں ان تین سویپرز کو HANDLE کرنا تھا۔ شمی کی ماں کی دی ہوئی ''مہلت'' میں ابھی وقت باقی تھا اور میں اس مہلت میں اضافہ بھی کروا سکتا تھا۔ لیشونت کو سیف کی چابیاں حاصل کرنے اور مطلوبہ فائلیں نکالنے میں جو دشواریاں پیش آ سکتی تھیں وہ بھی میرے پیش نظر تھیں لیکن میرا اور میرے ساتھیوں کا یہ حال تھا کہ صبح سے شام تک لیشونت کے دفتر سے واپس لوٹنے تک ہم اس کی کامیابی کی آس لگائے بیٹھے رہتے تھے اور شام کو جب لیشونت خاموشی سے سر جھکائے گھر کی جانب بڑھ جاتا تھا تو ہم سب بھی مایوس ہو جاتے تھے۔ یہ دراصل تاراپور کے ایٹمی بجلی گھر کے متعلق معلومات کی اہمیت کی وجہ سے تھا۔ بعض اوقات مجھے خیال آتا کہ لیشونت اپنی مہم کے خطرات کے پیش نظر کہیں اس کام سے دستبردار ہی نہ ہو جائے۔ ایسی صورت میں اس سے یہ کام کروانے کیلئے ہمارے پاس زری کے ساتھ اس کی تصویریں اور ہیڈ کوارٹرز کی ڈاک کی واپسی کے وقت کی فائل کور، جس پر Classified and Confidential چھپا ہوا تھا کی تصویریں ہی کافی تھیں لیکن میں چاہتا تھا کہ لیشونت اپنی دیرینہ خواہش اور طلب کے تحت یہ کام کرے۔ جب شمی کی ماں کی دی ہوئی مہلت ختم ہونے میں صرف ایک دن رہ گیا تھا تو لیشونت نے دفتر کی ڈاک کے ہمراہ ایک خط دیا جو میرے ساتھیوں نے مجھے فوراً پہنچا دیا۔ خط میں لیشونت نے گولچہ سینما کے ریسٹورنٹ میں آج ہی ملنے کیلئے لکھا تھا بلکہ وقت بھی خود ہی طے کر لیا تھا۔

مقررہ وقت پر میں ریسٹورنٹ میں پہنچا تو لیشونت کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اس کا چہرہ اس کی مایوسی اور ناکامی کے اثرات سے بالکل بجھ سا گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ جنرل کئی روز سے دفتر نہیں آ رہا۔ اس نے ایک ہفتے کی چھٹی لے رکھی ہے۔ جس میں سے 4 دن گزر چکے ہیں اور چھٹی سے پہلے کے دو دنوں میں نہ تو جنرل نے اسے طلب کیا اور نہ ہی اسے موقع مل سکا کہ جنرل کے کمرے میں داخل ہو کیونکہ وہ جب بھی جنرل کے کمرے کی طرف گیا وہاں میٹنگ ہو رہی تھی۔ لیشونت اپنی ناکامی سے حد درجہ مایوس تھا۔ کہنے لگا۔ ''اب شمی کا حصول ناممکن ہو گیا ہے''۔ میں نے اس کی ڈھارس بندھائی اور کہا کہ جنرل کی چھٹی ختم ہو جائے تو پھر موقع مل جائے گا۔ لیشونت کہنے لگا ''موقع تو یقیناً مل جائے گا لیکن بے فائدہ ہوگا شمی کی ماں کی دی ہوئی مہلت تو کل ختم ہو رہی ہے''۔ یہ ایسا وقت تھا کہ مجھے لیشونت کو جو اپنی ہمت قریباً ہار چکا تھا، پھر سے تروتازہ کرنا تھا...... میں نے لیشونت سے کہا کہ وہ دل چھوٹا نہ کرے۔ شمی یقیناً اسے ہی ملے گی۔ اس وقت شام کے سات بج رہے تھے۔ میں نے لیشونت کو ہزار روپے دیتے ہوئے کہا کہ وہ گھر جا کر تازہ دم ہو اور ٹھیک 9 بجے شمی کے بالا خانے پر میں اسے ملوں گا اور شمی کی ماں کو مزید مہلت دینے پر رضامند کرنے کی کوشش کروں گا۔

لیشونت اور میں ریسٹورنٹ سے تقریباً اکٹھے باہر نکلے۔ وہ اپنے گھر کی طرف چلا اور میں ٹیکسی لے کر شمی کے بالا خانے پر پہنچ گیا۔ دراصل میں محفل جمنے سے پہلے ہی شمی کی ماں کو بریف کرنا چاہتا تھا۔ محفل سجانے کے سامان ہو رہے تھے۔ میں نے شمی کی ماں سے علیحدگی میں بات کی کہ آج لیشونت اور میں رات 9 بجے اکٹھے تمہارے ہاں آئیں گے۔ لیشونت کیلئے مزید مہلت مانگنے پر پہلے تو تم انکار کر دینا اور میرے بہت اصرار کرنے اور لیشونت کیلئے میرے پانچ ہزار پیشگی دینے پر اسے مزید دس یوم کی مہلت دے دینا۔ یہ باتیں سمجھا کر میں واپس اپنے ہوٹل چلا آیا اور 9 بجے تک تیار ہو کر اور پیسے لے کر پھر چاوڑی بازار میں شمی کے بالا خانے کے قریب پہنچ گیا۔

غازی

لیفٹیننٹ وہاں پان کی دکان پر کھڑا تھا۔ کہنے لگا میں تو ساڑھے آٹھ بجے ہی یہاں پہنچ گیا تھا اور پان کی دکان پر ہی دکاندار سے گلاس اور سوڈا لے کر اپنا سوڈ بنا رہا ہوں۔ ہم دونوں شمی کے بالا خانے میں اکٹھے داخل ہوئے۔ محفل شروع ہو چکی تھی۔ میں نے شمی کی ماں کو اشارے سے پچھلے کمرے میں آنے کا کہا۔ وہ کمرے میں گئی اور ساتھ ہی ہم بھی کمرے میں چلے گئے۔ میں نے لیفٹیننٹ سے کہا کہ جو کچھ کہنا ہے جلدی جلدی کہہ ڈالو۔ لیفٹیننٹ نے مزید مہلت مانگی تو شمی کی ماں نے صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگی۔ ''صاحبو! ہم تو کھلی کتاب ہیں۔ اس بازار میں ہر طرف شمی شمی ہو رہی ہے۔ شمی کو حاصل کرنا تو ایک طرف رہا۔ اس کے خواب دیکھنے کے لئے بھی جیب بھری ہونی چاہئے۔ یہ تو میں نے محض لیفٹیننٹ بابو کے پرانے گاہک ہونے کی وجہ سے انہیں بتا دیا تھا۔ ورنہ انہیں تو دوسروں کی طرح دعوت نامہ ہی ملتا۔ اب میں بہت جلد شمی کی یہ رسم ادا کروں گی۔ گاہک تو پہلے ہی میرے اشارے کے منتظر ہیں۔ لیفٹیننٹ نے کئی بار گڑگڑا کر مزید مہلت مانگی لیکن وہ پرانی گھاگ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ میں نے جب یہ محسوس کیا کہ لیفٹیننٹ بالکل ہی مایوس ہو چلا ہے تو شمی کی ماں سے کہا۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ لیفٹیننٹ بابو کے پاس پیسے نہیں۔ انہوں نے کہیں لگا رکھے ہیں جن کی وصولی میں دیر ہو گئی ہے۔ اب محض چند روز کی بات ہے۔ آپ اپنی رسم کی تیاری کریں۔ یہ کہتے ہوئے میں نے 5 ہزار روپے شمی کی ماں کو دیئے۔ ''یہ 5 ہزار پیشگی ہیں۔ آپ آج سے دسویں روز رسم کی ادائیگی رکھیں۔ اس سے پہلے ہی آپ کو بقیہ رقم مل جائے گی''۔ بڑھیا نے 5 ہزار تو فوراً دبوچ لئے اور بولی ''بقیہ تیس ہزار تو شمی کے ہوئے اور رسم کی ادائیگی یونہی نہیں ہوتی۔ اس بازار کے سب بالا خانے والوں کی دعوت ہوتی ہے۔ ہم اپنے سب گاہکوں کو بھی دعوت دیتے ہیں۔ رات گئے تک بازار کی سب لڑکیاں مجرا کرتی ہیں۔ شمی کے لئے جوڑا ابھی سلوانا ہے اور لیفٹیننٹ بابو کو شمی کی منہ دکھائی کے لئے 12 تولے کا سیٹ بھی دینا ہوگا اور یہ سب اخراجات لیفٹیننٹ بابو کو دینے ہوں گے۔ میرے پوچھنے پر شمی کی ماں نے بتایا کہ کل 10 ہزار روپے مزید خرچ ہوں گے۔'' میں نے کہا کہ وہ بھی تیس ہزار کے ہمراہ آپ کو مل جائیں گے۔ آپ تیاری کریں۔ سب باتیں طے کر کے ہم کمرے سے باہر ہال میں آ گئے۔ محفل ابھی پوری طرح جمی نہیں تھی۔ لیفٹیننٹ خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ شمی کی ماں نے مجھے بیٹھنے کے لئے بہت زور دیا لیکن میں نے ضروری کام کا عذر کر کے معذرت کر لی جبکہ لیفٹیننٹ خود کو ابھی سے آدھا دولہا سمجھتے ہوئے بڑی شان سے محفل میں بیٹھ گیا۔ اس کی جیب میں میرے دیئے ہوئے ایک ہزار روپے جو کلبلا رہے تھے۔ میں نے لیفٹیننٹ سے چلتے چلتے یہ کہا کہ کل شام 7 بجے مجھے گولچہ سینما کے ریسٹورنٹ میں ضرور ملے۔

اگلے روز شام کو لیفٹیننٹ گولچہ سینما کے قریب ہی مجھے نظر آ گیا۔ میں نے اسے ریسٹورنٹ جانے کا اشارہ کیا اور چند منٹوں کے وقفے کے بعد میں بھی ریسٹورنٹ میں اس کی ٹیبل پر جا بیٹھا۔ میرے دو ساتھی حسب معمول ہماری نگرانی کر رہے تھے۔

لیفٹیننٹ نے میرے بولنے سے پہلے ہی میرا بہت بہت شکریہ ادا کیا کہ گزشتہ رات میں نے اس کے خوابوں کو بکھرنے سے بچا لیا۔ وہ جب چپ ہوا تو میں نے کہا۔ ''لیفٹیننٹ بابو! میرے بس میں جو کچھ تھا میں نے کر دیا۔ اب آگے آپ کی ہمت ہے جو 5 ہزار میں نے شمی کی ماں کو دیئے ہیں۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اب آپ کو ہر صورت وہ فائلیں لانی ہوں گی۔ شمی کی ماں نے 10 ہزار مزید رسم کی ادائیگی کے لئے مانگ لئے ہیں۔ وہ بھی میں ادا کروں گا لیکن اس کے لئے آپ کو تھوڑا سا مزید کام کرنا ہوگا۔ جنرل کی سیف میں صرف یہ دو فائلیں ہی نہیں بلکہ اور بہت سی اہم فائلیں ہوں گی۔ جنرل کی OFFICIAL ڈائری بھی اسی سیف میں ہوگی۔ آپ تاراپور کی دو فائلوں کے ساتھ اور دوسری اہم فائلیں بھی مجھے لا کر دیں گے۔ کیونکہ فائلوں میں محفوظ کاغذات آپ ہی ٹائپ کرتے ہیں۔ اس جنرل سے پہلے یہاں جو جنرل تعینات تھے ان کی OFFICIAL ڈائریاں بھی اسی سیف میں ہوں گی کیونکہ ایسی ڈائریاں تبادلے کے وقت جنرل ہمراہ نہیں لے جاتے بلکہ آنے والے جنرل کی رہنمائی کیلئے ان ڈائریوں کو وہیں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ آپ موجودہ جنرل اور اس سے پہلے تعینات تین جنرلز کی ڈائریاں فائلوں کے ہمراہ ضرور لائیں''۔ لیفٹیننٹ میری باتیں بہت غور سے سن رہا تھا۔ میں نے سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''لیفٹیننٹ بابو! آپ نے جس دشت میں قدم رکھا ہے۔ وہاں ہر ہر لمحے آپ کو پیسوں کی ضرورت پڑے گی۔ شمی کو محض آپ کی بن کر رہنے کے لئے آپ کو ہر ماہ ایک معقول رقم اسے دینی ہوگی۔ پھر آپ کو شمی کی فرمائشیں پوری کرنے کے لئے بھی خاصی رقم کی ضرورت ہوگی۔ آپ کی اس مد میں مالی ضروریات میں پوری کروں گا اور آپ کو ہماری ضروریات پوری کرنی ہوگی۔ آپ کا بھرپور تعاون مجھے ملتا رہا تو مالی طور پر آپ کو پریشانی ہرگز نہ ہوگی''۔

میری ساری باتوں کے دوران لیفٹیننٹ مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ میں خاموش ہوا تو چند لمحے وہ خاموش رہا اور نہایت سنبھل سنبھل کر بولا: ''صاحب مجھے آپ کا نام بھی پتہ نہیں۔ نہ ہی آپ نے بتایا اور نہ ہی میں نے پوچھنے کی ہمت کی۔ لیکن شمی کے بالا خانے پر آپ سے اتفاقاً پہلی ملاقات سے اب تک جو حالات گزر رہے ہیں۔ ان سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ کس ملک کے لئے کام کر رہے ہیں۔ آپ کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے میں خود گلے تک دھنس چکا ہوں۔ میری واپسی کی کوئی صورت نہیں اور آپ کے ساتھ تعاون میں ہی میری بقا ہے۔ میرے خلاف آپ کے پاس اتنے ثبوت ہیں کہ آپ مجھے زندہ درگور کر سکتے ہیں اور پھانسی پر چڑھوا سکتے ہیں......''۔ ''اس کے علاوہ میرے آدمی تمہیں گولی بھی مار سکتے ہیں''۔ میں نے اس کی بات کاٹی۔ آپ نے بالکل درست کہا۔ میں آپ سے بھرپور تعاون کرنے کو تیار ہوں۔ میری اولاد میری دشمن ہے اور انہوں نے گھر میں ایسے حالات پیدا کر دیئے ہیں کہ مجھے گھر ہی سے نفرت ہو گئی ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کسی ایسی جگہ چلا جاؤں جہاں مجھے کوئی نہ جانے۔ میری ساری زندگی دفتری کام میں گزری ہے۔ جمع پونجی کچھ بھی نہیں، جس اولاد کے اوپر اپنی حیثیت سے بڑھ کر اس لئے خرچ کیا کہ وہ بڑھاپے میں میری لاٹھی بنیں گے وہی مجھے گھر سے نکالنے کی تدبیریں کر رہے ہیں۔ پہلے میرا کمرا گھر میں سب سے کھلا اور ہوا دار تھا لیکن اب ایک کونے کی کوٹھڑی ہی میں میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔ مجھے بتائے بغیر میرا ذاتی سامان اور ایک کھاٹ اس کوٹھڑی میں ڈال دی گئی۔ جوان بیٹے اور بیٹیاں ہونے کے باوجود اگر مجھے کچھ دیر ہو جائے تو خود ہی برتنوں سے ٹھنڈا کھانا نکال کر زہر مار کر لیتا ہوں۔ میرے ملنے والوں اور دوستوں کو گھر آنے کی اجازت نہیں۔ اپنے گھر میں ہی میں ایک اجنبی بن کر رہ گیا ہوں۔ ان حالات سے گھبرا کر میں نے پہلے شراب اور پھر شمی کے بالا خانے پر اپنے غم بھلانے چاہے۔ عارضی یا مصنوعی ہی سہی لیکن مجھے شراب اور شمی نے سکون دیا۔ لیکن اس سکون کے حصول میں روپے کی ضرورت ہے جو آپ پوری کر رہے ہیں۔ آپ نے میرے تعاون کی بڑی معقول قیمت ادا کی ہے اور شمی کے معاملے میں آپ نے جس طرح سے میری مدد کی ہے۔ اسے میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ آج میں آپ کو ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ جنرل کی سیف کے اندر ایک ایسا خانہ بنا ہوا ہے جو ایک علیحدہ چابی سے کھلتا ہے۔ ایک روز میں نے جنرل کو اس خانے میں ایک نقشہ، جس پر مختلف رنگوں سے نشان اور لکیریں لگائی گئی تھیں، اور چند کاغذات رکھتے ہوئے دیکھ لیا۔ جنرل اسی وقت میٹنگ سے فارغ ہوا تھا۔ جب مجھے ٹائپنگ کے لئے بلایا گیا تو جو کچھ میں نے ٹائپ کیا اس کی کاپیاں بنا کر پردھان منتری اور نیول اور ایئر چیف ہیڈ کوارٹرز میں بھیج دی گئی تھیں اور ٹائپ شدہ اصل کاغذ جنرل نے نقشے کے ساتھ ہی رکھوا دیئے تھے۔ ٹائپ کرنے کی وجہ سے مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ پاکستان پر حملہ کرنے کا مفصل پلان تھا۔ وہ نقشہ اور کاغذات اب بھی سیف میں محفوظ ہیں اور میں کوشش کروں گا کہ وہ بھی آپ کو لا دوں اور مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے اس کام کا بھی بہت معقول معاوضہ دیں گے''۔ لیفٹیننٹ نے آج پہلی بار پاکستان سے میری وابستگی کا ذکر کیا تھا اور میں حیران تھا کہ آج سے پہلے اس نے یہ بات کیوں نہ کی حالانکہ بے تکلفی کے کئی ایسے وقت آئے تھے جب وہ یہ بات مجھ سے کر سکتا تھا۔ شاید میری دھمکیوں اور مسلح ساتھیوں کی گولیوں کے خوف نے اسے بولنے کی جرأت نہ دی تھی اور آج آخر وہ دل کی بات زبان پر لے ہی آیا۔

میں نے اسے کہا ''دیکھو لیفٹیننٹ یہی بہتر ہے کہ جیسے سب کچھ جانتے ہوئے بھی ہم دونوں نے اس مسئلے پر کبھی بات نہیں کی، آئندہ بھی نہ کریں تمہیں صرف اتنا یقین دلاتا ہوں کہ مالی تعاون کے علاوہ تمہاری سیفٹی اور سیکورٹی کا ذمہ بھی لیتا ہوں۔ اگر تم کسی مصیبت میں پھنس گئے تو تمہیں بچانے کے لئے بے شک ہمیں درجنوں لوگوں کی زندگی لینی پڑے ہم پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ جنگی نقشے اور متعلقہ کاغذات کا ہم تمہیں بہت معقول معاوضہ دیں گے بشرطیکہ وہ ہمارے لئے کارآمد ہوں۔ تھوڑی دیر مزید گفتگو کرنے کے بعد میں ریسٹورنٹ سے چلا آیا۔ اب تک سب کام حسب منشا ہو رہا تھا۔ اب لیفٹیننٹ کی طرف سے کامیابی کی خبر کا انتظار تھا اور میرا ایک ایک لمحہ یہی خبر سننے کے انتظار میں بے چینی سے گزر رہا تھا۔

اس ملاقات کے بعد لیفٹیننٹ نے میرے ساتھیوں کو مقررہ دنوں میں دو مرتبہ ڈاک کے پیکٹ دیئے جن کی ہم نے حسب معمول کاپیاں اور فوٹو بنا لئے۔ مجھے اچھی طرح سے یہ یاد ہے کہ ہفتے کا دن تھا۔ سردی خاصی بڑھ چکی تھی۔ اور میں اپنے کمرے میں صوفے پر نیم دراز اخبار پڑھ رہا تھا۔ سہ پہر چار بجے کے قریب فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف میرا ایک ساتھی بول رہا تھا۔ خوشی سے اس کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ اس نے کہا صاحب ڈاک مل گئی ہے اور سب کام ہو گیا ہے۔ اس کی آواز سے ہی مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ لیفٹیننٹ نے معرکہ سر کر لیا ہے میں نے اپنے ساتھی کو کہا کہ وہ فوراً گھر چلا جائے میں وہیں پہنچ رہا ہوں۔ خوشی کے مارے میرا بھی برا حال تھا۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کئے اور ٹیکسی لے کر ساتھیوں کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ سارے رستے میں یہی سوچتا رہا کہ خدائے ذوالجلال والاکرام کے کرم سے ہمارے رستے خود بخود کھلتے جا رہے ہیں اور مشکل سے مشکل کام اللہ پاک ہمارے لئے آسان کر رہا ہے۔ اور اتنی بڑی کامیابی ملنے کی وجہ محض اس ذات کریم کا رحم و فضل ہے۔

ساتھیوں کے گھر پہنچا تو انہوں نے دروازہ بند کر کے تھیلا میرے سامنے الٹ دیا۔ میرے سامنے فرش پر تاراپور کے ایٹمی بجلی گھر اور ٹاٹا ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی متعلقہ دو فائلیں۔ چار عدد ڈائریاں جن کے کور پر سرخ پٹی اور چار ستارے بنے ہوئے تھے اور ایک علیحدہ پیکٹ میں سے نکالے ہوئے کاغذات اور نقشہ اور معمول کی ڈاک کا پیکٹ پڑے تھے۔

انتہائی اہم معلومات کا خزانہ میرے قدموں میں پڑا تھا۔ سب رب العزت کا کرم تھا کہ اتنے قلیل وقت میں اتنی کم محنت اور جدوجہد کے عوض بغیر کوئی جانی نقصان اٹھائے ہمیں اتنی بڑی کامیابی نصیب ہو گئی تھی۔ ہم پانچوں ساتھیوں میں کوئی بھی پیشہ ور جاسوس یا اس کام کا سابقہ تجربہ رکھنے والا نہ تھا اور ہم دشمن ملک کے دفاعی مرکز میں سیکورٹی کے مضبوط اور مربوط نظام کو توڑ کر نہ صرف انتہائی اہم دفاعی راز بلکہ دشمن کا جنگی پلان بھی حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ ہم نے سب سے پہلے بارگاہ رب العزت میں شکرانے کے نفل ادا کئے اور پھر اس خزانے کی تفصیلاً جانچ پڑتال شروع کر دی۔

راہ حق کے شہید

تاراپور کے ایٹمی پلانٹ کی فائلوں میں تاریخ وار افزودہ یورینیم کے پلانٹ سے ٹاٹا ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے جانے والے ریڈیو ایکٹیوٹی سے محفوظ ٹرکوں کی روانگی اور منزل پر پہنچنے کی تفصیلات اور دوران سفر سیکورٹی کے انتظامات کی تفصیل درج تھی۔ دوران سفر ایک بار ایک ٹرک کے بارش کی وجہ سے پھسلنے ہالٹ جانے اور اس حادثے میں ٹرک ڈرائیور اور ایک سیکورٹی گارڈ (کمانڈو) کے ہلاک ہونے اور تین زخمی ہونے والے گارڈز کے ریڈیو ایکٹیوٹی سے متاثر ہونے کے علاوہ تاراپور پلانٹ کے چیف انجینئر اور ٹاٹا ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے سیفٹی انچارج کو آئندہ کے لئے احتیاطی تدابیر پر مبنی خط و کتابت موجود تھی۔ ہر ٹرک میں لادے جانے والے افزودہ یورینیم کی سلاخوں کی تعداد اور وزن اور وصولی کی رسیدیں بھی موجود تھیں۔ ٹاٹا ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے چیف کے لکھے ہوئے دو خطوط بھی موجود تھے جن میں کامیاب ٹرانسپورٹیشن اور سیکورٹی کے FOOL PROOF انتظامات کرنے پر آرمی چیف کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔ اپنے تجربات کی کامیابی اور عنقریب بھارتی افواج کو ایک ''تحفہ'' دینے کا مژدہ بھی سنایا گیا تھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان فائلوں میں درج معلومات کے پاکستان پہنچنے پر پاکستانی سائنس دان بھارت کی ایٹمی ریسرچ میں کامیابی کی حدود متعین کرنے میں ضرور کامیاب ہو سکتے تھے۔ پاکستان واپسی پر مجھے اپنے ذرائع سے معلوم ہوا کہ راجستھان میں بھارتی ایٹمی دھماکے کا پاکستان کی TOP BRASS کو آٹھ ماہ قبل ہی علم ہو چکا تھا۔ راجستھان میں بھارتی افواج کی نقل و حرکت، خاصے بڑے علاقے کو RESTRICTED ZONE بنانے، آبادی کے انخلا اور سرنگوں کی کھدائی کے علاوہ ہماری بھیجی گئی فائلوں میں درج ٹاٹا ریسرچ انسٹیٹیوٹ میں بھیجے گئے افزودہ یورینیم کے وزن سے ہمارے سائنسدانوں نے متوقع بھارتی ایٹمی دھماکے کے حجم کا صحیح اندازہ لگا لیا تھا اور ایک مفصل رپورٹ پاکستان کے اس وقت کے چیف ایگزیکٹو مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو بھی بھیج دی گئی تھی۔ حکومت پاکستان نے UNO، امریکی صدر اور مسلم ممالک کے سربراہوں کو بھی اس رپورٹ کی کاپیاں بھیجی تھیں۔ پاکستانی پریس نے بھی بھارت کے متوقع ایٹمی دھماکے کے بارے میں اس انداز میں کالم اور خبریں شائع کی تھیں کہ پاکستانی قوم کے دلوں میں بے خبری میں اچانک بھارتی دھماکے کی دہشت نہ پیدا ہونے پائے۔ اس طرح بھارت کا اچانک دھماکہ کر کے پاکستانی قوم میں خوف اور دہشت پیدا کرنے کا پلان بالکل ناکام ہو گیا اور اس پلان کی ناکامی میں ہماری بھیجی ہوئی معلومات کا بھی کچھ عمل دخل تھا۔

جنرلوں کی چار ٹاپ سیکرٹ ڈائریاں میں بار بار دیکھتا تھا۔ ان ڈائریوں میں سقوط ڈھاکہ کے بعد بھارتی افواج کی نقل و حرکت سے متعلق احکامات کے علاوہ 6 نئے ڈویژن جن میں 5 انفنٹری اور ایک آرمرڈ ڈویژن تھا، کے متعلق مکمل معلومات تھیں جن کے مطابق انفنٹری ڈویژنز میں ہر ایک میں ایک چوتھائی پرانے ڈویژنز کی نفری شامل کرنے اور اتنی ہی تعداد میں نئے ڈویژنز کی نفری پرانے ڈویژنز میں کھپانے کے احکامات تھے۔ اسکے علاوہ ایک نیا MOUNTAIN DIVISION (پہاڑی ڈویژن) RAISE کرنے کے احکامات بھی تھے۔ جو جدید ترین روسی اسلحہ اور ہلکی توپوں سے مسلح ہوگا۔ یہ ڈویژن یقیناً کشمیری عوام کی ''سرکوبی'' کے لئے تیار کیا جا رہا تھا۔ جو سقوط ڈھاکہ کے بعد اپنی آزادی کے خواب سے بھی محروم ہو چکے تھے۔ ایک خط جنرل نے لیپا سیکٹر کے بریگیڈ کمانڈر کو لکھا تھا جس میں وادی لیپا پر قبضہ برقرار رکھنے کی سختی سے ہدایت کی گئی تھی سقوط ڈھاکہ سے پہلے وادی لیپا پاکستان کے زیر قبضہ تھی۔ سیز فائر لائن کو شملہ معاہدے کے وقت کنٹرول لائن کا نام دیا گیا۔ اندرا گاندھی نے سیز فائر لائن کو سیدھا کرنے کے بہانے وادی لیپا کو بھی مقبوضہ کشمیر میں شامل کر لیا تھا۔ اس وقت حکومت پاکستان کو بامر مجبوری بھارتی فیصلہ منظور کرنا پڑا کیونکہ اس جنگ کے دوران بھارت نے نہ صرف مغربی پاکستان کا بھی کچھ سرحدی ٹکڑا اپنے قبضے میں کر لیا تھا بلکہ ہمارے نوے ہزار فوجی بھی بھارت کی قید میں تھے۔ بھارت ان حالات میں پاکستان سے اپنی مرضی کے فیصلے کروانے کی پوزیشن میں تھا۔ پاکستان کو اپنے قیدی واپس لینے اور بھارت سے زیر قبضہ زمین واپس لینے کیلئے یہ فیصلہ کرنا پڑا۔ بھارت سے واپسی پر مجھے ذوالفقار علی بھٹو کے ایک باڈی گارڈ راجہ سرفراز جو کہ DSP تھے اور بعد میں DIG ہو کر ریٹائر ہوئے، پتہ چلا کہ شملہ معاہدہ آخر وقت تک کھٹائی کا شکار تھا۔ پاکستانی ڈیلی گیشن میں شامل افراد نے واپسی کے لئے اپنا سامان پیک کر لیا تھا۔ صبح پاکستانی وفد کی واپسی تھی۔ اندرا گاندھی نے پاکستانی قیدیوں کی رہائی کے عوض پاکستان سے جو مطالبہ کیا تھا وہ اتنا بڑا تھا کہ پاکستانی قوم اور حکومت کبھی اسے تسلیم نہ کر سکتی تھی۔ رات کو کھانے کے بعد شملہ کے سرکٹ ہاؤس میں اندرا گاندھی اور بھٹو چہل قدمی کیلئے باغ میں گئے۔ وہاں پھر جنگی قیدیوں کا ذکر چھڑ گیا۔ بھٹو نے کہا ''مسز گاندھی۔ میں پاکستانی قیدیوں کی واپسی میں دلچسپی نہیں رکھتا ہوں۔ جنگی قیدی بننے کے بعد وہ افواج پاکستان کیلئے بیکار ہو چکے ہیں۔ اگر وہ پاکستان کو لوٹا دیئے گئے تو ہمیں انہیں ریٹائر کر کے نہ صرف پنشن دینی ہوگی بلکہ 90 ہزار روزگاروں کا مسئلہ بھی کھڑا ہو جائے گا۔ بہتر ہے آپ انہیں اپنے پاس ہی رکھیں اور جنیوا کنونشن کے مطابق انہیں رہائش، خوراک، لباس اور دوسری سہولتیں مہیا کرتی رہیں'' یہ بھٹو صاحب کا ترپ کا پتا تھا۔

اندرا گاندھی ایک تو ہندو عورت تھی۔ دوسرے 90 ہزار پاکستانی قیدیوں کو ہمیشہ کے لئے رہائش خوراک اور دیگر سہولتیں اور ان کی نگرانی پر اٹھنے والے اخراجات...... اندرا گاندھی یہ سن کر بالکل ہی ڈھے گئی اور ان سے اپنی ڈیمانڈ واپس لیتے ہوئے فوری طور پر شملہ معاہدہ تیار کرنے کا حکم دیا۔ سوئے ہوئے سیکرٹریوں کو جگایا گیا اور رات دو بجے تک معاہدے کی نوک پلک سنوار کر اسے دستخطوں کے لئے دو سربراہوں کو پیش کیا گیا۔ رات کے پہلے پہر معاہدے پر دونوں سربراہوں کے دستخط ہوئے۔

قسط نمبر 20

غازی

ذکر وادی لیپا کا ہو رہا تھا۔ کنٹرول لائن کے نقشے میں وادی لیپا بھارت کے پاس چلی گئی تھی۔ اس سیکٹر کا پاکستانی کمانڈر ایک نڈر اور سر پھرا پاکستانی بریگیڈیئر تھا۔ وادی لیپا تو بھارت کو دے دی گئی لیکن یہی بات بریگیڈیئر کے دماغ میں فٹ نہ بیٹھ سکی۔ اس نے خفیہ طور پر اپنی تیاری جاری رکھی اور ایک رات اپنے پورے بریگیڈ کی طاقت سے وادی لیپا پر حملہ کر دیا۔ بھارتی جنرل کا اپنے بریگیڈیئر کے نام خط ہمارے ہاتھ لگ چکا تھا جس میں اسے وادی لیپا پر ہر حالت میں قبضہ برقرار رکھنے کا حکم دیا تھا۔ وہاں بھارتی فوج بھی چوکی اور بلندی پر پکے مورچوں میں تیار STAND-2 پوزیشن میں تھی۔ گھمسان کا رن پڑا۔ حملہ رات کے وقت شروع میں کیا گیا تھا اور صبح تک بھارتی افواج کے ایک ہزار سے زیادہ جوان اور افسر پاکستانی مجاہدوں کی گولیوں کا شکار ہو چکے تھے جب کہ پاکستان کے تقریباً چار سو جوان اور افسر اس معرکے میں شہید ہوئے۔ صبح تک پاکستانی افواج نے نہ صرف وادی لیپا بلکہ وادی کے اردگرد پہاڑیوں پر بھی جہاں بھارتی افواج نے پکے بنکرز بنا رکھے تھے، قبضہ کر لیا۔ بھارت خاموشی سے اپنی اس شکست کو پی گیا۔ وادی لیپا اور اس کے گردونواح کی پہاڑیاں آج تک پاکستان کے قبضے میں ہیں۔ وادی لیپا میں شہید ہونے والے مجاہدوں کی بہادری کے اعتراف میں پشاور اور نوشہرہ کے علاوہ کشمیر کے کئی رجمنٹل سینٹرز میں لیپا میس بنائے گئے ہیں۔ چونکہ یہ ایک غیر اعلانیہ حملہ تھا اور رہائی کمانڈ کی اجازت کے بغیر کیا گیا تھا۔ اسلئے بہادری کے محیر العقل کارنامے دکھانے والوں کو میڈل تو نہ دیئے جا سکے لیکن ان کی بہادری کے واقعات نے پاکستانی قوم کو تا قیامت ان کا ممنون احسان بنا دیا۔

بھارت سے واپسی کے بعد ایک روز میں پشاور لیپا میس میں گیا۔ ایک کمرے میں سے نسیم بیگم کے انتہائی پرسوز قومی ترانے کی آواز آ رہی تھی۔ ”اے راہ حق کے شہیدو، وفا کی تصویرو۔ تمہیں وطن کی ہوائیں سلام کہتی ہیں“...... میں دروازہ کھٹکھٹا کر اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ ایک کیپٹن نے ریکارڈ پلیئر پر یہ ریکارڈ لگا رکھا تھا۔ تعارف کے بعد اس نے بتایا کہ لیپا پر حملے کے وقت وہ سیکنڈ لیفٹیننٹ تھا۔ اس کی کمپنی ایڈوانس پوزیشن میں تھی۔ جب وہ دشمن کی ہیوی مشین گنز کی رینج میں پہنچی تو دشمن نے اچانک ان پر فائر کھول دیا۔ 137 کی کمپنی میں سے صرف 5 زندہ بچ سکے جن میں سے ایک وہ بھی تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ آپ یقین نہیں کر سکیں گے کہ ہم کس بے جگری سے لڑے۔ بھارت کے بنکر وادی کی پہاڑیوں اور ٹیلوں میں بنے ہوئے تھے اور انہیں خاموش کرنے کی ہمیں کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ ہمارا ایڈوانس رک چکا تھا اور بھارت کو کسی لمحے بھی کمک مل سکتی تھی۔ ہماری کمپنی کے چند جوانوں نے بھارتی بنکرز کو خاموش کرنے کا بیڑا اٹھایا اور وہ ایک محفوظ جگہ سے ان پہاڑیوں اور ٹیلوں پر پہنچ گئے، جن میں بھارتی بنکرز بنے ہوئے تھے جو ہینڈ گرینیڈ ان کے پاس تھے وہ پن نکالنے کے بعد 6 سیکنڈ میں پھٹتے تھے۔ ان ٹیلوں اور پہاڑیوں سے انہوں نے گرینیڈ نیچے پھینکے لیکن 6 سیکنڈ میں وہ بھارتی بنکرز سے بہت نیچے جا کر پھٹتے تھے۔ ان بنکرز میں ہیوی مشین گنوں کے علاوہ ساڑھے تین انچ کے مارٹر، گولہ بارود اور بھارتی فوجی موجود تھے۔ ہمارے جوانوں نے آپس میں مشورہ کیا اور خود سے اپنا اور بھارت کے بنکرز کے فاصلے کا اندازہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ گرینیڈ کی پن نکال کر اور لیور سے انگوٹھا ہٹا کر دو چار سیکنڈ تک گرینیڈ کو اپنے ہاتھ میں رکھیں گے اور پھر بھارتی بنکرز کی طرف اچھال دیں گے۔

اس PROCESS کے دوران گنتی کی ٹائمنگ میں غلطی کی وجہ سے ہمارے ایک جوان کے ہاتھ میں ہی گرینیڈ پھٹ گیا اور وہ شہید ہو گیا۔ باقی پانچوں نے صحیح ٹائمنگ پر گرینیڈ پھینکے اور وہ بالکل صحیح جگہ پر پھٹے۔ گرینیڈوں سے تو بھارتی نقصان کم ہوا لیکن بھارتی بنکروں میں موجود گولہ بارود پھٹنے سے قیامت بپا ہو گئی۔ ٹیلوں اور پہاڑیوں کا اوپری حصہ بھارتی گولوں اور گولہ بارود کے دھماکوں کی وجہ سے پھٹ گیا اور بھارتی سورماؤں کی جلی ہوئی لاشیں فضا میں دس گز سے زیادہ بلند ہو کر زمین پر گرنے لگیں۔ ہمارا ایک جوان ایک ایسی ہی جلی لاش کی زد میں آ کر اپنا بازو تڑوا بیٹھا۔ صبح سویرے وادی لیپا اور اردگرد کی پہاڑیوں اور ٹیلوں پر پاکستانی پرچم لہرانے لگا اور بھارت اپنے نقصان سے اتنا خوفزدہ ہوا کہ وادی لیپا اس کی یادداشت سے ہی نکل گئی اور اس نے یہ وادی واپس لینے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ میں کیپٹن کے جذبات کو سراہتے ہوئے میس سے باہر چلا آیا لیکن وادی لیپا کے پس منظر میں ”اے راہ حق کے شہیدو، وفا کی تصویرو، تمہیں وطن کی ہوائیں سلام کہتی ہیں“۔ نسیم بیگم کا گایا ہوا یہ ترانہ کئی روز تک میرے کانوں میں گونجتا رہا۔

بات ہو رہی تھی جنرلوں کی چار ڈائریوں کی۔ ان ڈائریوں کا ایک ایک صفحہ بیش قیمت معلومات سے بھرا ہوا تھا۔ سب سے اہم چیز بھارتی حملے کا مکمل پلان اور بھارتی بارڈر پر بھارتی فوجوں کی پوزیشن، چار مختلف جگہوں سے بیک وقت حملہ کرنے کی ARROW بنا کر نشاندہی، حملہ آور فوجوں کیلئے توپ خانے کا کور، انفنٹری ڈویژنز میں پہلے سے موجود ٹینک رجمنٹس کی تعداد، ایک پورے ٹینک ڈویژن کا سیالکوٹ اور لاہور سیکٹر پر بیک وقت حملہ اور پاکستانی افواج کے ممکنہ جوابی حملے کی جگہوں کا تعین کیا گیا تھا۔ اس نقشے اور متعلقہ کاغذات میں ان کی تفصیل دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہم بھارتی کمانڈ کے OPERATION ROOM میں موجود ہیں۔ جہاں جنگ کے دوران ہر ایک تفصیل موجود ہوتی ہے۔ کاغذات کے مطابق بھارتی نیوی اور ایئر فورس نے کراچی کو اپنی گولہ باری کا نشانہ بنانا تھا اور صوبہ سندھ کا سڑک اور ریل سے باقی پاکستان سے رابطہ کاٹنا تھا۔ بھارتی BORDER SE-(BSF) CURITY FORCE باقاعدہ افواج کے ساتھ مل کر حیدر آباد اور کراچی پر قبضہ کرنا تھا۔ بھارتی وزیر اعظم کو بھیجے گئے خط میں یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ اگر پلان کے عین مطابق حملہ کیا گیا تو کامیابی 80 فیصد یقینی تھی۔ کامیابی کی صورت میں مفتوح علاقوں میں فوجی گورنر مقرر کرنے کیلئے چند جرنیلوں کے ناموں کی سفارش کی گئی تھی۔ ڈاک کے پیکٹ میں حسب معمول اہم نوعیت کے خطوط تھے۔

میں نے ساتھیوں کو فوری طور پر ان سب کی تصویریں اور کاپیاں بنانے پر لگا دیا۔ نقشے کی بھی کئی تصویریں اتاری گئیں لیکن میں مطمئن نہیں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس نقشے کی ہو بہو کاپی بنائی جائے۔ نقشے کی کاپی کیسے بنائی جاتی ہے مجھے اور میرے ساتھیوں کو اس بارے میں کچھ علم نہ تھا۔ میں اللہ کا نام لے کر شہر میں کتابوں اور نقشوں کے ایک بڑے اسٹور پر چلا گیا۔ وہاں ہر جگہ کے نقشے موجود تھے۔ میں نے بحر الکاہل کے ایک نسبتاً غیر معروف جزیرے پاپائیو کا نقشہ مانگا جو بڑی تلاش کے بعد سیلزمین نے مجھے لا کر دیا۔ میں نے کہا کہ مجھے اس جیسے 6 اور نقشے درکار ہیں۔ سیلزمین نے معذرت کی کہ صرف ایک ہی نقشہ موجود ہے۔ میں نے کہا کہ نقشے کو ہو بہو کاپی کرنے کیلئے جو کاغذ استعمال ہوتا ہے مجھے وہ چاہئے اس نے اس کاغذ کا نام غالباً TRACING PAPER بتایا۔ میں نے اس کاغذ کا ایک رول 12 انچ اور چوبیس انچ کیلئے، پرکار، مختلف اقسام کی پنسل اور مختلف رنگوں کے HI-LI-TER، ایک بورڈ اور نقشے کو بورڈ پر لگانے کے لئے پنیں خریدلیں اور ساتھیوں کے گھر لوٹ آیا۔ کاپی کرنے والے کاغذ کا رول شفاف تھا۔ اسے نقشے کے اوپر جما کر لگانے سے نقشہ صاف دکھائی دیتا تھا۔ میں نے میٹرک تک جومیٹری پڑھی تھی اور اسی ابتدائی علم کی بنا پر میں نے نقشے کی دو کاپیاں بنانے کا کام سنبھالا۔ یقین جانئے کہ میری زندگی میں نقشے کی کاپی بنانے کی یہ پہلی کوشش تھی۔

میں نے لکڑی کے بورڈ پر نقشہ اور اس کے اوپر TRACING PAPER پنوں سے جما کر لگا دیا اور اللہ کا نام لے کر نقشے میں بنی پاکستان اور بھارت کی بارڈر لائن بنائی اور چند گھنٹوں کی محنت کے بعد نقشے کو ہو بہو بمعہ ہر ایک تفصیل اور رنگوں کے TRACING PAPER پر منتقل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ چند منٹوں کے توقف کے بعد میں نے دوسرا TRACING PAPER اسی نقشے کی ایک اور کاپی بنانے کے لئے لگایا۔ اتنی بڑی کامیابی نے ہمیں بھوک اور تھکن کا احساس بھی نہ ہونے دیا تھا۔ ہمارا ایک ساتھی ہر گھنٹے کے بعد چائے اور بسکٹ ہمیں پیش کرتا تھا جس سے ہم تر و تازہ ہو جاتے تھے۔ میرے نمبر ٹو نے بتایا کہ چھوٹے کیمرے کی فلمیں ختم ہوئی چاہتی ہیں۔ میں نے ان فلموں کے رول پر تحریر ان کا سائز اور کمپنی کا نام پڑھ کر اپنے نمبر ٹو کو کہا کہ کناٹ سرکس میں کوڈک کی ایجنسی اور سیل شاپ ہے وہاں جا کر پتہ کرے شاید اس سائز کی فلم وہاں مل جائے۔ میں نے اسے کیمرے میں پڑنے والے سیل بھی لانے کا کہا۔ ایک گھنٹے کے اندر ہی میرا نمبر ٹو خوش خوش واپس لوٹا اس نے سیل شاپ میں اس سائز کی موجود ساری کی ساری 32 فلمیں خرید لی تھیں اور کیمرے کیلئے فالتو سیل بھی لے آیا تھا۔ ہم اپنے کام میں جتے ہوئے تھے۔ سلیٹوں سے دھڑا دھڑ کاپیاں بن رہی تھیں۔ کیمرے سے ہر ہر صفحے کے دو دو فوٹو بنائے جا رہے تھے اور میں نقشے کی دوسری کاپی بنانے میں مشغول تھا۔ جب ہم نے کام ختم کیا تو آدھی سے زیادہ رات بیت چکی تھی اب ہمارے پاس ڈائریوں کے ہر صفحے کی دو کاپیاں اور کیمرے سے اتارے گئے دو دو عکس موجود تھے۔ تارا پور کی فائلوں کی بھی دو دو کاپیاں اور دو دو عکس موجود تھے۔ نقشے کی ہو بہو دو کاپیاں TRACING PAPER پر بن چکی تھیں۔ کام ختم ہوا تو ہمیں بھوک اور تھکن کا احساس ہوا۔ میرے ساتھیوں نے بتایا کہ گھنٹہ گھر کے قریب ایک درمیانے درجے کا ریسٹورنٹ رات بھر کھلا رہتا ہے۔ میں نے ایک ساتھی کو کھانا لانے اور دوسرے کو اسے کور دینے کے لئے بھیجا اور ان کے آنے سے پہلے ہم نے یشونت کی واپس کرنے والی فائلیں، نقشہ اور متعلقہ کاغذات، ڈائریاں اور ڈاک علیحدہ کر کے تھیلے میں ڈال دیں۔ پاکستان بھیجنے والی ڈاک، نقشہ، ڈائریوں کی کاپیاں اور فلم رول علیحدہ کر کے ایک پیکٹ بنایا اور اپنے پاس رکھنے والی کاپیاں اور نقشہ بنا کر اسے الگ پیکٹ میں بند کر دیا۔ جب ہم کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو رات اتنی گزر چکی تھی کہ میں نے ساتھیوں کے ہمراہ ہی شب بسری کا فیصلہ کیا۔ یشونت کو ڈاک واپس کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔ میں نے ایک چٹ پر اسے اگلے دن یعنی اتوار کو شام 7 بجے چاوڑی بازار کے ریسٹورنٹ میں ملنے کے لئے کہا اور ساتھیوں سے کہا کہ علی الصباح ڈاک کا تھیلا اور میری چٹ یشونت کو گھر پر پہنچا دیں۔

اگلی صبح جب میں بیدار ہوا تو آٹھ بج چکے تھے اور میرے ساتھی یشونت کو ڈاک کا تھیلا دے کر واپس آ چکے تھے۔ ناشتہ کرنے کے بعد میں اپنے ہوٹل روانہ ہونے ہی والا تھا کہ مجھے خیال آیا کہ 10 بجے پاکستان سے ہمارا وائرلیس پر رابطہ ہونا ہے۔ میں نے وائرلیس آپریٹر کو کہا کہ رابطہ ہونے پر JACK POT-SEND MOST RELIABLE TO COLLECT کوڈ میں MESSAGE RECEIVED-ALL OK. کے علاوہ بھی ٹرانسمٹ کرے۔ یہ پیغام بھیجنے کے بعد میں اپنے ہوٹل چلا آیا اور لمبی تان کر سو گیا۔ شام کو مجھے یشونت سے ملنا اور اس کی ”آرزو“ کی تکمیل کے سلسلے میں اپنا کردار ادا کرنا تھا۔

شام کو میں نے ہوٹل کے لاکر سے پیسے نکالے اور 7 بجے چاوڑی بازار کے ریسٹورنٹ میں پہنچ گیا یشونت میرے انتظار میں وہاں پہلے ہی سے بیٹھا ہوا تھا۔ آج اس کی حالت دیدنی تھی۔ اپنی آرزو کی تکمیل اتنے قریب آنے کی خوشی اور جو کام وہ کر بیٹھا تھا اس کا خوف بیک وقت اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ ان دونوں کیفیتوں پر قابو پانے کی کوشش میں اس نے بہت زیادہ چڑھا رکھی تھی۔ میں نے اسے اس کی کامیابی پر مبارکباد دی تو وہ کہنے لگا ”صاحب جس روز جنرل صاحب چھٹی سے واپس آئے اسی روز اپنی ڈاک پڑھنے کے بعد انہوں نے مجھے ٹائپنگ کیلئے بلا لیا۔ میں نے جنرل صاحب کی مطلوبہ فائل نکالنے کیلئے سیف کھولی تو سیف کی چابیاں بجائے سیف کے تالے میں چھوڑنے کے اپنی جیب میں ڈال لیں اور ٹائپ کرنے کے دوران تینوں چابیوں کے نقش صابن پر اتار لئے اور جب کام ختم ہو گیا تو سیف بند کر کے چابیاں جنرل صاحب کو لوٹا دیں۔ چابیوں کے نقش تو میرے پاس تھے لیکن چابیاں بنوانے میں بہت دشواری پیش آئی۔ چابیاں بنانے والی دکانوں پر گیا تو انہوں نے نقش کی چابی بنانے سے انکار کر دیا۔ ایک اور دکان پر گیا تو اس نے کہا یہ خطرناک کام ہم نہیں کرتے۔ چھتہ لال میاں میں بشیرا گیرج والے کے پاس جاؤ۔ میں چھتہ لال میاں میں ڈھونڈتا ہوا بشیرے کی گیرج پر پہنچا تو اس نے نقش دیکھ کر پوچھا کہ کس نے بھیجا ہے۔ میں ڈرا ہوا تو بہت تھا یونہی کہہ دیا کہ بڑے صاحب نے بھیجا ہے۔ بشیرے کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔ کہنے لگا اچھا تو بڑے صاحب کو پھر کوئی سیف کھولنی ہے۔ میں نے سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا تو بشیرا مجھے گیرج کے پچھلے حصے میں لے گیا۔ جہاں لیتھ مشین لگی ہوئی تھی۔ دو گھنٹے میں اس نے تینوں چابیاں بنا کر مجھے دے دیں اور کہا کہ بڑے صاحب کو کہنا کہ مال میں میرا حصہ نکال کر الگ رکھ دیں۔ میں کسی کو بھیج کر منگوا لوں گا۔ خود یہاں نہ آئیں۔ لوگ شک کرتے ہیں۔ میں حیران اور سراسیمہ تھا کہ جس بڑے صاحب کے مغالطے میں بشیرے نے چابیاں بنا کر دی ہیں جب انہیں پتہ چلے گا تو معلوم نہیں وہ میرے ساتھ کیا سلوک کریں۔ چابیاں لے کر میں بھاگم بھاگ اس علاقے سے نکلا اور فیصلہ کر لیا کہ آئندہ کبھی چھتہ لال میاں نہیں جاؤں گا۔ ہفتے کو کام کا آدھا دن ہوتا ہے جنرل صاحب کے جانے کے بعد بھگوان کا نام لیکر میں ان کے کمرے میں گیا۔ چابیاں بالکل صحیح بنی تھیں۔ سیف کھولنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی اور چند منٹ میں، میں فائلیں، ڈائریاں، نقشہ اور کاغذات اپنے تھیلے میں ڈال کر کمرے سے باہر آ گیا۔ اب ایک مشکل باقی ہے کل سوموار کو مجھے دفتر جلد جا کر جنرل صاحب کے آنے سے پہلے سب چیزیں سیف میں واپس رکھنی ہیں۔ یشونت نے مجھے یہ سب تفصیل اپنی بہادری دکھانے اور مجھ سے داد پانے کیلئے سنائی تھی۔ میں نے بھی اسے بھرپور داد دی اور کہا کہ جب اتنا مشکل مرحلہ تم نے خوش اسلوبی سے طے کر لیا تو باقی بھی بہت آسانی سے کر لو گے۔

میں چائے پی رہا تھا اور یشونت کو میری خاموشی کھٹک رہی تھی۔ کہنے لگا ”صاحب آپ کا کام تو میں نے سر ہتھیلی پر رکھ کر پورا کر دیا ہے۔ اب وہ شمی......“ اتنا کہہ کر وہ رک گیا۔ وہ میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں خاموشی سے اس کی اس امید و بیم کی کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میں نے خاموشی سے چائے ختم کی۔ میری خاموشی کا چند منٹ کا وقفہ یشونت کیلئے صدیوں پر بھاری پڑ رہا تھا۔

اس نے میرا بازو تھام کر ملتجیانہ لہجے میں کہا ”صاحب آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا“ میں مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور کہا ”یشونت بابو تم نے ہمارا کام کیا اور اب ہم تمہارا کام کرتے ہیں“ یہ سن کر یشونت بھی میرے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا۔ ریسٹورنٹ کا بل ادا کر کے ہم باہر آ گئے۔ میں نے اسے آگے آگے چلنے کا کہا۔ تھوڑی دیر میں ہی یشونت اور میں شمی کے بالا خانے پر پہنچ گئے۔ ہم نے شمی کی ماں کو پچھلے کمرے میں بلا لیا۔ یشونت جو شمی کی ماں کے سامنے پہلے بھیگی بلی بنا بیٹھا رہتا تھا۔ آج اس کے انداز ہی کچھ اور تھے اور وہ بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہا تھا۔ کافی دیر تک وہاں معاملات طے ہوتے رہے۔ بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ شمی کی ماں کو فی الحال مزید بیس ہزار روپے دیئے جائیں اور بقیہ رقم رسم کے طے ہونے کے دن اسے دی جائے گی۔ میں نے بیس ہزار یشونت کو دیئے اور یشونت نے وہ فوراً ہی شمی کی ماں کو دے دیئے۔ یشونت نے مطالبہ کیا کہ آج محفل کے دوران شمی کی ماں تمام تماش بینوں کے سامنے اس رسم کا اعلان کرے۔ شمی کی ماں کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں نے یشونت کے مطالبے پر دو ہزار اسے دیئے۔ یشونت وہیں بیٹھ گیا اور میں واپس چلا آیا۔ واپسی پر میں سوچ رہا تھا کہ ”زر، زمین اور زن، ہی ہر فساد کی جڑ ہے“ میں لفظ وطن سے غداری بھی فساد کے ساتھ شامل کر لیا جائے تو بہت مناسب رہے گا۔

اگلے دو روز میں بالکل فارغ رہا منگل کو یشونت نے حسب معمول ڈاک میرے ساتھیوں کو دی جس کی کاپیاں بنا کر ڈاک اسے لوٹا دی گئی۔ اب مجھے آئندہ بدھ کو پاکستان سے وائرلیس پیغام کا انتظار تھا۔ بدھ کی صبح ہی میں ساتھیوں کے گھر چلا گیا۔ مقررہ وقت پر وائرلیس سیٹ آن کیا۔ رابطہ قائم ہونے پر پاکستانی پیغام ملا جسے ڈی کوڈ کیا گیا۔ پیغام میں کہا گیا تھا کہ آئندہ اتوار گیارہ بجے ایک اسپیشل کوریئر جسے میں جانتا ہوں، اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مجھے سبزی منڈی ریلوے اسٹیشن پر ملے گا۔ تمام ڈاک اس کے حوالے کر دی جائے۔

میں نے اپنے ساتھیوں سے مشورے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ جنرل کی سیف سے حاصل شدہ نقشے، ڈائریوں اور فائلوں کی ایک ایک کاپی کے علاوہ یشونت سے متعلقہ تصاویر کی بھی ایک ایک کاپی اپنے پاس رکھی جائے اور شروع سے اب تک مشن کے دوران اپنے پاس رکھی جانے والی سب کاپیاں بھی پاکستان بھیج دی جائیں۔ ہم نے یہ کاپیاں اپنے پاس محض اس لئے رکھی تھیں کہ خدانخواستہ اگر کوریئر دوران سفر پکڑا جائے تو حاصل شدہ معلومات ضائع ہونے سے بچ جائیں اور ہم دوبارہ انہیں پاکستان پہنچانے کی کوشش کریں۔ اس بار بھی جنرل کی سیف سے حاصل شدہ انتہائی اہم معلومات کی ایک ایک کاپی اپنے پاس رکھنے کا فیصلہ کیا کہ اتوار کو ڈاک لے جانے والے اسپیشل کوریئر اگر کسی مشکل سے دوچار ہو جائیں تو معلومات کا یہ خزانہ ضائع ہونے سے بچ جائے۔ گزشتہ تمام ڈاک کی ریزرو کاپیاں بھیجنے کا ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمارے پاس کاپیوں کا ڈھیر کسی اچانک خطرے کی صورت میں ہماری MOBILITY کو کم کر سکتا تھا اور پکڑے جانے کی صورت میں ہمارے خلاف ایک مکمل ثبوت بن سکتا تھا اس کے علاوہ ہماری حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں دشمن اپنے منصوبوں کو تبدیل کر سکتا تھا یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ گزشتہ تمام کاپیوں کو ترتیب دے کر ایک علیحدہ پیکٹ بنائیں۔ شام تک یہ کام بھی مکمل ہو گیا۔ اسپیشل کوریئر کی آمد تک میں نے ساتھیوں کو ماسوا یشونت سے ڈاک لینے کے سب سرگرمیاں معطل کرنے کا کہا اور اپنے ہوٹل واپس چلا آیا۔

غازی

یشونت کی رسم کی ادائیگی آئندہ ہفتے کی شام ٹھہری تھی۔ میں نے یشونت کو بقیہ رقم بھی دیدی۔ میرے پاس دو تین روز فراغت کے تھے۔ چاند کی چودھویں تاریخ بھی دو دن بعد تھی۔ میں نے تاج محل آگرہ دیکھنے کا پروگرام بنایا اور اگلی صبح آگرہ کیلئے ٹرین پکڑ لی۔

انتہائی احتیاط اور حاضر دماغی کے باوجود اس سفر کے دوران مجھ سے ایک ایسی غلطی ہوئی جس کے متعلق میں آج بھی سوچتا ہوں تو ہنسی بھی آتی ہے اور اپنی غلطی کا متوقع انجام سوچ کر کانپ اٹھتا ہوں۔ ریل کا سفر میں ہمیشہ کوشش کرتا تھا کہ تھرڈ کلاس میں کروں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رش کی وجہ سے ہر کوئی جگہ بنانے اور اپنے سامان کی فکر میں مصروف ہوتا ہے اور دوسرے مسافروں کی طرف کم ہی متوجہ ہوتا ہے۔ مجھے ڈبے میں کھڑکی کے ساتھ سنگل سیٹ ملی۔ میرے سامنے کی سنگل سیٹ پہ ایک ہندو برہمن ماتھے پہ تلک لگائے الٹی دھوتی باندھے بیٹھا تھا۔ آگرہ پہنچنے سے قریب آدھ گھنٹہ قبل اس برہمن نے ڈھکن والی پیتل کی چمکتی ہوئی گڑوی نکالی اور ہاتھ کی اوک میں پانی انڈیل کر پینے لگا۔ میری پیاس بھی اچانک جاگ اٹھی۔ میں نے اس برہمن کو کہا۔ ”مہاراج اگر کشٹ نہ ہو تو ہمیں بھی جل پینے کو دے دیویں۔“ برہمن نے گڑوی میری طرف بڑھا دی۔ میں نے پانی اپنے ہاتھ کی اوک بنا کر پینا چاہا تو سارا پانی میرے ہاتھ کی انگلیوں کے خلا سے نیچے بہنے لگا۔ برہمن مجھے اس مشکل صورت میں گھرا دیکھ کر مسکرایا اور مجھے کہا ”مہاشے آپ گڑوی کو منہ لگا کر جل پی لیں۔“ میں نے گڑوی کو منہ لگا کر سیر ہو کر پانی پیا اور شکریہ کے ساتھ اسے گڑوی واپس کر دی۔ میں کھڑکی سے گزرتے ہوئے مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اچانک کوئلے کا ایک ذرہ میری ناک میں گھس گیا (بھارت میں اکثر ریلوے انجن کوئلے سے چلتے ہیں) مجھے چھینک آئی اور بے اختیار میرے منہ سے الحمدللہ نکلا۔ برہمن نے مجھے گھور کر دیکھتے ہوئے غصے بھری آواز میں پوچھا ”تم مسلمان ہو؟“ اسے اپنی گڑوی کے بھرشٹ ہو جانے کا غم اور غصہ تھا۔ مجھے کچھ اور نہ سوجھا تو میں نے اسے سرگوشی میں کہا ”خاموش رہو۔ اس ڈبے میں کچھ پاکستانی جاسوس سفر کر رہے ہیں۔ صرف انہیں متوجہ کرنے کیلئے میں نے یہ لفظ کہا ہے میں دہلی میں آئی بی (INTELI GENCEBU REAU) کا آفیسر ہوں اور دہلی سے ہی انہیں پہچاننے کی کوشش میں ہوں۔ برہمن حیران و ششدر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اپنے حواس پہ قابو پانے کی پوری کوشش کی لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ہم دونوں اسی کیفیت کا شکار تھے کہ گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی۔ یہ اسٹیشن راجہ کی منڈی تھا یعنی آگرہ کا مول اسٹیشن۔ اگلا آگرہ چھاؤنی تھا۔ میں ریل کے ڈبے سے باہر آ گیا۔ تاج محل دور سے دکھائی دے رہا تھا۔ حالات کے تحت میں نے تاج محل کی سیر کا پروگرام ملتوی کیا۔ چند منٹوں میں ہی گاڑی روانہ ہو گئی اور میں واپس دہلی جانے والی گاڑی کے انتظار میں ویٹنگ روم میں بیٹھ گیا۔ واپسی کیلئے میں نے سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لیا اور شام ڈھلنے سے پہلے دہلی پہنچ گیا۔

واپسی کے سفر کے دوران بھی میں پریشان رہا۔ دہلی پہنچ کر میں نے فیصلہ کیا کہ آگرہ جانے اور تاج محل دیکھنے کا پروگرام دو تین ماہ کیلئے بھول جاؤں۔ مجھے کیا خبر تھی کہ آئندہ چند روز میں ہی میرے ساتھیوں کو ایک ہنگامی مشن پورا کرنے کیلئے آگرہ جانا پڑے گا۔

اگلے روز صبح دس بجے عبدالکریم میرے ہوٹل میں آیا۔ اس نے بتایا کہ کرنل شنکر دو دن آگرہ میں رہ کر گزشتہ شام واپس لوٹا ہے۔ رات کو نشے میں کہہ رہا تھا کہ آگرہ سے پہلے پکڑے گئے پاکستانی جاسوسوں کا واقعہ ابھی ٹھنڈا ابھی نہیں ہوا تھا کہ دو نئے پاکستانی جاسوس آگرہ میں پکڑے گئے ہیں۔ ہیڈ کوارٹرز کی طرف سے اسے اس سلسلے میں آگرہ جانا پڑا۔ وہ بھارتی انٹیلی جنس کا شکوہ کر رہا تھا کہ جس جگہ انہیں تفتیش کیلئے رکھا گیا ہے وہ راجہ کی منڈی کے ریلوے اسٹیشن سے آگرہ کی جانب بنے ریلوے آؤٹر سگنل کے ساتھ ہی واقع ہے اور اسے ریسیو کرنے والے DMI (DIRECTORE MILITARY INTELLIGENCE) کے آدمیوں نے ریلوے اسٹیشن سے لے کر سیف ہاؤس تک ریلوے پٹڑی کے کنارے کنارے اسے پیدل چلایا۔

عبدالکریم نے اپنے متعلق پھر میری منت سماجت شروع کر دی۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ میں جلد ہی اس کیلئے کچھ کروں گا۔ کچھ اور باتیں کرنے کے بعد میں نے اسے دو سو روپے دیئے اور رخصت کر دیا۔ نئے پاکستانی جاسوسوں کے پکڑے جانے کی خبر نے مجھے پژمردہ کر دیا تھا۔ میں اپنے ساتھیوں کے گھر چلا گیا اور انہیں یہ خبر سنائی۔ میرے ساتھی جوان تھے، نڈر تھے اور جذبہ حب الوطنی سے سرشار تھے۔ یہ بات سن کر بھڑک اٹھے اور کہنے لگے کہ ان جاسوسوں کو چھڑوانے کیلئے ہمیں فوری کارروائی کرنی چاہئے۔ میرے تین ساتھی غیر شادی شدہ تھے۔ ان میں سے ایک کہنے لگا ”سر جب سے ہم بھارت میں داخل ہوئے ہیں ہم نے ذہنی طور پہ یہ تسلیم کر لیا ہے کہ ہم اپنے خون کا آخری قطرہ تک اپنے وطن کی حرمت اور حفاظت کیلئے نچھاور کر دیں گے۔ جو پکڑے جا چکے ہیں وہ بھی ہمارے بھائی ہیں اور یقیناً یہی جذبہ لیکر وہ بھارت میں داخل ہوئے ہوں گے۔ اگر ہم انہیں بچانے میں کامیاب ہو جائیں تو ہمارے لئے یہ اپنے مشن میں کامیابیوں سے زیادہ اہم ہوگا۔“ چوتھے ساتھی نے کہا ”سر اگر خدانخواستہ آپ یا ہم میں سے کوئی پکڑا جائے اور باقی ساتھیوں کو اس جگہ کا علم ہو جائے تو کیا ہم یونہی خاموش بیٹھے رہیں گے۔ گرفتار ہونے والے بھی ہمارے اپنے ہیں اور انہیں چھڑوانے کیلئے ہمیں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرنا چاہئے۔“ میں نے انہیں کہا کہ میں ان کے اس جذبے کی قدر کرتا ہوں لیکن ہمیں جوش کے ساتھ ساتھ ہوش سے بھی کام لینا چاہئے۔ پورے بھارت کی آبادی میں ہم پانچ ہی ایک دوسرے کی حقیقت سے بخوبی واقف ہیں۔ ہمیں یہاں صرف اپنے مشن کو پورا کرنے کیلئے بھیجا گیا ہے۔ اگر ہم اپنے سینئرز کی ہدایات کیخلاف گرفتار شدہ جاسوسوں کو چھڑوانے کا فیصلہ بھی کر لیں تو ہمیں پہلے چند باتوں کو مدنظر رکھنا ہوگا سب سے پہلے یہ کہ ان جاسوسوں کی نگرانی پہ کتنے پہرے دار متعین ہیں اور ان کے پاس کس قسم کا اسلحہ ہے۔ نمبر دو یہ کہ بھارتی تشدد کے بعد وہ اس قابل بھی ہیں کہ حراست سے چھوٹنے کے بعد فرار ہو سکیں۔ نمبر تین یہ کہ وہ فرار ہو کر کہاں جائیں گے۔ پاکستان کی طرف کا بارڈر تو بھارت سے ان کے فرار ہونے کے فوراً بعد سیل کر دیا جائے گا۔ پہرے داروں سے بغیر مقابلہ کئے ہم ان کو حراست سے چھڑوا نہیں سکتے۔ مقابلے میں ہم زخمی اور گرفتار بھی ہو سکتے ہیں اور ایسی صورت میں ہمارا سارا مشن الٹ پلٹ ہو سکتا ہے۔ میں تو انہیں سمجھا بجھا کر واپس لوٹ آیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میرے جانے کے بعد وہ خود ہی ساری منصوبہ بندی کر کے میری اجازت اور علم کے بغیر ہی اس پہ فوری طور پہ عمل پیرا ہو جائیں گے۔

اگلے دن صبح کے دس بجے میرے نمبر ٹو کا فون آیا۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں مجھے فوری ملنے کیلئے کہا۔ میں حیران تھا کہ ایسی کیا ایمرجنسی پیدا ہو گئی ہے۔ میں نے اسے مغل محل ریسٹورنٹ میں 11 بجے ملنے کا کہا۔ مقررہ وقت پہ جب میں ریسٹورنٹ میں پہنچا تو وہ باہر ہی میرا انتظار کر رہا تھا۔ ریسٹورنٹ ابھی ابھی کھلا تھا۔ میں اسے ریسٹورنٹ میں ایک گوشے کی ٹیبل پہ لے گیا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا اور پریشان تھا۔ اس کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ جو کچھ اس نے بتایا اسے سن کر میرے بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے کہا کہ گزشتہ رات سے ہمارے تینوں ساتھی غائب ہیں۔ اس نے کہا کہ رات بارہ بجے تک وہ یہی سمجھتا رہا کہ تینوں فلم کا آخری شو دیکھنے چلے گئے ہیں۔ جب وہ بارہ بجے کے بعد بھی واپس نہ آئے تو وہ باہر سڑک پہ رات دیر تک کھلے ہوٹلوں میں انہیں تلاش کرتا رہا لیکن سب بے سود اور جب صبح بھی وہ واپس نہ آئے تو وہ بہت گھبرا گیا۔ بھارت میں قیام کے دوران ایسا پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ میری ہدایت کے مطابق انہیں صرف دو دو کی ٹولی میں باہر جانے کی اجازت تھی۔ فلم کا آخری شو دیکھنے کی سختی سے ممانعت تھی۔ باہر جانے سے پہلے اپنے دونوں ساتھیوں کو بتانا لازم تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور کب تک واپس لوٹیں گے اور اب صورتحال یہ تھی کہ دو کے بجائے تین ساتھی رات 8 بجے سے غائب تھے اور انہوں نے میرے نمبر ٹو اور میری غیر موجودگی میں اپنے سینئر کو بھی اپنے جانے کا کچھ نہ بتایا تھا۔ بقول میرے نمبر ٹو کے صبح اس نے ان کا سامان چیک کیا تھا۔ وہ تینوں اپنے پسٹل، فالتو راؤنڈ اور چھریوں والے بید ساتھ لے گئے تھے۔

کئی قسم کے اندیشوں اور وسوسوں نے گھیر لیا۔ ان کی گمشدگی کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ میں بلاوجہ سوچ بچار میں وقت ضائع کرنے کے اپنے نمبر ٹو کو ساتھ لیکر ان کے گھر چلا گیا۔ سب چیزیں موجود تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان پہ کیا بیتی۔ میں نے ان کے کمروں کو اچھی طرح سے کھنگال ڈالا لیکن کوئی ایسی چیز نہ مل سکی جس سے ان کی گمشدگی کا سراغ ملتا۔ تھک ہار کر میں نمبر ٹو کے کمرے میں جا بیٹھا۔ بار بار ایک ہی بات ذہن میں آتی تھی کہ وہ فلم کا آخری شو دیکھنے گئے ہوں گے۔ واپسی پہ پولیس نے معمول کی چیکنگ کے دوران ان سے اسلحہ برآمد کیا ہوگا اور وہ کسی حوالات میں ہوں گے۔ تفتیش کے دوران ہمارا سارا بھید کھل جائے گا۔ نہ صرف ہم دونوں بھی پکڑے جائیں گے بلکہ ہمارا مشن اور اتنی اہم ڈاک بھی دشمن کے ہاتھ لگ جائے گی۔ جیسے جیسے میں اس زاویئے سے سوچتا جاتا مجھے آئندہ تاریکی ہی تاریکی دکھائی دیتی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ فوری طور پہ ڈاک اور دوسری ضروری اشیا یعنی ٹرانسمیٹر، کیمرے اور ہماری اصلی پہچان کا سبب بننے والی تمام اشیا اس گھر سے فوری طور پہ ہوٹل منتقل کر لوں۔ اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ تینوں گمشدہ ساتھیوں کو میرے ہوٹل کا بھی علم ہے۔ پکڑے جانے کی صورت میں تشدد کے باعث اگر وہ بول پڑے تو دشمن ہوٹل میں بھی فوراً پہنچ جائے گا۔ اس لئے فوری طور پہ مجھے اور میرے نمبر ٹو کو کسی غیر معروف ہوٹل میں شفٹ کر جانا چاہئے۔ میں نے نمبر ٹو کو سب سامان پیک کرنے کو کہا۔ مجھے اس وقت کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔ فکر تھی تو ڈاک اور باقی اشیا کو محفوظ کرنے اور خود کو اور اپنے نمبر ٹو کو بچانے کی۔ میں نمبر ٹو کے کمرے میں بڑی بے قراری اور اضطراری کی حالت میں بار بار نمبر ٹو کو جلد از جلد سامان پیک کرنے کا کہہ رہا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ یہ وقت کا کھیل ہے کہ ہم پہلے اس گھر سے نکلتے ہیں یا پولیس اور دوسرے بھارتی ادارے یہاں پہنچ جاتے ہیں۔ اسی کیفیت میں میری نگاہ ٹائم پیس پہ پڑی تو اس کے نیچے ایک کاغذ دبا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے وہ کاغذ اٹھایا اور میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

یہ خط ہمارے تینوں ساتھیوں کی طرف سے مجھے اور میرے نمبر ٹو کو مخاطب کر کے لکھا گیا تھا اور اس پہ ان تینوں کے دستخط ثبت تھے۔ خط کا مضمون کچھ اس طرح تھا کہ ہم تینوں آگرہ میں گرفتار دو پاکستانی جاسوسوں کو بچانے کے لئے جا رہے ہیں۔ اگر دو دن تک ہم واپس نہ لوٹ سکے تو یہ سمجھ لیجئے گا کہ ہم تینوں دشمن کی گولیوں سے ہلاک ہو چکے ہیں اور اگر ہم زندہ گرفتار ہو گئے تو ہم سائنائیڈ داڑھیں چبا کر اپنی جان دے دیں گے لیکن اپنے راز اور آپ کے متعلق کسی قسم کی معلومات دشمن کو نہ دیں گے۔ خط میں انہوں نے مجھ سے اور نمبر ٹو سے اپنے ڈسپلن اور ہدایات کی خلاف ورزی کرنے پہ معافی مانگی تھی اور لکھا تھا کہ اگر ہم یہ قدم نہ اٹھاتے تو ہمارے دماغ اس خیال سے پھٹ جاتے کہ ہمارے دو پاکستانی بھائی ہمارے جیسے ہی مشن کی تکمیل کے دوران گرفتار ہو چکے ہیں اور ان کی قید اور تشدد کرنے کی جگہ کا علم ہونے کے باوجود ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر رہے۔ انہوں نے لکھا تھا کہ آپ ہمارے اس اقدام کی کامیابی کی دعا کریں اور ہمارے زندہ نہ رہنے کی صورت میں ہماری مغفرت کی دعا کریں۔ زندہ رہنے کی صورت میں آپ...... یا کورٹ مارشل جو سزا دے گا اسے بھگتنے کو تیار ہیں۔

میں نے نمبر ٹو کو بلایا اور اسے یہ خط پڑھنے کو دیا۔ اس خط نے مجھے اور زیادہ پریشان کر دیا۔ ناکامی کی صورت میں انہوں نے اپنی جان دینے اور راز نہ بتانے کا جو کہا تھا اس جذباتی پس منظر میں ایسے جذباتی عہد کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ نمبر ٹو بھی خط پڑھ کر حیران و ششدر رہ گیا۔ اس نے سارا گھر ان کے سراغ کی تلاش میں الٹ پلٹ کر دیا تھا لیکن گھبراہٹ میں اپنے کمرے میں ٹائم پیس کی طرف دھیان نہ دیا۔ یہ خط ملنے کے باوجود میں نے نمبر ٹو کے ساتھ مل کر سب ضروری سامان اٹھایا اور چھتہ لال میاں میں ایک معمولی ہوٹل میں دو کمرے لے لئے۔ گھر کے دروازوں کی ایک ایک چابی سب کے پاس تھی لیکن تینوں ساتھی اپنی چابیاں بھی وہیں چھوڑ گئے۔ مالک مکان کے گھر والوں کو ہم نے چابیوں کا ایک سیٹ دیا اور میرے نمبر ٹو نے کہا کہ اس کے ساتھی کسی ضروری کام کی وجہ سے بیرون دہلی گئے ہیں اور جلدی میں چابیاں بھی بھول گئے ہیں۔ اسے بھی کسی پارٹی کو سامان ڈلیور کرنے کے لئے جانا پڑ رہا ہے۔ اس کی واپسی سے پہلے اگر اس کے ساتھی آ جائیں تو انہیں چابیاں دے دیں۔

چھتہ لال میاں سے میں سیدھا اپنے ہوٹل پہنچا اور اپنے دو چار جوڑے کپڑے ایک سوٹ کیس میں رکھ دیئے۔ کچھ اہم کاغذات اور سارے روپے لاکر سے نکال لئے۔ سائیلنسر والا پسٹل بھی سوٹ کیس میں رکھا اور ہوٹل کی انتظامیہ کو یہ بتا کر کہ دو ایک دن کے لئے دہلی سے باہر جا رہا ہوں، چھتہ لال میاں کے ہوٹل میں پہنچ گیا۔ دن کا باقی حصہ اور رات ہم نے آنکھوں میں کاٹی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی بڑے زلزلے کی وجہ سے ساری عمارت ڈھیر ہو گئی ہو۔ آئندہ مشن کی بات تو ایک طرف رہی ہم دونوں صرف یہ سوچ رہے تھے کہ کسی طرح ہم ڈاک آنے والے کوریئر کو دے سکیں۔ میرے نمبر ٹو نے تجویز پیش کی کہ ہمیں ٹرانسمیٹر پہ پاکستان رابطہ کرنا چاہئے جسے میں نے فوراً ہی اس بنا پہ رد کر دیا کہ بھارتی سول اور فوجی جاسوسی کے محکمے میجر احسن اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری کی وجہ سے پہلے ہی چوکنا ہو چکے تھے۔ اب ان دو نئے جاسوسوں کی گرفتاری کے بعد تو وہ ایمرجنسی کی حالت میں ہوں گے۔ ان حالات میں ٹرانسمیٹر پہ لمبا پیغام، خود ان اداروں کو اپنی نشاندہی کرنے کے مترادف ہوگا۔ میرے نمبر ٹو نے یہ بھی کہا کہ اگر ہمارے تینوں ساتھی کامیابی کے ساتھ بخیریت لوٹ بھی آئے تو انہیں ڈسپلن کی خلاف ورزی کی وجہ سے کوریئر کے ہمراہ واپس بھیج دیا جائے۔ میں نے اسے کہا کہ فی الحال انتظار کرو اور دیکھو (WAIT AND SEE) پہ عمل کرنا ہے اور اس وقت ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اس انتہائی اہم ڈاک کو پاکستان بھجوانا ہے۔ ان تینوں نے جو حرکت کی تھی۔ وہ جذبات سے قطع نظر انتہائی فاش غلطی اور جان بوجھ کر ڈسپلن کی شدید خلاف ورزی تھی۔ مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ ان کی بخیر و عافیت واپسی کی صورت میں اگر انہیں پاکستان واپس بھیجا جائے تو وہ کورٹ مارشل کے خوف سے راہ میں ہی فرار نہ ہو جائیں۔ انہوں نے خط میں اپنے جذبات لکھ کر اپنی دانست میں تو اپنے اس اقدام کو جائز قرار دیا تھا لیکن میرے لئے مشکلات کا ایک پہاڑ کھڑا کر دیا تھا۔ میں نے حالات کے تقاضے کے پیش نظر ان کی بخیریت واپسی ورنہ بصورت دیگر ان کے واپس آنے کی ان کی لکھی ہوئی مدت کے دو دن بعد تک ان کا انتظار کرنے کے بعد ہی پاکستان کو ان کے بارے میں مطلع کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ دورانیہ اتوار تک کا بنتا تھا جب اسپیشل کوریئر نے مجھے ملنا تھا۔ پانچ میں سے اب ہم صرف دو باقی تھے۔ میں نے اپنے نمبر ٹو کو کہا کہ جب تک حالات کسی ڈھب بیٹھ نہ جائیں ہم دونوں ایک دوسرے کو کور کریں گے اور تنہا ہرگز باہر نہ جائیں گے۔

اگلے روز دس بجے کے قریب ہم دونوں ان کے گھر کے سامنے سڑک پہ پہنچے تو اتفاقاً مالک مکان مل گیا۔ اس نے میرے نمبر ٹو کو بتایا کہ صبح وہ تینوں گھر آ گئے ہیں۔ ہم قریباً بھاگتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے تو وہ سو رہے تھے۔ نمبر ٹو نے انہیں جگایا۔ مجھے اور نمبر ٹو کو دیکھ کر وہ اس قدر گھبرائے کہ آنکھیں نہ ملا سکتے تھے۔ میں نے انہیں بالکل نارمل لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تمہارا خط مل گیا تھا۔ لہٰذا وجوہات بیان کرنے کے بجائے مفصل طور پہ اپنے گھر سے جانے اور واپس آنے تک کے واقعات بتاؤ اور صرف ایک آدمی بولے۔ باقی خاموش رہیں۔ یہ سن کر ہمارا وہ ساتھی جو جوڈو کراٹے کا ماہر تھا، کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا ”سر ہم سے بڑی غلطی ہوئی جو یہ حرکت کر بیٹھے“ میں نے اسے ٹوکا ”صرف وہ بتاؤ جو میں نے پوچھا ہے۔ غلطی ہوئی ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ بعد میں ہوگا“۔ ”سر آپ کے جانے کے بعد ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ آگرہ میں گرفتار دونوں پاکستانیوں کو بچانا ضروری ہے۔ ہمیں یقین تھا کہ آپ ہمیں ہرگز اس کی اجازت نہ دیں گے۔ سو ہم نے طے کیا کہ آپ کی لاعلمی میں ہی یہ کام کیا جائے۔ ہم تینوں مسلح ہو کر ریلوے اسٹیشن پہ پہنچے، رات گیارہ بجے آگرہ جانے والی گاڑی پہ سوار ہوئے۔ یہ پسنجر گاڑی تھی۔ ہر اسٹیشن پہ رکتی اور دوسری گاڑیوں کو پاس کرواتی صبح راجہ کی منڈی اسٹیشن پہ پہنچی۔ ہم گاڑی سے اتر گئے اور سیف ہاؤس کا جو نقشہ آپ نے بتایا تھا اس طرف چل پڑے۔ ہم نے سوچا تھا کہ دن بھر ان کی نگرانی کے بعد رات کو کمانڈو ایکشن کر کے انہیں چھڑوانے کی کوشش کریں گے۔ ریلوے اسٹیشن سے ہی ریلوے پٹڑیوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ جو آگرہ کینٹ اسٹیشن تک جاتا ہے۔ سیف ہاؤس کے سامنے ریلوے پٹڑیوں کی دوسری جانب ایک کچی بستی بنی ہوئی ہے۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ جو سیف ہاؤس کی طرف سے اشارے کر کے بول رہے تھے ہم بھی ان میں شامل ہو گئے۔ سیف ہاؤس کے سامنے کئی فوجی جیپیں اور ایمبولینسیں کھڑی تھیں۔ ملٹری پولیس والے سیف ہاؤس کی طرف کسی کو جانے نہیں دیتے تھے۔ کچی بستی والے بھی اپنے گھروں کے سامنے دور سے ہی دیکھ رہے تھے۔ ہمارے پوچھنے پہ مختلف لوگ مختلف باتیں کرنے لگے۔ ہر کوئی اپنے اپنے خیال کے گھوڑے دوڑا رہا تھا لیکن یقین سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔

غازی

ایمبولینسوں اور جیپوں کی موجودگی سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی سینئر افسر کی آمد کا انتظار کیا جارہا ہے۔ملٹری پولیس والے پٹریوں کی دوسری طرف سے ان لوگوں کو گھروں کے اندر جانے کا کہہ رہے تھے لیکن وہ پٹریاں عبور کرکے شہریوں کو زبردستی گھروں میں دھکیل نہیں رہے تھے (شاید اس کی وجہ بھارت میں مارشل لاء کا نہ لگنا اور فوج کا شہری معمولات میں دخل اندازی کی حدود کا تعین تھا) ہم نے دیکھا کہ ریلوے کانٹا بدلنے والا ایک شخص اپنی وردی میں اس بستی میں داخل ہوا اور جلد ہی لوگوں نے اسے گھیر لیا۔اس نے بتایا کہ صبح کے تین بجے کے قریب وہ ڈیوٹی پر جانے کے لئے گھر سے نکلا ہی تھا کہ سامنے والے گھر (سیف ہاؤس) کے اندر اور باہر گولیاں چلنے کی آواز آئی۔وہ کانٹے والا سیف ہاؤس کے متعلق تو کچھ نہ جانتا تھا۔اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ اس گھر میں کچھ فوجی رہتے ہیں اور کبھی کبھی چیخیں بھی سنائی دیتی ہیں۔جیپوں میں سوار فوجی افسر بھی یہاں آتے جاتے دکھائی دیتے ہیں۔اس گھر کے باہر اور اندر ہلکی پاور کے بلب جل رہے تھے۔اس روشنی میں اس نے دیکھا کہ فوجی وردی پہنے ہوئے تین آدمی گھر کے باہر گولیاں لگنے سے مر چکے ہیں اور گھر کے اندر سے بھی فائرنگ کی آواز آرہی ہے۔فائرنگ تھمی تو چند منٹوں بعد 5 آدمی جو شہری کپڑے پہنے ہوئے تھے،شہری کپڑے پہنے دو اور آدمیوں کو سہارا دیئے مکان سے باہر آئے۔کچھ فاصلے پر ایک موٹر کھڑی تھی۔وہ سب اس موٹر میں جا کر بیٹھ گئے اور موٹر تیزی سے پکی سڑک کی طرف بڑھی اور غائب ہوگئی۔میں تو یہ سب دیکھ کر بہت ڈرا اور بھاگتے ہوئے اسٹیشن جا کر حاضری کے رجسٹر پر دستخط کئے اور ڈیوٹی دینے لگا۔میں نے جو کچھ دیکھا تھا اس کی وجہ سے میری طبیعت خراب ہوگئی اور چھٹی لیکر اب میں گھر جارہا تھا۔میں اس بارے میں فوجیوں کو کوئی بیان نہیں دونگا۔خواہ مخواہ پرائی مصیبت مول کیوں لوں۔اس کانٹے والے کی باتیں سن کر وہاں موجود لوگوں نے پھر تبصرے شروع کر دیئے۔تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ ایک جیپ آئی جس پر ایک اسٹار لگا ہوا تھا۔یقیناً اسی بریگیڈیئر کا انتظار ہورہا تھا۔وہ دوسرے جونیئر افسران کے ساتھ سیف ہاؤس کے اندر گیا اور تھوڑی دیر بعد ہی باہر آگیا۔جونیئر افسران سے چند منٹ باتیں کیں اور اپنی جیپ میں بیٹھ کر چلا گیا۔

کئی قسم کے اندیشوں اور وسوسوں نے گھیر لیا۔ان کی گمشدگی کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔میں بلاوجہ سوچ بچار میں وقت ضائع کرنے کے اپنے نمبر ٹو کو ساتھ لیکر ان کے گھر چلا گیا۔سب چیزیں موجود تھیں۔کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان پر کیا بیتی۔میں نے ان کے کمروں کو اچھی طرح سے کھنگال ڈالا لیکن کوئی ایسی چیز نہ مل سکی جس سے ان کی گمشدگی کا سراغ ملتا۔تھک ہار کر میں نمبر ٹو کے کمرے میں جا بیٹھا۔بار بار ایک ہی بات ذہن میں آتی تھی کہ وہ فلم کا آخری شو دیکھنے گئے ہوں گے۔واپسی پر پولیس نے معمول کی چیکنگ کے دوران ان سے اسلحہ برآمد کیا ہوگا اور وہ کسی حوالات میں ہوں گے۔تفتیش کے دوران ہمارا سارا بھید کھل جائے گا۔نہ صرف ہم دونوں بھی پکڑے جائیں گے بلکہ ہمارا مشن اور اتنی اہم ڈاک بھی دشمن کے ہاتھ لگ جائے گی۔جیسے جیسے میں اس زاویئے سے سوچتا جاتا مجھے آئندہ تاریکی ہی تاریکی دکھائی دیتی۔میں نے فیصلہ کیا کہ فوری طور پر ڈاک اور دوسری ضروری اشیا یعنی ٹرانسمیٹر،کیمرے اور ہماری اصلی پہچان کا سبب بننے والی تمام اشیا اس گھر سے فوری طور پر ہوٹل منتقل کرلوں۔اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ تینوں گمشدہ ساتھیوں کو میرے ہوٹل کا بھی علم ہے۔پکڑے جانے کی صورت میں تشدد کے باعث اگر وہ بول پڑے تو دشمن ہوٹل میں بھی فوراً پہنچ جائے گا۔اس لئے فوری طور پر مجھے اور میرے نمبر ٹو کو کسی غیر معروف ہوٹل میں شفٹ کر جانا چاہئے۔میں نے نمبر ٹو کو سب سامان پیک کرنے کو کہا۔مجھے اس وقت کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔فکر تھی تو ڈاک اور باقی اشیا کو محفوظ کرنے اور خود کو اور اپنے نمبر ٹو کو بچانے کی۔میں نمبر ٹو کے کمرے میں بڑی بے قراری اور اضطراری کی حالت میں بار بار نمبر ٹو کو جلد از جلد سامان پیک کرنے کا کہہ رہا تھا۔میں سوچتا تھا کہ یہ وقت کا کھیل ہے کہ ہم پہلے اس گھر سے نکلتے ہیں یا پولیس اور دوسرے بھارتی ادارے یہاں پہنچ جاتے ہیں۔اسی کیفیت میں میری نگاہ ٹائم پیس پر پڑی تو اس کے نیچے ایک کاغذ دبا ہوا دکھائی دیا۔میں نے وہ کاغذ اٹھایا اور میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

یہ خط ہمارے تینوں ساتھیوں کی طرف سے مجھے اور میرے نمبر ٹو کو مخاطب کرکے لکھا گیا تھا اور اس پر ان تینوں کے دستخط ثبت تھے۔خط کا مضمون کچھ اس طرح تھا کہ ہم تینوں آگرہ میں گرفتار دو پاکستانی جاسوسوں کو بچانے کیلئے جارہے ہیں۔اگر دو دن تک ہم واپس نہ لوٹ سکے تو یہ سمجھ لیجئے گا کہ ہم تینوں دشمن کی گولیوں سے ہلاک ہو چکے ہیں اور اگر ہم زندہ گرفتار ہوگئے تو ہم سائینا ئڈ داڑھیں چبا کر اپنی جان دے دیں گے لیکن اپنے راز اور آپ کے متعلق کسی قسم کی معلومات دشمن کو نہ دیں گے۔خط میں انہوں نے مجھ سے اور نمبر ٹو سے اپنے ڈسپلن اور ہدایات کی خلاف ورزی کرنے پر معافی مانگی تھی اور لکھا تھا کہ اگر ہم یہ قدم نہ اٹھاتے تو ہمارے دماغ اس خیال سے پھٹ جاتے کہ ہمارے دو پاکستانی بھائی ہمارے جیسے ہی مشن کی تکمیل کے دوران گرفتار ہو چکے ہیں اور ان کی قید اور تشدد کرنے کی جگہ کا علم ہونے کے باوجود ہم ان کی کوئی مدد نہیں کررہے۔انہوں نے لکھا تھا کہ آپ ہمارے اس اقدام کی کامیابی کی دعا کریں اور ہمارے زندہ نہ رہنے کی صورت میں ہماری مغفرت کی دعا کریں۔زندہ رہنے کی صورت میں آپ...... یا کورٹ مارشل جو سزا دیں گے اسے بھگتنے کو تیار ہیں۔

میں نے نمبر ٹو کو بلایا اور اسے یہ خط پڑھنے کو دیا۔اس خط نے مجھے اور زیادہ پریشان کر دیا۔ناکامی کی صورت میں انہوں نے اپنی جان دینے اور راز نہ بتانے کا جو کہا تھا اس جذباتی پس منظر میں ایسے جذباتی عہد کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔نمبر ٹو بھی خط پڑھ کر حیران و ششدر رہ گیا۔اس نے سارا گھر ان کے سراغ کی تلاش میں الٹ پلٹ کر دیا تھا لیکن گھبراہٹ میں اپنے کمرے میں ٹائم پیس کی طرف دھیان نہ دیا۔یہ خط ملنے کے باوجود میں نے نمبر ٹو کے ساتھ مل کر سب ضروری سامان اٹھایا اور چھتہ لال میاں میں ایک معمولی ہوٹل میں دو کمرے لے لئے۔گھر کے دروازوں کی ایک ایک چابی سب کے پاس تھی لیکن تینوں ساتھی اپنی چابیاں بھی وہیں چھوڑ گئے۔مالک مکان کے گھر والوں کو ہم نے چابیوں کا ایک سیٹ دیا اور میرے نمبر ٹو نے کہا کہ اس کے ساتھی کسی ضروری کام کی وجہ سے بیرون دہلی گئے ہیں اور جلدی میں چابیاں بھی بھول گئے ہیں۔اسے بھی کسی پارٹی کو سامان ڈیلیور کرنے کے لئے جانا پڑ رہا ہے۔اس کی واپسی سے پہلے اگر اس کے ساتھی آجائیں تو انہیں چابیاں دے دیں۔

چھتہ لال میاں سے میں سیدھا اپنے ہوٹل پہنچا اور اپنے دو چار جوڑے کپڑے ایک سوٹ کیس میں رکھ دیئے۔کچھ اہم کاغذات اور سارے روپے لاکر سے نکال لئے۔سائیلنسر والا پسٹل بھی سوٹ کیس میں رکھا اور ہوٹل کی انتظامیہ کو یہ بتا کر کہ دو ایک دن کے لئے دہلی سے باہر جارہا ہوں،چھتہ لال میاں کے ہوٹل میں پہنچ گیا۔دن کا باقی حصہ اور رات ہم نے آنکھوں میں کاٹی۔یوں محسوس ہورہا تھا جیسے کسی بڑے زلزلے کی وجہ سے ساری عمارت ڈھیر ہوگئی ہو۔آئندہ مشن کی بات تو ایک طرف رہی ہم دونوں صرف یہ سوچ رہے تھے کہ کسی طرح ہم ڈاک آنے والے کوریئر کو دے سکیں۔میرے نمبر ٹو نے تجویز پیش کی کہ ہمیں ٹرانسمیٹر پر پاکستان رابطہ کرنا چاہئے جسے میں نے فوراً ہی اس بنا پر رد کر دیا کہ بھارتی سول اور فوجی جاسوسی کے محکمے میجر احسن اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری کی وجہ سے پہلے ہی چوکنا ہو چکے تھے۔اب ان دو نئے جاسوسوں کی گرفتاری کے بعد تو وہ ایمرجنسی کی حالت میں ہوں گے۔ان حالات میں ٹرانسمیٹر پر لمبا پیغام،خود ان اداروں کو اپنی نشان دہی کرنے کے مترادف ہوگا۔میرے نمبر ٹو نے یہ بھی کہا کہ اگر ہمارے تینوں ساتھی کامیابی کے ساتھ بخیریت لوٹ بھی آئے تو انہیں ڈسپلن کی خلاف ورزی کی وجہ سے کوریئر کے ہمراہ واپس بھیج دیا جائے۔میں نے اسے کہا کہ فی الحال انتظار کرو اور دیکھو (WAIT AND SEE) پر عمل کرنا ہے اور اس وقت ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اس انتہائی اہم ڈاک کو پاکستان بھجوانا ہے۔ان تینوں نے جو حرکت کی تھی۔وہ جذبات سے قطع نظر انتہائی فاش غلطی اور جان بوجھ کر ڈسپلن کی شدید خلاف ورزی تھی۔مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ ان کی بخیر و عافیت واپسی کی صورت میں اگر انہیں پاکستان واپس بھیجا جائے تو وہ کورٹ مارشل کے خوف سے راہ میں ہی فرار نہ ہو جائیں۔انہوں نے خط میں اپنے جذبات لکھ کر اپنی دانست میں تو اپنے اس اقدام کو جائز قرار دیا تھا لیکن میرے لئے مشکلات کا ایک پہاڑ کھڑا کر دیا تھا۔میں نے حالات کے تقاضے کے پیش نظر ان کی بخیریت واپسی ورنہ بصورت دیگر ان کے واپس آنے کی ان کی لکھی ہوئی مدت کے دو دن بعد تک ان کا انتظار کرنے کے بعد ہی پاکستان کو ان کے بارے میں مطلع کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ دورانیہ اتوار تک کا بنتا تھا جب اسپیشل کوریئر نے مجھے ملنا تھا۔پانچ میں سے اب ہم صرف دو باقی تھے۔میں نے اپنے نمبر ٹو کو کہا کہ جب تک حالات کسی ڈھب بیٹھ نہ جائیں ہم دونوں ایک دوسرے کو کور کریں گے اور تنہا ہرگز باہر نہ جائیں گے۔

اگلے روز دس بجے کے قریب ہم دونوں ان کے گھر کے سامنے سڑک پر پہنچے تو اتفاقاً مالک مکان مل گیا۔اس نے میرے نمبر ٹو کو بتایا کہ صبح وہ تینوں گھر آگئے ہیں۔ہم قریباً بھاگتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے تو وہ سو رہے تھے۔نمبر ٹو نے انہیں جگایا۔مجھے اور نمبر ٹو کو دیکھ کر وہ اس قدر گھبرائے کہ آنکھیں نہ ملا سکتے تھے۔میں نے انہیں بالکل نارمل لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تمہارا خط مل گیا تھا۔لہٰذا وجوہات بیان کرنے کے بجائے مفصل طور پر اپنے گھر سے جانے اور واپس آنے تک کے واقعات بتاؤ اور صرف ایک آدمی بولے۔باقی خاموش رہیں۔یہ سن کر ہمارا وہ ساتھی جو جوڈو کراٹے کا ماہر تھا،کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا "سر ہم سے بڑی غلطی ہوئی جو یہ حرکت کر بیٹھے" میں نے اسے ٹوکا "صرف وہ بتاؤ جو میں نے پوچھا ہے۔غلطی ہوئی ہے یا نہیں،اس کا فیصلہ بعد میں ہوگا"۔"سر آپ کے جانے کے بعد ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ آگرہ میں گرفتار دونوں پاکستانیوں کو بچانا ضروری ہے۔ہمیں یقین تھا کہ آپ ہمیں ہرگز اس کی اجازت نہ دیں گے۔سو ہم نے طے کیا کہ آپ کی لاعلمی میں ہی یہ کام کیا جائے۔ہم تینوں مسلح ہوکر ریلوے اسٹیشن پر پہنچے،رات گیارہ بجے آگرہ جانے والی گاڑی پر سوار ہوئے۔یہ پسنجر گاڑی تھی۔ہر اسٹیشن پر رکتی اور دوسری گاڑیوں کو پاس کرواتی صبح راجہ کی منڈی اسٹیشن پر پہنچی۔ہم گاڑی سے اتر گئے اور سیف ہاؤس کا جو نقشہ آپ نے بتایا تھا اس طرف چل پڑے۔ہم نے سوچا تھا کہ دن بھر ان کی نگرانی کے بعد رات کو کمانڈو ایکشن کرکے انہیں چھڑوانے کی کوشش کریں گے۔ریلوے اسٹیشن سے ہی ریلوے پٹریوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔جو آگرہ کینٹ اسٹیشن تک جاتا ہے۔سیف ہاؤس کے سامنے ریلوے پٹریوں کی دوسری جانب ایک کچی بستی بنی ہوئی ہے۔وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔جو سیف ہاؤس کی طرف سے اشارے کرکے بول رہے تھے ہم بھی ان میں شامل ہوگئے۔سیف ہاؤس کے سامنے کئی فوجی جیپیں اور ایمبولینسیں کھڑی تھیں۔ملٹری پولیس والے سیف ہاؤس کی طرف کسی کو جانے نہیں دیتے تھے۔کچی بستی والے بھی اپنے گھروں کے سامنے دور سے ہی دیکھ رہے تھے۔ہمارے پوچھنے پر مختلف لوگ مختلف باتیں کرنے لگے۔ہر کوئی اپنے اپنے خیال کے گھوڑے دوڑا رہا تھا لیکن یقین سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔

ایمبولینسوں اور جیپوں کی موجودگی سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی سینئر افسر کی آمد کا انتظار کیا جارہا ہے۔ملٹری پولیس والے پٹریوں کی دوسری طرف سے ان لوگوں کو گھروں کے اندر جانے کا کہہ رہے تھے لیکن وہ پٹریاں عبور کرکے شہریوں کو زبردستی گھروں میں دھکیل نہیں رہے تھے ہم نے دیکھا کہ ریلوے کانٹا بدلنے والا ایک شخص اپنی وردی میں اس بستی میں داخل ہوا اور جلد ہی لوگوں نے اسے گھیر لیا۔اس نے بتایا کہ صبح کے تین بجے کے قریب وہ ڈیوٹی پر جانے کے لئے گھر سے نکلا ہی تھا کہ سامنے والے گھر (سیف ہاؤس) کے اندر اور باہر گولیاں چلنے کی آواز آئی۔وہ کانٹے والا سیف ہاؤس کے متعلق تو کچھ نہ جانتا تھا۔اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ اس گھر میں کچھ فوجی رہتے ہیں اور کبھی کبھی چیخیں بھی سنائی دیتی ہیں۔جیپوں میں سوار فوجی افسر بھی یہاں آتے جاتے دکھائی دیتے ہیں۔اس گھر کے باہر اور اندر ہلکی پاور کے بلب جل رہے تھے۔اس روشنی میں اس نے دیکھا کہ فوجی وردی پہنے ہوئے تین آدمی گھر کے باہر گولیاں لگنے سے مر چکے ہیں اور گھر کے اندر سے بھی فائرنگ کی آواز آرہی ہے۔فائرنگ تھمی تو چند منٹوں بعد 5 آدمی جو شہری کپڑے پہنے ہوئے تھے،شہری کپڑے پہنے دو اور آدمیوں کو سہارا دیئے مکان سے باہر آئے۔کچھ فاصلے پر ایک موٹر کھڑی تھی۔وہ سب اس موٹر میں جا کر بیٹھ گئے اور موٹر تیزی سے پکی سڑک کی طرف بڑھی اور غائب ہوگئی۔میں تو یہ سب دیکھ کر بہت ڈرا اور بھاگتے ہوئے اسٹیشن جا کر حاضری کے رجسٹر پر دستخط کئے اور ڈیوٹی دینے لگا۔میں نے جو کچھ دیکھا تھا اس کی وجہ سے میری طبیعت خراب ہوگئی اور چھٹی لیکر اب میں گھر جارہا تھا۔میں اس بارے میں فوجیوں کو کوئی بیان نہیں دونگا۔خواہ مخواہ پرائی مصیبت مول کیوں لوں۔اس کانٹے والے کی باتیں سن کر وہاں موجود لوگوں نے پھر تبصرے شروع کر دیئے۔تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ ایک جیپ آئی جس پر ایک اسٹار لگا ہوا تھا۔یقیناً اسی بریگیڈیئر کا انتظار ہورہا تھا۔وہ دوسرے جونیئر افسران کے ساتھ سیف ہاؤس کے اندر گیا اور تھوڑی دیر بعد ہی باہر آگیا۔جونیئر افسران سے چند منٹ باتیں کیں اور اپنی جیپ میں بیٹھ کر چلا گیا۔

کانٹے والے کے کہنے کے مطابق تین فوجیوں کی لاشیں جو اس نے سیف ہاؤس کے باہر دیکھی تھیں ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی ایمبولینسوں میں رکھ دی گئی تھیں۔سورج کی روشنی میں ہم نے دیکھا کہ ان لاشوں کی جگہ چونے سے لاشوں کی پوزیشن بنا دی گئی تھی۔سیف ہاؤس کے اندر سے تین فوجیوں کی لاشیں ہمارے سامنے دوسری ایمبولینس میں ڈال دی گئیں۔سیف ہاؤس کو تالا لگا کر دو فوجیوں کو پہرے پر کھڑا کر دیا گیا اور پہلے ایمبولینس اور پھر باقی جیپیں بھی وہاں سے چلی گئیں۔اب ہمارا وہاں ٹھہرنا بیکار اور خطرناک تھا لہٰذا ہم اسی راستے سے راجہ کی منڈی اسٹیشن پر پہنچ گئے اور دہلی کی طرف جانے والی جو پہلی ٹرین ملی،اس پر سوار ہوگئے۔اسٹیشن پر بہت سارے فوجی سپاہی اور افسران اور سفید کپڑوں میں فوجی جاسوس جو اپنے ہیئر کٹ کی وجہ سے پہچانے جاتے تھے،کتوں کی طرح بھاگتے ہوئے جاسوسوں کو تلاش کررہے تھے۔ہم نے بجائے دہلی کے انبالہ کے ٹکٹ لئے تھے لیکن پلیٹ فارم پر فوجیوں کی پوچھ گچھ سے بچنے کا کوئی رستہ نظر نہیں آتا تھا۔مجھے ایک ترکیب سوجھی۔میں نے چپکے سے اپنی کلائی کی گھڑی جیب میں رکھ لی اور ایک کیپٹن کے پاس جا کے اسے نمستے کیا اور وقت پوچھا۔اس نے وقت بتا دیا تو میں نے اس سے پوچھا کہ انبالہ جانے والی گاڑی کب آئے گی۔اس نے جھلا کر کہا کہ ریلوے کے کسی آدمی سے پوچھو۔مجھے کیا معلوم۔گاڑی تو پلیٹ فارم پر ہی کھڑی تھی۔میں نے ویسے ہی ریلوے کے ایک قلی سے گاڑی کا پوچھا اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اس کیپٹن کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے پھر نمستے کیا۔کیپٹن تو پلیٹ فارم پر ایک جگہ کھڑا تھا جبکہ باقی فوجی پلیٹ فارم پر بکھرے ہوئے تھے۔مجھے کیپٹن سے ایک آدھ منٹ بات کرتے دیکھ کر باقی فوجی ہمیں اس کا واقف کار سمجھے اور ہم بغیر کسی پوچھ گچھ کے ایک ڈبے میں سوار ہوگئے اور دہلی پہنچ گئے۔رات ہم نے ویٹنگ روم میں بسر کی کیونکہ اسٹیشن پر فوجی چیکنگ کررہے تھے۔ہم سے بھی انہوں نے پوچھا تو ہم نے کہا کہ راجہ کی منڈی سے ٹرین میں سوار ہوئے تھے اور انبالہ جانا ہے چونکہ جس ٹرین سے ہم آئے ہیں وہ صرف دہلی تک کی تھی لہٰذا انبالہ جانے والی ٹرین کا انتظار کررہے ہیں۔ہم نے انہیں ٹکٹ دکھا کر مطمئن کر دیا اور وہ آگے بڑھ گئے۔یہاں آکر ہمیں شدت سے احساس ہوا کہ آپ کی اجازت کے بغیر ہم نے اتنا بڑا اقدام اٹھایا ہے۔ڈرتے ڈرتے ہم گھر پہنچے۔ہم نے سب حقیقت بیان کر دی ہے۔ہمیں اپنی سنگین غلطی کا شدت سے احساس ہوا اور ہم اپنی اس حرکت پر بے حد نادم ہیں۔آپ ہمارے لئے جو سزا بھی تجویز کریں گے ہمیں خوشی سے قبول ہوگی۔

میں نے کہا کہ سزا کے بارے میں تو بعد میں بات کروں گا۔اب یہ کرو کہ آپ دونوں میرے اور نمبر ٹو کے ساتھ چلو۔ایک کو گھر چھوڑ کر ہم چاروں چھتہ لال میاں پہنچے۔ہوٹل والوں سے حساب کرکے سب سامان اٹھایا اور پہلے ان کے گھر گئے اور وہاں سے اٹھایا ہوا سب سامان نمبر ٹو کے حوالے کرکے لودھی ہوٹل چلا آیا۔میرے ہمراہ صرف ایک سوٹ تھا۔کمرے میں پہنچ کر میں نے اللہ کا شکر ادا کیا مرتے مرتے اس ذات پاک نے ہمیں بچا لیا۔(پاکستان واپس آنے پر مجھے پتہ چلا کہ آگرہ میں پکڑے جانے والوں کا گروپ بھی 5 افراد کا تھا۔یہ پانچوں آگرہ چھاؤنی میں دو اور تین کی ٹولیوں میں اپنے ٹارگٹ تک پہنچنے کی کوشش میں تھے کہ شک پڑنے پر ایف آئی یو کے آدمیوں نے دو کو پکڑ لیا اور ڈی ایم آئی والوں کے حوالے کر دیا۔باقی تین دور سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ان کا گروپ لیڈر بھی دو پکڑے جانے والوں میں شامل تھا۔باقی تینوں نے الگ الگ رہ کر ان کا پیچھا کیا اور وہ اسی شام سیف ہاؤس تک پہنچ گئے۔4 دن تک وہ اپنے گرفتار ساتھیوں کو چھڑوانے کی تدابیر کرتے رہے۔اس دوران دو گرفتار ساتھیوں پر درمیانہ تشدد بھی کیا گیا۔تین آزاد ساتھیوں نے بالآخر کمانڈو ایکشن کرنے کا فیصلہ کیا اور جس صبح میرے ساتھی وہاں پہنچے تو کمانڈو ایکشن کرکے وہاں پر موجود 6 بھارتی فوجیوں کو ہلاک کرکے ساتھیوں کو چھڑوا لیا گیا تھا۔موٹر کار بھی اسی رات گن پوائنٹ پر چھینی گئی تھی اور آگرہ اسٹیشن کے قریب اسے چھوڑ کر وہ پانچوں پہلے لکھنؤ اور پھر بھارت نیپال بارڈر پر پہاڑیوں سے گزرتے نیپال میں داخل ہوئے اور کھٹمنڈو میں سے اپنے سفارت خانے کے ذریعے پہلے ملائیشیا اور پھر پاکستان بخیریت پہنچ گئے) اگلے روز صبح ہی میں ساتھیوں کے گھر چلا گیا۔میں نے رات ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ سخت سرزنش کے سوا ان کے خلاف پاکستان میں ان کی اس حرکت کی رپورٹ نہیں کروں گا۔میری اپنی پوزیشن بہت نازک تھی۔دشمن ملک میں ان سے کام لینا جہاں کسی اتھارٹی کا ان پر حکم چلانے اور عدولی پر ان کو کوئی سزا دینے کا ذریعہ نہ ہو بہت ہی کٹھن کام تھا۔

غازی

میں اکثر اوقات ان سے دوستانہ ماحول میں باتیں کرتا اور نفسیاتی طور پر انہیں HANDLE کرتا تھا اور اب بھی میں نے نفسیاتی طور پر ہی ان سے نمٹنے کا سوچا تھا۔ ایک روز گھر پر میں نے ان چاروں کو ایک کمرے میں اکٹھا کیا اور کہا کہ آپ لوگوں کی اس حرکت سے مجھ پر واضح ہو چکا ہے کہ "آپ مجھ سے خوش نہیں ہیں۔ ہم سب یہاں اپنے وطن اور قوم کے مفاد میں جان کی بازی لگا کر آئے ہیں۔ ہم سب کی مشترکہ کوششوں سے اللہ پاک نے ہمیں غیر معمولی کامیابیوں سے نوازا۔ یہ سب کامیابیاں ٹیم ورک کا نتیجہ تھیں اور ہر ٹیم کا ایک کپتان ہوتا ہے۔ میں بھی اپنی ٹیم کا گروپ لیڈر ہوں۔ آپ کے اس اقدام سے میں سمجھتا ہوں کہ اب بحیثیت گروپ لیڈر مجھے آپ کا بھرپور تعاون حاصل نہیں لہٰذا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ اتوار کو پاکستان سے آنے والے کوریئر کے ہمراہ میں پاکستان واپس چلا جاؤں۔ جب تک آپ کا نیا گروپ لیڈر آئے آپ نمبر ٹو کے احکامات پر عمل کریں گے۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی اس حرکت کے بارے میں سینئرز کو کچھ نہ بتاؤں گا"۔ میں یہ باتیں کہہ کر خاموش ہو گیا۔ وہ چاروں پہلے تو گم صم مجھے تکتے رہے۔ پھر یک لخت پھٹ پڑے۔ "نہیں صاحب ہم ایسا ہرگز نہ ہونے دیں گے۔ ہم جان دیدیں گے لیکن آپ کو واپس جانے نہیں دیں گے۔ آپ جو سزا چاہیں ہمیں دے لیں لیکن اپنا یہ فیصلہ بدل لیں۔ اگر آپ واپس چلے گئے تو ہم سب بھی آپ کے پیچھے پیچھے واپس پاکستان چلے جائیں گے۔ چاہے وہاں ہمیں سزائے موت ہی کیوں نہ دی جائے"۔

(وہ سب بیک وقت بول رہے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ان کی اس حرکت کی...... میں خود پاکستان واپس جانے اور اپنا مشن نامکمل چھوڑ کر جانے کی پاداش میں سزا بھگتنے کو تیار ہو جاؤں گا)۔ جب ان کی منت سماجت بہت بڑھ گئی تو میں نے انہیں کہا آپ نے ایک بار فوج میں بھرتی کے وقت حلف اٹھایا تھا۔ دوسری بار بھارت آنے سے پہلے۔ اب میں آپ سے حلف تو نہیں اٹھواؤں گا۔ صرف وعدہ لوں گا کہ آپ آئندہ ایسی حرکت ہرگز نہیں کریں گے"۔ ان سب نے باری باری اپنی ماؤں کو درمیان میں لا کر ایسا وعدہ کیا کہ میں کانپ اٹھا حالانکہ میں نے انہیں ایسا وعدہ کرنے کا ہرگز نہیں کہا تھا۔

چند لمحے پہلے والا ماحول یکسر بدل چکا تھا۔ سب کی آنکھیں پرنم تھیں۔ میں نے سب کو باری باری گلے لگایا۔ بارش شروع ہو چکی تھی۔ انہوں نے چائے بنائی۔ چائے پینے کے تھوڑی ہی دیر کے بعد کھانے کی خوشبو کی مہک آئی۔ مالک مکان دو بڑی سینیوں میں چار پانچ مختلف قسم کے کھانے اور بریانی لے کر آ گیا۔ سیڑھیوں پر کھڑی اس کی بیٹیاں کھانوں کی ٹرے پکڑا رہی تھیں اور وہ انہیں اندر لا رہا تھا۔ میں حیران تھا اور ابھی سوچ ہی رہا تھا اس اچانک میزبانی کا کونسا موقع تھا کہ مالک مکان نے بتایا کہ اس کی بڑی بیٹی کی منگنی طے ہو گئی ہے۔ نزدیکی رشتہ داروں کی دعوت میں کرایہ داروں کو شریک نہ کرنا کسی طور مناسب نہ تھا اور پھر ہمسائے کے حقوق کے متعلق تو اسلام میں اتنی ہدایات ہیں کہ ایک موقع پر جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمسائے کے حقوق بتا رہے تھے تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ "ہمسائے کے اتنے حقوق بیان کئے گئے ہیں کہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وراثت میں بھی ہمسائے کا حصہ رکھنے کے احکامات الٰہی نازل نہ ہو جائیں"۔ میں نے مالک مکان کو بیٹی کی منگنی پر مبارک دی۔ لذیذ کھانوں کا شکریہ ادا کیا اور ساتھیوں کے مشورے سے فیصلہ کیا کہ آئندہ چند روز میں ہم پانچوں اپنی طرف سے 5 بنارسی سوٹ مالک مکان کو بیٹی کی منگنی کے تحفے میں پیش کریں گے۔ یوں شام تک ہم بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے۔ صبح محفل کی جو تلخی تھی وہ ختم ہو چکی تھی اور اس کی جگہ ایک خوشگوار اعتماد کی فضا نے لے لی تھی۔

یشونت نے حسب معمول ڈاک پہنچا دی تھی۔ آئندہ اتوار تک میں فارغ تھا۔ میں نے کرنل شنکر کے پاس جانے کا سوچا اور شام کو میں کرنل شنکر کی محفل میں بیٹھا تھا۔ آج اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا۔ کرنل شنکر نے میرا پرتپاک خیر مقدم کیا اور اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص سے میرا تعارف کروایا۔ وہ آگرہ چھاؤنی میں پنجاب رجمنٹ کا کمانڈنگ آفیسر تھا اور ہیڈ کوارٹر میں کسی کام سے آیا تھا۔ کرنل شنکر کی محفل ناؤ نوش جب عروج پر پہنچی تو کرنل شنکر نے نشے میں جھومتے ہوئے مجھ سے پوچھا "ونود اگر تم اپنی بہترین چائے کی پیٹیاں کسی محفوظ جگہ پر کسی اعتباری شخص کے حوالے کرو اور وہ پیٹیاں گم ہو جائیں اور تمہیں بعد میں معلوم ہو کہ تمہارا اعتباری آدمی لاپروا اور غافل شخص ہے تو اپنی اس ناسمجھی کا الزام تم خود کو دو گے یا اس لاپروا اور غافل شخص کو؟"۔ میں نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ "یقیناً میں خود کو مورد الزام ٹھہراؤں گا کیونکہ جس شخص کے پاس میں نے پیٹیاں رکھی تھیں مجھے اس کے متعلق پہلے ہی چھان بین کر لینی چاہئے تھی"۔ "بالکل درست اور یہی بات میں کرنل رنجیت کو آج کئی بار سمجھا چکا ہوں لیکن کچھ بھی اس کے دماغ میں سمانہیں رہا"۔ (NOTHING CAN BE PUT IN THE BRAIN OF THIS SQUARE HEADED PERSON) کرنل کے اس بے تکلفانہ انداز سے میں نے اندازہ لگایا کہ کرنل رنجیت اس کا پرانا اور بے تکلف یار ہے۔ کرنل شنکر نے کرنل رنجیت پر اپنی "گولہ باری" جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "رنجیت تمہاری کم سے کم سزا میرے خیال میں ملازمت سے برخواستگی ہو گی۔ فوجی ہونے کی وجہ سے تمہیں کوئی دوسرا کام تو آتا نہیں۔ اگر تم کہو تو میں ونود سے اس کے چائے کے کاروبار میں تمہیں شامل کرنے کی سفارش کر دوں"۔ کرنل رنجیت خاموشی سے سر جھکائے کرنل شنکر کے تمام حملے خاموشی سے سہہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کرنل شنکر نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ "پاکستانی میجر احسن اور اسکے ساتھیوں کے گرفتار ہونے اور ان کے مرنے کے بعد بھی انہوں نے اپنی روش نہ بدلی۔ چند روز پیشتر آگرے میں دو پاکستانی جاسوس پکڑے گئے تھے۔ ان کے ڈویژن کمانڈر نے انہیں کرنل رنجیت کے حوالے کر دیا کہ F.I.U کے آدمیوں کے ذریعے ان کی تفتیش کریں۔ کرنل رنجیت نے اسے بلاوجہ کی دردسری سمجھتے ہوئے انہیں آگرے میں DMI کے حوالے کر دیا۔ DMI اور FIUS میں ہمیشہ سے ایک تناؤ موجود ہے۔ DMI والوں نے یہاں اپنے ہیڈ کوارٹرز اور آرمی ہیڈ کوارٹرز کو مطلع کیا۔ اپنے ہیڈ کوارٹرز کی طرف سے میں آگرہ گیا۔ وہاں DMI والوں کا میرے ساتھ رویہ ہتک آمیز تھا کیونکہ وہ صرف پردھان منتری کو جواب دہ تھے۔ میں اسی روز واپس چلا آیا۔ DMI کے دہلی کے افسران ابھی آگرہ جانے کا سوچ ہی رہے تھے کہ پاکستانی جاسوسوں کے ساتھیوں نے نہ صرف انہیں چھڑوا لیا بلکہ پہرے پر موجود ہمارے 6 جوانوں کو بھی ہلاک کر دیا۔ اب کرنل رنجیت کو یہاں جواب دہی کیلئے بلوایا گیا ہے۔ اس کا G.O.C بھی اس کے ہمراہ آیا ہے۔ اسے بھی کرنل رنجیت کی طرح ہی اپنی غفلت کی جواب دہی کیلئے بلایا گیا ہے۔ رنجیت میرا پرانا دوست ہے میں اسے بچانے کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں لیکن اپنے جنرل کے سامنے میں کس حیثیت میں ان کی صفائی دے سکتا ہوں؟"۔

کرنل رنجیت تھوڑی دیر بعد رخصت لے کر کلب میں اپنے الاٹ شدہ کمرے میں چلا گیا۔ کرنل شنکر تھوڑی دیر سر اٹھائے ستاروں کو دیکھتا رہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا "ونود میں تو حقیقتاً پاکستانی جاسوسوں کے فرار اور بھارتی جوانوں کی موت سے خوش ہوا ہوں۔ جاسوس جس نظریئے سے دشمن ملک میں داخل ہوتا ہے اسے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیر کے جبڑوں میں اپنا سر رکھ رہا ہے۔ اس کے زندہ واپس لوٹنے کی امید بہت ہی کم ہوتی ہے۔ گرفتار ہونے کے بعد اسے اور اس کے ساتھیوں کو اسی جذبے کے ساتھ اپنی رہائی کی کوشش کرنی چاہئے کیونکہ گرفتار جاسوس کو اپنی رہائی اور زندہ رہنے کی امید ہرگز نہ رکھنی چاہئے۔ جب تک وہ خود اپنی جان داؤ پر لگا کر اپنی رہائی کی کوشش نہ کرے۔ تشدد سہہ کر اپنی زبان کھولنے اور تشدد کی وجہ سے جان دینے سے بہت بہتر ہے کہ وہ گرفتار کرنے والوں کی کسی کمزوری کو بھی دیکھے تو اس کا بھرپور فائدہ اٹھائے۔ اس طرح یا تو وہ بچ کر بھاگ جائے گا یا پھر گرفتار کرنے والوں کی گولیوں سے ہلاک ہو جائے گا۔ گرفتاری کے بعد موت تو اس کے سامنے منڈلاتی رہتی ہے۔ اسلئے موت کا خوف بالکل نہ کرے اور اپنے بچاؤ کی کوشش ہرگز ترک نہ کرے"

کرنل شنکر تو شراب کے نشے میں اس واقعے میں بھارتی فوج کی غفلت کا بار بار ذکر کر رہا تھا اور میں اس کی باتیں انتہائی غور سے سن رہا تھا۔ دشمن ملک کا ایک کرنل مجھے بھارتی سمجھتے ہوئے یہ "راز" کی باتیں بتا رہا تھا جو میرے سینئرز نے ٹریننگ کے دوران مجھے ذرا نرم الفاظ میں بتائی تھیں۔ میں تو دونوں کی باتوں کا تجزیہ کر رہا تھا اور تقدیر مجھ پر خندہ زن تھی کیونکہ آئندہ سال میں خود ہی ان حالات کا شکار ہونے والا تھا...... تھوڑی دیر کے بعد میں نے کرنل شنکر سے اجازت طلب کی۔ میں اس کے لئے کناٹ سرکس سے گرم نمکین کا جو لے گیا تھا۔ کرنل نے میرا شکریہ ادا کیا اور میں واپس اپنے ہوٹل چلا آیا۔

آئندہ کل یعنی ہفتے کو یشونت کی مراد بر آئی تھی۔ یشونت نے مجھے اس تقریب میں شمولیت کی بھرپور دعوت دی تھی لیکن میں نے معذرت کر لی اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ اس نے اپنے چند دوستوں کو مدعو کیا تھا وہ اس کی اصلی مالی حالت جانتے تھے اور اب یک لخت اسے اس طرح دولت لٹاتے دیکھ کر وہ اگر کچھ شک میں پڑ گئے ہوں تو وہاں مجھے یعنی ایک اجنبی کو اس کے ہمراہ بے تکلفی سے پیش آتے دیکھ کر ان کا شک دوچند ہو سکتا تھا۔ یشونت میری بات سمجھ گیا۔ میں اسے جنرل کی سیف کے کاغذات کی رقم پہلے ہی دے چکا تھا۔ لہٰذا اس نے میری معذرت قبول کر لی۔ میں نے اسے کہا کہ تم نے دیکھ لیا ہو گا کہ تمہارے تعاون کا معاوضہ تمہاری امیدوں سے بہت زیادہ اور ٹھیک وقت پر مل جاتا ہے۔ اب شمی کی وجہ سے تمہاری مالی ضروریات بڑھ جائیں گی۔ اپنی اتنی محنت سے حاصل شدہ خوشی کو عارضی نہ بنا دینا۔ شمی جیسی عورتیں مردوں کو چند ماہ میں ہی اتنی خوشیاں دے سکتی ہیں جو دوسری عورتیں زندگی بھر اپنے مردوں کو نہ دے سکیں کیونکہ شمی جیسی عورتوں کے پیش نظر صرف ایک بات ہوتی ہے کہ کس طرح اپنے عاشق کو خوش کر کے اسکی جیب خالی کریں اور اپنے مقصد کے حصول کیلئے وہ ناز و انداز کا ہر حربہ آزماتی ہیں۔

ہفتے کے روز یشونت نے حسب معمول ڈاک میرے ساتھیوں کو دی جسے انہوں نے فوری طور پر کاپیاں کرنے کے بعد اسے شام سے پہلے ہی لوٹا دیا اور اس نئی ڈاک کو بھی کوریئر کو دی جانے والی ڈاک میں شامل کر لیا۔ کیونکہ اگلی صبح اسپیشل کوریئر کی آمد تھی۔ میرے ساتھیوں نے ہفتے کی شام ہی مجھے اپنے گھر میں بتایا کہ دہلی کے بیرون شہر جانے اور آنے والی بسوں کے اڈوں اور ریلوے اسٹیشنوں پر بھارتی خفیہ پولیس اور فوجی آنے جانے والے مسافروں پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ ہوٹلوں، سراؤں اور مسلمان آبادیوں کی خصوصی نگرانی کی جا رہی ہے۔ ہمارے ہاں کی پولیس کی طرح بھارتی پولیس بھی اونچے درجے کے ہوٹلوں میں گھسنے کی جرأت نہیں کرتی۔ مصیبت آتی ہے تو نچلے درجے کے ہوٹلوں کی۔ میں نے ساتھیوں کو چوکنا رہنے اور بلا کسی خاص وجہ کے گھر سے باہر نکلنے کی ممانعت کی۔ میں بھی جلد ہی اپنے ہوٹل واپس چلا آیا اور سینئرز کے نام اپنے خطوط کو آخری ٹچ دینے لگا۔

اتوار کی صبح میرا ایک ساتھی ڈاک اٹھائے اور دوسرے ساتھی اسے اور مجھے کور دینے کیلئے مقررہ جگہ پر پہنچ گئے۔ سبزی منڈی ریلوے اسٹیشن شہر کے بیچوں بیچ بنا ہوا ہے۔ ریلوے پٹڑیوں کے اوپر شہر کے دونوں حصوں کو ملانے کیلئے ایک اوور ہیڈ برج ہے۔ میں ساتھیوں کو اسٹیشن کی دوسری جانب مارکیٹ میں ایک ہوٹل میں چھوڑ کر اوور ہیڈ برج کے اوپر پہنچا ہی تھا کہ سامنے سے کیپٹن ارشد آتا دکھائی دیا۔ کیپٹن ارشد پاک فوج میں جوڈو کراٹے کا ماہر اور تیز دوڑنے میں امتیازی پوزیشن رکھتا تھا۔ میری ٹریننگ کے دوران ایک فرلانگ سے شروع کر کے گیارہ میل تک مجھے مسلسل دوڑنے کی ٹریننگ اسی نے دی تھی۔ اسے دیکھ کر میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس سے لپٹ جاؤں لیکن حالات کے تقاضے کے مطابق ہم نے آنکھوں آنکھوں میں ہی علیک سلیک کی۔ اس کے پاس سے گزرتے وقت میں نے سرگوشی میں کہا کہ وہ آگے چلتا جائے میں چند لمحوں میں ہی اس کے پیچھے آ جاؤں گا۔ وہ دھیمی چال سے آگے بڑھتا گیا۔ میں تیزی سے پلیٹ فارم پر آیا اور بک اسٹال سے ایک دو رسالے لئے اور واپس برج کی طرف چل پڑا۔ برج کی سیڑھیاں اترتے ہوئے میں نے کیپٹن ارشد کو جا لیا۔ اب ہم دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ کیپٹن ارشد نے مجھے بتایا کہ اس نے اپنے ساتھیوں (گائیڈز) کو پل کی اسی طرف بازار میں چھوڑا ہے اور ایک گھنٹے کے اندر امرتسر جانے والی ٹرین پر واپس جانا ہے۔ امرتسر کے نام پر میں چونک پڑا اور پوچھا کہ کوئی نیا رستہ تلاش کر لیا ہے۔ کیپٹن ارشد نے بتایا کہ امرتسر سے پاکستان کو جانے کا ایک نیا رستہ حافظ محمد (لاہور کا رہائشی پاک بھارت سرحد کا اسمگلر) کے کیریئرز نے پنڈ کھجری کے راستہ دریافت کیا ہے بھارتی جانب کے سکھ اسمگلر ان کے ساتھی ہیں اور وہ بارڈر سے لے کر امرتسر ٹرین کی روانگی تک اپنی حفاظت میں لے کر جاتے ہیں۔ یہ ان کا تقریباً روز کا معمول ہے اور حافظ محمد بھارتی اسمگلرز کی لاہور آمد اور روانگی تک بارود تک ان کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہے۔ ہمارا ادارہ حافظ محمد کو سہولتیں فراہم کرتا ہے جس کے عوض اس کے آدمی ہمیں بارڈر کے آر پار لے جانے کی ذمہ داری اٹھانے کو تیار ہیں۔ اسی رستے کو دیکھنے اور چیک کرنے کیلئے وہ خود (کیپٹن ارشد) آیا ہے۔ اس نے بتایا کہ منڈی صادق گنج (جہاں سے ہم بھارت میں داخل ہوئے تھے) کی نسبت یہ راستہ نسبتاً آسان اور کم خطرناک ہے کیونکہ بارڈر کے دونوں طرف ایک فرلانگ کے فاصلے پر دو گاؤں ہیں جن کے رہائشی اس کام میں ملوث ہیں اور وہی دہلی تک لے کر آئے ہیں اور واپس بھی وہی لے کر جائیں گے۔

دوران گفتگو ہم اس ہوٹل کے سامنے پہنچے جہاں میرے ساتھی میرے انتظار میں تھے۔ میں ارشد کو اس ہوٹل میں لے گیا اور ساتھیوں کے نزدیک ہی ہم ایک ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ کیپٹن ارشد کا بھارت یاترا کا غالباً یہ پہلا موقع تھا۔ میں نے اشارے سے اسے بتایا کہ یہ میرے ساتھی ہیں اور ہم سب مسلح ہیں۔ یہ سن کر کیپٹن ارشد کی پریشانی کچھ کم ہوئی۔ ہم نے چائے پی۔ میں نے کیپٹن ارشد کو ڈاک کی اہمیت کے متعلق مختصراً بتایا اور کہا پاکستان پہنچ کر منگل کو وائرلیس پر اپنے بخیریت پہنچنے کا بتا دیں تاکہ ڈاک کی کاپیاں ہم تلف کر دیں۔ ہم نے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ ہم ہوٹل سے اٹھے اور ہمارے پیچھے پیچھے میرے ساتھی بھی فاصلہ رکھ کر ہمیں کور دیتے رہے۔ کیپٹن ارشد نے تقریباً سو میٹر دور ایک دوسرے ہوٹل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس کے ساتھی وہاں بیٹھے ہیں جن میں ایک حوالدار اسے کور دینے کیلئے بھی ہے۔ میں نے کیپٹن ارشد کو اس ہوٹل میں جانے کو کہا اور اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ جس ساتھی نے ڈاک اٹھائی ہوئی تھی وہ آگے بڑھ آیا اور میرے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ باقی دو ساتھی ہمیں کور کئے ہوئے تھے۔ اسی انداز میں میرا ڈاک والا ساتھی اور میں ہوٹل کے بالکل نزدیک پہنچ گئے۔ میں نے ڈاک کا پیکٹ اس سے لے لیا اور ہوٹل کے اندر جا کر کیپٹن ارشد کے حوالے کیا۔ کیپٹن ارشد نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ آئندہ وہ کوریئر کا کام انجام دے گا۔ نشانی کے طور پر وہ "سب ٹھیک ہے" کیلئے سبز رومال اور خطرے کی صورت میں سرخ رومال گلے میں باندھے رہے گا اور میں بھی انہی سگنلز کیلئے کوٹ کی جیب میں لال اور سبز رومال نمایاں طور پر رکھوں گا۔ آئندہ کے کوریئر اور میں نے اچھی طرح ایک دوسرے کی شکلیں پہچان لیں اور تھوڑی دیر بعد میں کیپٹن ارشد سے رخصت ہونے لگا تو اس نے پاکستان سے آمدہ ڈاک کا پیکٹ مجھے اپنے ساتھیوں سے لے کر دیا۔ ڈاک لے کر میں ہوٹل سے باہر آ گیا اور اسے اپنے نمبر ٹو کو دے کر ایک ساتھی کے ہمراہ گھر بھیج دیا جبکہ تیسرا ساتھی اور میں ریلوے پلیٹ فارم پر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہی کیپٹن ارشد اپنے ساتھیوں سمیت آ گیا۔ 10 منٹ میں گاڑی بھی آ گئی وہ سب دو مختلف ڈبوں میں بیٹھ گئے۔ گاڑی روانہ ہوئی ہم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو الوداع کہا اور گھر واپس لوٹ آئے۔

اس دفعہ کی ڈاک میں ہمیں نئے کوریئر کے علاوہ اور کئی ہدایات سمیت سختی سے تنبیہ کی گئی تھی کہ اپنی سیکورٹی کا خاص خیال رکھیں۔ ایک ماہ کے اندر ہمارے دو گروپ پکڑے گئے تھے۔ ایک گروپ تو شہید ہو گیا تھا۔ جبکہ دوسرا گروپ جان لیوا ٹریننگ کے بعد اپنے پہلے مشن کے دوران ہی پکڑے جانے پر بھارت میں کام کرنے کیلئے بیکار ہو چکا تھا۔ (اس نئے گروپ کے متعلق میں نے کرنل شنکر کے حوالے سے مفصل رپورٹ بھی ڈاک میں بھیجی تھی) ڈاک میں ہمارے گھریلو خطوط بھی شامل تھے۔ ہمارے لئے یہ خطوط کسی نعمت سے کم نہ تھے۔ ان حالات میں دیار غیر میں گھر والوں کی خیریت کی اطلاع ملنا ہی بڑی بات تھی۔ جنرل کی ڈاک آج ہی بھیجی گئی تھی لہٰذا اس پر کوئی تبصرہ نہ تھا۔ یہ مرحلہ بھی بخیر و عافیت طے ہو چکا تھا۔ میں شام تک ساتھیوں کے گھر میں ہی رہا اور خوب گپ شپ ہوتی رہی۔ شام کو مالک مکان اوپر آیا اور مجھے کہا کہ وہ مجھ سے علیحدگی میں ملنا چاہتا ہے۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ وہ مجھے اپنے ہمراہ نیچے اپنے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھوں، چائے اور SNACKS آ گئے۔

غازی

مالک مکان نے مجھے چائے بنا کر دی اور SNACKS پیش کئے۔ میں اور وہ دونوں خاموشی سے چائے پی رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ مالک مکان علیحدگی میں مجھ سے کیا بات کرنا چاہتا ہے جب کوئی بات واضح نہ ہو تو انسان کی سوچ لامحدود وسعتوں تک جا پہنچتی ہے۔ میں نے یہ تو طے کر لیا تھا کہ خود اس سکوت کو نہ توڑوں گا۔ ادھر مالک مکان بھی شاید گفتگو شروع کرنے کیلئے موزوں الفاظ کی تلاش میں تھا۔ میرے کپ کی چائے ختم ہوئی تو مالک مکان نے مزید چائے ڈالتے ہوئے کہا۔ (میں نے آپ سے علیحدگی میں بات کرنے کی جو بات کی تھی وہ یقیناً آپ کو اور میرے کرایہ داروں کو کھٹکی ہو گی لیکن اس کے سوا کوئی دوسرا چارا بھی نہ تھا۔ کئی ماہ سے آپ کی یہاں آمد و رفت اور اپنے کرایہ داروں کا مجھے یہ بتا کر مکان کرایہ پر لینا کہ وہ مختلف شہروں سے کاروبار کے لئے دہلی آئے ہوئے ہیں۔ ان کا اپنے کاروبار کیلئے کبھی بھی کاروباری اوقات میں گھر سے باہر نہ جانا بڑی عجیب سی بات لگتی ہے اگر میں اپنی فیملی کے ساتھ یہاں نہ رہتا تو مجھے صرف کرایہ وقت پر لینے سے ہی غرض ہوتی لیکن اکٹھے رہتے ہوئے مجھے ان پر نگاہ بھی رکھنی پڑتی ہے میری جوان بچیاں ہیں اور ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے میرے لئے یہ بہت ضروری تھا)۔ وہ ذرا خاموش ہوا تو میں نے پوچھا کہ کیا کرایہ داروں نے کوئی نا مناسب حرکت کی ہے؟ (نہیں جی ایسی کوئی بات نہیں۔ ان کی شرافت کی تو میں قسم کھا سکتا ہوں۔ وہ تو ایک طرح سے ہمارے رکھوالے بنے ہوئے ہیں)۔ مالک مکان نے یہ کہہ کر میرے اس وہم کو دور کر دیا۔ (جناب بات دراصل یہ ہے کہ آپ کے ساتھ ان کی گفتگو کے انداز اور آپ کی غیر موجودگی میں آپ کو چیف کے نام سے مخاطب کرنا اور آپ کو سر کہنے سے ہمیں یہ تو یقین ہو گیا تھا کہ آپ سب کاروباری لوگ نہیں ہیں اوپری منزل کے برآمدے میں بیٹھ کر آہستگی سے کی ہوئی گفتگو بھی ہمیں نیچے سنائی دے جاتی ہے۔ جو کچھ ہماری سمجھ میں آیا وہ یہ تھا کہ ان کی بات چیت ہمیشہ کسی مشن کی تیاری، تکمیل یا ڈاک کے متعلق ہوتی ہے۔ میری چھوٹی بچی دو تین روز پہلے گلی میں سامنے والے ہمسایوں کے گھر اپنی سہیلی سے ملنے گئی ہوئی تھی دونوں چوبارے کی کھڑکی میں سے دیکھ رہی تھیں تو ہمارے کرایہ داروں نے سامنے والا دروازہ بند کر دیا لیکن کھڑکی بند نہ کی۔ کھڑکی کے سامنے ایک بڑا آئینہ دیوار میں لگا ہوا ہے۔ اس آئینے میں لڑکیوں نے دیکھا کہ کرایہ داروں نے ایک مشین نکالی۔ بجلی سے اس کو CONTACT کیا۔ ایریل کی ایک تار پہلے ہی سے کھڑکی میں سے باہر نکال رکھی تھی انہوں نے اس مشین سے ٹیلی گرام دینے والے ایک آلے کا استعمال کیا جبکہ کانوں سے ہیڈ فون لگائے، وہی کرایہ دار کچھ لکھتا بھی جاتا تھا۔ پندرہ منٹ تک انہوں نے اس مشین کو استعمال کیا اور پھر کہیں چھپا کر رکھ دیا اور دروازہ کھول دیا"۔ مالک مکان کی زبانی یہ بات سن کر میرے حواس اڑ گئے۔ میں نے خود پر قابو پانے کی بہت کوشش کی لیکن مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ کو مالک مکان نے اچھی طرح سے نوٹ کر لیا ہو گا۔ میں نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا "آپ نے اس بات سے کیا نتیجہ اخذ کیا؟" مالک مکان نے جواب دیا۔ "میرے خیال میں آپ کسی غیر ملک یا پاکستان کیلئے کام کر رہے ہیں اور آپ سب پاکستانی ہیں"۔ میں کچھ دیر خاموش رہا اور حواس کو مجتمع کر کے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ اگر آپ کو یقین ہے کہ ہم پاکستانی ہیں اور پاکستان کیلئے کام کر رہے ہیں تو آپ کے لئے تو یہ سنہری موقع ہے۔ پولیس کو اطلاع دے کر اور ہمیں پکڑوا کر آپ نہ صرف خاصے بڑے انعام کے حقدار بن سکتے ہیں بلکہ بھارت کی وفاداری کا ناقابل تردید ثبوت بھی دے سکتے ہیں" میرے یہ الفاظ ڈوبتے ہوئے شخص کی آخری کوشش کے مترادف تھے۔ مالک مکان نے میری بات سنتے ہی لاحول ولاقوۃ پڑھا اور کہا۔ "جناب میں آپ کو نہیں جانتا لیکن اتنا ضرور سمجھتا ہوں کہ خدانخواستہ اگر میری سوچ ایسی ہوتی تو آج آپ پولیس یا فوج کی حراست میں ہوتے ہم الحمدللہ مسلمان ہیں دنیا بھر کے مسلمانوں اور خصوصاً پاکستانی مسلمانوں کو اپنا قبیلہ سمجھتے ہیں۔ ہم دہلی کے پنجابی سوداگران فیملی سے ہیں پاکستان میں بھی ہماری خاصی وسیع رشتہ داری ہے۔ آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ ہم آپ کو پکڑوا دیں گے جناب والا میں تو آپ کے متعلق یہ یقین کر کے کہ آپ واقعی پاکستانی ہیں اور پاکستان کے مفاد میں کام کر رہے ہیں آپ کو دہلی میں ان مسلمانوں کے متعلق بتانا اور ملانا چاہتا ہوں جن کی زیر زمین سرگرمیاں بھارت کے خلاف ہیں اور وہ کوئی ایسا موقع ضائع نہیں کرتے جس سے ہندوستان کو زک پہنچائی جا سکے"۔

میرے لئے مالک مکان کی یہ باتیں اچانک اور خلاف توقع تھیں کہ میں فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنے کے قابل نہ رہا تھا۔ چند منٹ تو میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس دوران اس کے متعلق سینکڑوں مثبت اور منفی خیالات میرے دماغ میں آئے۔ وہ ہماری اصلیت اور ٹرانسمیٹر کے متعلق جان چکا تھا۔ ایسی صورت حال درپیش آنے پر ہمیں جو ہدایات دی گئی تھیں ان کے مطابق تو ہمیں انہیں بلا تاخیر ختم کر دینا چاہئے تھا۔ اسی کے ساتھ مجھے لیفٹیننٹ کا خیال آیا جو ہندو ہوتے ہوئے بھی اپنی اغراض اور اپنی جان کے خوف سے ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کر رہا تھا جیسا کہ میں نے ابھی ابھی مالک مکان سے کہا تھا کہ ہمارے متعلق اتنا کچھ جان لینے کے بعد تو اسے پولیس کو اطلاع کر دینی چاہئے تھی۔ اس کا پہلے ہی سے ایسا نہ کرنا اور ہمیں پاکستان کے ہمدردوں سے متعارف کرانے کی پیشکش کرنا اس کی کوئی چال نہیں ہو سکتی تھی۔ خاموشی کے ان چند منٹوں میں، میں نے بہت کچھ سوچا اور بالآخر اس ذہنی کشمکش سے نکل کر ایک فیصلہ کر لیا۔ میں نے مالک مکان کو مخاطب کرتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں آپ کو فی الحال اپنے اور اپنے ساتھیوں کے متعلق یہی بتا سکتا ہوں کہ آپ نے جو کچھ سوچا ہے وہ درست ہے۔ ہم اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھے یہ کام کر رہے ہیں اور اپنے کام میں رکاوٹ بننے والی ہر ہستی کو بلا تاخیر ختم کر دینے میں ہمیں کوئی عار یا جھجک نہیں لیکن اپنے وطن کے حامیوں کیلئے ہم اپنی جانیں لڑا دینے کو بھی تیار ہیں۔ آپ نے ہماری حقیقت جاننے کے باوجود جو رویہ اپنایا ہے۔ اس کی وجہ سے آپ کے خلوص پر تو کوئی شک و شبہ نہیں۔ آپ نے جن زیر زمین ہمدردوں کا ذکر کیا ہے۔ امکان ہو سکتا ہے کہ ان میں شاید کچھ کالی بھیڑیں بھی موجود ہوں۔ ہماری جانوں سے بہت زیادہ اہم ہمارا مشن ہے۔ لہٰذا آپ ان کو ہماری اصلیت کے متعلق فی الحال کچھ نہ بتائیں۔ ہمیں ان سے ملوائیں ہم خود اپنے ڈھب سے انہیں ٹھونک بجا کر اپنی تسلی کریں گے۔ آپ انہیں ہمارے متعلق یہی بتائیں کہ ہم ان کے ہم خیال بھارتی مسلمان ہیں۔ انہیں یہ بھی نہ بتائیں کہ میرے ساتھی آپ کے کرایہ دار ہیں"۔ میں جانے کے لئے اٹھا تو مالک مکان نے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ کہنے لگا کہ پاکستان ہی ہم بھارتی مسلمانوں کی آخری امید ہے۔ مشرقی پاکستان میں اندرونی گڑبڑ اور بغاوت سے فائدہ اٹھا کر بھارت نے جو کچھ کیا اس سے بھارتی مسلمانوں کی آنکھیں کھل چکی ہیں چانکیہ کے پیروکاروں کا اصل روپ سامنے آ گیا ہے۔ اپنے ہی ہم مذہبوں کی ذاتوں کے اونچ نیچ میں یقین کرنے والا ہندو بھلا مسلمانوں کو کیسے برداشت کر سکتا ہے۔ ہمیں تو وہ ملیچھ کہتا ہے یعنی اپنی کمترین ذات شودر سے بھی کمتر جس کا سایہ بھی پڑ جانے سے وہ بھرشٹ (ناپاک) ہو جاتا ہے۔ بھارت میں سیکولرازم کے جھوٹے پروپیگنڈے کا پول مشرقی پاکستان میں مداخلت سے کھل چکا ہے اور جو بھارتی مسلمان اس پروپیگنڈے کا شکار ہو چکے تھے وہ بھی اب اس متعصبانہ ذہنیت کو بخوبی جان چکے ہیں۔ چند غدار مسلمان خاندانوں کو چھوڑ کر جنہیں بھارتی حکومت نے مراعات دے کر خرید رکھا ہے، سارے بھارت کے مسلمان ایک ہو چکے ہیں اور آپ دیکھیں گے کہ جب بھی وقت آیا تو بھارتی مسلمان وہی کردار ادا کریں گے جو مشرقی پاکستان میں مکتی باہنی نے کیا تھا۔ میں آئندہ چند روز میں چیدہ چیدہ ہم خیال ساتھیوں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے آپ سے ملواؤں گا اور اس میٹنگ کے دن، وقت اور جگہ کا آپ کے ساتھیوں کو بتا دوں گا۔

مالک مکان سے رخصت ہو کر میں اپنے ساتھیوں کے پاس چلا گیا اور انہیں اس گفتگو کے متعلق بتایا۔ انہوں نے بھی میرے فیصلے کی تائید کی اور میں اس ہونے والی ملاقات کی روشنی میں اپنے ایک نئے مشن کے خدوخال بناتا ہوا اپنے ہوٹل چلا آیا۔ بدھ کے روز ٹرانسمیٹر پر ہمیں کیپٹن ارشد کے ڈاک کے ہمراہ بخیریت پاکستان پہنچنے کی خوش خبری دی گئی۔ کیپٹن ارشد سے ملاقات کے دوران چونکہ نئے کوریئر سے ملنے کی جگہ کا تعین نہیں کیا گیا تھا اس لئے کیپٹن ارشد سے ملنے والی جگہ پر ہی آئندہ اتوار کو کوریئر سے ملنے کا کہا گیا۔ میں نے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اب تک بھیجے جانے والی ڈاک کی سب کاپیاں آتش دان میں جلا ڈالیں۔ منگل کو لیفٹیننٹ سے نئی ڈاک مل چکی تھی اور ساتھ ہی ایک خط بھی جس میں مجھے بدھ کی شام کو ملنے کا لکھا تھا۔ میں چاوڑی بازار کے ریسٹورنٹ میں جا جا کر تنگ آ چکا تھا لیکن اس سے زیادہ محفوظ جگہ اور کوئی نہ تھی۔ گولچہ سینما کا ریسٹورنٹ بھی پاکستانی جاسوسی گروپس کے پکڑے جانے کے بعد اتنا محفوظ نہیں رہا تھا کیونکہ بھارتی سیکورٹی بہت سخت ہو چکی تھی اور آئی بی اور DMI کے کتے ہر جگہ بو سونگھتے پھرتے تھے۔ لیفٹیننٹ نے ملاقات پر اپنی حسرت کے پورا ہونے کی باتوں کے علاوہ مجھ سے مزید روپے مانگے۔ شمی کی مانگیں پورا کرنے کیلئے اسے روپے کی ضرورت تھی۔ لیفٹیننٹ کو دیئے جانے والے ایک ایک پیسے کا میں نے باقاعدہ حساب رکھا ہوا تھا۔ میں نے اسے دو ہزار روپے دیئے اور کہا کہ اب تک کے سب کام کا معاوضہ اسے مل چکا ہے۔ اب صرف آئندہ کی جمعے میں دوبارہ کی ڈاک کا معاوضہ اسے دیا جائے گا۔ جب تک وہ کوئی بڑا کام سرانجام نہیں دیتا۔ میں جانتا تھا کہ لیفٹیننٹ نے جس کیچڑ بھرے جوہڑ میں چھلانگ لگائی تھی اس میں خون چوسنے والی جونکوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ شمی کی فرمائشیں پوری کرنے کیلئے لیفٹیننٹ کو بڑے سے بڑا رسک لینا ہی پڑے گا۔

یہ جمعہ کی رات تھی۔ غالباً دو بج رہے تھے جب ٹیلی فون کی گھنٹی کے مسلسل بجنے سے میں نیند سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ یہ میرے نمبر ٹو کا فون تھا۔ اس نے کہا کہ مالک مکان (نذیر شیروانی) مجھ سے فوری ملنا چاہتا ہے۔ یہ فون بھی وہ اسی کے گھر سے کر رہا تھا۔ نذیر شیروانی نے اسے کہا تھا کہ میرا اس سے فوری ملنا بے حد ضروری ہے اور وقت اس ملنے میں انتہائی اہم ہے۔ میں حیران تھا کہ رات کے اس وقت ایسا کون سا اہم کام ہو سکتا ہے جس کے لئے نذیر مجھ سے اسی وقت ملنا چاہتا ہے۔ میں نے نمبر ٹو کو کہا کہ نذیر سے میری بات کروائے۔ نمبر ٹو نے بتایا کہ نذیر ڈرائنگ روم میں ایک نووارد کے ساتھ بیٹھا ہے اور یہ فون وہ اس کے رہائشی کمرے سے کر رہا ہے اور اسے ابھی بلا کر لاتا ہے۔ ایک منٹ کے اندر ہی نذیر فون پر تھا۔ اس نے کہا کہ وہ مجھے کسی سے فوری ملوانا چاہتا ہے جو اپنے ساتھ میرے لئے ایک انمول تحفہ لایا ہے۔ یہ ساری بات کچھ اس ڈھب سے ہوئی تھی کہ میں نے اس کے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جلدی میں کپڑے بدل کر اور سائیلنسر والا پسٹل لے کر میں ہوٹل کی لابی میں آ گیا۔ اس وقت سڑک پر ٹیکسی ملنا محال تھی۔ شفٹ منیجر نے بتایا کہ ایئرپورٹ سے مسافروں کو لانے اور لے جانے والی گاڑی میں وہ مجھے جگہ دے سکتا ہے جس کا کرایہ ٹیکسی کے کرائے سے 10 گنا زیادہ تھا۔ میرے پاس کوئی اور چارہ نہ تھا۔ میں نے وہی گاڑی لے لی اور ساتھیوں کے گھر کے قریب پہنچ کر اسے رخصت کر دیا۔ گلی بالکل سنسان تھی اور گلی کے سامنے میرے دو ساتھی میرا انتظار کر رہے تھے۔ گھر پہنچنے تک میں نے ان سے اس وقت بلانے کی وجہ جاننا چاہی لیکن انہیں بھی کچھ علم نہ تھا۔ نمبر ٹو نے انہیں مجھے کور دینے کے لئے بھیجا تھا۔ وہ اتنا ہی جانتے تھے بلکہ حیران تھے کہ ایسی کیا بات تھی جس کے باعث مجھے اس وقت بلایا گیا۔

میں نذیر کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو نووارد کو دیکھتے ہی میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور یہی کیفیت اس شخص کی تھی میں نے دونوں ساتھیوں کو مکان کی ڈیوڑھی میں مستعد اور چوکس رہنے کا کہا۔ نمبر ٹو کو میں نے اشارہ کیا اور وہ اوپر چلا گیا۔ اب ڈرائنگ روم میں نذیر، میں اور وہ نووارد تھے۔ نووارد اور میں ابھی تک ایک دوسرے کو گھور رہے تھے اور نذیر حیرانی سے ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر میں نے پسٹل ہولسٹر سے نکال کر ہاتھ میں تھام لیا۔ بات ہی کچھ ایسی تھی۔ نووارد کرنل شنکر کا بیٹ مین عبدالکریم تھا جو مجھے کرنل شنکر کے دوست ونود چوپڑا کے نام سے جانتا تھا اور میں عبدالکریم کو نذیر شیروانی کے گھر اس وقت دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ پسٹل کو میرے ہاتھ میں دیکھ کر وہ دونوں گھبرا گئے تھے اور ان کی گھگھی بندھ گئی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میں کسی بہت بڑی سازش کا شکار ہو رہا ہوں۔ میں کسی قیمت پر بھی اپنا اور اپنے ساتھیوں کا اس طرح جال میں پھنس جانا برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میری سوچ یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ ان دونوں کو ختم کر کے ہمیں یہاں سے نکلنے میں زیادہ سے زیادہ 15 منٹ لگیں گے۔

عبدالکریم کے منہ سے نکلا بھی تو "ونود صاحب میرا کیا قصور ہے"۔ عبدالکریم کے ونود صاحب کہنے پر نذیر اور گھبرا گیا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کسی سازش کا شکار ہو چکا ہے۔ ہم تینوں کی اس وقت کی کیفیت ایسی تھی جسے تحریر کرنا ممکن نہیں۔ میں نے پستول کی نال کا رخ نذیر کی طرف کرتے ہوئے پوچھا "یہ کیا چکر ہے؟" نذیر بے اختیار کہنے لگا ونود صاحب میری جوان بچیاں ہیں مجھے معاف کر دیں۔ عبدالکریم نے میرے آگے ہاتھ باندھ دیئے۔ حضور مجھے معاف کر دیجئے۔ مجھ سے بہت بڑی بھول ہو گئی ہے اور میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میں نے پستول کا رخ عبدالکریم کی طرف کیا "تم بولو اور فوراً بولو یہ کیا معاملہ ہے"۔ عبدالکریم کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے کہا کہ نذیر صاحب نے تو اسے بتایا کہ کسی پاکستانی فوجی افسر سے اسے ملوانا ہے۔ میں نے پستول نذیر کی طرف کرتے ہوئے اسے پستول سے ہی اشارہ کیا کہ اب وہ بولے۔ جب وہ کچھ نہ بولا تو میں نے اسے کہا کہ اگر تم دونوں نے مجھے ساری بات فوراً نہ بتائی تو میں بغیر کسی مزید وارننگ کے دونوں کو شوٹ کر دوں گا۔ میں نے پسٹل پر لگے سائیلنسر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ گولیاں چلنے کی آواز بھی نہ آئے گی اور تم ٹھنڈے ٹھنڈے لیٹ جاؤ گے۔ میری اس دھمکی نے خاطر خواہ اثر کیا اور نذیر نے زبان کھولی۔

جناب مجھے معلوم نہیں کہ آپ مسلمان ہیں یا ہندو۔ پاکستانی ہیں یا بھارتی۔ میں نے تو آپ سے جو گفتگو کی تھی، اسی کے بھروسے پر عبدالکریم کو جو ہمارا ساتھی ہے آپ سے ملوانے یہاں بلوایا تھا۔ عبدالکریم نے اس کی بات کاٹی۔ یہ ونود صاحب ہیں اور میرے کرنل کے دوست ہیں اور درجنوں بار میرے کرنل سے ملنے سروسز کلب میں آ چکے ہیں اور میں بھی ان کے پاس لودھی ہوٹل کئی بار جا چکا ہوں۔ شیروانی صاحب آپ نے مجھے مروا دیا۔ میں آپ کے کہنے میں آ کر ایسی فاش غلطی کر چکا ہوں کہ اب میرے بچنے کی کوئی امید نہیں۔ یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ادھر میں سوچ رہا تھا کہ کہیں نہ کہیں کوئی ایسی غلط ضرور بات ہے جس کے باعث یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ یک لخت میرے دماغ میں روشنی کا ایک کوندا لپکا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس سب مخمصے کی بنیاد "ونود" ہے۔ میں نے چند سیکنڈ اس پر غور کیا اور ان دونوں سے کہا کہ سچائی یہ ہے کہ میں مسلمان اور پاکستانی ہوں لیکن بھارت میں ونود نام سے رہ رہا ہوں۔ میری اس بات کی تصدیق میرے ساتھی بھی کر سکتے ہیں۔ میری یہ بات سن کر ان کی سراسیمگی میں کمی آئی لیکن انہیں میری بات کا یقین تب ہی آیا جب میں نے پسٹل واپس ہولسٹر میں رکھ لیا۔ عبدالکریم کہنے لگا۔ سر تین چار روز پہلے نذیر صاحب نے آپ کا ذکر کیا تھا۔ میں تو ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھا۔ آج کرنل شنکر کے پاس DMI کے ایک بریگیڈیئر آئے تھے۔ اس بریگیڈیئر نے اپنے بریف کیس سے ایک ڈائری نکال کر کرنل شنکر کو دکھائی۔ میں اپنی جگہ پر کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے کرنل شنکر کو کہا کہ اس ڈائری میں ان بھارتی پاکستانی اور بنگلہ دیش بننے کے بعد پاکستان جانے والے مسلمانوں کے لئے CONTACT کے ذرائع کی تفصیل درج ہے جو بھارتی مفاد کے لئے کام کر رہے ہیں اور DMI کے پے رول پر ہیں۔ ڈائری دیکھنے کے بعد کرنل شنکر نے بریگیڈیئر کو واپس کر دی اور کہا کہ میں جنرل سے بات کر کے تمہاری اس کے ساتھ میٹنگ رکھوا دوں گا تاکہ ہیڈ کوارٹر کی طرف سے تمہارے فنڈ میں اضافہ ہو سکے۔ جنرل اگرچہ تم سے اس لئے ناخوش ہے کہ تم اسے اپنی کارکردگی کی رپورٹ نہیں دیتے ہو اور فوج میں ہوتے ہوئے خود کو ہم سے افضل سمجھتے ہو لیکن تم سے ملاقات اور ڈائری دیکھ کر وہ یقیناً تم سے تعاون کرے گا۔ بریگیڈیئر نے ڈائری بریف کیس میں رکھ دی اور مجھے بریف کیس کرنل کے کمرے میں "حفاظت" سے رکھنے کا کہا۔ وہ تو مے نوشی میں مشغول ہو گئے اور میں موقع پا کر "حفاظت" سے وہ بریف کیس ہی یہاں اٹھا لایا ہوں۔ کیونکہ یہ نمبروں والا بریف کیس کھولنا میرے بس میں نہ تھا۔ اب میری واپسی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب میں یہاں انڈر گراؤنڈ کام کرنے والے ساتھیوں کے ہمراہ رہ کر خود کو پوشیدہ رکھوں گا۔ کیونکہ اب تک ہر طرف میری تلاش میں سینکڑوں فوجی مصروف ہو چکے ہوں گے۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آئندہ میرے بچاؤ کا کیا انتظام کرتے ہیں۔ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے اور آئندہ بھی کرتا رہوں گا۔ میں نے بریف کیس کے متعلق پوچھا تو اس نے صوفے کے پیچھے سے اٹھا کر میرے سامنے رکھ دیا۔ نمبروں والا یہ بریف کیس کھولنا ممکن نہ تھا۔ میں نے اپنے نمبر ٹو کو بلوایا اس نے اپنے ٹرانسمیٹر ٹھیک کرنے کے اوزاروں سے چند منٹ میں ہی اس کے اندرونی تالے توڑ کر اسے کھول دیا۔ چار یا پانچ فائلوں (جن پر ٹاپ سیکرٹ لکھا ہوا تھا) ایک ڈائری بھی تھی۔ میں نے ڈائری کھولی تو اس میں عبدالکریم کے کہنے کے مطابق پاکستان میں بھارت میں کام کرنے والوں کے نام، پتے اور CONTACT کے ذرائع درج تھے۔ میں نام پڑھ رہا تھا اور میری حیرت اور وحشت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس ڈائری میں چند پاکستانی کلیدی سیاست دانوں، نوکر شاہی، صنعت کاروں اور تجارت کاروں کے نام بھی تھے۔ جن کے متعلق پاکستان میں کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ پاکستان کی محبت کا دم بھرنے والے یہ اہم اور مشہور و معروف لوگ پاکستان کے خلاف بھارت کیلئے جاسوسی کرتے تھے اور اس کا کثیر معاوضہ فارن کرنسی میں وصول کرتے تھے۔

قسط نمبر 25

غازی

اس ڈائری میں درج ناموں سے محسوس ہوتا تھا کہ پاکستان میں بھارت نے اپنے جاسوسوں کا بہت بڑا نیٹ ورک بنا رکھا ہے۔ شاید ہی ایسا کوئی شعبہ ہو جس میں بھارتی جاسوس داخل نہ ہوں۔ پشاور سے کراچی تک ہر بڑے شہر اور چھاؤنی میں اس کے کارندے موجود تھے۔ اس میں وہ صنعت کار بھی شامل تھے جنہوں نے حکومت پاکستان سے خصوصی مراعات اور بینکوں سے قرضے لے کر بڑی بڑی صنعتیں لگا رکھی تھیں وہ بیوروکریٹس بھی ان کے پے رول پر تھے جن کی قابلیت اور اتھارٹی کے پاکستان بھر میں چرچے تھے۔ ان سیاستدانوں کے نام بھی تھے جن کا قبلہ دہلی اور گاڈ فادر گاندھی تھا اور وہ سیاست دان بھی تھے جو اپنے جلسوں میں پاکستان سے محبت اور اس کی بقا کیلئے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینے کے دعوے کرتے تھے۔ سابقہ پاکستان سے سقوط ڈھاکہ کے بعد اس بچے کھچے پاکستان میں آنے والے PLANTED مسلمانوں اور ان مسلمانوں کے روپ میں بھارت کے تربیت یافتہ ہندو جاسوسوں کے نام اور CONTACT کے ذرائع بھی درج۔ میں تو حیران تھا کہ اتنے منظم اور وسیع نیٹ ورک کے ہوتے ہوئے پاکستان اب تک بھارت کے ہاتھوں بچا کیسے ہوا تھا۔ مختصراً پاکستان کی حالت اس ڈائری کی روشنی میں سقوط ڈھاکہ سے تین سال قبل کے مشرقی پاکستان کے حالات کے عین مطابق تھی جب ''اگرتلہ سازش کیس'' منظر عام پر آیا اور اس سازش میں ملوث غداروں کو قید سے چھڑوانے کیلئے پاکستان کے تقریباً سبھی سیاسی جماعتوں کے لیڈر یک زبان ہو گئے تھے۔ ادنیٰ سے اعلیٰ بیوروکریسی کھلے عام پاکستان کے (خدانخواستہ) ختم ہونے کی باتیں کرتی تھی۔ اعلیٰ کاروباری حلقے اور صنعت کاروں نے حکومت سے عدم تعاون کر کے سول نافرمانی کی صورتحال پیدا کر دی تھی۔ بڑی معذرت کے ساتھ یہ لکھنے پر مجبور ہوں کہ پاکستان کی دفاعی جاسوس ایجنسیاں بھی افواج پاکستان میں شامل ان بنگالی پاکستانیوں کی نشان دہی میں ناکام ہو چکی تھیں جنہوں نے پاکستان سے وفاداری کا حلف اٹھا کر آرمی، ایئر فورس اور نیوی میں کمیشن حاصل کئے تھے اور پاکستان کے محافظوں کے بھیس میں وہ غداری کی اعلیٰ ترین مثالیں قائم کر رہے تھے۔ 71ء کی پاک بھارت جنگ سے پہلے ہی بھارت کو پاکستان کے تمام دفاعی راز ان غداروں نے پہنچا دیئے تھے اور ان غداروں کی وجہ سے ہی جنگ شروع ہوتے ہی بھارتی ایئر فورس نے پاکستان کے خفیہ ہوائی اڈوں اور AIR STRIPS (چکوال اور شورکوٹ) کو اپنی بمباری کا نشانہ بنایا تھا اور پاکستان نے انتہائی مجبوری کے عالم میں اپنی ایئر فورس کے جہاز ایران بھیج دیئے تھے بھارتی بمبار اور لڑاکا جہاز کراچی سے پشاور تک بلا روک ٹوک منڈلاتے رہتے تھے۔ انہی غداروں نے اس وقت پاکستان کی واحد آبدوز ''غازی'' کی صحیح نشان دہی کی اور اسے بمبئی کے قریب بھارتی فریگیٹ جہازوں نے گھیرے میں لے کر DEPTH CHARGERS مار کر ڈبو دیا تھا اور انہی غداروں نے بھارت کو خفیہ سگنل دے کر پاکستان کے کروز جنگی جہاز خیبر کو بھارتی میزائل بوٹ کے میزائلوں کا نشانہ بنوایا تھا۔ خیبر جہاز صرف 6 منٹ میں اپنے سات سو سے زیادہ بحری افسروں اور جوانوں کے ساتھ ڈوب گیا۔ اس جہاز کی زیر قیادت ایک فریگیٹ کے بنگالی کپتان نے اپنے بنگالی وائرلیس آپریٹر کے ذریعے بھارتی نیوی کو سگنل دے کر خیبر کی نشاندہی کی تھی خود اسے کوئی نقصان نہ پہنچا تھا اور دنیا کو دکھانے کیلئے یہ جہاز بھارتی نیوی کی ''حراست'' میں وزکا پٹم کی بندرگاہ پر بخیر و عافیت پہنچ گیا۔ مشرقی پاکستان میں ایسٹ پاکستان رجمنٹس، ایسٹ پاکستان رائفلز کے علاوہ بنگالی پولیس نے بھی کھلی بغاوت کر کے اپنے مغربی پاکستان کے افسران اور جوانوں اور ان کے بیوی بچوں کو بے دردی سے شہید کر دیا تھا۔ افواج پاکستان میں مشہور عالم ہوا باز ایم ایم عالم جیسے محب وطن بنگالی تو چند ایک ہی تھے جبکہ غدار بنگالی جوان اور افسر ہزاروں کی تعداد میں تھے جن کی غداری کے سیاہ کارنامے پاکستان کی تاریخ میں تاقیامت موجود رہیں گے۔ کھٹمنڈو (نیپال) میں پاکستان کا سفیر بنگالی تھا۔ اس نے پاکستانی سفارت خانے پر قبضہ کر کے اس پر بنگالی باغیوں کا جھنڈا لہرا دیا اور وائرلیس کی کوڈ اور ڈی کوڈ کی کتاب بھی بھارتی سفارتخانے کے حوالے کر دی۔ اس DEFACTOR (غدار) کی وجہ سے تمام خفیہ پیغامات بھارت کیلئے کھلی کتاب بن گئے۔ پاکستان نے افراتفری کی حالت میں کھٹمنڈو میں ایک کرائے کے مکان میں نئے پاکستانی سفیر اور نئے عملے کے ساتھ سفارت خانہ کھولا اور فوری طور پر نئی ہوئی نئی کوڈ اور ڈی کوڈ بک دنیا بھر میں اپنے سفارت خانوں کو جاری کی۔

بریف کیس میں دوسرے کاغذات اتنے اہم نہ تھے۔ میں نے نمبر ٹو کو ڈائری کے ہر صفحے کے دو دو فوٹو بنانے کیلئے کہا اور کمرے میں مالک مکان عبدالکریم اور میں رہ گئے۔ ڈیوڑھی میں کور دینے والے ساتھیوں کو بھی میں نے آرام کرنے کا کہا۔ یہ ڈائری تو میرے سینئرز کیلئے ایک نعمت مترقبہ تھی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اتنی اہم ڈائری ہمارے ہاتھ آ جائے گی۔ اس خوشی کے ساتھ ساتھ میں نے کمرے میں موجود بے یقینی اور بے اعتمادی کی فضا کو ختم کرنا چاہا۔ میں نے اٹھ کر عبدالکریم اور پھر نذیر شیروانی (مالک مکان) کو گلے لگایا اور انہیں تفصیلاً بتایا کہ میں نے اس کمرے میں جو کچھ بھی کیا وہ اپنے مشن کی سیکورٹی کیلئے کیا۔ اب جبکہ تمام غلط فہمیاں دور ہو چکی ہیں تو ہمیں اب مل کر آئندہ کے لائحہ عمل کے متعلق سوچنا چاہئے۔ صبح ہو چکی تھی، نذیر کے گھر سے گرما گرم چائے اور انڈے پراٹھوں کا ناشتہ آ گیا۔ اب ہمارا فوری اور حل طلب مسئلہ عبدالکریم کی حفاظت کرنا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ نہ صرف دہلی بلکہ پورے بھارت میں اس کی تلاش شروع ہو چکی ہوگی۔ اس کا ان حالات میں بھارت میں کہیں بھی رہنا خطرے سے خالی نہ تھا اور اس کے پکڑے جانے کی صورت میں ہمارا مشن بھی خطرے سے دوچار ہو سکتا تھا۔ میں نے انہیں کہا کہ کم از کم ایک ہفتہ تو عبدالکریم میرے ساتھیوں کے ہمراہ رہے اور کمروں سے باہر نہ نکلے۔ جب دہلی میں اس کی تلاش کی سرگرمی کم ہو جائے تو اسے دہلی کے زیر زمین ہمدردوں کے پاس پہنچا دیا جائے۔ میں اس دوران ڈائری پاکستان بھیج کر اپنے سینئرز سے پرزور درخواست کروں گا کہ وہ عبدالکریم کو پاکستان بلوا لیں اور اس کی خدمت کے عوض اسے پاکستان کی شہریت دلوا دیں۔ مجھے یقین تھا کہ میری درخواست رد نہیں کی جائے گی۔ عبدالکریم نے پاکستان جانے کی پرزور خواہش ظاہر کی۔ بھارت میں اس کا کوئی قریبی رشتہ دار اور سرپرست نہیں تھی۔ فوج میں اس سے جو ذلت آمیز سلوک کیا جاتا تھا اس کی وجہ سے وہ انتہائی افسردہ اور بددل ہو چکا تھا اور اب سب سے اہم وجہ

D . M . I

کے بریگیڈیئر کا انتہائی خفیہ رازوں سے بھرا بریف کیس لے کر فرار ہونا تھا اور پکڑے جانے کی صورت میں انتہائی تشدد اور موت اس کا مقدر ہو چکی تھی۔ میں عبدالکریم کو لے کر اوپر ساتھیوں کے پاس گیا۔ ان کی رات بھی آنکھوں میں کٹی تھی۔ میں نے انہیں تمام واقعہ بتایا اور کہا کہ عبدالکریم اب ان کے ساتھ رہے گا اور اسے کمروں سے باہر ہرگز نہ نکلنے دیں۔ علیحدگی میں انہیں کہا کہ عبدالکریم نے بے شک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اور اسے بحفاظت پاکستان بھیجنے کیلئے پوری کوشش کروں گا لیکن وہ عبدالکریم کی طرف سے ہمیشہ محتاط رہیں۔ اس نے بغیر کسی لالچ اور کسی فائدے کے بغیر اتنا خطرناک کام کیا ہے اس کی وجہ اس کی بیزاری اور حالات سے سمجھوتہ نہ کرنے والی لاابالی شخصیت ہے۔ بھارتی افسروں کی گالیوں نے چنگاری کو شعلہ بنا دیا ہے۔ اس صورت حال میں وہ یہاں بھی کوئی ایسی حرکت کر سکتا ہے جو ہم سب کو کسی مصیبت میں پھنسا دے۔ میں نے ساتھیوں کو کہا کہ اول تو وہ کوئی ایسا موقع ہی نہیں آنے دیں اور اگر بفرض محال انہیں ایسی صورت کا سامنا ہو تو فوری طور پر اسے خنجر سے ہلاک کر دیا جائے جس طرح اپنی زندگیوں سے زیادہ اپنے مشن کو اہمیت دیتے ہیں ویسے ہی ہمیں اپنے مشن کی حفاظت کیلئے کسی کی جان لینے میں دریغ نہیں کرنا چاہئے۔ بے شک وہ عبدالکریم ہی کیوں نہ ہو۔ میرے ساتھیوں نے کہا کہ اس صورت میں کم از کم دو آدمی گھر میں ہمیشہ موجود رہیں گے اور سیڑھیوں کے اوپر والے دروازے کو ہمیشہ مقفل رکھیں گے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ عبدالکریم کو انڈر گراؤنڈ ہمدردوں کے پاس نہیں بھیجنا چاہئے۔ ان کے پاس نہ کوئی مشن ہے اور نہ ہی وہ عبدالکریم کی مکمل حفاظت کر سکیں گے۔ ہمیں نہ صرف عبدالکریم کو گرفتاری سے بچانا تھا بلکہ اس کو بھی نامحسوس ہونے والی حراست میں رکھنا تھا۔ اور یہ کام کرنے کا میرے ساتھیوں نے خود ذمہ اٹھایا۔ میں نے ان کی تجویز سے اتفاق کیا اور انہیں مزید ہدایات دے کر پھر مالک مکان کے پاس چلا آیا اور اسے کہا کہ حالات نے اچانک ایسا رخ اختیار کر لیا ہے اسے بھی پوری طرح محتاط رہنا ہوگا۔ کم از کم پندرہ روز تک وہ زیر زمین ساتھیوں سے ملنے سے گریز کرے۔ گھر سے باہر کم ہی جائے اور کسی طرح اپنے گھر کے سامنے والے ہمسائے کو کہے کہ تمہاری بیٹی کی سہیلی نے چوبارے پر جو کچھ دیکھا تھا اس کا ذکر کسی سے نہ کرے۔ اس پر مالک مکان نے بتایا کہ اس کا ہمسایہ تو خود انڈر گراؤنڈ ہمدردوں کا ایک طرح سے سرپرست ہے اور اس کے گھر سے راز کی کوئی بات ہرگز باہر نہ نکلے گی۔ اس سے رخصت ہو کر میں اپنے ہوٹل چلا آیا۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ سویا تو شام ڈھلے آنکھ کھلی۔ دوسرے روز میں نے شہر کا جائزہ لینے کا سوچا۔ بلاوجہ ٹیکسی میں شہر گھومنا محفوظ نہ تھا۔ میں اشوکا ہوٹل چلا گیا اور وہاں سے ٹورسٹ بس میں نئی اور پرانی دہلی کے قابل دید مقامات کی سیر بھی کی اور شہر کی حالت کا بھی جائزہ لیا ہر جگہ مخصوص لوگوں کی بھاگ دوڑ، خاص طور پر پبلک مقامات اور مسلمانوں کے رہائشی علاقوں میں جگہ جگہ چیکنگ دیکھنے میں آئی۔ قرول باغ اور خواجہ نظام الدین اولیا کی درگاہ تو پورے طور پر پولیس کے محاصرے کی حالت میں تھا۔ چاندنی چوک، لال قلعہ، قطب مینار اور ہمایوں کے مقبرے میں بھی سول لباس میں فوجی اور پولیس ہر آنے والے کی جانچ کر رہے تھے۔ انہیں غالباً عبدالکریم کے قد کاٹھ، سر اور چہرے کے متعلق بریف کیا گیا تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ عبدالکریم سے مشابہت رکھنے والے ہر شخص سے پوچھ گچھ کی جا رہی تھی۔ دہلی کی یہ حالت کم و بیش پندرہ روز تک برقرار رہی۔ اس دوران ہمیں لیثونت سے ڈاک معمول کے مطابق ملتی رہی۔ بدھ کے روز پاکستان رابطہ کرنے پر پھر جیک پاٹ ملنے کی خبر اور معتبر کیریئر کو بھیجنے کا انتہائی مختصر پیغام بھیجا۔ آئندہ اتوار کو وائرلیس پیغام ملا کہ گزشتہ ڈاک لینے والا کیریئر بدھ کو اسی مقام پر ملے گا۔ اس بار بدھ کو کیپٹن ارشد پہلے کی طرح ملا۔ میں نے ڈاک اور ڈائری اس کے حوالے کی۔ اپنی ڈاک میں، میں نے عبدالکریم کے کوائف مفصل طور پر لکھے اور اسے پاکستان بلوانے کی درخواست کی۔ میں نے یہ بھی لکھا کہ عبدالکریم جب تک ہماری حفاظت میں ہے ہمارا مشن اور ہم سب خطرے میں ہیں اور اسکی نگرانی میں ہمہ وقت مصروف رہنے کی وجہ سے میرے ساتھی آئندہ مشنوں میں ساتھ دینے سے قاصر ہیں۔ لہٰذا اسے فوری پاکستان بلوانے کا انتظام کیا جائے۔ ورنہ پاکستان کے مفاد کیلئے جان کی بازی لگا کر اتنا بڑا کارنامہ انجام دینے والے کو زندگی کی ضمانت اور انعام دینے کے بجائے ہمیں مجبوراً ہلاک کرنا پڑے گا۔

میری اس تحریر کا میرے سینئرز پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ عبدالکریم کو ہمارا مہمان بنے ٹھیک اٹھارہ روز بعد کوریئر اسے اپنے ہمراہ پاکستان لے گئے۔ عبدالکریم کو پاکستان کی شہریت دی گئی اور کاروبار کیلئے ساٹھ ہزار روپے بھی بطور انعام دیا گیا (پاکستان پہنچنے کے فوری بعد اسے ہماری ایجنسی نے اپنی حفاظت میں لے لیا..... INTERROGATION اور CRPOSS INTERROGATION کے مرحلوں سے گزرنے کے بعد اسے CLEAR کر دیا گیا تھا)۔ عبدالکریم نے پاکستان میں شادی کی اور آج بھی الحمدللہ بخیر و عافیت اپنے بال بچوں سمیت پرسکون زندگی گزار رہا ہے۔ جب تک عبدالکریم ہمارا مہمان رہا، ہماری جان گلے میں اٹکی رہی، یہی حال نذیر شیروانی کا تھا۔ بھارتی پولیس اور فوج نے دہلی سے باہر جانے کے سب راستوں کی ناکہ بندی کر رکھی تھی اور ہر آنے جانے والے کو انہیں مطمئن کئے بغیر نکل جانا تقریباً ناممکن تھا جب دو کوریئرز عبدالکریم کو لینے آئے تو میرے ساتھیوں نے اسے اپنے پاس رکھی نقلی مونچھوں، داڑھی اور سکھوں کی پگڑی پہنا کر اسے ایک مکمل سکھ بنا دیا تھا اور میرے دو ساتھی انہیں کور دینے کیلئے سبزی منڈی اسٹیشن سے شاہدرہ تک ٹرین میں ان کے ڈبے میں ہمراہ رہے۔ یہ مرحلہ بخیر و خوبی طے پا جانے کی خوشی میں ہم نے ایک گھریلو جشن منایا جس میں میرے اور میرے ساتھیوں کے علاوہ مالک مکان نذیر شیروانی اور اس کے ہمسائے عارف نے بھی شرکت کی۔ اس جشن میں ہم نے ان کے انڈر گراؤنڈ ساتھیوں کی مدد سے اپنے آئندہ ماہ یعنی جنوری 73ء میں کئے جانے والے مشن کے بارے میں ابتدائی بات چیت کی۔ نذیر اور عارف نے یقین دلایا کہ انڈر گراؤنڈ لڑکے بڑے جرأت مند اور تیز ہیں۔ انہیں صرف صحیح گائیڈنس کی ضرورت ہے اور ان سے بڑے سے بڑا کام لیا جا سکتا ہے۔ میں نے انہیں کہا کہ ابھی عبدالکریم کی تلاش جاری ہے۔ اگرچہ اس تلاش میں پہلے والی شدت باقی نہیں رہی لیکن دہلی اور گردونواح کی مسلمان بستیوں پر بھارتی فوج اور پولیس اب بھی خصوصی نگاہ رکھے ہوئے ہے۔ یہ میرا اور میرے ساتھیوں کا مشاہدہ تھا۔ میں نے انہیں کہا کہ جب تک حالات بالکل نارمل نہیں ہو جاتے۔ ہم کو احتیاطاً نئے افراد سے ملنے والے میں احتراز کرنا چاہئے۔ انہوں نے بھی میری بات سے اتفاق کیا۔ ہمارے پاس جنوری کے مشن کیلئے خاصا وقت تھا اور ہم جلدی میں کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتے تھے۔

پاکستان واپس پہنچنے پر میرے سینئرز نے بتایا کہ عبدالکریم کی مہیا کردہ ڈائری ملتے ہی ہم نے اپنی تمام مہیا فورس ان غداروں کی تلاش اور LANCESURVIEL (نگرانی) کیلئے پاکستان بھر میں پھیلا دی۔ اسکے نتیجے میں بھارتی ایجنٹوں کے کئی گروپ ٹرانسمیٹروں کے ساتھ پکڑے گئے۔ جن سے تفتیش کے ذریعے بھارت کو بھیجی گئی معلومات حاصل کرنے کے بعد انہیں شوٹ کر دیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے ملکی حالات لمبی تفتیش اور عدالتی کارروائیوں کی پیچیدگیوں کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ٹرانسمیٹر کا ملنا ہی غداری کا سب سے بڑا ثبوت ہے اور غداری کی سزا ہمارے محکمے میں صرف موت ہے۔ اس ڈائری میں درج تفصیلات کے مطابق ان سیاست دانوں، نوکر شاہی کے اعلیٰ افسران اور صنعت کاروں اور تجارت کاروں کی بھی بھرپور نگرانی کی گئی اور ثبوت اکٹھے کئے گئے۔ مارچ 73ء میں ان غداروں کی گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ غدار بیوروکریٹس کو ملازمت سے ہٹا کر لمبی سزائیں دی گئیں۔ ان سے زیادہ برا حشر ان غدار صنعت کاروں اور تجارت کاروں کا ہوا۔ جن میں سے بعض نے خودکشی کر لی اور بعض کو ہمیشہ کیلئے غائب کر دیا گیا۔ رہ گئے سیاست دان تو غدار سیاستدانوں کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ اس وقت برسراقتدار سیاست دان بڑے بلند و بانگ دعوؤں کے ساتھ برسراقتدار آئے تھے۔ ان کے وہ دعوے جب سراب ثابت ہوئے تو انہوں نے اپنی بقا کے لئے گرفتار سیاست دانوں سے گفت و شنید شروع کر دی۔ بہر حال ہم نے اس وقت پاکستان میں بھارت کے موجود تمام جاسوسی نیٹ ورک توڑ دیئے تھے۔

بھارت میں ہمارے گروپ کی کامیابی کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ جب ہم بھارت میں داخل ہوئے تو ہمیں اپنے سینئرز کے احکامات کی حرف بحرف بجا آوری کا حکم تھا اور اب حالت یہ تھی کہ ہماری غیر معمولی کامیابیوں نے ہمیں اعتماد کے اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا کہ ہمارے سینئرز ہمارے مشوروں پر عمل کرنے لگے تھے اور یہ سب رب العزت کا کرم تھا جس نے ہمیں اس منزل پر پہنچایا۔ مجھے ڈاک میں ایک خصوصی پیغام ملا کہ آئندہ کے مشنوں کیلئے بقدر روپیہ، اسلحہ، گرینیڈز وغیرہ درکار ہوں وہ دہلی میں ایک نئے کوڈ کے ساتھ ایک ''ہمدرد'' سے حاصل کر سکتا ہوں۔ اس نئے ہمدرد کو پہلے ہی ہدایات دی جا چکی ہیں۔ معمول کی ضروریات کیلئے مزید پچاس ہزار روپیہ مجھے بھیج دیا گیا تھا۔ اور کم روپے کے حصول کیلئے پہلے والے ہمدردوں سے رابطہ کرنے کی ہدایت کی تھی۔

غازی

ڈی ایم آئی میرے پیچھے پڑ گئی

عبدالکریم کے پاکستان بھیج دینے کے بعد میں ایک شام کرنل شنکر سے ملنے گیا۔ میری اتنی لمبی غیر حاضری اسے میرے متعلق شک میں مبتلا کر سکتی تھی۔ سروسز کلب میں سویلین کے داخلے پر اب ایسی پابندی لگ چکی تھی کہ جس کو ملنا ہو وہ لکھ کر کلیئرنس دے تو پھر ہی نام، پتہ، ملاقات کا وقت درج کیا جاتا تھا اور واپسی پر اس کاغذ پر صاحب ملاقات کے دستخط اور وقت لکھنا ضروری تھا۔ ان مراحل کو طے کر کے جب میں کرنل شنکر کے پاس پہنچا تو اس نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا۔ لان میں اسی جگہ اس نے محفل جما رکھی تھی۔ میں جا کر اس کے پاس بیٹھ گیا اور اپنی غیر حاضری کی وجہ بمبئی جانا اور واپسی پر طبیعت کی ناسازی بتائی۔ ''اچھا ہی ہوا ونود جو تم اس عرصے میں یہاں نہیں آئے۔ عبدالکریم مجھے ایک بہت بڑی مشکل میں پھنسا کر فرار ہو گیا'' میں نے کرنل شنکر سے تفصیل پوچھی تو اس نے صرف یہی بتایا کہ عبدالکریم اسے ملنے آنے والے ایک بریگیڈیئر کا بریف کیس لیکر اچانک غائب ہو گیا۔ اس بریف کیس میں انتہائی اہم کاغذات تھے۔ تلاش بسیار کے باوجود عبدالکریم ہاتھ نہ آ سکا اور اب وہ بریگیڈیئر اور خود کرنل شنکر انکوائری کے ذلت آمیز اور تھکا دینے والے مراحل سے گزر رہے ہیں۔ کرنل شنکر جو پہلے ہی اپنے ذاتی غم شراب کے نشے میں بھلانے کی کوشش کرتا تھا اس نئی مصیبت کی وجہ سے جام پر جام چڑھا رہا تھا ''ونود'' اس نے سرگوشی میں کہا ''یہ نیا بیٹ مین اور جو دو دوسرے سویلین ڈریس میں اس کے قریب ہی کھڑے ہیں ہمارے محکمہ جاسوسی کے آدمی ہیں اور میری اور مجھ سے ملنے کیلئے آنے والوں کی نگرانی اور جاسوسی کے لئے کھڑے ہیں اور اس سے زیادہ ذلت اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ سپاہی اور ICO رینک کے آدمی فل کرنل حاضر ڈیوٹی کی اس کے سامنے جاسوسی کریں۔ اور پھر رینکس میں مجھ سے بہت کم تر درجے کے جو افسر مجھ سے تفتیش کرتے وقت ''سر'' کا دم چھلا لگا کر مجھ سے ایسے ذلت آمیز سوال کرتے ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ میں انہیں شوٹ کر دوں۔ میں نے تو پکا فیصلہ کر لیا ہے کہ انکوائری کے نتیجے میں اگر مجھے فوج سے نہ نکالا گیا تو میں خود ہی فوج کو چھوڑ دوں گا۔ مجھ سے یہ ذلت آمیز زندگی اب مزید برداشت نہیں ہو سکتی۔ میرا قصور کیا ہے۔ بیٹ مین عبدالکریم کو خود اسی محکمے والوں نے اپنی تسلی کے بعد مجھے دیا تھا۔ وہ بریف کیس لے کر بھاگ گیا تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ یہ غلطی تو اس بریگیڈیئر کی ہے جو اتنے اہم کاغذات جنہیں دفتر سے نکالنے کی ہرگز اجازت نہ تھی بریف کیس میں ڈالے پھرتا تھا چونکہ تفتیش بھی اس کا محکمہ خود کر رہا ہے اس لئے وہ سارا ملبہ مجھ پر ڈالنے کی کوشش میں ہیں۔ آج تم یہاں آئے ہو اور کل کو ہی اس محکمے کے آدمی تمہارے ہوٹل میں پہنچ جائیں گے اور تم سے طرح طرح کے سوال پوچھیں گے۔ تم ہرگز نہ گھبرانا اور بلا جھجک ان کے ہر سوال کا مناسب جواب دے دینا۔ مجھ سے ملنے کی وجہ پوچھیں تو کہہ دینا ہماری پہلی ملاقات آج سے چند ماہ پہلے اکبر ہوٹل میں ایک ڈریس شو میں ہوئی تھی اور ہم مزاجی کی وجہ سے ملاقاتیں بڑھتی رہیں۔ میں بھی انہیں یہی بتاؤں گا تاکہ دونوں کے بیانات ٹیلی ہو سکیں'' میں نے کہا کرنل صاحب اگر مجھے حالات کا علم ہوتا تو میں آتا ہی نہیں''۔ ''یہ بات نہیں بلکہ تمہارا آج یہاں آنا تمہارے اور میرے دونوں کے حق میں بہتر ہوا ہے اگر تم نہ آتے تو یہ عبدالکریم کے غائب ہونے کے بعد تمہارے نہ آنے کی وجہ سے مشکوک ہو جاتے۔ تمہارا اب یہاں آنا ہی تمہاری صفائی کے لئے کافی ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ تم اب میرے پاس اپنی آمد و رفت بڑھا دو تاکہ شک کی مدھم سی لکیر بھی ان کے ذہن میں ہو تو وہ مٹ جائے''۔ کرنل شنکر کے پاس کچھ دیر اور بیٹھ کر اور جلدی ہی ملنے کا وعدہ کر کے میں اجازت لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے دیکھا کہ سویلین کپڑوں میں سے ایک نے برآمدے میں دوسرے کونے میں کھڑے ایک شخص کو اشارہ کیا۔ کلب سے باہر میں نے ٹیکسی لی تو جلد ہی محسوس ہوا کہ ایک گاڑی ہمارا پیچھا کر رہی ہے۔ میں نے اس نگرانی کی تصدیق کے لئے ٹیکسی کو کناٹ سرکس چلنے کو کہا۔ وہ گاڑی مسلسل ہمارا پیچھا کر رہی تھی۔ کناٹ سرکس میں ایک دکان سے تھوڑی بہت شاپنگ کر کے میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو لودھی ہوٹل چلنے کو کہا۔ لودھی ہوٹل تک اسی گاڑی نے ہمارا پیچھا کیا۔ میں تو ٹیکسی فارغ کر کے ہوٹل کے اندر چلا گیا نہ معلوم وہ گاڑی کب تک وہاں کھڑی رہی۔ میری MOBILE SURVIELLANCE شروع ہو چکی تھی اور بہت جلد ہی STATIC SURVIELLANCE شروع ہونے والی تھی۔ میں کمرے میں چلا آیا اور ان سے نمٹنے کے ذرائع سوچنے لگا۔

اگلے دن صبح سویرے ہی اپنے ساتھیوں سے ملنے اور انہیں اپنی نگرانی شروع ہونے کی اطلاع دینے ہوٹل سے نکل کھڑا ہوا۔ ہوٹل کی لابی میں صرف ایک دو غیر ملکی ٹورسٹ بیٹھے تھے۔ ہوٹل کے باہر پارکنگ سے گزرتا ہوا میں سڑک پر آ گیا۔ میں عمداً اپنے ساتھ اسلحہ نہیں لایا تھا۔ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے میں نے کئی بار اچانک پیچھے گھوم کر دیکھا کہ میرا پیچھا تو نہیں ہو رہا۔ لوگ فٹ پاتھ پر آ جا رہے تھے لیکن ان میں کوئی میرا پیچھا کرنے والا دکھائی نہ دیا۔ میں نے اپنے فٹ پاتھ اور سڑک کی دوسری جانب کے فٹ پاتھ پر آنے والوں کی شکلوں کو ذہن نشین کر لیا۔ آگے سگنل چوک تھا۔ میں نے جان بوجھ کر اپنی رفتار ایسی رکھی کہ جب سڑک پار کرنے کا اشارہ روشن ہو جائے تو میں اس وقت وہاں پہنچوں۔ اشارہ روشن ہوتے ہی میں نے سڑک پار کی اور دوسری جانب کے فٹ پاتھ پر پہنچ کر واپس چلنا شروع کر دیا۔ پندرہ بیس قدم چلنے کے بعد میں نے جوتوں کے تسمے باندھنے کے بہانے جھک کر پیچھے خوب اچھی طرح سے دیکھا۔ لیکن کوئی بھی پہلے دیکھا ہوا چہرہ نظر نہ آیا۔ اس طریقے سے پیچھا کرنے والے خود کو ظاہر کئے بغیر پیچھا نہیں کر سکتے۔ اور ان کا نگرانی کرنے کا تسلسل درہم برہم ہو جاتا ہے۔ پیچھا کرنے والی گاڑی بھی U-TURN لئے بغیر اپنی کارروائی جاری نہیں رکھ سکتی۔ جب میں نے آل کلیئر دیکھا تو ایک خالی ٹیکسی کو روک کر اس میں بیٹھ گیا۔ پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے میں نے کئی بار پیچھے دیکھا۔ کوئی گاڑی بھی اس نیت سے آتی دکھائی نہ دی۔ مزید احتیاط کیلئے میں نے ٹیکسی کو جن پر بیت چلنے کو کہا۔ وہاں پر ایک سڑک گول چکر بناتی ہوئی پھر بڑی سڑک میں شامل ہو جاتی ہے۔ اس چکر والی سڑک کا پورا چکر (جو عام حالات میں کوئی احمق ہی لگا سکتا ہے) لگا کر ہم پھر بڑی سڑک پر آ گئے۔ اس دوران میں نے پیچھے کی ٹریفک پر پورا دھیان رکھا۔ کوئی گاڑی بھی ہمارا پیچھا کرتے دکھائی نہ دی۔ وہاں سے میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو کناٹ پیلس چلنے کو کہا۔ ڈرائیور بھی حیران تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ میں اسے خود ہی بتایا کہ مجھے صبح سویرے ہوا خوری کی عادت ہے۔ کچھ دیر پیدل چلنے کے بعد مجھے ٹانگ میں درد محسوس ہوا۔ لہٰذا میں نے عادت پوری کرنے کیلئے ٹیکسی لے لی۔ ٹیکسی کے شیشے میں نے اتار رکھے تھے۔ ٹھنڈا ہوا کے تھپیڑوں سے میرا چہرہ سن ہو چکا تھا لیکن یہ ضروری تھا۔

کناٹ پیلس پہنچ کر میں نے ٹیکسی چھوڑ دی اور ایک اعلیٰ ریسٹورنٹ میں جا کر بھرپور ناشتے کا آرڈر دیا۔ ریسٹورنٹ کے دروازے کے ساتھ ہی لگے پبلک ٹیلی فون بوتھ سے نذیر شیروانی (مالک مکان) کا نمبر ملایا اور اسے اپنے نمبر ٹو کو بلانے کیلئے کہا۔ تین منٹ ختم ہونے سے پہلے ہی اگر SLOT میں مزید سکے نہ ڈالے جائیں تو فون خود بخود ڈس کنکٹ ہو جاتا تھا۔ مزید سکے میں نے ہاتھ میں تھام رکھے تھے۔ میرا نمبر ٹو فون پر آیا تو میں نے اسے بتایا کہ میری نگرانی ہو رہی ہے اسلئے مجھے ہوٹل میں ٹیلی فون ہرگز نہ کیا جائے اور نہ ہی مجھے ملنے کوئی ہوٹل میں آئے جب تک کہ میری نگرانی ختم نہ ہو جائے اور میں انہیں ALL CLEAR نہ کہوں۔ میں خود ہی ہر روز 10 سے 11 بجے کے دوران انہیں کہیں نہ کہیں سے فون کر لیا کروں گا۔ لیفٹیننٹ سے بروقت ڈاک لینے اور پاکستان سے ٹرانسمیٹر پر پیغام وصول کرنے میں کوتاہی ہرگز نہ کی جائے اور میرے فون کرنے پر مجھے تفصیلات بتا دی جائیں۔ میرا نمبر ٹو میری نگرانی کی بات سن کر پریشان ہو گیا اور اس نے مجھے کہا کہ ہمارا وہ ساتھی جو جوڈو کراٹے کا ماہر اور بہت اچھا نشانچی تھا اگر ALL CLEAR ہونے تک میرے ہوٹل میں کمرہ لے کر وہاں مجھے کور دے اور حفاظت کرے تو بہت بہتر ہو گا۔ میں نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا۔ فون پر گفتگو کے بعد میں نے ریسٹورنٹ میں ناشتہ کیا اور اشوکا ہوٹل جا کر ٹورسٹ بس میں پھر سارے دہلی کا چکر لگایا۔ میں نے محسوس کیا کہ پہلے والی کڑی چیکنگ میں اب خاصی کمی ہو چکی تھی۔ عبدالکریم کی کم از کم دہلی میں اب تک موجودگی سے وہ ناامید ہو چکے تھے۔ تقریباً چار بجے میں واپس اپنے ہوٹل میں پہنچا تو میرا ساتھی لابی میں بیٹھا تھا۔ میں کمرے کی چابی لینے کیلئے ریسپشن پر گیا تو وہ بھی وہاں پہنچ گیا اور قدرے بلند آواز میں اپنے کمرے کی چابی مانگی۔ اس کا کمرہ میرے کمرے کی طرح فرسٹ فلور پر تھا۔ مجھے بھی تسلی ہو گئی کہ خدانخواستہ کوئی مشکل میں پڑنے پر میں بالکل ہی اکیلا نہیں ہوں گا۔ ریسپشن پر مجھے بتایا گیا کہ دو صاحب مجھ سے ملنے کیلئے آئے ہیں اور پھر آنے کا کہہ کر چلے گئے تھے (ریسپشن پر والوں نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ انہوں نے میرے قیام کی تاریخ سے لیکر آج تک کی میری مصروفیات کے بارے میں کرید کرید کر پوچھا تھا۔ صبح کی شفٹ والا ریسپشن کا عملہ اس وقت جا چکا تھا۔ (یہ بات دوسرے دن مجھے ریسپشن کے اس لڑکے نے بتائی جسے میں گاہے بگاہے تھوڑے بہت روپے دیا کرتا تھا اور اکثر وہی لاکر کے ڈبل لاک کی چابی لاکر روم میں لاتا تھا) میں اپنے کمرے میں چلا آیا اور فوراً ہی دونوں پسٹل، گولیاں، چھری والا بیگ اور اپنی اصل شناخت کی ساری چیزیں لے کر ساتھی کے کمرے میں جا کر اور اسے دے کر واپس اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ میرے کمرے میں اب میرے ذاتی استعمال کی اشیا کے علاوہ کھلی چائے کے پیکٹ اور دو تین بڑے تھیلوں میں نمی سے محفوظ کاغذوں میں بند مختلف اقسام کی کھلی چائے کے بنڈل رہ گئے تھے میں نے ذہنی طور پر خود کو انکوائری کرنے والوں کے سوال و جواب کیلئے تیار کر لیا تھا۔

دوسری صبح 9 بجے سے پہلے ہی میرے فون کی گھنٹی بجی اور ریسپشنسٹ نے بتایا کہ دو صاحب مجھے ملنے کیلئے لابی میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے لباس تبدیل کیا اور اپنے ساتھی کے کمرے کے دروازے پر مخصوص طرز کی دستک دے کر لابی میں آ گیا۔ لابی میں کئی ملکی اور غیر ملکی بیٹھے ہوئے تھے۔ دو شخص مجھے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور میری طرف بڑھے۔ غالباً گزشتہ شام ہی انہوں نے ریسپشن سے میرے حلیے کا پوچھ لیا تھا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر مجھ سے میرا نام پوچھا۔ جب میں نے اپنا نام ونود چوپڑا بتایا تو انہوں نے بتایا کہ وہ مجھ سے ملنا اور کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے میں نے ان کا تعارف پوچھا تو انہوں نے نہایت نرمی سے بتایا کہ وہ فوج کے ایک حساس ادارے سے آئے ہیں۔ ان میں ایک ادھیڑ عمر اور دوسرا جوان تھا۔ میں انہیں لے کر کافی شاپ میں آ گیا اور اپنے اور ان کیلئے کافی منگوائی۔ اتنی دیر میں میرا ساتھی بھی ایک دوسری ٹیبل پر آ کے بیٹھ گیا تھا۔ ظاہراً تو وہ چائے پینے اور اخبار پڑھنے میں مگن تھا لیکن یقیناً اس کا دھیان ہماری طرف ہی تھا۔ میں نے انہیں کافی پیش کرتے ہوئے پوچھا کہ میں ان کی کیا سیوا کر سکتا ہوں۔ ادھیڑ عمر نے مجھ سے میرے کاروبار کے متعلق پوچھا تو میں نے انہیں بتایا کہ کھلی چائے کا BLENDER اور بیوپاری ہوں۔ بمبئی میں رہتا ہوں اور گزشتہ چند ماہ سے دہلی میں اپنے کاروبار کی وسعت کیلئے مقیم ہوں کیونکہ یہاں سے پنجاب، ہریانہ، دہلی کے علاوہ اتر پردیش میں میری چائے کو اچھی پذیرائی مل رہی ہے۔ میری بات سن کر وہ فوراً کرنل شنکر پر آ گئے اور اس سے میرے تعلقات کے بارے میں پوچھا۔ میں نے کہا کہ کرنل شنکر سے غالباً پہلی ملاقات اکبر یا اشوکا میں ایک ڈریس شو میں ہوئی تھی۔ پہلی ملاقات میں ہی ہم مزاجی کی وجہ سے ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ نتیجتاً میں اکثر اپنی خالی شامیں کرنل شنکر کے ساتھ گزارتا ہوں اور آج شام بھی کرنل شنکر کے پاس جاؤں گا۔ پرسوں شام بھی انہی کے ساتھ تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ آپ کی اس پوچھ گچھ کا مقصد کیا ہے۔ میں نے انہیں کہا کہ اپنے دیش کیلئے میں ہر ممکن تعاون کرنے کیلئے تیار ہوں لیکن مجھے کچھ بتائیں تو سہی۔ اب وہ مجھے کیا بتاتے، لگے ادھر ادھر کی باتیں کرنے۔ میں نے انہیں کہا کہ میں نے ابھی تک آپ کی شناخت دیکھی بھی نہیں ہے۔ آپ کی زبانی بات پر بھروسہ کر کے میں نے آپ کی سب باتوں کا جواب دیا ہے۔ اب میں آپ کی کسی بھی بات کا جواب اس وقت تک نہیں دوں گا۔ جب تک آپ اس پوچھ گچھ کی وجہ نہیں بتائیں۔ میں کوئی اجنبی یا انجان شخص نہیں ہوں۔ میری سینٹرل منسٹر سے لے کر فوج کے اعلیٰ افسران تک رسائی ہے (یہاں میں نے میس کے بریگیڈیئر اور اس منسٹر کا نام لیا۔ جن کی گفتگو کی ریکارڈنگ آشا نے مجھے دی تھی) اور آج شام کرنل شنکر کو بھی آپ کی یہاں آمد کا بتاؤں گا۔ میری اس دھمکی آمیز گفتگو نے ماحول بالکل الٹ دیا۔ اب وہ میری اس طرح سے منتیں کر رہے تھے کہ یہ محض غلط فہمی تھی جو انہیں یہاں لے آئی اور مجھے اس ملاقات کو یہیں بھول جانے کا کہہ رہے تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ میں آزاد دیش کا شہری ہوں۔ انکم ٹیکس ادا کرتا ہوں اور کسی غیر قانونی کام میں ملوث نہیں ہوں اور آپ بغیر کچھ بتائے مجھ سے سوالات کرتے جا رہے ہیں اور میں نے ایک شریف شہری کی طرح آپ کے سوالات کے جوابات دیئے ہیں۔ میری ان باتوں سے وہ بالکل ہی ڈھیلے پڑ گئے اور کئی بار معذرت کرنے کے بعد وہ رخصت ہوئے۔ اس دوران میری اندرونی کیفیت یہ تھی کہ میں اچھا خاصا خوفزدہ ہو چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ آئندہ کے حالات اس پہلی ملاقات پر منحصر ہیں۔ لہٰذا میں نے ان پر اپنا عکس جمانے میں اپنی پوری توانائی صرف کر دی تھی۔ مجھے بخوبی علم تھا کہ بات یہیں پر ختم نہیں ہو جائے گی بلکہ میری نگرانی کا سلسلہ کئی روز جاری رہے گا۔ ان کے جانے کے بعد میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ میرا ساتھی بھی چند منٹ بعد کافی شاپ سے اٹھ آیا۔ میں نے اپنے کمرے کا دروازہ جان بوجھ کر کھلا چھوڑ دیا تھا۔ ساتھی سامنے سے گزرا تو میں نے اسے کہا کہ وہ ساتھیوں کے پاس جائے اور انہیں تسلی دے کہ سب ٹھیک ہے اور آئندہ چند روز تک میرے بجائے وہ ان سے ملا کرے گا۔ جب وہ جانے لگا تو میں نے اسے 6 ہزار روپیہ دیا کہ لیفٹیننٹ کو ہر دوسری ڈاک کے ساتھ 2 ہزار روپیہ دیا جائے اور میرے متعلق بتائے کہ میں چند روز کیلئے دہلی سے باہر گیا ہوں۔

بعد دوپہر میں ہوٹل سے باہر نکلا اور ایک ٹیکسی لی۔ تھوڑی ہی دیر میں مجھے محسوس ہو گیا کہ ایک گاڑی ہمارا پیچھا کر رہی ہے۔ میں ادھر ادھر کے بلا مقصد چکر کاٹ کر کناٹ پیلس پہنچا اور اسٹیشنری کی ایک بڑی دکان سے کچھ سامان خریدا اور واپس ہوٹل آ گیا۔ وہ گاڑی ہوٹل واپس پہنچنے تک میرا پیچھا کرتی رہی۔ چونکہ مجھے اپنی نگرانی ہونے کا علم ہو چکا تھا اس لئے میں نے اسے کوئی اہمیت نہ دی۔ شام کو میں کرنل شنکر کے پاس چلا گیا۔ اس بار ایک دوسری گاڑی میرا پیچھا کر رہی تھی۔ کرنل شنکر کے پاس میں دو گھنٹے سے زائد بیٹھا رہا اور اسے مختصراً صبح ہوٹل میں ملنے والوں اور نگرانی کے متعلق بتایا۔ کرنل شنکر نے کہا کہ چند روز کے اندر یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ یہ ان کی ROUTINE کی کارروائی ہے۔ مزید چند روز تک یہ نگرانی کا سلسلہ جاری رہا اور پھر ختم ہو گیا۔ اس دوران میں کرنل شنکر سے دو بار اور ملا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس نے جنرل کو اپنی اور اپنے دوستوں کی نگرانی اور پوچھ گچھ کے متعلق تفصیلاً رپورٹ کی ہے۔ کرنل شنکر آرمی ہیڈ کوارٹر کا افسر تھا اور اس کی پوسٹ خاصی اہم تھی اور پھر جو واقعہ پیش آیا تھا۔ اس میں کرنل شنکر کسی طرح سے بھی ملوث نہ تھا۔ اس کے جنرل نے یقیناً اس کی رپورٹ کا نوٹس لیا ہو گا۔ تبھی اس کی نگرانی اور اس کے واقف کاروں کی نگرانی ایک روز اچانک ختم ہو گئی۔ میرا ساتھی نگرانی ختم ہونے کے بعد بھی دس روز میرے ہوٹل میں ہی مقیم رہا اور اس کے ہوٹل سے جانے کے دو روز بعد میں بھی احتیاط کے طور پر ZIG ZAG راستوں سے ہوتا ہوا اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔ مزید چند روز معمول سے زیادہ احتیاط برتنے کے بعد ہم سب نے اپنے پہلے والی روٹین اختیار کر لی۔

میں نے ایک روز نذیر شیروانی اور عارف سے میٹنگ کی اور ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ نیو ایئر کی رات کو ہمیں کچھ ہنگامہ کرنا چاہئے۔ نئے سال کی آمد کی خوشی میں 31 دسمبر کی رات کو گولے وغیرہ تو چھوڑے جاتے ہیں۔ میں نے انہیں کہا کہ اس رات ٹھیک 12 بجے جب بڑے ہوٹلوں کے بال رومز میں ایک منٹ کیلئے بالکل اندھیرا کر دیا جاتا ہے۔ اگر عین اس وقت اشوکا اور اکبر ہوٹل میں بڑے کریکر چھوڑے جائیں۔ تو بڑا شور شرابہ مچے گا کیونکہ اس رات بھارتی آرمی، ایئر فورس اور نیوی کے اعلیٰ افسران بھی ان جگہوں پر موجود ہوں گے۔ ہالوں کے اندر کریکر پھٹنے سے افراتفری اور سراسیمگی پھیل جائے گی جس کا دوسرے دن کے اخباروں میں خوب چرچا ہو گا۔ یہ ایک طرح سے ہماری ریہرسل تھی اس کام کی جو ہم 26 جنوری کو بھارتی مسلح افواج کی پریڈ کے دوران دکھانا چاہتے تھے۔

غازی

نذیر اور عارف نے اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا بلکہ یہ کہا کہ یہ سب کام انڈر گراؤنڈ نوجوان مسلمان لڑکے سر انجام دیں گے۔ میں انہیں صرف ہدایات دوں۔ اس کام کے لئے مجھے ان لڑکوں سے ملنا تھا۔ میں نے ان پر اپنا یہ شک پہلے ہی ظاہر کر دیا تھا کہ ممکن ہے، ان لڑکوں میں بھارتی حکومت کے پلانٹڈ بھی شامل ہوں۔ اس لئے وہ میری اصلیت اور میرے ساتھیوں کے متعلق انہیں کچھ نہ بتائیں۔ بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ ان لڑکوں کے لیڈر سے مجھے ملوایا جائے۔ میں اسے ہدایات دوں اور وہ لیڈر میری ہدایات کی روشنی میں لڑکوں سے کام لے۔ دوسرے دن ہی مجھے نمبر ٹو کے ذریعے یہ پیغام ملا کہ شام کو 6 بجے لیڈر سے ملنے جانا ہے۔ مقررہ وقت پر میں ساتھیوں کے گھر چلا گیا۔ نذیر اور عارف تیار تھے۔ ہم نے ٹیکسی لی اور عارف نے اسے چھتہ لال میاں چلنے کو کہا۔ چھتہ لال میاں میں ایک جگہ ہم نے ٹیکسی چھوڑ دی اور عارف ہمیں قریب ہی ایک گیرج میں لے گیا۔ اس نے گیرج میں کام کرنے والے ایک لڑکے سے کچھ کہا اور تھوڑی دیر بعد ہی ہم گیرج کے اندرونی حصے میں ایک ڈرائنگ روم نما کمرے میں پہنچا دیئے گئے۔ وہاں ایک شخص نے بھرپور مسکراہٹ سے ہمیں خوش آمدید کہا اور اپنا تعارف بشیر احمد کے نام سے کرایا۔ یہ نام سن کر میں کچھ چونک سا گیا۔ لیفٹیننٹ نے بھی کہا تھا کہ چھتہ لال میاں میں بشیر گیرج والے سے اس نے چابیاں بنوائی تھیں۔ تعارف اور رسمی کلمات کے دوران ہی چائے اور خشک فروٹ آ گیا۔ بشیر کو عارف نے اس ملاقات کا پہلے ہی سے بتا دیا تھا اس لئے ہی ہماری خاطر و مدارات کا سب انتظام تھا۔ بشیر نے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے بتایا کہ "گیرج کا کام تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ بیس سے زیادہ لڑکے اس کے پاس کام کرتے ہیں جبکہ ہفتوں کوئی گاڑی مرمت کیلئے نہیں آتی۔ اپنے اور ان لڑکوں کے اخراجات پورے کرنے کیلئے ان سب کو غیر قانونی کام کرنے پڑتے ہیں۔" صاحب! یہ ہندو ویسے تو ہم مسلمانوں سے سخت نفرت کرتے ہیں لیکن اپنے ناجائز کام کروانے کیلئے ہاتھ جوڑتے ہیں، خاصا روپیہ دیتے ہیں اور اگر میں انکار کر دوں تو سفارشی بنا کر اپنی بیویوں اور بیٹیوں کو ہمراہ لے آتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں ہر جائز و ناجائز کام کرتا ہوں، ان کی اتنی جرات نہیں کہ وہ میرے خلاف پولیس میں رپورٹ کریں اور اس علاقے کی پولیس بھی ہماری جانب سے آنکھیں اور کان بند رکھتی ہے۔ کیونکہ میرے لڑکے ایک جگہ نہیں بلکہ کئی جگہوں پر بکھرے رہتے ہیں۔ میں نے سب لڑکوں کو (چاقو کی ایک قسم) کا استعمال ٹھیک ٹھاک سکھا رکھا ہے۔ یہاں کچھ عرصہ قبل ایک نیا تھانیدار آیا تھا۔ اس نے مجھے کئی بار تھانے بلایا اور غیر مہذب انداز میں پیش آیا۔ ایک روز میں تھانے میں بیٹھا تھا کہ قرول باغ کے لڑکوں نے گھر سے نکلتے ہی اس کی انتڑیاں نکال باہر کیں۔ میری تھانے میں موجودگی میں ہی اس کی لاش تھانے لائی گئی۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ان کے پاس میرے خلاف کوئی ثبوت نہ تھا۔ لڑکے واردات کر کے اپنے علاقے میں روپوش ہو گئے تھے۔ یہ علاقہ مسلمانوں کا ہے۔ یہاں سخت سے سخت تھانیدار بھیجا گیا لیکن کسی نے بھی تھانے میں کاغذوں کا پیٹ بھرنے کے سوا عملی طور پر کچھ نہ کیا۔ یہ ہندو صرف کمزور پر ظلم و ستم کرتا ہے۔ ذرا کسی نے آنکھ میں آنکھ ڈال کر دیکھا تو فوراً بھیگی بلی بن جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے بشیر اس پہلی ملاقات میں مجھ پر اپنی اہمیت جتانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا کہ ہمیں 31 دسمبر کی رات کو کچھ جگہوں پر دھماکے کرنے ہیں جس کیلئے نڈر، چست لڑکے اور بڑے کریکرز کی ضرورت ہے۔ بشیر میری بات سن کر ہنس پڑا اور بولا، صاحب میرے لڑکے تو اتنے نڈر ہیں کہ اگر میں کہوں تو وہ خود اپنے پیٹ میں چاقو گھونپ لیں اور جہاں تک کریکرز کا سوال ہے۔ تو یہاں ہر قسم کی گولیوں کے علاوہ ہینڈ گرنیڈ بھی آپ کا یہ غلام بناتا ہے۔ میرے گاہک تو (ایک آنکھ دبا کر) مدھیہ پردیش کی پہاڑیوں اور سابھر تک پھیلے ہوئے ہیں۔

عارف نے بشیرے کو میرے متعلق پہلے ہی بتا دیا تھا اس لئے اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ بشیر جیسے کم پڑھے لکھے ہنر مند آدمی جو غیر قانونی کاموں میں بھی ملوث ہوں کو جب اپنے مذہب کے مفاد کیلئے کوئی کام کرنے کا موقع ملتا ہے تو وہ بڑے سے بڑا کام کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ بشیر کی بھارت میں یہی حالت تھی۔ اس نے ان بے روزگار مسلمان لڑکوں کے گروہ بنا رکھے تھے جو مالی مجبوریوں کا شکار تھے۔ بھارت میں ویسے مسلمان ہونا ہی سب سے بڑا جرم سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے یہ لڑکے اس کے گروہ میں بھی شامل تھے۔ بشیر ان سے جو بھی کام لیتا ہو گا وہ یقیناً خلاف قانون ہو گا لیکن وہ کوئی منظم گروہ نہ تھا۔ جب بھی جہاں بھی کوئی موقع ملتا، وہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوں گے۔ نہ تو ان کی کوئی تربیت ہوئی تھی اور نہ کوئی مخصوص مقصد ان کے پیش نظر تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر 31 دسمبر کو انہوں نے حسب منشا کام کیا تو انہیں میں جہاں تک مجھ سے ہو سکا، تربیت دوں گا اور انہیں ایک یونٹ کے طور پر واضح نصب العین کے ساتھ کام کرنے کی ترغیب دوں گا۔

میں نے بشیر سے کہا کہ اگر ممکن ہو تو مجھے اپنے نڈر اور چست لڑکوں میں سے نسبتاً زیادہ پڑھے لکھے لڑکوں سے ملوا دے۔ اکبر اور اشوکا ہوٹل میں نیو ایئر نائٹ کے لئے ٹیبلوں کی ریزرویشن صرف جوڑوں کے لئے ہو سکتی تھی اور اس GATHERRING میں شامل ہونے کیلئے اچھے لباس کے علاوہ PERSONALITY کی بھی ضرورت تھی۔ میں نے لڑکوں کا ساتھ دینے کیلئے لڑکیوں کے متعلق تو سوچ لیا تھا کہ ان ہوٹلوں کی لابی میں ایسی بہت لڑکیاں مل جاتی تھیں۔ لڑکوں کیلئے موزوں لباس بھی سلے سلائے مل سکتے تھے۔ بشیر نے مجھے دو روز بعد شام کو اپنے SELECTED لڑکوں سے ملوانے کا وعدہ کیا اور ہم بشیر کے رات کے کھانے تک رکنے کے بے حد اصرار کے باوجود اس سے دو دن بعد ملنے کا وعدہ کر کے چلے آئے۔

میں نے اپنے ساتھیوں کو ساری بات بتائی اور ہم نے اپنے طور پر یہ پروگرام بنایا کہ ہم اور خصوصاً میں اس رات اشوکا اور اکبر ہوٹل کے قریب بھی نہ پھٹکیں گے۔ میں لودھی ہوٹل کے درمیانے درجے کے پروگرام میں شامل ہوں گا۔ جبکہ میرے ساتھی کارونیشن ہوٹل میں اپنی شام گزاریں گے۔

دو روز بعد نذیر، عارف اور میں پھر بشیرے کی گیراج میں گئے۔ خاطر و مدارت کے بعد بشیرے نے اپنے شاگرد کو آواز دی جو اپنے ہمراہ چار لڑکوں کو لیکر کمرے میں آ گیا۔ ان چاروں کی عمریں بیس اور پچیس سال کے درمیان تھیں اور شکل و صورت سے بھی وہ اچھے گھروں کے لگتے تھے۔ انہوں نے فرداً فرداً ہم سب سے با ادب ہو کے ہاتھ ملایا اور بیٹھ گئے۔ میں نے ان کے نام اور تعلیم پوچھی تو انہوں نے اپنے ناموں کے ساتھ تعلیم بتائی۔ ان میں سے دو ایف اے تھے۔ ایک بی اے اور ایک میٹرک تھا۔ بشیرے نے بتایا کہ اس نے انہیں پہلے ہی بتا دیا ہے کہ انہیں کیا کام کرنا ہو گا جس کی انہوں نے بڑی خوشی سے حامی بھر لی ہے۔ ان چاروں کو دیکھ کر اور ان سے مزید گفتگو کے بعد میں نے پروگرام میں ذرا تبدیلی کی اور دونوں ہوٹلوں میں دو دو جوڑے بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے یہ فیصلہ اس وجہ سے کیا کہ ایک منٹ کے لئے تاریکی ہونے کے درمیان ایک شخص صرف ایک کریکر ہی چلا سکتا ہے۔ اگر دو ہوں تو ہال میں مختلف اطراف میں دو کریکر چلنے سے افراتفری میں دو چند اضافہ ہو سکتا ہے۔ میں نے لڑکوں سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ان کے پاس گہرے رنگوں کے سوٹ اور اوور کوٹ ہیں۔ بشیرے نے بتایا کہ وہ خصوصی طور پر چپٹے کریکر بنا کر دے گا۔ جو لباس میں بخوبی چھپائے جا سکتے ہیں اور ان کا دھماکہ بہت شدید ہو گا۔ میں نے لڑکوں کو کہا کہ روشنیاں گل ہوتے ہی انہیں کریکر چلانے اور انہیں ہال میں اچھال کر درمیان میں پھینکنا ہو گا اور یہ سارا کام 25 سیکنڈ سے بھی کم وقت میں کرنا ہو گا۔ میں چاہتا تھا کہ روشنیاں گل ہونے کے وقفے کے دوران ہی کریکر پھٹ جائیں۔ بالکل اندھیرے میں پر ہجوم ہالوں میں کریکر پھٹنے سے جو سراسیمگی اور دہشت پھیلی تھی اس کا آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔

میں نے بشیرے کو کہا کہ کریکرز کے ساتھ بارود کی بتی اتنی چھوٹی لگائے جو 5 سیکنڈ میں کریکر کو چلا سکے۔ غرضیکہ ابتدائی تربیت اور پروگرام پر عمل کرنے کی ہدایات دے کر میں نے بشیرے کو کہا کہ میں ان لڑکوں سے حلف لینا چاہتا ہوں۔ وہ تیار ہو گئے اور میں نے ان سے حلف لیا کہ وہ اپنا کام پوری تندہی اور ہدایات کے عین مطابق سر انجام دیں گے اور خدانخواستہ کسی مشکل میں گرفتار ہو گئے تو ہرگز ہرگز اپنا راز اور ساتھیوں کا نام کسی کو نہ بتائیں گے۔ آج بشیرے نے ہماری لاعلمی میں ہی کھلانے کا انتظام کر رکھا تھا۔ ابھی ہم وہاں بیٹھے ہی تھے کہ گرما گرم پرتکلف کھانا آ گیا۔ ہم سب نے اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھایا اور بشیرے کا شکریہ ادا کر کے اس سے رخصت چاہی۔ لڑکے ہمارے جانے سے پہلے ہی چلے گئے تھے۔ میں نے بشیرے سے کہا کہ وہ جو کام ہمارے لئے کرنے لگا ہے اس کا اصل معاوضہ تو اللہ ہی اسے دے گا۔ لیکن اسے اگر کچھ رقم درکار ہو تو وہ مہیا کی جا سکتی ہے۔ میری بات سن کر بشیرے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا "صاحب! روپیہ کمانے کے بہت سے ڈھنگ ہیں جب جائز ذرائع سے میں روزی کمانے میں ناکام ہو گیا تو میں نے ہر جائز و ناجائز طریقہ اختیار کیا اور اب میں نے نہ صرف بہت کافی روپیہ کما لیا ہے بلکہ اس میں گونا گوں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ تمام لڑکے اپنی ضروریات کے لئے مجھ سے پیسہ لیتے ہیں۔ آپ اور آپ کے ساتھی تو اپنی جانیں داؤ پر لگا کر جو کام اس ملک میں کرنے آئے ہیں۔ مجھے اس کا کچھ کچھ اندازہ ہے۔ پاکستان پہلے بھی اسلام کا قلعہ تھا اور اب بھی ہے۔ لعنت ہے مجھ پر کہ آپ کے کام میں کچھ ہاتھ بٹانے کا میں معاوضہ لوں۔ میں تو اپنا سب کچھ پاکستان اور اس کے مفاد پر نچھاور کرنے کو تیار ہوں۔ آپ نے یہ بات کہہ کر مجھے میری اپنی نگاہوں میں ہی ذلیل کر دیا ہے۔ بشیرے کی باتیں سن کر میں بھی آبدیدہ ہو گیا۔ میں نے بڑھ کر اسے گلے لگایا اور کہا "بشیر بھائی تمہاری دل آزاری کرنے کی میں معافی چاہتا ہوں۔ اس مادہ پرست ملک میں مجھے علم نہیں تھا کہ تمہارے جیسے درد دل رکھنے والے لوگ بھی موجود ہیں۔ پہلے تم نے پاکستان کو اسلام کا قلعہ کہا تھا اور اب میں کہتا ہوں کہ تمہارے جیسے اسلام اور پاکستان سے محبت رکھنے والے لوگوں کی وجہ سے ہی پاکستان واقعی اسلام کا قلعہ ہے۔ رات کے گھپ اندھیرے کے بعد اب سیاہی چھٹنے والی ہے اور انشاءاللہ وہ دن ضرور آئے گا جب بھارت ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا اور پاکستان 71ء میں اپنی ہزیمت کا پوری طرح سے بدلہ لے گا۔

اس ملاقات کے بعد بشیرے اور ان چاروں لڑکوں سے میں دو مرتبہ ملا اور انہیں 31 دسمبر کی رات کے بارے میں اچھی طرح سے بریف کیا۔ بشیرے نے اس دوران چپٹے کریکر تیار کر لئے تھے۔ ان کا حجم دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کا دھماکہ کسی بڑے بم جیسا ہو گا۔ میں نے اس دوران اپنے نمبر ٹو کو بھیج کر اکبر اور اشوکا ہوٹل میں دو دو ٹیبل ریزرو کروائے جن کے ریزرویشن چارجز چار ہزار روپے تھے۔ ہماری تمام تیاری مکمل تھی جیسا کہ شروع میں عرض کر چکا ہوں۔ ان دونوں ہوٹلوں کی لابی میں PAID PARTNER لڑکیاں ہمہ وقت موجود رہتی تھیں۔ میں نے اپنے نمبر ٹو کو دونوں ہوٹلوں میں بھیجا جہاں سے اس نے چار مناسب لڑکیوں کو ہزار روپیہ فی لڑکی کے حساب سے بک کر کے انہیں کناٹ پیلس کے رنگ محل ریسٹورنٹ میں 31 دسمبر کی شام کو 7 بجے ملنے کا کہا اور ایڈوانس میں انہیں سو روپیہ فی لڑکی دیا۔ کرسمس اور نیو ایئر کی وجہ سے ان CALL GIRLS کے ریٹ بھی بڑھ گئے تھے۔ میں نے یہ سارا کام اپنے نمبر ٹو کے ذریعے اس لئے کروایا کہ میں پہلے ہی DMI کی نظروں میں آ چکا تھا اور میں کسی طرح کا خطرہ مول نہ لے سکتا تھا۔ سب تیاریاں مکمل تھیں۔ مقررہ وقت کے مطابق 31 دسمبر کو 5 بجے شام میں بشیرے کے پاس گیا لڑکے پہلے ہی وہاں موجود تھے۔ بشیرے نے ہر لڑکے کی پینٹ کی بیلٹ کے ساتھ کریکرز اس طرح لگائے تھے کہ کوٹ پہننے سے وہ بالکل چھپ جاتے تھے۔ ہر لڑکے کے پاس ایک ایک خنجر بھی ٹانگوں کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ میں نے انہیں کناٹ پیلس میں سات بجے سے پہلے ہی پہنچ جانے کا کہا۔ جہاں میرے نمبر ٹو نے چاروں لڑکیوں کے ساتھ انہیں ملنا تھا۔ نمبر ٹو کی نشانی لیدر جیکٹ اور سرخ قمیض تھی۔ میں نے چاروں لڑکوں کو ایک ایک ہزار روپیہ دینا چاہا تو بشیرے نے منع کر دیا اور کہا کہ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی انہیں دو دو ہزار روپیہ دے چکا ہے۔ بشیرے نے انہیں سگریٹ کے پیکٹ اور ماچس دیتے ہوئے ہنستے ہوئے کہا کہ میں نے انہیں کہا ہے کہ کام کرنے کے بعد آج رات خوب موج اڑاؤ۔

31 دسمبر کے رش کی وجہ سے ہمیں کافی انتظار کے بعد دو ٹیکسیاں ملیں۔ بشیرے نے لڑکوں کو ایک ٹیکسی میں روانہ کیا اور چلتے وقت انہیں کہا کہ اگر کام ٹھیک طور سے انجام نہ دیا تو تمہارے گھر والوں کو قبرستان بھجوا دوں گا کیونکہ تمہاری لاشیں انہیں وہیں ملیں گی۔ یہ چلتے وقت کی آخری ہدایت تھی۔ ہمیں بھی بھارتی بارڈر میں داخل ہونے سے پہلے اسی طرح کی لیکن نرم الفاظ میں ہدایت ملی تھی۔ میرا نمبر ٹو 8 بجے مجھے مغل محل ریسٹورنٹ میں ملا۔ اس نے بتایا کہ چاروں لڑکیاں بروقت پہنچ گئی تھیں۔ لڑکوں کے آنے کے بعد اس نے چاروں ریزرویشن کارڈ لڑکوں کو اور بقیہ نو سو روپیہ فی لڑکی ان لڑکیوں کو دیئے اور چاروں دو گروپس میں ٹیکسیوں میں بیٹھ کر اشوکا اور اکبر ہوٹل چلے گئے۔

میں نے نمبر ٹو کو بھی جانے کی اجازت دے دی اور اپنے ہوٹل چلا آیا۔ لودھی ہوٹل بھی 4 اسٹار ہوٹل تھا۔ انہوں نے بھی 31 دسمبر کی رات کو بھرپور منانے کا انتظام کیا ہوا تھا۔ میرا ٹیبل پہلے سے ہی ریزرو تھا میں کمرے میں جا کر غسل کر کے تازہ دم ہوا اور ڈریس سوٹ پہن کر نیچے آ گیا۔ ہوٹل کے کانفرنس ہال میں نیو ایئر نائٹ منانے کا انتظام تھا ہال میں سینکڑوں رنگ برنگے بڑے بڑے غبارے کرسمس لڑی کے علاوہ رنگ دار جھلملاتی روشنیوں کی لڑیاں آنے والوں کو خوش آمدید کہہ رہی تھیں میں اپنے ٹیبل پر جا کے بیٹھ گیا اس وقت تک تمام ٹیبل بھر چکے تھے۔ بمبئی سے خصوصی بلایا گیا ایک بینڈ اپنی تیز دھنوں سے ماحول کو مزید رنگین بنا رہا تھا ہر ٹیبل پر جوڑے بیٹھے تھے صرف میرا ٹیبل ہی ایسا تھا جس پر میں اکیلا تھا۔ جوڑا نہ ہونے کی رعایت مجھے خصوصی طور پر اس لئے دی گئی تھی کیونکہ میں ہوٹل کا مستقل رہائشی تھا۔ ان دنوں مشہور مغربی ناچ ROCK-N-ROLL اور SHAKE تھے اور مجھے ان پر خاصا عبور تھا۔ تھوڑی دیر بعد ڈانس ہال کا منیجر میرے پاس آیا اور بڑے مودبانہ انداز میں کہنے لگا کہ ایک بریگیڈیئر اور ان کی بیگم بغیر ریزرویشن کے آ گئے ہیں۔ بریگیڈیئر عرصے سے ہمارے ہوٹل کے اچھے COSTOMER ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو انہیں آپ کی ٹیبل پر بیٹھا دیا جائے۔ میں تنہائی سے پہلے ہی بور ہو رہا تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور رسم کے مطابق ان کے استقبال کیلئے ہال کے دروازے پر چلا گیا۔ منیجر نے بریگیڈیئر سے میرا اور بریگیڈیئر نے اپنی بیوی سے میرا تعارف کروایا۔ یہاں بھی وہی بات تھی۔ ادھیڑ عمر شوہر اور جوان بیوی۔ میں نے انہیں اپنے ٹیبل پر جوائن کرنے کی دعوت دی۔ وہ تو تھے ہی ایسی دعوت ملنے کے انتظار میں۔ بخوشی میرے ساتھ ہو لئے۔ میں نے بریگیڈیئر کی بیوی کو کرسی پر بٹھایا۔ دوسری جانب بریگیڈیئر بیٹھ گیا اور بیچ میں، میں سینڈوچ بن گیا۔ بریگیڈیئر اور اس کی بیوی سے مشروبات کے لئے پوچھا تو بریگیڈیئر نے کہا THANK YOU VERY MUCH BUTWE WILL PLAY DUTCH (شکریہ لیکن ہم اپنے مشروبات کی قیمت خود ادا کریں گے) بریگیڈیئر نے ولایتی وہسکی منگوائی اور دونوں میاں بیوی جام پر جام چڑھانے لگے۔ نیو ایئر کی رات، روشنیوں اور سجاوٹ کی جگمگاہٹ، بینڈ کے نغمات بکھیرتے ساز اور فلور پر ناچنے والوں کے تھرکتے بدن۔ بریگیڈیئر کی بیوی نے کئی بار شوہر کو آنکھ کے اشارے سے فلور پر آنے کا کہا لیکن بریگیڈیئر صاحب ابھی تک شراب سے اپنی بیٹری چارج نہ کر سکے تھے۔ اس کی بیوی جھلا اٹھی۔ اس وقت بریگیڈیئر کا میں نے ہاتھ بٹانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے بریگیڈیئر سے اجازت طلب کر کے اس کی بیوی کو ناچ کی دعوت دی۔ وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی ہم نے فلور پر ڈانس شروع کیا اور رو قفے وقفے سے رات پونے بارہ بجے تک ناچتے رہے۔ بریگیڈیئر نے اپنی کوشش میں ناکام ہونے کی وجہ سے اتنی زیادہ پی لی تھی کہ کرسی سے ٹیک لگا کر خراٹے بھرنے لگا۔ اس طرح سونے میں ہی اس کی عافیت تھی۔ ہال میں فوٹو گرافر بھی گھوم پھر کر تصویریں اتار رہے تھے۔ بارہ بجنے میں 5 منٹ باقی تھے جب میں نے بریگیڈیئر کو جگایا اور کہا کہ صرف 5 منٹ باقی ہیں نئے سال کے استقبال میں بیوی کو اس کے حوالے کر کے میں ہوٹل سے باہر چلا آیا۔

لودھی ہوٹل اکبر اور اشوکا سے زیادہ دور نہیں تھا پھر بھی تجسس کی وجہ سے میں باہر آ گیا تھا ٹھیک بارہ بجے فضا چھوٹے چھوٹے دھماکوں سے گونج اٹھی ہوٹل کی تمام روشنیاں ایک منٹ کے لئے گل کر دی گئی تھیں۔ مجھے اپنے ساتھی لڑکوں کے متوقع دھماکوں کی آواز سنائی نہ دی۔ میں تقریباً بیس منٹ یخ بستہ سردی میں تھپیڑے کھاتے ہوئے صرف ڈریس کوٹ میں باہر کھڑا رہا۔ جب سردی ناقابل برداشت ہو چکی تھی میں ہوٹل واپس جانے کا سوچ رہی رہا تھا کہ ایمبولینسیں اور فائر بریگیڈ کے انجن اپنے زوردار سائرن بجاتے اشوکا اور اکبر ہوٹل کی سڑک پر جاتے دکھائی دیئے۔ مجھے سردی کا احساس ختم ہو گیا اور میں تصور میں ان ہوٹلوں میں دھماکوں سے پھیلی سراسیمگی کے عالم میں مہمانوں اور ہوٹل کے اسٹاف کی بھاگ دوڑ اور افراتفری کو ENJOY کرنے لگا۔ تھوڑی دیر تصور کی آنکھوں سے ان مناظر سے لطف اندوز ہونے کے بعد میں اپنے کمرے میں چلا گیا (یہاں میں یہ بتانا بھول گیا کہ تعارف کے وقت بریگیڈیئر نے اپنا نام راج پال اور اس کی بیوی نے مالتی بتایا تھا۔ ڈانس ہال میں ہنگامہ اتنا زیادہ تھا کہ بات سنائی ہی نہ دیتی تھی۔ وہ تو دوسرے دن بریگیڈیئر سے شام کو ملاقات ہوئی تو اس سے کافی شاپ میں مفصل گفتگو ہوئی۔ دراصل بریگیڈیئر اتنا مدہوش ہو چکا تھا کہ اس کو ہوٹل اسٹاف نے بڑی دقت سے ہوٹل کی گاڑی پر اس کو اس کے بنگلے پہنچایا تھا۔ اس کی بیوی بھی ڈرائیونگ کرنے کی حالت میں نہ تھی۔ بریگیڈیئر کی گاڑی ہوٹل میں ہی کھڑی رہی اور دوسرے دن شام بریگیڈیئر گاڑی لینے اور ہوٹل کا بل ادا کرنے آیا تھا)۔

غازی

نذیر، عارف اور میں دوسرے دن بارہ بجے بشیر کے ہاں پہنچے۔ صبح اخباروں کے فرنٹ پیج اکبر اور اشوکا ہوٹل میں رات ٹھیک بارہ بجے بم پھٹنے، مہمانوں کے زخمی ہونے اور مختلف قیاس آرائیوں سے بھرے پڑے تھے۔ بشیر نے بتایا کہ چاروں لڑکے صبح 10 بجے آئے تھے چاروں کے کریکر صحیح وقت پر پھٹے تھے۔ وہ تو افراتفری میں اندھیرے میں ہی باہر نکل آئے تھے البتہ ہال میں لوگوں کی چیخ و پکار اور دھماکوں سے ٹوٹنے والی بوتلوں، گلاسوں اور ہلکے فرنیچر کے ٹکڑوں سے کئی افراد دونوں جگہوں پر زخمی ضرور ہوئے تھے۔ لڑکوں نے اسے بتایا تھا کہ دہلی کے انتہائی پوش علاقے (جہاں دنیا بھر کے سفارت خانے موجود ہیں) میں ان ہوٹلوں میں دھماکوں کی وجہ سے پولیس اور فوج نے دونوں ہوٹلوں کو CORDON (گھیرا) کر لیا تھا۔ اخبارات میں لکھا تھا کہ فوری طور پر یہ طے نہیں کیا جا سکتا کہ یہ دھماکے کس چیز کے تھے۔ دونوں ہوٹلوں کی بھرپور تلاشی لی گئی اور کچھ برآمد نہ ہونے پر ہی فوج اور پولیس کا گھیرا ختم کیا گیا۔

دو روز بعد میں نذیر اور عارف کے ساتھ بشیر کی گیرج میں گیا۔ بشیر اپنے لڑکوں کی کامیابی پر پھولا نہیں سما رہا تھا۔ ہم نے اسے اور اس نے ہمیں مبارکباد دی۔ میں نے بشیر سے کہا کہ یہ دھماکے ہمارے مقصد کے حصول کی طرف ہمارا پہلا قدم تھا اور تمہارے لڑکوں کی آزمائش بھی اور تمہاری وجہ سے ہی یہ سب ممکن ہوا۔ اب ہم ان لڑکوں سے وہ کام لیں گے جس سے پورے بھارت میں ہلچل مچ جائے گی۔ میں نے بشیر کو بے حد اصرار کر کے لڑکوں کو بطور انعام دینے کے لئے 12 ہزار روپے دیئے اور کہا کہ آئندہ دو تین روز میں اسے پورا پلان دوں گا تاکہ اس پر عمل کرنے کے لئے لڑکوں کو تربیت دی جا سکے۔

بشیر سے فارغ ہو کر ہم واپس آ گئے۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر کے 26 جنوری کے لئے ایک پلان ترتیب دیا اور اس کی نوک پلک سنواری۔ 26 جنوری کو بھارت کے ہر بڑے شہر میں اور خصوصاً دہلی میں (پاکستان میں 23 مارچ کی طرح) دفاعی افواج کی پریڈ، ایئر شو اور اسلحے کی نمائش ہوتی ہے اور یہی دن ہم نے اپنے مشن کے لئے چنا تھا تاکہ بھارتی عوام اور غیر ملکی سفارتی نمائندوں کے سامنے بھارتی فوج اور انٹیلی جنس کی سبکی کر سکیں اور ان کی نااہلیت کو دنیا بھر کے سامنے ظاہر کر دیں۔

میں نے ساتھیوں کے مشورے سے دہلی کے پالم ایئرپورٹ، بمبئی کے سانتا کروز ایئرپورٹ اور سری نگر کے ہوائی اڈے کے کارگو سیکشنز کو ٹارگٹ بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے علاوہ دہلی میں پریڈ کے دوران خودساختہ مالوٹوف بموں کے دھماکے بھی کرنے تھے۔ ایئرپورٹس کے کارگو سیکشنوں میں دھماکوں میں ہم نے آتش گیر مادہ استعمال کرنا تھا تاکہ جانی نقصان کم سے کم ہو اور مالی نقصان زیادہ سے زیادہ۔ دہلی میں فوجی پریڈ کا تو ہم کچھ نہ بگاڑ سکتے تھے۔ اس لئے ہم نے پریڈ کے آخر میں مختلف صوبوں کے فلوٹس کو ان کے STARTING POINT پر ہی مالوٹوف بموں کا نشانہ بنانا تھا۔ بجائے بوتلوں کے ہم نے دستی تھرماس کے ٹین کے خولوں سے یہ بم بنانے کا فیصلہ کیا۔ سردی کا موسم ہونے کی وجہ سے بوتلیں ہاتھ میں دیکھ کر انٹیلی جنس والوں کو شبہ ہو سکتا تھا لیکن چائے بھری تھرماس تو پریڈ دیکھنے والے اکثر ساتھ لاتے ہوں گے اور ان تھرماسوں میں ہمارے چار پانچ (چائے بھری تھرماس) بآسانی نظر انداز کئے جا سکتے تھے۔ اپنے ساتھیوں کے مشورے سے پلین مکمل کرنے کے بعد میں بشیر کی گیرج میں گیا اور اپنا پلین بتایا۔ آتشیں گرنیڈ تو میں اپنے سینئرز کے دیئے ہوئے نئے ہمدرد سے دہلی میں حاصل کر سکتا تھا۔ مالوٹوف بموں کے لئے میں نے بشیر کو کہا کہ چار پانچ دستی تھرماس لے کر ان کے خولوں پر ایسی گہری لکیریں لگا دے جیسی دستی بموں پر ہوتی ہیں۔ ایئرپورٹس پر دھماکوں کے لئے اس نے کہا کہ پہلے والے چار میں سے ہی وہ تین لڑکے اس کام کے لئے بھیجے گا۔ ان میں سے ایک لڑکا بمبئی کئی بار جا چکا تھا۔ اسے بمبئی کے لئے منتخب کیا گیا۔ دہلی کا پالم ہوائی اڈہ تو سبھی نے دیکھ رکھا تھا۔ وہاں بھی کام دکھانا کچھ مشکل نہ تھا۔ بات سری نگر کے ہوائی اڈے پر آ کے ٹھہر گئی۔ 71ء کی جنگ کے بعد بھارتی افواج کی مقبوضہ جموں اور کشمیر میں عددی طاقت بڑھا دی گئی تھی۔ سردیوں میں تو عوام کی آمد و رفت بہت کم ہو جاتی تھی۔ ان حالات میں مشن اگر کامیاب ہو بھی جائے تو سری نگر سے باہر نکلنے کے صرف دو راستے تھے ایک بذریعہ ہوائی جہاز اور دوسرا بذریعہ سڑک۔ ان دونوں پر چیکنگ کے دوران اگر کوئی سری نگر میں اپنے قیام کی مدت اور جگہ کے متعلق سوالات کا خاطر خواہ جواب نہ دے سکے تو اسے فوری گرفتار کر لئے جانے کا ہر ممکن امکان تھا۔ ہم نے ان خدشات کے پیش نظر سری نگر کے ہوائی اڈے کو اپنے پروگرام سے نکال دیا اور بقیہ کی بھرپور تیاری کی شروع کر دی۔

اگلے روز میں اپنے نئے ہمدرد کے پاس پہنچا۔ اس کی فیکٹری دہلی سے ملحقہ انڈسٹریل ایریا میں واقع تھی۔ میں فیکٹری کی انتظار گاہ میں کافی دیر بیٹھا اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ خاصی دیر کے بعد جب وہ فارغ ہوا تو اس سے دفتر میں ملاقات ہوئی۔ میں نے چٹ پر اپنا کوڈ پہلے سے ہی لکھ دیا تھا۔ میں نے وہ چٹ اس کی میز پر رکھ دی۔ اس پہلی اور اچانک ملاقات میں چٹ دیکھ کر وہ کچھ نہ سمجھا اور سوالیہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اسے کہا کہ اسے الٹا پڑھئے۔ الٹا پڑھ کر اسے فوراً بات سمجھ میں آ گئی۔ میرے کمرے میں داخل ہوتے وقت اس نے میرے سلام کا رسمی سا جواب دیا تھا۔ اب اٹھ کر اس نے مجھ سے معانقہ کیا۔ خیریت پوچھی اور کہا ہم اکٹھے اب دفتر سے باہر نکلتے ہیں۔ مزید گفتگو گاڑی میں کریں گے۔ اس سے پہلے ہم دونوں نے اپنے کوڈز کو دو مرتبہ دہرایا تاکہ ایک دوسرے کے متعلق کوئی شک و شبہ نہ رہے۔ دہلی جانے والی سڑک پر اس نے دھیمی رفتار سے گاڑی چلانی شروع کی اور مجھ سے آمد کی وجہ پوچھی۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے 6 عدد گرنیڈ درکار ہیں۔ جن کی پن نکالنے اور پھٹنے میں پندرہ منٹ کا وقفہ ہو۔ (عام گرنیڈ پن نکالنے کے 6 سیکنڈ بعد پھٹ جاتا ہے) اس نے بتایا کہ ایسے گرنیڈ تو مہیا نہیں لیکن وہ ہمیں ٹائم بم دے سکتا ہے۔ جن کے پھٹنے کا وقت ہم خود سیٹ کر سکتے ہیں۔ اس نے کہا کہ آئندہ پیر کے دن ٹھیک اسی وقت میں اسے اس کی فیکٹری سے 5 سو قدم کے فاصلے پر سڑک پر ملوں اور لفٹ مانگنے کیلئے اشارہ کروں۔ گاڑی میں ہی وہ مجھے مطلوبہ اشیاء ایک سوٹ کیس میں پیک میرے حوالے کرے گا۔ اس نے کہا کہ میری فیکٹری میں تقریباً 80 فیصد غیر مسلم کام کرتے ہیں۔ اس لئے آپ کا فیکٹری میں آنا مناسب نہیں اس نے مجھے اپنے گھر اور فیکٹری کے فون نمبر دیئے کہ جب بھی کوئی کام ہو تو ان نمبروں پر فون کر کے صرف یہ کہیں کہ آج موسم اچھا ہے اور اگلے روز شام 6 بجے میں آپ کو ایئرپورٹ روڈ پر پانی کی سبیل کے پاس سے گاڑی میں اٹھا لیا کروں گا۔ اس نے کہا کہ مجھے آپ کو پیسے دینے کی ہدایت بھی ملی ہے۔ اس لئے سوٹ کیس میں ایک لاکھ روپیہ بھی ہوگا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ہمارے لئے کام بھی کرنا چاہتا ہے اور کچھ ڈرا ہوا بھی ہے۔ اس نے مجھے دہلی کے شروع ہوتے ہی ایک ٹیکسی اسٹینڈ پر اتار دیا۔

میری عادت ہے کہ کسی سے ملنے کی جگہ سے اگر میں واقف نہ ہوں تو ملاقات سے پہلے ہی اس جگہ کو تلاش کر لیتا ہوں تاکہ ملاقات کے وقت جگہ ڈھونڈنے میں وقت صرف نہ ہو۔ ٹیکسی اسٹینڈ سے ٹیکسی لے کر میں نے اسے ایئرپورٹ روڈ پر چلنے کو کہا۔ ڈرائیور نے مجھ سے پوچھا کہ ایئرپورٹ روڈ پر کس جگہ جانا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ ٹھنڈے پانی کی سبیل والی کوٹھی پر۔ اس سڑک پر شاید ایک ہی کوٹھی سبیل والی تھی۔ ڈرائیور نے مجھے ٹھیک سبیل والی کوٹھی پر اتار دیا۔ ٹیکسی کو فارغ کر کے میں نے اس کوٹھی کے مالک کی نیم پلیٹ پڑھی تو معلوم ہوا کہ یہ کوٹھی مشہور فلمی ماہنامے شمع کے مالک یونس دہلوی کی تھی۔ میں نے کچھ دور اور آگے جا کر ایک ٹیکسی پکڑی اور اپنے ہوٹل چلا آیا۔

اپنی طرف سے 26 جنوری کے استقبال کے لئے ہم اپنی تیاریوں میں مصروف تھے۔ اس دوران پاکستان سے دو مرتبہ ڈاک ملی اور ہم نے اپنی ڈاک پاکستان بھیجی۔ یشونت باقاعدگی سے ڈاک کا پیکٹ میرے ساتھیوں کے حوالے کرتا اور ہر مرتبہ دو ہزار روپے لیتا تھا۔ پاکستان سے ٹرانسمیٹر پر بھی باقاعدگی سے ہماری خیریت پوچھی جاتی تھی۔ ہر کام معمول کے مطابق ہو رہا تھا۔ بشیر نے 4 تھرمسوں کے خول میرے کہنے کے مطابق بنا لئے تھے اور چاروں لڑکوں کو ان کے مشن بتا دیئے تھے۔ آئندہ پیر کو میرے نئے کانٹیکٹ نے 6 ٹائم بم اور ایک لاکھ روپیہ مجھے دے دیا۔ میں اور میرے ساتھی 26 جنوری کے مشن میں اگرچہ عملی حصہ نہیں لے رہے تھے لیکن جنگ کے دنوں کی طرح ان کا گھر ہمارا OPERATION ROOM بن گیا تھا۔ جہاں پر باہمی مشورے سے فیصلے ہوتے تھے۔ میں تقریباً ہر روز بشیر کی گیراج جانے لگا۔ چاروں لڑکے بھی وہاں آ جاتے تھے اور میں انہیں مشن کے دوران پیش آنے والی ہر دشواری اور اس سے نکلنے کی تربیت دینے لگا۔ ان لڑکوں کی دلیری اور خوشی خوشی میری ہدایات پر عمل کرنے اور بار بار ریہرسل کے باوجود بشاش رہنے سے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ لڑکے اپنے اپنے مشن کو بخیر و خوبی انجام دیں گے۔ جنوری کے تیسرے ہفتے میں، میں نے انہیں دو ٹائم بم لا کے دیئے اور انہیں OPERATE کرنے کی بار بار مشق کروائی۔ میں نے انہیں ٹائم بم بیس منٹ بعد پھٹنے کا وقت ADJUST کرنے کی بار بار مشق کروائی اور انہیں کہا کہ ٹائم بم کارگو سیکشن میں کارگو کے بڑے کارٹنز کے درمیان چھپا کر رکھ دیں۔ کارگو سیکشن میں داخلے کے لئے انہیں بتایا کہ اس سیکشن میں اکثریت ایجنٹ سامان بک کروانے یا چھڑوانے آتے ہیں۔ وہ ان کے ہمراہ ہی ان کے ساتھی کے طور پر سیکشن میں داخل ہوں تو ان کیلئے بڑی آسانی رہے گی۔ یکلخت طبیعت خراب ہونے کا بہانہ بنا کر کسی بڑے کارٹن پر بیٹھ جائیں اور چھوٹا تھیلا جس میں بم رکھا ہوگا اس کو چھپا کر اور بم چلنے کا سوئچ آن کر کے پچھلے کارٹن کے پیچھے رکھ دیں اور پھر جلد از جلد وہاں سے نکلیں اور خیال رکھیں کہ بیس منٹ میں آپ ایئرپورٹ ورنہ کم از کم کارگو سیکشن سے نکل کر مین ٹرمینل میں پہنچ جائیں اور جتنی جلد ممکن ہو ایئرپورٹ سے جتنا دور جا سکتے ہیں، چلے جائیں۔ پالم ایئرپورٹ پر عارف انہیں دو مرتبہ لے کر گیا اور کارگو سیکشن میں لے جا کر انہیں عملی طور پر وہاں کا ماحول دکھایا۔ اس نے سیکشن کے ایک کارکن سے یونہی پوچھا کہ بکنگ کے کتنے روز تک کارگو بمبئی پہنچ جاتا ہے اس کے علاوہ کچھ اور معلومات لیں اور واپس چلے آئے۔

بمبئی کے متعلق ہم نے فیصلہ کیا کہ دو لڑکے وہاں جائیں۔ ایک مشن سرانجام دے اور دوسرا اسے کور کرے۔ بشیر نے انہیں چار عدد پستول بھی دیئے کہ خطرہ اگر زیادہ ہو تو بے شک پستول سے ہوائی فائر اور اگر مسلح آدمی سامنے آ جائیں تو انہیں گولی مار کر فرار ہو جائیں۔

21 اکتوبر کو 2 لڑکے بذریعہ ٹرین بمبئی روانہ ہو گئے۔ بشیر نے انہیں ایک ایڈریس زبانی یاد کروایا کہ اگر ضرورت پڑے تو وہ اس ایڈریس پر جا کر نہ صرف مدد حاصل کر سکتے ہیں بلکہ روپوش بھی رہ سکتے ہیں۔ بشیر نے بمبئی میں اپنے اس CONTACT کو فون کر کے بتا دیا کہ اگر ان ناموں کے لڑکے آئیں تو ہر طرح سے ان کی مدد کرے۔ مجھے بشیر، عارف، نذیر اور ان لڑکوں کی گرم جوشی سے محسوس ہوتا تھا کہ ان میں سے ہر کوئی اس مشن کو اپنا ذاتی کام سمجھ کر اپنی پوری توانائی اس میں صرف کر رہا تھا۔

ان لڑکوں کی بمبئی روانگی کے بعد میں نے بشیر کے ساتھ مل کر مالوٹوف بم تیار کئے۔ یہ بم بنانے کی ترکیب میں یہاں اس لئے تحریر نہیں کر سکتا کیونکہ ترکیب جاننے کے بعد ہر گھر بم ساز فیکٹری بن جائے گا۔ بشیر نے اپنے گروپ میں چار لڑکے اس کام کے لئے چنے اور میں نے انہیں یہ بم ACTIVE کرنے اور انہیں پھینکنے کی بیسیوں بار ریہرسل کروائی۔ 25 دسمبر کو جب ہم ملے تو پالم ایئرپورٹ اور پریڈ پر جانے والے لڑکے مکمل طور پر تیار تھے۔ بشیر نے مشن کے بعد دو جگہوں سے لڑکوں کو اٹھانے کیلئے دو پرائیویٹ موٹروں کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔ میں اور میرے ساتھی پریڈ پر جا رہے تھے۔ میرے نمبر ٹو نے مشن کے دوران تصویریں اتارنی تھیں اور ایک ساتھی نے اسے کور دینا تھا۔ دوسرے دو ساتھیوں نے چاروں لڑکوں کو کور دینا تھا پالم ایئرپورٹ پر کارگو سیکشن کے اندر پہنچانے کی ذمہ داری عارف نے لے لی تھی۔ 26 جنوری 8:30 بجے دہلی میں پریڈ پر اور 11:00 بجے دونوں ایئرپورٹس پر کارروائی کا وقت بہت پہلے ہی مقرر کر دیا گیا تھا اور اس مقررہ وقت میں تبدیلی صرف موقع پر حالات کو دیکھ ہی کی جا سکتی تھی۔ بمبئی جانے والے لڑکوں نے عارف کو فون پر اپنے بمبئی پہنچنے اور سانتا کروز ایئرپورٹ پر کارگو سیکشن میں جا کر حالات کا جائزہ لینے کا بتا دیا تھا۔ یہ ہمارا پہلا مشن تھا جس میں ہم صرف نگرانی کرنے والے تھے اور سارا مشن ان لڑکوں نے پورا کرنا تھا۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ 25 اور 26 جنوری کی رات میں نے بڑی بے قراری میں گزاری۔ تمام رات میں بار بار اللہ پاک کے حضور یہی التجا کرتا رہا کہ ہمارا یہ مشن بھی پہلے مشنوں کی طرح کامیابی سے ہمکنار ہو۔ میں خصوصی طور پر مشن میں شامل لڑکوں کی سلامتی کی دعا بھی مانگ رہا تھا۔ ہم تو پاکستان سے ہی سر پر کفن باندھ کر نکلے تھے لیکن یہ لڑکے صرف ہماری ترغیب دینے کی وجہ سے اس خطرناک کام میں محض اپنے مذہب اور جذبے کی وجہ سے شامل ہوئے تھے۔

26 جنوری کو صبح سویرے میں تیار ہو کر ہوٹل سے باہر آ گیا۔ 8 بجے اندرا گاندھی کو لال قلعے پر بھارتی پرچم لہرانا تھا اور ساڑھے آٹھ بجے پریڈ کا آغاز ہونا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ بڑی مشکل سے ایک ٹیکسی ملی جس نے میٹر کے بجائے منہ مانگے داموں پر مجھے پریڈ کے نقطہ آغاز سے ذرا دور اتار دیا۔ پریڈ کے لئے بھارت کی تینوں افواج کے فوجی دستے اور ٹینک، توپیں، میزائل، بیٹریز، موبائل ریڈار کے ٹرک، بارڈر سیکورٹی فورس BSF کے دستے، اونٹ سوار صحرائی جنگ کے لڑاکا دستے، انجینئرنگ کے عارضی پل بنانے کے موبائل ٹرک ترتیب میں پریڈ کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ان کے بعد پیرا ملٹری فورس، پولیس اور CMH کی نرسوں کے دستے تھے۔ ان کے بعد اسکاؤٹس، طلبہ اور طالبات کی ٹولیاں پی ٹی کے مظاہرے کے لئے موجود تھیں۔ سب سے آخر میں مختلف صوبوں کی ثقافتی نمائندگی کرنے والے فلوٹ تھے۔ پریڈ دیکھنے کے لئے تمام ممالک کے سفیروں اور VVIP شخصیتوں کے لئے سلامی کے چبوترے کے دونوں طرف شامیانے لگے ہوئے تھے۔ بھارتی صدر کو سلامی لینی تھی جبکہ تینوں افواج کے سربراہ اور وزیر اعظم کے لئے چبوترے پر بیٹھنے کا انتظام تھا۔ پریڈ دیکھنے کے لئے عوام کی بہت بڑی تعداد پریڈ کے نقطہ آغاز سے لے کر کرسیوں کے طویل سلسلے تک سڑک کے دو رویہ کھڑی تھی۔ بارش سے بچنے کے لئے دونوں اطراف چھتریاں ہی چھتریاں نظر آ رہی تھیں۔ اس سارے علاقے میں بھارتی فوج اور پولیس کے جوان سیکورٹی کے لئے جا بجا کھڑے تھے یہ اتنی بڑی پریڈ تھی کہ سلامی کے چبوترے سے تقریباً ایک کلومیٹر پہلے چوک میں دائیں جانب والی سڑک پر بھی ایک کلومیٹر تک پریڈ میں شمولیت کرنے والے بالکل تیار کھڑے تھے۔ میں نے لڑکوں کو پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ جب پریڈ شروع ہونے کا اعلان ہو جائے تو اس کے بعد ہی وہ کارروائی کریں کیونکہ اعلان کا مطلب یہ ہوگا کہ صدر، وزیر اعظم اور تینوں افواج کے سربراہوں کے علاوہ تمام سفیر اور VVIP شخصیات بھی آ چکی ہوں گی۔ اسی لئے میں نے کارروائی کا وقت مقرر کرنے کے باوجود حالات کی مناسبت سے وقت میں تبدیلی کا اختیار انہیں دیا تھا۔ ہم نے جو مالوٹوف بم بنائے تھے ان سے ہمارا مقصد صرف فلوٹس میں آگ بھڑکانے اور توڑ پھوڑ کا کام لینا تھا۔ 26 جنوری کو عام تعطیل تھی، صرف لازمی سروسز مثلاً اسپتال، فائر بریگیڈ، ایئرپورٹ اور ریلوے وغیرہ کی چھٹی نہیں تھی۔ ہمارے سب انتظامات مکمل تھے۔ اب سب کام لڑکوں کو کرنا تھا اور اللہ پاک سے انہیں ہمت، کامیابی ملنے کی امید تھی۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ میں خود گھبرایا ہوا تھا۔ ہم نے بھارت میں جو بھی کام کئے تھے وہ خفیہ UNDER SHADOW تھے۔ کھلے عام اور لاکھوں عوام کے درمیان نیم تربیت یافتہ لڑکوں کے ذریعے دھماکے کرنے کا یہ ہمارا پہلا تجربہ تھا۔ بھارتی سیکورٹی کا سارا دھیان مسلح افواج اور فوجی اسلحے کی حد تک تھا۔ اس کے بعد شامل پریڈ دستوں کی سیکورٹی بہت کم تھی اور فلوٹوں پر تو سیکورٹی کے لئے اکا دکا پولیس کے سپاہی ہی نظر آتے تھے۔ میرا یہاں کوئی کام نہ تھا۔ DMI کی نظروں میں پہلے ہی میں آ چکا تھا۔ لہٰذا اچھے نتائج کی تمنا اور توقع لئے ہوئے میں اپنے ہوٹل واپس آیا۔ دھماکوں کے وقت ہوٹل میں میری موجودگی بھی میرے اوپر کسی شک کو دور کرنے کے لئے ضروری تھی۔

میں نے اپنے ساتھیوں اور بشیر سے یہ طے کیا تھا کہ دھماکوں کے فوری بعد وہ اپنے ٹھکانوں پر چلے جائیں۔ لڑکے بشیر کو اپنے مشن کی رپورٹ دیں۔ بعد دوپہر تین بجے میں ساتھیوں کے گھر جاؤں گا اور نذیر کے فون سے بشیر سے رابطہ کروں گا۔ بشیر کی اور اپنے دو ساتھیوں کی جو لڑکوں کو کور دے رہے تھے کی رپورٹوں کا موازنہ کروں گا۔ دہلی پالم ایئرپورٹ کی رپورٹ بھی اس وقت تک یقیناً آ چکی ہوگی اور عین ممکن تھا کہ بمبئی سے بھی اس وقت تک رپورٹ موصول ہو جائے۔

غازی

تین بجے میں ساتھیوں کے پاس جانے کے لئے ہوٹل سے باہر نکلا اور ایک ٹیکسی لی۔ مجھے نئی دہلی سے پرانی دہلی جانا تھا۔ راستے میں کئی سگنل آئے تھے۔ ایک سگنل پر جب ٹیکسی رکی تو اخباروں کے ضمیمے بیچنے والے چلا چلا کر ضمیمے فروخت کر رہے تھے۔ انگریزی کا صرف ایک ضمیمہ مل سکا باقی سب ہندی زبان کے تھے۔ ضمیمے میں شہ سرخیوں میں پریڈ میں شمولیت کرنے والے چار فلوٹوں پر دھماکے، آگ لگنے اور فلوٹوں پر موجود 20 سے زیادہ افراد کے زخمی ہونے کی خبر تھی۔ دوسری سرخی میں پالم ایئرپورٹ پر کارگو سیکشن میں بم دھماکے سے کارگو کی خاصی بڑی تعداد تباہ ہونے اور چھت کا ایک حصہ گرنے کا لکھا ہوا تھا۔ اخبار میں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ دونوں جگہوں پر موقع پر کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی اور پولیس کارگو سیکشن کے عملے کو حراست میں لے کر پوچھ گچھ کر رہی ہے جبکہ فلوٹوں پر دھماکوں سے عوام کی افراتفری اور بھاگنے کی وجہ سے کئی افراد گر کے زخمی بھی ہو گئے تھے جو خبر سننے کے لئے میں ساتھیوں کے پاس جا رہا تھا اس کا بیشتر حصہ مجھے ضمیمے میں ہی مل گیا تھا۔ یہاں میں قارئین کو دونوں جگہوں پر دھماکوں کے متعلق کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ کارگو سیکشن میں دھماکہ کرنے والے لڑکے کو میں نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ بم آن کر کے بڑے کارٹنوں کے بیچ میں پھینک دے۔ اس طرح بم کی شدت میں نمایاں کمی ہو جاتی ہے۔ 360 درجے کے گول دائرے میں 80 درجہ طاقت تو فرش پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ 180 درجوں میں تقریباً 140 درجے بم کی شدت دونوں اطراف کے کارٹنوں کو تباہ کر دیتی اور آگ لگا دیتی ہے جبکہ صرف 35 سے 40 درجہ دھماکے کی شدت سیدھی اوپر جاتی ہے جس کے نتیجے میں کئی کارٹن تباہ ہو گئے اور ان میں آگ لگ گئی۔ چھت کا ایک حصہ گر گیا اور فرش پر گڑھا پڑ گیا البتہ جانی نقصان نہیں ہوا۔ فلوٹس پر مالوٹوف بم چونکہ پھینکے گئے تھے اس لئے تھرماس کے خولوں کے ٹکڑوں سے ان پر موجود لوگ زخمی ہوئے اور فلوٹس جو لکڑی کے ڈھانچوں پر بنائے جاتے ہیں ان میں فوری آگ بھی لگ گئی۔ دہلی میں ہمارا مشن پوری طرح سے کامیاب ہوا تھا۔ پریڈ کے دوران فلوٹوں پر دھماکے آگ لگنے اور لوگوں کے زخمی ہونے سے فلوٹوں کی پریڈ میں شمولیت نہ ہو سکی۔ غیر ملکی سفراء اور VVIP آگ لگنے، لوگوں کے زخمی ہونے اور بھارتی سیکورٹی کی نااہلیت کے گواہ تھے۔ عوام کی افراتفری اور بھاگ دوڑ نے دھماکوں کے تاثر کو دوچند کر دیا تھا۔ پالم ایئرپورٹ پر دھماکے نے RESTRICTED ZONE میں بھارتی سیکورٹی کی دھجیاں اڑا دی تھیں۔ اگر ہم چاہتے تو ان دھماکوں سے بیسیوں افراد کو ہلاک بھی کر سکتے تھے۔ لیکن ایک تو بھارتی نہتے عوام کو ہلاک کرنا ہمارا مقصد نہ تھا۔ دوسرے ہلاکت کی صورت میں سب کی ہمدردیاں ہلاک شدگان اور بھارتی حکومت کے ساتھ ہوتیں لیکن اب صورت یہ تھی کہ سب بھارتی سیکورٹی (خصوصاً 26 جنوری کے حوالے سے) کی نااہلیت پر غم و غصے کا اظہار کر رہے تھے اور یہی ہمارا مقصد تھا جو سو فیصد پورا ہوا۔

ساتھیوں کے گھر پہنچ کر میں نے نذیر کے ذریعے عارف کو بلوایا اور اس کے آنے تک ساتھیوں کے پاس بیٹھ کے ان سے تفصیل پوچھی۔ ہم نے تو جو مالوٹوف بم بنائے تھے۔ وہ عام مولوٹوف سے بہت زیادہ UP GRADED تھے۔ میرے ساتھی بھی ان کی کارکردگی سے حیران تھے۔ انہوں نے بتایا کہ لڑکوں نے چاروں تھرماس یکے بعد دیگرے فلوٹوں پر اچھالے۔ بم زوردار دھماکے سے پھٹے۔ ان کے ٹکڑوں نے نہ صرف فلوٹوں پر کھڑے ہوئے لوگوں کو زخمی کیا بلکہ قریبی کھڑے چند پریڈ دیکھنے والے بھی زخمی ہوئے۔ بم پھٹتے ہی فلوٹوں میں آگ لگ گئی۔ وہاں کھڑے عوام ڈر کر بھاگے۔ اس افراتفری میں لڑکے بھی بھاگ گئے۔ بشیر نے ان کے لئے گاڑیوں کا پہلے ہی انتظام کر رکھا تھا۔ لہٰذا وہ بخیر و عافیت اپنی منزل پر پہنچ گئے ہوں گے (عارف نے بشیر کو فون کر کے اس بات کی تصدیق کر لی تھی)۔ عارف نذیر کے گھر آ چکا تھا۔ میں نیچے آیا اور دونوں کو مہم کی کامیابی کی مبارک باد دی۔ انہوں نے ہم سب کو مبارک باد دی۔ عارف نے بتایا کہ ایئرپورٹ پر کام سرانجام دینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ کارگو سیکشن میں اس وقت صرف دو آدمی ہال میں موجود تھے۔ لڑکے نے کارٹنوں کو دیکھتے ہی بم کو آن کر دیا اور ان کارٹنز پر ایسے بیٹھ گیا جیسے کسی کا منتظر ہو اور موقع ملتے ہی بم کا تھیلا دو کارٹنوں کے درمیان پھینک دیا۔ اس نے ان سے کہا کہ مجھے 11 بجے یہاں ایک بیرنگ ایجنٹ نے ملنے کو کہا تھا۔ مجھے ایک ضروری کام سے واپس جانا ہے اگر کوئی پوچھے تو اسے بتا دیں کہ چندر آ کر چلا گیا ہے۔ یہ کہہ کر لڑکا باہر چلا آیا۔ ایئرپورٹ سے باہر میں گاڑی میں اس کا انتظار کر رہا تھا وہ بمشکل گاڑی میں بیٹھا ہی تھا کہ زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی۔ ہمارا کام مکمل ہو چکا تھا لہٰذا ہم واپس چلے آئے۔ گاڑی بشیر نے بھیجی تھی، میں راستے میں اتر گیا اور گاڑی لڑکے کو لے کر بشیر کے گھر چلی گئی۔ اب تک مجھے بمبئی کے ہوائی اڈے کے علاوہ تمام معلومات مل چکی تھیں۔ نذیر کے ٹیلی فون سے بشیر سے رابطہ کیا تو اس نے بتایا کہ ابھی تک بمبئی سے کوئی اطلاع نہیں آئی۔ چونکہ اس دور میں ڈائریکٹ ڈائلنگ کا سسٹم شروع نہیں ہوا تھا اس لئے کال ملنے میں خاصا وقت صرف ہو جاتا تھا۔ میں نے بشیر کو دہلی میں لڑکوں کی کامیابی پر اسے اور لڑکوں کو مبارک باد دی۔ بشیر نے اگلے روز دوپہر کو اس خوشی میں ہمیں کھانے کی دعوت دی جسے میں نے انتہائی شکریے کے ساتھ مسترد کر دیا کیونکہ ان دھماکوں کے بعد دہلی میں سیکورٹی یقیناً بہت سخت ہو چکی ہو گی اور ہم کسی طرح کی بھی بے احتیاطی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ میں نے بشیر کو کہا کہ بمبئی سے جو خبر آئے وہ عارف کو مختصر اور چھپے الفاظ میں بتا دے۔ نامعلوم مجھے کیوں یہ خیال آ رہا تھا کہ دہلی میں مسلمانوں اور سکھوں کے ٹیلی فونوں پر OBSERVATION لگ چکی ہو گی۔ میں نے نذیر کے گھر میں چائے پی اور ساتھیوں کو بتا کر اپنے ہوٹل چلا آیا۔

دوسرے روز میں ابھی کمرے میں ہی تھا کہ نمبر ٹو کا فون آیا اور اس نے ہمارے اپنے طے شدہ کوڈ میں بتایا کہ چائے کی دو پیٹیاں بغیر ٹوٹ پھوٹ کے گودام میں پہنچ چکی ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بمبئی گئے ہوئے دونوں لڑکے اپنا کام کر کے بمبئی کے ٹھکانے پر بخیریت پہنچ چکے ہیں۔ مجھے ان کی طرف سے بھی تسلی ہو گئی میں نے ناشتہ کمرے میں ہی منگوا لیا اور اپنے مقرر کردہ دو اخبار TRIBUNE اور TIMES OF INDIA دیکھنے شروع کئے دونوں اخباروں کے پہلے صفحے پریڈ کے دوران دھماکوں اور دہلی اور بمبئی ایئرپورٹس پر دھماکوں کی خبروں اور تصویروں سے بھرے پڑے تھے TRIBUNE نے تو اپنے اداریئے میں صاف لکھ دیا تھا کہ 26 جنوری کو دہلی اور بمبئی میں دھماکے پاکستان کے ایجنٹوں یا آزادی پسند سکھوں نے کئے ہوں گے۔ TIMES OF INDIA نے شاندار پریڈ کو SYMBOL OF NEGLIGENCE قرار دیتے ہوئے کہا کہ ایسی نمائشی پریڈوں کے بجائے ہمیں اپنی سیکورٹی پر توجہ دینی چاہئے۔ دشمن ہمارے اتنے اندر گھس آیا ہے اور اتنی بے خوفی سے کارروائیاں کر رہا ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ پریڈ کے دوران یہ حادثہ اور دہلی اور بمبئی کے ہوائی اڈوں پر دھماکے دراصل ہمارے منہ پر دشمن کا بھرپور طمانچہ ہے۔ ابھی 31 دسمبر کے طمانچے کی گونج ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ 26 جنوری کو دوبارہ ہماری نااہلیت کے باعث ہمیں بھرپور طمانچہ کھانا پڑا ہے۔ مجھے انگریزی کے جو بھی اخبارات ان خبروں کے حوالے سے مل سکے وہ لے لئے تاکہ انہیں پاکستان جانے والی ڈاک میں بھیج سکوں۔ ان دھماکوں کی خبر BBC نے بھی نشر کی اور مجھے یقین ہے کہ تمام سفیروں نے ان دھماکوں کی خبر اپنے ممالک کو بھیجی ہو گی۔

یہاں میں یہ عرض کرتا چلوں کہ ہمیں پاکستان سے ان دھماکوں کے لئے کوئی ہدایت نہیں ملی تھی۔ ہم نے یہ دھماکے کرنے کا فیصلہ اپنی صوابدید کے مطابق خود کیا تھا۔ سقوط ڈھاکہ کے سانحے کو صرف میرے سینئرز ہی نے نہیں بلکہ سارے پاکستانیوں نے شدت سے اپنی رسوائی سے تعبیر کیا تھا اور اب ہم اس رسوائی کا بدلہ لینے میں اپنا کردار ادا کر رہے تھے۔ میرے سینئرز کو ان دھماکوں کی اطلاع تو مل چکی تھی لیکن انہیں یہ علم نہ تھا کہ ان کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا۔ ہماری ڈاک سے جب انہیں معلوم ہوا کہ یہ دھماکے ہم نے کروائے تھے اور پاکستان کے ہمدردوں کا ایک گروہ بھی تشکیل دے دیا تھا تو یقیناً وہ خوشی سے جھوم اٹھے ہوں گے۔ پاکستان سے آنے والی ڈاک میں انہوں نے ہمیں اس از خود کردہ کارروائی پر بہت مبارک اور شاباش دی اور لکھا کہ جب اپنے چیف کو انہوں نے ہماری سابقہ کارروائیوں کے ساتھ ان دھماکوں کا بتایا تو چیف کے سراہتے الفاظ کچھ اس طرح سے تھے کہ اگر مجھے اتنے حوصلہ مند 25 گروپ اور مل جائیں تو میں بغیر جنگ لڑے بھارت کو شکست دے کر گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر سکتا ہوں۔ 2 فروری کو بشیر نے بمبئی والے لڑکوں کی بخیریت دہلی آمد کا مژدہ سنایا۔

ان دھماکوں کے بعد بھارتی انٹیلی جنس واقعی بہت چوکس ہو چکی تھی۔ ہم نے بھی اپنے ڈاک پاکستان بھیجنے اور وصول کرنے کے سوا آئندہ کے سب PLANS کچھ عرصہ کے لئے معطل کر دیئے۔ لیفٹیننٹ سے ڈاک باقاعدگی سے مل رہی تھی۔ میں اور میرے ساتھی مسلسل کام اور ذہنی دباؤ کی وجہ سے خاصے تھک چکے تھے۔ میں نے سینئرز کی اجازت سے ہم سب کے لئے 10 روز کی چھٹی کی اجازت لی۔

پروگرام اس ترتیب سے طے ہوا کہ پہلے میں اکیلا دس روز کی چھٹی کروں پھر ساتھی دو دو کی ٹولی میں یکے بعد دیگرے چھٹی پر جائیں۔ میں نے اپنے دس روز شملہ میں گزارنے چاہے۔ سردیوں میں شملہ میں برف باری اور جاکو میں بندروں کے گڑھ کے متعلق میرے والدین مجھے بڑی دلچسپ باتیں سنایا کرتے تھے۔ میری پیدائش سے 5 سال کی عمر تک وہ گرمیوں کا موسم شملہ میں گزارتے تھے۔ میرے دماغ میں شملہ کی دھندلی تصویر تو تھی اور اب میں خود جا کر اس تصویر کو نمایاں کرنا اور اس میں نقش بھرنا چاہتا تھا۔ میں نے ساتھیوں کو بتایا کہ شملہ پہنچ کر میں انہیں اپنے ہوٹل سے فون کروں گا اور انہیں رابطے کیلئے نمبر بتا دوں گا تاکہ کسی ایمرجنسی کی صورت میں وہ مجھ سے رابطہ کر سکیں۔ پاکستان سے آنے والی ڈاک کی وصولی اور ڈاک بھیجنے کی تاریخ میری چھٹیوں میں آتی تھی۔ اسلئے میں نے نمبر ٹو کو چارج دیتے وقت کوریئر سے ملنے کا کوڈ اور جگہ بتا دی۔ یہ کوریئر اس سے پہلے بھی کیپٹن ارشد کے ہمراہ میرے نمبر ٹو کو دیکھ چکا تھا۔ میں نے جانے کی سب تیاری کر لی۔ گرم کپڑوں کے چند جوڑے سوٹ کیس میں ڈالے۔ سائیلنسر والا اور سادہ پسٹل ساتھ لیا۔ ہوٹل سے چیک آؤٹ کیا۔ لاکر میں رکھے ایک لاکھ سے زیادہ روپے نمبر ٹو کے حوالے کئے اپنا باقی سامان بھی ساتھیوں کے پاس رکھا اور 20 فروری کو میں شملہ کے لئے روانہ ہو گیا۔

شملہ پہنچے مجھے ابھی 6 روز ہی گزرے تھے کہ میرے نمبر ٹو کا فون آیا۔ اس نے بتایا کہ بشیر کو کسی نے گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے اور یہ خبر اسے نذیر اور عارف نے بتائی ہے۔ یہ خبر سنتے ہی میرا تفریحی موڈ تو یکلخت ختم ہو گیا تھا۔ میں نے نمبر ٹو کو کہا کہ وہ اور دوسرے ساتھی ہرگز اس طرف نہ جائیں۔ نذیر اور عارف کو بھی ادھر جانے سے منع کر دیں اور میں پہلی گاڑی سے واپس آ رہا ہوں۔ سفر کے دوران میں سارا وقت یہی سوچتا رہا کہ بشیر کو کس نے قتل کیا ہے۔ پولیس یا سرکاری اداروں نے اگر اسے ہلاک کیا ہوتا تو اخبارات میں بڑھا چڑھا کر اسے ہلاک کرنے کا دعویٰ کیا جاتا لیکن ان اداروں کی جانب سے بالکل خاموشی تھی۔ اس واردات کی تفصیلات مجھے دہلی جا کر ہی مل سکتی تھیں۔ بشیر جیسے مخلص ساتھی کی موت میرے لئے کم صدمے کی بات نہ تھی۔ دہلی آ کر میں سیدھا ساتھیوں کے گھر گیا اور ان سے جو کچھ بھی اس واردات کی تفصیل مل سکتی تھی وہ سن کر نذیر اور عارف کے ساتھ ایک میٹنگ کی۔

نذیر اور عارف نے بھی جتنا کچھ اس واردات کے متعلق انہیں علم تھا، مجھے بتایا لیکن یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ قاتل کون ہے؟ عارف نے بتایا کہ بشیر سے رات کھانا کھانے کے بعد جب وہ اپنے اندرونی کمرے میں اکیلا تھا، کوئی ملنے آیا جسے اس نے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ نذیر کے ملازم کے مطابق وہ کوئی سکھ تھا۔ ملازم چائے بنانے کے لئے باورچی خانے میں گیا تو اس نے گولی چلنے کی آواز سنی۔ وہ بھاگا ہوا کمرے میں آیا تو بشیر کو ماتھے پر گولی لگ چکی تھی اور وہ بستر پر دراز مرا پڑا تھا اور سکھ غائب تھا۔ ملازم نے بشیر کے جاننے والے ایک دو قریبی گھروں میں اطلاع دی وہ آ گئے اور اس واردات کی پولیس کو خبر کی۔ اگلی صبح لاش کا پوسٹ مارٹم ہوا اور بعد دوپہر لاش دفنا دی گئی۔ عارف نے بتایا کہ گو بشیر لاوارث تھا لیکن اس کے جنازے میں ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ دکھ اور غم کا احساس اپنی جگہ لیکن میں بشیر کے قتل کو اندھا قتل قرار دیئے جانے کے لئے ہرگز تیار نہ تھا۔ میرے دماغ میں بار بار ایک ہی بات گھوم رہی تھی کہ بشیر جو دن کے وقت بھی بغیر جان پہچان کے کسی کو نہ بلاتا تھا۔ رات کو اپنے اندرونی کمرے میں کسی انجان کو ملنے اور ملازم کو چائے بنانے کے لئے بھیجنے پر کیسے تیار ہو گیا۔ اس کا ملازم جس کا نام عاقل میاں تھا، نے بھی اس سکھ کو اپنے لئے انجان بتایا تھا اور کہتا تھا کہ جب میں اس کا پیغام لے کر بشیر کے پاس گیا تو اس نے سکھ کو فوراً ہمراہ لانے کو کہا۔ عاقل قریب دو سال سے بشیر کے باورچی اور خادم کا کام کر رہا تھا۔ اس واردات کی کڑیاں ملاتے مجھے دو دن گزر گئے۔ اچانک ایک خیال آیا کہ واردات کے متعلق ہم صرف عاقل میاں کے بیان کی روشنی میں ہی سوچ رہے ہیں اگر بفرض محال عاقل کا بیان ہی غلط ہو تو...... اور اچانک ہی میرے دماغ میں کڑیاں خود بخود ملنے لگ گئیں۔ بشیر اپنی تمام رقم اپنے گھر میں رکھتا تھا۔ جس کا عاقل میاں کو علم ہو جانا عین ممکن تھا۔ عاقل قریب دو سال قبل بشیر کی ملازمت میں آیا تھا۔ ان دو سالوں میں اس سکھ کو عاقل نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ بڑے تعجب کی بات تھی۔ عاقل میرٹھ کا رہنے والا تھا یہ اس کا بیان تھا جس کی کبھی تصدیق نہیں کی گئی۔ ان سب باتوں کی روشنی میں میری سوچ صرف عاقل کو ہی قاتل ٹھہراتی تھی۔ اس کا واردات کے بعد روپے لے کر فوراً ہی بھاگ نہ جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ بشیر کے دوست اور جانثار ساتھی اسے پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالتے۔ میں نے عارف اور نذیر سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ بشیر کے ظاہری طور پر رکھے ہوئے صرف 3 ہزار روپے ہی ملے ہیں جبکہ خود بشیر کی زبانی اس کے پاس نو دس لاکھ روپیہ تھا جسے اس نے گھر میں ہی رکھا ہوا تھا۔ جوں جوں میں عاقل کے متعلق سوچتا میرا شک یقین میں بدلتا جاتا۔ بالآخر میں نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر کے ایک ترکیب کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کیا اور اگلی شام ہم مسلح ہو کر بشیر کے گیرج کی طرف روانہ ہو گئے۔

بشیر کے گیرج سے قدرے پہلے ہی ہم نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ ہم سنگل (FILE) فائل پوزیشن میں چل رہے تھے۔ حالات ہی کچھ ایسے ہو چکے تھے کہ ہمیں بے حد احتیاط سے کام لینا پڑتا تھا۔ بشیر ہمارا قابل اعتماد ساتھی بن چکا تھا اور اسی کے ذریعے ہم 31 دسمبر اور 26 جنوری کے مشن پورے کر سکے تھے۔ اس کے قتل کو بھول جانا اور پس پشت ڈالنا ہمارے لئے ناممکن تھا۔ اس جذباتی لگاؤ کے علاوہ بشیر ہماری بہت اہم ضرورت تھا۔ اسی کے توسط سے ہم نے لڑکوں کے گروہ کو باقاعدہ تربیت دینے کا فیصلہ کیا تھا جس کے متعلق اپنے سینئرز کو بھی آگاہ کر دیا تھا۔ ہمیں یہ بھی خطرہ تھا کہ اگر قاتل کو ہمارے اور بشیر کے تعلقات کا علم ہے تو وہ کسی وقت بھی ہم سب کے لئے مصیبت کھڑی کر سکتا ہے۔ اس لئے فوری طور پر اس کا سراغ لگانا اور ہمیشہ کے لئے اس کا منہ بند کرنا ہمارے اپنے تحفظ کے لئے بہت ضروری تھا۔

بشیر کی گیرج سے کچھ پہلے ہمیں چاروں لڑکے اپنی طرف آتے دکھائی دیئے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں واپس لوٹ جانے کا کہا۔ ان لڑکوں نے ہی 26 جنوری کو پریڈ کے دوران دھماکے کئے تھے۔ ہمیں ان پر پورا اعتبار تھا۔ ہم واپس چل دیئے۔ وہ لڑکے تیز تیز چلتے ہوئے ہم سے آن ملے اور سرگوشی میں انہوں نے بتایا کہ گیرج میں اس وقت پولیس آئی ہوئی ہے۔ کچھ اور آگے ایک چھپر ہوٹل تھا۔ دو لڑکے ہمیں اس ہوٹل کی پچھلی طرف لے گئے۔ وہاں چھپر ہوٹل کے باورچی خانے کے ساتھ ہی ایک کمرہ بنا ہوا تھا جس میں چند کرسیاں اور میزیں پڑی تھیں۔ لڑکوں نے بتایا کہ یہ چھپر ہوٹل بشیر نے ہی ایک بے روزگار مسلمان کو اپنے پیسوں سے بنوا کر دیا تھا اور بشیر کے ساتھیوں کے لئے محفوظ جگہ تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں چائے آ گئی۔ آسمان سیاہ بادلوں سے بھرا پڑا تھا کسی بھی وقت بارش شروع ہو سکتی تھی۔ ان لڑکوں نے بتایا کہ پولیس نے عاقل میاں سے معمولی سی پوچھ گچھ کی ہے۔ پولیس کو تو یہ خوشی تھی کہ علاقے کا ایک مشہور اور بنڈر مسلمان "غنڈہ" ہلاک ہو گیا تھا۔ ان کی سردردی ختم ہو چکی تھی اس لئے محض رسمی اور سرسری کارروائی کی جا رہی تھی۔ میں نے لڑکوں سے کہا کہ آج ہم یہ فیصلہ کرنے نکلے ہیں کہ بشیر کے قاتل تک ہر حالت میں پہنچیں گے۔ لڑکوں کے پوچھنے پر میں نے بتایا کہ ہمیں عاقل پر شک ہے۔ لڑکوں نے دبی زبان سے میری بات کی تائید کی لیکن وہ حیران تھے کہ اس دو سالہ پرانے ملازم کو بشیر کو قتل کرنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ بشیر اسے تنخواہ سے بہت زیادہ رقم انعام اور امداد کی صورت میں دیتا تھا۔ میں نے لڑکوں کو کہا کہ وہ ہمارے ساتھ ہی ٹھہریں۔ آج ہی اس بات کا فیصلہ ہو جائے گا کہ عاقل بے گناہ ہے یا گناہ گار۔ لڑکوں نے رضامندی ظاہر کی۔ میں نے دو لڑکوں کی ڈیوٹی لگائی کہ گیرج کے قریب کہیں چھپ کر دیکھیں اور پولیس کے جانے کی ایک لڑکا ہمیں فوراً اطلاع دے اور دوسرا وہیں کھڑا رہے اور عاقل اگر ہمارے پہنچنے سے پہلے باہر جائے تو اس کا پیچھا کرے۔ دونوں لڑکے چلے گئے اور ہم ان کے انتظار میں اسی کمرے میں بیٹھے رہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک لڑکا تقریباً بھاگتے ہوئے آیا۔ اس نے بتایا کہ پولیس واپس چلی گئی ہے اور عاقل جب گیرج کے دروازے وغیرہ بند کرنے لگا تو اس لڑکے کے ساتھی نے دروازہ بند کرنے سے پہلے ہی عاقل کو باتوں میں لگا لیا ہے اور اگر ہم جلد وہاں پہنچ جائیں تو گیرج کے اندر داخل ہو سکتے ہیں۔ ہم فوراً اٹھے اور بھاگم بھاگ گیرج تک پہنچے۔ گیرج کا بڑا دروازہ نیم وا تھا۔ ہم ایک ایک کر کے گیرج میں داخل ہوئے۔ سب سے آخر میں داخل ہونے والے میرے ساتھی نے گیرج کے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔

غازی

عاقل جو ہم 9 افراد کی اچانک آمد سے گھبرا گیا تھا۔ دروازہ بند ہوتے دیکھ کر بالکل ہی بوکھلا گیا اور مدد کے لئے چیخنے ہی والا تھا کہ میرے جوڈو کراٹے کے ماہر ساتھی نے اسے چہرے پر لگاتار دو تین گھونسے مار کر نیم بے ہوش کر دیا۔ میں نے دو لڑکوں کی ڈیوٹی مین گیٹ پر لگائی تا کہ اگر کوئی باہر سے آئے تو ہمیں بتا سکیں۔ میرے دو ساتھیوں اور دو لڑکوں نے عاقل کو ہاتھوں پاؤں سے اٹھایا اور اسے گیرج کے اندر اس کمرے میں لے گئے جہاں بشیر دن کے وقت بیٹھا کرتا تھا۔ اس کمرے کے اندر سے ایک کمرہ چھوڑ کر بشیر کے رہائشی حصے کے دو کمرے تھے اور ان کمروں سے ملحقہ وہ بڑا کمرہ تھا جس میں لیتھ مشین کے علاوہ کئی اور مشینیں پڑی ہوئی تھیں۔ بشیر کے رہائشی حصے کے کمرے مقفل تھے۔ عاقل کی جیب سے میرے نمبر ٹو نے چابیاں نکالیں اور عاقل کو گھسیٹتے ہوئے ہم سب بشیر کے رہائشی کمرے میں آ گئے۔ اسی کمرے میں بشیر کو قتل کیا گیا تھا۔

عاقل کے لئے یہ سب بالکل غیر متوقع تھا، اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا میں نے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور انہوں نے اسے ٹھڈوں سے مارنا شروع کر دیا۔ میں چاہتا تھا کہ اسے شروع میں ہی ایسی مار دی جائے کہ وہ سچ بولنے پر مجبور ہو جائے۔ جب اس کی اچھی طرح سے ٹھکائی ہو گئی تو میں نے اسے بیٹھنے کو کہا۔ وہ بڑی مشکل سے اٹھ کر کرسی پر بیٹھنے ہی لگا تھا کہ میں نے اسے ایک زوردار جھانپڑ رسید کیا اور کہا کہ فرش پر اکڑوں ہو کر بیٹھے۔ عاقل فرش پر بیٹھ گیا تو میں نے اس سے پوچھا۔ اب ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہ بشیر کیسے قتل ہوا۔ عاقل نے وہی سکھ والی کہانی شروع کی تو میرے ساتھی نے پیچھے سے اس کے سر پر گھونسہ مارا۔ میں نے عاقل سے کہا کہ میں نے تمہیں سچ بولنے کے لئے کہا تھا۔ سکھ والی بات بالکل غلط ہے۔ سچ بتاؤ، عاقل نے گڑگڑا کر قسمیں کھانی شروع کیں کہ سکھ والا واقعہ سچا ہے۔ میرے ساتھیوں نے اسے پھر مارنا شروع کیا۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور یہ کمرہ گیرج کے بالکل آخری حصہ میں واقع تھا۔ عاقل کی چیخ و پکار کی آواز سڑک پر سنی جانے کا کوئی امکان نہ تھا۔ میرے ایک ساتھی نے لوہے کا ایک بھاری رینچ اٹھایا اور مجھ سے پوچھا کہ ہاتھوں سے شروع کروں یا پاؤں سے۔ میں نے کہا پاؤں سے۔ میرے ساتھی نے اسے جوتے اتارنے کو کہا۔ عاقل نے جوتے اتارنے میں تامل کیا تو میرے ساتھیوں نے اسے اپنی گرفت میں لے کر اس کے جوتے اتارے۔ دو ساتھیوں نے عاقل کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ایک نے اس کے منہ میں رومال ٹھونسا اور رینچ والے ساتھی نے پورے زور سے اس کے پاؤں پر رینچ مارنا شروع کیا اور تب چھوڑا جب اس کے پاؤں کی ہڈیاں چکنا چور ہو چکی تھیں۔ عاقل بہت تڑپا تلملایا لیکن میرے ساتھیوں کی مضبوط گرفت سے نہ نکل سکا۔ عاقل کے منہ میں رومال بدستور ٹھنسا ہوا تھا۔ میرے ساتھی نے اس کا دوسرا پاؤں کھینچ کر سامنے کیا اور مارنے کیلئے رینچ بلند کیا۔ میں نے عاقل کو کہا اب بھی سچ بول دو تو اس اذیت سے بچ جاؤ گے دوسری صورت میں تمہارا دوسرا پاؤں اور پھر سارے جسم کی ایک ایک ہڈی کے بیسیوں ٹکڑے کر دیئے جائیں گے۔ تم نے دیکھ لیا ہے کہ ہم سچ اگلوانے کیلئے کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ عاقل کے منہ میں رومال تھا۔ دونوں بازو ساتھیوں نے پکڑے ہوئے تھے۔ اس نے زور زور سے اثبات میں سر ہلانا شروع کیا۔ رینچ والے ساتھی نے اس کے منہ سے رومال نکالا تو پہلے تو عاقل نے درد کی تکلیف کی وجہ سے چیخیں مارنی شروع کیں۔ میرے ساتھی نے رینچ اٹھا کر پھر اس کے پاؤں کو نشانہ بنانا چاہا تو عاقل نے چیختے ہوئے کہا اللہ کے واسطے مجھے مت ماریں میں سب کچھ سچ بتاتا ہوں۔ اس طرح کے تشدد کو تابڑ توڑ حملہ کہتے ہیں۔ عاقل نے جو کچھ بتایا وہ یہ تھا کہ بشیر کے قتل سے ایک رات پہلے اس نے بشیر کو اپنی خفیہ سیف کھولتے دیکھ لیا تھا۔ یہ سیف زمین میں اسی کمرے میں اس طرح گڑی ہوئی تھی کہ اس کے سامنے کا رخ اوپر کی جانب تھا اور فرش سے قریب 16 انچ اندر تھی۔ کمرے میں بڑے ٹائلوں کا فرش تھا۔ سیف بند کر کے اس کے اوپر ٹائل رکھ دیئے جاتے تھے اور بڑا قالین ان ٹائلوں کو ڈھانپ دیتا تھا۔ کمرے میں ایک بڑا قالین بچھا ہوا تھا اور سیف والی جگہ پر صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ عاقل نے بتایا کہ سیف میں ڈھیر سارے روپے دیکھ کر اس کی نیت خراب ہو گئی تھی۔ بشیر کو اس پر اتنا اعتبار تھا کہ اسے ایک پستول بھی دے رکھا تھا۔ اسی پستول سے اس نے بشیر کو اگلی رات نشانہ بنایا اور بشیر کی جیب سے چابیاں نکال کر سیف کھولنی چاہی لیکن کامیاب نہ ہو سکا کیونکہ سیف میں نمبر لاک بھی تھا۔ ہم نے صوفہ ہٹایا۔ قالین پلٹا ٹائل اٹھائے تو سیف سامنے تھی۔ چابیوں کا پوچھنے پر عاقل نے بتایا کہ دوسرے کمرے میں لیتھ مشین کی موٹر کے نزدیک چھپا کر رکھی ہیں۔ ایک ساتھی اس کمرے میں گیا اور چابیاں اٹھا لیں۔ چابیاں تو سیف میں لگ گئیں لیکن نمبر لاک بڑی پرابلم تھا۔ سیف اتنی مضبوط تھی کہ پستول کی گولیوں سے بھی نہ کھل سکتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ نمبروں کی ترتیب بشیر نے کہیں لکھ کر رکھی ہو گی۔ میں نے بشیر کے کاغذات کی الماری کھنگالنی شروع کی۔ اس الماری میں مختلف قسم کے کاغذات، بجلی اور پانی کے بل بے ترتیب پڑے ہوئے تھے۔ ایک ڈائری نما کاپی کاغذوں کے نیچے سے ملی۔ اس میں نام، ٹیلی فون نمبر اور عجیب و غریب قسم کے ایڈریس لکھے تھے۔ مثلاً مشرق میں 140 کلو والے کو سامان پہنچانا ہے۔ 6 کلو جنوب میں سامان کی قیمت ملے گی۔ اس ڈائری پر اسی طرح کی تحریریں درج تھیں۔ میں نے نوٹ کیا کہ اس ڈائری کے ہر صفحے پر اوپر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی عددی تعداد 786 لکھی ہوئی ہے۔ صرف ایک صفحہ ایسا تھا جس پر دائیں جانب 8 اور 6 لکھے ہوئے تھے جبکہ بائیں جانب 7 لکھا تھا۔ میں حیران تھا کہ اس صفحے پر 786 کو الٹ پلٹ اور علیحدہ علیحدہ کیوں لکھا تھا۔ میرے ساتھی اس دوران سیف کے نمبر ملانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بغیر کسی وجہ کے میں نے انہیں ہٹایا اور نمبروں والی ناب کو صفر پر لا کر پہلے دائیں جانب نمبر 8 پر لایا پھر بائیں جانب پورا چکر دے کر 7 نمبر پر رکا اور دائیں جانب پورا چکر دے کر 6 نمبر پر رکا۔ اللہ کا نام لے کر میں نے ہینڈل گھمایا تو سیف کھٹاک سے کھل گئی۔ میں سمجھتا ہوں اس میں میرا کوئی کمال نہ تھا یہ سب بسم اللہ کی برکت تھی، محض اتفاق نہ تھا۔ میں نے ساتھیوں کو کہا کہ سیف کو بالکل خالی کر دیں۔ سیف میں سے گیارہ لاکھ اور پانچ ہزار کے لگ بھگ رقم، 8 عدد مختلف بور کے پستول اور ریوالور کی بے شمار گولیاں اور ایک ڈائری برآمد ہوئی۔ ڈائری میں اس کے گروہ کے تمام لڑکوں کے پتے اور کچھ ٹیلی فون نمبر لکھے ہوئے تھے۔ میں نے وہ ڈائری تو جیب میں رکھ لی اس دوران شدید بارش اور خاصی رات گزر جانے کے باعث بڑے گیٹ پر کھڑے لڑکے بھی اندر آ گئے تھے، روپیہ اور کاغذات میرے ساتھیوں نے بشیر کے ہی ایک سوٹ کیس میں رکھ لئے اور اسلحہ اور گولیاں ایک کینوس کے تھیلے میں ڈال دیں۔ عاقل گھٹنوں کے بل بیٹھا آنکھیں پھاڑے ہمیں اور سیف سے نکلنے والے لاکھوں روپوں کو دیکھتے ہوئے درد سے کراہ رہا تھا۔ اب وہی ہماری سب سے بڑی پرابلم تھا۔ میری ہمیشہ سے یہ عادت رہی ہے کہ میں کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے والدین اور ان کی غیر موجودگی میں دوستوں اور ساتھیوں سے مشورہ ضرور کرتا تھا لیکن بعض اوقات جب میں اپنے تئیں اپنے کسی فیصلے کو بالکل درست سمجھتا تھا تو پہلے اس پر عمل کرتا اور بعد میں دوسروں کو بتاتا تھا۔

میں نے لڑکوں کو گاڑی پر ڈالنے والا ترپال لانے کو کہا۔ چند منٹ میں ہی وہ ایک پھٹا پرانا ترپال لے آئے میں نے انہیں ترپال کو دوہرا کر کے بچھانے کی ہدایت کی۔ کسی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں۔ سب خاموشی سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے ساتھیوں کو کہا کہ وہ عاقل کو ترپال کے بیچ میں بٹھا دیں۔ انہوں نے عاقل کو اٹھا کر ترپال پر بٹھا دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے آئندہ اقدام کا قیاس کر سکیں۔ میں نے سائلنسر والا پسٹل نکالا اور عاقل کے سینے پر پے در پے تین گولیاں داغ دیں۔ عاقل نے مدہم سی سسکی لی اور وہیں ڈھیر ہو گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ لڑکوں اور اپنے ساتھیوں سے مشورہ کروں اور مختلف آرا کی صورت میں کسی مخمصے میں پڑ جاؤں۔ عاقل نے بشیر کے قتل کا اقبال کیا تھا۔ محض پیسے کی لالچ میں اس نے ہمارے ایک بے لوث اور وفادار ساتھی کا قتل کیا تھا اور اسے زندہ چھوڑ دینے کا مطلب تھا کہ میں اپنے سمیت اپنے ساتھیوں، لڑکوں اور نذیر و عارف کو بھارتی پولیس اور DMI کے حوالے کر دوں۔ میرے ساتھیوں نے پہلی مرتبہ مجھے طیش کے عالم میں دیکھا تھا۔ وہ تو بالکل خاموش رہے، سب لڑکے مجھے لالہ جی کہتے تھے، ان میں سے ایک نے سکوت توڑا اور کہنے لگا لالہ جی ہمیں یہی تشویش تھی کہ کہیں آپ اسے چھوڑ نہ دیں اس جیسے غدار اور نمک حرام کا یہی انجام لازمی تھا۔ وہ چپ ہوا تو سب نے اس کی تائید کی۔ ایک لڑکے نے کہا کہ اگر اس کی لاش کے پانچ سات ٹکڑے کر دیئے جائیں اور چہرہ ناقابل شناخت بنا کر گردن الگ کر دی جائے تو بہتر رہے گا۔ ایک نے تجویز کیا کہ لاش کو گیرج میں کہیں دفن کر دیا جائے جسے میں نے فوراً ہی مسترد کر دیا۔ بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ چہرے کو ناقابل شناخت بنا کر گردن الگ کر دی جائے اور بقیہ جسم کے 8 ٹکڑے کئے جائیں۔ ان ٹکڑوں کو ترپال کے ٹکڑے کر کے ان میں الگ الگ باندھ کر دریا برد کیا جائے۔ عاقل کا سارا سامان جلا دیا جائے اور کوئی ایسا نشان نہ چھوڑا جائے جس سے پتہ چل سکے کہ عاقل کو مار دیا گیا ہے بلکہ یہ سمجھا جائے کہ وہ بھاگ گیا ہے۔ لاش کے ٹکڑے کرنے کا کام میں نے لڑکوں کو سونپا میرے ساتھیوں میں سے ایک باورچی خانے میں چائے بنانے چلا گیا۔ قارئین! یہ میری زندگی اور بھارت میں میرا پہلا قتل تھا جس پر میں کبھی شرمندہ نہیں ہوا۔

میں نے عارف کا فون ملایا اس وقت رات کے ڈھائی بج رہے تھے اور موسلا دھار بارش جاری تھی کافی دیر تک گھنٹی بجنے کے بعد عارف نے فون اٹھایا۔ میں نے مختصراً اسے کہا کہ چھتہ لال میاں میں ہم کل 9 افراد موجود ہیں ایک بڑی ایمرجنسی ہے اس لئے جیسے بھی ہو، ایک پرائیویٹ کار خود ڈرائیو کرتے ہوئے 4 بجے تک پہنچ جائے۔ عارف کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی میں نے فون بند کر دیا۔ آدھ گھنٹے کے اندر لڑکوں نے لاش کے ٹکڑوں کی 9 گٹھریاں بنا لی تھیں۔ میرا ساتھی چائے اور بسکٹ لے کر باورچی خانے سے آ گیا سب نے چائے پی۔

چار بجے سے پہلے ہی ہمیں ہارن کے وقفے وقفے سے بجنے کی آواز سنائی دی عارف اپنے ایک پڑوسی کی گاڑی لے کر آ چکا تھا۔ میں نے مختصراً اسے ساری بات بتائی۔ لڑکوں نے گاڑی کی ڈگی میں سب گٹھریاں بھی رکھ دی تھیں۔ انہوں نے ایک عقلمندی کی تھی کہ گیرج میں پڑی اینٹوں میں سے ہر گٹھری میں پانچ پانچ اینٹیں بھی رکھ دی تھیں تا کہ گٹھریاں وزن کی وجہ سے تہہ میں چلی جائیں ہر گٹھری کو رسی سے مضبوطی کے ساتھ باندھا گیا تھا۔ عارف نے بتایا کہ ایک سڑک جمنا کے ڈاؤن اسٹریم Down Stream دس بارہ میل تک دریا کے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔ گٹھریوں کو وہاں پھینکنا بہتر رہے گا۔ میں نے صبح چار بجے کا وقت اس لئے چنا تھا کہ اس وقت پولیس اور دیگر اداروں کے نائٹ ڈیوٹی والے گھروں کو چلے جاتے ہیں جبکہ صبح کی ڈیوٹی والے 6 بجے سے پہلے ڈیوٹی کے مقام پر نہیں پہنچتے۔ اس وقت صرف نواحی دیہاتوں سے دودھ والے ہی سڑکوں پر نظر آتے ہیں۔ گاڑی میں عارف کے ساتھ میرا ایک ساتھی اور تین لڑکے بیٹھ گئے۔ تا کہ گٹھریوں کو ٹھکانے لگانے میں وقت صرف نہ ہو۔ گیرج میں میرے سوا تین ساتھی اور ایک لڑکا رہ گئے۔ عارف نے واپسی پر لڑکوں کو چھتہ لال میاں کے قریب اتار کر میرے ساتھی کے ہمراہ واپس چلے جانا تھا۔ میں نے عارف کو کہا کہ گٹھریاں پھینکنے کے بعد گاڑی کی ڈگی کو کچھ وقت بارش میں کھلا رہنے دے تا کہ اگر خون کا کوئی نشان ہو تو وہ مٹ جائے۔ ہمارے پاس رہ جانے والے لڑکے نے بتایا کہ دہلی کی بہت ساری ٹیکسیاں چھتہ لال میاں میں رہنے والوں کی ہیں جو صبح سات بجے روزی کمانے نکل پڑتی ہیں۔ ٹھیک ساڑھے 5 بجے ہم نے گیرج کے کمروں اور مین گیٹ کو تالہ لگایا اور سوٹ کیس اور کینوس کے پستولوں اور گولیوں سے بھرے تھیلے کو اٹھا کر سڑک پر آ گئے ابھی بالکل اندھیرا تھا بادلوں نے سحر کی مدہم روشنی کو چھپا رکھا تھا موسلا دھار بارش جاری تھی۔ ہم بارش میں بھیگتے چلتے چلتے تقریباً دو کلومیٹر دور چوراہے پر پہنچ گئے اور دائیں رخ کی سڑک کے کنارے ایک درخت تلے کھڑے ہو گئے تا کہ کوئی ہمیں چھتہ لال میاں سے آتا ہوا نہ سمجھ بیٹھے۔ تھوڑی دیر بعد ہی ایک ٹرک دہلی کی جانب جاتا دکھائی دیا ہم نے اسے روکا تو سکھ ڈرائیور نے کہا کہ اسے سبزی منڈی جانا ہے دس روپے دو اور پیچھے بیٹھ جاؤ ہم نے اسے غنیمت جانا بلکہ بہت بہتر جانا اور ترپال سے ڈھکے ٹرک میں بیٹھ گئے۔ سبزی منڈی پہنچ کر ہم نے ریلوے اسٹیشن کا اوور ہیڈ برج کراس کیا اور دوسری طرف آ گئے۔ اسٹیشن کے باہر رکشے اور ٹیکسیاں کھڑی تھیں ہم نے دو ٹیکسیاں لیں ایک میں اس لڑکے کو دو سو روپے دے کر اس کے گھر بھیجا۔ اور دوسری میں میرے تینوں ساتھی اور میں ساتھیوں کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ ہم رات بھر کے جاگے اور بارش سے بری طرح بھیگے ہوئے تھے ہم میں ناشتہ بنانے کی ہمت بھی نہ تھی۔ نذیر کے گھر والے بیدار ہوئے تو ہم نے انہیں ہمارے لئے ناشتہ بنانے کا کہا اور نذیر کو بھی اوپر بلا کر اسے رات کا واقعہ سنایا۔ اس نے بھی میرے فیصلے کی تائید کی۔ آٹھ بجے تک عارف اور ہمارا ساتھی بھی لوٹ آئے اور اپنا کام بخیر و خوبی انجام دینے کا بتایا تو ہمیں اطمینان نصیب ہوا۔ بشیر سے متعلق باقی واقعات مختصراً عرض کرتا ہوں۔ دو روز بعد عارف نے بشیر کے شاگرد لڑکوں کی میٹنگ بلائی۔ کیونکہ عارف کو ہی سرپرست کی حیثیت حاصل تھی میں نے تمام روپیہ عارف اور نذیر کے حوالے کیا جسے دونوں نے Joint اکاؤنٹ کھول کر بینک میں رکھوا دیا۔ اس رقم سے لڑکوں کی مزید تربیت اور ان کی جائز ضروریات کیلئے روپیہ نکلوایا جا سکتا تھا۔ بشیر کا کوئی فوری وارث تو تھا نہیں جسے روپیہ دیا جاتا۔ اس لئے اس کا بہترین مصرف ہم نے یہی سمجھا کہ اس کی رقم کو اس کے جانثاروں پر ہی خرچ کرنا چاہئے۔ بشیر کی صحیح قدر تو ہمیں اس کے مرنے کے بعد آئی جب پتہ چلا کہ بشیر نے گیرج اپنی موت کے بعد بیچ کر اس روپے سے چھتہ لال میاں کی کنواری لڑکیوں، ضعیف مردوں اور عورتوں میں بانٹنے کی قانونی وصیت کر رکھی تھی۔ میرے مشورے سے عارف نے وہ گیرج بشیر کے جمع شدہ پیسوں میں سے 3 لاکھ میں خرید لی۔

بشیر کے جانثاروں کو پھر مل بیٹھنے اور مستقبل میں اپنی کارروائیوں کیلئے جگہ میسر آ گئی۔ جن لڑکوں کو بشیر نے موٹر مکینک کا کام سکھایا تھا انہوں نے ورکشاپ سنبھال لی۔ چھتہ لال میاں والوں کو جب بشیر کی وصیت اور غنڈے کے خول میں ایک محبت کرنے والا شریف انسان دکھائی دیا تو بہت ساری پرائیویٹ کاریں اور ٹیکسیاں اس کے گیرج کی گاہک بن گئیں۔ مکینک لڑکوں نے بھی خوب محنت کی۔ گیرج کا کام اور شہرت روز بروز بڑھتی گئی۔ دن کو وہاں موٹروں کی مرمت کا کام ہوتا تھا اور رات کو تربیت اور مستقبل میں کارروائیوں کی منصوبہ بندی کی جاتی تھی۔ کیا اب بھی مجھے عاقل کے قتل کا مجرم ٹھہرایا جا سکتا ہے؟ ایک بات بیان میں رہ گئی۔ بشیر کی سیف سے ملے اسلحہ کو میں نے اپنے ساتھیوں کی تحویل میں دے دیا کیونکہ مجھے خدشہ تھا کہ نوجوان لڑکے جذبات میں بہہ کر کوئی ایسی نادانی نہ کر بیٹھیں جس کا خمیازہ ہم سب کو بھگتنا پڑے۔ رام پوری چاقو کا استعمال ہوا تو وہ بشیرے سے سیکھ ہی چکے تھے بارود کی اسلحہ انہیں دینا دانشمندی نہ تھی۔

آئی بی ہیڈ کوارٹرز میں دھماکے

میرے ساتھی اور میں پہلے ہی اعصاب شکن ماحول میں رہ رہے تھے۔ بشیر کے قتل نے تو ہمیں بالکل ہی ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ہماری حالت کا اندازہ تو وہی کر سکتے ہیں جنہیں ہوائی سفر کے دوران کبھی جہاز کے AIR POCKET میں آ کر سینکڑوں فٹ یکلخت نیچے چلے جانے یا طوفان میں گھر کر ڈگمگانے کا تجربہ ہوا ہو۔ صرف چند منٹوں کیلئے ایسی کیفیت کے دوران مسافروں کی جو حالت ہوتی ہے۔ ہم لگاتار اور مسلسل تقریباً دس ماہ سے اس کا شکار تھے۔ بشیر کے قتل کے دو ہفتے بعد میں نے ساتھیوں کو پہلے سے طے شدہ چھٹی پر جا کر تازہ دم ہونے کو کہا۔ لیکن انہوں نے جانے سے انکار کر دیا۔ میں نے انہیں ماسوا ڈاک کی وصولی اور بھیجنے تمام سرگرمیاں پندرہ روز کیلئے معطل کرنے کا کہا، وہ مان گئے۔ میں خود بھی بے حد ذہنی دباؤ کا شکار تھا جس کا میں نے کبھی اظہار نہیں کیا تھا۔ میں تقریباً روزانہ ساتھیوں کے گھر جاتا تھا۔ عارف اور نذیر سے بھی اکثر ملاقات رہتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ میرے ساتھی ہمیشہ اپنے بستروں میں رضائی اوڑھے لیٹے ہی رہتے تھے، خود میری حالت یہ تھی کہ ان دو تین گھنٹوں کو چھوڑ کر جو میں ساتھیوں کے پاس جانے اور ان کے ساتھ بات چیت میں صرف کرتا تھا باقی سارا وقت اپنے کمرے میں ہی گزارتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ایسی حالت میں اگر مزید چند روز ہم نے گزارے تو اعصابی تناؤ ہم سب پر حاوی ہو جائے گا اور ہم مزید کوئی مشن پورا کرنے کے قابل نہ رہیں گے۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ 65ء کی جنگ کے بعد سیز فائر کے دوران پاکستانی اور بھارتی فوجیں ایک دوسرے کی فائرنگ رینج میں مورچوں میں دبکی رہتی تھیں۔ پاکستانی فوجی آدھی رات کے وقت مل کر بلند آواز میں اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے اور فوراً ہی بھارتی فوجی ہزاروں گولیاں فائر کر دیتے۔ بھارتی فوجی علی الصبح حاجات سے فراغت کیلئے چمکتی گڑویاں لئے ہوئے مورچوں سے باہر نکلتے تو پاکستانی نوجوان گڑویوں کا نشانہ باندھ کر دو چار فائر کر دیتے تھے۔ بس پھر نہ حاجات باقی رہتی تھی اور نہ ہی گڑویاں۔ کئی کئی گھنٹے بھارت کی طرف سے مسلسل فائر جاری رہتا۔ پاکستانی فوجیوں نے تو اسے ایک روزمرہ کا کھیل بنا لیا تھا۔ ادھر بھارتی فوج کی حالت دگرگوں تھی۔ آخر کار سیکٹر کمانڈروں کے اجلاس میں اس سیکٹر کے بھارتی بریگیڈیئر نے پاکستانی سیکٹر کمانڈر سے گڑگڑا کر التجا کی کہ ایک تو پاکستانی فوجی رات کو اللہ اکبر کا نعرہ نہ لگائیں اور دوسرے گڑویوں پر فائر کرنا چھوڑ دیا۔ کئی بھارتی فوجی اللہ اکبر کے نعرے سے اپنے حواس کھو بیٹھے اور چیختے چلاتے فائر کرتے تو نومینز لینڈ سے بھی آگے بڑھ کر پاکستانی گولیوں کا شکار ہو چکے تھے۔

قسط نمبر 31

غازی

لہو گرم رکھنے کیلئے ہمیں لپکنا، جھپکنا اور جھپٹ کر پلٹنے کی اشد ضرورت تھی۔ میں نے ہنگامی بنیادوں پر ایک پروگرام بنایا اور عارف کے ذریعے لڑکوں کو شام چھ بجے گیرج میں میٹنگ کیلئے اکٹھے ہونے کا کہا۔ اگلے روز ہم پانچوں عارف کو ساتھ لے کر گیرج پہنچے۔ تمام لڑکے وہاں موجود تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ ہمیں اب ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہیں رہنا چاہیے بلکہ اپنی سرگرمیوں کو تندہی سے جاری رکھنا چاہیے۔ HIT AND RUN کی پالیسی کے تحت آپ لوگوں کو ٹارگٹ چننے ہیں۔ چونکہ لڑکے دہلی اور گردونواح سے بخوبی واقف ہیں لہٰذا ہر تین لڑکوں کی ٹولی کا انچارج میرا ایک ساتھی ہوگا۔ میں نے 9 لڑکوں کی تین ٹولیاں بنائیں اور تین ساتھیوں کو (نمبر ٹو کو چھوڑ کر) ان کا انچارج بنا لیا۔ میں نے انہیں کہا کہ ٹارگٹ چنتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ شہری آبادی کو جانی یا مالی نقصان نہ پہنچے۔ ہمارا مقصد صرف سراسیمگی پھیلانا اور IN-UNIFORM ان لوگوں کے خلاف عوام میں نا اہلی کے جذبات پیدا کرنا ہے۔ ٹارگٹ چننے کے بعد وہ مجھے ٹارگٹ کی تفصیلات بتائیں گے اور اگر ٹارگٹ ہر لحاظ سے مفید اور محفوظ ہوا تو میں اس ٹارگٹ کیلئے ضروری سامان مہیا کروں گا۔ میں نے لڑکوں سے کہا کہ پرسوں صبح 9 بجے وہ کشمیری گیٹ، گاندھی کی سمادھی اور لال قلعہ کے سامنے بالترتیب اے، بی اور سی گروپ پہنچ جائیں۔ جہاں پر میرے تینوں ساتھی انہیں ملیں گے اور ٹارگٹس کی تلاش میں ان کے ہمراہ رہیں گے۔ سب نے اس پروگرام کو پسند کیا۔ میرے ساتھی بھی اپنی اصلی فارم میں آ گئے اور اس نئے مشن کیلئے ذہنی طور پر خود کو تیار کرنے لگے۔ ان ٹارگٹوں کی تلاش سے میرا ایک اور مقصد بھی تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میرے ساتھی دہلی سے اچھی طرح سے واقف ہو جائیں اور میں بھی ان معلومات کی روشنی میں ان سب جگہوں پر نشان لگا سکوں جہاں ایسی کارروائی کی جا سکتی تھی اور وہ حساس مقامات جو اب تک میری نظروں میں نہیں آئے تھے ان کے متعلق بھی جانکاری کر سکوں۔ ان تینوں ٹولیوں نے کم از کم دس بارہ حساس مقامات تلاش کرنے تھے۔ اس IN-UNIFORM سے میری مراد صرف فوجی علاقے ہی نہیں تھے بلکہ پولیس، ریزرو پولیس، آئی بی، نیوی اور ایئر فورس کے دفاتر کے علاوہ پولیس لائنز، فوجی اور آل انڈیا ریڈیو کے ٹرانسمیشن پول بھی تھے جہاں فوج کا پہرہ ہوتا ہے۔ میں نے اس بات کی تفصیلاً وضاحت کر دی تھی۔

مقررہ وقت پر میرے ساتھی لڑکوں سے مقررہ جگہوں پر ملے اور اپنے اپنے ٹارگٹس کی تلاش میں دہلی اور گردونواح کے علاقوں میں پھیل گئے۔ ہر شام 8 بجے میں ساتھیوں کے گھر جاتا۔ ہم سب نے دہلی اور نواحی علاقوں کے ایک جیسے نقشے لے رکھے تھے۔ میرے ساتھی اپنے اپنے نقشوں پر نشان لگاتے اور اس سے علاقے کی تفصیل مجھے بتاتے اور میں اپنے نقشے پر نشان لگا کر ان کی حاصل کردہ تفصیل کی سمری لکھ لیتا۔ یوں تقریباً دس روز میں مجھے چودہ مختلف حساس مقامات کی تفصیل اور نشان دہی حاصل ہو چکی تھی۔ میرے ساتھی اور لڑکے بھرپور چستی اور عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ میں نے ان چودہ مقامات کی اہمیت کے حساب سے درجہ بندی کر لی اور تین دن میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان سب مقامات پر گیا۔ اٹیک کا وقت اور بھاگنے کے رستوں کا تعین کیا۔ درجہ بندی میں اول اہمیت میں نے ریڈیو ٹرانسمیشن پول ایریا، دوم آئی بی ہیڈ کوارٹرز اور تیسری پوزیشن تین مقامات یعنی آرمی، ایئر فورس اور نیول RECRUITING CENTRES کو دی۔ ان تمام مقامات پر حملوں کے وقت مدافعت کا کوئی امکان نہ تھا اور میرے ساتھیوں اور لڑکوں کو گروپ کی صورت میں حملہ کرنے اور دو دو کی ٹولی میں بھاگ جانے کا عملی تجربہ بھی ہو جاتا۔ میں نے اپنے نئے ہمدرد صنعت کار سے رابطہ کیا اور اس سے مزید پندرہ ٹائم بم طلب کیے۔ اس نے ایک ہفتے میں بم مہیا کرنے کی مہلت لی۔ میں چاہتا تھا کہ لڑکوں اور اپنے ساتھیوں کی کارکردگی اگر حوصلہ افزا رہی تو اس سب سے بڑے مشن کو انجام دینے کی کوشش کروں جس کے متعلق میرے سینئرز نے دوران تربیت مجھے بتایا تھا کہ وہ مشن ہمارا PRESTIGE MATTER بن چکا ہے۔ میں نے بھی بھارت میں اب تک کے قیام کے دوران جب بھی اس مشن کے متعلق سوچا، اپنے ساتھیوں کی مختصر تعداد اور مشن سرانجام دینے کیلئے مطلوبہ سامان کا نہ ہونا آڑے آیا۔ اب ان نڈر لڑکوں کی وجہ سے ہماری عددی کمی پوری ہو چکی تھی اور نئے ہمدرد کے ذریعے ہر طرح کے مطلوبہ اسلحے کا حصول ممکن بنا دیا گیا تھا۔ ہمارے سینئرز نے بھی یہ نیا انتظام غالباً اس لئے کیا تھا کہ ہماری گزشتہ کارکردگی نے انہیں متاثر کیا ہو اور انہیں اپنے PRESTIGE MISSION میں ہماری کامیابی کا امکان نظر آتا ہو اور وہ مشن بھارت کے اس ہوائی اڈے کا جس کا رن وے، جنگی طیاروں کے PARKING RAMP اور FUELING کا انتظام پہاڑ میں سرنگیں کھود کر پہاڑ کے اندر کیا گیا تھا اور ایک تہائی رن وے بھی پہاڑ کے اندر ہی تھا اور وہاں بھارت نے اپنے مگ 21 کے علاوہ فرانسیسی میراج طیارے بھی محفوظ کیے ہوئے تھے۔

ہم نے پہلے روز ریڈیو ٹرانسمیٹر پولز (POLE) I.B ہیڈ کوارٹرز پر صبح سات بجے اور آرمی اور ایئر فورس ریکروٹمنٹ سینٹر پر شام 6 بجے حملے کا وقت مقرر کیا ان اوقات میں مدافعت کا بہت کم امکان تھا اور اگر ان کا جانی نقصان ہوتا بھی تو بہت کم ہوتا۔ ایک ہی دن میں چار مختلف حساس مقامات پر بم دھماکوں سے تباہی اور وہ بھی بھارتی دارالحکومت میں پورے بھارت کو ہلا کر رکھ دیتی۔ میں نے کئی بار ان چاروں ٹارگٹس پر جا کر حملے کے بعد بھاگنے کے راستوں کا تعین کیا۔ دشواری صرف ریڈیو ٹرانسمیٹر پولز پر حملے کے بعد فرار کی راہ کا تعین کرنے میں پیش آئی۔ ٹرانسمیشن کے پولز دہلی کے انڈسٹریل ایریا کے ختم ہو جانے کے بعد محض جی ٹی روڈ پر دہلی سے قریب 30 کلومیٹر کے فاصلے پر تھے اور وہ سارا ایریا خاردار تاروں سے گھرا ہوا تھا اندر داخل ہونے کا صرف ایک راستہ تھا اور ٹرانسمیشن پولز کے درمیان ریلوے اسٹیشن کے دو کمرے اور گارڈز کے لئے بھی دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ نگرانی کے دوران مجھے ایک وقت میں صرف دو گارڈ ہی دکھائی دیئے۔ جو بیشتر وقت گارڈ روم میں ہی گزارتے تھے کیونکہ بادلوں کی وجہ سے انہیں دھوپ سینکنے کو میسر نہ تھی۔ پچھلی جانب کی خاردار تاروں کو کاٹ کر ریلوے اسٹیشن تک بغیر گارڈز کی نگاہ میں آئے پہنچنا بہت آسان تھا۔ مسئلہ صرف بم رکھنے کے بعد مین روڈ تک واپس آنا اور وہاں سے دہلی تک آنے کا تھا۔ اس کا حل یوں نکالا گیا کہ بم کو آن کر کے پھٹنے کا وقفہ 45 منٹ کا رکھا جائے اور واپسی کے لئے گاڑی مہیا کرنے کی ذمہ داری عارف کو سونپی۔

I.B (انٹیلی جنس بیورو) کا ہی کوارٹر پرانی دہلی میں ایک قدیم عمارت میں قائم تھا۔ ایک بغیر دروازوں کے مغلیہ دور کے طرز کا داخلے کا اتنا بڑا دروازہ تھا کہ بڑا ہاتھی بھی با آسانی گزر جائے۔ دروازے سے گزر کر مستطیل میدان میں عملے کی اور سرکاری گاڑیوں کی پارکنگ تھی اور اس میدان کے تین اطراف برآمدے اور کمرے بنے ہوئے تھے۔ ہمیں یقین تھا کہ وہیں پر زیر زمین ٹارچر سیل اور لاک اپ بھی ضرور ہوں گے۔ یہاں پر پروگرام کے مطابق پارکنگ لاٹ میں سرکاری گاڑیوں کے درمیان والی گاڑی میں بم رکھنا تھا تاکہ دھماکے سے دونوں اطراف کھڑی گاڑیوں کو بھی نقصان پہنچے۔ صبح سات بجے سویپرز کے بھیس میں ان گاڑیوں تک پہنچنا اور بم رکھنے کے بعد فرار ہونا بہت آسان تھا۔ نیول ریکروٹنگ سینٹر کو ہم نے فی الحال اپنی لسٹ سے نکال دیا تھا۔ آرمی اور ایئر فورس ریکروٹنگ سینٹرز پر شام 4 بجے کے بعد صرف دو تین گارڈز اور سویپرز کی حکمرانی ہوتی تھی۔ ان دونوں جگہوں کی چار دیواری 4 سے 5 فٹ تک بلند تھی اور اسے پھلانگ کر اصل عمارت کے بڑے دروازے تک پہنچنا اور بم رکھ کر (دروازہ بند ہونے کی صورت میں کھڑکی کا شیشہ کاٹ کر بم اندر پھینکنا) اور سلامتی سے واپس لوٹنا بھی ایسا دشوار نہ تھا۔ ان دونوں جگہوں پر بم پھٹنے کا وقفہ 30 منٹ رکھنے کا طے ہوا۔ یہ دونوں سینٹرز نئی دہلی میں سفارت خانوں کے قریب ہی جن پت کے علاقے میں واقع تھے۔ میں نے ان حملوں کے دوران پیش آنے والی ہر ممکن دشواری اور تمام جزیات پر اپنے ساتھیوں سے کئی بار مشورہ کیا اور لڑکوں کو کئی بار ریہرسل کروائی۔ ہمارا ہوم ورک پوری طرح سے مکمل تھا اور ہم سب اس پر متفق اور مطمئن تھے حملے کا وقت تک متعین کیا جا چکا تھا۔ اب ہمیں بموں کی وصولی کے بعد صرف تاریخ کا تعین کرنا تھا۔ میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ یہ حملے اتوار کے روز کیے جائیں کیونکہ چھٹی کی وجہ سے آئی بی کی بیشتر گاڑیاں ہیڈ کوارٹرز میں موجود ہوں گی ریکروٹنگ سینٹرز پر بھی بالکل خاموشی ہوگی کیونکہ بعض اوقات امیدواروں کے ٹیسٹ خاصی دیر تک جاری رہتے تھے۔

میری ہدایت پر میرے ساتھیوں نے خاردار تار کاٹنے کے لئے ایک بڑا کٹر، ربڑ کے بڑے دستانے، سویپرز کے مخصوص لباس، شیشہ کاٹنے کیلئے ہیرے کی قلمیں، شیشے کو بغیر آواز علیحدہ کرنے کے لئے ربڑ کے ویکیوم (یہ ویکیوم ربڑ بچوں کی کھلونوں کی دکان سے تیروں کے آگے لگے ویکیوم ربڑ تھے) اپنے اور لڑکوں کے لئے کینوس شوز اور اونی ٹوپیاں (جنہیں کھول کر گردن تک لایا جا سکتا تھا اور صرف آدھا چہرہ دکھائی دیتا) خرید لیں اور ان ٹوپیوں پر پشت کی جانب صرف آنکھوں کی جگہ پر سوراخ کر لئے تاکہ اگر ضرورت پیش آئے تو حملے کے دوران ان کی شناخت نہ ہو سکے۔ غرضیکہ پلان کے مطابق ہماری تمام تیاری مکمل تھی۔ اس بار مجھے ان مشنز کو صرف مانیٹر کرنا تھا۔ عملی حصہ نہیں لینا تھا۔ طے شدہ مقام اور وقت کے مطابق مجھے دو سوٹ کیسوں میں حفاظت سے پیک کیے ہوئے 15 ٹائم بم بھی مل گئے۔ اپنے ساتھیوں کو ACTIVATE کرنے کیلئے میں نے چاروں جگہوں پر بم پلانٹ کرنے کی ذمہ داری انہیں سونپی۔ لڑکوں نے انہیں کور دینا تھا۔ صبح والی دو ٹولیوں میں سے ایک کو اسی شام دوسرے ٹارگٹ پر حملہ کرنا تھا یہ ٹولی میرے جوڈو کراٹے کے ماہر ساتھی کے زیر نگرانی تھی۔ میرے نمبر ٹو نے بہت ضد کی کہ اسے بھی چاروں میں سے ایک مشن دیا جائے لیکن میں نے اسے اجازت نہ دی ہمارا ٹرانسمیٹر آپریٹر وہی تھا اور مشن میں ناکامی کی صورت میں ہمارا ٹرانسمیٹر سے پاکستان سے رابطہ ختم ہو جاتا۔ میں نے اس مشن کیلئے بھی پاکستان سے اجازت نہیں لی تھی۔ مجھے ایک جنرل ہدایت دی گئی تھی کہ ہر وہ کام کرو جس سے عوام میں سراسیمگی پھیل سکے اور اسی ہدایت کے تحت میں نے گزشتہ اور یہ مشن ترتیب دیئے تھے۔

میں نے آئندہ جمعے کی شام ساتھیوں کے ہمراہ لڑکوں سے میٹنگ کی۔ عارف اور نذیر بھی اس میٹنگ میں شامل تھے۔ میں نے انہیں آخری ہدایت دی اور بتایا کہ آئندہ اتوار کو یہ مشن سرانجام دینے ہیں۔ میرے ساتھیوں کے پاس اپنا اسلحہ تھا۔ بشیر کی سیف سے ملے اسلحہ میں سے میں نے تین ریوالور اور گولیاں تینوں ٹولیوں کے اسمارٹ لڑکوں کو دیں اور کہا کہ اسلحے کا استعمال صرف اسی صورت میں کیا جائے جب کوئی اور رستہ باقی نہ رہے اور مشن مکمل کرنے کے بعد اسلحہ میرے ساتھیوں کو واپس کر دیا جائے۔ عارف کے ذمے گاڑی کا انتظام کرنا اور ٹرانسمیشن پولز تک چاروں کو لے جانے اور واپس لانے کی ڈیوٹی تھی۔ غرضیکہ تمام انتظامات اور ہدایات کو آخری بار دہرا کر ہم واپس چلے آئے۔ ساتھیوں کو گھر پر چھوڑ کر میں اپنے ہوٹل واپس آ گیا۔ میں نے ساتھیوں کو علیحدگی میں خبردار کر دیا تھا کہ ان کی ٹولی کا ایک لڑکا بھی غیر حاضر ہو تو مشن کو ملتوی کر دیں۔ بشیر کے قتل کے واقعے نے مجھے بے حد چوکنا کر دیا تھا اور مجھے کسی پر بھی پورا اعتبار نہیں رہا تھا۔ اس مشن کی تمام تفصیلات پلاننگ میں بیان کر چکا ہوں۔ لہٰذا انہیں دوبارہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اتوار کی صبح 7 بجے ہی میں ساتھیوں کے گھر پہنچ گیا۔ نذیر، میں اور میرا نمبر ٹو نذیر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر مشن کے نتائج کا انتظار کرنے لگ گئے۔ سب سے پہلے آئی بی کے ہیڈ کوارٹرز جانے والی ٹولی کا نگران میرا ساتھی آیا۔ اس نے بتایا کہ سویپر کے بھیس میں اسے گاڑیوں تک پہنچنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی اور وہ درمیان والی گاڑی میں بم رکھ کر بلا کسی کی نظر میں آئے وہاں سے نکل آیا۔ ریوالور والے لڑکے نے ریوالور اسے واپس کیا اور چاروں الگ الگ راستوں سے چلے گئے۔ قریباً ایک گھنٹے بعد عارف میرے ساتھی کے ساتھ واپس آیا اور اپنی کامیابی کا مژدہ سنایا۔ بم پھٹنے کے وقت سے بہت پہلے ہی دونوں ٹولیاں اپنے ٹارگٹس سے بہت دور پہنچ چکی تھیں۔ اب ہمیں اخباروں کے ضمیمے چھپنے کے وقت تک انتظار کرنا تھا۔ اس ساتھی کو بھی لڑکے نے ریوالور واپس کر دیا تھا۔ عارف نے بتایا کہ وہ ٹرانسمیشن پولز کے سامنے مین روڈ پر گاڑی کا بونٹ اٹھا کر ان کا انتظار کر رہا تھا۔ کسی نے بھی وہاں اس کی موجودگی کا نوٹس نہیں لیا۔ چاروں کارروائی مکمل کر کے ٹہلتے ہوئے واپس آ گئے اور وہ گاڑی تیز بھگا کر دہلی چلا آیا۔

نذیر نے دوپہر کے کھانے کا انتظام اپنے ہاں کر رکھا تھا۔ میں نے کھانے کے بعد اپنے نمبر ٹو کو بھیجا کہ جا کر اگر کوئی ضمیمہ چھپا ہو تو لے آئے۔ تھوڑی دیر میں ہی نمبر ٹو خوشی سے سرخ چہرے کے ساتھ فاتحانہ انداز میں واپس آیا۔ اس کے پاس انگریزی اور ہندی میں چھپے ضمیمے تھے۔ انگریزی ضمیمے میں آئی بی اور ٹرانسمیشن پولز پر دھماکوں کی خبریں جلی سرخیوں کے ساتھ چھپی ہوئی تھیں۔ مختصر اداریئے میں انٹیلی جنس بیورو کے ہیڈ کوارٹرز میں دھماکے سے 7 گاڑیوں کے مکمل تباہ ہونے اور باقی گاڑیوں کو نقصان پہنچنے کا احاطہ کرتے ہوئے اس ادارے کو بری طرح لتاڑا گیا تھا اور وزیر داخلہ سے استعفیٰ دینے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اسی اخبار میں ٹرانسمیشن پولز پر ریلوے اسٹیشن کے مکمل طور پر تباہ ہونے اور دہلی ریڈیو اسٹیشن کے بند ہونے پر وزیر مواصلات سے بھی استعفے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ شام 5 بجے تک انگریزی کے 5 مختلف ضمیمے ہمارے پاس جمع ہو چکے تھے۔ اخبار والوں کو کیا معلوم تھا کہ ابھی تو صرف انٹرول ہوا ہے اور باقی آدھا حصہ شام 6 بجے شروع ہوگا۔ ہم نے ایک دوسرے کو بھرپور مبارکباد دی۔ شام کو جانے والی ٹولی کا ساتھی آرام کرنے اپنے کمرے میں چلا گیا ہم نذیر کے ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھے تھے وقفے وقفے سے چائے پیتے رہے۔ 5 بجے سے قبل ہی ہمارا ساتھی شام کے مشن کے لئے تیار ہو کر آ گیا اور ہم سے اجازت لے کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرے نمبر ٹو نے مجھے پھر اس مشن پر جانے کی اجازت دینے کو کہا لیکن میں نے انکار کر دیا اور اسے کہا کہ عنقریب ہی ہم سب اس مشن کے متعلق تفصیلات طے کریں گے جس میں سب کو اپنی صلاحیت دکھانے کا بھرپور موقع ملے گا۔ اس مشن میں جی بھر کر اپنے ارمان پورے کر لینا۔

شام کو سات بجے پہلی ٹولی واپس آئی۔ نذیر نے لڑکوں کو باہر سے ہی واپس بھیج دیا۔ میرے ساتھی نے ایئر فورس ریکروٹنگ سینٹر کے ہال سے ملحقہ کمرے کی کھڑکی کا شیشہ کاٹنے اور بم پھینکنے کا بتایا۔ انہیں کسی مدافعت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ واپسی پر لڑکے نے ریوالور اسے واپس کر دیا تھا۔ اب صرف آخری ٹولی کی کامیاب واپسی کے ہم سب منتظر تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہی ہمارا ساتھی مسکراتا واپس لوٹا۔ اس ساتھی کا یہ آج کا دوسرا مشن تھا۔ اس نے بتایا کہ شیشہ کاٹنے کے بعد اسے علیحدہ کرتے وقت شیشہ نیچے گر گیا۔ ایک فوجی گارڈ آواز سن کر ادھر دوڑا آیا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ میرا ساتھی اس کے بوٹوں کی چاپ سن کر ایک طرف چھپ گیا۔ ابھی وہ فوجی ٹوٹے ہوئے شیشے کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ اسے کور دینے والے ایک لڑکے نے پیچھے سے آ کر اپنے چاقو سے اس کی گردن کاٹ دی۔ یہ سب کچھ آٹھ دس سیکنڈ میں ہو گیا۔ میرے ساتھی نے بڑے آرام سے بم کمرے میں کھڑکی کے قریب ہی پڑی کرسی پر رکھ دیا اور ہم سب واپس چلے آئے۔ شام ڈھلے دہلی ریڈیو اسٹیشن اپنی نشریات ایمرجنسی RELAY SYSTEM سے بحال کرنے میں کامیاب ہوا۔

دوسرے دن صبح کے اخبارات چاروں جگہوں پر تباہی کے حالات سے بھرے ہوئے تھے I.B کے ہیڈ کوارٹرز میں تباہ گاڑیوں اور ٹرانسمیشن لائن کے RELAY STATION کے منہدم کمرے اور تباہ مشینری کی تصویریں بھی تھیں۔ آرمی اور ایئر فورس ریکروٹنگ سینٹرز کی تصویریں نہیں تھیں۔ اخبارات میں یہ لکھا تھا کہ ان دونوں عمارتوں میں بم کے دھماکے ہوئے اور دھماکوں والے کمرے تباہ ہو گئے۔ آرمی کے جوانوں نے دونوں عمارتوں کو گھیر رکھا تھا۔ گارڈ کے قتل ہو جانے کی خبر کو سرکاری طور پر دبا دیا گیا تھا لیکن جائے وقوعہ پر پہنچنے والے اخبارات کے رپورٹروں کو سویپرز نے بتا دیا تھا کہ ایک گارڈ بھی ہلاک ہو گیا ہے۔

ہماری اس کامیابی نے جہاں ہمیں خوشیوں سے لاد دیا تھا وہاں پورے بھارت اور خصوصاً راجدھانی دہلی کے عوام میں خوف و ہراس اور عدم تحفظ کا بہت احساس پیدا ہو گیا۔ اخبارات کئی روز ان دھماکوں کی خبروں سے بھرے رہے۔ TRIBUNE نے تو اپنے اداریئے میں یہاں تک لکھا تھا کہ اب ہمیں واقعی ضرورت ہے کہ آئی بی، آرمی اور ایئر فورس کی حفاظت کے لئے ایک علیحدہ فورس تیار کریں۔ اپوزیشن پارٹیوں نے اس موقع کو غنیمت جان کر حکمران پارٹی پر بے طرح کیچڑ اچھالی۔ حتیٰ کہ لوک سبھا میں بھی اس واقعہ پر خاصا ہنگامہ ہوا۔ اخبارات نے ان دھماکوں کا ذمہ دار پاکستان، علیحدگی پسند سکھوں اور بعض نے کشمیر کے حریت پسندوں کو ٹھہرایا۔ ان دھماکوں سے چند روز قبل ہی تامل ناڈو (مدراس) کی صوبائی حکومت کو ختم کر کے صدر راج نافذ کیا گیا تھا کئی اخبارات نے اسے سابق تامل ناڈو حکومت کا انتقامی کارنامہ قرار دیا۔ ان دھماکوں کے بعد دہلی کو معمول پر آنے میں دس پندرہ روز لگ گئے۔ بھارتی ہندوؤں نے پاکستان کے اندرونی خلفشار کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے 71ء میں دولخت کر دیا تھا لیکن اپنی فطری بزدلی کے باعث وہ ہر وقت پاکستان سے خوف زدہ رہتے تھے کہ نجانے کب یہ زخمی شیر بدلہ لینے کو اٹھ کھڑا ہو۔ یہ تو ہمارے اس وقت کے حکمرانوں کی بزدلی، بھارت نوازی اور پاکستان دشمنی تھی جو بدلہ نہ لے سکا اور ہزار سال تک جنگ لڑنے کے دعوے کرنے والے کشمیر میں سیز فائر لائن کو کنٹرول لائن قرار دینے کے پردے میں آزاد کشمیر میں سیز فائر لائن کے قریب فوجی لحاظ سے انتہائی اہم پہاڑیوں کو بھارتی تسلط میں دے آئے۔ یہاں تک کہ اس "فیاضی" میں انہوں نے شاہراہ ریشم کی وہ پہاڑیاں بھی بھارت کو پیش کر دیں جن پر صرف ایک ہیوی مشین گن اور ایک مارٹر سے شاہراہ ریشم کو بھارت بند کر سکتا ہے۔

غازی

میں نے دیکھا کہ میرے ساتھیوں کی پژمردگی اب بشاشت میں بدل گئی تھی۔ دراصل کسی مشن کو سرانجام دینے کی یہ پہلی مکمل ذمہ داری تھی جسے انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا تھا۔ میں نے عارف کے ذریعے لڑکوں کو دو دو ہزار روپے بھجوائے اور انہیں آئندہ بیس روز تک بالکل نارمل رہنے اور ایک دوسرے سے ملنے سے منع کر دیا تھا کیونکہ اب DMI کے علاوہ I.B ایئر فورس اور آرمی کے جاسوس یونٹ بھی حملہ آوروں کو ہر جگہ تلاش کر رہے تھے اپنے ساتھیوں کو بھی میں نے محتاط رہنے کا کہا۔ بھارتی انگریزی اور ہندی کے جتنے اخباروں میں ان دھماکوں کے متعلق خبریں چھپتی رہیں۔ وہ میں نے خرید لئے (ہندی اخبار ہمیں عارف کی بیٹی کے توسط سے ملے کیونکہ وہ اسکول میں ہندی پڑھتی تھی) میں نے یہ سب اخبار آئندہ ڈاک میں پاکستان بھیج دیئے۔ مجھے یقین تھا کہ ہمارے ادارے کے پاس بھی بھارتی جاسوسوں اور ربارڈر اسمگلروں کی ایک بڑی کھیپ ہوگی جو ہندی اخبار انہیں پڑھ کر سنائے گی۔

قریباً ایک ماہ بعد میں نے ساتھیوں اور لڑکوں کو پھر اکٹھا کیا اور کہا کہ ہمیں دہلی سے دور ایک بڑے مشن کو پورا کرنے جانا ہے اس لئے ذہنی اور جسمانی طور پر خود کو تیار رکھیں۔ اپنے تین ساتھیوں کے علاوہ میں تین لڑکوں کو ہمراہ لے جاؤں گا۔ اس بار میرا مشن پہاڑوں کی سرنگوں میں چھپا ہوا بھارتی ہوائی اڈہ تھا۔

بھارت کے اس ہوائی اڈے کے متعلق ہماری معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ بھارت میں رہتے ہوئے پاکستان سے معلومات حاصل کرنے کی بات بڑی مضحکہ خیز تھی۔ ہمیں صرف یہ معلوم تھا کہ یہ ہوائی اڈہ پہاڑی علاقے میں بنایا گیا ہے اور نزدیک ترین شہر گورکھ پور ہے مزید معلومات کا حصول صرف گورکھ پور سے ہی ممکن تھا۔ دہلی میں دھماکوں سے جو سراسیمگی پھیلی تھی وہ آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی لیکن بھارتی سویلین اور فوجی ایجنسیاں پورے طور پر حرکت میں آ چکی تھیں اور ہر طرف ان کے کارکن دھماکہ کرنے والوں کی تلاش میں پھر رہے تھے۔ معمول کی ڈاک کے علاوہ ہم نے اپنی تمام سرگرمیاں معطل کر دی تھیں۔ ہمارے گروپ نے ہمیں دیئے گئے مشنز کے علاوہ اپنے طور پر کئی مشن کامیابی سے پورے کئے تھے ہم نے تازہ ترین معلومات کے حصول کے لئے یشونت کو پل بنالیا تھا آشی کی فرمائشیں پوری کرنے کے لئے وہ ہفتے میں دو بار باقاعدگی سے ہمیں ڈاک دے رہا تھا۔ جانباز نڈر لڑکوں کا ہم نے گروپ تیار کر لیا تھا جو انتہائی خطرناک کام کرنے کو ہمہ وقت تیار رہتا تھا ہمارے سینئرز ہماری کارکردگی سے بہت خوش تھے ایسے حالات میں جب تک ہمیں پاکستان سے کسی نئے مشن کے لئے ہدایات نہ ملتیں ہمارا UNACTIVE رہنا ہی بہتر تھا۔ میں چاہتا تھا کہ جب تک گورکھ پور کے مشن میں کامیابی کا ففٹی ففٹی یقین نہ ہو جائے، اپنے سینئرز کو کچھ نہ بتایا جائے کیونکہ اب تک کی مسلسل کامیابیوں میں ہم ناکامی کا داغ نہیں لگانا چاہتے تھے۔ ہماری 10 یوم کی چھٹی تو پہلے ہی منظور ہو چکی تھی۔ چنانچہ میں نے مئی 73ء میں اپنے دو ساتھیوں اور تین لڑکوں کے ساتھ گورکھ پور جانے کا فیصلہ کیا۔ اس دوران معمول کے واقعات کو میں نے طوالت کی وجہ سے قلم بند نہیں کیا۔ مختصراً میں تقریباً ہر ہفتے کرنل شنکر سے ملنے سروسز کلب جاتا رہا۔ آشا سے تین چار بار ملاقات ہوئی وہ بہت آزاد خیال عورت تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اب وہ اتنی DEPRESS ہو چکی ہے کہ جے چند سے چھٹکارے کے لئے وہ اسے زہر دے کر ہلاک کرنے پر بھی آمادہ ہے اس نے جے چند سے اپنے حق میں وصیت لکھوانے کے لئے اس سے ازدواجی تعلقات میں بہت بہتری پیدا کر لی ہے۔ جے چند نے اسے سوتیلی اولاد سے تحفظ دینے کے لئے جلد ہی اس کے نام نہایت معقول رقم اور جائیداد منتقل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جونہی یہ کام ہو جائے گا میں جے چند کو سورگ میں بھیج دوں گی۔ دولت اور جائیداد کے عوض میں اپنی زندگی کی خوشیوں کا اس بوڑھے کھوسٹ کے مرنے تک گلا نہیں گھونٹ سکتی۔ یہ آشا کے الفاظ تھے جو اس نے ایک ملاقات کے دوران کہے۔ یشونت نے اس دوران اپنے معاوضے میں اضافہ کرنے کا کہا۔ میں نے نرمی سے انکار کر دیا کہ جب تک کوئی نیا JACK POT ہمیں نہ ملے اسے مزید رقم کی توقع نہیں کرنی چاہئے اور اگر اس نے ڈاک دینے یا ہم خطوط کو ہمیں دینے سے انکار کیا تو اس کا انجام بھی اسے یاد رکھنا چاہئے۔

ہمارے سب کام معمول کے مطابق نہایت خوش اسلوبی سے ہو رہے تھے۔ مئی کے دوسرے ہفتے میں، میں اپنے دو ساتھیوں اور تین لڑکوں کے ساتھ گورکھ پور کے لئے روانہ ہو گیا۔ گورکھ پور میں میرے ساتھیوں اور لڑکوں نے ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں کمرے لئے۔ میں سول لائنز کے قریب ایک نسبتاً بہتر ہوٹل میں ٹھہرا۔ میں نے ساتھیوں کو ہدایت کر دی کہ لڑکوں کو اپنی نگاہ میں رکھیں اور کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جس سے ہماری آمد مشکوک ہو جائے کیونکہ گورکھ پور دہلی کی نسبت بہت چھوٹا شہر ہے اور مشکوک حرکات بہت جلد نظر میں آ سکتی ہیں۔

اگلے روز میں ساتھیوں کے ہوٹل گیا اور ایک ساتھی ایک لڑکے کی دو ٹولیاں بنائیں اور ایک لڑکے کو اپنے ہمراہ لے کر شہر کے سروے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ میں نے ساتھیوں کو کہا کہ اگر ضرورت پیش آئے تو لڑکوں کو بولنے دیں اور خود خاموش رہیں لڑکوں کا لب و لہجہ دہلی والوں کا تھا اور میرے ساتھی پنجابی لہجے میں اردو بولتے تھے دہلی میں تو سب چل جاتا تھا لیکن یہاں صورتحال مختلف تھی۔ گورکھ پور اتر پردیش میں ہمالیہ کے دامن میں پہاڑیوں کے سلسلے میں واقع ہے۔ یہ شہر نیپال کی سرحد کے قریب ہے اور ریلوے جنکشن کے علاوہ یہاں بھارتی چھاؤنی بھی ہے ہم شہر بھر میں سارا دن گھومے۔ درمیانے درجے کا شہر ہے۔ ہمیں شہر میں ایئر فورس کی وردی پہنے کوئی بندہ دکھائی نہ دیا۔ دوسرے روز بھی سارا دن شہر میں مارے مارے پھرنے کے باوجود ہمیں کوئی ایسا سراغ نہ ملا جس سے ہوائی اڈے کی موجودگی کی تصدیق ہو سکتی۔ کسی انجان سے ہوائی اڈے کے متعلق پوچھنا انتہائی خطرناک تھا۔ مجھے میجر احسن کے مسلمان بیٹ مین پر بھروسہ کرنے کا انجام یاد تھا اس لئے ہمیں خود ہی اس تلاش کو جاری رکھنا تھا۔ تیسرے دن میں لڑکے کے ہمراہ شہر سے باہر ایک سڑک پر جا رہا تھا کہ مجھے ایک پیٹرول ٹینکر دکھائی دیا۔ جس کی رفتار سے معلوم ہوتا تھا کہ خالی ہے۔ میں نے رکشہ والے کو اسی سڑک پر جانے کو کہا۔ دو تین موڑ گزرنے کے بعد مجھے پیٹرول کے ٹینک دکھائی دیئے۔ رکشہ والے نے پوچھنے پر بتایا کہ شہر بھر کے پیٹرول پمپوں کو یہاں سے ہی پیٹرول سپلائی ہوتا ہے۔ ریلوے اسٹیشن کے قریب بھی دو ٹینک ہیں لیکن وہاں کا پیٹرول صرف فوج کے لئے ہے میرے لئے یہ معلومات دلچسپ تھیں۔ میں نے رکشہ والے کو واپس شہر چلنے کا کہا۔ شہر میں رکشہ چھوڑ کر ہم نے ایک دوسرا رکشہ لیا اور ساتھیوں کے ہوٹل چلے گئے شام کو میں نے سب کو اکٹھا کیا اور کہا کہ کل وہ ریلوے اسٹیشن کے قریب آئل ٹینکس تلاش کریں اور سارا دن ٹینک کو جانے والی سڑک پر آئل ٹینکروں کے نمبر اور رنگ نوٹ کریں اور خصوصی طور پر ان ٹینکروں پر دھیان دیں جن پر HIGHLY INFLAMMABLE کے ساتھ P.C.OCTANE 100 لکھا ہو۔ کیونکہ لڑاکا اور بمبار جہازوں میں انتہائی صاف اور بغیر ملاوٹ کے پیٹرول استعمال ہوتا ہے میرے ساتھیوں نے دو دن کی تگ و دو کے بعد اس ٹینکر کا سراغ لگا لیا جو خاکی رنگ پر کیموفلاج کئے ہوئے تھا۔ میرے ساتھیوں نے اسے پیٹرول لے کر جانے والی سڑک پر پانچ چھ کلومیٹر تک جا کر وہ جگہ بھی نوٹ کر لی جہاں پر اس سڑک سے مختلف اطراف کو جانے والی سڑکوں کے کٹ ختم ہو جاتے تھے وہ سڑک گورکھپور سے شمال مغرب کی طرف جاتی تھی۔ دوسرے روز میں اپنے ایک ساتھی کے ساتھ اس سڑک پر خاصی دور تک گیا میں نے دیکھا کہ اس سڑک سے اطراف کو جانے والی سڑکیں چھوٹی اور ٹوٹی پھوٹی تھیں جبکہ یہ مین سڑک جو آگے جاتی تھی شروع سے ہی بڑی اور بغیر ہچکولوں کے ٹوٹ پھوٹ کے بغیر نہایت مضبوط بنی ہوئی تھی۔ اس سڑک پر کوئی ٹریفک دکھائی نہیں دی۔ سو فیصد صاف تیل لے جانے والے ٹینکر ٹوٹی پھوٹی سڑکوں پر نہیں جاتے کیونکہ ہچکولوں سے یہ تیل خود بخود بھڑک اٹھتا ہے مجھے پختہ یقین ہو گیا تھا کہ یہی سڑک ہوائی اڈے تک جاتی ہے اور یہ ہوائی اڈہ گورکھپور کی حدود سے خاصی دور بنا ہوگا۔

گورکھپور میں مزید دو دن رہنے سے ہمیں مزید یہ معلومات حاصل ہوئیں کہ اس سڑک پر آگے جا کر ایک چیک پوسٹ آتی ہے جب تک وہاں سے CLEARANCE نہ ملے آگے کوئی نہیں جا سکتا۔ اس چیک پوسٹ کے بعد رہائشی علاقہ ہے وہاں پر ہوائی اڈے سے متعلقہ عملے کے رہائشی کوارٹرز ہیں ان کوارٹرز کے بعد آفیسرز کی رہائشی کالونی ہے اس کے بعد ایک اور چیک پوسٹ ہے جہاں پر دو آفیسرز میس ہیں جن میں پائلٹ اور سنگل سینئر آفیسر رہتے ہیں آفیسر میس کے بعد سڑک ایک پہاڑی کے گرد گھوم جاتی ہے ہمیں یہ معلومات بڑے کھوج کے بعد ایک ادھیڑ عمر ڈرائیور سے ملیں جو کالونی کی تعمیر کے دوران ایک انجینئر کو کالونی کے تعمیراتی حصے تک لے جاتا تھا۔ اس نے ہمیں یہ معلومات ایک شراب خانے کے باہر ٹیکسی اسٹینڈ پر دیں جب میں اور میرا ساتھی اسے اس سڑک پر لے جانے کے لئے بک کرنا چاہتے تھے۔ اس نے بتایا کہ پہلی چیک پوسٹ سے آگے رہائشی کالونی میں جانے کے لئے جس کو ملنا ہو اس کی ٹیلی فون پر اجازت حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس ڈرائیور نے کہا ''بابو جی آپ نے جن صاحب کو ملنا ہے ان کو ٹیلی فون کر کے کہہ دیں کہ وہ آپ کے نام میرا نام اور ٹیکسی نمبر چیک پوسٹ پر لکھوا دیں۔ تب ہی میں آپ کو وہاں تک لے جا سکتا ہوں'' ڈرائیور کی باتیں سن کر ہم مایوس ہو گئے ظاہراً ایسی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی کہ ہم کالونی یا آفیسرز میس تک ہی پہنچ سکتے۔ اس کے آگے جانے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ میں نے اس شام ساتھیوں کو اس صورت حال سے آگاہ کیا اور دوسرے روز ہم مایوس دہلی کے لئے روانہ ہو گئے۔

واپسی کے سفر کے دوران اور دہلی پہنچ کر بھی میں کئی ہفتے تک ہوائی اڈے تک پہنچنے کی کسی بھی امکانی صورت پر غور کرتا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان رکاوٹوں کو کیونکر عبور کیا جائے۔ ڈرائیور نے بھی چند برس پہلے کے حالات بیان کئے تھے اب جبکہ وہ ہوائی اڈہ مکمل طور پر OPERATIONAL تھا تو کیا سیکورٹی کے وہی پہلے والے انتظامات تھے یا نئے رائج کئے گئے تھے ان کے متعلق ہمیں کچھ علم نہ تھا۔ رفتہ رفتہ یہ مشن میرے ذہن سے دھندلاتا گیا اور آخر کار MISSION IMPOSSIBLE سمجھ کر ہم نے اسے بھلا دیا۔

دہلی میں ہماری معمول کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ معمول کے مطابق ڈاک کی آمد و رفت جاری تھی۔ میرے ساتھی ہفتے میں دو بار لڑکوں کی تربیت کے لئے بشیر کی گیرج میں جاتے تھے۔ میں تقریباً ہر ہفتے کرنل شنکر سے ملتا تھا۔ اسی دوران 73ء کا موسم سرما شروع ہو گیا۔ اس مرتبہ ہم نے نئے سال کا استقبال دھماکے کرنے کے بجائے ہوٹلوں کی محفلوں میں شمولیت سے کیا۔ 74ء کی 26 جنوری کی پریڈ بھی ہم نے خاموشی سے دیکھی اور پریڈ میں شامل اسلحہ اور ہتھیاروں کی تصویریں اتار کر پاکستان بھیج دیں۔ میں قارئین کو ایک وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ ہماری یہ آٹھ نو ماہ کی خاموشی غیر معمولی نہیں تھی۔ بھارت میں قیام کے دوران اگر ہر روز ایک مشن پورا کرنے کا کوئی دعویٰ کرے تو وہ محض افسانہ اور من گھڑت قصہ ہوگا۔ بھارت میں ہمارے قیام کا ایک ایک دن ہمارے مشن کی کامیابی تھی۔ جس طرح پاکستان کے غیر ممالک میں سفارت خانے صرف پاکستان کے مفاد کیلئے قائم کئے گئے ہیں۔ وہ سفارت خانے چاہے کوئی عملی کارکردگی نہ دکھائیں لیکن صرف پاکستان کی نمائندگی کیلئے بیسیوں افراد کے عملے پر کروڑوں ڈالر سالانہ خرچ کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح ہم بھارت میں اپنے محکمے کے نمائندے تھے جو ان کے احکام کی بجا آوری پر ہمہ وقت تیار تھے۔ ہم نے حساس معلومات کے حصول کے پل بنا دیئے تھے۔ تمام دیئے گئے مشنوں کو کامیابی سے پورا کیا تھا۔ جانثار لڑکوں کی ایک ٹیم تھی جن کے ذریعے نہ دیئے گئے مشن بھی کامیابی سے پورے کئے تھے اور یہی وجہ تھی کہ ہمارے سینئرز بھارت میں ہمارے قیام کو طول دے رہے تھے۔ مجھے ایک خفیہ خط میں یہاں تک کہا گیا تھا کہ میرے سمیت میرے ساتھیوں میں سے اگر کوئی بھارت میں شادی کرنا چاہتا ہے تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا اور پاکستان واپسی پر ان کی بیویوں کو پاکستانی شہریت بھی دلا دی جائے گی۔

بشیر کی گیرج کو لڑکوں نے بڑی اچھی طرح سنبھالا تھا۔ میں ہفتے میں ایک روز گیرج جاتا تھا اور لڑکوں سے ان کی تربیت کے علاوہ دوسرے مشاغل کے بارے میں بھی بات چیت کرتا تھا۔ یہ فروری 74ء کے وسط کا ذکر ہے۔ میں بشیر کی گیرج میں بیٹھا تھا۔ ایک ٹرک مرمت کے لئے گیرج میں کھڑا تھا، میرے پوچھنے پر مکینک لڑکے نے بتایا کہ چلتے ہوئے اس کا کرینک شافٹ آواز دیتا ہے۔ شاگرد نے اس کے پیچھے جیک لگا کر اسے اٹھانا چاہا تو جیک آدھ میں ہی جواب دے گیا۔ میرے پوچھنے پر کہ اب کیا کرو گے۔ مکینک لڑکے نے کہا کہ میں نے چوڑی بلیٹس بنوا رکھی ہیں اور ٹرک کے نیچے وہ بلیٹس کولا کی شکل میں لٹکا کر ان بلیٹس پر لیٹ کر ٹرک کو سڑک پر چلوائے گا اور چلتے ٹرک کی کرینک شافٹ کو دیکھ کر نقص کا پتہ چلائے گا۔ میرے سامنے ہی اس نے 16 انچ چوڑی تین بلیٹس ٹرک کے نیچے فٹ کیں۔ ایک بلیٹ نے اس کی گردن، دوسری نے کمر کے نچلے حصے اور تیسری نے اس کے پاؤں کو اٹھا رکھا تھا۔ لڑکے نے بلیٹس پر لیٹنے کے بعد ڈرائیور کو ٹرک چلانے کا کہا۔ ٹرک چلنے سے کرینک شافٹ بھی گھومنے لگی۔ 15 منٹ کے اندر ٹرک واپس آ گیا۔ مکینک نے نقص کا پتہ چلا لیا تھا۔ آدھ گھنٹے میں اس نے نقص دور کر دیا اور ٹرک والا اسے 250 روپے دے کر چلا گیا۔

مکینک لڑکے نے بلیٹس کے اوپر لیٹ کر ٹرک چلوایا تھا اور ایک کلومیٹر سے زیادہ فاصلہ اسی صورت میں طے کیا تھا اور اسے خراش تک نہ آئی تھی۔ میرے دماغ میں روشنی کا ایک جھماکہ ہوا۔ مجھے گورکھپور کے ہوائی اڈے کے اندر ایپرن تک پہنچنے کی ترکیب دھندلی سی دکھائی دے رہی تھی اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر ان بلیٹس کی خامیوں کو دور کر کے انہیں UP GRADE کیا جائے اور حفاظتی اقدام کئے جائیں تو آئل ٹینکرز کے نیچے لیٹ کر سرنگ کے اندر کھڑے جہازوں تک پہنچا جا سکتا ہے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو بلیٹس کے متعلق بتایا اور کہا کہ اگر مضبوط بلیٹس اور انہیں ٹرک کے نچلے حصے میں فٹ کرنے کے محفوظ طریقے کا پتا چل جائے تو آئل ٹینکروں کے اسٹیشن کے قریب آئل ٹینکس سے پیٹرول لینے کے دوران یا سڑک پر مرمت کرنے والے کے بھیس میں ٹینکر کو تھوڑی دیر کیلئے روک کر یہ بلیٹس فٹ کر کے ہوائی اڈے کی سرنگ کے اندر تک پہنچا جا سکتا ہے۔ میں نے ساتھیوں کو کہا کہ ابھی تک یہ تجویز محض ایک دھندلا سا خاکہ ہے جب تک مکمل طور پر اس کے خد و خال واضح نہ ہو جائیں اور جب تک ہم اسے O.K اور اس کے قابل عمل ہونے کا اطمینان نہ کر لیں اس کا کسی سے بھی ذکر نہ کریں۔

بھارت میں 90 فیصد بھارت میں ہی تیار شدہ مرسیڈیز ٹرک اور بسیں چلتی ہیں۔ جن کے ماڈل معمولی ترمیم کے ساتھ تین چار سال کے بعد مارکیٹ میں آتے ہیں۔ میں نے ایک ساتھی کو ایک لڑکے کے ساتھ پھر گورکھ پور بھیجا تاکہ معلوم کریں کہ آئل ٹینکر کس ماڈل کے اور کتنے پہیوں والے ہیں۔ چند روز کے بعد وہ واپس آئے اور بتایا کہ مرسیڈیز ماڈل کے 10 پہیوں والے ٹینکر ہیں۔ ان معلومات کی روشنی میں، میں نے گیرج کے مکینک کو کہا کہ وہ ویسا ہی ٹینکر تلاش کرے اور اس کے نیچے گھس کر بلیٹس کو فٹ کرنے کی جگہ تلاش کرے۔ ابھی مکینک لڑکا ایسے ٹینکر کی تلاش میں تھا کہ میرا نمبر ٹو دہلی میں مرسیڈیز کے شوروم سے مختلف سائز کے مرسیڈیز ٹرکوں کے چیسیز کے بروشر لے آیا۔ ان بروشرز میں 10 پہیوں والے ٹرک کے چیسیز کی تصویریں بھی تھیں۔ مکینک لڑکے نے بتایا کہ کمپنی والے صرف چیسیز ہی فروخت کرتے ہیں اور ان چیسیز پر بس، ٹرک یا ٹینکر کی باڈی مالک کو اپنی خواہش کے مطابق خود بنوانی پڑتی ہے۔ کمپنی سے مکمل تیار باڈی سمیت ایسی گاڑیاں بھی ملتی ہیں جن کی قیمت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ باڈی چاہے کمپنی کی بنی ہو یا پرائیویٹ طور پر بنوائی جائے۔ چیسیز کا اندرونی حصہ ایک ہی طرح کا ہوتا ہے۔ میں نے سوچا کہ ایئر فورس والے کمپنی سے مکمل تیار شدہ ٹینکر ہی خریدتے ہوں گے۔ مکینک لڑکے نے اس دوران ایک دس وہیلر ٹینکر کے نیچے گھس کر بلیٹس لگانے کے ضروری پوائنٹ نوٹ کر لئے۔ ٹینکر کی باڈی اور چیسیز کے درمیان اسٹیل کی مختلف ٹکڑوں میں منقسم ایک چادر لگی ہوتی ہے۔ اس چادر میں مختلف جگہوں پر سوراخ ہوتے ہیں۔ مکینک لڑکے نے کہا کہ وہ مشین پر ایسے راڈ تیار کر سکتا ہے جو سوراخ میں داخل ہو کر دو اطراف میں کھل جائیں اور چادر کو مضبوطی سے پکڑ لیں۔ ان راڈوں کے نچلے حصے میں ہک لگانے کیلئے مضبوط گول دائرے ہوں جن میں بلیٹس کے ہک با آسانی ڈالے جا سکیں۔ اس لڑکے نے کاغذ پر اسکیچ بنا کر مجھے راڈز کی دوران استعمال صورت سمجھائی۔ میں اس کی تجویز سے کافی مطمئن ہو گیا اور اسے کہا کہ وہ 12 عدد راڈ بہترین اسٹیل کے بنائے اور یہ راڈ ذہن میں یہ رکھ کر بنائے کہ ان کے استعمال کے دوران ان کو 120 کلو وزن تک برداشت کرنا ہوگا۔ میں نے 120 کلو وزن اس لئے کہا تھا کہ ٹینکر کے چلنے کے دوران جھٹکوں سے بلیٹس پر لیٹنے والے کے وزن کا دباؤ دگنا بھی ہو سکتا تھا۔ مکینک لڑکے کو میں نے راڈ بنانے کا کہا اور ساتھ ہی ساتھ عارف کو مارکیٹ میں مہیا پرانے پیراشوٹس کی بیلٹس اور ہک خریدنے کا کہا۔ عارف دونوں چیزیں لے آیا۔ بیلٹس کی چوڑائی صرف 3 انچ تھی میں نے عارف کو کہا کہ ان بیلٹس کو ایک دوسرے کے ساتھ نہایت مضبوط دھاگے سے اس طرح سیا جائے کہ ڈھائی ڈھائی میٹر لمبی ایک بارہ انچ چوڑی اور دو انچ چوڑی بیلٹس تیار ہو جائیں۔ یہ کام عارف نے اپنی بیگم اور نذیر کی بچیوں کے سپرد کیا۔

غازی

انہوں نے رضائی سینے والی سوئیوں سے تین تین سلائیاں کر کے میرے مطلوبہ سائز کی تین بیلٹس تیار کر دیں۔ میرا ذہن مکمل طور پر اس منصوبے کی جزئیات میں کوئی کسر نہ چھوڑنے میں مصروف تھا۔ ان بیلٹس پر لیٹ کر لمبے سفر کے دوران جھٹکوں سے گر پڑنے کا امکان تھا۔ لہٰذا میں نے ایک فٹ چوڑی بیلٹ کے اوپر مسافر جہازوں کی سیفٹی بیلٹ کی طرز کی حسب ضرورت چھوٹی بڑی ہونے والی بیلٹ لگوانے کا فیصلہ کیا۔ عارف نے کباڑیوں سے یہ بیلٹ بھی خریدی اور لڑکیوں نے نہایت خوش اسلوبی سے اس بیلٹ کو بڑی بیلٹ پر سی دیا۔ مکینک لڑکے نے اس دوران چند راڈ تیار کئے تھے جو سوراخ میں ڈالنے کے بعد راڈ کے نچلے حصے میں بنے ایک اوپر نیچے حرکت کرنے والے سوئچ کو اوپر کرنے سے دو حصوں میں تقسیم ہو کر اسٹیل کی چادر سے چپک جاتے تھے اور سوئچ کو نیچے کرنے سے اپنی پہلے والی پوزیشن میں آ جاتے تھے ان راڈوں پر سیفٹی لاک بھی لگائے گئے تھے کہ جھٹکوں سے راڈ خود بخود بند ہو کر نیچے نہ گر جائے۔ اب ہمیں پھر دس وہیلر ٹرک کی تلاش تھی جس کی نچلی پلیٹ کے سوراخوں کے فاصلے کو دیکھ کر بیلٹس کو ایسے کاٹا جانا تھا۔ تاکہ تینوں بیلٹس لیٹنے والے کو ایک سیدھ میں سنبھال سکیں۔ چند روز میں مکینک لڑکے نے ہماری یہ مشکل بھی حل کر دی اور ٹینکر کی پلیٹ کا اسکیچ بنا کر ان سوراخوں پر نشان لگا دیئے جن میں راڈ داخل کرنے تھے اور بیلٹس کو مطلوبہ سائز کے مطابق کاٹ دیا۔ میں نے عارف کے ذریعے کٹے ہوئے سائز کے مطابق بیلٹس کا ایک اور سیٹ بنوایا۔ اس دوران مکینک لڑکے نے 12 عدد راڈ تیار کر کے میرے حوالے کر دیئے۔

میں نے مکینک لڑکے کو کہا کہ اگر ممکن ہو تو ہم ان راڈز اور بیلٹس کی عملی ٹرائی بھی لے لیں۔ چند روز میں لڑکے نے عارف کو پیغام بھیجا کہ گیرج میں ویسا ہی ٹینکر آ گیا ہے آپ رات کو ٹرائی لے لیں۔ میں شام گہری ہونے کے بعد اپنے نمبر ٹو کے ساتھ گیرج میں پہنچا۔ مکینک لڑکا اور میرا نمبر ٹو دونوں ٹینکر کے نیچے گھس گئے۔ میری نظر گھڑی پر تھی۔ ابھی دو منٹ بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ مکینک لڑکا باہر آ گیا اور مجھے ٹینکر میں ساتھ بیٹھنے کا کہہ کر خود اسٹیرنگ سنبھال لیا اور ٹینکر کو گیرج سے نکال کر سڑک پر لے آیا۔ ٹینکر کی رفتار ستر کلومیٹر فی گھنٹہ تک بڑھا کر جانے آنے میں کل 10 کلومیٹر فاصلہ طے کر کے واپس گیرج میں آ گیا۔ ٹینکر کے کھڑے ہونے کے بعد ایک منٹ میں میرا نمبر ٹو ٹینکر کے نیچے سے نکل آیا اور کہا کہ نہایت محفوظ طریقہ ہے اور سیفٹی بیلٹس نے تو گرنے کے امکان کو بھی یکسر ختم کر دیا۔ ہم خوشی خوشی ساتھیوں کے گھر پہنچے اور اب تک اس مشن کیلئے اپنی کی ہوئی کاوشوں کی کامیابی کا اپنے ساتھیوں اور عارف اور نذیر کو بتایا عارف اور نذیر کے جانے کے بعد میرے نمبر ٹو نے میرے گھٹنے پکڑ لئے اور کہا ”آج تک میں نے آپ کے ہر حکم کی بلا چوں چرا تعمیل کی ہے لیکن اب اگر آپ نے مجھے اس مشن پر جانے سے روکا تو میں پاکستان واپس جانے کو ترجیح دوں گا۔ آپ نے پہلے مجھ سے وعدہ بھی کیا تھا۔ میں بجلی کا ٹیکنیشن بھی ہوں اور ٹرانسمیٹر تک ٹھیک کر لیتا ہوں۔ بم کا ٹائمنگ سیٹ کرنے اور اسے بینڈیج (BANDAGE) ٹیپ سے ٹرک کے نیچے فٹ کرنا آپ سے بہتر جانتا ہوں۔ میں نے یہاں قیام کے دوران (ایک ساتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ٹرانسمیٹر چلانے اور CODE کو DECODE وغیرہ سب تفصیل سے سکھا دیا ہے۔ میری غیر موجودگی میں یہ سب کام بخوبی انجام دے سکتا ہے۔ اگر میں مشن میں شہید ہو گیا تو آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری شہادت مشن کو مکمل کرنے کے بعد ہی ہو گی۔ میں سفر کے دوران ہی بم کو ٹرک سے چسپاں کر دوں گا اور سرنگ میں پہنچنے کے بعد ہی مختصر وقفے کا ٹائم سیٹ کروں گا تاکہ بم یقینی طور پر سرنگ میں ہی پھٹے۔ اس مشن کیلئے میں موزوں ترین شخص ہوں۔ مجھے نہ بھیج کر آپ مجھ سے ناانصافی کریں گے اور اللہ کے سامنے میں آپ کا دامن پکڑوں گا۔

میں اپنے نمبر ٹو کی وطن سے محبت، جذبہ حریت اور شوق شہادت کے اس شدت سے اظہار کو سن کر حیران رہ گیا۔ ہم پانچوں اپنے وطن کی محبت اور بھارت کے سقوط ڈھاکہ کی صورت میں لگائے زخموں پر مرہم لگانے آئے تھے اور اپنی بساط سے کہیں زیادہ ہم نے اپنے اس ازلی دشمن کو نقصان پہنچایا تھا۔ میں نے اب تک کامیابی سے انجام دیئے کسی بھی مشن کا کریڈٹ صرف خود کو نہیں دیا تھا بلکہ اسے اپنے گروپ کی اجتماعی کوششوں کا ثمر ٹھہرایا تھا۔ ہم نے کوئی بھی مشن ساٹھ سے ستر فیصد کامیابی کے یقین کے بغیر شروع نہیں کیا تھا اور اب میرا نمبر ٹو اس مشن کو اکیلا انجام دینے کی ضد کر رہا تھا جس میں کامیابی کا یقین بے شک ففٹی ففٹی تھا لیکن بچ نکلنے کا امکان بیس فیصد سے بھی کم تھا۔ میں نے اسے اس مشن کے تمام خطرناک پہلوؤں سے آگاہ کیا لیکن اس نے ایک نہ سنی اور بالآخر مجھے اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ میں چاہتا تھا کہ 23 مارچ کو یوم پاکستان کی خوشی کے موقع سے پہلے اس مشن کی کامیابی کا تحفہ اہل وطن کو پیش کر دیا جائے میں نے اپنے نمبر ٹو کو (جسے آئندہ میں حبیب کے نام سے مخاطب کروں گا) کہا کہ اس مشن کی اہمیت کے پیش نظر اسے فوری طور پر بیلٹس پر لیٹنے کی پریکٹس شروع کر دینی چاہئے میں نے اسے بیلٹس کا ایک سیٹ دیا جسے اس نے چھت کے بالوں میں کنڈے گاڑ کر ٹرک کی نچلی شیٹ والی پوزیشن میں لٹکا دیا۔ وہ ہر روز دو مرتبہ ان بیلٹس پر لیٹ کر ساتھیوں کو کہتا کہ اسے دائیں بائیں اور آگے پیچھے جھلائیں تاکہ چلتے آئل ٹینکر والی پوزیشن بن جائے۔

حبیب کو مشن پر جانے کی اجازت دینے کے دو روز بعد میں گیرج میں گیا تو مکینک لڑکے نے (جسے آئندہ میں قیصر کہوں گا) مجھ سے پوچھا کہ ہمیں مشن پر کب جانا ہے۔ میں حیران تھا کہ ساتھیوں کے علاوہ میں نے مشن پر جانے کے متعلق کسی کو نہیں بتایا جو لڑکے گورکھپور گئے تھے انہیں بھی مشن کے ناقابل عمل ہونے کا کہہ دیا تھا اور اب قیصر کا مجھ سے پوچھنا کہ ”ہمیں مشن پر کب جانا ہے“ میرے لئے باعث حیرت تھا۔ میں نے قیصر کو ذرا کریدا تو اس نے بلا جھجک کہا کہ اسے ہماری تیاری اور راڈ بنوانے سے پورا یقین ہو چکا ہے کہ ہم نے مشن پر جانے کا فیصلہ کر لیا ہے اسے لڑکوں کے ذریعے گورکھپور میں آئل ٹینکروں کی نگرانی کا بھی علم ہو چکا تھا۔ ”چاہے آپ کے مشن کے متعلق مجھے ابھی تک پوری معلومات نہیں ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا مشن گورکھپور سے تعلق رکھتا ہے اور اسے ٹرک یا آئل ٹینکروں کے نیچے بیلٹس پر لیٹ کر انجام دینا ہے۔ بیلٹس پر لیٹنے کے دوران کام کرنے کا مجھے تجربہ ہے راڈز کو چادر کے سوراخوں میں کم از کم وقت میں ڈالنے، سیٹ کرنے اور بیلٹس کو ان میں فٹ کرنے کا دعویٰ کرتا ہوں، ریوالور چلانے اور چاقو کے استعمال کا میں ماہر ہوں، اس لئے اس مشن پر جانے کے لئے میں خود کو موزوں ترین سمجھتا ہوں، لہٰذا اس مشن پر جانے کا موقعہ مجھے دیں۔“ قیصر کو میں نے بتایا کہ میں پہلے ہی اپنے ساتھیوں میں سے ایک کا انتخاب کر چکا ہوں تو قیصر نے کہا کہ ایک کے بجائے اگر دو کو مشن پر بھیجا جائے تو کامیابی کا دہرا یقین ہو سکتا ہے۔ قیصر کی ان باتوں نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس نے بالکل درست کہا تھا کہ دو کے مشن پر جانے سے کامیابی کے امکانات بہت بڑھ جاتے تھے۔ ایک سے اگر غیر ارادی طور پر کوئی غلطی ہو جاتی تو دوسرا اسے COVER کر سکتا تھا۔ پھر واپسی کے دوران یقینی مزاحمتوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے دونوں ایک دوسرے کی مدد کر سکتے تھے۔ یہ مشن ایسا تھا جس کیلئے صرف ایک بار ہی RISK لیا جا سکتا تھا دوسری بار جانے کی کوئی گنجائش ہرگز نہ تھی۔ نفسیاتی طور پر بھی اکیلا شخص مشن کے دوران کسی مرحلے میں بھی اکیلا ہونے کے باعث حواس کھو سکتا تھا جبکہ دو ہونے کی صورت میں تنہا ہونے کا احساس ختم ہو جاتا میں نے ان سب پہلوؤں پر غور کرنے اور قیصر کی اس مشن پر جانے کی خواہش اور اس کی اہلیت کے پیش نظر یہ طے کیا کہ دونوں کو مشن پر بھیجا جائے۔ میں نے قیصر کو پیش آنے والے خطرات سے پوری طرح آگاہ کیا کہ اگر یہ اس کی SKIN DEEP خواہش ہے تو وہ ختم ہو جائے لیکن اس نے اپنے دلائل سے مجھے لاجواب کر دیا اور میں نے قیصر کو اس مشن میں شامل ہونے کی اجازت دے دی اور اب تک ہوائی اڈے کے متعلق مجھے جو معلومات حاصل ہو چکی تھیں ان کی روشنی میں اسے بریف کیا اور فوری طور پر بیلٹس پر لیٹنے کی پریکٹس شروع کرنے کا کہا اور دوسرے دن قیصر کو بیلٹس کا دوسرا سیٹ بھجوا دیا۔

میں نے اس مشن پر حبیب (نمبر ٹو) کے علاوہ اپنے ایک ساتھی اور قیصر سمیت چار لڑکوں کو ہمراہ لے جانے کا فیصلہ کیا تھا اس دوران پاکستان بھیجی جانے والی ڈاک میں، میں نے لکھ بھیجا کہ ہم لوگ ایک مشن کا جائزہ لینے اور اگر ممکن ہوا تو اسے جائزہ لینے کے دوران ہی پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔ حبیب اور ایک ساتھی بھی میرے ہمراہ جا رہے ہیں۔ ڈاک کی وصولی اور بھیجنے کا میرے باقی دو ساتھیوں کو علم نہیں اور نہ ہی کوریئر سے ان کی چہرہ آشنائی ہے لہٰذا ہماری واپسی تک ڈاک کے سلسلے کو معطل کیا جائے۔ واپسی پر ٹرانسمیٹر کے ذریعے کسی بدھ یا اتوار کو 10 بجے او کے کا سگنل دیں گے۔ اس سگنل کے بعد معمول کے دنوں اور اوقات میں ڈاک کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا جائے میں اب تک کئے گئے مشنوں میں اس بار سب سے بڑا گروہ ہمراہ لے جا رہا تھا کیونکہ ابھی تک مشن کے دوران درپیش مختلف مراحل سے ہم لاعلم تھے اور میں چاہتا تھا کہ ضرورت پڑنے پر میں عددی کمی کا شکار نہ ہو جاؤں۔ سب تیاریاں مکمل کر کے ہم 6 مارچ 74 کو گورکھپور کے لئے روانہ ہوئے۔ ہمارے پاس ذاتی اور ضروری سامان کے علاوہ 6 ٹائم بم، 8 پسٹل اور سینکڑوں گولیاں تھیں۔ گورکھپور پہنچ کر میں نے ایک ساتھی اور لڑکوں کو ایک دن کے مختلف اوقات میں ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرایا۔ حبیب اور قیصر نے میرے ہمراہ میرے ہوٹل میں کمرے لئے۔ دوسرے دن صبح سے ہی ہم نے پیٹرول ٹینکس کی نگرانی شروع کر دی تاکہ ایئر فورس کے آئل ٹینکروں کا کھوج مل سکے۔ مجھے اب تک حاصل شدہ معلومات سے اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ آئل ٹینکروں سے ڈائریکٹ جہازوں میں پیٹرول نہیں ڈالا جاتا اور سرنگ میں یقیناً ایئر فورس کے اپنے ٹینک بنے ہوں گے جن میں آئل ٹینکروں کا پیٹرول ذخیرہ کیا جاتا ہو گا اور ان ٹینکوں سے جہازوں کو پیٹرول سپلائی ہوتا ہو گا۔ آئل ٹینکر اپنا لوڈ ایئر فورس کے ٹینکوں میں منتقل کر کے اپنی پارکنگ میں واپس آ جاتے ہوں گے۔ تین چار روز کی نگرانی کے بعد ہمیں ایئر فورس کا آئل ٹینکر دکھائی دیا۔ پیٹرول بھرنے میں تقریباً آدھا گھنٹہ صرف ہوا ٹینکر میں ڈرائیور کے علاوہ کلینر اور ایک مسلح گارڈ موجود تھا۔ یہ تینوں پیٹرول بھرنے کے دوران ٹینکر سے باہر آ کر پیٹرول ٹینکس کے نزدیک ہی بنی ہوئی ایک منڈیر پر بیٹھ گئے۔ تیل بھرنے کے دوران حبیب اور قیصر کا ٹینکر کے نیچے گھسنا ممکن نہ تھا۔ واپسی کے سفر کے دوران سڑک پر مرمت کرنے والوں کے بھیس میں ہم ٹینکر کو چند منٹوں کے لئے روک سکتے تھے لیکن یہ کام بغیر سڑک مرمت کی ہیوی مشینری کے بغیر ممکن نہ تھا۔ اگر ہم سڑک پر کسی طرح سے بھی ٹینکر روک کر گارڈ، ڈرائیور اور کلینر پر قابو پا کر اور ان کی وردیاں پہن کر ٹینکر لے جاتے تو پہلی چیک پوسٹ پر ہی دھر لئے جاتے۔ بالفرض محال اگر ہم چیک پوسٹ کی رکاوٹوں کو بھی عبور کر لیتے تو ہمیں معلوم نہ تھا کہ ایئر فورس کے ٹینک کہاں ہیں اور کس طرح وہاں تک پہنچا جا سکتا ہے ایئر فورس کے ٹینکر ہفتے میں ایک آدھ بار ہی پیٹرول لینے آتے تھے۔ ہمیں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آئل ٹینکروں تک کس طرح پہنچیں۔ اسی سوچ بچار میں دن پر دن گزرتے جا رہے تھے اور ہم اس مسئلے کا کوئی حل تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہوئے تھے۔

ایک شام ہم سب ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے کہ ایک لڑکے نے کہا کہ اس نے نگرانی کے دوران دیکھا ہے کہ پیٹرول ٹینکس کا جس وسیع چار دیواری نے احاطہ کیا ہوا ہے اس کے تین بڑے گیٹ ہیں پہلے اور دوسرے گیٹ میں ریلوے لائن بچھی ہوئی ہے۔ ایک چھوٹا گیٹ عملے کے داخلے کیلئے بنا ہوا ہے تیسرے بڑے گیٹ سے ٹینکر آتے جاتے ہیں۔ یہ چاروں گیٹ مقفل رہتے ہیں اور ٹینکروں کے لئے بنے گیٹ پر ایک چوکیدار موجود رہتا ہے جو ٹینکر ڈرائیور کی شناخت کیلئے دو چار منٹوں کے لئے ٹینکر کو گیٹ سے باہر روکتا ہے اور شناخت کے بعد تالا کھول کر ٹینکر کو اندر جانے کی اجازت دیتا ہے یہ دو چار منٹ کا وقفہ حبیب اور قیصر کیلئے بہت کم تھا۔ ہمیں کم از کم دس منٹ درکار تھے۔ اسی لڑکے نے کہا کہ اگر ایک لڑکا میرے ہمراہ کر دیں تو میں ٹینکر کو دس کے بجائے پندرہ بیس منٹ تک روک سکتا ہوں۔

میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ہمارا ایک ساتھی اگر سڑک پر فاصلے سے کھڑا ہو کر دور سے ٹینکر کو دیکھ کر اشارہ کر دے تو میں اور میرا ساتھی فوراً ہی چوکیدار کے پاس پہنچ جائیں گے۔ ساتھی چوکیدار کو باتوں میں لگا کر اس کے قریب ایسے رخ سے کھڑا ہو جائے گا کہ پھاٹک کو چوکیدار نہ دیکھ سکے اور میں اسی دوران تالے میں تھوڑی سی ایلفی ڈال دوں گا یہ کام کر کے ہم وہاں سے چلے آئیں گے۔ ٹینکر کے پہنچنے پر چوکیدار تالا کھولنے میں ناکام ہو جائے گا۔ ٹینکر میں بیٹھے ہوئے لوگ ٹینکر سے اگر اترے بھی تو ان کا دھیان تالے اور گیٹ پر ہو گا اس طرح جو وقت ملے گا اس میں حبیب اور قیصر ٹینکر کے نیچے جا کر اپنی کارروائی آسانی سے مکمل کر سکتے ہیں یہ تجویز اگرچہ محفوظ نہ تھی لیکن اس کے سوا دوسرا کوئی ذریعہ بھی نہ تھا سب نے اسی تجویز پر عمل کرنے کے حق میں ووٹ دیا۔

واقعات کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لئے عرض ہے کہ دہلی سے روانگی سے قبل میں نے عارف کے ذریعے سلیٹی رنگ کے دو اوور آل (OVER ALL) حبیب اور قیصر کے لئے بنوائے تھے اور ان کی پشت پر ایئر فورس کے مخصوص گول دائروں والے نشان بھی بنوائے تھے ایک مسئلہ جس کا کوئی حل ہمیں اب تک نہیں سوجھا تھا وہ حبیب اور قیصر کے بم آن کر کے سرنگ سے نکلنے اور ایئر فورس کے RESTRICTED AREA سے بحفاظت باہر آنے کا تھا۔ دو موہوم سی صورتیں تھیں۔ اول یہ کہ دھماکے کے بعد وہاں جو افراتفری پھیلتی ہے اس کا فائدہ اٹھا کر وہ دونوں کوئی جیپ یا ٹرک لے کر جانے والے رستے ہی سے واپس آتے۔ ہنگامی حالت میں شروع کے ایک دو گھنٹوں کے دوران سخت سے سخت سیکورٹی انتظامات دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ آئل ٹینکس کے علاوہ ایئر فورس کا ARSENAL (اسلحہ خانہ) بھی سرنگ کے اندر ہی موجود ہو گا۔ سرنگ میں ہمارے بموں کے دھماکے سے اگر آئل ٹینکس نے آگ پکڑ لی تو ARSENAL میں بھی آگ کی حدت سے دھماکے ہوں گے۔ جہاز تو یقیناً جل اٹھنے تھے۔ سرنگ میں اسلحہ خانے کے آگ پکڑنے سے دھماکوں کی شدت اور حدت کا رخ بھی صرف سرنگ کے دہانے کی طرف ہو گا۔ سرنگ کے اندر کسی بھی ذی روح کا بچ جانا ممکن نہ تھا اس لئے حبیب اور قیصر کا بموں کے پھٹنے سے پہلے ہی سرنگ سے باہر نکل آنا، بے حد ضروری تھا۔ دوسری صورت میں دونوں کو سرنگ سے باہر آ کر پہاڑ پر چڑھ جانا اور چھپتے چھپاتے لمبا چکر کاٹ کر گورکھپور پہنچنا تھا۔ دونوں صورتوں میں ان کے بچنے کا بہت کم امکان تھا۔ میں نے ان سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھی تھی۔ گورکھپور میں بھی انہیں ان خطرات سے کئی بار آگاہ کیا لیکن سب بے سود۔ ان کا مشن پر جانے کا اصرار بڑھتا گیا۔

میں دہلی سے روانگی سے پہلے اتر پردیش کا ایک نقشہ ہمراہ لایا تھا اس نقشے کے مطابق گورکھپور سے تقریباً 50 کلومیٹر شمال میں مہندوال اور 45 کلومیٹر پدر اؤنا اور جنوب میں 50 کلومیٹر دیوریا کے قصبات تھے۔ یہ سب علاقے سطح مرتفع اور چھوٹی بڑی پہاڑیوں پر مشتمل تھے۔ گورکھپور میں آخری ہدایت کے طور پر میں نے انہیں کہا کہ اگر سڑک پر واپسی میں دشواری پیش آئے تو پہاڑی رستہ اختیار کریں اور نزدیکی قصبات تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ پہاڑی رستہ اختیار کرنے کی صورت میں اپنے اوور آل اتار کر پھینک دیں۔ میں نے انہیں کہا کہ سرنگ کے باہر یقینی طور پر جیپیں اور ٹرک وغیرہ کھڑے ہوں گے۔ ان میں سے کوئی بھی گاڑی حاصل کریں اگر کوئی رکاوٹ بنے تو بے دریغ اسے شوٹ کر دیں۔ واپسی کے دوران اگر چیک پوسٹوں پر کوئی روکے تو گاڑی چلانے والا تیز رفتاری سے BARRIERS کو توڑتا ہوا آگے بڑھے جبکہ دوسرا گارڈز پر فائر کھول دے۔ میں نے انہیں کہا کہ میں اپنے ساتھ دو لڑکوں کو لے کر کسی پرائیویٹ گاڑی میں جہاں تک اس سڑک پر آنا ممکن ہوا ان کا انتظار کروں گا۔ سب اپنا سامان بالکل تیار رکھیں کیونکہ ہمیں فوری طور پر گورکھپور سے نکلنا ہو گا۔ غرضیکہ اپنا تمام پروگرام تفصیلاً طے کر کے ہم نے اگلی صبح سے مشن پر عملی کام کا آغاز کر دیا۔ حبیب اور قیصر نے اوور آل اور بم خالی تھیلوں میں ڈال کر آئل ٹینکس کے قریب اوٹ میں جگہیں سنبھال لیں۔ چوکیدار کے پاس جانے والے دونوں لڑکوں نے بھی ریلوے لائن کے ساتھ ایسی جگہ پر ڈیرے ڈالے جہاں سے ٹینکر کی آمد کا سگنل دینے والا لڑکا انہیں بخوبی دکھائی دے سکتا تھا۔ پروگرام کے مطابق ہم نے یہ طے کیا کہ ہم سب ہر روز صبح ہوٹلوں کے بل ادا کر کے حبیب اور قیصر کا سامان میرے کمرے میں اور دوسرے ہوٹل والے ایک لڑکے کے کمرے میں رکھ دیا کریں تاکہ ہوٹل چھوڑنے میں وقت ضائع نہ ہو۔ مشن سے واپسی پر حبیب اور قیصر کو لینے کیلئے پرائیویٹ گاڑی کے حصول کے لئے ہم نے فیصلہ کیا کہ جونہی قیصر اور حبیب ٹینکر کے ساتھ روانہ ہوں گے۔ ہم شہر میں کسی بھی اچھی حالت کی ایسی پرائیویٹ گاڑی کو روک کر جس میں صرف ایک شخص ہو۔ ڈرائیور سمیت اس گاڑی کو اغوا کر لیں گے اس دوران میرا ساتھی اپنے اور میرے ہوٹل سے سامان لے کر طے شدہ جگہ پر آ جائے گا اس کے فوری بعد ہم ایک اور پرائیویٹ گاڑی ڈرائیور سمیت اغوا کریں گے اور دونوں گاڑیاں لے کر سرنگ والی سڑک پر آخری دوشاخے تک جا کر حبیب اور قیصر کا انتظار کریں گے۔ دونوں گاڑیوں کے مالکان یا ڈرائیور کو سنسان جگہ دیکھ کر لڑکے انہیں خنجر سے ہلاک کر دیں گے۔ آپ اسے ہمارا ظالمانہ اور سفاکانہ رویہ بھی کہہ سکتے ہیں لیکن اس کے سوا کوئی دوسری صورت نہ تھی اگر ہم انہیں ضرب پہنچا کر بے ہوش بھی کر دیتے تو ہوش میں آنے کے بعد وہ ہماری شکل وصورت سے متعلقہ حکام کو یقیناً آگاہ کر دیتے اس لئے ہم نے مجبوراً یہ قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہم دشمن کے ساتھ حالت جنگ میں تھے اور ان حالات میں ہمیں KILL YOUR ENEMY BEFORE HE KILLS YOU کے مقولے پر عمل کرنا تھا۔ ہمارے دو جانباز اس انتہائی خطرناک مشن پر جان کی بازی لگا رہے تھے ان کے جانے کے بعد ہی ہم نے گاڑیاں اغوا کرنی تھیں اور ان کی جان بچانے کیلئے اگر ہمیں سینکڑوں افراد کو بھی ہلاک کرنا پڑتا تو ہم ذرا دریغ نہ کرتے۔

غازی

20 مارچ تک ہم روزانہ صبح 8 بجے سے شام کے 6 بجے تک اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے ٹینکر کا انتظار کرتے رہے۔ ہم صبح اپنے ہمراہ سینڈوچ بنوا کر لے جاتے تا کہ بھوک کا مداوا کر سکیں۔ 21 مارچ کو صبح ساڑھے نو بجے کے قریب سڑک پر کھڑے لڑکے نے ٹینکر کی آمد کا سگنل دیا سگنل ملتے ہی دونوں لڑکے تقریباً بھاگتے ہوئے اپنی اوٹ سے نکل کر گیٹ پر چوکیدار کی طرف گئے۔ ایک نے چوکیدار سے ٹینکوں کے انچارج کے متعلق پوچھتے ہوئے اسے باتوں میں لگایا اس دوران دوسرے لڑکے نے نہایت پھرتی سے تالے میں ایلفی ڈال دی۔ یہ سارا کام بمشکل ڈیڑھ منٹ میں پورا کر کے دونوں لڑکے شہر کی طرف مقررہ جگہ پر لوٹ گئے۔ چند منٹ کے اندر ٹینکر گیٹ پر پہنچ گیا۔ چوکیدار نے معمول کے مطابق ٹینکر والوں کی شناخت کے بعد گیٹ کھولنا چاہا تو تالا ایلفی کی وجہ سے نہ کھل سکا۔ چوکیدار نے تالا کھولنے کیلئے زور آزمائی شروع کی۔ یہی وقفہ ہمیں درکار تھا۔ حبیب اور قیصر نے بموں اور اوور آل کے تھیلے اپنے سینوں پر باندھ رکھے تھے۔ وہ خاموشی اور تیزی سے ٹینکر کی طرف بڑھے اور بغیر کسی کی نظر پڑے ٹینکر کے نیچے گھس گئے گیٹ کھلنے میں جب دیر ہوئی تو ٹینکر میں بیٹھے ڈرائیور، گارڈ اور کلینر بھی اتر آئے تالے میں ایلفی چونکہ تازہ تازہ ڈالی گئی تھی۔ اس لئے چند زوردار جھٹکوں سے ڈرائیور نے تالا کھول دیا پھاٹک کھلنے پر ٹینکر اندر داخل ہوا اور ایک ٹینکر واپسی کے لئے روانہ ہوا۔ اب تک سب کام ہماری امیدوں کے مطابق ہوا تھا ہم بھاگتے بھاگتے رکشا اسٹینڈ پر گئے وہاں سے دو رکشا لیکر دولڑکے ہوٹلوں سے ہمارا سامان لینے چلے گئے۔ میں نے انہیں میٹنگ پوائنٹ کا بتا دیا تھا۔ باقی ہم تین تھے ہم نے شہر کے ساتھ ہی چھوٹے سے انڈسٹریل ایریا کا رخ کیا۔ ہمیں وہاں سے گاڑیاں حاصل کرنی تھیں۔ چند گاڑیوں کے بعد ہمیں ایک ایسی کار دکھائی دی جس میں صرف ایک آدمی تھا۔ میں نے سڑک کے درمیان آ کر اسے روکا۔ ڈرائیور نے شیشے چڑھائے ہوئے تھے۔ پسٹل میرے جیب میں تھا میں نے اسے کچھ کہنے کے انداز میں لب ہلائے۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس نے شیشہ نیچے کیا۔ میں نے پسٹل نکال کر اس کی گردن کے ساتھ لگا دیا۔ ڈرائیور کے لئے یہ سب انتہائی غیر متوقع تھا وہ بوکھلا گیا میں نے دروازہ کھول کر اسے ساتھ کی نشست پر دھکیلا۔ اور خود اسٹیرنگ سنبھال لیا۔ مجھے اسٹیرنگ پر دیکھتے ہی دونوں لڑکے اوٹ سے نکل کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ میں نے گاڑی کو ٹرن کیا۔ اس دوران لڑکوں نے ڈرائیوروں کو کھینچ کر پچھلی سیٹ کے پائیدان پر لٹا دیا۔ ایک لڑکے نے ریوالور اس کی کنپٹی سے لگا کر کہا ذرا بھی حرکت کی یا آواز نکالی تو بھیجا اڑا دوں گا۔ گاڑی لیکر میں میٹنگ پوائنٹ پر پہنچ گیا اور گاڑی سے نکل کر ہوٹل جانے والے لڑکوں کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ بیس منٹ کے اندر چند منٹوں کے وقفے سے دونوں لڑکے آ گئے اور گاڑی سے کچھ دور ہی سامان اتار کر رکشاؤں کو فارغ کر دیا میں گاڑی ان کے قریب لے آیا۔ انہوں نے جلدی جلدی سامان گاڑی کے ٹرنک (ڈگی) میں رکھا اور ہم اب دوسری گاڑی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ اب ہم نے ریلوے آفس کا رخ کیا اور آفس کے مین گیٹ سے باہر ہی گاڑی پارک کر کے ہم دو آفس کی حدود میں داخل ہوئے۔ گورکھپور میں بڑا جنکشن ہونے کی وجہ سے مسافروں کی بھیڑ رہتی ہے۔ ہم آفس کی کار پارکنگ میں چلے گئے ریزرویشن کیلئے وہاں لوگ آ رہے تھے۔ پارکنگ میں سات آٹھ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ہم گاڑی چرا بھی سکتے تھے لیکن گاڑی چوری ہونے کی اطلاع ملنے پر نہ صرف شہر کی ناکہ بندی ہو جاتی بلکہ گاڑی کی تلاش بھی فوری شروع ہو جاتی۔ اس لئے ہم ڈرائیور کے ساتھ ہی گاڑی اغوا کرنا چاہتے تھے۔ ایک سوٹڈ بوٹڈ صاحب ریزرویشن آفس سے باہر آئے اور ایک نئی گاڑی کی جانب بڑھے، ابھی اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ میں نے پسٹل اس کی پشت سے لگا کر اسے اندر دھکیلا اور پسٹل کے دستے سے اس کے سر کے پچھلے حصے پر زوردار چوٹ لگائی۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔ میرے ساتھی نے پچھلا دروازہ کھول کر اسے بھی پائیدان پر لٹا دیا۔ میں گاڑی لے کر آفس کے باہر آ گیا میرا ساتھی بھی گاڑی چلانے کا ماہر تھا۔ میں نے ساتھی کو دوسری گاڑی چلانے کے لئے بھیج دیا اور کہا کہ اس گاڑی کے ڈرائیور کو بھی پسٹل کے دستے سے سر پر چوٹ لگا کر بے ہوش کر دو تا کہ ان کی طرف سے کوئی خدشہ باقی نہ رہے ہم کل سات افراد گورکھپور آئے۔ حبیب اور قیصر کے علاوہ ہم 5 تھے۔ ایک لڑکا میری گاڑی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور دوسری گاڑی میں میرے ساتھی کے ساتھ دو لڑکے بیٹھ گئے اور ہم نے اللہ کا نام لے کر اپنی گاڑیاں ہوائی اڈے کی سڑک پر ڈال دیں۔ میں اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کروں گا۔ کہ یہ میرا پہلا مشن تھا جس میں، میں ایڈوانس پارٹی (عملی حصہ لینے والوں) میں شامل نہیں تھا۔ میری اپنی حالت ایسی تھی کہ حواس بالکل معطل ہو چکے تھے میں پہلے سے طے شدہ پلاننگ کے مطابق ایک روبوٹ کی طرح کام کر رہا تھا اور میرے ساتھی اور لڑکوں کی بھی یقیناً یہی حالت تھی۔ یہ پہلا مشن تھا جس میں کارروائی کی جگہ اور حالات کا ہمیں ذرا بھر علم نہیں تھا، کارروائی کے بعد حبیب اور قیصر کے بحفاظت بچ نکلنے کے بہت ہی کم چانس تھے اس ساری پلاننگ کی ذمہ داری مجھ پر تھی اور میں نے اپنے سینئرز سے بھی اس مشن کی اجازت نہیں لی تھی۔ حبیب اور قیصر آگ کے سمندر میں کودنے گئے تھے۔ حبیب اور قیصر اگر بخیریت آ جاتے تو اس میں میری پلاننگ کا ذرا بھر حصہ نہ ہوتا۔ یہ ہم پر اللہ پاک کا رحم اور کرم ہوتا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ اپنے نمبر بنانے کی خواہش میں، میں نے حبیب اور قیصر کو موت کے منہ میں دھکیلا ہے مجھے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ میں نے جلد بازی میں غلط اور غیر محفوظ پلاننگ کی ہے۔ اس احساس کی وجہ سے اگر صبح کا وقت لوٹ آتا تو میں حبیب اور قیصر کو جانے سے روک دیتا لیکن تیر کمان سے چھوٹ چکا تھا۔ اب اللہ پاک کے رحم و کرم کی امید پر آس لگائے بیٹھا تھا۔ لڑکوں اور ساتھیوں کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہ تھی۔ ایک دوسرے سے وہ ایک لفظ بھی نہیں بول رہے تھے۔ ہمارے قیدی سر کی چوٹ کے باعث تقریباً دو گھنٹوں کیلئے بے ہوش ہو چکے تھے۔ میں نے لڑکوں کو کہا کہ ان کے سروں پر دوبارہ چوٹ لگائیں تا کہ وہ ہوش میں نہ آ سکیں۔ میں نے اس وقت یہ عہد کیا کہ حبیب اور قیصر کی بخیریت آمد کی خوشی میں اللہ کے حضور شکرانے کے نفل ادا کروں گا اور ان دو قیدیوں کو ہلاک کرنے کے بجائے سر پر چوٹیں پہنچا کر چار پانچ گھنٹوں کے لئے بے ہوش کر دوں گا اور اس عرصے میں دونوں گاڑیوں میں ہم گورکھپور سے خاصی دور نکل جائیں گے۔ ہم نے واپسی کا روٹ بذریعہ سڑک خلیل آباد (60 کلومیٹر) اور فیض آباد (50 کلومیٹر) تک اور پھر بذریعہ ٹرین لکھنو اور لکھنو سے دہلی جانے کا بنایا تھا ہمیں انتظار کا ایک ایک پل گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ حبیب اور قیصر کو گئے تقریباً تین گھنٹے گزرے تھے کہ ہمیں زمین ہلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ابھی زمین کی تھرتھراہٹ ختم نہیں ہوئی تھی کہ پہاڑ کی دوسری جانب سے آگ اور دھوئیں کے بادل اٹھتے ہوئے دکھائی دیئے اسکے ساتھ ہی کانوں کے پردے پھاڑنے والے دھماکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وقفے وقفے سے آگ کے شعلے بلند ہوتے اور دھماکوں کی شدت بڑھتی جاتی۔

شعلے اتنے بلند تھے کہ پہاڑ کی دوسری جانب ہونے کے باوجود ہمیں دکھائی دے رہے تھے وقفے وقفے سے دھماکوں کی شدت سے میں نے اندازہ لگایا کہ سرنگ میں بنا ہوا اسلحہ خانہ بھی آگ پکڑ چکا ہے اور یہ دھماکے بم، راکٹ اور دوسرا اسلحہ پھٹنے سے ہو رہے ہیں ہمیں جو شعلے دکھائی دے رہے تھے وہ یقیناً سرنگ کے دہانے سے نکلتے تھے کیونکہ اخراج کا اور کوئی رستہ نہ تھا مشن پورا ہونے کی حد تک ہم کامیاب ہو چکے تھے لیکن ہمیں ذرا بھر خوشی نہ تھی۔ ہم سب حبیب اور قیصر کی بخیریت واپسی کی دعائیں مانگ رہے تھے دھماکے اور آگ کے شعلے اسی شدت سے جاری تھے کہ ہمیں ایئر فورس کا ایک ٹرک سرنگ کی طرف سے آتا دکھائی دیا۔ ہم نے گاڑیاں اسٹارٹ کر لیں اور دو لڑکے اس سڑک کے دونوں طرف ڈھلانوں میں کھڑے ہو گئے۔ ٹرک تیزی سے ہماری طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ ٹرک ذرا نزدیک پہنچا تو لڑکوں نے ڈرائیور اور ساتھ کی سیٹ پر بیٹھے ہوؤں کو پہچان کر نعرہ لگایا اور سڑک کے بیچ آ کر ٹرک کو رکنے کا اشارہ دینے لگے۔ ٹرک رکتے ہی حبیب اور قیصر ٹرک سے باہر آئے میں نے اپنے ساتھی کو کہا کہ ٹرک کے ایکسیلیٹر پر پتھر رکھ کر اسے اسٹارٹ کرے اور اسٹیرنگ موڑ کر سڑک کی ڈھلوان پر لڑھکا دے ابھی تک ہمارے حواس قابو میں نہ تھے اور نہ ہی حبیب اور قیصر سے ہم نے کوئی بات کی تھی۔

ٹرک لڑھکتا ہوا ڈھلوان سے پچاس ساٹھ فٹ گہری کھائی میں جا گرا۔ لڑھکتے ہوئے اس میں آگ لگ گئی۔ اس دوران لڑکے دو یرغمالی ڈرائیوروں کو گاڑیوں سے بے ہوشی کی حالت میں ہی نکال چکے تھے۔ ایک لڑکے نے خنجر نکالا ہوا تھا میں نے یہ دیکھا تو چیخ کر اسے منع کیا لڑکے میرے کہنے پر ان دونوں کو گھسیٹ کر ڈھلوان پر ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں لے گئے میں نے خود جا کر ان کے سروں کو پسٹل کے دستے سے کئی کئی بار ضرب پہنچائی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ آئندہ چار پانچ گھنٹوں تک ہوش میں نہیں آ سکتے تھے۔ قیصر میرے ساتھ اور حبیب ساتھی کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ہم نے گاڑیوں کا رخ گورکھپور کی جانب کیا اور شہر میں داخلے سے پہلے ہی خلیل آباد کی سڑک پر گاڑیوں کو تیز رفتاری سے بھگاتے لے گئے۔ سڑک ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی ہم بمشکل ایک گھنٹے میں خلیل آباد پہنچے۔ وہاں پر ہم نے دونوں گاڑیوں میں پیٹرول ڈلوایا۔ پانی اور آئل چیک کیا اور فیض آباد کی طرف روانہ ہو گئے۔ فیض آباد پہنچنے میں ہمیں مزید 5 گھنٹے لگے۔ سڑک جگہ جگہ ZIGZAG اور ٹوٹی پھوٹی تھی۔ فیض آباد میں داخل ہونے سے پہلے ہی ہم نے گاڑیاں روک کر اپنا سامان نکال لیا۔ میرے ساتھی نے ٹرک لڑھکاتے وقت ڈیزل سے بھرا (CANE) کین نکال کر آدھا ٹرک میں انڈیل دیا تھا اور آدھا ہمراہ لے آیا تھا۔ ٹرک سے باہر نکل کر اس نے ڈیزل کو آگ دکھا دی تھی اسی وجہ سے ٹرک میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ آدھا بچا ہوا ڈیزل ہم نے دونوں گاڑیوں کے اندر انڈیل دیا اور اسے آگ لگا کر تیز تیز قدموں سے فیض آباد میں داخل ہو گئے۔ فیض آباد میں رکشے لے کر ہم ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ میں نے اپنے ساتھی کو اسٹیشن کا جائزہ لینے کو بھیجا اس نے بتایا کہ کوئی غیر معمولی سرگرمی دکھائی نہیں دی۔ ہم نے دو دو کی ٹولیوں میں لکھنو کے ٹکٹ لئے۔ تین گھنٹے انتظار کے بعد لکھنو جانے والی ٹرین آئی اور ہم سب ایک ہی ڈبے میں سوار ہو گئے میں نے سب کو اپنے پسٹل اور ریوالور تیار رکھنے کا کہا۔ اتنے بڑے مشن کو کامیابی سے پورا کرنے اور قیصر اور حبیب کے بخیریت لوٹ آنے کے بعد ہم کوئی رسک لینے کو تیار نہ تھے۔

ٹرین کے چلنے کے بعد ہم نے گورکھپور سے بنوائے سینڈوچ کھائے۔ فیض آباد سے لکھنو تک سوا سو کلومیٹر کا فاصلہ اس پسنجر ٹرین نے 5 گھنٹوں میں طے کیا لکھنو پہنچے تو رات خاصی ڈھل چکی تھی اسٹیشن سے معلوم ہوا کہ دہلی کی ٹرین صبح 8 بجے ملے گی۔ ہم نے رات کا بقیہ حصہ ریلوے ویٹنگ روم میں ہی گزارنے کا فیصلہ کیا اسٹیشن سے ہی ہم نے چائے اور کیک کھا کر بھوک مٹائی۔ صبح 8 بجے ہم ٹرین میں بیٹھے اور شام گئے دہلی پہنچے۔ گورکھپور سے دہلی پہنچنے تک ہم نے مشن کے متعلق اپنے جانباز ہیروز حبیب اور قیصر سے کوئی بات نہ پوچھی تھی دہلی اسٹیشن سے میں نے تین لڑکوں کو رخصت کیا اور قیصر کو ہمراہ لے کر ساتھیوں کے گھر آ گیا یہ رات بھی ہم نے خاموشی سے بسر کی۔ باوجود بے حد اشتیاق کے میں نے حبیب اور قیصر سے مشن کے متعلق کچھ نہ پوچھا۔ میں جانتا تھا کہ انہیں TENSION کے جال سے نکلنے کیلئے آرام کی ضرورت ہے دوسرے روز صبح ناشتے کے بعد میں نے انہیں اپنے کمرے میں بلایا۔ میرے ساتھی بھی وہاں آ گئے تھے میں نے حبیب اور قیصر کو کامیابی سے مشن مکمل کرنے اور زندہ بچ نکلنے پر بہت بہت مبارکباد دی۔ میرے ساتھیوں نے بھی بڑھ بڑھ کر انہیں گلے لگایا۔ عارف اور نذیر بھی ہمارے کمرے میں آ چکے تھے میں نے حبیب اور قیصر کو کہا کہ اب تفصیلاً وہ بتائیں کہ ٹینکر کے نیچے لیٹنے کے بعد واپسی تک ان پر کیا بیتی اور کس طرح وہ واپس لوٹنے میں کامیاب ہوئے چونکہ مشن کا یہ انتہائی خطرناک حصہ انہوں نے سرانجام دیا تھا لہٰذا میں ان دونوں کی زبانی بیان کردہ حالات کو اپنے الفاظ میں تحریر کر رہا ہوں۔

حالات کے تسلسل کو برقرار رکھنے کیلئے دہلی میں ہماری عدم موجودگی کے درمیان پیش آئے واقعات بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ پاکستان سے ہماری ڈاک کا سلسلہ تو میری درخواست پر منقطع ہو چکا تھا لیکن پاکستان سے ٹرانسمیٹر پر ایک روز کے وقفے سے دہلی میں ہمارے دو ساتھیوں سے ہماری واپسی کا پوچھا جاتا رہا تھا۔ اس مشن کے متعلق میں نے نہ تو اپنے سینئرز کو کچھ بتایا تھا اور نہ ہی ان سے اجازت لی تھی۔ انہیں تو یہ بھی علم نہ تھا کہ ہم کس مشن کے لئے کہاں گئے ہیں پاکستان سے میرے ساتھیوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ مقررہ وقت پر صرف پاکستان سے آمدہ پیغام وصول کریں اور خود کوئی پیغام ٹرانسمیٹ نہ کریں۔ انہیں یہ ہدایت بھی کی گئی تھی کہ دہلی واپسی پر میں پاکستان سے آنے والے ٹرانسمیٹر پیغام کو اپنی موجودگی میں وصول کروں کیونکہ کوئی بہت ضروری اور اہم ہدایت مجھے دینی ہے۔

حبیب اور قیصر سے جب میں نے مشن کے دوران پیش آنے والے واقعات پوچھے تو وہاں موجود ہم سب ہمہ تن گوش تھے۔ حبیب نے بات شروع کی۔ اس نے کہا کہ گیٹ پر ٹینکر کے رکتے ہی قیصر اور میں نہایت آسانی سے ٹینکر کے نیچے پہنچ گئے۔ قیصر نے تو فوری ٹینکر کے نیچے لگی اسٹیل پلیٹ میں سوراخ ڈھونڈ کر ان میں راڈ پھنسا کر اپنی بیلنس فٹ کر لیں۔ مجھے سوراخ ڈھونڈنے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ قیصر نے میری مدد کی اور موزوں سوراخوں میں میرے راڈ ڈال کر میری بیلنس ان میں فٹ کر دیں۔ ہم دونوں کو بیلنس پر لیٹے بمشکل چند سیکنڈ ہی گزرے تھے کہ پھاٹک کھلنے کی آواز آئی اور ٹینکر چل پڑا۔ آئل ٹینکس کے قریب جا کر ٹینکر رک گیا۔ اندازے کے مطابق وہاں ٹینکر پر پیٹرول لوڈ کرنے میں تقریباً آدھ گھنٹہ لگنا تھا۔ دو چار منٹ اسی صورت میں گزارنے کے بعد جب ہم نے دیکھا کہ ہماری اس حالت میں موجودگی کو کسی نے نوٹ نہیں کیا اور ٹینکر میں پیٹرول بھرنے کی آواز سنائی دی تو ہم نے بیلنس پر لیٹے لیٹے اپنے اوور آل پہن لئے۔ دونوں نے دو دو بم نکال کر بینڈیج ٹیپ کے ساتھ نہایت مضبوطی سے ٹینکر کی پلیٹ کے ساتھ چسپاں کر دیئے۔ اور بینڈیج ٹیپ سے بموں کو چار چار مختلف جگہوں پر لگا کر انہیں اتنا محفوظ کر دیا کہ سفر کے دوران سڑک پر جھٹکوں کی وجہ سے بم گر نہ جائیں۔ ہمیں اب صرف بموں کی ٹائمنگ سیٹ کرنی تھی جو ہم منزل پر پہنچ کر ہی سیٹ کر سکتے تھے۔ سیفٹی بیلنس نے ہمیں جھٹکوں سے گرنے سے بچایا ہمارے تھیلوں میں اب ایک ایک بم، پسٹل، گولیاں اور خنجر تھے۔ تھیلے ہم نے سینوں پر باندھ رکھے تھے۔ پہلی چیک پوسٹ روانگی کے پون گھنٹے کے بعد آئی۔ وہاں سے کلیرنس کے بعد ٹینکر آگے چل پڑا۔ دوسری چیک پوسٹ تقریباً 20 منٹ بعد آئی۔ ہم اس سارے سفر کے دوران صرف سڑک اور عمارات کی پانچ چھ فٹ بلندی تک ہی دیکھ سکتے تھے۔ دوسری چیک پوسٹ سے کلیرنس کے تقریباً 10 منٹ کے سفر کے بعد ٹینکر بائیں جانب مڑا۔ اب ہمارے ایک طرف پہاڑ اور دوسری جانب کھڈ تھے۔ سڑک کے دونوں جانب خاردار تار کی بہت گھنی باڑھ لگی ہوئی تھی۔ ٹینکر نے اس سڑک پر اپنی رفتار کم کر دی کیونکہ سامنے سے بھی جیپ اور ٹرک آ رہے تھے۔ سڑک پہاڑی کے ساتھ ساتھ اس کی گولائی کے ساتھ ہی گھوم رہی تھی۔ ہمیں ایسا محسوس ہونے لگا کہ سڑک اب ڈھلوان ہے کچھ ہی دیر بعد ہمارے ایک جانب پہاڑی اور دوسری جانب ہموار زمین آ گئی اس ہموار زمین پر بنا ہوا رن وے صاف دکھائی دے رہا تھا جو پہاڑی میں جا کر گم ہو جاتا تھا رن وے آنے سے پہلے ہی ٹینکر ایک سرنگ میں داخل ہوا اور تقریباً سو میٹر جا کر رک گیا ہم نے بموں پر 20 منٹ وقفے کا ٹائم سیٹ کیا (ان بموں میں زیادہ سے زیادہ 59 منٹ بعد پھٹنے کا وقت سیٹ کیا جا سکتا تھا) اتنی دیر میں ٹینکر سے پیٹرول سرنگ میں بنے ٹینکس میں منتقل کیا جانے لگا۔ سرنگ میں بجلی سے روشنی کی گئی تھی جو باہر کی روشنی سے بہت کم تھی ہم نہایت آہستگی اور بغیر کوئی آواز پیدا کئے ٹینکوں کی دوسری جانب سے ٹینکر سے باہر نکلے ہم نے دیکھا کہ یہ سرنگ آگے جا کر پہاڑ میں کھدے ہوئے ایک بہت بڑے ہال میں ختم ہو جاتی تھی ہمارے اوور آل پہنے ہونے کی وجہ سے ہم پر کسی نے شک نہیں کیا اور ہم اس ہال تک پہنچ گئے۔ وہ ہال اتنا بڑا تھا کہ اس میں جہازوں کے کئی ہینگر سما جائیں۔ اس ہال میں دو تین مختلف اقسام کے جنگی جہاز کھڑے تھے۔ ان جہازوں کی پارکنگ میں بجلی کی بہت زیادہ روشنی نے دن کے اجالے کا سماں پیدا کر رکھا تھا۔ وہاں پر درجنوں ٹیکنیشن ہمارے جیسے اوور آل پہنے جہازوں کی مرمت اور دیکھ بھال کر رہے تھے۔ میں نے اپنے دوسرے بم میں اب سے 15 منٹ بعد کا ٹائم سیٹ کیا اور جہازوں کی طرف چل پڑا۔ جب میں ہال کے تقریباً نصف تک پہنچا تو مجھے سرنگ کا وہ دہانہ دکھائی دیا جس میں میدانی رن وے داخل ہوتا تھا۔ سرنگ میں تقریباً ایک کلومیٹر رن وے بنا ہوا تھا۔ اسی پوائنٹ سے ہینگر میں کھڑے جہاز ٹیک آف کے لئے اسٹارٹ ہوتے تھے اور سرنگ سے نکلنے تک ان کی رفتار اتنی بڑھ جاتی ہو گی کہ میدانی رن وے کا کچھ حصہ ہی طے کر کے وہ محو پرواز ہو جاتے ہوں گے۔ میں جہازوں کی طرف یہ سوچ کر بڑھا تھا کہ کسی بھی جہاز کی کاک پٹ میں موقع دیکھ کر بم پھینک دوں گا اور یہ موقع مجھے بہت جلد مل گیا۔ میں بم ایک جہاز میں پھینک کر قیصر کی طرف متوجہ ہوا وہ اس ہال میں سات آٹھ حصوں پر منقسم سیمنٹ کے اندر لگی بہت چھوٹی چوڑائی کی ریل کی پٹڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔ جو رن وے والی سرنگ کے ہال میں خاتمے کے قریب ہی ایک پٹڑی میں شامل ہو جاتی تھیں اور وہ ایک پٹڑی ایک سرنگ میں چلی جاتی تھی۔ ہم نے جو ٹائم ٹینکر والے بموں میں سیٹ کیا تھا اس میں اب صرف 9 منٹ باقی تھے۔ قیصر نے سرگوشی میں مجھے کہا کہ یہ پٹڑیاں یقیناً جہازوں میں بم لادنے والی ٹرالیوں کیلئے بنی ہیں اور سرنگ میں داخل ہونے والی پٹڑی ARSENAL تک جاتی ہے میں نے اس کو بہت سمجھایا لیکن وہ نہ مانا اور اس سرنگ میں داخل ہو گیا اور میں ٹینک والی سرنگ سے باہر جانے کو چل پڑا۔ قیصر نے سرنگ میں کیا کیا یہ اسی سے پوچھئے۔

غازی

قیصر نے بتایا کہ میں وقت کی کمی کے باعث سرنگ میں داخل ہوکر بھاگنے لگا۔ یہ پٹڑی ایک جگہ ختم ہوجاتی تھی وہاں بھی ایک بڑی سرنگ جس میں ٹرک آسکیں بنی ہوئی تھی۔ جہاں پٹڑی ختم ہوتی تھی وہاں ترتیب سے مختلف سائز کے بم اور راکٹ سیلنڈروں کی تعداد میں پڑے تھے جن کی نگرانی پر دو ایئر فورس کے گارڈ اور ایک افسر تھا تینوں نے اوورآل پہن رکھے تھے۔ دونوں گارڈ مسلح تھے جبکہ افسر کے پاس ظاہری طور پر کوئی ہتھیار نظر نہ آتا تھا۔ اوورآل کی وجہ سے مجھے گارڈز تک پہنچنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ میں ایک گارڈ کے قریب گیا اور انتہائی غیر متوقع طور پر خنجر سے اس کی شہ رگ کاٹ دی۔ بم پر میں نے صرف 10 منٹ کا وقفہ سیٹ کیا تھا میں نے بیک وقت اپنا بم بموں کے اسٹاک کے ساتھ رکھا اور گارڈ کی اسٹین گن اٹھائی۔ اس سارے واقعے کا دوسرے گارڈ کو اس وقت پتہ چلا جب میں اس کے انتہائی قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے اسے بھی خنجر سے واصل جہنم کیا۔ ان کے افسر نے دوسرے گارڈ کا حشر دیکھ کر اپنے اوورآل کی زپ کھول کر وردی میں سے پستول نکالنا چاہا۔ پستول کو وہ ابھی پوری طرح سے نکال بھی نہ سکا تھا کہ میں نے اسٹین گن سے اس پر تین چار گولیاں چلا کر اسے وہیں ڈھیر کر دیا اور خود اس بڑے سرنگ کے دہانے کی طرف بھاگنا شروع کر دیا سرنگ میں اسٹین گن چلنے کی آواز کئی گنا بڑھ گئی تھی لیکن کوئی آواز کی سمت کا تعین نہ کر سکا تھا۔ دہانے پر دو پہرے دار کھڑے تھے۔ مجھے اوورآل پہنے اور ہاتھ میں اسٹین گن لئے دیکھ کر وہ مجھے عملے کا ہی ایک فرد سمجھے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ اندر گولیاں چلنے کی آواز کیسی تھی۔ اتنی دیر میں، میں بھاگنے کی وجہ سے اپنے پھولے ہوئے سانس پر قابو پا چکا تھا میں نے انہیں کہا "کیا تمہیں اب تک خبر نہیں ہوئی؟" وہ دونوں سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ کر بیک وقت بولے "ہمیں کوئی خبر نہیں" اور میں نے انہیں اسٹین گن کی گولیوں سے اندرونی خبر دے دی۔ سڑک پر پہنچ کر میں ٹینکر کے داخلے والی سرنگ کی طرف بھاگا کیونکہ حبیب اسی سرنگ سے باہر آنے کیلئے چلا تھا سرنگ کے دہانے کے قریب ہی حبیب میرا منتظر تھا ہم نے ٹرکوں اور جیپوں کی پارکنگ کی طرف دوڑ لگائی ابھی ہم اس پارکنگ کے نزدیک ہی پہنچے تھے کہ ہمیں پہلا دھماکہ سنائی دیا۔ ہم بھاگم بھاگ پارکنگ میں کھڑے ایک ٹرک کی طرف پہنچے۔ ٹرک میں بیٹھنے ہی لگے تھے کہ دوسرا دھماکہ ہوا اور اس کے ساتھ تیسرا دھماکہ ہوا اور پھر تو دھماکوں، شعلوں کا سلسلہ بندھ گیا۔ میں نے ٹرک میں چابی نہ ہونے کی وجہ سے اس کے ڈیش بورڈ سے تاریں نکالیں اور انہیں جوڑ ہی رہا تھا کہ ٹرک تھرتھرانے لگا زمین ہل رہی تھی یہ آئل ٹینک یا ARSENAL میں بموں کے پھٹنے کی وجہ تھی ہم نے ٹرک اسٹارٹ کیا اور تیزی سے واپسی کیلئے روانہ ہوئے اچانک ایک کانوں کے پردے پھاڑنے والا انتہائی شدید دھماکہ ہوا یہ دھماکہ غالباً حدت سے ARSENAL میں رکھے بموں کے بیک وقت پھٹنے سے ہوا تھا اس دھماکے نے زمین کو ایسے جھنجھوڑا کہ ہمارا ٹرک کئی فٹ ہوا میں اچھلا بڑی مشکل سے میں نے اسٹیئرنگ پر قابو رکھا۔ ابھی ہم سڑک کے موڑ کے اس حصے تک نہیں پہنچے تھے۔ جہاں سرنگیں آنکھوں سے اوجھل ہوتیں کہ تینوں سرنگوں سے بیک وقت آگ کے شعلے نکلے۔ زمین مسلسل تھرتھرا رہی تھی اور دھماکوں کا سلسلہ جاری تھا۔ آگ کی حدت ہمیں ٹرک میں بھی محسوس ہوئی۔ میں نے ٹرک کی رفتار تیز کر دی پہلے بند بیریئر کو تیز رفتار ٹرک نے توڑ دیا۔ میس اور کالونی کے رہائشی زمین ہلنے اور دھماکوں کی وجہ سے باہر نکل آئے تھے۔ میں ٹرک کے ایکسیلیٹر کو دبائے جا رہا تھا دوسرا بیریئر بھی ٹرک سے توڑتے ہوئے ہم RESTRICTED AREA سے باہر نکل آئے۔ آگے آکر دوشاخے کے قریب آپ انتظار میں کھڑے تھے۔ حبیب نے کہا "سر آپ نے آگ کے شعلے اور دھوئیں کی جو بلندی دیکھی تھی۔ وہ اصل کا عشر عشیر بھی نہ تھی۔ کیونکہ درمیان میں پہاڑ تھا جو کچھ ہم نے دیکھا وہ تو قیامت صغریٰ تھی۔ اس شدت کی آگ تھی کہ انسانوں سمیت ہر شے یقیناً راکھ کا ڈھیر بن گئی ہوگی۔ یہاں میں آپ کو ایک عجیب حقیقت بتانا چاہتا ہوں۔ اس مشن میں کامیابی اور رہبر و بننے کا سہرا حبیب قیصر کے سر پر اور قیصر حبیب کے سر پر باندھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دونوں کا یہ کہنا تھا کہ دوسرے کے بغیر یہ مشن کبھی کامیاب نہ ہوسکتا۔ ان دونوں نے فی الحقیقت اپنی جان کی بازی لگا کر ہمارے چیف سے لے کر ہر متعلقہ فرد کے ادھورے خواب کو پورا کیا تھا۔

ہماری شاباش اور تعریف کے علاوہ پاکستان سے اس مشن کی کامیابی کی تصدیق کے بعد ان دونوں کو خصوصاً اور مشن میں شامل ساتھی لڑکوں اور مجھے کیا انعام ملا۔ اس کے متعلق صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہم سب کی توقع سے کہیں زیادہ تھا۔ سب سے زیادہ تعجب اس بات پر تھا کہ بھارتی حکومت اور ایئر فورس نے اس تباہی کو بالکل دبا دیا۔ ہم سب اخبار ایک ہفتے تک کھنگالتے رہے لیکن اتنے بڑے واقعے کی کوئی خبر کسی اخبار میں موجود نہ تھی۔ صرف Times of india نے ایک اداریہ The mass pyre inmountain کے عنوان سے شائع کیا جس میں ہوائی اڈے پر تباہی کا ذکر بڑے محتاط انداز میں کیا گیا تھا۔ اس کی یقینی وجہ یہ تھی کہ اس واقعے کی تشہیر کرنے سے بھارت خود اپنی نااہل سیکورٹی کو تسلیم کرتا اور اپنے منہ پر خود طمانچے مارتا۔ ہندو کی تو خوبی ہی یہ ہے کہ اپنی غلطی کو کبھی تسلیم نہیں کرتا اور ہمیشہ خود کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کشمیر میں اب چھ لاکھ سے زیادہ بھارتی فوج کی موجودگی کو بھارت کا صحیح اقدام قرار دینا، جوناگڑھ اور حیدرآباد پر اس لئے قبضہ کرنا کہ وہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے اور کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت کو نظرانداز کر کے اس وقت کے بھارتی مہاراجہ ہری سنگھ کے الحاق کو وجہ بنا کر قبضہ کرنا بھارتی ذہنیت کی بھرپور اور عمدہ عکاسی کی بہترین مثال ہے۔

شام تک میں ساتھیوں کے گھر بیٹھا رہا اور ہم اس جان لیوا مشن کی تکمیل اور مکمل کامیابی کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ ساتھیوں کے گھر میں اکثر جاتا تھا اور رندھیر پر ہماری میزبانی کا بوجھ پڑتا تھا۔ میں نے کئی بار رندھیر کو اس بلاوجہ کی میزبانی سے روکنے کی کوشش کی لیکن اس نے ہر بار قطعی انکار کر دیا۔ گورکھپور سے واپسی پر ہم گزشتہ 24 گھنٹے سے اس کی میزبانی سے فیض یاب ہو رہے تھے۔ شام کو سب سے رخصت ہوکر میں اور قیصر سڑک پر آگئے۔ ہم دونوں نے اپنے اپنے سوٹ کیس دو ٹیکسیوں میں رکھے اور قیصر اپنے گھر اور میں اپنے ہوٹل روانہ ہوا۔ ہوٹل میں میرے لئے کئی روز پہلے کا کرنل شنکر کا پیغام موجود تھا کہ میں اسے فوری ملوں۔ اگلی صبح میں نے پاکستان جانے والی ڈاک کے لئے اس مشن کی مکمل رپورٹ لکھی جس میں یہ بھی لکھا کہ بھارتی حکومت نے اتنے بڑے حادثے کو بالکل دبا دیا ہے اور اس حادثے کے متعلق کسی اخبار میں کوئی خبر شائع نہیں ہوئی۔ اگلے روز ٹرانسمیٹر پر رابطے کے وقت میں ساتھیوں کے گھر چلا گیا۔ مقررہ وقت پر پاکستان سے رابطہ ہوا تو حبیب (نمبر ٹو) نے نہایت مختصر پیغام دیا کہ گروپ لیڈر اور دونوں ساتھی واپس آگئے ہیں اور گروپ لیڈر یہاں موجود ہے۔ اس کے جواب میں پاکستان سے مجھے ہدایت کی گئی کہ تفصیلی رپورٹ ڈاک کے ذریعے بھیجوں۔ مزید یہ کہ نئے راستے سے ڈاک لانے، لے جانے والوں میں سے کچھ بارڈر پر پکڑے گئے ہیں۔ اس لئے پہلے رستے سے پہلے والے کوریئر سے آئندہ جمعے کو شام 4 بجے آخری مرتبہ کے Contact spot پر ملوں۔ لاہور کے رستے آنے والے کوریئر اگر دکھائی دیں تو ان کی نظروں میں نہ آؤں وہ دشمن کی حراست میں ہیں۔ کیپٹن ارشد سے ملاقات کے دوران میرے جن ساتھیوں کو ان کوریئرز نے دیکھا ہے۔ وہ بھی ان کی نظروں سے بچیں۔ پاکستان سے ہمیں ٹرانسمیٹر پر مفصل ہدایات ملتی تھیں۔ بھارتی انٹیلی جنس یقیناً اس فریکوئنسی پر انہیں کیچ کرتی ہوگی۔ پاکستانی ٹرانسمیٹر کا تو وہ کچھ نہ بگاڑ سکتے تھے۔ خطرہ صرف ہمارے ٹرانسمیٹر سے پیغام بھیجتے وقت تھا۔ لہٰذا ہم اپنا پیغام زیادہ سے زیادہ ایک منٹ کیلئے ٹرانسمٹ کرتے تھے اس مختصر وقت میں ہمارے Trace ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔

گورکھپور کے متعلق ہمیں جو معلومات آئندہ دو ماہ میں حاصل ہوئیں۔ قارئین کے لئے تسلسل کی غرض سے یہاں لکھ رہا ہوں۔ مختلف ذرائع جن میں کرنل شنکر بھی تھا، مجھے معلوم ہوا کہ گورکھپور کے مرکزی شہر ہونے کی وجہ سے اس خفیہ اڈے کو گورکھپور کا اڈہ کہا جاتا تھا جبکہ یہ درحقیقت گورکھپور سے تقریباً 50 کلومیٹر کے فاصلے پر چندوال کے قریب بنایا گیا تھا۔ اس اڈے کا رن وے مہندوال کی طرف تھا اور رہائشی کالونیاں اور میس وغیرہ پہاڑ کی اس جانب گورکھپور کی طرف تھے۔ سرنگیں مہندوال کی جانب تھیں۔ اس اڈے سے ٹیک آف کے بعد جہاز تربیتی اور (Routine) روٹین کی پروازوں کے لئے اڑتے تھے۔

یہ مستند اطلاعات بھی ملیں کہ ہماری کارروائی کی وجہ سے پہاڑ کے اندر موجود تمام لوگ، جہاز اور اسلحہ راکھ کا ڈھیر بن گئے۔ اس حادثے کی وجہ کا تعین کرنے کے لئے اعلیٰ سطح کے کمیشن بنائے گئے۔ لیکن کوئی کمیشن بھی حتمی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ یہ ہوائی اڈہ تباہی کے بعد قریب ایک سال تک بند رہا۔ یہ سب باتیں مجھے بمبئی اور پاکستان واپس پہنچنے سے پہلے نیپال میں معلوم ہوئیں۔

آئندہ جمعے کو مجھے پہلے والے کوریئر سے ملنا تھا۔ میں نے Times of india کے اس شمارے کے کئی پرچے خرید ے تاکہ پاکستان بھیج سکوں۔ اس مشن کی مفصل رپورٹ بھی تیار کی۔ ہماری دہلی سے غیر موجودگی کے دوران لیفٹیننٹ سے جتنی ڈاک موصول ہوئی تھی۔ وہ بھی دہلی میں رہ جانے والے ساتھیوں نے تیار کر رکھی تھی۔ اس بار ہماری ڈاک کا پیکٹ خاصا بڑا تھا۔ میں جمعرات کو کرنل شنکر سے ملنے گیا۔ حسب معمول اس نے سروسز کلب کے لان میں محفل سجا رکھی تھی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اسے بتایا کہ میں اپنے کاروباری سلسلے میں بمبئی گیا ہوا تھا۔ میری دہلی سے غیر حاضری کے دوران اس کا ہوٹل میں بھیجا ہوا پیغام واپسی پر ملا، سو حاضر ہوگیا ہوں۔ کرنل شنکر جو اپنی کرسی پر نیم دراز تھا میری بات خاموشی سے سنتا رہا۔ میں نے بات ختم کی تو وہ کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور سرگوشی کے انداز میں بولا "کیا گورکھپور بھی گئے تھے؟" کرنل شنکر کی زبانی گورکھپور کا نام سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میں نے حواس پر قابو پانے کی پوری کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ میں خاموشی سے ٹکٹکی باندھے چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ یقیناً کرنل شنکر نے بھی میری اس حواس باختگی کو محسوس کیا ہوگا۔ اس نے ٹھنڈے پانی کا گلاس میرے سامنے رکھ دیا جسے میں غٹاغٹ پی گیا، حواس ذرا بحال ہوئے تو کرنل شنکر کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دیکھی۔ میں نے حواس مجتمع کرتے ہوئے جواب دیا کہ میں بمبئی سے واپسی پر گورکھپور بھی گیا تھا۔ مجھے وہاں اپنی چائے متعارف کرانی تھی۔ میں نے اسے جواب تو دے دیا لیکن میری زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ میری اس حالت کو کرنل شنکر گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے چند لمحے توقف کیا اور اسی سرگوشی کے لہجے میں بولا "تم ونود ہو یا نوید۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ میرے لئے تو تم صرف ونود ہو۔ جو کام بھی کرو پوری احتیاط سے اور دیکھ بھال سے کرو"۔ یہ کہہ کر وہ چپ ہوگیا اور اپنے لئے نیا جام بنانے لگا۔ کرنل شنکر کے اس فقرے نے میرے بڑی مشکل سے بحال کئے ہوئے حواس پھر درہم برہم کر دیئے۔ میرے دل و دماغ میں زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی۔ میرے لئے اس کی باتیں انتہائی غیر متوقع تھیں۔ میں اس مجرم کی طرح اس کے سامنے بیٹھا تھا جس کے جرائم یکلخت بے نقاب ہو چکے ہوں اور وہ اپنی سزا سننے کا منتظر ہو۔ کرنل شنکر میری اس حالت سے خاصا محظوظ ہو چکا تھا۔ اس نے اپنا اصلی لب و لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا "مجھے ایک Official کام سے گورکھپور جانا پڑا۔ میں نے تمہیں وہاں دیکھا۔ تمہارے ساتھ دو تین اور آدمی بھی تھے۔ میں جیپ میں چھاؤنی جا رہا تھا اس لئے ٹھہر نہ سکا۔ میں گورکھپور میں دو روز رہا اور واپس دہلی آگیا"۔ کرنل شنکر نے اب وہی پہلے والی ہنسی مذاق کی باتیں شروع کر دیں۔ میں نیم دلی سے اس کا ساتھ دیتا رہا، لیکن میرے دماغ میں اس کے کہے ہوئے الفاظ مسلسل گونجتے رہے۔ "تم ونود ہو یا نوید اور جو کام بھی کرو پوری احتیاط اور دیکھ بھال سے کرو"۔ بڑے واضح اور صاف الفاظ میں میری اصلیت اور اصل کام کا اسے علم ہو جانے کا مطلب لئے ہوئے تھے۔

دوران گفتگو کرنل نے شاید میری بدحواسی کو دور کرنے کے لئے پھر گورکھپور کا ذکر شروع کر دیا۔ "ونود کیا تمہیں معلوم ہے کہ گزشتہ دنوں گورکھپور میں کیا حادثہ ہوا"۔ میرے نفی میں سر ہلانے پر اس نے کہا کہ "وہاں ایئر فورس کے ایک خفیہ ہوائی اڈے پر اچانک آگ بھڑک اٹھی جس نے جہازوں، اسلحہ خانہ (Arsenal) اور آئل ٹینکس کو بھی آناً فاناً اپنی لپیٹ میں لے لیا اور دو سو سے زیادہ Airforce personnels کے ہمراہ سب کچھ جل کر راکھ ہوگیا۔ اس ہوائی اڈے پر سیکورٹی اتنی سخت تھی کہ تخریب کاری کا ذرا سا بھی امکان نہیں۔ عینی شہادت دینے کو بھی کوئی زندہ نہ بچا۔ صرف ایک ٹرک جائے حادثہ سے نکل سکا جو دو سیکورٹی بیریرز کو توڑتا ہوا Restricted area سے باہر آیا۔ صرف اس کا ڈرائیور اس حادثے کا عینی شاہد تھا لیکن اپنی حواس باختگی میں ٹرک پر کنٹرول نہ رکھ سکا اور ٹرک کھڈ میں لڑھک کر ڈرائیور سمیت جل کر راکھ ہوگیا۔ یہ حادثہ یقیناً ایئر فورس Crew کی غفلت کی وجہ سے پیش آیا ہے"۔ کرنل تھوڑی دیر کو چپ ہوا اور پھر سوالیہ انداز میں بولا۔ "ایک بات ایسی ہے جو اس حادثے کو تخریب کاری کا نتیجہ قرار دے سکتی ہے۔ حادثے کے بعد گورکھپور کے دو آدمی ہوائی اڈے والی سڑک پر بیہوش پائے گئے۔ ان کے بیان کے مطابق اسی روز ان کی گاڑیاں پستول دکھا کر چھینی گئی تھیں اور انہیں سروں پر ضرب پہنچا کر بیہوش کر دیا گیا تھا۔ ان کی دونوں گاڑیاں فیض آباد کے قریب جلی ہوئی ملی ہیں۔ ان دونوں کے بیان کے مطابق وہ اتنے حواس باختہ تھے کہ گاڑیاں چھیننے والوں کو اچھی طرح سے دیکھ نہ سکے۔ ان کے بیانات سے صرف ایک Clue ملا کہ ان میں ایک آدمی گورا چٹا اور لمبے قد کا تھا" کرنل یہ بتا کر پھر چپ ہوگیا اور میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ وہ غالباً میری پریشانی سے لطف اندوز ہو رہا تھا پھر اچانک بولا "ونود۔ کیا یہ عجیب اتفاق نہیں کہ تم بھی گورے چٹے اور لمبے قد کے ہو اور حادثے کے دنوں میں گورکھپور میں ہی تھے"۔ میرے لئے اب خاموش رہنا محال تھا۔ میں نے بھی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ کرنل صاحب اگر آپ کو مجھ پر شک ہے تو پھر پکڑوا کیوں نہیں دیتے۔ کرنل کھلکھلا کر ہنس پڑا اور بولا "مجھے شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ تم وہ گورے چٹے اور لمبے آدمی نہیں ہو جس کا ذکر دونوں کار مالکان نے کیا ہے۔ بھارت میں ایسی مشابہت تو ہزاروں لوگوں میں ہوسکتی ہے۔ میں نے تو محض مذاقاً یہ بات کی تھی۔ ہیڈکوارٹر میں اس حادثے کی جو رپورٹس آئی ہیں میں نے تو ان رپورٹس کی بنا پر تمہیں سب واقعہ بتایا ہے۔ ایئر فورس والوں نے تو اپنی نااہلیت اور کمزور سیکورٹی کو چھپانے کیلئے اس حادثے کی خبر اور تفصیلات کو دبا دیا ہے تمہیں آگاہ کرنے کے لئے یہ تفصیلات تمہیں بتائی ہیں" اس کے بعد کرنل نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ جب دو گھنٹے بعد میں نے کرنل سے اجازت چاہی تو اس نے اٹھ کر ہاتھ ملایا اور مسکراتے ہوئے پھر سرگوشی میں کہا "میں نے تو یہ باتیں تمہیں اس لئے بتائی ہیں کہ تمہیں حادثے میں ہونے والے نقصان کا پورا اندازہ ہو جائے"۔ کرنل نے اپنا چہرہ میرے کان کے قریب کرتے ہوئے پھر سرگوشی میں کہا "آئندہ کبھی گورکھپور نہ جانا۔ میں کرنل سے رخصت لے کر واپس ہوٹل آگیا۔ میرے دل و دماغ میں مچی ہلچل میں اضافہ ہو چکا تھا۔ اسی باعث میں ساری رات سو نہ سکا۔ کرنل کی باتوں نے مجھے بالکل Abnormal کر دیا تھا۔

اگلا دن جمعہ تھا۔ مقررہ وقت میں ڈاک کا پیکٹ لے کر پہلے والے کوریئر سے ملنے چلا گیا۔ میں بھی مسلح تھا اور میرا ایک ساتھی بھی مجھے کور دینے کے لئے ہمراہ تھا۔ کرنل شنکر سے حاصل شدہ معلومات بھی میں نے ڈاک میں شامل کر دی تھیں۔ مقررہ جگہ پر کوریئر ملا اور ہم نے اپنے پیکٹوں کا تبادلہ کیا۔ ٹریننگ کے دوران دی گئیں ہدایات کے مطابق میں نے آئندہ ڈاک کے تبادلے کے لئے نئی جگہ نیا وقت اور نئی تاریخ کا تعین کیا۔ جس کا اصولی طور پر علم صرف مجھے اور کوریئر کو ہونا تھا میں نے اسے یہ بھی کہا کہ مجھ سے ملاقات کے وقت وہ خود اکیلا آئے، اپنے کسی ساتھی کو ہمراہ ہرگز نہ لائے۔ اس کوریئر کو چونکہ میرے ساتھیوں کے متعلق کچھ علم نہ تھا لہٰذا میں نے یہ فیصلہ کیا کہ آئندہ صرف میں ڈاک کے تبادلے کے لئے جاؤں گا اور میرا ایک ساتھی کوریئر کی نظروں میں آئے بغیر مجھے کور دے گا اور ہر بار مختلف ساتھی میرے ہمراہ جائے گا۔ میں نے ساتھیوں کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ اگر اچانک لاہور والے کوریئر کو دیکھیں تو اس کی نظروں میں آئے بغیر گم ہو جائیں۔ کیونکہ وہ ٹرانسمیٹر میسج کے مطابق بھارتی حراست میں ہے۔

غازی

کرنل شنکر سے گورکھپور کے متعلق ہونے والی گفتگو سے جہاں مجھے ہوائی اڈے کی تباہی کی تفصیلات ملی تھیں وہاں اس نے Between the lines مجھے یہ بھی بتادیا تھا کہ بھارتی انٹیلی جنس موٹروں کے مالکان کی شناخت کے مطابق ایک لمبے قد اور سفید رنگ والے کی تلاش میں تھی۔ یہ یقینی امر تھا کہ گاڑیاں جلا کر حادثے کے ذمہ دار لوگ فیض آباد میں ہی نہیں رہ گئے تھے بلکہ وہ ٹرین کے ذریعے یا تو گورکھپور سے ہوتے ہوئے مظفر پور کی طرف گئے ہیں یا لکھنو کی طرف یہ تعین کرنے کے بعد مظفر پور کی طرف جانے والوں کی منزل نیپال ہوسکتی تھی دوسری طرف لکھنو جانے والے کان پور اور پھر وہاں سے بھارت کے کسی بھی حصے میں جاسکتے تھے۔ اگر گزشتہ ڈیڑھ سال کے دھماکوں کو پیش نظر رکھ کر وہ تفتیش کو آگے بڑھاتے تو دہلی میں نیو ایئر نائٹ ایئر پورٹ اور 26 جنوری کے دھماکوں کی وجہ سے اپنی تفتیش میں وہ دہلی کو مرکزی حیثیت دے سکتے تھے۔ کرنل شنکر کا مجھے آئندہ محتاط رہنے اور گورکھپور نہ جانے کا مشورہ دینا بھی اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ انٹیلی جنس والے پوری تندہی سے ہمارا سراغ لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ دوسری طرف پاکستان سے موصولہ ٹرانسمیٹر پیغام میں پرانے کوریئر کے ذریعے پرانے رستے سے ڈاک بھیجنے کا سلسلہ دوبارہ شروع کرنے، لاہور بارڈر سے آنے والے کوریئر یا اس کے ساتھیوں کے پکڑے جانے کی اطلاع اور خصوصی طور پر لاہور کوریئر کو دیکھتے ہی غائب ہو جانے کی ہدایت کا واضح مطلب تھا کہ لاہور والا کوریئر بھارتی بارڈر کے اندر پکڑا جاچکا ہے۔ دہلی میں اس کی موجودگی کا صرف ایک ہی مقصد ہوسکتا تھا کہ اس نے بھارتی تفتیشی اداروں کے تشدد کی وجہ سے سب کچھ بک دیا ہے اور وہ تفتیشی ادارے کے کارکنوں کے نرغے میں ہمیں دہلی میں تلاش کر رہا ہے۔ ان سب حالات کے پیش نظر میں نے فیصلہ کیا کہ سوائے ٹرانسمیٹر، پستولوں، گولیوں اور کیمروں کے اپنا اور ساتھیوں کے پاس موجود منا سب سامان جس سے ہماری شناخت ہونی ممکن تھی، عارف کے گھر منتقل کر دیا جائے۔ جمعہ کے روز میں نے ڈاک وصول کی تھی اتوار کے روز یہ کام کر دیا۔ عارف سے چونکہ ہمارا ظاہری کوئی تعلق نہ تھا (نذیر کے گھر میرے ساتھی رہتے تھے) اس لئے اس کا گھر موجودہ حالات میں محفوظ ترین تھا۔ عارف کے گھر رکھے گئے سامان میں بشیر مرحوم کی سیف سے ملے ریوالور، پستول اور گولیوں کے علاوہ ہم نے بموں سے بھرا سوٹ کیس بھی اس کے گھر منتقل کر دیا۔

میں نے دہلی میں اپنی اور ساتھیوں کی سکونت تبدیل کرنے کے متعلق بھی سوچا لیکن نئی جگہ ہمارے لئے زیادہ غیر محفوظ تھی۔ موجودہ جگہوں پر رہتے ہوئے ہمیں دو سال ہونے کو آئے تھے۔ ساتھیوں کے محلے دار بھی انہیں کاروباری سمجھتے تھے اور ان کی ایسی کوئی Activity محلے داروں کی نظر میں نہ تھی جو انہیں مشکوک بناسکتی۔ مالک مکان نذیر اور عارف بھی ان کی صفائی دینے کو موجود تھے۔ ادھر لودھی ہوٹل میں میرا طویل قیام میرے حق میں جاتا تھا۔ ہوٹل کا تمام اسٹاف مجھے چائے کے بیوپاری کی حیثیت سے جانتا تھا اور اس کی گواہی دے سکتا تھا۔ اسی ہوٹل میں میرے متعلق پوچھ گچھ کے لئے DMI والے ایک بار آچکے تھے اور انہوں نے بھی مجھے Clear کر دیا تھا۔ لہٰذا سکونت تبدیل کرنے کا خیال میں نے دل سے نکال دیا۔ ساتھیوں کو میں نے موجودہ حالات کی نوعیت اور ممکنہ درپیش آنے والے خطرات سے آگاہ کیا اور انہیں Red Alert پوزیشن میں رہنے کا کہا جوڈو کراٹے کے ماہر ساتھی کو میں نے لودھی ہوٹل میں اپنے فلور پر ایک کمرے میں شفٹ کر لیا تا کہ کسی ناگہانی صورت میں وہ مجھے کور بھی دے سکے اور ساتھیوں کو بھی بتا سکے۔ اب ہمارے پاس صرف اسلحہ اور ٹرانسمیٹر تھا جسے ہم نے بہر صورت اپنے پاس رکھنا تھا۔ میں نے ساتھیوں کو یہ بھی کہہ دیا کہ اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ انہیں اپنی گرفتاری یقینی دکھائی دے تو Sitting Duck کی طرح بغیر مزاحمت کے گرفتاری ہرگز نہ دیں بلکہ اسلحے کا بے دریغ استعمال کریں۔ گرفتاری کی صورت میں پر تشدد موت تو لازمی مقدر تھی اس لئے دشمن کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچائیں، میں نے انہیں کہا کہ بے شک دشمن کے پندرہ بیس افراد گرفتار کرنے آئیں لیکن صرف تنخواہ کے لئے ملازمت کرنے والے ایک دو گولیاں چلتے ہی جانیں بچانے کے لئے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ ہندو تو فطرتاً ڈرپوک ہیں لہٰذا اسلحے کا استعمال انہیں بھگانے اور خود غائب ہو جانے میں بہت مدد دے گا۔

ہمارے پاس اب نہ تو کوئی مخصوص مشن باقی تھا اور نہ ہی پاکستان سے ہمیں کوئی نئی ہدایات موصول ہوئی تھیں۔ حالات کے پیش نظر ہم بھی چاہتے تھے کہ کچھ وقت بالکل خاموشی سے گزارا جائے۔ ہماری سرگرمیاں اب صرف ڈاک وصول کرنے، بھیجنے اور مقررہ وقت پر ٹرانسمیٹر پر پیغام وصول کرنے تک محدود تھیں۔ میرے ساتھی ہر روز ماسوا اتوار کی شام بشیر مرحوم کے گیرج جاتے اور لڑکوں کو تربیت دیتے موسم گرما شروع ہو کر اپنے جوبن تک آچکا تھا مئی 74ء میں بھارت نے راجستھان میں پوکھران کے مقام پر زیر زمین دوسرا ایٹمی دھماکہ کیا بھارت کے اس ایٹمی دھماکے کو دنیا بھر میں گونج ملی۔ بھارتی اخبارات نے تو اس دھماکے کی خبروں کے ساتھ ساتھ پاکستان کو بھارتی نیوکلیائی برتری کی وجہ سے باقاعدہ ڈرانا اور اپنے عظیم بھارت میں ضم ہو جانے کی دھمکی آمیز ترغیبات دینی شروع کر دیں اور یہ سلسلہ ہفتوں جاری رہا۔ میں اور میرے ساتھی بھی بھارتی ایٹمی دھماکے کی وجہ سے پژمردہ ہو گئے۔ ایک روز جب ہم سب اکٹھے بیٹھے تھے، ہماری گفتگو کا رخ اس ایٹمی دھماکے کی طرف ہو گیا۔ میں نے ساتھیوں کو کہا کہ بھارت ایک چھوڑ دس دھماکے کرے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پاکستانی سائنسدان بھی ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے نہیں ہوں گے۔ ماضی کی تاریخ کے اوراق ہمیں بتاتے ہیں کہ برصغیر میں تیز و تند ہوائیں ہمیشہ مغرب سے ہی آتی ہیں۔ ہزاروں برس قبل اس علاقے میں آرین سے لیکر سفید ہن، سکندر اعظم، لودھی، سلجوقی، تغلق غزنوی، خاندان غلاماں، مغل اور احمد شاہ ابدالی تک سب مغرب سے ہی آئے اور اس علاقے کا تیا پانچہ کرتے رہے۔ ہم بھارت کے مغرب میں ہیں اور انشاءاللہ ماضی کی روایات کو برقرار رکھیں گے۔ میرے ساتھی بھی لڑکوں کو گیرج میں اسی طرح دلاسا دیتے تھے۔ حالات بالکل ایک پرسکون سمندر کی طرح تھے لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اس پرسکون سمندر کے پیچھے ایک بڑے طوفان کی آمد آمد ہے اور یہی ہوا۔

شیر شکاریوں کے نرغہ میں

یہ 6 جون 74ء اور ڈاک لینے اور دینے کا دن تھا۔ کیریئر سے اس بار میں نے آصف علی روڈ پر ایک جوس کی دکان پر سہ پہر چار بجے ملنے کا طے کیا تھا۔ جوڈو کراٹے کے ماہر میرے ساتھی کو مجھے کور دینے کے لئے ساتھ جانا تھا ہماری ڈاک کا پیکٹ بھی اس کے پاس تھا۔ ہم آصف علی روڈ پر پونے چار بجے ہی پہنچ گئے اور جوس کی دکان سے کچھ فاصلے پر ٹیکسی چھوڑ دی۔ میں دکان کی طرف چلنے لگا۔ میرا ساتھی مجھ سے بیس پچیس قدم پیچھے تھا۔ ہم نے یہ طے کیا تھا کہ میں جوس کی دکان پر رک کر جوس کا آرڈر دوں گا۔ اس دوران میرا ساتھی میرے پاس سے گزرتے ہوئے ڈاک کا پیکٹ خاموشی سے مجھے تھما کر آگے بڑھ جائے گا اور بیس کلو میٹر کے فاصلے سے مجھے کور دے گا۔ میں جوس کی دکان پر پہنچا اور ابھی جوس کا آرڈر دے ہی رہا تھا کہ آناً فاناً چاروں طرف سے پندرہ سے زیادہ افراد مجھ پر جھپٹ پڑے۔ نہایت تیزی سے انہوں نے میرے ہاتھ میری پشت پر باندھے اور آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ دی۔ مجھے ایک گاڑی میں دھکیل کر دو افراد میرے دائیں بائیں بیٹھ گئے، اور گاڑی تیزی سے چل پڑی یہ سارا عمل ایک منٹ سے بھی کم وقت میں ہو گیا۔ مجھے تو سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا تھا۔ یقیناً میرا ساتھی بھی اس اچانک اور غیر متوقع حملے سے بوکھلا گیا ہو گا اور اس سے پہلے کہ وہ مجھے کور دے سکے گاڑی مجھے لے کر جاچکی ہو گی۔ اس کے پاس ڈاک کا پیکٹ بھی تھا جس کا تحفظ اس کی ذمہ داری تھی۔ اس واقعے کی اپنے باقی ساتھیوں کو اطلاع بھی اس نے دینی تھی۔ یہ صرف میرے اندازے تھے جو گاڑی میں سفر کے دوران میں نے لگائے۔ یہ بھی عین ممکن تھا کہ میرے ساتھی کو بھی اسی وقت گرفتار کر لیا گیا ہو۔ گرفتاری کے وقت تو میں ان کے نرغے میں تھا اور فوری طور پر میری آنکھوں پہ پٹی باندھ دی گئی تھی اور مجھے کچھ علم نہ تھا کہ میرے ساتھی کی کیا پوزیشن تھی۔ گاڑی تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک چلتی رہی اور اس دوران درجنوں موڑ کاٹے گئے کئی بار گاڑی چند لمحوں کے لئے رکی۔ یہ غالباً روڈ سگنل پر سرخ بتی ہونے کی وجہ تھی میں نے گاڑی میں اپنی دونوں طرف بیٹھے لوگوں سے پوچھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے غالباً انہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے میں اس بلاوجہ گرفتاری اور سڑک سے یوں اٹھائے جانے کی تذلیل کے خلاف ہائی کورٹ جاؤں گا میں ایک معزز کاروباری شخص ہوں میرے ساتھ بلاوجہ کا یہ سلوک انہیں بہت مہنگا پڑے گا ان دونوں نے جواب میں ایک لفظ تک نہ کہا جب میں خاموش نہ ہوا تو اگلی سیٹ سے آواز آئی کہ اسے چپ کراؤ اور ان دونوں نے میرے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ میری اس انداز سے گرفتاری اور تضحیک آمیز سلوک یقیناً پولیس کی کارروائی نہ تھی اور نہ پٹی بندھنے تک میں نے کسی باوردی شخص کو وہاں دیکھا تھا۔ مجھے گھیرے میں لینے والے سب سویلین لباس میں تھے۔ جوس کی دکان پر میرے پہنچتے ہی ان کی فوری کارروائی کی ایک ہی وجہ ہو سکتی تھی کہ انہیں میرے جوس کی دکان پر پہنچنے کے دن اور وقت کے علاوہ شناخت کا بھی پہلے سے علم تھا۔ کوریئر سے ہر ملاقات پر آئندہ ملنے کا دن، وقت اور نئی جگہ کا تعین بھی کرتا تھا۔ جس کا علم میرے اور کوریئر کے سوا کسی کو نہ ہوتا تھا حتیٰ کہ میرے ساتھی اور مجھے کور دینے والے کو بھی یہ علم نہ ہوتا تھا کہ مجھے کہاں اور کس وقت کوریئر سے ملنا ہے۔ مجھے سو فیصد یقین ہو چکا تھا کہ کوریئر نے ہی انہیں بتایا ہے۔ کوریئر چار بجے سے پہلے ہی وہاں پہنچ جانا چاہئے تھا۔ میں جوس کی دکان پر چار بجنے کے دو تین منٹ بعد پہنچا تھا جہاں ہم نے ٹیکسی چھوڑی تھی۔ وہاں سے بھی جوس کی دکان صاف دکھائی دیتی تھی۔ اس وقت بھی کوریئر وہاں موجود نہ تھا۔ ان وجوہات کی روشنی میں صرف کوریئر ہی دکھائی دیتا تھا جس نے میری مخبری کی تھی اگر پکڑے جانے والوں کو اپنی تفتیش سے میرے متعلق پتہ چلا ہوتا تو مجھے گرفتار کرنے کے لئے لودھی ہوٹل بہترین جگہ تھی جہاں میں بیشتر وقت موجود رہتا تھا۔

میرے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ آنکھوں پر اس بری طرح اور سختی سے پٹی باندھی گئی تھی کہ کچھ دکھائی دینا تو ایک طرف رہا، میں آنکھوں کے پپوٹے بھی نہ ہلا سکتا تھا۔ ہاتھ پشت پر ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر اس طرح باندھے گئے تھے کہ کلائیوں میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ گاڑی کی اوسط رفتار تیس پینتیس میل تھی اس حساب سے تقریباً پچاس میل چلنے کے بعد جب گاڑی رکی اور مجھے بازوؤں سے کھینچ کر اتارا گیا تو میں نے اندازہ لگایا کہ ہم دہلی میں ہی ہیں اور لمبا سفر سڑکوں پر ادھر ادھر گھومنے کی وجہ سے مجھے منزل کی قیاس آرائی سے دور رکھنے کے لئے کیا گیا ہے۔ گاڑی سے اتار کر وہ مجھے بازوؤں سے پکڑ کر تقریباً 40 قدم دھکیلتے ہوئے لے گئے اور پھر 25 سیڑھیاں اتار کر میرے اندازے کے مطابق لوہے کا دروازہ کھول کر مجھے اندر لے گئے۔ وہاں میری تلاشی لی گئی۔ میرے پاس بھرا ہوا پستول اور ایک فالتو میگزین تھی۔ پستول ملنے کے بعد تو انہوں نے اس بری طرح سے دوبارہ میری تلاشی لی کہ میری پینٹ کے ٹرن اور بیلٹس دیکھنے کے لئے میری پینٹ اتار لی گئی۔ بش شرٹ کے کالر پہلے اچھی طرح ٹٹولے اور پھر بش شرٹ بھی اتروالی۔ جوتے اور جراب بھی اتار لئے۔ میرے جسم پر صرف انڈرویئر اور بنیان باقی رہ گئے۔ مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھے یہاں لانے والوں کا کوئی افسر بھی وہاں موجود تھا جو انہیں اشاروں سے احکام دے رہا تھا۔ میری اس حالت میں مسلمان ہونے کی شناخت کی گئی۔ اسی حالت میں مجھے فرش پر بٹھا دیا گیا۔ مجھے کمرے میں کرسیاں یا میز رکھنے کی آواز سنائی دی۔ تھوڑی دیر اسی حالت میں گزری تھی کہ دو تین افراد نے میری ٹانگوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ دو نے میرے بال اور سر کو پکڑ کر میرا چہرہ اوپر کیا۔ ایک نے میرے منہ سے کپڑا نکالا اور منہ کے اندر زبان اور تالو کے بیچ لوہے یا لکڑی کا ایسا ٹکڑا پھنسا دیا جس سے میرا منہ کھل گیا۔ پھر کسی نے زنبور کی قسم کے کسی آلے سے میرے ایک ایک دانت اور داڑھ کو زور سے کھینچا۔ جب زنبور سائینائیڈ بھری نقلی داڑھ پر آیا تو وہ ذرا سے جھٹکے سے ہی باہر آ گئی مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں D.M.I (Directorate Military Intelligence) کی حراست میں ہوں۔ اس کے تھوڑی دیر بعد کرسیاں اٹھانے کی آواز آئی۔ پھر میرے دونوں پاؤں زنجیر میں لگے کڑوں میں علیحدہ علیحدہ جکڑ دیئے گئے۔ اس کے بعد ہاتھوں کی بندھی رسی کھولی گئی اور دونوں کلائیاں بھی زنجیر میں لگے ہتھکڑی نما کڑوں میں علیحدہ علیحدہ جکڑ دی گئیں۔ اس کے بعد ہاتھوں کی بندھی رسی کھولی گئی پٹی اتنی سختی سے باندھی گئی تھی کہ کچھ دیر تو مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ جب دیکھنے کے قابل ہوا تو وہاں صرف ایک شخص موجود تھا۔ میرے مانگنے پر اس نے مٹی کے ایک پیالے میں مجھے پانی دیا۔ میرے پاؤں میں پڑے کڑے جن زنجیروں سے بندھے تھے ان کے دوسرے سرے فرش پر گڑے ہوئے تھے اور میں ٹانگوں کو فولڈ (Fold) کر سکتا تھا۔ کلائیوں میں بندھے کڑے دیوار میں گڑی زنجیروں میں لگے ہوئے تھے اور ان میں صرف اتنی گنجائش تھی کہ میں دونوں ہاتھوں کو اپنی ناف تک لا سکتا تھا۔ اس آدمی سے میں نے کچھ پوچھنا چاہا تو اس نے صرف اتنا کہا کہ جو کچھ کہنا ہے وہ ہمارے افسران سے کہنا۔ میں تمہیں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ اگر سب کچھ سچ سچ بتا دو گے تو تمہارے حق میں بہتر رہے گا۔ ورنہ سچ بلوانے کے ہمارے پاس ایسے طریقے ہیں کہ تم سچ بولنے پر مجبور ہو جاؤ گے لیکن اس وقت تک تمہارے جسم کی ہڈیاں ٹوٹ چکی ہوں گی اور تم زندگی بھر کے لئے معذور ہو چکے ہو گے۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے ’’طریقوں‘‘ کا نمونہ پیش کرتے ہوئے ایک زوردار ٹھڈا میری دائیں ران پر مارا اور سیل کا دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ ٹھڈا لگنے سے مجھے درد تو بہت ہوا جسے میں نے ایک ہلکی سی آہ میں دبا لیا۔ یہ تو ابتدائے عشق تھا۔ میرے ساتھ آئندہ جو کچھ ہونا تھا سائینائیڈ کی داڑھ نکل جانے کے بعد مجھے ان کے تشدد کی انتہا اور زبان نہ کھولنے کے لئے خود کو تیار کرنا تھا۔ میں نے Cell کا جائزہ لیا۔ یہ سیل اندازاً 12x16 فٹ کا تھا۔ اس کی چھت بہت اونچی تھی جہاں پر مدھم روشن والا بلب ٹمٹما رہا تھا۔ چھت کے بالکل قریب دیوار میں مضبوط سلاخوں والا ایک روشندان تھا۔ سیل کے دروازے پر لوہے کی پلیٹ لگی ہوئی تھی اس پلیٹ میں اوپر کی جانب 18 انچ مربع کا ایک کٹ تھا جسے دروازے کے باہر کی جانب لگی ایک پلیٹ نے اس کٹ کو ڈھانپ رکھا تھا۔ یہ کٹ باہر والوں کے اندر دیکھنے کے لئے بنایا گیا ہو گا۔ میرے دائیں جانب میرے بالکل قریب ہی ایک چھوٹا پانی کا مٹکا تھا جس تک میرا ہاتھ پہنچ سکتا تھا۔

خود کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے آغا حشر کاشمیری کا شعر یاد آیا۔

شیر کس حال میں ہے
لوہے کے جال میں ہے

انٹروگیشن شروع ہونے سے پہلے مجھے کچھ فیصلے کرنے تھے۔ جوس کی دکان پر میری گرفتاری کا مطلب تھا کہ انہیں میری لودھی ہوٹل میں رہائش کا علم نہ تھا۔ لہٰذا لودھی ہوٹل کا نام نہیں لینا تھا۔ میرے ساتھیوں کے متعلق بھی انہیں کوئی علم نہ تھا۔ لہٰذا خود کو اکیلا ظاہر کرنا تھا۔ بھارت میں داخلے کی مدت کا تعین میرے لئے مشکل مرحلہ تھا۔ یہ کوریئر جس کے متعلق مجھے یقین تھا کہ اسی کی مخبری کے باعث میں پکڑا گیا تھا، ہمارے بھارت میں داخلے کے بعد شروع سے ہی ڈاک لاتا اور لے جاتا تھا۔ صرف چند ماہ کے لئے لاہور کا راستہ اختیار کیا گیا تھا۔ اگر اس نے DMI والوں کو سب کچھ بتادیا تھا تو پھر مجھے بھارت میں قیام کے ایک ایک روز کا حساب دینا تھا۔ بھارت میں انجام دیئے اپنے سارے مشنوں سے مجھے لاتعلق ظاہر کرنا لازمی تھا۔ ہمدردوں اور ساتھیوں کے نام بھی نہیں لینے تھے۔ کوریئر نے اس مرتبہ لائی ہوئی ڈاک بھی یقیناً دشمنوں کے حوالے کر دی ہو گی۔ میں دعا مانگنے لگا کہ اس ڈاک میں کوئی ایسی چیز نہ ہو جو میرے ساتھیوں اور ہمارے کیے گئے مشنوں کو عریاں کر دے۔ میرے ساتھ آئندہ جو کچھ ہونا تھا اس کا مجھے پورا اندازہ تھا۔ میں نے حکمت عملی (Strategy) یہ بنائی کہ دوران تفتیش میں انہیں اپنا صحیح نام بتا دوں گا۔ میرے مسلمان ہونے کا تو وہ پہلے ہی اطمینان کر چکے تھے۔ تفتیش کے دوران میں انہیں پاکستان میں دوران تربیت بتائے گئے بھارتی افواج اور ہتھیاروں کے متعلق اپنی معلومات بتاؤں گا۔ اس طرح پاکستان کے مفاد کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر میں تفتیش کا دورانیہ لمبا اور تشدد میں کمی کی کوشش کروں گا۔ حقیقت بھی یہ تھی کہ پاکستان کی دفاعی افواج کے متعلق میری معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں، بھارت آنے سے پہلے میں تربیلہ میں غیر ملکی ٹھیکیداروں (Tarbela joint venture) کے پاس بحیثیت P.R.O ملازم تھا۔ تربیت کے دوران مجھے صرف بھارت اور بھارتی افواج کے متعلق معلومات ازبر کروائی گئی تھیں۔ میں نے یہ بھی طے کیا کہ میں دوران تفتیش ان سے تعاون کرتے ہوئے انہیں اپنے کسی فرضی Contact کو پکڑوانے کیلئے دہلی میں مختلف مقامات پر لے جانے کی کوشش کروں گا کیونکہ اگر وہ مان گئے تو بے شک چاروں اطراف سے ان کے نرغے میں ہونے کے باعث وہ مجھے ہتھکڑی نہیں لگائیں گے اور اس طرح ممکن ہے کہ میرے بھاگنے کی کوئی سبیل بن جائے۔ اس طرح کے بہت سے خیالات میرے دماغ میں آتے رہے اور انہی خیالات میں غرق میری آنکھ لگ گئی۔

غازی

نامعلوم کیا وقت تھا جب میرے جسم پر ٹھوکریں مار کر مجھے جگایا گیا۔ آنے والے چار بندے تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے میری آنکھوں پر پٹی باندھی۔ پھر ہاتھوں کو کڑوں سے آزاد کر کے میری پشت پر رسی سے باندھ دیئے۔ پھر پاؤں سے کڑے اتارے اور بازوؤں سے پکڑ کر سیل سے باہر لے گئے اور سیڑھیاں چڑھ کر بائیں جانب کو چل دیئے۔ دس بارہ قدم چلنے کے بعد دائیں طرف مڑے اور چند قدم چلنے کے بعد مجھے ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ پہلے آنکھوں کی پٹی کھولی اور پھر ہاتھ کھول دیئے۔ انتہائی تیز روشنی کے ریفلیکٹر (Reflector) میں لگے بلب نے میری آنکھیں چندھیا دیں۔ کئی بار آنکھیں کھولنے اور بند کرنے کے بعد مجھے ایک بڑے ٹیبل پر پڑے اسی لیمپ کے پیچھے کرسیوں پر بیٹھے تین اشخاص دھندلے دھندلے سے دکھائی دیئے۔ میں بالکل خاموش بیٹھا رہا۔ آنکھیں جب کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو میں نے ادھر ادھر دیکھا یہ ایک بڑا کمرہ تھا جس میں دو پنکھے پوری رفتار سے چل رہے تھے۔ مجھے لانے والے کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر جا چکے تھے۔ تھوڑی دیر کی خاموشی اور مجھے Assess کرنے کے بعد درمیان میں بیٹھا آدمی بولا ''مسٹر۔ اب تک تمہیں یہ معلوم ہو چکا ہوگا کہ تم ایک بہت بڑی مصیبت میں پھنس چکے ہو۔ اس مصیبت سے تمہارے نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن ہم تمہیں ایک موقع دینا چاہتے ہیں۔ اگر تم ہمارے ساتھ تعاون کرو، ہمارے سوالات کا صحیح اور مکمل جواب دو اور اپنے عملی تعاون سے ہمیں یقین دلا دو کہ تم دلی طور پر ہمارا ساتھ دو گے تو تم نہ صرف تشدد سے بچ جاؤ گے بلکہ ہم تمہیں آزاد کر دیں گے اور تمہیں خاطر خواہ انعام بھی دیا جائے گا۔ دوسری صورت میں، میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ جس سیل میں تمہیں رکھا گیا ہے۔ وہاں سے ہمارے لوگوں نے کئی لاشیں نکال کر جلا ڈالی ہیں۔ اگر اس سیل کو غور سے دیکھو تو وہاں تمہیں خون کے داغ بھی دکھائی دیں گے۔ یہ ان کا خون ہے جنہوں نے ہماری شرافت کی وجہ سے پہلے زبان نہیں کھولی لیکن جب ہم نے دوسرا طریقہ استعمال کیا تو انہوں نے سب کچھ بتا دیا لیکن اپنی حماقت کی وجہ سے ہماری شرافت کی پیشکش کو ٹھکرا کر یا زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے یا زندگی بھر کیلئے اپاہج ہو گئے۔ ہماری یہ عادت ہے کہ ہم پہلے شرافت کی زبان میں بات کرتے ہیں جس کی سمجھ میں یہ زبان نہ آئے اسے دوسری زبان میں سمجھایا جاتا ہے۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم کون سی زبان سمجھتے ہو۔ میں نے یہ لمبی بات اس لئے کی ہے کہ تم شکل وصورت سے پڑھے لکھے لگتے ہو اور میں نہیں چاہتا کہ تم لاعلمی میں مارے جاؤ'' ۔ وہ خاموش ہوا تو اس کے ساتھ کرسی پر بیٹھا نسبتاً ایک جوان شخص بولا Your game is over now show sportsmen spirit and cooperate with us میں نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کہا کہ آپ نے جو کچھ بھی کہا ہے اس کے لئے میں آپ کا مشکور ہوں۔ واقعی میری گیم اب ختم ہو چکی ہے اور میں پوری کوشش کروں گا کہ آپ کے سوالات کے اطمینان بخش جواب دوں۔ اگر میں کسی بات کا جواب نہ دے سکوں تو اس کی وجہ آپ سے کچھ چھپانا نہیں بلکہ میری لاعلمی ہو گی۔ اس سے پہلے کہ آپ مجھ سے سوالات پوچھنے کا سلسلہ شروع کریں، میری آپ سے دو درخواستیں ہیں۔ اول یہ کہ میرے کپڑے مجھے لوٹا دیئے جائیں اور دوسری درخواست یہ ہے کہ اپنے آدمیوں سے کہیں میرے ساتھ توہین آمیز اور ذلیل کرنے کا رویہ چھوڑ دیں۔ جسم پر لگے زخموں سے زیادہ درد انا پر لگے زخموں سے ہوتا ہے۔ میں آپ کی حراست میں ہوں۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ میرے ''تعاون'' کرنے پر آمادگی کے بعد آپ کا میرے ساتھ کیسا رویہ ہوتا ہے۔ میں خاموش ہوا تو ان تینوں نے آپس میں کھسر پھسر کی۔ پھر درمیان والے نے گھنٹی بجائی۔ باہر سے ایک شخص اندر آیا اور درمیان والے نے اسے میرے کپڑے اور جوتے لانے کے ساتھ ساتھ چائے بسکٹ اور پانی لانے کا بھی کہا۔ سائیڈ پر بیٹھے آدمی نے لیمپ کا سوئچ بند کر کے کمرے میں لگے عام بلب جلا دیئے۔ درمیان والے نے کہا Now relax and prepare your self to answer the questions یہاں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہماری تمام گفتگو انگریزی میں ہوئی تھی۔ میں چونکہ اپنی گرفتاری اور پھر وہاں سے فرار ہونے کے درمیانی عرصے کے کسی ایک لمحے کو بھی اب تک فراموش نہیں کر سکا اسلئے اس دوران پیش آئے واقعات اور سوال جواب کے مرحلوں کو اردو میں ڈھالنے کی پوری کوشش کے باوجود کچھ حصے انگریزی میں لکھنے پر مجبور ہوں تا کہ قارئین تک بالکل صحیح تاثر پہنچا سکوں۔

چند منٹوں میں ہی میرا لباس اور جوتے مجھے مل گئے۔ جنہیں میں نے ان کی اجازت سے کمرے کے کونے میں جا کر پہن لیا۔ پھر پانی، چائے اور بسکٹ آ گئے۔ انہوں نے مجھے میرا سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر بھی لوٹا دیا۔ چائے پینے کے بعد بیچ والے نے جو یقیناً ان کا سینئر تھا۔ سوالات کا سلسلہ شروع کیا (س) نام (ج) میں نے اپنا صحیح نام بتا دیا (س) مذہب (ج) مسلم (س) قومیت (ج) پاکستانی (س) کس ایجنسی کیلئے کام کرتے ہو؟ (ج) مجھے علم نہیں کیونکہ میں سویلین ہوں اور مجھے یہ بتایا ہی نہیں گیا کہ میں کس کے لئے کام کرتا ہوں۔ (س) پاکستان سے رابطے کا ذریعہ (ج) کوریئر جس نے آپ کو میرے متعلق مخبری کی۔ (س) پہلے کیا کرتے تھے؟ (ج) تربیلہ میں PRO تھا (س) اس ادارے میں کیسے آئے؟ (ج) سقوط ڈھاکہ کے بعد جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ (س) کس کے ذریعے رابطہ ہوا؟ (ج) ایک کرنل دوست کے ذریعے (س) تربیت کہاں پائی؟ (ج) لاہور میں۔ (س) کس راستے سے بھارت میں داخل ہوئے؟ (ج) وہی رستہ جس سے کوریئر آتا ہے۔ میرے اس جواب پر سینئر نے سخت آواز میں کہا Name it میں نے جواب دیا منڈی صادق گنج سے بھارت میں ہنومان گڑھ اسٹیشن تک۔ (س) یہاں کتنے عرصے سے ہو (ج) تقریباً دو سال سے۔ اس کی تصدیق آپ کوریئر سے بھی کر سکتے ہیں۔ (س) تمہیں کیسے معلوم ہے کہ تمہارا کوریئر ہماری حراست میں ہے؟ (ج) جہاں پر مجھے آج گرفتار کیا گیا اس جگہ، دن اور وقت کا علم صرف کوریئر کو ہی تھا۔ (س) رہائش کہاں ہے؟ (ج) علی گڑھ میں (س) اپنے محکمے کے افسران کے نام بتاؤ۔ (ج) مجھے کسی کے نام کا علم نہیں حتیٰ کہ اپنے محکمے کے نام سے بھی ناواقف ہوں۔ جنہوں نے تربیت دی تھی انہوں نے بھی اپنے صحیح نام نہیں بتائے آپ کی طرح وہاں بھی Compartmentation پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔

(س) ہمارے متعلق کیا جانتے ہو؟ (ج) مجھے یقین ہے کہ آپ DMI سے ہیں (س) یہ اندازہ تم نے کیسے لگایا؟ (ج) میری گرفتاری جس منظم طریقے سے ہوئی، کوئی سویلین محکمہ اتنی پھرتی نہیں دکھا سکتا۔ (س) تمہارا مشن کیا ہے؟ (ج) یہ سروے کرنا کہ بھارتی مسلمان پاکستان کے ساتھ کس حد تک دلی وابستگی رکھتے ہیں اور کتنے فیصد بھارتی غیر مسلم پاکستان کے ساتھ امن کے خواہاں ہیں۔ (س) تمہارے گروپ میں کتنے آدمی ہیں؟ (ج) میں اکیلا ہوں (س) تم جھوٹ کہہ رہے ہو (ج) اگر میرے ساتھ کچھ اور لوگ ہوتے تو میں لازماً آپ کو ان کے متعلق بتا دیتا۔ اس طرح تفتیش کا بوجھ بٹ جاتا۔ (س) یہاں کے اخراجات کیسے پورے کرتے ہو؟ بھارت میں کن لوگوں سے تمہارے مراسم ہیں اور یہاں پر کون تمہیں مالی امداد دیتے ہیں؟ (ج) میرے اخراجات کیلئے روپے کوریئر کے ذریعے پاکستان سے آتے ہیں۔ بھارت میں مجھے کوئی مالی مدد نہیں دیتا۔

اس طرح کے بنیادی سوال مجھ سے 2 گھنٹے سے زیادہ پوچھے گئے اور میں ان کے گول مول جواب دیتا رہا۔ بھارتی افواج اور اسلحے کے متعلق ان کے پوچھنے پر میں نے کہا کہ مجھے ٹریننگ کے دوران جو کچھ بتایا گیا ہے۔ اس کے سوا میں کچھ نہیں جانتا اور جو کچھ بھارتی دفاعی افواج کے متعلق میری معلومات ہیں میں وہ سب آپ کو بتانے کو تیار ہوں۔ میرے ساتھ آج جو کچھ ہوا ہے اس سے میری دماغی حالت صحیح نہیں۔ مجھے لمبے عرصے کے لئے جیل بھیجنے یا ہلاک کرنے کے لئے آپ کے پاس میری بیان کی ہوئی معلومات ہی کافی ہیں لیکن انہیں نہ تو ریکارڈ کیا گیا ہے اور نہ ہی لکھا جا رہا ہے۔ میں نے آپ کو مکمل تعاون کا یقین دلایا ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اپنی تفتیش کسی اور وقت کریں۔ میں تو آپ کی حراست میں ہوں میری سائنائیڈ بھری داڑھ بھی آپ نے نکال لی ہے۔ مجھے وقت دیں تا کہ میں ذہنی طور پر نارمل ہو سکوں۔ اگر دوران تفتیش کسی موقع پر بھی آپ نے محسوس کیا کہ میں آپ سے کچھ چھپا رہا ہوں تو آپ کے اختیار میں ہے کہ جیسا سلوک چاہیں آپ میرے ساتھ کر سکتے ہیں اور یہ حقیقت تھی کہ میں بہت زیادہ ذہنی دباؤ میں تھا اور سنبھلنے کے لئے کچھ وقت چاہتا تھا۔ اب تک میں نے جو جواب دیئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ ان کی کوئی حیثیت نہیں اور مجھ سے حقیقت اگلوانے کے لئے وہ مجھ پر بے تحاشا تشدد کریں گے۔ میں چاہتا تھا کہ میں ذہنی طور پر تشدد سہنے کے لئے خود کو تیار کر لوں۔ ان کے سینئر نے میری باتیں سن کر کہا ''جو کچھ تم نے بتایا ہے وہ صریحاً غلط اور جھوٹ ہے۔ ہم نے تمہیں موقع دیا لیکن تم نے یہ سمجھا کہ تمہارے سامنے دو احمق بیٹھے ہیں جو تمہاری ہر بات کو سچ مان لیں گے۔ اپنے دماغ سے اس خیال کو ہی جھٹک دو کہ تم ہم سے سچائی چھپا سکو گے۔ ہم تمہیں صرف ایک موقع اور دیتے ہیں اور تمہیں یہاں سے شفٹ کر کے اس سے بہتر جگہ بھیج رہے ہیں۔ تمہیں اتنا وقت بھی دیں گے کہ تم Mentally normal ہو سکو۔ تمہارا بیان بھی ہمارا ایک آدمی لکھتا جائے گا۔ آئندہ تفتیش کے دوران اگر تم نے غلط بیانی کی یا کچھ چھپانے کی کوشش کی تو پھر تمہارے ساتھ جو سلوک کیا جائے گا اس کے تم خود ذمہ دار ہو گے''۔ یہ کہہ کر ان کے سینئر نے گھنٹی بجائی۔ دو آدمی اندر آ گئے، سینئر نے انہیں مجھے باہر لے جانے کا کہا، وہ میری آنکھوں پر پٹی باندھنے لگے تو سینئر نے انہیں روک دیا اور کہا کہ رات کے اندھیرے میں اسے کیا نظر آئے گا۔ اس کے ہاتھ بھی کھلے رہنے دو۔ تھوڑی دیر تک ایک بند گاڑی اسے آ کر لے جائے گی۔ کمرے میں بھی اسے کھلا رہنے دینا لیکن دو آدمی اس کی نگرانی کے لئے کمرے میں موجود رہیں۔ یہ ہدایت دے کر وہ اٹھا تو میں نے اس سے کہا ''سر میں آپ سے دوبارہ یقین دہانی چاہتا ہوں کہ آپ سے بھرپور تعاون کے بدلے مجھ پر تشدد نہیں کیا جائے گا اور آپ کے اطمینان کے بعد مجھے رہائی مل جائے گی''۔ سینئر نے کہا ''تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں لکھ کر دوں''۔ ایک جونیئر بولا Mr.you have no choice. you got to believe us یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ ان دو گارڈز نے مجھے پکڑا اور کمرے سے باہر لے آئے۔ وہاں دو اور گارڈز کھڑے تھے۔ یہ چاروں مجھے اسی زمین دوز کمرے میں لے آئے۔ دو گارڈز کمرے کے اندر کھڑے رہے اور دوسرے دو گارڈز دو کرسیاں لے کر آئے۔ مجھے فرش پر بیٹھ جانے کا کہہ کر وہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میں فرش پر لیٹ گیا۔ زمین دوز کمرہ اونچی چھت کی وجہ سے باہر کی نسبت خاصا ٹھنڈا تھا۔ میں نے آئندہ پیش آنے والے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے خود کو تیار کرنا شروع کیا، اسی دوران میری آنکھ لگ گئی۔ کہتے ہیں کہ نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ میں گو سولی کے قریب تھا لیکن ابھی سولی پر چڑھا نہ تھا۔

مجھے سوئے ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی ہو گی کہ جھنجھوڑ کر جگا دیا گیا۔ کمرے میں اس وقت پہلے دو گارڈز کے علاوہ 4 اور آدمی موجود تھے۔ نئے افراد میں سے ایک نے میری آنکھوں پر پٹی باندھی اور مجھے بازوؤں سے پکڑ کر کمرے سے باہر لے آئے۔ اس زمین دوز کمرے میں تو دن اور رات کی تمیز ہونا ہی ناممکن تھا۔ آنکھوں پر پٹی بندھی ہونے کی وجہ سے کمرے سے باہر آ کر بھی وقت کا کچھ اندازہ نہ ہو سکا۔ مجھے وہ ایک طرف لے کر چلے اس بار میں نے قدم گننے شروع کئے۔ اڑتالیس قدم گننے تھے جن میں دو سیڑھیاں بھی شامل تھیں کہ وہ رک گئے اور دھکیل کر مجھے زمین پر ایک میٹر بلند (درمیان میں ایک پائیدان) ایک بینچ پر بٹھا دیا گیا۔ ٹٹول کر میں نے اندازہ لگایا کہ یہ گاڑی تھی۔ دروازہ بند کرنے کی آواز آئی اور گاڑی چل پڑی۔ مختلف جگہوں پر دائیں بائیں مڑتے اندازاً ایک گھنٹے بعد یہ گاڑی ایک جگہ رکی۔ مجھے گاڑی سے اتارا گیا۔ اترنے سے پہلے میرے سر پر ایک کپڑا ڈال دیا گیا۔ تیس سے زیادہ قدم چلنے کے بعد مجھے ایک قدم سیڑھی چڑھ کر چند قدم کے بعد ایک جگہ روکا گیا۔ سر کا کپڑا اور پٹی ہٹا دی گئی۔ یہ ایک 12x10 کا کمرہ تھا۔ جس میں ایک طرف ایک فولڈنگ بیڈ اور بستر تھا۔ حوالات کی طرح ایک مضبوط سلاخوں والا دروازہ تھا۔ یہ دروازہ ایک چھوٹے برآمدے میں کھلتا تھا۔ کمرے کی چوڑائی سے دونوں اطراف دو اونچی دیواریں برآمدے اور آگے تقریباً 15 فٹ دور تک گئی تھیں۔ جہاں سامنے کی ایک دیوار دونوں طرف سے ان سے ملی ہوئی تھی۔ دائیں جانب کی دیوار میں ایک لوہے کا دروازہ تھا۔ میں ابھی اچھی طرح سے ان دیواروں اور کمرے کو دیکھ بھی نہ پایا تھا کہ چاروں گارڈز سلاخوں والے دروازے کو لاک کر کے دیوار والے دروازے سے باہر چلے گئے اور اسے بھی باہر سے بند کرنے اور تالا لگانے کی میں نے آواز سنی۔ کمرے کی چھت میں ایک بلب لگا ہوا تھا۔ جس کا سوئچ کمرے میں نہیں تھا۔ کمرے میں ایک طرف بغیر دروازے کا ایک ٹوائلٹ کمرے کے باہر کی جانب بنا ہوا تھا۔ جس میں دیسی طرز کا فلش، لوٹا اور ایک ٹونٹی پانی کی تھی۔ ٹوائلٹ میں کوئی کھڑکی یا روشندان نہ تھا۔ کمرے میں ایک جانب ایک پانی سے بھرا مٹکا اور پلاسٹک کا گلاس تھا۔ پلنگ کے بالمقابل فرش میں جڑی لوہے کی ایک ٹیبل اور دیوار میں جڑی زنجیر سے بندھی لوہے کی ایک کرسی تھی۔ جسے بمشکل چند انچ چاروں جانب سرکایا جا سکتا تھا۔ چھت پر لگا بلب کمرے کے آخری کونے میں تھا اور ایک چھت کا پنکھا کمرے کے درمیان میں بہت اونچا چھت سے چھوتا ہوا لگا تھا۔ جسے بیڈ یا ٹیبل پر چڑھ کر بھی چھوا نہ جا سکتا تھا اس پنکھے کا سوئچ بھی کمرے میں نہ تھا۔ چار دیواری کی دیواریں اتنی بلند تھیں کہ باہر کی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی تھی۔ برآمدے کی وجہ سے جب تک فرش پر انتہائی جھک کر نہ دیکھا جائے۔ آسمان بھی نظر نہ آتا تھا۔ یہ تھی میری VVIP رہائش گاہ جو ''تعاون'' کیلئے رضامند ہونے کے باعث مجھے دی گئی تھی۔ میں بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ دو گھنٹے گزرے ہوں گے کہ میرے لئے کھانا آ گیا۔ کھانا لانے والے کے ساتھ دو رائفل بردار گارڈز تھے۔ کمرے کا دروازہ کھولتے وقت دونوں نے رائفلیں میری طرف تان لیں، کھانا میز پر رکھ کر وہ واپس چلے گئے۔ کھانے میں تین چپاتیاں اور دال تھی۔ یہ دوپہر کا کھانا تھا۔ روشنی سے میں نے اندازہ کیا کہ دن کے بارہ یا ایک بجے ہوں گے۔ دھوپ کی تمازت سے یہ کمرہ آگ ہو رہا تھا اور پنکھے کی ہوا اس میں اضافہ کر رہی تھی۔ میں صرف ایک ہی بات سوچ رہا تھا کہ میں نے تفتیش کے دوران جو کچھ کہا تھا، اس پر کتنا عرصہ قائم رہ سکوں گا۔ چائے کے کاروبار اور بمبئی میں سکونت کی جو Cover story پاکستان سے روانگی سے قبل میرے سینئرز نے میرے لئے تیار کی تھی وہ عام حالات اور محض شک کی بنا پر پوچھ گچھ کیلئے ہی موزوں تھی لیکن اپنے ہی آدمی (کوریئر) کی غداری کی وجہ سے گرفتار ہونے کی صورت میں میرے پاس اپنے بچاؤ یا Cover کا کوئی راستہ نہ تھا۔

یہاں پر میں واقعات کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لئے دو تین باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں جن کا علم مجھے بہت بعد میں یا پھر پاکستان واپس پہنچنے پر ہوا۔

کوریئر کی غداری پر میرا یقین محض شک کی بنیاد پر نہ تھا۔ جوس کی دکان پر ملنے کے دن اور وقت کا صرف مجھے اور کوریئر کو ہی علم تھا۔ مقررہ وقت پر میرے وہاں پہنچتے ہی چاروں اطراف سے مجھ پر DMI کے آدمی اس طرح ٹوٹ پڑے جیسے انہیں میرے متعلق مکمل طور پر پہلے ہی بریف کیا جا چکا ہو۔ ہنومان گڑھ کے راستے سے آنے والا کوریئر مجھے ملنے کے دن سے دو رات قبل بارڈر کراس کرتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ بارڈر کراس کرنے کے بعد فوری طور پر اسے بھارتی بارڈر سیکورٹی فورس نے گرفتار کر لیا ہو اور تفتیش اور تشدد کو برداشت نہ کرتے ہوئے اس نے میرے متعلق سب کچھ اگل دیا ہو۔ پاکستان واپس پہنچنے پر مجھے بتایا گیا کہ کوریئر کو ایسی صورت درپیش آنے پر یہ بتانے کی ہدایت کی گئی تھی کہ وہ دہلی میں کسی بھی جگہ کا نام بتا دے جہاں پر مقررہ وقت پر اسے ڈاک کا پیکٹ رکھ دینا اور پاکستان جانے والی ڈاک کا پیکٹ اٹھانا ہوتا تھا۔ پیکٹ وصول کرنے والے کو اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اگر اسے ایسی ہی صورت پیش آئی تھی تو اس نے دی گئی ہدایت کو نظر انداز کر کے پٹر پٹر سب کچھ بتا دیا تھا۔ پاکستان واپسی پر مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ وہ اپنی روانگی سے آٹھ دس روز بعد واپس آیا اور سینئرز کو یہ بتایا کہ ڈاک کا پیکٹ اس نے مجھے دے دیا تھا لیکن میں نے اسے ڈاک نہیں دی اور کہا کہ اگلی بار ملنے پر اسے پاکستان جانے والی ڈاک دی جائے گی۔ حالانکہ مجھے حکم تھا کہ بے شک کوئی ڈاک نہ ہو تو بھی پیکٹ ضرور بھیج دیا جائے کیونکہ پیکٹ کے اندر خصوصی طور پر تیار کردہ ایک واٹر پروف پیکٹ ہوتا تھا۔ کوریئر کو چونکہ بھارتی بارڈر میں بنی B.R.B قسم کی نہر کو تیر کر عبور کرنا ہوتا تھا اس لئے یہ خصوصی واٹر پروف پیکٹ تیار کئے گئے تھے جنہیں پاکستان بھیجنا لازمی تھا۔ میرے ساتھیوں نے میری گرفتاری کے اگلے روز ہی میری گرفتاری اور جوڑ و کراٹے والے ساتھی کے جمعے کے روز پاکستان بھیجے جانے والی ڈاک کے بچ جانے کی خبر پاکستان ٹرانسمیٹ کر دی تھی۔ لہٰذا کوریئر کو پاکستان میں داخل ہوتے ہی گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے تین چار روز اپنے بچاؤ کیلئے ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد ہتھیار ڈال دیئے اور بتایا کہ اسے ہنومان گڑھ اسٹیشن پر گرفتار کیا گیا تھا۔ تشدد برداشت نہ کرتے ہوئے اس نے گھبراہٹ میں سب کچھ بتا دیا تھا لیکن اس بات کا وہ کوئی جواب نہ دے سکا کہ وہ بھارتی حراست سے کیونکر نکلا، پاکستان آ کر اس نے اپنی گرفتاری کو کیوں چھپایا اور آئندہ ڈاک لے جانے کیلئے دن کا تعین کیوں کیا۔ اس کا مطلب ظاہر تھا کہ وہ Defector (غدار) ہے۔ ہماری قومی بدقسمتی ہے کہ آزادی کے حصول کے بعد بھی ہم نے اپنی رہبری کیلئے مغربی ممالک کو ہی اپنا قبلہ جانا۔ میں یہاں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ محکمہ جاسوسی کی ''اعلیٰ'' تربیت کے حصول کیلئے پاکستان اور بھارت دونوں ممالک کے افسران اسکاٹ لینڈ میں بھیجے جاتے تھے اور اکثر ایسا ہوا کہ بھارتی اور پاکستانی زیر تربیت افسران اکٹھے ایک ہی کلاس میں یہ تربیت حاصل کرتے۔ سائنائیڈ بھری داڑھ انتہائی تشدد کو نہ برداشت کر سکنے کی صورت میں چبا لینے کی تربیت دونوں ممالک نے اسکاٹ لینڈ یارڈ سے ہی پائی تھی اور دونوں ممالک اس آخری اقدام سے بخوبی واقف تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میری گرفتاری کے بعد سیل (Cell) میں تلاشی کے بعد سب سے پہلے میری داڑھوں کو پرکھا گیا اور سائنائیڈ بھری داڑھ نکال دی گئی۔ اب میرے پاس ماسوائے تشدد کی انتہا سے مرنے کے کوئی چارہ کار نہ تھا۔

غازی

میں نے حالات کا تجزیہ کیا اور اپنے تجزیئے کی روشنی میں کچھ فیصلے کئے۔ اس کٹھن گھڑی میں اللہ پاک سے التجا کی کہ مجھے اپنے فیصلوں پر قائم رہنے کی ہمت اور طاقت عطا کرے۔ میرا فیصلہ یہ تھا کہ اپنے ابتدائی بیان پر آخر دم تک قائم رہوں گا۔ کسی بھی حالت میں اپنے ساتھیوں لڑکوں اور ہمدردوں کے نام انہیں ہرگز ہرگز نہ بتاؤں گا۔ نہ ہی بھارت میں سرانجام دیئے گئے مشنوں کے متعلق کچھ بتاؤں گا اور نہ ہی ان سے اپنا تعلق ظاہر کروں گا۔ میں نے ابتدائی تفتیش میں اپنا صحیح نام اور اپنی ماضی کی ملازمت کے متعلق صحیح جواب اس لئے دیئے تھے کہ جنیوا کنونشن کے تحت صرف باوردی دشمن کو جو برائے نام تحفظات ملتے تھے وہ بے وردی گرفتار شدگان پر لاگو نہیں ہوتے تھے اور نہ ہی کوئی ملک اپنے بے وردی جاسوسوں کی گرفتاری کے بعد انہیں OWN کرتا ہے بلکہ وہ گرفتار شدگان سے قطعی لاتعلقی ظاہر کرتے ہیں۔ صرف ایک موہوم سی امید ہوتی ہے کہ اگر نام پتہ وغیرہ صحیح دے دیا جائے تو پھر کسی تیسرے ملک کے توسط سے دونوں ملک ایسے قیدیوں کا تبادلہ کرتے ہیں۔ یہ امید محض دل کو بہلانے کیلئے ہے۔ ورنہ ایسے قیدیوں کی گرفتاری کی نہ تو تشہیر کی جاتی ہے اور نہ ہی انہیں زندہ یا اس قابل چھوڑا جاتا ہے کہ ان کا تبادلہ کیا جا سکے۔ سپر طاقتوں کا معاملہ دوسرا ہے۔ 65ء کی انڈو پاک جنگ کے دوران کراچی میں ایک حملہ آور جہاز ہٹ (HIT) کیا گیا۔ جسے دو روسی پائلٹ اڑا رہے تھے۔ دونوں پائلٹ پیراشوٹ کے ذریعے بحفاظت اتر آئے۔ انہیں گرفتار کر لیا گیا اور ریڈیو پر ان کی گرفتاری کی خبر بھی نشر کی گئی لیکن چوبیس گھنٹوں کے اندر ہی روسی سفارت خانہ انہیں سفارتی دباؤ سے چھڑوا کر لے گیا۔ 71ء کی جنگ کے دوران بھی انتہائی مستند ذرائع نے تصدیق کی تھی کہ روس کی بھارت کو دی ہوئی میزائل بوٹس کا عملہ روسی تھا۔ ان میزائل بوٹس نے ہی ہمارے بحری جنگی جہاز خیبر کو نشانہ بنایا تھا۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس وقت کی سپر پاور روس سے ہم احتجاج تک نہ کر سکے۔

میرے فیصلے کا لب لباب یہ تھا کہ جب سر پر آن پڑی ہے تو پوری ہمت اور حوصلے سے اپنے ابتدائی مؤقف پر قائم رہنا ہے۔ اور تفتیش کاروں کو الجھانے اور ان کو ان کے ملک کی ہی وہ معلومات دے کر جو پاکستان کو ہمارے بھارت میں داخلے سے پہلے ہی مل کر اب OUT DATED ہو چکی تھیں، ان کی تفتیش کے رخ کو موڑنے (DIVERT) کی کوشش کرنی ہے۔ تفتیش کرنے والے بھی آخر انسان اور خطاؤں سے مبرا نہ تھے۔ میں چاہتا تھا کہ نفسیاتی طور پر انہیں زیر کرنے کی کوشش کروں۔ اس کی مثال میں چند فقروں میں پیش کرتا ہوں۔ اگر کوئی اجنبی شخص آپ کے گھر میں گھس آئے آپ اسے پکڑ لیں اور گھر میں بلا اجازت داخل ہونے کی وجہ دریافت کریں اور جواب میں وہ آپ کو بتائے کہ آپ کے گھر میں تجوری (SAFE) کس کمرے میں کس الماری کے پیچھے پوشیدہ ہے۔ صندوقوں میں بند قیمتی اشیا کی تفصیل اور تالوں کی چابیاں کہاں رکھی ہیں اور آپ کے کتنے بچے ہیں اور کن کن اوقات میں کن کن اسکولوں میں جاتے ہیں۔ تو آپ یقیناً اس شخص سے پوچھ گچھ کو پس پشت ڈال کر اپنے گھر، اپنی قیمتی اشیا اور اپنے بچوں کے تحفظ کے متعلق سوچنے لگ جائیں گے اور اس اجنبی شخص سے یہ جاننا چاہیں گے کہ اسے آپ کے گھر اور افراد خانہ کے متعلق اور کن کن باتوں کا علم ہے۔ آپ کو اپنے اب تک کئے تمام حفاظتی اقدام بے کار اور بے معنی دکھائی دیں گے اور آپ کی توجہ نئے حفاظتی اقدام اور قیمتی اشیا کی جگہوں کی تبدیلی کی طرف مبذول ہو جائے گی۔ دو سال سے زیادہ عرصہ پہلے پاکستان میں دوران تربیت ہمیں پاکستانی افواج کے متعلق تو کچھ نہیں بتایا گیا تھا لیکن بھارتی افواج کے متعلق بھرپور اور مفصل تفصیلات بتائی گئی تھیں۔ میرے پروگرام میں تھا کہ میں تفتیش کے دوران یہ OUT-DATED معلومات آہستہ آہستہ تفتیش کرنے والوں کو بتاؤں گا اور ان کی توجہ ان کی اپنی دفاعی افواج، ان کے دفاعی پروگرام اور فوجوں کی DEPLOYMENT کا پاکستان کو علم ہونے کی طرف پھیر دوں گا۔ اس طرح میں تھرڈ ڈگری ٹارچر سے بھی بچ جاؤں گا اور ''تعاون'' کی پیشکش کے پیش نظر وہ شاید مجھے اپنے کسی CONTACT کو پکڑوانے کے لئے بغیر ہتھکڑی کے شہر میں بھی لے جائیں جہاں سے میں فرار کی کوشش کروں گا اور شاید کامیاب بھی ہو جاؤں۔ میں صرف تشدد سے پہلے فرار کی کوشش کرنا چاہتا تھا۔ ورنہ تشدد کے بعد تو میری جسمانی حالت ہی ایسی ہو جاتی تھی کہ بغیر نگرانوں کے وہ مجھے اگر دہلی کی کسی سڑک پر چھوڑ دیتے تو میں اسے کر اس بھی نہ کر سکتا۔ میں نے ذہنی طور پر خود کو تشدد برداشت کرنے اور زبان نہ کھولنے کے لئے بھی تیار کر لیا تھا۔ اس تیاری میں اپنے وطن اور اس کی مٹی سے محبت کے علاوہ میرے افراد خانہ اور خصوصاً اس وقت میرے اکلوتے بیٹے (جو میری روانگی کے وقت ایک سال کا بھی نہ تھا) کیلئے باپ کے نام کے ساتھ غدار کے شرمناک اضافے کے بجائے شہید کا باعث صد احترام لفظ چھوڑنے کی خواہش بھی تھی۔

وہ دن بھی یونہی گزر گیا۔ رات ساتھ آٹھ بجے کے قریب تین چپاتیوں اور دال پر مشتمل کھانا بھی آ گیا۔ کھانے کے بعد میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ آدھی رات کے قریب میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر مجھے اس سیل (CELL) سے نکالا گیا۔ مجھے کچھ علم نہ تھا کہ کتنے آدمی میرے ہمراہ تھے۔ CELL میں تو صرف دو داخل ہوئے تھے جنہوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھی تھی۔ قدموں کی چاپ سے اندازہ ہوتا تھا کہ چھ سات بندے تھے جن میں دو افراد کے جوتوں کی آواز فوجی بوٹوں کی تھی۔ مجھے تقریباً ڈیڑھ سو قدم چلایا گیا۔ چلنے کے دوران دو مرتبہ مجھے روک کر تین چار مرتبہ لٹو کی طرح گھمایا گیا۔ یہ عمل یقیناً مجھے سمت اور فاصلے کا تعین نہ کر سکنے کیلئے کیا گیا تھا۔ بالآخر مجھے ایک سیڑھی چڑھ کر روک دیا گیا۔ دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے ایک کرسی پر لے جا کر بٹھا دیا گیا اور آنکھوں سے پٹی ہٹا دی گئی۔ اب میرے سامنے ابتدائی تفتیشی ٹیم کے علاوہ ایک اور شخص بھی بیٹھا تھا اور ٹیبل کے دائیں جانب بھی ایک شخص بیٹھا تھا۔ میز پر اسپول (SPOOL) والا ٹیپ ریکارڈ پڑا تھا جس کا مائیک ٹیبل کے درمیان رکھا تھا۔ دائیں جانب بیٹھے شخص کے ہاتھ میں قلم اور سفید کاغذ دھرے تھے۔ چند منٹ کی خاموشی کے بعد سامنے بیٹھے نئے شخص نے مجھے کرخت لہجے میں مخاطب کیا اور کہا کہ تم نے میری ٹیم کو جو بیان دیا ہے وہ محض بکواس ہے۔ یہ ان کی غلطی تھی کہ تمہیں اسی وقت اپنی حقیقت اگلنے پر مجبور نہیں کیا۔ ہم دشمن کے جاسوسوں کی نازبرداریاں نہیں کرتے اور نہ اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ اپنی مرضی سے جب چاہیں، ہمیں جھوٹی سچی کہانی سنا دیں اور ہم اس پر یقین کر لیں۔ اب اپنے دماغ میں میری یہ بات اچھی طرح سے بٹھا لو کہ ہم صرف سچ سننا چاہتے ہیں اور اس بات کا فیصلہ میں کروں گا کہ تم سچ بول رہے ہو یا جھوٹ۔ اگر مجھے ذرا سا بھی شک پڑا کہ تم غلط بیانی سے کام لے رہے ہو تو اسی لمحے تمہیں جھوٹ بولنے کی سزا ملے گی۔ یہ سزا ہماری شرافت کی لائن کے خاتمے کے ساتھ ہی جڑی ہوئی ہے اور تمہیں صرف ذہن نشین کرانے کے لئے ہے کہ تمہارے سامنے احمق نہیں بیٹھے ہیں جنہیں تم بے وقوف بنا سکو۔ (NEVER THINK THAT YOU ARE SITTING INFRONT OF JUGGLERS AND CAN BEFOOL THEM) وہ چپ ہوا تو میں نے کہا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے جو کچھ پہلے بتایا ہے اور جو کچھ اب بتاؤں گا وہ بالکل سچ ہوگا۔ میری گرفتاری سے لے کر اب تک مجھے سوچنے کا خاصا موقع ملا ہے اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ آپ کی ٹیم کے ایک رکن نے مجھے کہا تھا کہ YOUR GAME IS OVER اور یہی حقیقت ہے اب میری اسی میں بھلائی ہے کہ میں آپ سے مکمل تعاون کروں۔ میری بات ختم ہونے پر اسی شخص نے ٹیپ ریکارڈر والے شخص کو اشارہ کیا۔ اس نے ریکارڈر آن کیا۔ اب تک مجھ سے مخاطب شخص نے جو یقیناً اس ٹیم کا لیڈر تھا مجھے کہا NOW START FROM THE BEGINING (اب ابتدا سے شروع ہو جاؤ) میں نے وہی باتیں دہرانی شروع کر دیں جو ٹیم کے ممبران کو پہلے بتا چکا تھا۔ جب میں نے یہ کہا کہ مجھے بھارت میں سروے کیلئے بھیجا گیا تھا تو لیڈر نے میری بات کاٹی اور کہا کہ تم دو سال سے زیادہ عرصے تک اس ملک میں صرف سروے کرتے رہے ہو۔ میرے ہاں کہنے پر لیڈر نے ہاتھ اٹھا کر دو انگلیوں سے اشارہ کیا اور فوراً ہی میرے سر پر دو بار انتہائی زوردار ضرب ماری گئی۔ مجھے ایسا لگا کہ میرا دماغ پھٹنے لگا ہے۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا تو ایک لحیم شحیم شخص ہاتھ میں لمبا چوڑا چمڑے کا تلہ لئے کھڑا تھا بالکل ویسا ہی جیسے پولیس والے جرم اگلوانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ لیڈر نے کہا ''اب بتاؤ کس لئے آئے تھے''۔ میں نے پھر کہا سروے کے لئے لیڈر کے اشارے پر پھر میرے سر کو دوبارہ تختہ مشق بنایا گیا۔ پھر وہی سوال پوچھا گیا۔ میں نے پھر وہی جواب دیا اور پھر وہی میرے سر کی درگت بنی۔ میں نے بھی تہیہ کیا ہوا تھا کہ چاہے مار مار کر یہ میرے سر کو توڑ دیں میں اپنا بیان ہرگز نہ بدلوں گا ایسی ذلت اور اذیت سے میرا زندگی میں کبھی پالا نہ پڑا تھا۔ مجھ پر TORTURE کا آغاز ہو چکا تھا اور میرے عزم میں مزید پختگی آ چکی تھی۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ دس گیارہ بار اس کے پوچھنے پر میں نے وہی جواب دیا اور ہر بار وہی سزا پائی۔ اس کے بعد میری آنکھوں میں دھند چھانے لگی۔ میرا دماغ بے جان ہو رہا تھا کچھ دیر میرے سر پر مسلسل ضرب پاشی کی گئی۔ سر پر مسلسل چوٹیں لگنے کا احساس کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گیا۔ میں شاید بے ہوش ہو چکا تھا۔

جب مجھے ہوش آیا تو سورج خاصا بلند ہو چکا تھا۔ آنکھوں کی دھند آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی میں اسی سیل میں بیڈ پر پڑا تھا۔ میرا دماغ بالکل کام نہیں کر رہا تھا۔ میں نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی تو میرے منہ سے کراہ نکلی۔ میں بیڈ سے اٹھ نہ سکا۔ ابھی تک مجھے کچھ یاد نہ آیا تھا کہ میرے ساتھ کیا بیتی۔ میرے کانوں سے شائیں شائیں کی مسلسل آواز آ رہی تھی۔ رفتہ رفتہ دماغ کی دھند چھٹنے لگی۔ مجھے رات کا واقعہ یاد آنے لگا۔ میں نے سر پر ہاتھ پھیرنا چاہا تو درد سے میری چیخ نکل گئی۔ سر پر درمیان میں دو تین جگہ بڑے بڑے گومڑ پڑ چکے تھے جن سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ چہرے پر ہاتھ پھیرا تو جمے ہوئے خون سے ہاتھ لتھڑ گئے۔ چہرے پر کوئی زخم نہ تھا۔ یہ خون یقیناً نکسیر پھوٹنے سے نکلا تھا۔ جب تک میں ہوش میں تھا تو نکسیر نہ پھوٹی تھی۔ یقیناً میرے بے ہوش ہونے کے بعد بھی میرے سر پر ضربات پہنچائی گئی تھیں۔ میرے جسم کا انگ انگ دکھ رہا تھا۔ میں نے اپنے جسم پر ہاتھ پھیرا تو محسوس ہوا کہ ٹانگوں، رانوں، بازوؤں اور پیٹھ پر متعدد ایسی جگہیں تھیں۔ جنہیں چھونے سے بھی درد کی شدید لہریں اٹھتی تھیں۔ یقیناً میری بے ہوشی کے بعد میرے جسم کو بھی تختہ مشق بنایا گیا تھا۔ بڑی مشکل سے ذرا ذرا کھسک کر میں پانی کے مٹکے تک پہنچا اور پانی سے چہرے گردن اور ہاتھوں پر لگے خون کو صاف کیا اور مٹکے کے نیم گرم پانی سے پیاس بجھائی اور پھر بیڈ پر دراز ہو گیا۔ چوٹیں ٹھنڈی ہونے کی وجہ سے زیادہ درد کر رہی تھیں۔ میری عمر 74ء میں 38 سال کے قریب تھی اور میں جوانی کے اس دور سے بہت زیادہ آگے نکل چکا تھا جس میں درد کا احساس نسبتاً کم ہوتا ہے۔ میں نیم غنودگی کی حالت میں بیڈ پر پڑا تھا۔ نہ معلوم کس وقت کھانا آیا جو میں نے نہ کھایا۔ میں اسی حالت میں تھا کہ غروب آفتاب کے قریب کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک لکڑی کی کرسی کمرے میں رکھ دی گئی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ہی ابتدائی تفتیشی ٹیم کا لیڈر کمرے میں آ گیا۔ اس کے ساتھ دو گارڈز تھے۔ اس نے کھانے کے برتن واپس بھیجے اور چائے اور بسکٹ لانے کا کہا۔ مٹکے میں سے پانی نکال کر اس نے مجھے اسپرو کی دو گولیاں کھانے کو دیں اور 8 گولیاں میرے سرہانے رکھ دیں۔ آیوڈیکس کی ڈبیا مجھے دی کہ چوٹوں پر لگا لو۔ چائے آ گئی تو اس نے مجھے چائے بنا کر دی بسکٹ کھانے کو دیئے۔ جب میں چائے پینے لگا تو اس نے سرگوشی میں کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ تمہاری حالت پر ہم مذہب ہونے کی وجہ سے رحم آ رہا ہے۔ میرا تم کو یہی مشورہ ہے کہ مجھے سب کچھ بتا دو۔ میری ترقی ہو جائے گی اور تمہیں یہاں سے فرار کرانے کا میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ یہ کم بخت جلد ہی دل کی بات کہہ کر اپنے ''مسلمان'' ہونے کا اظہار کر بیٹھا۔

یہ جاسوسی کے ملزمان کی تفتیش کا ایک روایتی طریقہ ہے۔ ایک تفتیشی ٹیم تشدد کرتی ہے۔ اور اسی ٹیم کا ایک فرد بعد میں ملزم سے تنہا مل کر اظہار ہمدردی کرتا ہے اور اسے مدد دینے اور فرار کروانے کا وعدہ کرتا ہے۔ جاسوسی کا ملزم یہ بخوبی جانتا ہے کہ اسے نہ تو کبھی کسی عدالت میں پیش کیا جائے گا اور نہ اپنے کسی ہمدرد کے ذریعے کسی وکیل سے ملاقات کا موقع فراہم کیا جائے گا۔ تشدد کا آغاز بہت ہی تکلیف دہ ہوتا ہے۔ بعد میں تو تشدد سہتے سہتے جسم اس کا عادی اور حواس معطل ہونے کے باعث تشدد کی اذیت اور تکلیف کا احساس کم ہو جاتا ہے۔ ہر طرف سے ناامیدی اور کسی قسم کی مدد ملنے سے مایوس ملزم کو جب تفتیشی ٹیم کا کوئی ممبر ہمدردی جتاتا ہے تو ملزم اسے ''امداد غیبی'' اور ڈوبتے کو تنکے کا سہارا سمجھ کر اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر اپنی صحیح اصلیت اپنے تفویض کردہ مشن کے علاوہ مدد حاصل کرنے کے لئے اپنے ہمدردوں اور ساتھیوں کے متعلق سب کچھ اگل دیتا ہے۔ میں یہاں پر یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جو شخص تشدد کے ابتدائی پانچ چھ روز برداشت کر جائے اور زبان نہ کھولے تو پھر انتہائی شدید تشدد سے بھی اس سے زبان کھلوائی نہیں جا سکتی۔ میجر احسن شہید جس کا ذکر پہلے میں کر چکا ہوں میرے جواز کی بہترین مثال ہے۔ تفتیشی ٹیم کے اس ممبر نے جو میرے لئے اسپرو اور آیوڈیکس لے کر آیا تھا اور چائے اور بسکٹ منگوانے کا بھی اہتمام کیا تھا۔ اس پہلی ''ہمدردانہ'' ملاقات میں ہی مجھے فرار کرانے کیلئے اپنا سب سے بڑا کارڈ شو کر بیٹھا۔ اس نے اپنے ''مسلمان'' ہونے اور مجھے راز بتانے کے عوض اپنی ترقی پانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ میں اس کی باتیں نہایت غور سے سنتا رہا اور ساتھ ہی آہستہ آہستہ چائے پی رہا تھا۔ اب مجھے اپنے پتے ترتیب دینے تھے۔ اس نے بات ختم کی تو میں نے کہا۔ ''اس دکھ اور مصیبت کی گھڑی میں ایک ہمدرد مسلمان کا مل جانا میرے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ آپ کی ہمدردی نے مجھ میں گویا نئی روح پھونک دی ہے۔ مجھ سے اب تک تفتیش کے دوران جو کچھ پوچھا گیا، میں نے بتا دیا۔ مجھے اپنی طرف سے تو بولنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ میرے پاس جو معلومات ہیں وہ بھارت کے لئے بہت کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں۔ میں نے تو پہلے ہی روز اپنی گرفتاری کے بعد ہتھیار ڈال دیئے تھے، میری سائینیڈ بھری داڑھ نکل جانے کے بعد آخری امید بھی ختم ہو چکی تھی۔ اسلئے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ آپ سے پورا تعاون کروں گا۔ آپ مسلمان ہیں اور میری مدد کرنا چاہتے ہیں۔ میں، آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ سے نہ صرف انتہائی تعاون کروں گا بلکہ اگر میری بات مانی گئی تو 20 جون کو سبزی منڈی ریلوے اسٹیشن پر ایک پاکستانی CONTACT کو بھی پکڑوا دوں گا بشرطیکہ آپ نے میری گرفتاری کی خبر پریس اور ریڈیو میں نہ دے دی ہو اگر وہ 20 جون کو کسی وجہ سے نہ آ سکا تو پھر 22 جون کو اسی جگہ اور اسی وقت وہ مجھے ملے گا۔ میں تو آپ سے پورا تعاون کرنا چاہتا تھا لیکن میرا جو حشر کیا گیا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری دی ہوئی معلومات اتنی اہم ہوں گی جس سے آپ کی ترقی یقینی امر ہو جائے گی۔

میری باتیں سن کر تو اس کی باچھیں کھل اٹھیں۔ میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''میرے سر پر مسلسل ضربیں لگنے سے میری دماغی حالت ایسی نہیں کہ میں آئندہ چوبیس گھنٹے تک بیان دے سکوں۔ میں آپ کی حراست میں تو ہوں ہی۔ اگر آپ نے مجھے دماغی طور پر سنبھلنے کا وقت دے دیا تو میں آپ کو مایوس نہ کروں گا۔ دوسری صورت میں نہ خدا ہی ملا، نہ وصال صنم ہی ہوا کے مصداق، موت تو مجھے سامنے دکھائی دے رہی ہے۔ میں پھر غداری کا لیبل خود پر کیوں لگواؤں''۔ اس نے میرا ہاتھ دبایا اور بولا ''میری پوری کوشش ہو گی کہ تمہیں 24 گھنٹے آرام کا وقت مل جائے''۔ پھر ذرا قریب ہو کر بولا ''اگر تمہیں نماز پڑھنے والا کپڑا اور قرآن (اس کا تلفظ کران تھا) چاہئے تو میں بھجوائے دیتا ہوں'' میں نے کہا ''یہ تو آپ کی بڑی کرم نوازی ہو گی۔ مجھے سگریٹ اور ماچس بھی چاہئے اگر ممکن ہو تو وہ بھی بھجوا دیئے''۔ وہ سب چیزیں بھیجنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

درد کی شدت کے باوجود مجھے ہنسی آ گئی۔ مجھ سے راز اگلوانے کے لئے اس نے خود کو مسلمان تو ظاہر کیا تھا لیکن اسے لفظ جاءنماز تک کا علم نہ تھا اور قرآن مجید فرقان حمید کو ادب کے الفاظ کے بغیر ''کران'' کہنے والا واقعی DMI کا ہی ''مسلمان'' ہو سکتا تھا۔ میں آئندہ تفتیش کیلئے خود کو تیار کرنے اور اس کی منصوبہ بندی کرنے لگا۔ رات کو خاصے بہتر کھانے کے ساتھ ہی ایک جاءنماز ایک مترجم قرآن مجید اور سگریٹ کے دو پیکٹ اور ماچس مجھے بھیج دیئے گئے۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے وضو کیا اور عشا کی نماز پڑھی۔ میرے جیسے ہی بے عمل مسلمانوں کے متعلق اللہ پاک نے فرمایا ہے ''جب ہم ان کی رسی کو کھینچتے ہیں تو وہ لمبی لمبی دعائیں مانگنا شروع کر دیتے ہیں'' میں نے بھی نماز کے بعد اتنی خشوع و خضوع سے دعائیں مانگیں۔ جتنی زندگی بھر کبھی نہ مانگیں تھیں۔ میری دعاؤں کا لب لباب یہ تھا کہ ''اے پروردگار! میرے گناہ بے حد و شمار ہیں لیکن تیری رحمتیں بے پایاں ہیں۔ تو رحمٰن ہے، رحیم ہے، کریم ہے، عفو و درگزر کرنے والا ہے، غنی ہے، ذوالجلال والاکرام ہے، سمیع ہے، بصیر ہے، غفار ہے، ستار ہے، وکیل ہے، علیم ہے، حلیم ہے، بے حد و حساب صفات کا مالک ہے۔ معاف کرنے والا ہے، ذرہ نواز ہے۔ اپنے حبیب کے صدقے اور اپنے پیاروں کے صدقے مجھ بے کس پر رحم فرما۔ میرے دانستہ اور نادانستہ گناہوں کو معاف کر۔ میری مدد فرما اور مجھ پر اپنا رحم کر، اپنا کرم کر، اپنا فضل کر''۔ یقین جانئے دعائیں مانگنے کے بعد مجھے بڑا سکون ملا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں اکیلا نہیں بلکہ ذات قادر مطلق میرے ساتھ ہے اور میری قسمت کا فیصلہ DMI والے نہیں بلکہ ذات باری تعالیٰ کرے گی۔

غازی

وہ رات میں نے بڑے سکون سے گزاری۔ اگلی صبح ناشتے میں چائے اور پوریاں ملیں۔ ناشتے کے بعد میں نے باوضو ہو کر تلاوت کلام پاک شروع کر دی۔ قرآن پاک اگرچہ مترجم تھا لیکن میں عربی تلاوت کئے جا رہا تھا آج سے دو تین برس قبل ایک مشہور زمانہ عالم دین کا ایک قول پڑھا تھا کہ بائیس برس دین کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد میں نے اللہ کو پہچانا لیکن مجھے یقین ہے کہ اللہ پاک کو مجھ سے زیادہ مقرب وہ ان پڑھ اور عربی سے لابلد گڈریا ہے جو آیات قرآنی کا مطلب سمجھے بغیر انہیں بلک بلک کر اس یقین کے ساتھ پڑھتا ہے کہ وہ سچا کلام ہے۔

دن کا باقی حصہ میں نے آئندہ تفتیش کے دوران اپنے بیان اور ان "معلومات" کو دہراتے ہوئے گزارا جن سے میں نے تفتیش کرنے والوں کو یقین دلانا تھا کہ میں فی الحقیقت ان سے تعاون کر رہا ہوں۔ یہاں میں عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ بھارت کے دفاع کے متعلق میں نے جو معلومات انہیں دیں۔ وہ دو سال اور چند ماہ قبل دوران تربیت مجھے پاکستان میں ازبر کرائی گئی تھیں۔

پاکستان واپسی پر میں نے جب اپنے سینئرز سے پوچھا کہ وہ معلومات دشمن کو دیئے کیا پاکستان کے مفاد میں کسی طرح بھی نقصان دہ تھیں تو انہوں نے پورے وثوق سے کہا کہ ہرگز نہیں کیونکہ وہ OUT DATED تھیں اور ایک طرح سے پاکستان کے مفاد میں تھیں کہ بھارتی افواج کو یہ معلوم ہو جاتا کہ ان کے مختلف ڈویژن، بریگیڈ اور رجمنٹس کے متعلق پاکستان کو کتنا بھرپور علم ہے۔

تقریباً آدھی رات کو گارڈز مجھے لینے آ گئے اور پہلے کی طرح مجھے انٹروگیشن روم میں پہنچا دیا گیا۔ اس دفعہ ٹیم میں وہ مرکزی افسر نہ تھا جس کے حکم پر میرے سر پر تشدد کیا گیا تھا۔ اس بار ٹیم کے ممبر انسبتاً شرافت سے پیش آئے۔ رسمی سی مختصر گفتگو اور مجھے سگریٹ دینے کے بعد ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا گیا۔ اس بار ٹیم کا سربراہ وہی تھا جو گزشتہ شام میرے CELL میں آیا تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ شروع سے اپنے متعلق اور بھارت میں اپنے قیام کے متعلق تفصیلاً بتاؤ۔ میں نے رٹی رٹائی وہی داستان شروع کر دی جو گزشتہ دو بار انہیں سنا چکا تھا۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ گزشتہ دو سال سے تم بھارت میں صرف سروے کرنے پر ہی لگے ہو یا اس کے پس پردہ کوئی اور مقصد بھی ہے، میں نے جواب دیا کہ ان دو سالوں میں مجھے سروے کرنے اور بھارت میں لمبی مدت رہنے کیلئے خود کو ADJUST کرنے کی کوشش کرنے کا کہا گیا تھا۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ لمبی مدت کے لئے بھارت میں تمہارے قیام کرنے کی کیا وجہ تمہیں بتائی گئی تھی، میرا جواب تھا کہ کھل کر تو کچھ نہیں بتایا گیا تھا لیکن ٹریننگ کے دوران بھارتی افواج کے متعلق مجھے جو کچھ بتایا گیا اس کا مطلب واضح تھا کہ اگر میری سروے رپورٹس سے وہ مطمئن ہو گئے تو پھر مجھے بھارتی افواج کی جاسوسی کا کام دیا جائے گا۔ انہوں نے سوال کیا کہ کیا پاکستان میں ایک جاسوس کو ٹریننگ دینے اور اس کی صلاحیتوں کو آزمانے کیلئے کئی سال لگ جاتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے اوروں کے متعلق تو کچھ علم نہیں کیونکہ COMPARTMENTATION پر نہایت سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ جیسے ملٹری میں SHORT SERVICE COMMISSION کے لئے صرف چھ ماہ کی ٹریننگ اور لمبی مدت کے لئے ڈھائی سال کی ٹریننگ ہوتی ہے۔ ویسے ہی میری ٹریننگ اور بھارت میں دو سال سے زیادہ قیام LONG SERVICE کے لئے تھا (س) بھارتی افواج کے متعلق تمہاری کیا معلومات ہیں؟ (ج) بھارت میں قیام کے دوران تو کچھ بھی نہیں لیکن ٹریننگ کے دوران مجھے جو کچھ بتایا گیا تھا وہ بیان کر دیتا ہوں۔ میں نے یادداشت پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کی ایکٹنگ کرتے ہوئے بھارتی فوج کے 5 انفنٹری ڈویژنوں کے نشان، ان کے بریگیڈز کے نمبر اور کون کون سی رجمنٹس پر یہ بریگیڈز مشتمل تھے اور ان کے شناختی نشان بتانے شروع کئے۔ اگرچہ روشنی مدھم تھی لیکن میں صاف دیکھ رہا تھا کہ تفتیشی ٹیم بے اختیار منہ کھولے خاموشی سے میری بات نہایت غور سے سن رہی تھی۔ پنکھوں کی اور میری آواز کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ THERE WAS PINDROP SILENCE میں بھارتی تفتیشی ٹیم کے آگے بھارت ہی کے OUT DATED راز کھول رہا تھا اور ہر بھارتی ڈویژن کی بات کہتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ایک ایک کر کے ان کے کپڑے اترتے جا رہے تھے، میں نے تقریباً دو گھنٹے انفنٹری کے صرف 5 ڈویژنوں کے متعلق بتانے کے بعد اپنا سر پکڑ لیا، اور ٹیم کے سربراہ کو کہا کہ سر پر چوٹوں کی وجہ سے اب سر درد سے پھٹنے لگا ہے۔ ممبران نے آپس میں کھسر پھسر کی اور سربراہ بولا، کوئی بات نہیں۔ ہم تفتیش کل رات تک ملتوی کر دیتے ہیں۔ امید ہے کل بھی تم آج کی طرح ہی تعاون کا مظاہرہ کرو گے یہ کہہ کر اس نے گھنٹی بجائی گارڈز اندر آ گئے۔ اس بار اس "تعاون" کے صلے میں تفتیشی ٹیم کے تینوں ممبران نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور گارڈز کو مجھے واپس CELL میں لے جانے کا حکم دیا۔

Cell میں بستر پر لیٹے ہوئے میں یہ سوچنے لگا کہ دو سال سے زیادہ پرانی معلومات بیان کرنے پر ان کا جو ردعمل ہوا ہے اگر وہی ردعمل بھارتی افواج کے سربراہ کا ہو تو وہ تو اپنی ساری فوج کی پوزیشن تبدیل کرنے کا سوچنے لگ جائے گا اور اگر ایسا ہو جائے تو پاکستان کے حق میں بہتر ہو گا کیونکہ جب ایک جگہ Deployed فوج یا اس کا کچھ دفعہ Move کرتا ہے تو FIU والے بھی جن کی دشمن کے علاقے میں صرف پندرہ بیس میل کی رینج ہوتی ہے، وہ بھی سب کچھ معلوم کر لیتے ہیں جبکہ دشمن کے علاقے میں انتہائی اندر جا کر جاسوسی کرنے والوں کے لئے تو یہ بچوں کا کھیل ہوتا ہے جب کہ ایک جگہ پر Deployed فوج کے متعلق چھان بین زیادہ مشکل ہوتی ہے۔ میں نے آج کی تفتیش خیریت سے ہو جانے پر شکرانے کے نفل ادا کئے۔ رات کا باقی حصہ سوتے جاگتے اور آئندہ شب کو تفتیش کا سامنا کرنے کی تیاری میں گزر گیا۔ آپ یقین جانیئے کہ گرفتاری کے بعد مجھے اپنے اہل خانہ کے ہیولے بیسیوں بار تیزی سے آنکھوں کے سامنے گزرتے دکھائی دیئے لیکن میں نے ان کے خیال کو ہر بار جھٹک دیا۔ انسان کی سب سے بڑی کمزوری اور اسکے پائے استقلال میں لرزش پیدا کرنے والے اس کے اہل خانہ اور ان کی یاد ہوتی ہے۔ اور میں قطعاً نہیں چاہتا تھا کہ ایسی صورت حال میرے ساتھ بھی پیش آئے۔

انہی خیالوں میں رات کا بقیہ حصہ گزرا۔ اگلا دن کچھ وقت سوتے اور کچھ وقت آنے والی رات کی تیاری میں گزر گیا۔ میں جانتا تھا کہ ٹائم گین Time Gain کیلئے تفتیشی ٹیم کو جو معلومات دے رہا ہوں، ان کا جب تجزیہ کیا جائے گا تو تفتیشی ٹیم کی کارکردگی محض صفر ہو گی، کیونکہ وہ اپنی ہی فوج کے متعلق باتیں سننا نہیں چاہتے تھے اور وہ بھی اتنی پرانی بہر حال میں نے جو Stand لیا تھا مجھے توقع تھی کہ مجھے مزید چند روز ان کے تشدد سے بچنے کا موقع مل جائے گا۔ آدھی رات کو پھر مجھے تفتیشی کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ کل والی تفتیشی ٹیم وہاں موجود تھی۔ سوالات کا سلسلہ شروع ہوا تو میں نے کہا کہ مجھے جو کچھ دوران تربیت بتایا گیا تھا اس کے مطابق بھارت کا فسٹ آرمڈ ڈویژن جھانسی کے قریب Stationed ہے۔ اس آرمڈ ڈویژن کے علاوہ نمبر 10 انڈیپینڈینٹ آرمرڈ بریگیڈ Indepenant Armoured Brigade جو بذات خود ایک ڈویژن کے برابر ہے اس میں اوسی PT76 اور فرانسیسی AMX-13 ٹینک ہیں جنہیں آپ نے 71ء کی جنگ میں مشرقی پاکستان میں استعمال کیا تھا اور سقوط ڈھاکہ کے بعد انہیں آپ فاضلکا سیکٹر میں لے آئے ہیں۔ لاہور سیکٹر میں آپ نے Sikh light infantary کی رجمنٹس اور پنجاب رجمنٹس کو Deploy رکھا ہے۔ آپ کا 39 Mountain DIV جس کا ہیڈ کوارٹر پونا میں ہے اسے جموں کے نزدیک Move کر دیا ہے۔ جھانسی کے قلعے میں آپ کا بہت بڑا ایمونیشن ڈپو ہے۔ میں خاموش ہوا تو انہوں نے سوال کیا کہ ایئر فورس اور نیوی کے متعلق کیا جانتے ہو۔ میں نے کہا کہ آپ کے ایئر کرافٹ کیریر وکرانت پر Harrier اور کینبرا جہاز ہیں۔ 65ء کی جنگ کے دوران پاکستانی آبدوز غازی نے آپ کے ایک فریگیٹ بیاس کو ڈبو دیا تھا اور آپ نے اپنے ایک دوسرے فریگیٹ پر بیاس نام لکھ کر نیشنل اور انٹرنیشنل پریس کو اس نئے بیاس فریگیٹ پر عصرانہ دیا اور یوں پاکستانی دعوے کو جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کی۔ میں نے انہیں کہا کہ آپ کو یقیناً میری باتیں تلخ لگی ہوں گی لیکن آپ نے مجھے کہا کہ جو کچھ بھی میرے علم میں ہے آپ کو بتا دوں اس لئے میں نے یہ باتیں آپ کے سامنے بیان کی ہیں۔ میں نے تقریباً تین گھنٹے ان کے سوالات کے جوابات دیئے وہ مجھ سے بار بار پاکستانی دفاعی افواج کے متعلق سوالات کرتے تھے اور ہر بار میرا ایک ہی جواب ہوتا تھا کہ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ آپ کے جو ایجنٹ پاکستان بھیجے جاتے ہیں انہیں آپ بھارتی افواج کے متعلق کوئی معلومات Feed نہیں کرتے۔ بعینہ اسی طرح پاکستانی افواج کے متعلق میری معلومات صفر ہیں میں نے انہیں کہا کہ ایک پاکستانی ایجنٹ کا دہلی میں مجھ سے رابطہ ہے۔ مجھے یہ بالکل علم نہیں کہ اسے کیا مشن سونپا گیا ہے ہمیں ایک دوسرے سے بات کرنے کی بھی اجازت نہیں اور نہ ہی مجھے اس کے ٹھکانے کا علم ہے۔ میرا کام صرف یہ ہے کہ پاکستانی کوریئر جو ڈاک لاتا ہے اس میں سے اس کی ڈاک اور اس کیلئے بھیجے گئے پیسے اسے دے دوں۔ 20 جون کو دن کے ٹھیک دس بجے مجھے سبزی منڈی ریلوے اسٹیشن پر اسے ملنا ہے اور اگر کوریئر پیسے لایا تھا تو اس کی ڈاک کے علاوہ 5 ہزار روپے بھی دینے ہیں۔ اگر 20 جون کو صبح 10 سے ساڑھے دس کے درمیان وہ مجھے کسی وجہ سے نہ ملا تو پھر 22 جون کو اسی وقت اور اسی جگہ مجھے اسے ملنا ہے۔ اگر آپ مجھے 20 جون کو سبزی منڈی اسٹیشن پر لے چلیں تو میں اسے پکڑوا سکتا ہوں۔ ممکن ہے ان کا کوئی گروپ ہو۔ اس کے ذریعے آپ اس گروپ تک پہنچ سکتے ہیں۔ میں نے انہیں یہ بھی کہا کہ گرمی اور خون جمنے کی وجہ سے میرے کپڑوں سے بدبو آ رہی ہے۔ اگر آپ مہربانی کریں تو میرے ناپ کی ایک قمیص اور پاجامہ مجھے دیں۔ اس کے بعد میں نے یہ پیش کش کی کہ اس کے علاوہ اگر آپ 20 جون کو اس آدمی کو پکڑنا چاہتے ہیں تو میرے پہنے ہوئے کپڑوں کو دھلوا کر پریس کروا دیں اور اگر ڈاک میں پاکستان سے رقم بھیجی گئی تھی تو 20 جون کو 5 ہزار روپے بھی مجھے دیں تاکہ میں رقم دینے کے بہانے چند منٹ کے لئے اسے روک لوں اس دوران آپ اسے گرفتار کر لیں۔ چونکہ رقم آپ اس سے برآمد کریں گے اس لئے اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہو گا کہ وہ اپنے پاکستانی ہونے اور یہاں اپنے قیام کا مقصد آپ کو بتا دے۔ میری گواہی اور اسے "راہ راست" پر لانے کی میری کوشش بھی آپ کے کام کو آسان بنا دے گی۔ میں نے بات ختم کی تو انہوں نے کہا کہ وہ مشورہ کر کے مجھے کل بتائیں گے۔ جب وہ اٹھنے لگے تو میں نے کہا کہ ایک بات آپ کو بتانا میں بھول گیا تھا اگر 20 جون کو آپ کا مجھے لے جانے کا پروگرام ہو تو ایک سبز رومال بھی مجھے دیجیئے گا۔ جسے میں دائیں کلائی پر باندھ لوں گا۔ یہ میرا اور اس آدمی کا "سب ٹھیک ہے" کا سگنل ہے۔ خطرے کی صورت میں سرخ رومال استعمال کیا جاتا ہے۔ میری سب باتیں انہوں نے بڑے تحمل سے سنیں اور مجھے واپس سیل میں بھیج دیا گیا۔

سبزی منڈی ریلوے اسٹیشن پر نہ تو مجھے کسی Contact سے ملنا تھا اور نہ مجھے اس فرضی Contact کو 5 ہزار روپے دینے تھے۔ یہ سب پلان میں نے اپنے فرار ہونے کی کوشش کرنے کیلئے بنایا تھا۔ جن قارئین نے دہلی کا سبزی منڈی اسٹیشن دیکھا ہے۔ انہیں بخوبی علم ہو گا کہ گھنٹہ چوک سے اسٹیشن کی طرف جو سڑک جاتی ہے اس پر ایک پرانا سینما ہاؤس بھی ہے۔ پلیٹ فارم کے باہر ریلوے اسٹاف کے کوارٹر اور رکشہ ٹیکسی اسٹینڈ بھی ہے۔ پلیٹ فارم میں داخل ہو جائیں تو دائیں طرف اسٹیشن ماسٹر کا دفتر اور ویٹنگ روم وغیرہ ہیں اور بائیں جانب ایک بک اسٹال اور ایک چائے کا اسٹال ہے۔ تقریباً اسی جگہ پر اوور ہیڈ برج بنا ہوا ہے۔ اس پل کی دوسری جانب ایک سڑک ہے جو 90 درجے کا زاویہ بناتی ہوئی تقریباً سو میٹر دور سبزی منڈی کی مین سڑک سے جا ملتی ہے۔ اس اسٹیشن پر دو مین ریلوے لائنوں کے علاوہ آٹھ دس لوپ لائنیں بھی ہیں جو بیشتر اوقات مال کے ڈبوں کی شفٹنگ اور مال اتارنے اور چڑھانے کے لئے مال کے ڈبوں سے بھری رہتی ہیں۔ میں نے اسی اوور ہیڈ برج کے پلیٹ فارم کی دوسری جانب والے حصے میں "اپنے Contact کو ملنا تھا"۔ تفتیشی ٹیم کو میں نے ایسی مفصل پلاننگ کر کے دی تھی جیسی میں اپنے مشنوں کے دوران کیا کرتا تھا۔ صرف اپنے فرار کا منصوبہ انہیں نہیں بتایا تھا۔ مجھے صرف ایک بات کا خدشہ تھا۔ گرفتاری کے بعد میں نے گھبراہٹ میں تفتیشی ٹیم کو بتایا تھا کہ میں علی گڑھ سے دہلی ڈاک وصول کرنے اور بھیجنے کے لئے آتا ہوں۔ علی گڑھ کا نام تو میں نے بتا دیا تھا۔ جبکہ میں نہ تو کبھی علی گڑھ گیا تھا اور نہ ہی وہاں کے رہائشی علاقوں اور ہوٹلوں کے نام جانتا تھا۔ مجھے یہی خدشہ تھا کہ اگر تفتیشی ٹیم نے مجھ سے علی گڑھ کے متعلق سوال کئے جہاں میں اپنے سابقہ بیان کے مطابق دو سال سے زیادہ عرصے تک رہا تھا تو میں کیا جواب دوں گا۔ کمان سے تیر نکل چکا تھا جس کی واپسی ناممکن تھی۔ علی گڑھ والا بیان میں نے سب سے پہلی تفتیش کے دوران دیا تھا۔ جسے ریکارڈ نہیں کیا گیا تھا۔ اس کے بعد نہ تو میں نے کبھی علی گڑھ کا نام لیا اور نہ انہوں نے کبھی پوچھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرے دو سالہ بھارت میں قیام کے متعلق جب تفصیلی تفتیش کا مرحلہ آئے گا تو اس وقت مجھے بہت بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ دوسری تشویش مجھے کوریئر سے DMI والوں کو حاصل کردہ ڈاک کے متعلق تھی۔ نہ معلوم اس ڈاک میں کیا تھا۔ ڈاک میں اگرچہ کسی کا نام لکھا نہیں ہوتا تھا اور ہدایات بھی کسی کو مخاطب کئے بغیر ہوتی تھیں لیکن بعض اوقات اس ڈاک میں ہمارے گھریلو خطوط بھی ہوتے تھے۔ جو بغیر اصلی لفافوں کے ہوتے تھے ان خطوط میں درج ناموں پر سیاہی لگا دی جاتی تھی۔ مجھے اور میرے ساتھیوں کو ایک دو تین چار کی ترتیب میں نمبر الاٹ کئے گئے تھے۔ ان خطوط کو سنسر کر کے سادہ لفافوں میں ڈال کر اوپر نمبر لکھ دیئے جاتے تھے۔ میں نے سوچا کہ کوریئر سے حاصل کردہ ڈاک کے متعلق انہیں یہی کہوں گا کہ وہ ساری ڈاک سبزی منڈی پر ملنے والے "Contact" کے لئے ہے۔

اگلے روز شام کے وقت میرے لئے سلیٹی رنگ کی قمیص اور پائجامہ بھیج دیا گیا اور میرے پہنے ہوئے کپڑے لے گئے۔ پاجامہ میں نالے کے بجائے الاسٹک لگا تھا۔ ایک ہوائی چپل اور سگریٹ بھی تھے۔ اس رات مجھے تفتیش کے لئے باہر نہیں نکالا گیا۔ اس سے اگلے دن صبح کے وقت گارڈز نے آ کر میری آنکھوں پر پٹی باندھی اور مجھے باہر لے جا کر اور کئی بار لٹو کی طرح گھما کر تقریباً ڈیڑھ سو قدم چلنے کے بعد ایک سیل میں جا کر میری پٹی اتار دی۔ اس سیل کے باہر بھی اونچی چار دیواری تھی۔ باتھ روم بھی کمرے کے پچھلی طرف بنا ہوا تھا۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ جس سیل سے مجھے یہاں لایا گیا تھا۔ یہ بالکل ویسا ہی تھا لیکن اس سیل سے تقریباً دگنا بڑا تھا۔ اس سیل میں دو بیڈ تھے اور ایک بیڈ پر ایک نوجوان بے ہوش پڑا تھا۔ اس نے بھی سلیٹی پاجامہ اور قمیص پہن رکھی تھی جس پر جگہ جگہ خون کے دھبے تھے۔ اس نوجوان کے منہ اور ایک کان سے بھی جمے ہوئے خون کی لکیر چہرے سے ہوتے ہوئے گردن تک چلی گئی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اسے بڑی بے دردی سے مارا پیٹا گیا ہے۔ اس کی حالت دیکھ کر پہلے تو مجھے شک ہوا کہ وہ مر چکا ہے۔ میں نے اس کی نبض ٹٹولی تو وہ چل رہی تھی۔ میں نے دل میں کہا کہ ان بھیڑیوں نے نامعلوم کس جرم کی پاداش میں اس جوان کے ساتھ اتنا بے رحمانہ سلوک کیا ہے کہ زندہ اور مردہ میں تمیز مشکل ہو گئی۔ تین چار گھنٹوں بعد اس نوجوان نے کراہنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو اس نے پانی مانگا۔ پانی پینے کے بعد اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور کراہتے کراہتے سو گیا یا بے ہوش ہو گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے اپنے ساتھ آئندہ پیش آنے والے تشدد کا اندازہ ہو رہا تھا۔ آخر کب تک میں تفتیشی ٹیم کو طفل تسلیوں سے بہلا سکتا تھا۔ غروب آفتاب کے بعد اسے پھر ہوش آیا۔ میں نے پانی سے اس کے چہرے اور گردن سے خون صاف کیا اور اسے سگریٹ دیا۔ اس کی حالت ذرا سنبھلی تو میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور اس کی یہ حالت کیوں کی گئی۔ وہ جواب دینے ہی لگا تھا کہ ہم دونوں کے لئے کھانا آ گیا۔ بڑی مشکل سے اس نے چند نوالے کھانا کھایا۔ میرے دوبارہ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ لاہور رنگ محل کا رہنے والا ہے۔ فلمیں دیکھنے کا اسے بہت شوق ہے اور اسی شوق کے پیش نظر اس نے لاہور کے ایک اسمگلر سے رابطہ کر کے بھارت میں داخل ہونے کا پروگرام بنایا۔ بارڈر کراس کرتے ہی بھارتی سیکورٹی فورس والوں نے دونوں کو للکارا۔ اسمگلر تو اس علاقے سے بخوبی واقف تھا وہ تو وہاں سے آگے بڑے سرکنڈوں (Elephant Grass) میں چھپتے چھپاتے غائب ہو گیا۔ جبکہ میں سیکورٹی فورس والوں کے ہاتھ آ گیا۔ اپنے فیلڈ آفس میں لے جا کر انہوں نے پہلے تو تلاشی لیتے ہوئے اس کی جیبیں خالی کر دیں اور پھر بے تحاشہ مار مار کر میرے ساتھی اسمگلر کا پوچھنے لگے۔ میں نے انہیں سب کچھ صحیح صحیح بتا دیا لیکن انہوں نے میری ایک نہ سنی اور مجھے امرتسر لے جا کر اسی محکمے کے لوگوں کے حوالے کر دیا۔ وہاں بھی مجھ پر بے انتہا تشدد کیا گیا لیکن میرے پاس انہیں بتانے کو جب کوئی بات تھی ہی نہیں تو آخر کیا بتاتا۔ امرتسر سے مجھے یہاں لایا گیا مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ کون سا شہر ہے۔ چودہ پندرہ روز سے ہر رات کو مجھے ایک تہہ خانے میں لے جا کر بہت زیادہ مارا پیٹا جاتا ہے۔ مجھے ایک اندھیری کوٹھڑی میں رکھا جاتا تھا۔ دو دن ہوئے مجھے یہاں منتقل کیا گیا ہے۔ آپ بھی میری طرح مصیبت میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ اگر آپ مسلمان اور پاکستانی ہیں تو میری مدد کیجئے اور کسی طرح ان ظالموں کے شکنجے سے چھڑوائیں۔

غازی

میں نے اس نوجوان کو دلاسا دیا اور کہا کہ اگر تم بے گناہ ہو تو یہ تمہیں بالآخر چھوڑ دیں گے اور غیر قانونی طور پر بارڈر کراس کرنے کے جرم میں زیادہ سے زیادہ دو تین سال کی سزا ہو جائے گی۔ میں نے اسے کہا کہ تمہاری طرح ہی میں یہاں بے بس ہوں اور عملی طور پر تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ بہرحال حوصلہ رکھو، اللہ پاک یقیناً کوئی نہ کوئی رستہ دکھا دے گا۔ اس لڑکے نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کو یہاں کس جرم کے تحت لایا گیا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ یہ ایک لمبی کہانی ہے جسے تفتیشی عملے کے سامنے دہراتے دہراتے میں تھک گیا ہوں۔ اسلئے پھر کسی وقت تمہیں اپنی داستان سناؤں گا۔

اس رات جب باہر کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو میں تفتیشی مراحل سے گزرنے کے لئے خود کو تیار کرنے لگا۔ گارڈز اندر آئے اور اس نوجوان کی آنکھوں پر پٹی اور ہاتھ پشت پر باندھ کر اسے باہ دھکیل کر لے گئے۔ اس نوجوان نے پٹی بندھتے ہی رونا اور آہ و بکا شروع کر دی۔ زیادہ سے زیادہ 20 منٹ گزرے تھے کہ مجھے اس لڑکے کے چیخنے چلانے اور ہائے مر گیا۔ مجھ پر رحم کرو، اف میری ہڈی ٹوٹ رہی ہے کی آوازیں آنے لگیں ان آوازوں کے ساتھ ساتھ مغلظات اور مار پیٹ کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ ”ٹارچر سیل یہاں سے قریب ہی ہوگا“ میں نے اندازہ لگایا۔ اس لڑکے کی چیخوں سے ایسے معلوم ہو رہا تھا کہ اسے سخت جسمانی اذیت دی جا رہی ہے۔ مجھے پھر کسی کی کرخت آواز سنائی دی۔ مرچیں تیل اور ڈنڈا لاؤ۔ تھوڑی دیر بعد ہی اسے نوجوان کی انتہائی تیز چیخ سنائی دی۔ وہ شدت درد سے بھریں، دردناک چیخیں مار رہا تھا۔ چشم تصور سے میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جا رہا ہے۔ اتنا وحشیانہ عمل تو شاید کسی دور میں بھی ظالم سے ظالم شخص نے بھی اپنے دشمن سے نہ کیا ہوگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ نوجوان اور میں دونوں ان ظالموں کے آگے بے حقیقت کیڑے سے بھی کم حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے، میرے ساتھ اس سے بھی زیادہ اذیت ناک رویہ اپنایا جائے گا۔ پاکستان سے روانگی سے قبل سائینیڈ بھری داڑھ لگانا واقعی درست تھا۔ اس شرمناک اذیت اور ذلت سے بچنے کے لئے وہ داڑھ واقعی ان حالات میں نعمت ثابت ہوتی۔ اس نوجوان کی درد بھری چیخوں سے مجھے خاک نیند آنی تھی اس کی چیخیں اچانک بند ہو گئیں۔ میں نے سوچا کہ یا تو وہ مر گیا ہے اور یا کم از کم بے ہوش ہو چکا ہے۔ رات یونہی بیت گئی۔ فجر کے وقت چار گارڈز اسے ہاتھوں اور ٹانگوں سے اٹھائے سیل میں اس کے بیڈ پر پھینک کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے اس کی نبض دیکھی۔ نبض بالکل نارمل تھی۔ وہ یقیناً بے ہوش تھا۔ اسکی طرف سے مطمئن ہو کر میں اپنے بیڈ پر چلا آیا اور میری بھی آنکھ لگ گئی۔ صبح 8 بجے کے قریب ہم دونوں کے لئے ناشتہ آیا۔ وہ تو بے ہوش تھا، میں نے ناشتہ زہر مار کیا، میں سوچ رہا تھا کہ اب عنقریب ہی میری بھی ایسی ہی چیخیں شروع ہونے والی ہیں۔ میں نے خود کو اذیت اور تشدد سہنے کے لئے تو ایک حد تک تیار کر لیا تھا۔ لیکن جو شرمناک اذیت گزشتہ رات اس نوجوان کو دی گئی تھی اس کا میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اس نوجوان کے کپڑوں پر پرانے خون کے دھبوں کے علاوہ نئے دھبے بھی لگے ہوئے تھے اور اس کے پاجامے کی آسن بھی خون سے لتھڑی ہوئی تھی۔ تیل، مرچیں اور ڈنڈا منگوانے کی آواز، نوجوان Loudest cry (درد بھری انتہائی تیز چیخ) اور خون سے بھری آسن سے صاف ظاہر تھا کہ رات اس کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا تھا۔

دوپہر کے قریب اسے ہوش آیا۔ پہلے کی طرح اس کی ناک اور کان سے نکلنے والا خون اس کے چہرے پر جما ہوا تھا۔ میں نے اس کے چہرے سے خون صاف کیا، اسے پانی پلایا، اس کے ہاتھوں پر بھی خون جما ہوا تھا۔ اسے بھی صاف کیا۔ نوجوان تشکر بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ دوپہر کا کھانا آیا تو میرے بے حد مجبور کرنے پر اس نے کھانا کھایا۔ میں نے اسے کھانے کے بعد اسپرو کی دو گولیاں دیں۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور بولا ”میرے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے میں سمجھتا ہوں کہ دو چار دن سے زیادہ زندہ نہ رہ پاؤں گا۔ میرے پاس تو ان ظالموں کو بتانے کے لئے کچھ ہے ہی نہیں۔ میں تو بھارتی فلمیں دیکھنے کے شوق میں مارا گیا۔ آپ میری حالت دیکھیں اور خود کو ان ظالموں کے ظلم سے بچانے کے لئے اگر کوئی بات نہیں بتائی، تو وہ بھی بتا دیں، اس کی اس بات سے میں سوچ میں پڑ گیا کہ کل یہی شخص مجھ سے گڑگڑا کر یہاں سے نکلنے یا تشدد سے بچنے کے لئے میری مدد طلب کر رہا تھا اور آج مجھے نصیحت کر رہا ہے۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اس کے سراپے کا جائزہ لینے لگا۔

مجھے گرفتار ہوئے 6 دن ہوئے تھے جبکہ اس نوجوان کے مطابق اس کی گرفتاری کو آج سترہ اٹھارہ روز ہو چکے تھے لیکن اس کی داڑھی میری داڑھی کے نصف کے برابر تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ اور پاؤں کے ناخنوں کو دیکھا تو وہ بھی بڑھے ہوئے نہیں تھے۔ اس کے متعلق میرے دل میں کچھ شک سا پڑ گیا۔ میں نے اس شک کو مٹانے کے لئے اس سے پوچھا کہ وہ کتنا پڑھا ہوا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میٹرک پاس ہے۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ گورنمنٹ اسکول سے اس نے میٹرک پاس کیا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ رنگ محل میں میری بھی عزیز داری ہے۔ میرے عزیزوں کے گھر تو ”رنگ محل حویلی“ کے پیچھے ”گلبرگ“ میں ہیں۔ اس کا گھر رنگ محل حویلی کی کس جانب ہے۔ وہ گھبرا گیا اور کہنے لگا ہمارا گھر تو رنگ محل حویلی کے دائیں جانب ہے۔ میں نے سر ہلا کر گویا سمجھتے ہوئے کہا تو تمہارا مطلب ہے کہ سمن آباد میں ہے۔ وہ بولا جی ہاں سمن آباد میں ہے۔ میں نے کہا کہ حویلی کے باہر دو جھومتے ہوئے ہاتھی دیکھے ہیں۔ کہنے لگا جی ہاں کئی بار، بلکہ میں نے تو انہیں ایک دو بار گنے بھی کھلائے ہیں۔ (رنگ محل لاہور میں تنگ بازاروں کا مرکز ہے اور وہاں کوئی رنگ محل حویلی نہیں ہے اور نہ ہی ہاتھی ہیں۔ گلبرگ اور سمن آباد لاہور کی نئی بستیاں ہیں جو رنگ محل سے 10 سے 15 کلومیٹر دور ہیں) اس نے رنگ محل حویلی، جھومتے ہوئے ہاتھی اور سمن آباد کا کہہ کر میرے شک کو یقین میں بدل دیا۔ یہ نوجوان نہ تو پاکستانی تھا اور نہ یہ بارڈر پر پکڑا گیا تھا بلکہ یہ DMI کا بھیجا ہوا Stool pigeon تھا اور DMI کا ہی آدمی تھا۔ اس مصیبت کی گھڑی میں بھی میں نے DMI کے شروع کئے ہوئے اس کھیل کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ Stool pigeon کا متبادل اردو میں صحیح لفظ مجھے معلوم نہیں۔ یہ دشمن کا راز اگلوانے کے لئے ایک ہتھکنڈہ ہوتا ہے کہ اپنے ہی آدمی کو سیل (Cell) میں اصل ملزم کے ساتھ بند کر دیا جاتا ہے۔ اس کے جسم اور کپڑوں پر تشدد کی علامات بنائی جاتی ہیں اور سیل کے قریب ہی اسے لے جا کر مصنوعی تشدد کیا جاتا ہے۔ وہ آدمی ایسی دردناک چیخیں مارتا ہے کہ سننے والوں کے دل دہل جائیں۔ اس کے دو مقاصد ہوتے ہیں اول یہ کہ اصل ملزم Stool pigeon پر ہونے والے تشدد اور اس کی حالت کو دیکھ کر گھبرا جائے، اس کے اعصاب ٹوٹ جائیں اس کی قوت ارادی اور مدافعت کی طاقت ختم ہو جائے اور وہ اپنے متعلق سب کچھ بتا دے۔ دوئم یہ کہ Stool pigeon کو اپنی ہی طرح مصیبت میں گرفتار سمجھ کر اسے اپنا رازدار بنا لے اور اسے اپنی اصلیت بتا دے۔ بعض اوقات اصل ملزم کا اعتماد حاصل کر کے یہ شخص اپنی رہائی کا مژدہ سناتا ہے اور اصل ملزم کو کہتا ہے کہ اپنے باہر کی Contact تک اگر کوئی پیغام پہنچانا ہو تو وہ یہ ”خدمت“ سرانجام دینے کو تیار ہے۔ تربیت کے دوران ہمیں Stool pigeon کے متعلق نہ صرف بریف کیا گیا تھا بلکہ راولپنڈی میں ایک مصنوعی مقابلہ بھی کروایا گیا تھا جس میں A ڈویژن پولیس اسٹیشن کی حوالات میں مجھے اور میرے ایک ساتھی کو ایک رات کے لئے بند کر دیا گیا تھا۔ جہاں پہلے سے ہی ایک اسٹول پجن موجود تھا۔ جس نے رات بھر ہمیں کریدنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ بریفنگ کے بعد چونکہ وہ تازہ تازہ واقعہ تھا اس لئے ہم دونوں نے اسٹول پجن کو پہچان لیا تھا۔

اب اس اچانک مصیبت اور بے چارگی کی حالت میں Stool pigeon کی بھرپور اداکاری کی وجہ سے میں اسے فوری پہچان نہ سکا۔ لیکن اس کی داڑھی ناخنوں اور لاہور میں رنگ محل کے متعلق اس کی ”معلومات“ نے اس کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ اسے بھی غالباً رنگ محل کے متعلق اپنی دی ہوئی معلومات پر خود ہی شک ہو گیا تھا۔ اس نے اسی میں عافیت سمجھی کہ اب سونے کا بہانہ کر کے میرے سوالات سے بچ جائے۔

رات کو پہلے مجھے سیل سے لے جایا گیا۔ تفتیشی ٹیم بھی غالباً اپنے بار بار کے دہرائے ہوئے سوالات اور میرے مسلسل ایک ہی جواب سے اکتا چکی تھی۔ اسلئے اس بار انہوں نے اپنے سوال جواب کا سلسلہ مختصر رکھا۔ ٹیم کے انچارج نے مجھے رخصت کرنے سے پہلے کہا تم نے اپنے متعلق ہمیں جو کچھ بتایا ہے ہمیں اس پر بالکل یقین نہیں۔ اب ہم تمہارے اس وعدے پر کہ 20 جون کو تم پاکستانی ایجنٹ کو پکڑوا دو گے، یقین کرتے ہوئے 20 جون کا انتظار کریں گے۔ اگر اس روز بھی تم ناکام ہوئے تو ہم تمہیں دوسری ٹیم کے حوالے کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں کہ دوسری ٹیم کا تمہارے ساتھ رویہ اتنا سخت ہوگا جس کا تمہیں اندازہ نہیں۔ اس لئے اب بھی وقت ہے کہ ہمیں سب کچھ سچ سچ بتا دو اور خود کو تشدد سے بچا لو۔ ہر انسان کی تشدد برداشت کرنے کی ایک حد ہوتی ہے اور جب اسے اس حد سے آگے لے جایا جاتا ہے تو وہ سب کچھ بتا دیتا ہے۔ اس کی یہ بات سن کر مجھے میجر احسن شہید یاد آ گیا۔ تشدد کی کون سی حد تھی جس سے وہ نہ گزرا تھا۔ لیکن اس نے زبان نہ کھولی۔ اس کے ہوش میں ہوتے ہوئے اس کے پاؤں کی انگلیاں اور پاؤں کاٹے گئے اس کے ہوش میں ہوتے ہوئے اس کے ہاتھوں کی انگلیاں اور ہاتھ کاٹے گئے۔ لیکن وہ مرد مومن یہ سب کچھ سہہ گیا، جان دے دی لیکن زبان نہ کھولی۔ تفتیشی ٹیم نے جو کچھ کہا تھا وہ بالکل درست تھا جب تک ایک ٹیم زبان کھلوانے میں مکمل طور پر ناکام نہ ہو جائے ملزم کو دوسری ٹیم کے حوالے نہیں کیا جاتا۔ ملزم کی زبان کھلوانے پر ہی کسی تفتیشی ٹیم کی کارکردگی کو پرکھا جاتا ہے اور کامیابی کی صورت میں سارا کریڈٹ (Credit) اسی ٹیم کو ہی ملتا ہے۔ 20 جون کو میرے تعاون کے وعدے سے موجودہ ٹیم کو مجھے اپنی تحویل میں رکھنے کا جواز مل گیا تھا۔ 20 جون کو اگر وہ ناکام ہو جاتے تو مجھے یقیناً کسی دوسری ٹیم کے سپرد کر دیا جاتا جس کے زبان کھلوانے کے اپنے حربے ہوتے۔ میں نے ٹیم کے انچارج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”سر میں اپنے عدم تعاون کا انجام بخوبی جانتا ہوں۔ میرے Cell میں ایک جوان قیدی ہے جس کی حالت دیکھ کر اور رات کو تفتیشی ٹیم کی تفتیش کے دوران اس کی چیخوں سے مجھے بخوبی اندازہ ہو چکا ہے کہ میرے عدم تعاون کی صورت میں میرا کیا حشر کیا جائے گا۔ میں نے آپ سے 20 جون اور اگر ایجنٹ اس روز نہ آیا تو 22 جون کو اسے پکڑوانے کا وعدہ کیا ہے۔ اگر 22 جون کو بھی ناکام ہوا تو آپ بے شک میرا جو حشر کریں مجھے آپ سے کوئی گلہ نہ ہوگا بلکہ میں اسے اپنے مقدر کا لکھا سمجھ کر قبول کروں گا“۔

ٹیم کے انچارج نے اپنے رویئے میں لچک پیدا کرتے ہوئے کہا ”پاکستان سے آنے والی ڈاک میں بھارتی کرنسی بھی بھیجی گئی تھی۔ تمہارے کہنے کے مطابق 20 جون کو 8 بجے تمہارے کپڑے، گھڑی اور سبز رومال تمہیں مل جائے گا۔ روانگی کے وقت 5 ہزار روپیہ بھی تمہیں ایجنٹ کو دینے کے لئے دیا جائے گا۔ تم بظاہر ہماری حراست میں نہیں ہو گے لیکن ہمارے درجنوں سویلین لباس میں جوانوں نے تمہیں چاروں طرف سے گھیر رکھا ہوگا۔ اس لئے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کا سوچنا بھی نہیں۔ اگر تم نے یہ حماقت کی تو ہم تمہارا وہ حشر کریں گے کہ تم اپنے لئے موت مانگو گے لیکن تمہیں موت بھی نہ ملے گی۔ ہم تمہیں سبزی منڈی اسٹیشن پر لے جا کر کوئی رسک نہیں لے رہے۔ وہاں پر تم آزاد ہونے کے باوجود بالکل اسی طرح ہماری حراست میں ہو گے جیسے اس کمرے میں ہو۔ اگر آزمانا چاہتے ہو تو سامنے دروازہ ہے۔ وہاں سے نکل کر فرار ہونے کی کوشش کرو۔ ہم میں سے کوئی بھی نہ تو اپنی کرسی سے اٹھے گا اور نہ ہی گارڈز کو پکارے گا۔ دروازے سے باہر نکلتے ہی تمہارا جو حشر ہوگا۔ اس کا تم اندازہ نہیں کر سکتے۔ اور اس حماقت کی کلیتاً ذمہ داری تمہاری ہوگی۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ ایسی کوئی بات نہ ہوگی۔ اس گفتگو کے بعد ٹیم نے مجھے سیل میں بھیج دیا۔

مجھے سیل (Cell) میں لایا گیا تو اسٹول پجن وہاں نہیں تھا۔ صبح کے قریب اسے واپس لایا گیا، اس بار پھر اس کے کپڑے خون سے لتھڑے ہوئے تھے اور وہ کراہ رہا تھا۔ مجھے چونکہ اس کی اصلیت کا یقین ہو چکا تھا اس لئے میں نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ میں نے سوچا کہ میرے ساتھ جو ہونا ہے اسے تو میں روک نہیں سکتا۔ اس دوران اس کے ”ڈرامے“ کا ہی لطف اٹھایا جائے۔ درحقیقت میں نے فرار کا جو منصوبہ بنایا تھا میں اپنی پوری توجہ اس پر مرتکز کئے ہوئے تھا۔ فرار میں ناکامی اور تشدد کے متعلق میں نے سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ زبان تو میں نے کسی حالت میں نہیں کھولنی تھی، میرا کیا حشر ہونا تھا اسے سوچ سوچ کر بار بار مرنے سے کیا فائدہ تھا۔ زندگی کسے عزیز نہیں ہوتی۔ مجھے بھی اپنی زندگی بہت عزیز تھی۔ اپنے گھر والوں سے بھی بڑی محبت تھی، لیکن بھارتی بارڈر کراس کرتے ہی میں نے اپنی ان کمزوریوں کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ یقیناً یہی حالت میرے ساتھیوں کی بھی تھی۔ ہم دو سال سے زیادہ بھارت میں قیام کے دوران سیکڑوں بار گھنٹوں اکٹھے گزارتے تھے لیکن میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس تمام عرصے میں کبھی ایک بار بھی کسی نے اپنے اہل خانہ کا نہ تو ذکر کیا اور نہ ہی انہیں یاد کیا تھا۔ زندگی سے پیار کیا ہوتا ہے، ہم اسے بھول چکے تھے۔ خطرناک سے خطرناک مشن پر جانے کے لئے قدم پیچھے کرنا تو دور کی بات ہے، سب سے بڑھ کر اس مشن پر جانے کی ضد کی اور خود کو مشن کے لئے موزوں قرار دینے کی کوشش کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم پانچوں جن میں صرف میں سویلین تھا اور میرے چاروں ساتھی سروسز (Services) کے باقاعدہ ملازم تھے ہم نے خود بھارت جانے اور خطرناک مشن سرانجام دینے کے لئے اپنے آپ کو والنٹیئر (Volunteer) کیا تھا۔ ہم میں سے کسی کو بھی زبردستی بھارت نہیں بھیجا گیا تھا۔ ہم سب اس دشمن ملک میں تنگ نظر ظالموں کے ہاتھوں گرفتاری کی صورت میں اپنے ساتھ ہونے والے بدترین تشدد سے بھی واقف تھے۔ سائنائیڈ کی داڑھیں لگوا کر ہم نے موت کو گلے لگانے کے اسباب کو بخوشی قبول کیا تھا۔ یقین جانئے کہ میں موت سے ہرگز خوف زدہ نہ تھا۔ زہر بھری داڑھ کے نکلنے کے بعد میں نے ذہنی طور پر خود کو بدترین تشدد سہنے کے لئے تیار کر لیا تھا۔ اب یہ جو چند روز (22 جون) کی مہلت تھی میں اسے پورے طور Enjoy کرنا چاہتا تھا۔ Cell میں مجھے یہ Stool pigeon (جسے آئندہ میں بیمار کبوتر کہوں گا) ہی میسر تھا چنانچہ میں نے اسی کے ساتھ ہی اپنے باقی ماندہ وقت کو خوشگوار بنانے کا فیصلہ کیا۔

غازی

میں نے دوپہر کے کھانے کے لئے بھی اسے نہ اٹھایا اور نہ ہی اس کے چہرے سے خون وغیرہ صاف کیا جب سورج غروب ہونے تک میری طرف سے کوئی پیش رفت نہ ہوئی تو وہ خود ہی کراہتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ دوپہر کے کھانے کے برتن اٹھانے کیلئے جب گارڈز آئے تو میں نے اس کے لئے بھیجا گیا کھانا بھی واپس کر دیا تھا اور گارڈز کو کہا تھا کہ یہ تو بے ہوش ہے۔ اسلئے اس کا کھانا بھی واپس لے جائیں۔ بیمار کبوتر نے مجھ سے کھانے کے متعلق پوچھا تو میں نے کہا کہ تم اس وقت بے ہوش تھے۔ سارا دن کھانے پر کھیاں بھنبھناتی رہتی ہیں اس لئے میں نے تمہارا کھانا واپس بھیج دیا۔ وہ جوان تھا اور جوانی میں نسبتاً بھوک زیادہ لگتی ہے۔ صبح کا ناشتہ بھی اس نے نہیں کیا تھا۔ اس کے چہرے پر بھوک کے آثار تھے اور کراہیں بھرنے اور ہائے وائے کرنے کی ایکٹنگ بھی مسلسل کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ اس کو ڈیوٹی سونپی گئی تھی کہ مجھ سے ہمدردی کے پردے میں کچھ راز اگلوا لے۔ اپنے کراہنے اور دو روز مجھ سے چہرے پر جمے خون صاف کرانے کے سوا اسے کوئی کامیابی نہ ہوئی تھی۔ بھوک کی شدت کی وجہ سے وہ خاصا بے چین دکھائی دیتا تھا۔ وہ خود ہی اٹھ کر باتھ روم میں گیا اور خود ہی چہرے اور ہاتھوں کو دھویا، میں سگریٹ سلگائے بستر پر نیم دراز کبھی کبھی اسے دیکھ لیتا تھا۔ میری خاموشی اب اس کیلئے ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ مجھے مخاطب کرکے بولا، صاحب آپ نے کیا سوچا ہے۔ میں نے پوچھا کس بات کے متعلق کیا سوچا ہے؟ کہنے لگا کہ ان ظالموں کے ہاتھوں ظلم سے بچنے کیلئے۔ میں نے کہا ''یہاں تم اپنی فکر کرو اپنے بچاؤ کے متعلق سوچو، میرے اوپر ہونے والے ظلم کی فکر میں کیوں گھلے جاتے ہو''۔ کہنے لگا ''میں نے تو اس لئے پوچھا تھا کہ میری حالت تو آپ دیکھ رہے ہیں، کس بری طرح سے مجھے ادھیڑ کر رکھ دیا گیا ہے۔ آپ تو بچ جائیں ان کے ظلم سے''۔ میں نے کہا ''کیسے بچ جاؤں'' کہنے لگا ''جو کچھ وہ پوچھتے ہیں انہیں صاف صاف بتا دیں'' میں نے کہا ''تم کیوں نہیں صاف صاف بتا کر ان کے ظلم سے بچ جاتے'' کہنے لگا ''میں نے سب کچھ بالکل سچ انہیں بتا دیا ہے اور بتانے کیلئے میرے پاس کچھ ہے بھی نہیں'' میں نے کہا ''میں نے بھی سب سچ انہیں بتا دیا ہے اور میرے پاس بھی انہیں بتانے کے لئے مزید کچھ نہیں، میں نہیں جانتا کہ جب تم نے سب کچھ انہیں بتا دیا ہے پھر بھی ہر روز وہ تمہارے ساتھ اتنا برا سلوک کیوں کرتے ہیں۔ یقیناً انہیں تمہارے متعلق یہ یقین ہو چکا ہے کہ تم کچھ چھپا رہے ہو اور اسے ہی اگلوانے کے لئے وہ تم پر تشدد کرتے ہیں۔ تم اپنے بچنے کی تدبیر کرو، میرا اللہ مالک ہے۔ میری فکر نہ کرو'' یہ کہہ کر میں نے آنکھیں موند لیں۔ گرمی سے برا حال ہو رہا تھا۔ پنکھے کی ہوا اتنی گرم تھی کہ لو بھی اس کے آگے ماند تھی۔ نل کا پانی اتنا گرم تھا کہ پانی میں انڈا ڈال دیں تو یقیناً ابل جاتا۔ طبیعت پہلے ہی بیزار ہو رہی تھی اس پر اس بیمار کبوتر کے سوالات، وہ مجھے سچ بولنے کی نصیحتیں کرنے لگا لیکن میں نے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ جب وہ خاموش نہ ہوا تو میں نے تنگ آ کر کہا ''دیکھو یا تو خاموش ہو جاؤ اور اگر بولنا چاہتے ہو تو مجھے رنگ محل حویلی کے متعلق بتاؤ۔ میں تو کبھی کبھار اس طرف جاتا تھا تم تو وہاں کے رہنے والے ہو۔ ہاتھیوں کو گنے بھی کھلاتے رہے ہو، تمہاری معلومات بہت زیادہ ہوں گی۔ مجھے اس حویلی کے متعلق بتاؤ'' اب تو جناب اسے ایسی چپ لگی کہ رات کا کھانا بھی اس نے خاموشی سے کھایا۔ نصف شب کے قریب گارڈز اسے لے گئے اور صبح اسے خون میں لتھڑا ہوا چھوڑ گئے۔ رات کو اس کی چیخوں اور آہ و بکا کی آوازیں بھی آتی رہیں۔ مجھے تو 20 جون تک کی مہلت مل چکی تھی۔ لہٰذا میں ان تاریخوں تک تفتیشی ٹیم کے سوالات سے بھی بچ گیا تھا۔ رات کے پچھلے پہر جب گرمی کی شدت میں کچھ کمی ہوئی تو میں سو گیا۔ سورج طلوع ہونے کے قریب تھا کہ پے در پے تین خوفناک دھماکوں سے میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میرے اندازے کے مطابق تینوں دھماکے میرے سیل سے قریباً سو میٹر دور ایک منٹ کے اندر ہوئے تھے۔ چار دیواری کے باعث باہر تو میں دیکھ نہیں سکتا تھا دھماکوں کے تین چار منٹ بعد سیٹیاں بجنے اور بھاگ دوڑ کی آوازیں آنے لگیں۔ اونچی آواز میں احکام دیئے جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہی جیپوں کے ایک طرف جانے کی آواز آئی اور ان کے بعد ایمبولینس اپنے مخصوص ہوٹر بجاتی گزر گئیں۔ ہر طرف ایک شور مچا ہوا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ کانوں کے پردے پھاڑنے والی آواز سے تو معلوم ہوتا تھا کہ یہ بموں کے دھماکے تھے اور ایمبولینس کی آمد سے اندازہ ہوتا تھا کہ جانی نقصان بھی ہوا ہے۔ بیمار کبوتر بھی حیران و پریشان تھا۔

سارا دن اسی شور شرابے میں گزر گیا۔ ہمیں صبح کا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا بھی نہ دیا گیا۔ رات کا کھانا لانے والوں کے ساتھ دو مسلح فوجی بھی تھے جنہوں نے سیل کا دروازہ کھلتے وقت ہماری طرف گنیں تان لیں میں تو خاموش رہا لیکن بیمار کبوتر نے کھانا لانے والوں سے پوچھا کہ صبح کس چیز کے دھماکے ہوئے تھے۔ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ رات کو دس گیارہ بجے گارڈز آ پہنچے۔ انہوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھی اور مجھے پہلے والے سنگل بیڈ سیل میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کے بعد بیمار کبوتر کو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔

تسلسل کو قائم رکھنے کیلئے عرض ہے کہ جب میں فرار ہو کر اپنے ساتھیوں کے پاس گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ تینوں دھماکے چھتہ لال میاں میں بشیر کے گیرج میں جمع ہونے والے لڑکوں نے کئے تھے۔ میرے ساتھیوں نے بتایا کہ میری گرفتاری کے بعد انہوں نے وائرلیس پر پاکستان سے رابطہ کیا تھا اور انہیں میرے متعلق بتایا تھا۔ پاکستان سے انہیں سختی سے ہدایت کی گئی تھیں کہ وہ اپنی تمام سرگرمیاں بالکل معطل کر دیں اور میری تلاش میں ہرگز کوئی رسک نہ لیں Wait and see ان کے دیئے ہوئے احکام کا لب لباب تھا۔ میرے ساتھیوں نے احکام پر حرف بحرف عمل کیا لیکن لڑکوں کو تمام واقعہ بتا دیا۔ میری گرفتاری کا سن کر لڑکے بہت مشتعل ہو چکے تھے۔ انہوں نے میرے ساتھیوں سے مل کر میرا سراغ لگانے اور مجھے چھڑانے کا پروگرام بنانا چاہا لیکن میرے ساتھیوں نے باوجود شدید خواہش کے پاکستان سے ملے احکام کے پیش نظر اپنی مجبوری بتائی اور معذرت کر لی۔ اب لڑکوں نے اپنے طور پر میرا کھوج لگانا چاہا۔ وہ چند ماہ پہلے ریٹائر ہونے والے ایک مسلمان فوجی سے ملے۔ جس نے انہیں بتایا کہ اس طرح گرفتاری کا عمل صرف DMI والے ہی کرتے ہیں۔ اس سابق فوجی نے لڑکوں کو دہلی میں DMI ہیڈ کوارٹرز کا محل وقوع بھی بتا دیا۔ وہ خود کبھی ہیڈ کوارٹرز کے اندر نہیں گیا تھا۔ اندر کی معلومات حاصل کرنے کے لئے لڑکوں نے گیرج میں مرمت کے لئے آئی ایک گاڑی لی اور بعد دوپہر ہیڈ کوارٹرز کے باہر کھڑے ہو گئے۔ جب اسٹاف چھٹی کے بعد باہر نکلا تو انہوں نے ہیڈ کوارٹرز کے ایک آدمی کو اغوا کر لیا اور گیرج میں لے گئے۔ تھوڑے سے تشدد کے بعد ہی اس نے ہیڈ کوارٹرز کا پورا نقشہ اور زیر زمین Cell کے علاوہ زمین پر بنے ہوئے سیلوں کی تفصیل بتا دی۔ میرے متعلق اسے کچھ بھی علم نہ تھا۔ ساتھیوں کے بقول لڑکوں نے اس فوجی کی وردی اتروا کر اسے دھوتی قمیص پہنا دی اور شاہدرہ کی طرف ایک سنسان جگہ پر لے گئے اور اس کی گردن پر خنجر رکھ کر اس سے میرے متعلق پوچھا لیکن وہ کچھ نہ بتا سکا۔ اس فوجی کا زندہ رہنا میرے علاوہ میرے ساتھی لڑکوں، عارف اور نذیر سب کے لئے خطرناک تھا اس لئے ایک لڑکے نے اسے خنجر سے ہلاک کر دیا اور اس کی لاش پر مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگا دی تاکہ شناخت کے قابل نہ رہے۔

لڑکوں کا لیڈر اب قیصر تھا جس نے گورکھپور کے مشن کو میرے نمبر ٹو کے ساتھ پورا کیا تھا۔ انہوں نے عارف کے پاس میرے رکھوائے ہوئے سامان سے 3 ٹائم بم اور 6 پسٹل اور گولیاں لیں۔ انہوں نے نقشے کے مطابق DMI کی اس دیوار کو نشانہ بنانا تھا جو Cell کے قریب تر تھی۔ بیرونی دیواریں بہت اونچی تھیں اور ان پر خاردار تاروں کی باڑھ لگی ہوئی تھی اس لئے باہر سے اندر کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ حملے میں دو گاڑیاں استعمال کی گئیں۔ علی الصبح جب سڑکوں پر ٹریفک نہیں ہوتی اس وقت حملے کا پروگرام بنایا گیا۔ ایک بم بیرونی دیوار کے ساتھ چسپاں کر دیا گیا جبکہ دو بم اندر پھینکے گئے۔ دیوار والے بم سے دیوار میں خاصا بڑا شگاف پڑ گیا جبکہ اندر پھینکے گئے بم DMI ہیڈ کوارٹرز میں رہائشی فوجیوں کی بیرکوں پر گرے۔ لڑکوں کو شاید اس ہیڈ کوارٹر کی عددی نفری کا علم نہ تھا۔ شگاف سے جب انہوں نے اندر جھانکا تو انہیں مختلف عمارتوں اور بیرکوں کے ہجوم میں سیل دکھائی نہ دیئے۔ دھماکوں کے فوری بعد سیٹیاں بجنے اور چیخ و پکار کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اب وہاں لڑکوں کا ٹھہرنا صریحاً بے وقوفی اور بغیر کسی فائدے کے خودکشی کے مترادف تھا۔ لہٰذا سب لڑکے جانیں بچا کر قریب ہی کھڑی دونوں گاڑیوں میں بھاگ آئے۔ صحیح علم تو کسی کو نہ تھا لیکن قیاس تھا کہ بارکوں پر بموں کے پھٹنے سے 8 سے زیادہ فوجی ہلاک اور بیسیوں زخمی ہو گئے تھے۔ ان دھماکوں کے بعد شہر کی سختی سے ناکہ بندی کر دی گئی اور جگہ جگہ تلاشی کا سلسلہ شروع ہو گیا لیکن اللہ پاک کے رحم و کرم سے لڑکے اور ساتھی بالکل محفوظ رہے۔ آٹھ دس دن کی سختی کے بعد چیکنگ وغیرہ ختم کر دی گئی اور دہلی کی زندگی معمول پر آ گئی۔ DMI کی بیرونی دیوار کی اسی روز مرمت کر دی گئی تھی جبکہ اندر کا حال کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ لڑکوں نے اس Attempt کے بعد DMI کے افسران پر ان کے گھروں اور دفتر کے درمیان حملوں کا پروگرام بنایا جسے عارف، نذیر اور میرے ساتھیوں نے لڑکوں کو سمجھا کر ملتوی کروا دیا کہ اگر ان حملوں کا کسی کو بھی ذرا سا بھی شک پڑ گیا کہ یہ حملے مجھے بچانے کیلئے ہو رہے ہیں تو مجھے فی الفور ختم کر دیا جائے گا اور میری زندگی کی موہوم سی امید بھی ختم ہو جائے گی۔ اس کے باوجود لڑکوں نے ہیڈ کوارٹرز سے آنے جانے والی گاڑیوں پر نگاہ رکھنی شروع کر دی کہ شاید کسی گاڑی میں انہیں نظر آ جاؤں لیکن وہاں تو صرف فوجی جیپیں، ٹرک، پرائیویٹ موٹریں اور بند فوجی گاڑیاں ہی آتی جاتی تھیں۔ اسلئے میرے بارے میں وہ کوئی سراغ نہ لگا سکے اور چند روز کے بعد لڑکوں نے یہ نگرانی بھی مایوس ہو کر ختم کر دی۔

اب پھر اصل سلسلے کی طرف آتے ہیں۔ اس سنگل بیڈ سیل میں مجھے وقت پر ناشتہ کھانا اور سگریٹ ملتے رہے۔ صرف ایک فرق پڑا۔ مسلح فوجی گارڈز دن رات میں چار پانچ دفعہ اچانک آ جاتے۔ کبھی سیل کے باہر سے ہی مجھے دیکھ کر چلے جاتے اور کبھی سیل کھول کر کمرے اور باتھ روم کی ہر چیز چیک کرتے۔ اسی طرح دن گزرتے جا رہے تھے۔ غالباً 18 جون کی رات تھی جب مجھے سیل سے نکال کر تفتیشی ٹیم کے کمرے میں لے جایا گیا۔ وہی سابقہ ٹیم کے ممبر تھے۔ انہوں نے پھر مجھے تلقین کی یا زیادہ مناسب الفاظ میں وارننگ دی کہ 20 جون کو سبزی منڈی اسٹیشن پر کوئی ''حماقت'' نہ کروں۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ ایسی کوئی بات نہ ہوگی۔ انہوں نے مجھے اپنی داستان شروع سے بیان کرنے کو کہا۔ میں نے پھر وہی رٹی رٹائی کہانی بیان کر دی۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے انہوں نے مجھے رخصت کرتے ہوئے کہا کہ تمہارا لباس جوتے اور گھڑی وغیرہ تم کو کل شام مل جائیں گی۔ کل شام تمہاری شیو بنانے کے لئے حجام بھی بھیج دیا جائے گا۔ پرسوں صبح ساڑھے 8 بجے تک تم تیار ہو جانا۔ چلتے وقت تمہیں 5 ہزار روپیہ بھی دے دیا جائے گا And remember no tricks میں نے کہا آپ مطمئن رہیں۔ میری طرف سے کوئی ایسی حرکت نہ ہوگی۔ میں نے انہیں کہا کہ گرمی بہت زیادہ ہے اور سیل میں صابن نہیں ہے۔ مزید براں مہربانی کریں تو ایک برش، ٹوتھ پیسٹ، کنگھی اور شیشہ بھی بھجوا دیں، تاکہ Contact کے سامنے جب میں جاؤں تو بالکل نارمل لگوں۔ ٹیم کے سربراہ نے کہا۔ بہت اچھا۔ یہ سب چیزیں تمہیں کل شام تمہارے لباس کے ساتھ ہی مل جائیں گی۔ ٹیم کا ایک ممبر جو اپنے دشمنی کے جذبات پر قابو نہ رکھ سکتا تھا بولا۔ کبھی نہ بھولنا کہ تمہاری کوئی حماقت اسے تمہاری زندگی کا آخری بار دانت صاف کرنا بھی بنا سکتی ہے۔ "I WILL" میں نے جواب دیا اور گارڈز مجھے سیل میں واپس لے گئے۔

اگلی شام گارڈز کے ہمراہ حجام بھی آ گیا۔ جس نے میری شیو بنائی۔ میری پینٹ، شرٹ، گھڑی، جوتے بھی مجھے واپس مل گئے۔ ایک سبز رومال، کنگھی شیشہ، صابن، ٹوتھ پیسٹ اور برش بھی مجھے دیا گیا۔ وہ رات میں نے زیادہ جاگ کر اور دعائیں مانگ کر گزاری۔ اگلی صبح 8 بجے تک میں روانگی کے لئے بالکل تیار ہو چکا تھا۔ گرفتاری کے بعد میں نے پہلی مرتبہ آئینہ دیکھا تھا، ان 14 روز میں میرا چہرہ آدھا نہیں رہا تھا۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے۔ یہ تو ابھی ''آغاز سفر'' تھا۔

فرار کی پہلی کوشش

مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میری یہ تیاری بالکل اس دنبہ جیسی تھی جسے قربانی سے پہلے بنایا سنوارا جاتا ہے۔ ٹھیک 9 بجے گارڈز آ گئے اور میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر مجھے باہر لے گئے۔ تقریباً سو قدم کے فاصلے پر مجھے ایک گاڑی میں بٹھا کر پٹی کھول دی گئی یہ بالکل بند گاڑی تھی جس کی چھت پر بلب جل رہا تھا۔ لاری میں میرے ساتھ سویلین لباس میں دو گارڈز بیٹھے تھے جن کی قمیصوں کے اندر سے ریوالور جھانک رہے تھے۔ پون گھنٹہ چلنے کے بعد گاڑی رکی۔ باہر کا دروازہ کھلا۔ پہلے گارڈز نیچے اترے اور پھر مجھے نیچے اترنے کا کہا گیا۔ گاڑی میں سوار ہونے کے بعد ایک گارڈ نے مجھے نوٹوں کی ایک گڈی تھمائی اور کہا کہ ''یہ 5 ہزار ہیں'' گڈی میں نے پینٹ کی جیب میں ڈال دی تھی جس سے جیب خاصی پھول گئی۔ گاڑی بند ہونے کی وجہ سے ہم تینوں پسینے میں شرابور ہو رہے تھے۔ گاڑی سے نیچے اترتے ہوئے وہ گڈی میری جیب سے نکل کر نیچے گر پڑی۔ میں اسے اٹھانے کے لئے نیچے جھکا اور جونہی سیدھا ہوا تو دیکھا کہ دونوں گارڈز مجھ سے 15 قدم سے زیادہ دور جا چکے ہیں۔ اب میں تفویض کیا کام دکھانے کے لئے ''آزاد'' تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ بالوں کے فوجی کٹ والے سویلین لباس پہنے ہوئے بیسیوں افراد نے مجھے ایک وسیع حصار میں لے رکھا تھا۔ میں پلیٹ فارم کی جانب چلا۔ پلیٹ فارم کے اندر بھی داخلے کے دروازے پر دونوں طرف سے اس طرح کے لوگ دکھائی دیئے۔ میں نے سست روی سے اوور ہیڈ برج کی طرف بڑھنا شروع کیا Contact سے ملنا تو فرضی کہانی تھی۔ میں تو اپنے فرار کیلئے لوپ ہول Loophole تلاش کر رہا تھا۔ اور ہیڈ برج کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں نے دانستہ لنگڑانا شروع کر دیا اور پل کی ریلنگ کو تھام کر آہستہ آہستہ اوپر جانے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت سینکڑوں نگاہیں مجھ پر مرکوز ہوں گی۔ برج پر لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ پل کے تقریباً درمیان میں پہنچ کر میں ریلنگ کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ پل کے دونوں طرف DMI کے آدمی نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے اتنا مکمل انتظام کیا ہوا تھا کہ لوپ لائنوں پر کھڑے خالی چھکڑوں پر بھی ان کے آدمی کھڑے تھے۔ کچھ دیر پل کے اوپر انتظار کرنے کے بعد میں نے پل کی دوسری جانب چلنا شروع کیا۔ اس طرف سیڑھیاں ابھی آدھی ہی اترا ہوں گا کہ نیچے سے تین آدمی چھلانگیں مارتے میری طرف آئے۔ ایک سرگوشی میں بولا، اس طرف نیچے جانے کی اجازت نہیں، میں نے اسے کہا کہ پل سے اتر کر سڑک پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ کہیں مطلوبہ آدمی آپ لوگوں کے فوجی کٹ بال دیکھ کر واپس ہی نہ چلا جائے۔ وہ تذبذب میں پڑ گئے اور میں نے نیچے اترنا شروع کر دیا۔ پل سے اتر کر میں دس پندرہ منٹ سڑک کے دونوں اطراف دیکھتا رہا۔ اس دوران تین ٹرک سڑک پر سبزی منڈی کو جاتے دکھائی دیئے۔ سڑک تنگ تھی اور لوپ لائنوں کے بالمقابل آتی ہوئی پل کے بالکل قریب سے 45 درجے کا زاویہ بناتے ہوئے سبزی منڈی کی مین روڈ سے جا ملتی تھی۔ اس موڑ پر ٹرک آ کر اپنی رفتار بہت آہستہ کر لیتے تھے۔ DMI کی گاڑیاں دونوں طرف پلیٹ فارم کی جانب کھڑی تھیں کیونکہ اس طرف پارکنگ کی کوئی جگہ نہ تھی۔ مجھے بھاگنے کا ایک ہی راستہ دکھائی دیتا تھا کہ کسی ٹرک کے پیچھے لٹکتی زنجیروں کو تھام کر مین روڈ تک پہنچ جاؤں، اور وہاں کے رش میں گم ہو جاؤں۔ میں اس وقت بھی یہ کوشش کر سکتا تھا لیکن دشواری یہ تھی کہ تینوں پہرے دار سائے کی طرح میرے بالکل پیچھے کھڑے تھے۔ ان کے اس قدر قریب ہوتے ہوئے میرے لئے اس طرح بھاگ نکلنا ناممکن تھا۔ میں نے چند منٹ مزید اپنے منصوبے کا جائزہ لیا اور واپس پل کی سیڑھیوں کی جانب چل پڑا۔ 15 منٹ سے زیادہ میں نے پل کراس کرنے میں لگا دیئے۔ پلیٹ فارم پر آ کر میں نے ''ہندو مسلم پانی'' کے مسلم گھڑوں سے پانی پیا۔ بک اسٹال پر کچھ رسالوں کی ورق گردانی کی۔ پھر پلیٹ فارم پر ایک جانب سے دوسری جانب ٹہلنا شروع کر دیا۔ جب گیارہ سے چند منٹ اوپر ہو گئے تو میں نے کلائی سے سبز رومال اتار کر جیب میں رکھ دیا اور پلیٹ فارم کے باہر آ گیا۔ میرے باہر نکلتے ہی دو آدمی گاڑیوں کی طرف گئے اور بند گاڑی لے کر آ گئے۔ انہوں نے دروازہ کھولا۔ میں گاڑی میں بیٹھ گیا۔ وہ دونوں بھی میرے ساتھ بیٹھ گئے۔ جب میری آنکھوں پر پٹی باندھنے لگے تو میں نے انہیں کہا کہ آپ تفتیشی ٹیم کے انچارج کو کہہ دیں کہ آج میں ان سے لازماً ملنا چاہتا ہوں۔

غازی

سیل میں مجھے چھوڑ کر وہ دونوں چلے گئے۔ رات تقریباً دس بجے تفتیشی ٹیم کا انچارج میرے سیل میں آیا۔ میں نے اسے پانچ ہزار روپے اور اپنی گھڑی واپس دی اور کہا کہ اگر آپ نے اپنے فوجی ہیر کٹ والے آدمی چاروں طرف پھیلا دیئے ہیں تو پھر 22 جون کو جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میرا Contact کوئی احمق نہیں ہے جو فوجی کٹ کے اتنے لوگوں کو دیکھ کر چونک نہ جائے۔ نہ معلوم آج بھی وہ آیا ہو اور خطرے کی بو سونگھ کر واپس چلا گیا ہو۔ اب میرے پاس صرف 22 جون کا موقع ہے کہ Contact کو پکڑوا سکوں۔ لیکن اس کے لئے آپ کو اپنے آدمیوں کو ایک تو کم کرنا چاہئے اور دوسرے انہیں کہیں کہ مجھ سے دور دور رہیں۔ پلیٹ فارم سے بھاگنے کے امکانی 4 راستے ہیں۔ ایک گھنٹہ چوک کی طرف، دوسرا اور تیسرا پلیٹ فارم کی دونوں جانب اور چوتھا سبزی منڈی والی سڑک۔ اگر آپ کو مجھ پر یقین نہیں ہے تو ان چاروں رستوں پر اپنے آدمی کھڑے کر دیں لیکن مجھ سے خاصے فاصلے پر ریلوے کے مال کے چھکڑوں پر بھی آپ کے آدمی کھڑے تھے۔ اور مجھے پلیٹ فارم کے عین سامنے آپ کی بند گاڑی سے اتارا گیا۔ اگر میرا Contact اس وقت پلیٹ فارم کے گیٹ پر کھڑا ہوتا تو کیا آپ توقع کر سکتے تھے کہ وہ مجھ سے ملتا یا فوراً ہی غائب ہو جاتا۔ ٹیم کا انچارج میری ساری باتیں خاموشی سے سنتا رہا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولا ٹھیک ہے پرسوں تمہیں آدھے رستے سے ہی ٹیکسی میں بٹھا دیا جائے گا جس کا ڈرائیور ہمارا اپنا آدمی ہوگا۔ ہمارے نگرانی کرنے والے پوشیدہ جگہوں پر کھڑے ہوں گے اور تمہیں پلیٹ فارم، اوور برج اور سڑک پر جانے کی بھی اجازت ہوگی۔ تمہارا پیچھا صرف ایک دو افراد ہی کریں گے جن کے ہیر کٹ فوجی نہیں ہوں گے۔ البتہ یہ خیال رکھنا کہ آج کے مقابلے میں دوگنی فورس ان تمام رستوں پر مامور ہوگی جن سے فرار ممکن ہے۔ اپنی ٹیم کے ممبران کی مرضی کے خلاف میں تمہارے ساتھ خاص رعایت برت رہا ہوں۔ اگر تم نے میری رعایت کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تو پھر تم خود حالات کے ذمہ دار ہوگے۔ جتنے تحمل اور بردباری سے ہم نے تمہیں اتنی مہلت دی ہے۔ اتنی ہی زیادہ تمہیں اذیت دی جائے گی۔ میں اس کی باتیں سن کر خاموش اور مستقبل سے مایوس سا ہو گیا۔ اٹھتے وقت اس نے پرسوں ساڑھے آٹھ بجے صبح تیار رہنے کی ہدایت کی اور مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا Hope for best اور چلا گیا۔ شاید اس نے میرے چہرے پر مایوسی کے تاثرات پڑھ لئے تھے۔

میری وہ رات اور اگلا دن بہت بے چینی میں گزرا۔ فرار میں کامیابی کے بہت کم چانسز (Chances) تھے۔ میں زیادہ سے زیادہ دس پندرہ منٹ چل کے دوسری جانب سڑک کے کنارے گزر سکتا تھا، اس دوران کسی ٹرک کا اس سڑک پر آنا اور میرا نگرانوں کا حصار توڑ کر ٹرک کے پیچھے لٹکنا اور مین روڈ پر ٹرک کو چھوڑ کر عوام کے رش میں غائب ہو جانا اور اس تمام عمل کے دوران نگرانوں کا مجھے پکڑنے میں کامیاب نہ ہونا کسی من گھڑت افسانے میں کسی سپر مین (Super Man) کے لئے تو بہت معمولی سی بات ہے لیکن ایک نارمل انسان کے لئے عملی طور پر اس کامیابی کے بہت ہی کم مواقع تھے۔ 22 جون میری دانست میں میرے لئے آخری موقعہ تھا جس میں کامیابی کا صرف 5 فیصد اور نگرانوں کی گولیوں سے مرنے اور تشدد سے بچنے کا 95 فیصد چانس تھا اور اسی لئے میں اس موقع کو گنوانا ہرگز نہ چاہتا تھا۔ گرفتاری کے باعث پاکستان کے لئے اس وجہ سے بھی بیکار ہو چکا تھا کہ مزید کوئی مشن نہ کر سکتا تھا میری درجنوں تصویریں اتاری جا چکی تھیں۔ میری Cover story ختم ہو چکی تھی اور میں اپنے محکمے کے لئے ایک عضو بیکار بن چکا تھا۔

ایک کانٹا چبھنے کی مجھے بھی اتنی ہی تکلیف ہوتی تھی جتنی کسی دوسرے انسان کو اور تفتیشی ٹیم کے رویئے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ میری زبان کھلوانے کیلئے تشدد کا سلسلہ شروع کرنے والے تھے جس میں مجھے میجر احسن شہید کی طرح تیز تشدد (Fast Torture) کے ذریعے جلد موت (Quick Death) نہ ملتی۔ میجر احسن کی شہادت اس کی کامیابی اور DMI کی ناکامی تھی۔ اب DMI والوں نے مجھے زندہ رکھ کر تشدد کا ہر وہ حربہ اپنانا تھا جس کے باعث میں اپنی زبان کھولنے پر مجبور ہو جاتا۔ فرار کے منصوبے میں ناکامی کی صورت میں نگرانوں نے مجھے وہیں گولیاں مار کر ہلاک کر دینا تھا، دونوں صورتیں میرے لئے ذریعہ نجات تھیں۔ میں اپنی موت کو آخری تحفہ سمجھ کر اپنے وطن عزیز کو پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس رات کا خاصہ حصہ عبادت کرنے میں گزارا۔ رات کو کھانے کے ساتھ ہی میرا لباس، جوتے، گھڑی اور سبز رومال وغیرہ مجھے بھیج دیئے گئے تھے، صبح میں وقت سے پہلے ہی تیار ہو گیا۔ 9 بجے گارڈز مجھے لینے کے لئے آ گئے۔ آنکھوں پر پٹی باندھ کر مجھے بند گاڑی میں بٹھایا گیا۔ کچھ دیر چلنے کے بعد گاڑی رکی میری آنکھوں سے پٹی ہٹا دی گئی تھی، مجھے 5 ہزار کی گڈی بھی دے دی گئی، یہ نئی دہلی میں جمن پتا کا علاقہ تھا۔ بند گاڑی ایک ٹیکسی کے قریب رکی تھی۔ مجھے ٹیکسی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کو کہا گیا، اگلی اور پچھلی سیٹوں کے درمیان پائیدان پر ایک منحنی سا شخص لیٹا ہوا تھا۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے مجھ پر پسٹل تان لیا اور اگلی سیٹ کے فرش میں جڑی ایک زنجیر کا ہتھکڑی جیسا کڑا میری ایک ٹانگ میں ڈال کر اسے بند کر دیا اور ٹیکسی سبزی منڈی اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگئی، ٹیکسی سے کچھ آگے ایک گاڑی جا رہی تھی جدھر جدھر وہ گاڑی مڑتی ٹیکسی بھی اس کا پیچھا کرتی، ٹیکسی اور اس گاڑی کی رفتار بھی ایک ہی تھی یقیناً وہ گاڑی DMI کی تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھنا چاہا تو فرش پر لیٹے آدمی نے مجھ سے کہا ''سامنے دیکھو'' اپنی ذہنی کیفیت تو میں اوپر کی سطور میں بیان کر چکا ہوں کہ میں خود اپنی موت کے اسباب کرنے جا رہا تھا، میں نے اس شخص کو کہا میں پیچھے دیکھوں گا اور ہر طرف دیکھوں گا تم میں ہمت ہو تو گولی چلا دو۔ یہ کہہ کر میں انجام سے لاپروا پیچھے دیکھنے لگ گیا۔ وہ بھلا مجھ پر ان حالات میں گولی کیسے چلا سکتا تھا۔ منہ ہی منہ میں دو چار گالیاں بک کر چپ ہو رہا۔ ہماری ٹیکسی کے پیچھے دو پرائیویٹ کاریں مسلسل ہمارے تعاقب میں تھیں۔ ان میں بھی یقیناً DMI کے آدمی ہوں گے۔ میں دل ہی دل میں اپنی زندگی کے اس پہلے اور آخری پروٹوکول کو دیکھ کر ہنس پڑا۔ میں اتنا اہم تو تھا کہ 3 گاڑیاں میری ''حفاظت'' کے لئے آگے پیچھے چل رہی تھیں اور اسٹیشن پر بھی یقیناً درجنوں افراد میرے ''استقبال'' کے لئے پہلے سے ہی میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اگر آگے اور پیچھے تین حفاظتی گاڑیاں نہ ہوتیں تو میرے لئے بڑا آسان تھا کہ لیٹے ہوئے آدمی سے پسٹل چھین کر کڑے کی چابی جو یقیناً اس شخص یا ڈرائیور کے پاس تھی حاصل کرتا اور خود کو آزاد کرا لیتا۔ یہ ساری کارروائی میں صرف 2 منٹ میں مکمل کر سکتا تھا لیکن ریوالور چھیننے کے دوران ہی ڈرائیور نے گاڑی روک دینی تھی اور گاڑی کے رکتے ہی حفاظتی گاڑیوں سے نکل کر مسلح افراد نے مجھے گھیرے میں لے لینا تھا اور اس طرح میں ٹیکسی میں کڑے سے بندھا ہوا ہی ان کے قابو میں آ جاتا۔ بفرض محال میں پسٹل سے ان پر فائر بھی کرتا تو لیٹے ہوئے آدمی اور ڈرائیور پر دو گولیاں چلانے کے بعد پسٹل میں صرف 5 گولیاں باقی رہتیں اور نگرانی کرنے والے مجھے ہلاک کرنے کے بجائے ٹیکسی میں ہی مجھ پر قابو پا لیتے۔ میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ ذہنی تناؤ کے باعث میں فوری طور پر اس منصوبے پر عمل کرنے سے قاصر رہا یا ابھی قدرت کو ہی منظور نہ تھا کہ مجھے رتبہ شہادت سے نوازتی اور ابھی کڑے امتحانوں سے گزرنا میرا مقدر تھا۔

سبزی منڈی اسٹیشن کی کار پارکنگ میں ٹیکسی جا کر رکی لیکن مجھے کڑے سے اس وقت تک آزاد نہ کیا گیا جب تک کہ تینوں حفاظتی گاڑیاں بھی پارکنگ میں جا کر رک نہ گئیں اور ان میں سے بارہ تیرہ افراد نکل کر مختلف اطراف میں پھیل نہ گئے۔ کڑے کی چابی ڈرائیور کے پاس تھی۔ میں ٹیکسی سے نکلا اور آہستہ آہستہ قدموں سے پلیٹ فارم کی جانب چل پڑا۔ میں نے کئی بار دائیں بائیں اور پلیٹ فارم کی سیڑھیوں پر جوتے کے تسمے باندھنے کے بہانے جھک کر پیچھے دیکھا۔ نگران مختلف جگہوں پر خود کو چھپا چکے تھے۔ وہ شاید اس انتظار میں تھے کہ میں پلیٹ فارم کے اندر چلا جاؤں تو وہ ایک ایک کر کے اپنے لئے پہلے سے مخصوص جگہوں پر چلے جائیں۔ پلیٹ فارم کے اندر بھی مجھے فوجی ہیر کٹ والے لوگ دکھائی نہ دیئے۔ میں بہت ہی آہستگی سے اوور ہیڈ برج کی طرف بڑھنے لگا۔ پلیٹ فارم پر بک اسٹال اور چائے کے اسٹال پر یونہی کھڑے میں نے چھ سات لوگوں کو دیکھا جو میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے کچھ آگے بڑھ کر اچانک واپس چلنا شروع کیا تو ان کی نگاہیں میرا تعاقب کر رہی تھیں۔ یہ لوگ یقیناً DMI کے فیلڈ ایجنٹ تھے۔ نچلے رینکس کے ان لوگوں کو جتنا بھی سمجھایا جائے یہ اپنی کسی نہ کسی حماقت سے خود کو ظاہر کر دیتے ہیں۔ میں نے ''مسلم پانی'' کے مٹکوں سے پانی پیا اور پھر پل کی طرف چل دیا۔ پل کے دوسری طرف کی سیڑھیاں اترنے تک میں نے تقریباً 16 ایسے آدمی مارک (Mark) کئے۔ جو بلاوجہ وہاں موجود اور مجھ پر نظریں گاڑے ہوئے تھے۔ چند منٹ میں نے سڑک کے موڑ پر کھڑے ہو کر سڑک کا جائزہ لیا۔ سڑک پر دونوں اطراف چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں اور ان پر بھی ''گاہک'' کھڑے تھے۔ جو سامان خریدنے کے بجائے میری طرف متوجہ تھے۔ میں واپس پلٹا اور پل کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ میرے بیان کے مطابق Contact نے مجھے پل یا پلیٹ فارم پر ملنا تھا۔ پل کے اوپر نگرانی کرنے والے جوں کے توں کھڑے تھے۔ کم تعلیم یافتہ یہ سپاہی یا حوالدار تک کے عہدے کے لوگ صرف آرڈر کی تعمیل پر ہی حرکت بھی کرتے ہیں۔ میری نگرانی کرنے کے احکام پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے ایک لمحے کو بھی اپنی نظریں مجھ پر سے نہ ہٹائی تھیں 22 جون کو آگ برساتے سورج کے نیچے یہ پل پر ایسے کھڑے تھے جیسے مجسمے ہوں۔ صرف ان کی نگاہیں میرے تعاقب میں ادھر سے ادھر ہو رہی تھیں۔ میں پلیٹ فارم پر آ گیا۔ چائے کے اسٹال اور بک اسٹال پر وہی لوگ موجود تھے۔ میں بک اسٹال پر کھڑے ایک شخص کے پاس پہنچا اور سرگوشی میں اسے کہا کہ مجھے ٹوائلٹ جانے کی ضرورت ہے، میرے ساتھ ویٹنگ روم تک چلو۔ وہ حیران و پریشان میری طرف منہ پھاڑے دیکھنے لگا۔ میں نے اسے کہا کہ اگر تم میرے ساتھ نہ گئے تو تمہارے افسر تم سے بہت ناراض ہوں گے کہ تم نگرانی کیلئے میرے کہنے کے باوجود میرے ساتھ نہیں گئے۔ میں اسے یہ کہہ کر ویٹنگ روم کی طرف چل پڑا۔ چند قدم چل کر میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ اور اس کے ساتھ کھڑا دوسرا آدمی میرے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ میں ویٹنگ روم میں گیا اور چند منٹ بعد فارغ ہو کر ویٹنگ روم سے باہر آ گیا۔ یہ دونوں نگراں ویٹنگ روم میں کھڑے تھے، میرے باہر آنے کے ساتھ ہی وہ بھی باہر آ گئے۔ میں بک اسٹال پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ جب وہ اسٹال پر پہنچے تو میں نے انہیں کہا کہ اب پہلے کی طرح یہیں کھڑے رہو۔ یہ کہہ کر میں پھر پل کی جانب بڑھ گیا۔ پل کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں نے پلٹ کر دیکھا تو بک اسٹال پر کھڑے دونوں نگراں اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ اس آپریشن کو مانیٹر کرنے والے یقیناً اسٹیشن ماسٹر کے دفتر میں موجود تھے۔ میں نے پل کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے فیصلہ کیا کہ اس بار لازماً فرار کی کوشش کروں گا، وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ اب ساڑھے دس سے بھی چند منٹ اوپر ہو چکے تھے اور گیارہ بجے تک انہوں نے مجھے واپس لے جانا تھا۔

میں پل کی دوسری جانب سڑک کے موڑ پر آ گیا۔ میں نے سوچا کہ اب وقت آ چکا ہے بجائے نگرانوں کے کھوج میں دماغ کو ادھر ادھر بھٹکانے کے اپنی پوری توجہ فرار پر مرتکز رکھوں، اب مجھے مین روڈ کی طرف جانے والے ٹرک کی تلاش تھی، چند منٹ بعد ہی ایک ٹرک دور سے آتا دکھائی دیا۔ میں نے نگرانوں کی توجہ ہٹانے کے لئے پل کی جانب چلنا شروع کیا۔ میں نے سوچا تھا کہ ٹرک کے موڑ تک پہنچنے اور رفتار کم کرنے تک پل کی صرف تین یا چار سیڑھیاں چڑھوں گا۔ میرا رخ پلیٹ فارم کی طرف دیکھ کر نگران اسی جانب متوجہ ہو جائیں گے۔ میں یکبار پلٹ کر بھاگوں گا اور ٹرک کے پیچھے لٹک جاؤں گا۔ ٹرک مین روڈ پر پہنچے گا تو یقیناً مین روڈ پر داخل ہونے کیلئے دونوں جانب آتی جاتی ٹریفک میں اپنا راستہ بنانے کیلئے رکے گا یا آہستہ ہو جائے گا اور میں ٹرک سے کود کر مین روڈ کی بائیں جانب بھاگوں گا اور سڑک کی دوسری جانب کی گلیوں میں غائب ہونے کی کوشش کروں گا۔

ٹرک قریب آیا تو میں یکبارگی پلٹا اور تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے ٹرک کے قریب پہنچ گیا اس ٹرک کے پیچھے زنجیریں لٹکی ہوئی تھیں۔ میں نے سڑک کے عقبی کھلنے والے تختے کو اچھل کر دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے تھام لیا ٹرک اس دوران موڑ کاٹ کر اپنی رفتار بڑھا چکا تھا۔ یہ سارا عمل تیس سیکنڈ سے بھی کم وقت میں پورا ہوا۔ میرے اس غیر متوقع اقدام سے نگران اتنے حواس باختہ ہو چکے تھے کہ کوئی ردعمل نہ کر سکے۔ ٹرک مین روڈ پر پہنچنے کے قریب تھا کہ مجھے سیٹیاں بجنے کے ساتھ ساتھ پستول کی گولیاں چلنے کی آوازیں آئیں۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا تو پل کے پاس کھڑے نگرانوں کے علاوہ سڑک پر گاہکوں کے روپ میں کھڑے نگران بھی دوڑ رہے تھے۔ مین روڈ آتے ہی ٹرک آہستہ ہوا تو میں نے ٹرک سے چھلانگ لگائی اور مین روڈ پر بائیں جانب بھاگنا شروع کر دیا۔ تفتیشی کمرے میں جسم پر جو تشدد کیا گیا تھا، ان چوٹوں کا درد مجھے بھاگتے ہوئے اپنی ٹانگوں میں محسوس ہوا۔ میرا پیچھا کرنے والے مین روڈ تک پہنچ چکے تھے اور میرے لئے تیز بھاگنا مشکل ہو رہا تھا۔ مین روڈ پر ایک پیپل کا درخت تھا۔ ایک لمحے کو وہاں رک کر میں نے پلٹ کر دیکھا تو نگران تو نظر نہ آئے البتہ دو گاڑیاں بڑی تیزی سے میری طرف بڑھ رہی تھیں۔ میں نے ٹریفک سے بھری سڑک کو اتنی تیزی سے کراس کیا کہ کئی گاڑیوں کو ایمرجنسی بریک لگانی پڑیں۔ سڑک کے دوسری جانب پہنچتے ہی میں نے فٹ پاتھ پر آگے دوڑنا شروع کیا۔ میری طرف آنے والی گاڑیاں سڑک کے بائیں جانب تھیں جبکہ میں سڑک کے دائیں جانب آگے بھاگ رہا تھا۔ پچاس قدم کے فاصلے پر میں نے اپنی طرف آنے والی ایک پرائیویٹ گاڑی کو فٹ پاتھ کے ساتھ رکتے دیکھا۔ اگرچہ میرے منصوبے میں یہ بات شامل نہ تھی۔ لیکن حالات کو دیکھتے ہوئے میں نے سوچا کہ اگر میں یہ گاڑی چھین لوں تو تعاقب کرنے والی گاڑیوں کے الٹی جانب بھگا کر لے جاؤں گا، ٹریفک کے رش میں تعاقب کرنے والی گاڑیاں یوٹرن (u-tern) لینے میں لامحالہ کچھ وقت صرف کریں گی اور اس دوران میں ان کی پہنچ سے دور نکل چکا ہوں گا۔ میں نے اپنے بھاگنے کی رفتار بڑھائی۔ سڑک کی دوسری جانب تعاقب کرنے والی گاڑیاں میرے بالکل متوازی پہنچ چکی تھیں۔ پرائیویٹ گاڑی کا ڈرائیور گاڑی سے نکل رہا تھا کہ اس کے سر پر پہنچ گیا۔ ہتھیار تو میرے پاس کوئی نہ تھا۔ میں نے اس کی کنپٹی پر ہاتھ کی زوردار ضرب لگائی۔ وہ لڑکھڑا کر سڑک پر گر گیا، اس کے ہاتھ سے چابی چھین کر میں گاڑی میں داخل ہو ہی رہا تھا کہ مجھے فائر کی آواز کے ساتھ ساتھ اپنی دائیں پنڈلی میں گولی لگنے کا احساس ہوا۔ پنڈلی کے درمیانی حصے میں محسوس ہوتا تھا کہ کسی نے دہکتے کوئلے رکھ دیئے ہوں۔ میں نے چابی انگنیشن میں ڈالی اور گاڑی اسٹارٹ کر لی۔ گاڑی کو سڑک پر ڈالتے ہوئے میں نے دیکھا کہ نگرانوں کی گاڑیوں میں نکلے ہوئے دو افراد سڑک کو آدھا کراس کر چکے تھے اور جونہی ان کے سامنے ٹریفک ہٹتی وہ مجھ پر فائر کر دیتے۔ گاڑی کی باڈی کے اگلے حصے پر پانچ چھ گولیاں ضرور لگی ہوں گی۔ غالباً وہ پوری سڑک اس لئے کراس نہیں کر رہے تھے کیونکہ انہوں نے مجھے گاڑی چھینتے اور اس میں بیٹھتے دیکھ لیا تھا۔ میں نے گاڑی پوری رفتار سے چلا دی اور پل والی سڑک سے بھی کافی آگے نکل آیا۔ مجھے اپنے فرار میں کامیابی کا یقین ہو چلا تھا۔ میری دائیں پنڈلی سے خون مسلسل بہہ رہا تھا۔ لیکن ان حالات میں اس طرف دھیان دینے کا وقت نہ تھا Back view mirror میں دیکھا کہ نگرانوں کی دو گاڑیوں سے مختلف دو اور گاڑیاں انتہائی تیز رفتاری سے دائیں بائیں ہوتی اور ٹریفک کو چیرتی میری گاڑی کے قریب آ رہی تھیں۔ میں نے پورا ایکسی لیٹر دبا دیا لیکن بھارت کی بنی ہوئی اس ہندوستان نامی گاڑی کی رفتار نہ بڑھ سکی۔ میرا پیچھا کرنے والی دونوں گاڑیاں اب بالکل میرے پیچھے تھیں اور ہمارے درمیان اب کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ ان گاڑیوں سے غالباً رائفل برداروں نے فائر کھول دیئے اور چند ہی لمحوں میں گاڑی کے دونوں پچھلے ٹائر یکے بعد دیگرے برسٹ ہو گئے۔ گاڑی لڑکھڑائی لیکن میں نے اسٹیرنگ پر قابو رکھ کر اسے الٹنے سے بچا لیا۔ ٹائر پھٹنے کی وجہ سے رفتار خود بخود کم ہو چکی تھی۔ میں نے بریک لگا کر گاڑی کو روکا اور اسٹیرنگ پر سر رکھ دیا۔ میری کامیابی منزل کو چھوتے چھوتے ناکامی میں بدل چکی تھی۔ تفتیشی ٹیم نے میرے وہم گمان سے بھی زیادہ حفاظتی اقدام کر رکھے تھے۔ پل والی سڑک جہاں مین روڈ سے ملتی تھی۔ وہاں سڑک کے دونوں اطراف مسلح نگرانوں سے بھری دو گاڑیاں ایک دوسرے سے مخالف سمتوں میں کھڑی تھیں جن کا آپس میں اور اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں مانیٹرنگ ٹیم سے رابطہ تھا۔ پیچھا کرنے والی ایک گاڑی میری گاڑی کے آگے اور دوسری سائیڈ میں رک گئی۔ مجھے کھینچ کر باہر نکالا گیا۔ انتہائی تیزی سے میری تلاشی لی گئی اور مجھے سائیڈ والی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر دھکیل دیا گیا۔ میری دونوں جانب دو گارڈز بیٹھ گئے جنہوں نے میرے ہاتھ پشت پر باندھے اور آنکھوں پر پٹی باندھی۔ اگلی سیٹ پر ان کا کوئی افسر بیٹھا تھا جو واکی ٹاکی پر کہنے لگا سر ہم نے اسے گرفتار کر لیا ہے۔ اس کے کہنے پر گارڈز نے میری جیب سے 5 ہزار کی گڈی اور کلائی سے گھڑی اتار لی۔ میری پنڈلی میں شدت سے درد ہو رہا تھا لیکن میں نے زبان کو دانتوں میں بھینچ کر آہ تک نہ بھری۔ میرا منصوبہ ناکام ہو چکا تھا اور میرے پاس اب خود کو حالات کے سپرد کرنے کے کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

منصوبے کی ناکامی کی مایوسی اور پنڈلی میں گولی لگنے کے درد سے میں نیم غنودگی کی حالت میں تھا۔ میری اس وقت کی حالت بالکل ویسی تھی جیسے کسی مجرم کو پھانسی کے تختے کی طرف جاتے وقت ہوتی ہوگی بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ۔ کیونکہ پھانسی پانے والا تو چند لمحوں میں ہر قسم کے دکھ درد سے آزاد ہو جاتا ہے جب کہ میرے اوپر ابھی تشدد کے پہاڑ توڑنے اور ظلم کے نئے نئے تجربات کئے جانے تھے۔

غازی

نا معلوم کس وقت گاڑی رکی مجھے کھینچ کر باہر نکالا گیا۔ تالہ کھلنے اور دروازہ کھولنے کی آواز آئی اور اتنی بے دردی سے دھکا دے کر مجھے پھینکا گیا کہ میرا سر سامنے کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ بغیر میری پٹی اتارے اور ہاتھ کھولے دروازہ بند کر دیا گیا۔ درد کی شدت سے مجھے بے حد پیاس لگ رہی تھی۔ میں نے دو تین بار پانی مانگا لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ میرے والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ بڑی سے بڑی مصیبت میں اگر کربلا کے شہیدوں کے دکھ اور تکالیف کو یاد کرو تو تمہیں اپنے دکھ اور تکالیف بہت پیچھے نظر آئیں گی۔ کربلا والوں نے تین دن بھوک اور پیاس میں گزارے تھے۔ جب کہ میں نے اپنی پیاس صرف ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے بجھائی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے دیوار سے ٹیک لگائی۔ ہاتھ پیچھے بندھے ہونے کی وجہ سے میں لیٹ نہ سکتا تھا ہاتھوں سے ٹٹول کر مجھے معلوم ہوا کہ میں اینٹوں کے فرش پر پڑا ہوں۔ پنکھا بھی کوئی نہ تھا۔ کمرہ تندور کی طرح تپ رہا تھا۔ نا معلوم میں کتنی دیر اسی حالت میں پڑا رہا۔ پنڈلی میں گولی لگنے کی وجہ سے میری ساری ٹانگ میں انتہائی درد ہو رہا تھا میں نے بڑی مشکل سے زخمی ٹانگ کو ہلایا اور اسے ایک دوبار فولڈ کیا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ گولی لگنے سے میری ٹانگ کے سامنے کا گوشت اور ہڈی کا کچھ حصہ ٹوٹ کر علیحدہ ہو چکا تھا لیکن ٹانگ کی ہڈی پوری طرح ٹوٹنے سے بچ گئی تھی۔ میں نے کروٹ کے بل لیٹنے کی کوشش کی تو ہاتھ بندھے ہونے کی وجہ سے بازو میرا وزن زیادہ دیر نہ سہار سکے۔ دیوار سے ٹیک لگانے میں ہی بہتری نظر آئی ٹانگ کے زخم سے بہتے خون کو کسی حد تک روکنے کیلئے میں نے اس ٹانگ کو فولڈ کر لیا مجھ پر غنودگی طاری ہوتی جا رہی تھی میں نے بھی اسی میں عافیت سمجھی یہ بھی اللہ پاک کا کرم ہے کہ غنودگی اور بے ہوشی کی حالت میں چاہے کچھ عرصہ کیلئے ہی دکھ درد کا احساس ختم ہو جاتا ہے نا معلوم میں کتنی دیر اسی حالت میں پڑا رہا کہ مجھے تین چار زوردار ٹھڈے مارے گئے۔ میں ہوش میں آ گیا مجھے کھڑا ہونے کو کہا گیا لیکن باوجود کوشش کے میں کھڑا نہ ہو سکا۔ اس جرم کی پاداش میں میرے چہرے اور جسم پر ٹھڈوں کی بارش کر دی گئی جب پھر بھی میں کھڑا نہ ہو سکا تو مجھے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کیا گیا اور مجھے دھکیلتے ہوئے کسی جانب لے گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ زخمی ٹانگ کی وجہ سے میں ایک قدم بھی نہ چل سکتا تھا۔ مجھے دھکیلا بھی جا رہا تھا اور گھسیٹا بھی جا رہا تھا۔ اسی حالت میں مجھے ایک دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا۔ کچھ دیر بعد ایک کرخت آواز آئی۔ ”کیا تم اپنے پہلے بیان میں کچھ تبدیلی یا اضافہ کرنا چاہتے ہو یا اسی پر قائم ہو“ میں نے جواب دیا ”میرا پہلا بیان ہی سچ پر مبنی تھا“۔ تم نے فرار ہونے کی کوشش کیوں کی؟ کیا تم سمجھتے تھے کہ اپنی اس احمقانہ کوشش میں کامیاب ہو سکو گے۔ ان کے اس سوال کا میں نے جواب دیا۔ ”فرار ہونے کی کوشش میرا حق تھا میں نے کوشش کی۔ ناکامی اور کامیابی تو بعد کی بات ہے“۔ میرا جواب سن کر وہ بھڑک اٹھے ”اب ہم اپنا حق استعمال کرتے ہیں“۔ میرے دونوں بازوؤں سے موٹا راڈ گزارا گیا۔ میرے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے اور آنکھوں پر پٹی تھی۔ اس لئے صرف محسوس ہی کر سکتا تھا راڈ کے دونوں سروں پر کنڈے اور ہک لگنے کی آواز آئی اور راڈ نے مجھے اوپر اٹھانا شروع کیا اور تھوڑی دیر ہی میں میرے دونوں پاؤں زمین سے اٹھ گئے۔ میرے جسم کا سارا بوجھ میری بغلوں اور کندھوں پر پڑ گیا۔ اوپر اٹھانے سے پہلے ایک مضبوط رسی میری کلائیوں کے گرد لپیٹ کر اسے میرے پیٹ پر کس کر باندھ دیا گیا تھا۔ میرے جسمانی وزن کی وجہ سے راڈ میری بغلوں پر پیٹھ کے اندر گھسا جا رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اس اذیت سے نکلنے والی چیخوں کو روک رکھا تھا اور ہر چیخ کو اللہ میں بدل کر منہ سے نکالتا تھا۔ راڈ کے دباؤ کی وجہ سے میرے پٹھے بے جان ہو رہے تھے۔ منہ سے صرف اللہ کی آواز آ رہی تھی۔ بت پرست اپنے درمیان اللہ کا نام سننے کی تاب بھلا کہاں رکھتے تھے۔ انہوں نے میری ٹانگوں پر ہنٹر مارنے شروع کر دیئے۔ چند لمحے بہت درد ہوا لیکن اللہ پاک کارساز ہے۔ میرا دماغ سن ہوتا چلا گیا اور لمحہ بہ لمحہ درد کا احساس کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گیا۔ میں بے ہوش ہو چکا تھا نہ معلوم کتنی دیر وہ میرے بے ہوش جسم کو ہی نشانہ ستم بناتے رہے۔

مجھے ہوش آیا تو میرے ہاتھ کھلے ہوئے تھے اور آنکھوں کی پٹی بھی اتر چکی تھی بڑی مشکل سے میں آنکھیں کھولنے کے قابل ہوا۔ میرے جسم کا ایک ایک حصہ درد سے پھٹ رہا تھا بڑی مشکل سے میں نے گردن گھما کر دونوں طرف دیکھا۔ یہ 8x10 فٹ کا سیل تھا۔ میں فرش پر پڑا تھا سامنے مضبوط سلاخوں والا بڑا دروازہ تھا اور برآمدے میں دو مسلح گارڈ اسٹولوں پر بیٹھے میری نگرانی کر رہے تھے۔ کمرے میں ایک کونے میں مٹی کا گھڑا اور پیالہ تھا۔ رفع حاجت کیلئے ٹوٹے ہوئے گھڑے کا نچلا حصہ دوسرے کونے میں پڑا تھا۔ دن ڈھلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے کچھ علم نہ تھا کہ تشدد والی رات کے بعد یہ اگلا دن تھا یا دوسرا دن میرے ٹانگ کے زخم پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ران کے جوڑ سے لے کر پاؤں تک زخم والی ٹانگ بری طرح سوجی ہوئی تھی۔ میں بڑی مشکل سے کھسکتا ہوا گھڑے تک پہنچا اور پانی پیا۔ زخمی ٹانگ سے خون بہت زیادہ بہہ چکا تھا۔ جمے ہوئے خون کے نشان فرش سے ہوتے ہوئے سیل کے دروازے کے باہر نالی تک چلے گئے تھے۔ اس سیل کے باہر کوئی چار دیواری نہ تھی سامنے کوئی 50 فٹ کے فاصلے پر (Toilets) ٹوائلٹس کی قطار تھی جس کے پیچھے ایک اونچی دیوار پر خاردار تاروں کی باڑھ لگی ہوئی تھی۔

پہرے داروں نے مجھے پانی پیتے ہوئے خاموشی سے دیکھا۔ میں گھسٹتا ہوا پھر سیل کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، میرے دونوں بازو راڈ کی وجہ سے بے جان ہو چکے تھے۔ میں نے بہت ہی دشواری سے گھڑے سے پانی نکالا تھا اور میں نے بازوؤں کو حرکت کے قابل بنانے کے لئے ہاتھوں کی مٹھیاں کھولنی شروع کیں تاکہ بے جان پٹھوں میں حرکت سے جان پڑ سکے۔ پانی پینے کے بعد مجھے پیشاب کی حاجت ہوئی۔ میں نے گارڈز کو کہا تو جواب ملا۔ دروازے کے ساتھ والی دیوار پر کر لو اور بعد میں پانی بہا دو میں نے بڑی مشکل سے یہ کام انجام دیا۔ پیشاب کے ساتھ خون بھی آیا۔ شاید میرے گردوں پر بھی انہوں نے طبع آزمائی کی تھی۔ شام ڈھلتے ہی دال اور روٹی پر مشتمل کھانا آ گیا۔ گارڈز نے اپنی اوقات دکھائی۔ دال کا پیالہ سلاخوں میں سے عین اس جگہ پر مجھے تھمایا۔ جہاں حاجت سے فارغ ہو کر میں نے پانی بہایا تھا اور روٹی بھی اسی جگہ سے تھماتے ہوئے جان بوجھ کر فرش پر گرا دی۔ دو چپاتیاں تھیں میں نے اوپر والی چپاتی کھائی اور نیچے والی دال کے پیالے کے ساتھ لوٹا دی۔ چپاتی کھاتے ہوئے مجھے ہر نوالہ چباتے ہوئے کرچ کرچ کی آواز آتی تھی (فرار کے بعد بمبئی میں مکمل میڈیکل چیک اپ سے معلوم ہوا کہ میری انتڑیوں اور معدے میں شیشے کے باریک ذرات چھپے ہوئے ہیں) رات کو پھر مجھے کلائیوں میں رسی اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر ٹارچر سیل میں لے جایا گیا۔ وہاں میری آنکھوں سے پٹی اتار دی گئی۔ زخمی ٹانگ کی وجہ سے میں بغیر سہارے کے کھڑا نہ ہو سکتا تھا۔ تفتیشی ٹیم کے افراد نئے تھے۔ ٹیم کے سربراہ نے مجھ سے پوچھا Do you want to say some thing (کیا تم کچھ کہنا چاہتے ہو) میں نے جواب دیا۔ Yes! you are swines (ہاں! تم سور کی اولاد ہو) میں چاہتا تھا کہ وہ اشتعال میں آ کر مجھ پر فوری سخت تشدد شروع کر دیں تاکہ میں جلد ہی بے ہوش ہو جاؤں اور تشدد کی تکلیف کے احساس سے بچ جاؤں۔ میری دی ہوئی گالی سن کر تفتیشی ٹیم کا ایک رکن کرسی سے اٹھنے لگا لیکن سربراہ نے اسے بٹھا دیا اور کہا Dont worry. we will give him a beter lesson (فکر نہ کرو۔ ہم اسے اچھا سبق پڑھائیں گے) اس کے کہنے پر گارڈز مجھے گھسیٹتے ہوئے ایک لمبی میز پر لے گئے۔ جس پر لٹا کر میرا جسم گردن سے پاؤں تک چمڑے کی پٹیوں سے اس طرح باندھ دیا گیا کہ میں ذرا سی بھی حرکت کے قابل نہ رہا۔ پھر میرے ایک کان کو گیلا کر کے ایک کلپ لگا دیا گیا جبکہ دوسرا کلپ میرے پوشیدہ عضو پر۔ یہ تھرڈ ڈگری ٹارچر تھا۔ جس کا مجھے نشانہ بنایا جانے والا تھا۔

ہٹلر کے پیروکار، نازی جرمنی کا ”سواستکار“ کے نشان کو پوجنے والے یہ بھارتی ہندو اپنے ظلم و ستم میں نازیوں سے بھی چند قدم آگے تھے۔ مجھے بجلی کے جھٹکے دینے کے لئے میرے جسم پر لگائے گئے دونوں کلپوں کو بجلی کی تاروں سے منسلک کر دیا گیا۔ جن کے دوسرے سرے ایک مشین (جسے غالباً Mango electric کہا جاتا ہے) میں لگے ہوئے تھے۔ اس مشین کے ہینڈل کو گھمانے سے 4 سو واٹ سے بھی زیادہ بجلی نہایت مختصر وقت اور وقفوں سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ مختصر وقت کے جھٹکے انسان کو ہلاک تو نہیں کرتے لیکن اتنے تکلیف دہ اور اذیت ناک ہوتے ہیں جسے قلم تحریر کرنے سے عاجز ہے۔ میرے منہ میں اکثر کپڑا ٹھونس دیا گیا۔ اور مشین کا ہینڈل گھمایا جانے لگا۔ اتنی ہائی وولٹیج کی بجلی سے میرے جسم کو وقفوں سے داغا جا رہا تھا۔ پہلے جھٹکے سے ہی مجھے ایسے محسوس ہوا کہ میرا کلیجہ اور دل میرے حلق میں آ گئے ہیں۔ انتہائی مضبوطی سے بندھے ہونے کے باوجود میرا جسم ہر جھٹکے سے پھڑ پھڑاتا اور کئی کئی انچ اس ٹیبل سے اچھلتا۔ مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ میرا دوران خون رک گیا ہے اور دل کی دھڑکن بند ہو چکی ہے۔ میری آنکھیں شدت تکلیف سے حلقوں سے باہر آ رہی تھیں اور دماغ کی نسیں پھٹ رہی تھیں۔ میری سانس رک رہی تھی۔ میں تشدد کے اس شدید ترین عذاب سے گزر رہا تھا جسے تحریر کرتے وقت آج بھی میرا جسم تھرا اٹھتا ہے۔ نا معلوم کتنی دیر مجھے بجلی کے جھٹکے دیئے جاتے رہے۔ کیونکہ جب مجھے ہوش آیا اور میں کچھ دیکھنے کے قابل ہوا تو میں اپنے Cell میں تھا اور سورج کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ بس دیکھ سکتا تھا لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کون ہوں، کہاں پر ہوں اور مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔ کافی وقت اس کیفیت میں گزر گیا۔ پھر آہستہ آہستہ حواس بحال ہونے لگے اور یادداشت جو بالکل ختم ہو چکی تھی لوٹ آئی۔ میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا جسم کے ایک ایک حصے میں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہزاروں سوئیاں چبھو دی گئی ہیں۔ میری آنکھوں کے پپوٹے بھی حرکت کرنے سے قاصر تھے۔ بھوک اور پیاس کا احساس ختم ہو چکا تھا۔ شام تک بڑی مشکل سے اس قابل ہو سکا کہ پانی کے گھڑے تک پہنچ کے پانی پی سکوں۔ میرے کلپ والے کان اور ناک سے خون نکل نکل کر جم چکا تھا۔ پانی پینے کے ساتھ ہی ابکائی آئی اور سارا پانی باہر آ گیا۔ میری جو کیفیت تھی میں اسے بیان کرنے سے عاجز ہوں۔ اسی حالت میں تھا کہ گارڈز نے Cell میں کھانا رکھ دیا۔ میں تو پانی بھی ہضم نہ کر سکتا تھا، کھانا کیسے کھاتا۔ ایک عجیب بات تھی کہ میری زخمی ٹانگ کا درد ختم ہو چکا تھا۔ مجھے یہی محسوس ہوا۔ حالانکہ حقیقت میں سارے جسم میں شدید درد کی لہریں ٹانگ کے درد پر حاوی ہو چکی تھی۔ نا معلوم کس وقت گارڈز آئے اور مجھے گھسیٹتے ہوئے اسی عقوبت خانے میں لے گئے۔ ٹیم کے افراد مجھ سے کچھ پوچھ رہے تھے کیا پوچھ رہے تھے مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا میرے جواب نہ دینے پر مجھ پر ٹھڈوں کی بارش کر دی گئی لیکن شاید میرا جسم بے حس اور حواس مکمل بحال نہ ہونے کی وجہ سے مجھے بہت تھوڑا درد ہوا۔ کئی آدمی مجھے دونوں اطراف سے ٹھڈے مار رہے تھے اور میں لڑھکتا ہوا ادھر سے ادھر ہو رہا تھا۔ میری یہ حالت دیکھ کر کسی نے انہیں مزید تشدد سے روکا۔ نیم غنودگی کی حالت میں مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ کسی نے میرا بلڈ پریشر دیکھا۔ زخمی ٹانگ پر نئی پٹی لگائی اور تین انجیکشن دیئے۔ پھر مجھے ہوش نہ رہا۔

مجھے ہوش آیا تو اتنا اچانک تھا کہ میں ہڑبڑا گیا۔ کسی نے پانی کی پوری بالٹی مجھ پر انڈیل دی تھی۔ میں اٹھ تو نہ سکا لیکن دیکھ سکتا تھا کہ ایک گارڈ بالٹی لئے کھڑا اور سیل کے باہر تین آدمی کھڑے تھے۔ مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر ایک آدمی نے اشارہ کیا تو دو گارڈ سیل میں داخل ہوئے اور مجھے کھینچ کر دیوار کے ساتھ میری ٹیک لگا دی۔ ایک اور گارڈ سیل میں آیا اور چائے میں بسکٹ بھگو کر مجھے بسکٹ کھلائے اور چائے پلائی۔ اس کے بعد سویلین لباس پہنے دو آدمی سیل میں آئے انہوں نے میرا بلڈ پریشر چیک کیا۔ ٹانگ کے زخم کی پٹی بدلی پانی کے ساتھ چند گولیاں مجھے کھلائیں دو انجیکشن لگائے۔ ایک گارڈ نے سگریٹ جلا کر مجھے دیا۔ میں نے ایک ہی کش کھینچا تھا کہ شدید کھانسی کی وجہ سے دہرا ہو گیا۔ اس کے بعد دو تین گارڈز نے مجھے کھڑا کیا اور میری گرفتاری کے وقت پہنا ہوا لباس اتار کر سلیٹی قمیص اور پاجامہ جو پہلے سیل میں مجھے دیا گیا تھا، پہنا دیا۔ غالباً وہ ڈاکٹر تھا جس نے مجھ سے کچھ پوچھا، کچھ نہ سمجھ آنے کے باوجود میں نے بولنا چاہا تو زبان نے ساتھ نہ دیا اور میں تتلا کر رہ گیا (بجلی کے جھٹکوں کا مجھ پر اتنا شدید اثر ہوا تھا کہ آج 23 برس گزرنے کے بعد بھی میں بڑی مشکل سے اپنی ہکلاہٹ پر قابو پاتا ہوں اور میری بائیں آنکھ کا ڈھیلا (Eyeball) بھی بعض اوقات صحیح جگہ پر نہیں رہتا۔ مجھے دیکھنے اور خصوصاً تیسری ڈائمنشن (3rd Dimension) میں فاصلے کا اندازہ لگانے میں خاصی دقت ہوتی ہے۔

مجھ پر یہ مہربانی میری ہمدردی یا انسانیت کے جذبے کے تحت نہیں ہو رہی تھی بلکہ مجھے مزید تشدد سہنے کیلئے تیار کیا جا رہا تھا جس کا ثبوت آئندہ دنوں میں مل گیا۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا جب مجھے ہوش میں لایا گیا لیکن میں دن اور تاریخ سے بالکل بے خبر تھا اور نہ ہی مجھے معلوم تھا کہ کتنے گھنٹوں یا دنوں میں بے ہوش رہا تھا۔ رات کا کھانا مجھے اسی ذلالت کے ساتھ سلاخوں کے نیچے سے فرش کو چھوتا ہوا دیا گیا۔ مجھے یقین ہے کہ گارڈز اوپر کے حکم پر نہیں بلکہ مجھ پر محض مسلمان ہونے کی وجہ سے اپنی ازلی نفرت کا اس طرح اظہار کر رہے تھے۔

اس رات مجھے انٹروگیشن کیلئے نہیں لے جایا گیا۔ دوسرے روز دن کو ڈاکٹر پھر آیا۔ میری پٹی تبدیل کی۔ انجیکشن لگائے اور دوا کی گولیاں دیں۔ میری ٹانگ کا زخم آہستہ آہستہ مندمل ہو رہا تھا سوجن اور درد میں بھی کمی ہو گئی تھی۔ اس رات مجھے پھر تفتیشی عقوبت خانے میں لے جایا گیا۔ تفتیشی ٹیم کے سربراہ نے مجھ سے پوچھا ”اب کیسا محسوس کر رہے ہو“۔ میں نے جواب دیا کہ زندہ ہوں۔ اس نے کہا ”ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ زندہ رہو اور ہمارے سوالوں کے جواب دو“۔ میں خاموش ہو گیا۔ تفتیشی ٹیم کے کسی فرد کے اشارے پر چار پانچ گارڈز نے مجھے زمین پر لٹا کر دبوچ لیا۔ ایک گارڈ نے لوہے کے ایک چپٹے ٹکڑے سے میرا منہ کھولا اور منہ کھلا رکھنے کے لئے میرے تالو اور زبان کے درمیان کوئی چیز پھنسا دی۔ ربڑ کی ایک نلکی میرے منہ میں حلق تک ڈال دی گئی۔ اس نلکی کے دوسرے سرے پر انیما (جلاب) دینے والا سلنڈر نما برتن تھا۔ اس کے ذریعے بہت زیادہ صابن ملے ہوئے پانی کو دوبارہ میرے پیٹ میں داخل کیا گیا۔ اتنی زیادہ مقدار میں صابن ملے پانی نے میرے پیٹ کو آخری حدوں تک پھیلا دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرا پیٹ پھٹ جائے گا۔ انہوں نے بس نہ کیا بلکہ اور پانی میرے پیٹ میں ڈالنے لگے۔ اس دوران گارڈز نے زنجیر سے بندھے دو کڑے میری دونوں ٹانگوں میں ڈال دیئے تھے جب پانی میری باچھوں سے باہر بہنے لگا تو انہوں نے میرے منہ سے نلکی اور منہ کھلا رکھنے والا لوہے کا ٹکڑا نکال دیا پھر زنجیریں کھینچی گئیں اور میں ہوا میں الٹا معلق ہو گیا۔ منہ کے رستے سارا پانی اور تھوڑی سی کھائی ہوئی غذا نکل گئی۔ اس رات میرے ساتھ یہ عمل دو مرتبہ دہرایا گیا۔ پانی میں نا معلوم کیا ڈالا گیا تھا پانی نکلنے کے بعد میرے پیٹ میں آگ سی لگ گئی۔ اس آگ کی اتنی زیادہ تکلیف تھی کہ میں تڑپنے لگا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرے پیٹ میں ہزاروں سوئیاں چبھو دی گئی ہیں۔ میں ابھی ہوش میں تھا کہ گارڈز مجھے لکڑی کے ڈنڈوں سے بری طرح پیٹنے لگے۔ درد کی شدت سے میں اوندھا ہو گیا۔ یکبارگی میرے سر کے درمیان ایک زوردار ڈنڈا لگا مجھے سر کی کھوپڑی ٹوٹنے کی آواز آئی۔ زوردار دھماکہ ہوا اور میرے حواس بالکل معطل ہو گئے۔

پہلی تفتیشی ٹیم نے بالکل درست کہا تھا کہ تم موت مانگو گے لیکن تمہیں مرنے نہیں دیا جائے گا۔ نا معلوم مجھے کب ہوش آیا۔ میرے لئے وقت دن اور رات کی تمیز ختم ہو چکی تھی۔ ایک عجیب بات میں نے محسوس کی۔ میرا جسم چوٹوں سے بھرا پڑا تھا۔ ٹانگ کا زخم تشدد کی وجہ سے کھل چکا تھا اور اس سے خون بہہ رہا تھا۔ لیکن جسم میں کہیں بھی درد کا نام و نشان نہ تھا۔ میں نے جسم کے مختلف حصوں پر ہاتھ پھیرا لیکن چھونے کا احساس نہ ہوا۔ ٹانگ کے زخم پر بندھی پٹی اور پھر زخم پر ہاتھ لگایا لیکن نہ تو درد ہوا اور نہ چھونے کا احساس۔ میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ لیکن یہ سمجھ نہ آتا تھا کہ کیا دیکھ رہا ہوں۔ میں نے سر پر ہاتھ پھیرا تو ہڈی ٹوٹنے کی جگہ پر ایسا محسوس ہوا جیسے چھوٹا سا اسپیڈ بریکر بنا ہو میرا ہاتھ خون میں لتھڑ گیا لیکن درد نہ ہوا۔ میری بائیں آنکھ کے کونے سے بھی خون نکل کر جم چکا تھا۔ لیکن درد نہ تھا۔ صرف کانوں سے مسلسل شائیں شائیں کی تیز آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے اس کیفیت سے نکلنے کے لئے کچھ یاد کرنے کی کوشش کی تو دماغ میں دھماکے ہونے لگے۔ میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ شاید میں پھر بے ہوش ہو گیا تھا۔

جب دوبارہ ہوش آیا تو دن کی روشنی تھی۔ میں کچھ سوچنے سمجھنے سے قاصر تھا۔ ادھ کھلی آنکھوں سے میں نے دیکھا کہ میرا غلاظت بھرا لباس تبدیل کر دیا گیا تھا۔ بے اختیار میرا دایاں ہاتھ میرے جسم کو ٹٹولنے لگا۔ میری کھوئی ہوئی یادداشت آہستہ آہستہ بحال ہو رہی تھی۔ جسم کے مختلف حصوں سے درد کی ٹیسیں بھی اٹھ رہی تھیں۔ میں نے بڑی مشکل سے ٹانگ کے زخم کو چھوا تو درد سے میری کراہ نکل گئی۔ نئی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ جسم کے مختلف حصوں پر بینڈ ایج لگے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے سر کی طرف ہاتھ بڑھایا تو محسوس ہوا کہ ایک بڑی پٹی میرے سر کے زخمی حصے اور چہرے پر بندھی ہوئی ہے۔ لباس کی تبدیلی اور طبی امداد میری بے ہوشی کے دوران کی گئی تھی۔ دوپہر کے قریب ڈاکٹر آیا۔ میری دوبارہ مرہم پٹی کی گئی۔ ڈاکٹر نے اپنی نگرانی میں مجھے دودھ ملا دلیہ کھلوایا۔ میری حالت دیکھ کر وہ بار بار سر کو جھٹکتا تھا۔ مجھے انجیکشن لگاتے ہوئے اس نے آہستہ سے Barbarians (ظالم وحشی) کہا۔ اس نے مجھے چند گولیاں کھلائیں اور کچھ گولیاں مجھے دیتے ہوئے کہا کہ درد ہونے کی صورت میں کھا لوں۔ میں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا لیکن ابھی میری قوت گویائی واپس نہ آئی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اسے اشاروں سے بتایا کہ میں بول نہیں سکتا ہوں۔ اس نے میرا منہ کھولا۔ چمٹی سے زبان کو پکڑ کر اوپر نیچے اور آگے پیچھے کیا۔ پھر دو انجیکشن میرے دائیں اور بائیں کانوں کے نیچے لگائے۔ میرے بازو کو تھپتھپاتے ہوئے Dont worry you will be all right (فکر نہ کرو تم ٹھیک ہو جاؤ گے) کہا اور چلا گیا۔

غازی

یقیناً یہ ڈاکٹر کی ہدایت تھی کہ اگلے تین روز مجھے سیل سے باہر نہ نکالا گیا۔ صبح ناشتے دوپہر اور رات کے کھانے میں مجھے صرف دلیہ ملتا رہا۔ اس دوران ڈاکٹر روز آتا اور میری مرہم پٹی کرتا۔ میری قوت گویائی اگر چہ واپس آچکی تھی لیکن میں نے خاموشی میں ہی مصلحت سمجھی۔ پیٹ میں صابن اور نا معلوم کیا کچھ ڈالنے سے مجھے مسلسل پیچش ہو رہی تھی اور بخار بھی تھا۔ میں نے ڈاکٹر کو اشاروں سے بتایا تو اس نے گولیاں دیں۔ وہ مجھے بلا ناغہ ہر روز 4 انجیکشن لگاتا تھا۔

میری صحت آہستہ آہستہ بحال ہو رہی تھی۔ چوتھے روز مجھے دوپہر کو سیل سے نکالا گیا۔ اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جایا گیا۔ جب پٹی کھلی تو میں نے تفتیشی ٹیم اور ڈاکٹر کو دیکھا۔ وہ برآمدے میں پیڈسٹل پنکھے کے سامنے بیٹھے تھے۔ برآمدے میں ایک طرف برف کے دو بلاک رکھے تھے برآمدے کے پیچھے کمرے اور سامنے چار دیواری تھی۔ چار دیواری میں ریت پڑی ہوئی تھی میرے کپڑے اتارے گئے اور مجھے ریت پر سیدھا لٹا کر میرے دونوں ہاتھوں اور پیروں پر پہرے داروں نے اپنے وزنی بوٹ رکھ دیئے تاکہ حرکت نہ کرسکوں۔ ریت اتنی گرم تھی جیسے جلتے تندور سے نکالی گئی ہو۔ میں اپنے منہ کو سختی سے بند کئے دانتوں کو بھینچے آہ کراہ کو روکے ہوئے تھا۔ قریباً بیس منٹ بعد مجھے ریت سے اٹھایا گیا اور برآمدے میں رکھے برف کے بلاکوں پر لٹا دیا گیا۔ 10 پندرہ منٹ بعد مجھے پھر ریت پر لٹا دیا گیا۔ اس بار ریت پر لیٹنے کے وقت میں اضافہ کر دیا گیا۔ پھر برف پر لٹا دیا گیا یہ عمل 3 مرتبہ دہرایا گیا۔ میرا جسم بار بار گرم ٹھنڈا ہونے کی وجہ سے سن ہو رہا تھا۔ جب تیسری بار مجھے ریت پر لٹایا گیا تو مجھے گرم ریت کی حدت کا احساس بہت کم ہوا اس بار برف پر لٹانے کے بعد جب مجھے پھر ریت کی طرف لے جایا جانے لگا تو ڈاکٹر نے چلا کر کہا Stop it. Stop it now. He will be paralysed forever (بند کرو، ختم کرو۔ یہ زندگی بھر کیلئے مفلوج ہو جائے گا) تفتیشی ٹیم کا مقصد بھی یقیناً یہی تھا کہ اس عمل سے مجھ پر فالج گر جائے اور میں مر جاؤں۔ تفتیش کے دوران انہیں ہر قسم کے انتہائی تشدد کے باوجود میری زبان کھلوانے میں ناکامی ہوئی تھی۔ اپنی ناکامی پر پردہ ڈالنے کیلئے اب انہیں میرے مردہ جسم کی ضرورت تھی۔ میجر احسن پر کئے گئے تشدد کے دوران میجر کی شہادت کے بعد غالباً تفتیشی ٹیموں کو سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ پاکستانی جاسوس زبان کھولنے کے بجائے تشدد کی موت کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس لئے انہیں ہلاک کرنے کے بجائے انہیں زندہ رکھ کر ایسا تشدد کیا جائے کہ وہ موت مانگیں اور انہیں موت بھی نہ ملے۔ شاید ایسی حالت میں ان کی قوت مدافعت ختم ہو جائے اور وہ بولنے پر مجبور ہو جائیں۔ تفتیشی ٹیم نے ڈاکٹر کے روکنے پر اس سے بحث شروع کر دی لیکن ڈاکٹر کے یہ کہنے پر خاموش ہو گئے کہ اگر تفتیش کرنا تمہاری ذمہ داری ہے تو ملزم کو زندہ رکھنا میری ذمہ داری ہے۔ اس وقت ملزم کی حالت ایسی نہیں کہ اس پر مزید تشدد کیا جائے۔ میری اجازت کے بغیر اگر تم نے ملزم کو Cell سے نکالا تو میں جنرل کو تمہارے خلاف رپورٹ کر دوں گا۔ یہ ساری گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر نے ہندی میں گارڈز کو حکم دیا کہ مجھے کپڑے پہنائے جائیں۔ اس کے بعد ہندی لب و لہجے سے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ پارسی مذہب کا ہے۔ کسی ہندو ڈاکٹر سے ایسے سلوک کی توقع کرنا ہی فضول تھی۔

مجھے سیل میں واپس لایا گیا۔ ڈاکٹر بھی تھوڑی دیر میں سیل میں پہنچ گیا۔ اس نے خود اپنے ہاتھ سے میری پشت اور گرم ریت سے متاثرہ حصوں پر کوئی Ointment (مرہم) لگائی۔ انجیکشن دیئے۔ ٹانگ کی اور سر کی پٹی تبدیل کی۔ کمپاؤنڈر اس کے ساتھ تھا لیکن ڈاکٹر نے یہ سب کام خود کئے۔ غالباً وہ مرتے ہوئے انسان کی خدمت کر کے اس کی دعائیں لینا چاہتا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہا تو اس نے سرگوشی میں کہا Never talk otherwise you will be taken again for torture (ہر گز مت بولو ورنہ تمہیں تشدد سہنے کیلئے دوبارہ لے جائیں گے) میں نے تشکر بھری نظروں سے اسے دیکھا اور وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔ اس روز کے بعد مجھے تشدد یا تفتیش کے لئے نہیں لے جایا گیا۔ ڈاکٹر ہر روز میری مرہم پٹی کے لئے آتا تھا۔ دو تین روز بعد میری خوراک میں تبدیلی کر دی گئی اور دلیہ صرف ناشتے میں اور دوپہر اور دن کے کھانے میں دال چپاتی ملنے لگی۔

میرے Cell پر پہرے داروں کو دو رکنی ٹیمیں تھیں۔ ہر ٹیم 8 گھنٹے پہرہ دیتی تھی۔ اللہ پاک کا کرم تھا کہ میں تیزی سے روبصحت ہونے لگا۔ جسمانی اور دماغی کمزوری بے حد تھی لیکن ٹانگ اور سر کے زخم بھرنے لگے۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ہر روز میرے Cell کو دھویا جانے لگا۔ ڈاکٹر کے حکم پر ہی ربڑ کے پائپ سے سیل کے اندر مجھ پر پانی پھینک کر مجھے ہر دوسرے روز غسل کرایا جانے لگا۔ میں نے ڈاکٹر کی ہدایت گرہ میں باندھ لی تھی کہ ہر گز نہ بولوں۔ تفتیشی ٹیم کے ارکان دو تین مرتبہ آئے اور سیل کے باہر ہی مجھ سے ایسی باتیں کرنے لگے کہ میں شاید اچانک بول اٹھوں۔ میں ان کی ہر بات کا جواب زبان پر ہاتھ رکھ کر اوں آں کر کے رہ جاتا اور وہ مجھے اور ڈاکٹر کو گالیاں بکتے واپس چلے جاتے۔

ڈاکٹر کی مسلسل دیکھ بھال اور دوائیوں کی وجہ سے خاصا ٹھیک ہو چکا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ پارسی ڈاکٹر کی وجہ سے ہی میں وقتی طور Torture سے بچ گیا ہوں لیکن ڈاکٹر آخر کب تک میری ڈھال بنا رہے گا میں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور فرار کے منصوبے سوچنے لگا۔ اسی روز جب ڈاکٹر آیا تو میں نے اسے سر کی پٹی تبدیل کرنے کے دوران آہستگی سے کہا Cell کے اندر ہی حاجت پوری کرنے سے مجھے بہت پریشانی اٹھانی پڑتی ہے اس شدید گرمی میں بے حساب مکھیوں اور بدبو کی وجہ سے دماغ پھٹنے کو آیا ہے۔ پیچش کی وجہ سے بار بار مجھے گھڑے کے ٹوٹے ٹکڑے کو ہی استعمال کرنا پڑتا ہے۔ Cell کے سامنے ہی لیٹرین کی قطار ہے اگر گارڈ ضرورت کے وقت وہاں لے جایا کریں تو میں اس اذیت سے بچ جاؤں گا۔ میری حالت آپ دیکھ رہے ہیں کہ زخموں اور کمزوری کے باعث میں ٹھیک سے کھڑا بھی نہیں ہو سکتا اس لئے مسلح پہرہ داروں کی موجودگی میں میرے فرار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا آپ پہلے ہی مجھ پر اتنی مہربانی کر رہے ہیں۔ جس کے لئے تا زندگی میں آپ کا مشکور رہوں گا۔ اگر مزید یہ مہربانی کر دیں تو مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔ ڈاکٹر نے خاموشی سے میری بات سنی اور سرگوشی میں ہی جواب دیا I will try اور چلا گیا۔ سیل میں مرہم پٹی کرنے کے دوران اسے خود میری پریشانی کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا مجھے یقین تھا کہ اگر ڈاکٹر چاہے تو مجھے یہ سہولت دلوا سکتا ہے۔ تفتیشی ٹیم کا کام اگر مجھ سے راز اگلوانا تھا تو ڈاکٹر کا کام مجھے زندہ رکھنا تھا۔ اسی لئے مجھ پر تشدد کے دوران تفتیشی ٹیم سے نہ صرف الجھ گیا تھا بلکہ اس نے تشدد بھی رکوا دیا تھا۔ یقیناً کوئی اعلیٰ عہدے کا افسر میرے کیس کا انچارج ہوگا اور ڈاکٹر کی اس تک ڈائریکٹ رسائی ہوگی۔ دوسرے روز ہی صبح کے وقت ایک لوہے کا کڑا میری بائیں کلائی میں پہنا دیا گیا گارڈ کمانڈر جو نائب صوبیدار اور سکھ تھا، نے گارڈز کو Cell کی چابی دی اور انہیں کہا کہ آئندہ مجھے حاجت کے لئے لیٹرین میں لے جایا کائے کڑے میں رسی باندھ کر دوسرا سرا ایک گارڈ پکڑ رکھے جب کہ دوسرا گارڈ اپنی رائفل تیار رکھے اور اگر میں بھاگنے کی کوشش کروں تو بلا تاخیر مجھے گولی مار دی جائے۔ گارڈ کمانڈر، گارڈز کو یہ ہدایات دیکر مجھ سے مخاطب ہوا اور پنجابی میں کہنے لگا کتنا گھبرو ہے تو اور تیرا جو حال ہو چکا ہے تو اگر نہ بولا تو اس سے بھی بدتر حال ہوگا اور اگر تو بولا تو پھر بھی تجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ جہاں اتنا تشدد تو نے سہہ لیا ہے وہاں تھوڑا بہت اور سہہ لینا اس نے کھل کر اور صاف بات تو نہ کی لیکن بین السطور Between the lines مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ میرے لئے بھی یہ آخری موقعہ تھا کہ فرار کی کوشش کروں۔ اس کوشش میں کامیابی یا ناکامی دونوں صورتوں میں میری نجات تھی۔ اتنے سخت تشدد کے بعد یہ وقفہ میرے لئے سنہری موقعہ تھا۔ زبان میں نے کھولی نہ تھی اور اب نہ مزید تشدد سہنے کا مجھ میں حوصلہ بھی نہ تھا۔

میں نے اپنی پوری توجہ گارڈز پر مبذول کر دی۔ دو دو گارڈز آٹھ آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی میرے سیل پر دیتے تھے۔ ان میں سے دو گارڈز تو انتہائی متعصب تھے۔ یہی وہ گارڈز تھے جو مجھے سلاخوں کے نیچے سے غلاظت کو چھوا کر کھانا دیتے تھے، اور اکثر اوقات مجھے فحش گالیاں دیتے تھے۔ انہی گارڈز نے مجھے لیٹرین لے جانے کے بعد جب سیل میں بند کیا تو میں نقاہت کے مارے فوری لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی مجھے پاؤں کے قریب ٹانگ پر کسی چیز کے رینگنے کا احساس ہوا۔ میں نے دیکھا تو ایک بڑا بچھو میری ٹانگ پر چل رہا تھا۔ اس سے پہلے کو وہ ڈنگ مارتا میں نے اسے انگلیوں سے جھٹک دیا۔ اسے مارنے کیلئے میں نے تکیے کی جگہ سر کے نیچے رکھنے والی اینٹ اٹھائی تو اینٹ کے نیچے درمیان بنے خول میں 3 اور بچھو تھے۔ میں نے چاروں بچھوؤں کو اینٹ سے مار دیا۔ دونوں گارڈز یہ دیکھ رہے تھے۔ بچھو مارنے پر انہوں نے مجھے بے تحاشہ گالیاں دیں۔ شاید بچھو بھی ان کا کوئی بھگوان تھا۔ یہ بچھو یقیناً ان کے ایما پر ہی سیل میں میری غیر حاضری کے دوران چھوڑے گئے تھے۔ دو گارڈز بالکل روبوٹ کی طرح تھے۔ اپنی ڈیوٹی کے آٹھ گھنٹوں میں سے چھ سات گھنٹے یہ دھوپ او گرمی کی پرواہ کئے بغیر سیل کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک مارچ کرتے ہوئے پہرہ دیتے تھے۔ وہ آپس میں بھی بہت تھوڑا بولتے تھے۔ مجھے مخاطب کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ گارڈز کی تیسری جوڑی ان دونوں کے مقابلے میں نسبتاً بہتر تھی۔ ان میں سے ایک گارڈ اپنے ماتھے پر ہمیشہ پیا ہوا چندن اور چاول کے چند دانے لگائے رکھتا تھا۔ سگریٹ پیتے ہوئے وہ کبھی کبھی مجھے بھی ایک سگریٹ دے دیتا تھا۔ میرے بول نہ سکنے کی ایکٹنگ کامیابی سے جاری تھی۔ ڈاکٹر کی ادویات سے اگر چہ پیچش میں خاصی کمی ہو چکی تھی لیکن میں فرار کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اپنی پلاننگ کو Fool proof بنانے کیلئے 24 گھنٹے میں دس بارہ مرتبہ لیٹرین جاتا۔ مجھے یہ چند منٹوں کا موقع ہی میسر تھا جب مجھے سیل سے باہر نکالا جاتا تھا۔ سیل سے باہر گرد و پیش کا تفصیلی نقشہ میں نے ذہن میں محفوظ کر لیا تھا۔ میرا سیل دس Cells کی ایک قطار میں دائیں جانب سے تیسرا تھا۔ باقی نو Cell یا تو خالی تھے یا ان میں ایسے لوگ محبوس تھے جن کیلئے گارڈز کی ضرورت نہ تھی۔ میرے سیل کے تقریباً سامنے ہی لیٹرین کی قطار تھی جن میں داخلے کا رخ دوسری جانب تھا۔ میرے سیل سے بائیں جانب لیٹرین سے بہت تھوڑے فاصلے پر ایک منزلہ بیرکس تھیں۔ دائیں جانب ایک پتلی سڑک تھی اور سڑک کے پار بنی ہوئی عمارت کی پشت تھی۔ لیٹرین سے زیادہ سے زیادہ 30 قدم کے فاصلے پر ایک اونچی دیوار تھی۔ اس دیوار پر خاردار تاروں کی باڑھ لگی ہوئی تھی۔ اس دیوار کی بلندی اور باڑھ سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ بیرونی دیوار ہے۔ دیوار کی دوسری طرف سے گاڑیوں کے چلنے کی مدھم آوازیں آتی رہتی تھیں۔ میں نے سیل سے ہر بار نکل کر مین دروازہ (Main entrance) دیکھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ میرے خیال میں میرا سیل اور اردگرد کی عمارتیں چار دیواری میں گھرے علاقے کے عقبی حصے میں تھیں۔ میرے لئے فرار ہونے کا ایک ہی ذریعہ تھا کہ میں تاروں والی دیوار پھلانگ جاؤں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ دیوار کی بلندی 8 فٹ کے لگ بھگ تھی اور سب سے نیچے والی خاردار تار دیوار سے 6 انچ بلند تھی۔ اس تار کے اوپر 5 یا 6 مزید خاردار تاریں تھیں جو دس فٹ کے فاصلے پر دیوار میں گڑے ہلالی شکل کے T-Irons سے بندھی ہوئی تھیں۔ اگر میں کسی طرح سب سے نیچے والی تار کو تھام کر، اس کے سہارے اپنے جسم کو اونچا کھینچ لینے میں کامیاب ہو جاتا تو تقریباً 3 فٹ اونچی خاردار تاروں کو پھلانگ کر دیوار کی دوسری جانب کود سکتا تھا۔ ان خاردار تاروں کو پھلانگنے اور دیوار کی دوسری جانب کودنے میں میرا زخمی ہونا لازمی تھا جبکہ میری ٹانگ ابھی ٹھیک نہیں ہوئی تھی اور میں لنگڑا کر بہت آہستہ چل سکتا تھا۔ یہ سب تو بعد کے مرحلے تھے۔ سب سے پہلے تو مجھے مسلح گارڈز سے جان چھڑانے کی سبیل کرنی تھی۔ میں نے اس کے علاوہ دیگر ممکنہ ذرائع پر غور کیا۔ لیکن سب ناممکن العمل ثابت ہوئے۔ اس منصوبے میں بھی میری کامیابی کے صرف 5 فیصد چانسز تھے۔ پہرے دار ہر وقت مسلح رہتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں رائفلیں اور پیٹی کے ساتھ بیک پر بیونٹ Bayonet (سنگین) لٹکی ہوتی تھی۔ سنگین پیٹی میں لگی ایک چھوٹی میان ہوتی ہے جسے ایک چھوٹی پٹی میں لگا سٹچ بٹن Stich button میان میں قابو رکھتا ہے۔ اگر بٹن کھول دیا جائے تو سنگین کو فوری نکالا جا سکتا ہے۔ میں یہ تفصیل اس لئے لکھ رہا ہوں کہ فرار کے عمل کے دوران اس کی تفصیل بیان کرنا مناسب نہ ہوگا۔

مجھ پر تعینات گارڈز کی ڈیوٹی کے اوقات بھی بدلتے رہتے تھے۔ گارڈز کی وہ جوڑی جو مجھ سے نسبتاً بہتر سلوک کرتی تھی، ان کی ڈیوٹی کے دوران میں خاصا وقت سلاخوں کے ساتھ کھڑا ان کی باتیں سنتا۔ "بول تو میں نہیں سکتا تھا"۔ اس لئے یہ گفتگو یک طرفہ ہوتی تھی۔ ان گارڈز میں سے ایک برہمن تھا جس کے ماتھے پر ہمیشہ چندن اور چاول لگے ہوتے تھے۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے مجھ "ملیچھ" کو "مشدھ" کرنے کا سوچا۔ کہنے لگا "صرف ہمارا دھرم ہی سچا ہے۔ ہمارے بھگوان تو ہمارے بیچ پیدا ہوئے اور تم مسلمان اپنے بھگوان کو بلانے کیلئے آج تک "خدا ...... خودا" (خدا) کہتے ہو۔ اتنا پکارنے کے باوجود تمہارا بھگوان نہیں آیا۔ زندگی میں تو تم نے بہت کشٹ (تکلیف) اٹھائے۔ اب بھی اگر ہمارا سچا دھرم اپنا لو تو تمہارے من کو بھی شانتی ملے گی اور تمہاری آتما بھی سورگ (جنت) میں جائے گی"۔ اس کی باتیں سن کر میں ایسے سر ہلاتا جیسے وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہو۔ دل میں، میں سوچتا تھا کہ سورگ اور نرگ (جنت اور دوزخ) تو بہت دور ہیں یہ تو اپنے مردے کو یہاں دنیا میں ہی چتا کی آگ میں شاید اس لئے جلاتے ہیں کہ یہیں جہنم کی آگ کے کچھ عادی ہو جائیں اور نرگ میں گرم سرد ہونے کے باعث بیمار نہ پڑ جائیں۔ میں نے اشاروں سے اسے کہا تم ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے اپنے دھرم کے متعلق کچھ اور بتاؤ۔ میرا اصل مقصد اس کی ہمدردی جیتنا تھا۔ میری دلچسپی دیکھ کر اس نے تفصیلاً مجھے ہندو دھرم کے متعلق لیکچر دینا شروع کر دیئے۔

غازی

فرار کی دوسری کوشش

ڈاکٹر آیا اور میری مرہم پٹی کے دوران اس نے کہا کہ میرے لئے جو کچھ وہ کرسکتا تھا، اس نے کر دیا، لیکن اب وہ مجبور ہے، اس نے کہا کہ آج Thursday (جمعرات) ہے اور پرسوں یعنی ہفتے کی شام کو مجھے انٹروگیشن کیلئے لے جایا جائے گا۔ انٹروگیشن کے دوران وہ بھی موجود ہوگا۔ اس نے کہا کہ جنرل کے حکم پر Intelligence Corp (انٹیلی جنس کور) سے سچ اور جھوٹ پرکھنے کی مشین اور ماہرین بلوائے گئے ہیں۔ تمہیں خاص انجکشن لگا کر کچھ سوال پوچھے جائیں گے۔ انجکشنوں کے اثر سے تمہارا دماغ تمہارے جسم کو کنٹرول کرنے کے قابل نہیں رہے گا اور نہ چاہتے ہوئے بھی تم بولنے لگو گے اور جو بولو گے اس کا فیصلہ مشین کرے گی کہ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ۔ اسکے بعد تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا وہ تم خود بہتر سمجھتے ہو۔ ڈاکٹر نے چلتے وقت ایک ایسی بات کہی کہ میرا منہ کھلا اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے سرگوشی میں کہا کہ کرنل شنکر کا میں دوست بھی ہوں اور معالج بھی۔ اسی کی ہدایت پر میں نے اپنی طرف سے جو بھی ممکن سہولت تھی تمہیں دی۔ He is very fond of you. (وہ تمہیں بہت پسند کرتا ہو۔) یہ کہہ کر ڈاکٹر چلا گیا۔ گرفتاری کے بعد پہلی مرتبہ معلوم ہوا تھا کہ کون سا دن ہے۔ میرے پاس صرف دو راتیں تھیں جن میں فرار کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی میں کوشش کرسکتا تھا۔ اب میں مزید تشدد سہنے کے ناقابل تھا خاص انجکشن اور مشین کے آگے تو میں بالکل بے بس ہو جاتا اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کچھ بول دیتا جسے چھپانے کے لئے میں نے اتنی اذیتیں سہی تھیں۔ اس سے بچنے کا صرف ایک حل تھا کہ میں فرار کے منصوبے پر عمل ان دو راتوں میں ہی کرلوں۔ فرار میں کامیابی کی اگرچہ بہت ہی موہوم امید تھی لیکن پہرے داروں کی گولیوں سے مرنے کا پورا یقین تھا۔ دونوں صورتوں میں جیت میری تھی اور ہار DMI کی۔

اسے حسن اتفاق کہیں یا اللہ پاک کی مدد۔ اس رات بارہ بجے ڈیوٹی پر برہمن اور اس کا ساتھی گارڈ آئے۔ دنیا بھر کے فوجیوں کو سکھایا جاتا ہے کہ دشمن کو ماردو، اس سے پہلے کہ وہ تمہیں مار دے (Kill your enemy before he kills you) اور دوسری اہم بات مقصدیت ہے۔ فتح مکہ سے قبل جنگ بدر اور جنگ احد میں بھائی کے مقابل بھائی اور بیٹے کے مقابل باپ تھا۔ دوران جنگ نہ باپ کے ہاتھ بیٹے کو قتل کرتے وقت لرزاں ہوئے اور نہ سگے بھائی کا گلا کاٹتے وقت بھائی کے ہاتھ رکے۔ کیونکہ مسلمان اس جنگ میں ایک واضح مقصد کے لئے لڑ رہے تھے۔ فوجی کے دل میں جب بھی دشمن کے لئے ترحم کا جذبہ آیا وہ خود ہی مارا گیا۔ میں نے آج رات ہی فرار کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کیا۔ Now or Never پر دل جم گیا۔ میں نے گارڈز کی ڈیوٹی شروع ہونے سے آدھے گھنٹے بعد برہمن کو اشارے سے کہا کہ مجھے لیٹرین جانے کی ضرورت ہے۔ اس نے میری کلائی کے کڑے میں رسی باندھی۔ دوسرے گارڈ نے رائفل میری طرف تان لی۔ برہمن نے سیل کا دروازہ کھولا اور رسی کا سرا پکڑ کر مجھے لیٹرین کی طرف لے گیا۔ میں نے لیٹرین میں پانچ چھ منٹ گزارے اور باہر آگیا اور دونوں گارڈز مجھے سیل کی طرف لے چلے۔ اب دونوں نے اپنی رائفلیں اپنے کندھوں پر لٹکا رکھی تھیں۔ میں نے درد کا بہانہ کرتے ہوئے خود کو کچھ جھکایا۔ دونوں گارڈز میرے دائیں اور بائیں چل رہے تھے میں نے دانستہ چھوٹے قدم لینے شروع کئے۔ چار پانچ قدموں میں ہی میں ان سے ایک فٹ سے زیادہ پیچھے رہ گیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جس کا مجھے انتظار تھا۔ میں نے بجلی کی تیزی سے دائیں طرف والے گارڈ کی بیونٹ (جو اس کے بائیں کولہے پر لٹکی تھی) کا حفاظتی بٹن کھولا۔ بیونٹ نکالی اور پورے زور سے اس کی پیٹھ میں گھونپ دی۔ اتنے زور سے گھونپی ہوئی بیونٹ اس کے جسم کے آر پار ہوگئی۔ اس کے منہ سے کراہ تک نہ نکلی۔ اس کے گرنے سے پہلے ہی میں نے بیونٹ واپس کھینچی اور اپنے بائیں جانب والے برہمن گارڈ کی پشت میں گھونپ دی۔ یہ سارا عمل 5 سیکنڈ میں مکمل ہوچکا تھا۔ برہمن نے چیخ ماری اور اس سے پہلے کہ میں بیونٹ باہر کھینچتا وہ ڈھیر ہوگیا۔ میں اپنی زخمی ٹانگ کے باوجود پوری رفتار سے بیرونی دیوار کی طرف بھاگا۔ رسی میری بائیں کلائی میں بندھی ہوئی تھی۔ ہوائی چپل میں نے لیٹرین کی طرف پھینکے اور دیوار کے پاس پہنچ کر اچھلا۔ میرا قد 6 فٹ دو انچ ہے۔ دو فٹ سے زیادہ اونچا میرا بازو ہے اور اچھلنے سے تقریباً ایک فٹ میں نے مزید بلندی Gain (حاصل) کی۔ میرا ہاتھ تیسری خاردار تار پر پڑا۔ اسے مضبوطی سے تھام کر میں نے اپنا بایاں ہاتھ بھی بلند کیا اور اسی تار کو تھام لیا۔ بازوؤں کے زور پر میں نے اپنا جسم بہ ہزار دقت اوپر اٹھایا اور پاؤں دیوار میں اٹکا کر ہاتھوں سے چوتھی اور پھر پانچویں تار تھامی۔ میرا جسم بھی ساتھ ساتھ اوپر اٹھتا رہا۔ سب سے اوپر والی تار دونوں ہاتھوں سے تھام کر میں نے اسے نیچے دبایا اور میرے دونوں پاؤں دیوار کے اوپر آگئے۔ اب میرے سامنے تین فٹ اونچی خاردار تاروں کی 6 باڑھیں تھیں جنہیں پھلانگ کر میں دیوار کی دوسری جانب جاسکتا تھا۔ عام حالات میں یہ تین فٹ اونچی رکاوٹ پھلانگنا میرے لئے بہت معمولی بات تھی۔ لیکن جسمانی کمزوری، چوٹوں کے درد اور زخمی ٹانگ کی وجہ سے یہاں تک پہنچتے ہوئے میرا سانس پھول چکا تھا۔ گارڈز کو مارنے سے لیکر یہاں تک پہنچنے میں مجھے پندرہ سے بیس سیکنڈ لگے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی ٹانگ کو اپنے دائیں ہاتھ کا سہارا دے کر اوپر اٹھایا اور باڑھ کی دوسری طرف رکھا۔ اسی وقت مجھے دور اندرونی حصے سے سیٹیاں بجنے کی آوازیں آئیں۔ اب ضائع کرنے کو ایک سیکنڈ بھی نہ تھا۔ میں نے جلدی سے بائیں ٹانگ باڑھ کی دوسری طرف کی۔ جلدی میں باڑھ کا ایک کانٹا میری بائیں ران میں گھس گیا اور پھلانگتے وقت ایک فٹ کے قریب ران کو چیرتا چلا گیا۔ وقت بالکل نہیں تھا۔ میں نے دیوار سے چھلانگ لگائی۔ زخمی ٹانگ کی وجہ سے میں سنبھل نہ پایا اور زمین پر گر گیا۔ کودنے کی وجہ سے غالباً میری ٹانگ کا زخم بھی کھل گیا تھا۔ میں نے حواس بحال رکھے اور بائیں ٹانگ پر کبھی اچھلتے اور کبھی دائیں پاؤں کا سہارا لیتے سڑک کی طرف تیزی سے بڑھنے لگا۔ اندر سے سیٹیاں بجنے کی آوازیں مسلسل آرہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ''جائے حادثہ'' کا سب کو علم نہ ہونے کے باعث اندر کی سب نفری گارڈ روم اور مین گیٹ کے قریب جمع ہورہی تھی۔ سڑک کی دوسری جانب جھاڑیاں تھیں۔ میں ان کی اوٹ میں نڈھال بیٹھ گیا۔ چند سیکنڈ بعد سانس بحال ہوتے ہی میں نے سڑک پر اپنے سیدھے ہاتھ کی جانب بھاگنا شروع کیا۔ اب مجھے ٹانگ کے زخم اور ران سے تیزی سے بہنے والے خون کی پرواہ نہیں تھی۔ زندہ رہنے کی خواہش میں اب سب درد بے وقعت ہوچکے تھے۔ سڑک پر میں بمشکل سو فٹ ہی بھاگا ہوں گا کہ سامنے سے آنے والی گاڑی کی تیز روشنی سے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں سڑک کے ایک جانب ہوگیا۔ اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں گاڑی قریب پہنچنے پر میں نے دیکھا، وہ ٹیکسی تھی۔ جب وہ ٹیکسی میرے اتنے قریب آگئی کہ اسے مجبوراً رکنا پڑے تو میں بھاگ کر سڑک کے بیچ آگیا۔ ڈرائیور نے بریک لگائی اور سڑک پر ٹائر گھسنے کی آواز آئی۔ ٹیکسی مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر رکی تھی۔ میں ڈرائیور کی طرف بڑھا۔ ٹیکسی خالی تھی۔ میں نے بغیر وقت ضائع کئے ڈرائیور کا دروازہ کھولا۔ میری حالت دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ آدھی رات کے بعد سنسان سڑک پر ایک زخمی شخص جس کے سر پر اور چہرے پر پٹیاں بندھی ہوں اچانک سڑک پر آکر گاڑی روکے تو ڈرائیور کی جو حالت ہوسکتی ہے اس کا بخوبی احساس کیا جاسکتا ہے۔ دروازہ تو میں پہلے ہی کھول چکا تھا۔ میں نے طے کرلیا تھا کہ اگر ڈرائیور نے مجھے لے جانے سے انکار کیا تو اسے گردن کی نسیں دبا کر ایک منٹ سے بھی کم وقت میں ہلاک کردوں گا۔ اس کی ٹریننگ میں پاکستان میں لے چکا تھا۔ میں نے ڈرائیور کو کہا میں زخمی ہوں اور غنڈے میرے پیچھے ہیں۔ مجھے فوراً یہاں سے لے چلو۔ اس نے کہا ''آپ پیچھے بیٹھیں''۔ یہ بھی ممکن تھا کہ میں پچھلی سیٹ کی جانب جاؤں اور وہ گاڑی بھگا لے جائے۔ میں نے فوراً ہی ڈیش بورڈ سے گاڑی کی چابی نکالی اور بجائے پیچھے بیٹھنے کے اس کے ساتھ والی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اسے کہا کہ وہ اپنا دروازہ بند کرکے لاک کرلے۔ وہ اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ چپ چاپ میرے کہنے پر عمل کرتا رہا۔ میں نے چابی اسے دی اور اپنا دایاں ہاتھ اس کی پشت کی طرف سے اس کی گردن پر لے آیا اور کہا کہ اگر کوئی عقلمندی دکھانے کی کوشش کی تو گلا گھونٹ کر مار ڈالوں گا۔ چپ چاپ چلو تو کوئی گزند نہ پہنچے گی۔ اس نے اچھا کہنے کیلئے سر ہلایا۔ میں نے اسے پرانی دلی چلنے کو کہا۔ اس نے گاڑی موڑی اور تیزی سے پیچھے کی طرف بھگانے لگا۔ جلد ہی ہم ایسے علاقے میں جا نکلے جسے میں پہچانتا تھا۔ وہ واقعی پرانی دلی کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے اسے محلہ فراش خانہ چلنے کو کہا۔ محلّہ فراش خانے کا علاقہ آگیا تو میں نے اسے ایک گلی کے قریب روکا۔ میں نے گاڑی میں بیٹھے ہوئے اسے کہا کہ میری حالت تم دیکھ رہے ہو۔ تمہارا کرایہ دینے کو میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ وہ تو مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ کہنے لگا کوئی بات نہیں، اگر آپ کو سو پچاس درکار ہوں تو میں دینے کو تیار ہوں۔ میں نے اس کا شکریہ ادا اور گاڑی سے اتر آیا۔ میں دروازہ بند بھی نہ کرنے پایا تھا کہ اس نے گاڑی بھگائی اور جلد ہی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

میں اس گلی سے بخوبی واقف تھا۔ اندر گلیوں میں سے ہوتے ہوئے ساتھیوں کے گھر تک ایک کلومیٹر کا فاصلہ ہوگا۔ میں اٹھتا بیٹھتا، دیواروں کا سہارا لیتا تقریباً ایک گھنٹے میں ساتھیوں کے پاس یعنی نذیر کے گھر پہنچا۔ میں بالکل نڈھال ہوچکا تھا۔ میں نے مسلسل گھنٹی بجانی شروع کردی۔ چند منٹ کے بعد نذیر نے دروازہ کھولا۔ کچھ اندھیرے کی وجہ سے اور کچھ میری بڑی ہوئی داڑھی اور برے حال کی وجہ سے چند لمحے تو وہ مجھے پہچان نہ پایا۔ جب میں نے اس کا نام لیا تو وہ چونک اٹھا اور مجھے فوراً اندر کھینچ کر کنڈی لگالی۔ چند رسمی کلمات کے بعد میں نے اس سے ساتھیوں کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا کہ سب بخریت اور اوپر سو رہے ہیں۔ نذیر کے سہارے سیڑھیاں چڑھ کر میں مکان کے اوپری حصے میں پہنچا۔ نذیر نے ساتھیوں کو جگایا۔ مجھے اور میری حالت کو دیکھ کر وہ اتنے حیران تھے کہ ان کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ سب نے باری باری مجھے گلے لگایا۔ فرار کے وقت مجھ میں جو ہمت آگئی تھی وہ منزل پر پہنچ کر ختم ہوگئی۔ میں ایک ساتھی کے بستر پر گر گیا۔ میں نے نمبر نو کو جو اب بقیہ ساتھیوں کا گروپ لیڈر تھا کہا کہ میری ران اور ٹانگ سے بہنے والا خون سڑک سے لیکر فراش خانے کی گلیوں سے ہوتا ہوا یہاں تک میری نشاندہی کرسکتا ہے۔ اس نے فوراً باقی ساتھیوں کو خون کے سب نشان صاف کرنے کا کہا۔ اسی وقت وہ دو بالٹیاں اور بوریوں کے ٹکڑے لے کر ٹارچوں کی روشنی میں خون کے دھبے صاف کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ نذیر چائے اور گھر میں موجود بسکٹ اور سویاں بنوا کر لے آیا۔ میں بات کرنے کے قابل نہ تھا۔ میں نے بالکل مختصراً انہیں بتایا کہ میں DMI سے فرار میں کامیاب ہوا ہوں اور وہ میری زبان کھلوانے میں اپنے تمام حربے آزمانے کے باوجود ناکام ہوئے۔ نذیر نے جاکر عارف کو میرے متعلق بتایا۔ عارف میرے زخمی ہونے کا سن کر اسی وقت اپنے ایک قریبی اور انتہائی بھروسے کے ڈاکٹر کو بلانے چلا گیا۔ چائے اور سویوں نے مجھے کچھ تقویت دی اور میں چند ہی لمحوں میں آزادی کی نیند سو گیا۔

ایک ماہ اور 6 دن پہلے 6 جون 74ء کو میں گرفتار ہوا تھا اور آج 12 جولائی جمعۃ المبارک تھا۔ گرفتاری کے دوران میں مجموعی طور پر زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس گھنٹے سویا تھا۔ ورنہ بیشتر وقت تشدد اور اس کے نتیجے میں بے ہوشی کی حالت میں ہی گزرا تھا۔ تشدد کے دوران مجھ پر جو بیتی، میں تفصیلاً آپ کی خدمت میں عرض کرچکا ہوں۔ 23 سال بعد بھی بھارتی ہندوؤں کے مجھ پر توڑے گئے ظلم وستم تحریر کرتے وقت میری جو ذہنی کیفیت ہوئی ہے۔ اسے میں ہی جانتا ہوں۔ میں نے ہندو کو اس کے اصلی روپ میں دیکھا ہے۔ خطہ ہند کے قدیم اصل باشندوں کو حملہ آور آرین نے جنوب میں دھکیل کر کول، دراوڑ اور اچھوت کا نام دے کر ہزاروں برس ان پر بے رحمانہ طور پر حکومت کی اور انہیں جانوروں سے بھی بدتر زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا۔ پھر مکافات عمل کا وقت آیا تو جذبہ شہادت سے اپنے سینوں کو منور کئے چند ہزار مسلمانوں نے مغرب سے آکر ان مغرور آریوں پر جو خود کو سب سے برتر نسل انسانی سمجھتے تھے، ہزار برس تک حکومت کی اور انہیں بتایا کہ کوئی بھی انسان محض اپنی نسل کی بناء پر برتر اور کمتر نہیں ہوتا۔ یہ اس کے اعمال ہوتے ہیں جو اسے برتر اور کمتر بناتے ہیں لیکن ہندو نے اس حقیقت کو تسلیم نہ کیا انہوں نے خود کو مختلف ذاتوں میں تقسیم کرلیا۔ سب سے افضل برہمن پھر راجپوت اور پھر کھشتری اور مزید تقسیم در تقسیم میں وہ سینکڑوں ذاتوں میں بٹ گئے لیکن ان سب ہندو ذاتوں میں ایک قدر مشترک تھی اور وہ تھی مسلمان سے نفرت۔ مسلمان کا ہندو پر سایہ بھی پڑ جائے تو وہ بھرشٹ (ناپاک) ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں سے انتہائی حد سے بھی بڑھ کر نفرت کرنے والی یہ قوم اتنی بزدل ہے کہ ان کے سورج ونسی راجپوت راجہ، مہاراجاؤں نے مسلمان حکمرانوں کی ہیبت سے لرزاں اپنی بہنیں اور بیٹیاں ان کے نکاح میں دیں۔ راجہ جے چند جو جہلم سے پشاور تک کا حکمران تھا۔ چار بار احمد شاہ ابدالی سے پوری تیاری کے ساتھ لڑا اور ہر بار احمد شاہ ابدالی اسے شکست دے کر کابل لے جاتا۔ راجہ جے چند سے اپنے پاؤں دھلواتا اور اسے رہا کرکے واپس بھیج دیتا۔ برصغیر میں مسلمانوں کے بعد انگریزوں کی حکومت آئی تو ہندوؤں نے انگریزوں سے مل کر مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے۔ وہ تو چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو بحیرہ عرب میں پھینک دیا جائے اور سارا بھارت شدھ ہوجائے لیکن عقاب مرجانا پسند کرے گا۔ پنجرے میں قید ہونا اسے گوارا نہیں مسلمان بے لوث قائدین کی جدوجہد نے اپنا اثر دکھایا اور قائداعظم کے ہاتھوں برصغیر میں مسلمانوں کی دنیا میں سب سے بڑی سلطنت وجود میں آئی۔ بھارتی ہندو حکومت بھلا یہ صدمہ کیسے سہہ سکتی تھی۔ لاکھوں مسلمانوں کو پاکستان کی طرف ہجرت کرنے کے دوران شہید کر دیا گیا۔ نوزائیدہ پاکستان کو معاشی طور پر ختم کرنے کیلئے پاکستان کے حصے کا سرکاری روپیہ ادا کرنے سے انکار کردیا۔ پاکستان کے حصے میں آنے والی فوج کا اسلحہ ضبط کرلیا اور حصے کا گولہ بارود دینے سے انکار کر دیا۔ پاکستان کی انتہائی مختصر ایئر فورس کے جو آسٹر اور ہارورڈ جہاز تقسیم ہند کے وقت بھارت میں تھے، انہیں لانے کے لئے جب پاکستانی پائلٹ بھارت گئے تو ان جہازوں کے پیٹرول ٹینکس میں چینی ڈال دی گئی چنانچہ وہ جہاز بھارتی حدود میں ہی گر کر تباہ ہوگئے۔ کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کرلیا اور کشمیری مسلمانوں پر ایک نہ ختم ہونے والی ظلم وتشدد کی خونی داستان رقم کی جانے لگی۔ پاکستان میں سیاسی بحران کا فائدہ اٹھاتے ہوئے 71ء میں مشرقی بازو کو علیحدہ کر دیا حالانکہ پاکستان 62 میں انڈو چائنا جنگ کے دوران کشمیر پر بڑی آسانی سے قبضہ کرسکتا تھا لیکن پاکستان نے اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا۔ اب بھارتی مسلمان بھارت میں نچلے درجے کے شہری بن کر رہ گئے ہیں۔ بھارتی مسلمانوں کو زک پہنچانے کا کوئی موقع نہیں گنوایا جاتا۔ میں نے بھارت میں 3 برس سے زیادہ ہندو بن کر اور ہندوؤں کی محفلوں میں جاکر مسلمانوں کے متعلق ان کی دلی نفرتوں اور ناپاک ارادوں کا بخوبی مشاہدہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں کئی بار میں نے بھارتی ہندوؤں اور حکومت کے اصل عزائم کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔

میں گہری نیند میں تھا کہ میرے ساتھیوں نے مجھے جگایا۔ عارف ڈاکٹر کو لے کر آگیا تھا۔ ڈاکٹر نے میری ٹانگ کے زخم کو دیکھا۔ ہڈی سے ٹوٹے ہوئے باریک ٹکڑے اور گوشت کو علیحدہ کیا۔ زخم والی جگہ پر ہڈی بالکل ننگی ہوچکی تھی۔ اس کی مرہم پٹی کی۔ تازہ ترین زخم میری بائیں ران میں خاردار تار پھلانگتے وقت آیا تھا۔

غازی

ڈاکٹر نے زخم کو صاف کیا۔ میری کھوپڑی کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی اور کھوپڑی کے گوشت کا کچھ حصہ دونوں ٹکڑوں کے بیچ چلا گیا تھا اور کچھ حصے نے سر کے اوپر اسپیڈ بریکر کی شکل اختیار کر لی تھی۔ یہ ڈاکٹر عارف کا انتہائی با اعتماد دوست تھا لیکن یہ جنرل پریکٹس کرنے والا تھا۔ جبکہ میرے زخموں کو آپریشن تھیٹر اور Specialist سرجن کی ضرورت تھی۔ اس ڈاکٹر سے جو کچھ بن پڑا اس نے کیا اور ہر روز صبح آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ میرے ساتھیوں نے میری شیو بنائی اور سارے جسم کو اسپنج کیا۔ میرے تمام کپڑے اور سامان تو لودھی ہوٹل میں تھا۔ میرے جوڈو کراٹے والے ساتھی نے بتایا کہ میری جن حالات میں گرفتاری ہوئی تھی اس سے وہ سمجھ گیا تھا کہ مصیبت بہت بڑی ہے لہٰذا وہ سیدھا لودھی ہوٹل آیا۔ ہوٹل کے اسٹاف نے اسے میرے ہمراہ دیکھا ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے اور میرے چیک آؤٹ ہونے کا کہا اور میرے کمرے کی چابی بھی لے لی۔ اس نے میرا سارا سامان اور سائیلنسر والا پسٹل پیک کیا۔ ہوٹل میں ہم دونوں نے یکم جون کو ایڈوانس میں مہینے بھر کی ادائیگی کر دی تھی۔ چنانچہ ہوٹل والوں نے ہم دونوں کی بقیہ رقم واپس کی۔ میرے متعلق اس نے ہوٹل والوں کو بتایا تھا کہ اچانک بہت ضروری کام سے مجھے کلکتہ جانا پڑ گیا ہے اور واپسی تین چار ماہ سے قبل ممکن نہیں۔ میرا یہ ساتھی چونکہ میری وساطت سے ہی ہوٹل میں ٹھہرا تھا لہٰذا ہوٹل والوں نے کوئی تعرض نہ کیا اور ایڈوانس دی گئی رقم کے ساتھ ساتھ میرا ساتھی اپنے سامان کے ہمراہ میرا سامان بھی لے آیا۔ میں نے کپڑے تبدیل کئے دوپہر کے کھانے کے بعد میں نے اپنے نمبر ٹو (حبیب) سے میری گرفتاری کے بعد کے حالات پوچھے تو اس نے بتایا کہ انہوں نے میری گرفتاری کی اطلاع دوسرے دن پاکستان ٹرانسمٹ کر دی تھی۔ وہاں سے دوسرے روز پیغام ملا کہ تمام سرگرمیاں معطل کر دی جائیں اور نئے احکام تک حبیب ہی گروپ لیڈر رہو گا۔ اس نے بتایا کہ لیٹونت سے معمول کے مطابق ڈاک لی جاتی ہے لیکن ڈاک لانے، لے جانے والا کوئی نہ تھا۔ 5 جولائی کو پاکستان سے پیغام ملا کہ اگلے دن کیپٹن ارشد حبیب سے وہیں ملے گا جہاں اس سے پہلی ملاقات ہوئی تھی (یہ سبزی منڈی کی مین روڈ کا ہوٹل تھا) 6 جولائی کو وہ ساتھیوں کے کور میں اس کے ہوٹل میں پہنچا اور کیپٹن ارشد کو تفصیلاً میری گرفتاری کا بتایا۔ ڈاک کا تبادلہ کیا۔ کیپٹن ارشد اپنے ہمراہ نیا کوریئر لایا تھا۔ آئندہ اس سے ملنے کا وقت اور مقام طے کیا۔ ابھی اس کے آنے میں 4 روز باقی ہیں۔ لڑکے میری گرفتاری کا پتہ چلنے کے بعد مشتعل تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں DMI کی حراست میں ہوں تو انہوں نے وہاں بموں کے تین دھماکے کئے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو اپنی گرفتاری کے حالات تفصیلاً بتائے۔ میرا DMI ہیڈ کوارٹرز سے زندہ سلامت بچ نکلنا ایک معجزہ تھا۔ مجھ گنہگار بندے پر اللہ پاک نے اپنا رحم و کرم کیا تھا۔ میرے ساتھیوں نے میرے کامیاب فرار کا مختصر الفاظ میں میسج ٹرانسمٹ کر دیا تھا اور اب تفصیلی رپورٹ میں اپنے ایک ساتھی سے لکھوا رہا تھا تاکہ کوریئر کے ذریعے پاکستان بھجوا سکوں۔ میری تیمارداری کا کام میرے ساتھیوں نے سنبھال لیا جبکہ نذیر نے ڈاکٹر کے مشورے سے میرے لئے مرغن غذائیں پکوانی شروع کر دیں تاکہ میری جسمانی کمزوری جلد دور ہو سکے۔ ڈاکٹر بلاناغہ آتا اور میری مرہم پٹی کے علاوہ انجکشن اور دوائیاں دیتا۔ میری ٹانگ کا زخم صرف اس حد تک ٹھیک ہو سکا کہ ننگی ہڈی پر ایک نہایت باریک جھلی بن گئی۔ آج بھی حالت یہ ہے کہ اگر اتفاقاً صابن بھی اس جگہ پر زور سے گھس دوں تو جھلی پھٹ جاتی ہے اور خون بہنا شروع ہو جاتا ہے۔ دائیں ٹانگ کی چپنی (Stepney) تشدد سے ٹوٹ چکی تھی اور صحیح نہ جڑ سکی اور پٹھے اس بری طرح مجروح ہوئے تھے کہ دائیں ٹانگ کا جوڑ ہمیشہ کے لئے سوج گیا اور اس ٹانگ پر میں آج تک نہ بوجھ ڈال سکتا ہوں اور نہ ہی کوئی معمولی رکاوٹ پھلانگ سکتا ہوں۔ معدے میں شیشے کے ذرات اس طرح پیوست ہو چکے ہیں کہ مستقلاً معدے کا مریض بن گیا ہوں اور مسلسل دوائیوں کا استعمال کرتا ہوں۔ ایک اور تکلیف شدید دمے کی صورت میں نذیر کے گھر ہی شروع ہو گئی۔ جسے بمبئی، کھٹمنڈو اور پاکستان کے سول اور فوجی ڈاکٹر بھی ٹھیک نہ کر سکے۔ میرے فرار کے چوتھے روز بھارتی ہندی اور انگریزی اخبارات میں میری تصویروں کے ساتھ نمایاں طور پر یہ خبر شائع ہوئی کہ یہ پاکستانی جاسوس قید سے فرار ہو گیا ہے۔ اس کی گرفتاری میں مدد دینے والے کو دس ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا۔ گزشتہ نئے سال کی رات لودھی ہوٹل میں تقریب کے دوران میری ایک بھارتی بریگیڈیئر کی بیوی کے ساتھ کسی فری لانسر فوٹوگرافر کی کھینچی ہوئی تصویر بھی اخبارات میں شائع ہوئی۔ یہ تمام اخبارات حبیب نے کوریئر کے ذریعے پاکستان بھجوا دیئے۔ میں اب اپنے ساتھیوں کا لیڈر نہیں بلکہ مہمان تھا اور ان کے پاس صرف صحت یاب ہونے تک ٹھہرا ہوا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ مجھے اپنی آئندہ Movement کے احکام ملیں اور میں یہاں سے رخصت ہو جاؤں۔ میرا سائیلنسر والا پستول چونکہ میرے لئے تحفہ تھا اس لئے میں نے اسے لے لیا اور ہمیشہ لوڈ اپنے سرہانے رکھتا تھا تاکہ اگر DMI کے کتے میری تلاش میں یہاں تک پہنچ گئے تو ساری گولیاں ان پر برسا کر آخری گولی سے خود کو ہلاک کر دوں۔ گیرج کے لڑکے بھی ایک یا دو کی ٹولی میں مجھ سے ملنے آتے رہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ ان کے پھینکے ہوئے تینوں بموں سے تقریباً سو میٹر کے فاصلے پر سیل میں بند تھا اور دھماکوں کی آوازیں نے سنی تھی تو فخر سے ان کے چہرے کھل اٹھے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ بشیر کے شروع کئے ہوئے مشن اور ہماری تربیت کو وہ آگے بڑھائیں گے۔

میرا دہلی میں ساتھیوں کے ہمراہ رہنا نہ صرف میرے لئے بلکہ میرے ساتھیوں اور نذیر اور عارف کیلئے بھی خطرناک تھا۔ میرے زخم اور صحت بتدریج ٹھیک ہو رہے تھے۔ اسی دوران پاکستان سے ڈاک موصول ہوئی اور مجھے بمبئی جانے کا حکم ملا۔ بمبئی میرے لئے نسبتاً بہت محفوظ تھا۔ پاکستانی سرحدوں کی طرف جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اول تو بھارت نے سرحدیں سیل (Seal) کر دی تھیں۔ دوئم میری جسمانی حالت ایسی تھی کہ بمشکل لنگڑا کر چل سکتا تھا۔ ٹریننگ کے دوران گیارہ میل تک مجھے دوڑنے کی پریکٹس کروائی گئی تھی اور اب حالت یہ تھی کہ بغیر سہارے کے چند قدم چلنا بھی دشوار تھا۔ میرے سینئرز کی طرف سے مجھے بمبئی میں دو ہمدردوں کے نام بھیجے گئے تھے جو میری مکمل صحت یابی تک میری نگہداشت اور میزبانی کر سکتے تھے۔

میرے پاس اپنے سامان کے دو سوٹ کیس تھے۔ میں نے بمبئی کے گرم مرطوب موسم کے پیش نظر دو تین جوڑے لباس اور دوسرا ضروری سامان ایک ایئر بیگ میں الگ رکھ لیا۔ میرے دونوں سوٹ کیس عارف نے بمبئی میں وکٹوریہ ٹرمینس (Terminus) اسٹیشن کے لئے ریلوے بلٹی کروا دیئے۔ میرے ساتھی اور لڑکے دہلی کے حالات مجھے ہر شام بتاتے تھے۔ سول اور فوجی جاسوسی محکموں کے لوگ پوری دہلی میں پھیل کر مجھے تلاش کر رہے تھے۔ شاید انہیں بتا دیا گیا تھا کہ میری جسمانی حالت ایسی ہرگز نہ تھی کہ دہلی سے باہر جا سکوں۔ یقیناً میں دہلی میں ہی کہیں روپوش تھا۔ اگرچہ پورے بھارت میں میرے پکڑے جانے کا احتمال تھا لیکن دہلی کی ناکہ بندی توڑ کر نکلنا ایک دشوار کام تھا۔ عارف نے مجھے دہلی کی حدود سے باہر چھوڑنے کی پیشکش تو کی تھی لیکن میں نے انکار کر دیا۔ ساتھی بھی میرے ساتھ محفوظ مقام تک جانے کو تیار تھے لیکن میں اپنی خاطر انہیں کسی مصیبت میں پھنسنے کا موقعہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے قیصر کو بلوایا اور اسے اپنی مشکل بتائی۔ قیصر نے مجھے کہا کہ آپ ہر روز رات 12 بجے بالکل تیار رہا کریں۔ میں دو تین دن کے اندر گاڑی لے کر آ جاؤں گا۔ اب حالت یہ تھی کہ نذیر، عارف اور میرے ساتھی ہر روز رات ایک بجے تک میرے پاس بیٹھے رہتے۔ قیصر سے بات ہوئے تیسری رات ساڑھے گیارہ بجے گھنٹی بجنے کی آواز آئی نذیر نے دروازہ کھولا تو لیفٹیننٹ کی وردی میں ملبوس قیصر تھا۔ کہنے لگا جلدی کیجئے۔ دو فوجیوں کو ہلاک کر کے جیپ حاصل کی ہے۔ تین لڑکے فوجی سپاہیوں کی وردی پہنے جیپ میں بیٹھے ہیں۔ ہمیں اس سے پہلے کہ سپاہیوں کی ہلاکت اور جیپ کی گمشدگی کا پتہ چلے آپ کو چھوڑ کر واپس آنا اور جیپ کو ٹھکانے لگانا ہے۔ یوں اچانک روانگی کے پروگرام کا سن کر میرے سمیت میرے ساتھیوں، نذیر اور عارف کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ سب نے گلے مل کر مجھے الوداع کیا۔ میں نے انہیں کہا کہ مجھے چھوڑنے کے لئے گھر سے باہر کوئی نہ آئے۔ قیصر کا سہارا لئے میں بڑی سڑک پر آ گیا جیپ میں بیٹھے لڑکوں نے مجھے سہارا دے کر پچھلے حصے میں سوار کروایا۔ ڈرائیونگ ایک دوسرا لڑکا کر رہا تھا جبکہ قیصر اس کے ساتھ بیٹھ گیا اور جیپ تیزی سے انڈسٹریل ایریا کی طرف روانہ ہوئی۔ راستے میں دو جگہ پر ناکے لگے ہوئے تھے جنہیں فوجی جیپ اور قیصر کی وردی نے آسانی سے عبور کر لیا۔ انڈسٹریل ایریا ختم ہونے کے بعد ایک چھپر ہوٹل ٹرک ڈرائیوروں کے لئے بنا ہوا تھا۔ میرے پروگرام کے مطابق مجھے یہاں سے اپنا سفر اکیلے جاری رکھنا تھا۔ چھپر ہوٹل سے ذرا آگے قیصر اور لڑکوں نے مجھے گرمجوشی سے الوداع کہا اور تیزی سے پلٹ گئے۔

اس سڑک پر ٹریفک کی آمد و رفت جاری تھی۔ میں سڑک سے ذرا ہٹ کر ایسی جگہ کھڑا ہو گیا جہاں آنے جانے والی گاڑیوں کی روشنی مجھ پر نہ پڑے۔ میں چاہتا تھا کہ کسی ٹرک میں لفٹ لوں۔ بسوں اور موٹر کاروں سے میں بچتا تھا۔ مجھے وہاں کھڑے آدھ گھنٹے سے زیادہ ہو گیا۔ اس دوران کئی ٹرک گزرے لیکن میرے اشارے پر کسی نے دھیان نہ دیا۔ بالآخر ایک ٹرک رکا۔ اس کا ڈرائیور ایک سکھ تھا۔ اس نے کہا کہ وہ صرف ہوڈل تک جا رہا ہے۔ میں نے غنیمت جانا اور اس میں سوار ہو گیا۔ میں نے ہوڈل کا کبھی نام بھی نہ سنا تھا۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ رات کے اندھیرے میں دہلی سے جتنا دور ممکن ہو چلا جاؤں۔ تقریباً پون گھنٹے کے سفر کے بعد ہوڈل کا قصبہ آیا۔ ڈرائیور کو میں نے کہا تھا کہ ایک ایمرجنسی کی وجہ سے مجھے متھرا جانا ہے۔ سردار جی نے مجھ سے 10 روپے کرایہ لیا تھا۔ وہ مجھے قصبہ کے ٹرکوں کے اڈے پر لے گیا۔ اور مجھے کوسی جانے والے ایک ٹرک پر بٹھا دیا۔ اس نے کہا کہ متھرا کے لئے بس یا ٹرک صبح سے پہلے نہیں مل سکتا۔ میں ٹرک میں کوسی چلا جاؤں جو یوپی کا سرحدی قصبہ ہے۔ وہاں سے متھرا جانے والی بسیں اور ٹرک مل جائیں گے۔ یہ ٹرک کوسی قصبے میں داخل ہو ہی رہا تھا کہ ڈرائیور نے ٹرک کی لائٹوں کا اشارہ دے کر آنے والی بس کو روک لیا۔ اس وقت صبح کی ہلکی روشنی پھیل چکی تھی۔ ڈرائیور نے بس پر ہندی میں لکھا متھرا پڑھ کر ہی اسے روکا تھا۔ ڈرائیور کو دس روپے دے کر میں بس میں جا بیٹھا۔ صبح کے 9 بجے ہوں گے جب بس متھرا کے مضافات میں داخل ہوئی۔ سڑک کے دائیں جانب مغلیا طرز تعمیر کی ایک وسیع مسجد تھی جس کے بہت بڑے صحن میں اونچی اونچی گھاس اگی تھی اور وہاں دو ہاتھی کھڑے تھے۔ بس شہر میں داخل ہوئی تو میں نے بس سے اتر کر ایک سائیکل رکشہ لیا اور اسے ریلوے اسٹیشن چلنے کو کہا۔ میں بسوں کے اڈوں اور پرہجوم سڑکوں سے بچنا چاہتا تھا۔ دہلی سے روانگی سے پہلے ہی میں نے پلان بنایا تھا کہ متھرا تک بذریعہ سڑک اور متھرا سے بمبئی بذریعہ ٹرین جاؤں گا۔ ریلوے ٹائم ٹیبل کے مطابق پنجاب میل ٹھیک ساڑھے نو بجے متھرا پہنچتی اور 20 منٹ بعد روانہ ہو جاتی تھی۔ مجھے اسٹیشن پہنچے ابھی چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ پنجاب میل آ گئی میں نے پلیٹ فارم سے باہر کھڑے ایک قلی سے بمبئی کا لوئر کلاس کا ٹکٹ منگوا لیا تھا۔ میں پلیٹ فارم کے باہر اوٹ میں کھڑا رہا۔ جونہی انجن نے روانگی کا وسل دیا میں جلدی سے پلیٹ فارم میں داخل ہوا اور لوئر کلاس کا جو ڈبہ سامنے دکھائی دیا، اسی میں سوار ہو گیا۔ ڈبہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بہت سے مسافر ڈبے کے فرش پر بیٹھے تھے۔ میں بھی کھڑکی کے ساتھ سنگل سیٹ کے ساتھ فرش پر بیٹھ گیا۔ میرے ساتھ ہی ایک فوجی سپاہی بیٹھا تھا اور سیٹ پر سفید ساڑھی پہنے ایک باوقار عورت بیٹھی تھی۔ اس نے ایک پاؤں سے چپل اتار رکھی تھی جو ٹرین کے مختلف اسٹیشنوں پر رکنے اور چلنے کے دوران سیٹ کے نیچے سے کافی پیچھے چلی گئی تھی۔ اس عورت نے جب چپل تلاش کی تو میں نے نیچے بیٹھے ہونے کی وجہ سے اس کی چپل پیچھے سے اٹھا کر اس کے دوسرے پاؤں کے قریب رکھ دی۔ اس خدمت کا صلہ اس خاتون نے یوں دیا کہ اگلے اسٹیشن پر اترنے سے پہلے اس نے اپنی سیٹ مجھے دے دی۔ مجھے سیٹ پر بیٹھتے دیکھ کر فوجی مجھے کہنے لگا کہ اس سیٹ پر تو میرا حق ہے کیونکہ میں تم سے پہلے ہی اس سیٹ کے خالی ہونے کے انتظار میں تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ چھٹی پر بمبئی جا رہا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ حق کی بات چھوڑو۔ چونکہ سفر لمبا ہے اور مجھے بھی بمبئی جانا ہے اس لئے ہم باری باری اس سیٹ پر بیٹھیں گے۔ مجھے بھی اس لکڑی کی سیٹ سے زیادہ فرش پر ٹانگیں پسار کر بیٹھنے میں زیادہ آرام تھا۔ پھر میرے بیگ میں دس ہزار روپے تھے، ٹوائلٹ جانے کے دوران اس کی حفاظت کی بھی ضرورت تھی۔ قصہ مختصر یونہی کبھی سیٹ اور کبھی فرش پر بیٹھتے گاڑی بمبئی کے مضافات میں داخل ہوئی۔

کلیان اسٹیشن سینٹرل بمبئی سے ستر میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ بمبئی کی لوکل ٹرین کا آخری اسٹیشن ہے۔ میں کلیان میں پنجاب میل سے اتر گیا اور لوکل ٹرین میں بیٹھ گیا۔ پنجاب میل چونکہ ایکسپریس ٹرین ہے۔ اس لئے کلیان کے بعد وکٹوریہ ٹرمینس پر ہی رکتی تھی جہاں پولیس اور انٹیلی جنس کے لوگوں کی موجودگی ضروری تھی۔ ان سے ہی بچنے کیلئے میں نے کلیان سے لوکل ٹرین پکڑی اور ''مسجد'' نامی اسٹیشن پر اتر گیا۔ ٹیکسی نے مجھے بھنڈی بازار پہنچا دیا۔ بھنڈی بازار بمبئی میں مسلمانوں کا گڑھ ہے۔ جے جے اسپتال ناکے کے قریب میں نے شبنم گیسٹ ہاؤس میں کمرہ لیا اور سفر کی تھکان اتارنے لگا۔ بمبئی پہنچنا میرے سفر کا پہلا سنگ میل تھا۔ منزل ابھی بہت دور تھی۔ میں نے دو روز سفر کی تھکان اتاری۔ ان دو دنوں میں مجھے کئی بار اس گیسٹ ہاؤس کے مالک/منیجر کے دفتر کے سامنے سے گزرنے کا اتفاق ہوا۔ ایک دفعہ میں نے دفتر کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا کہ وہ ٹرانسسٹر پر ریڈیو پاکستان کی خبریں نہایت دھیمی آواز میں سن رہا تھا۔ میں بڑی آہستگی سے دفتر میں داخل ہو گیا۔ مالک کو جب میری موجودگی کا احساس ہوا تو اس نے ٹرانسسٹر فوراً بند کر دیا۔ اس کی حالت ایسی تھی جیسے کوئی چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو اگرچہ گیسٹ ہاؤس میں میں نے اپنا نام آصف علی لکھوایا تھا۔ لیکن مالک شاید مجھے کسی بھارتی ایجنسی کا فرد سمجھ بیٹھا تھا۔ میں نے اس کا خوف دور کرنے کیلئے کہا کہ میں بھی ریڈیو پاکستان سننے کا خواہشمند ہوں۔ وہ کچھ اور گھبرا گیا۔ میں نے اسے کہا کہ تم جس طرح چاہو میرے متعلق اپنی تسلی کر سکتے ہو کہ میں مسلمان ہوں۔ گھبراہٹ میں اسے اور کچھ نہ سوجھا کہنے لگا کہ آپ واقعی مسلمان ہیں تو مجھے سورہ فاتحہ اور انا انزلنا سنا دیں۔ میں ہنس پڑا اور اسے دونوں صورتیں قرات کے ساتھ سنا دیں۔ اس کا خوف کم ہوا۔ کہنے لگا کہ آپ نے اپنا ایڈریس لکھنو کا لکھوایا ہے۔ لکھنو میں تو آپ کی شکل و شباہت کے آدمی نہیں ہوتے۔ اس کا نام غفار تھا۔ میں نے اسے کہا کہ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں بیان نہیں کیا جا سکتا، صرف سمجھا جاتا ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں تم سے زیادہ پاکستان کا حامی ہوں۔ تم بھی میرے متعلق زیادہ نہ سوچو۔ مجھے تم ایک اچھا دوست پاؤ گے۔ بھارت کے سب سے مشہور اور بڑے شہر میں مسلمانوں کی آبادی والے حصے میں مسلمانوں کے خوف اور دہشت کی یہ ایک معمولی سی مثال تھی۔ غفار نے ہماری اس گفتگو کے بعد سب سے پہلے تو یہ کیا کہ رجسٹر میں میری گیسٹ ہاؤس سے روانگی درج کر دی اور مجھے اپنے ذاتی رہائشی کمروں سے ملحقہ ایک کمرے میں شفٹ کر دیا۔ یہ کمرا بڑا اور زیادہ صاف ستھرا تھا اور اس کے ساتھ اٹیچڈ باتھ روم بھی تھا جبکہ باقی تمام منزلوں پر آٹھ آٹھ کمروں کیلئے مشترکہ ایک ایک غسل خانہ اور ٹوائلٹ (سنڈاس) تھا۔ غفار نے بتایا کہ گیسٹ ہاؤس کے دوسرے کمروں کی طرح اس کمرے کا رجسٹر میں اندراج نہیں ہے اور نہ ہی دوسرے کمروں کے رہائشیوں کی طرح اس کمرے کی روزانہ رپورٹ پولیس کو بھیجی جاتی ہے۔ اس نے اپنے ذاتی ملازم کو میرے کمرے کی صفائی کرنے اور کھانا وغیرہ لانے کی ہدایت کی۔ اس طرح میری پریشانی بھی دور ہو گئی۔ پاکستان کی طرح بھارت میں بھی ہوٹلوں میں مقیم مسافروں کے کوائف ہر روز متعلقہ تھانوں میں بھیجے جاتے ہیں۔ مجھے زخموں کی پٹیاں بدلنے اور دوا کے لئے ڈاکٹر کی ضرورت تھی۔ غفار کے توسط سے ایک ڈاکٹر جس کا کلینک بھنڈی بازار میں ہی تھا۔ ہر روز گیسٹ ہاؤس میں آ کر میری پٹیاں تبدیل کرنے لگا۔ دہلی کے ڈاکٹر نے مکمل نسخہ مجھے دے دیا تھا۔ اس ڈاکٹر نے اسی نسخے کے مطابق مجھے انجکشن اور دوا وغیرہ دینی شروع کر دی۔ میرے زخم تو آہستہ آہستہ مندمل ہو رہے تھے۔ لیکن دمے کی تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔ جب عام دواؤں سے افاقہ نہ ہوا تو اس ڈاکٹر نے انجکشن تجویز کئے۔ چوبیس گھنٹے میں دو انجکشن اور گولیوں سے مجھے دمے سے عارضی طور پر Relief مل جاتی تھی۔ گیسٹ ہاؤس میں ناشتہ اور کھانا باہر کے قریبی ریسٹورنٹس سے آتا تھا۔ کھانا لانے والے لڑکوں کو باہر والے کہہ کر پکارتے تھے۔ بمبئی میں عام گفتگو ایک مخصوص ملی جلی زبان میں کی جاتی ہے۔ میں نے ناشتے میں فرائیڈ انڈے اور توس منگوانے چاہے تو غفور کے ملازم نے باہر والے کو یوں آرڈر دیا۔ ''دو بیدا مسکا میں فرائی تیکھا کم، دو پاؤں اور تیکھی چائے لاؤ'' مسکا کا مطلب مکھن اور پاؤں توس اور بند کو کہتے ہیں اور تیکھا سرخ مرچ کو۔

غازی

بھنڈی بازار جے جے اسپتال ناکہ (چوک) سے شروع ہوکر ایرانی امام باڑے اور ایرانی مسافر خانے تک جاتا ہے۔ اس کے آگے کرافورڈ مارکیٹ ہے جہاں سے محمد علی روڈ شروع ہوتی ہے۔ پاکستان سے دہلی میں مجھے بمبئی میں ہمدردوں کے جو ایڈریس دیئے گئے تھے۔ وہ بالکل نامکمل تھے۔ مثلاً ایک ڈاکٹر کا صرف نام لکھا تھا جس کا لڑکا لاہور ایف سی کالج کا طالب علم تھا۔ دوسرا ایڈریس ایرانی مسافر خانے کے سامنے ایک موٹر بیٹری کی مرمت کرنے والی دکان کا تھا جہاں سے مجھے ''بڑے سیٹھ'' کا پتہ مل سکتا تھا۔ اسی طرح ایرانی امام باڑے کے قریب و جوار میں یوسف پٹیل کا پتہ کرنا تھا۔ بھنڈی بازار کے تقریباً وسط میں نیازی ریسٹورنٹ تھا جس کے مالک کے ذریعے میں ایک بینک کے ایم ڈی مسٹر رنگون والا تک پہنچ سکتا تھا۔

میں نے پہلے یوسف پٹیل کی تلاش شروع کی لیکن ناکام رہا۔ اس علاقے میں، میں جس سے بھی یوسف پٹیل کا پوچھتا تو وہ مجھے گھورتی نظروں سے دیکھتا اور ''معلوم نہیں'' کہہ کر آگے بڑھ جاتا۔ میں اب جسمانی طور پر اس قابل ہو چکا تھا کہ لنگڑاتا ہوا آہستہ قدموں سے کچھ فاصلے تک پیدل چل سکتا تھا۔ میں نے اب بڑے سیٹھ کو ڈھونڈنے کا فیصلہ کیا اور ایرانی مسافر خانے کے سامنے بیٹری کی مرمت کی دکان پر جا پہنچا۔ بڑے سیٹھ کا پوچھنے پر پہلے شاگردوں اور پھر مالک نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ میں دکان کے اندر ایک اسٹول پر بیٹھ گیا اور مالک سے کہا کہ مجھے بڑے سیٹھ سے ہر حالت میں ملنا ہے اور تم ہی مجھے اس کے متعلق بتا سکتے ہو۔ میں تو کسی نہ کسی طرح بڑے سیٹھ تک پہنچ جاؤں گا لیکن جب اسے معلوم ہوگا کہ تم نے مجھے اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا تو وہ تم سے بہت خفا ہوگا۔ میری یہ معمولی سی دھمکی کام کر گئی اور دکان مالک نے مجھے کہا کہ جمعرات کو شام 6 بجے یہاں آجانا۔ بڑے سیٹھ کا ایک آدمی ہر جمعرات کو یہاں آتا ہے۔ تمہیں اس سے ملوا دوں گا۔ میرے پاس جمعرات تک انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اس لئے واپس گیسٹ ہاؤس میں چلا گیا۔

بمبئی کا موسم بھی بڑا عجیب ہے۔ بالکل اچانک چند منٹوں میں بادل گھر آتے ہیں اور موسلا دھار بارش شروع ہو جاتی ہے۔ پیدل چلنے والے دکانوں کی اوٹ میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پندرہ بیس منٹ میں بارش تھم جاتی ہے۔ پانی کی نکاسی کا اتنا اعلیٰ نظام ہے کہ بارش ختم ہوتے ہی سڑکوں پر ایک بوند پانی دکھائی نہیں دیتا اور راہ گیر اپنی راہ لیتے ہیں۔ لوکل ٹرینوں کا نظام بھی اتنا اعلیٰ اور وسیع ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ بمبئی سینٹرل سے لیکر کلیان اور شہر کے کم و بیش 125 اسٹیشنوں مثلاً دادر، کولابا، اندھیری، ورلی، مسجد اور نا معلوم کن کن اسٹیشنوں کے لئے ہر چھ سات منٹ کے اندر گاڑی مل جاتی ہے۔ لائنوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ اپنی منزل کے لئے اگر گاڑی چھوٹ جائے تو چند منٹوں کے اندر دوسری گاڑی آجاتی ہے۔ ہر اسٹیشن پر گاڑی بہ مشکل ایک منٹ ٹھہرتی ہے۔ گاڑیوں کے انجن بجلی سے چلتے ہیں اور کوئی گاڑی ایک منٹ بھی لیٹ نہیں ہوتی۔ لوکل بسیں بھی لاتعداد ہیں اور ان سنگل اور ڈبل ڈیکر بسوں میں کبھی اوورلوڈنگ نہیں ہوتی۔ ہر بس اسٹاپ پر لوگ لائنوں میں کھڑے ہوتے ہیں۔ کوئی دھکم پیل نہیں ہوتی۔ جب کنڈیکٹر نے Full کہہ دیا مسافر وہیں رک جاتے ہیں۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ لائن میں کھڑے میاں بیوی میں سے ایک کو جگہ مل گئی تو دوسرا اگلی بس کے انتظار میں وہیں رک گیا۔ ٹیکسی یا تو بڑے کاروباری لوگ لیتے ہیں جنہیں اپنی گاڑی کی پارکنگ کے لئے جگہ نہیں ملتی اور یا پھر سیر و تفریح کے لئے چوپاٹی، جوہو اور مالابار ہلز پر جانے والے۔ تمام سڑکوں پر خالی ٹیکسیاں ہر وقت دوڑتی پھرتی ہیں۔ ان کے میٹر بالکل صحیح کام کرتے ہیں اور ٹیکسی لیتے وقت پاکستان کی طرح ڈرائیور پہلے آپ کا Biodata منزل مقصود پوچھ کر فرعونیت سے یہ فیصلہ نہیں کرتا کہ وہ آپ کو لے کر جائے یا نہیں اور نہ ہی کرائے کے لئے آپ سے بھاؤ تاؤ کرتا ہے۔

میں نے بمبئی کی ضرورت کے مطابق ایک برساتی اور پڑھنے کے لئے چند کتابیں خرید لیں۔ پکڑے جانے کے خوف سے میں بلا ضرورت باہر نہیں نکلتا تھا حالانکہ بمبئی دیکھنے کی مجھے بڑی آرزو تھی۔ جمعرات کو میں ساڑھے پانچ بجے ہی بیٹری کی دکان پر چلا گیا۔ اپنا پسٹل میں ہر وقت اندرونی پیٹی میں رکھتا تھا۔ تقریباً سات بجے شام ایک گاڑی ایرانی مسافر خانے کے پاس رکی۔ اس گاڑی کے شیشے سیاہ تھے اور بیٹھے ہوئے لوگ دکھائی نہیں دیتے تھے۔ دکاندار نے گاڑی کے ڈرائیور سے کچھ بات کی اور میری طرف اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے اندر بیٹھے لوگوں سے پوچھا اور گاڑی سے اتر کر میری طرف آیا اور مجھ سے میرا نام، پتہ اور بڑے سیٹھ سے ملنے کی وجہ پوچھی۔ میں نے اپنا نام آصف اور شبنم گیسٹ ہاؤس کا پتہ دیا اور کہا کہ میرا بڑے سیٹھ سے ملنا بے حد ضروری ہے اور ملنے کی وجہ میں صرف اسے ہی بتاؤں گا۔ ڈرائیور نے واپس جا کر گاڑی میں بیٹھے لوگوں سے کچھ بات کی اور مجھے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ گاڑی کے قریب پہنچا تو پچھلا دروازہ کھلا اور اندر بیٹھے ایک شخص نے مجھے اپنے ساتھ بیٹھنے کے لئے کہا۔ میرے بیٹھتے ہی گاڑی چل پڑی۔ پچھلی سیٹ پر میرے علاوہ دو نوجوان آدمی بیٹھے تھے۔ انہوں نے مجھ سے شائستہ لہجے لیکن بمبئی کی عوامی زبان میں مجھ سے دوبارہ میرا نام، پتہ اور بڑے سیٹھ سے ملنے کی وجہ پوچھی۔ میں نے انہیں وہی جواب دیا جو ڈرائیور کو پہلے دے چکا تھا۔ میں نے انہیں ایک بات مزید بتائی کہ میرے پاس اس وقت ایک لوڈ پسٹل اور لوڈ میگزین ہیں۔ آپ کو اس لئے بتا رہا ہوں کہ آپ میرے متعلق کوئی شک نہ کریں۔ انہوں نے پسٹل دیکھنا چاہا تو میں نے بیلٹ سے نکال کر سامنے بیٹھے آدمی کے ہاتھ میں دے دیا۔ ان دونوں نے گجراتی زبان میں آپس میں کچھ باتیں کیں اور پھر مجھ سے پوچھا ''کیا تم پاکستانی فوجی ہو؟'' میں نے جواب دیا ''میں جو کوئی بھی ہوں صرف بڑے سیٹھ کو بتاؤں گا آپ کو صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ میں بھارتی نہیں ہوں''۔ میرا جواب سن کر انہوں نے آپس میں گجراتی زبان میں بات کی اور مجھے کہا ''ہمارا ڈرائیور تمہارے ساتھ شبنم گیسٹ ہاؤس میں جا کر تمہاری وہاں رہائش کی تصدیق کرے گا۔ ہم آج بڑے سیٹھ سے بات کریں گے۔ اگر اس نے اجازت دی تو کل 11 بجے ڈرائیور تمہیں لینے شبنم گیسٹ ہاؤس میں آجائے گا۔ اگر ڈرائیور ایک بجے تک تمہارے پاس نہ پہنچا تو سمجھ لینا کہ بڑا سیٹھ تم سے ملنا نہیں چاہتا۔ اس صورت میں تم بڑے سیٹھ سے ملنے کی بات بھول جانا اور دوبارہ ایسی کوشش نہ کرنا''۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئے۔ اتنی دیر میں گاڑی جے جے اسپتال ناکے کے قریب جا کر رک گئی۔ انہوں نے میرا پسٹل مجھے واپس لوٹا دیا۔ ڈرائیور بھی میرے ہمراہ گیسٹ ہاؤس میں آیا۔ غفور اپنے دفتر میں بیٹھا تھا۔ ڈرائیور نے غفور سے میرے اس گیسٹ ہاؤس میں آمد اور رہائش کے متعلق پوچھا اور خاموشی سے چلا گیا۔ غفور اس کی باتیں سن کر کچھ پریشان دکھائی دیتا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے خاموشی سے ایک گجراتی اخبار نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں گجراتی تو نہیں پڑھ سکتا تھا لیکن اپنی تصویر دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ غفور نے بتایا کہ میری آمد کے دوسرے دن ہی اسے میرا چہرہ جانا پہچانا دکھائی دیا۔ اس نے کہا پرانے اخبار کھنگالے اور وہ اخبار نکال لیا جس میں میری تصویر چھپی تھی۔ اب غفور سے کچھ چھپانا بے سود تھا۔ میں نے اسے کہا کہ یہ سب درست ہے اور اب تم پر منحصر ہے کہ مجھے پناہ دو یا پکڑوا دو۔ لیکن یہ ضرور یاد رکھنا کہ میں گرفتار ہونے کے بجائے موت کو ترجیح دوں گا۔ یہ کہتے ہوئے میں نے پسٹل نکال کر اسے دکھایا اور کہا کہ اس کی گولیاں مجھے اپنی آخری سانس تک گرفتاری سے بچائیں گی۔ غفور نے بڑی سنجیدگی سے کہا کہ اگر آپ کو پکڑوانا ہوتا تو کئی روز پہلے یہ کام کر چکا ہوتا۔ ایک مسلمان جانباز کو ہندو بھارتی کتوں کے ہاتھوں پکڑوانے پر میں خود مر جانے کو ترجیح دوں گا۔ میری طرف سے آپ کوئی خدشہ محسوس نہ کریں لیکن آپ کا باہر جانا آپ کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ آپ احتیاط برتیں اور کم سے کم باہر جائیں۔ غفور نے مجھ سے پوچھا کہ میں تو اس آدمی کی آپ کے متعلق پوچھ گچھ سے پریشان ہو گیا تھا۔ وہ آدمی کون تھا؟ میں نے غفور کو بتایا کہ میں بڑے سیٹھ سے ملنے کی کوشش میں تھا۔ یہ ڈرائیور اس کے آدمیوں نے میری تصدیق کے لئے بھیجا تھا۔ غفور نے مجھ سے بڑے سیٹھ کے متعلق پوچھا تو میں نے اسے صاف بتا دیا کہ مجھے اس کے نام کا تو علم نہیں۔ مجھے ایرانی مسافر خانے کے سامنے ایک بیٹری مکینک کی دکان سے اس کا پتہ لینے اور ملنے کے لئے کہا گیا تھا۔ ایرانی مسافر خانے اور بیٹری کی دکان کا نام سن کر غفور بولا۔ کیا آپ کو واقعی بڑے سیٹھ کے نام کا علم نہیں۔ میں نے جواب دیا ''جب میں نے تمہیں اپنے متعلق سب کچھ بتا دیا ہے تو بڑے سیٹھ کا نام چھپانے سے کیا فائدہ تھا۔ غفور نے چائے کا آرڈر دے رکھا تھا۔ ہماری اس گفتگو کے دوران ہی چائے آچکی تھی۔ چائے پیتے ہوئے غفور نے کہا کہ بڑے سیٹھ کا نام حاجی مستان ہے۔ وہ برصغیر کا سب سے بڑا اسمگلر اور بمبئی اور ساحلی علاقوں میں مسلمانوں کی جان و مال کا محافظ ہے۔'' بمبئی کے مسلمانوں کا اللہ اور اس کے رسولؐ کے علاوہ صرف دو سہارے ہیں۔ حاجی مستان اور دلیپ کمار۔ دلیپ کمار مسلم اور غیر مسلم دونوں میں یکساں مقبول ہیں۔ کئی بار ہندو مسلم فساد کے دوران دلیپ کمار اکیلے فساد زدہ علاقے میں چلا گیا اور اس کے احترام میں ہندو مسلم فساد ٹل گیا۔ حاجی مستان کے بے شمار مسلم آدمی سارے بمبئی میں پھیلے ہوئے ہیں اور ہندو مسلم فساد شروع ہوتے ہی مسلمانوں کے تحفظ کے لئے وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کئی مسلح ہندو تنظیموں کے ہندو مسلم فساد میں حصہ لینے کے باوجود مسلمانوں کا جانی نقصان ہندوؤں کے مقابلے میں بہت کم ہوتا ہے۔ اگر حاجی مستان نے آپ کو پناہ دے دی تو پھر کم از کم بمبئی میں آپ کو کوئی خطرہ نہ ہوگا۔ پولیس اور خفیہ والے اس کا نام سنتے ہی کانپنے لگ جاتے ہیں اس کا اسمگلنگ کا سامان لانچوں اور ٹرکوں پر کھلے عام پولیس کے سامنے لوڈ اور ان لوڈ ہوتا ہے لیکن کسی کی جرات نہیں ہوتی کہ اس کے خلاف کارروائی کر سکے۔ یہی باتیں کرتے ہوئے رات کے دس بج گئے اور میں اپنے کمرے میں سونے چلا گیا۔

اگلے روز وہی ڈرائیور ساڑھے گیارہ بجے مجھے لینے آ گیا۔ وہی کالے شیشوں والی گاڑی تھی جس میں ایک شخص آگے اور دوسرا پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا تو ساتھ والے شخص نے ایک سیاہ پٹی مجھے دیتے ہوئے نہایت نرمی سے کہا کہ اسے اپنی آنکھوں پر باندھ لیں اور پسٹل مجھے دے دیں۔ میں نے اس کے کہنے پر عمل کیا اور گاڑی اپنی منزل کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

تقریباً تیس پینتیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد گاڑی رکی۔ میری آنکھوں سے پٹی ہٹا دی گئی۔ یہ ایک بہت بڑی اور بند گیرج تھی جہاں چار اور گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ اس گیرج کے اندر ہی ایک لفٹ تھی جس کے ذریعے ہم ایک بند راہداری میں پہنچے اور دس بارہ قدم چل کر ایک بڑے کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ کمرہ بہت اعلیٰ فرنیچر سے آراستہ تھا۔ اس کمرے کی دو دیواروں کو چھت سے فرش تک موٹے پردوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ یقیناً دیواروں میں کھڑکیاں ہوں گی جن سے باہر کا منظر دیکھ کر اس جگہ کی لوکیشن کا علم ہو سکتا تھا۔

ہم صوفوں پر بیٹھ گئے تھوڑی ہی دیر میں چائے، کافی اور کھانے کے دیگر لوازمات آ گئے۔ ہمارے سامنے ایک سنگل صوفہ کے ساتھ میز پر چار ٹیلی فون پڑے تھے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ صوفہ صاحب خانہ کے لئے مخصوص ہے۔ ہم چائے پینے میں مصروف تھے کہ ایک لمبا، دبلا اور سانولے رنگ کا شخص کمرے میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ اسے دیکھ کر مجھے یہاں لانے والے تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ میں بھی کھڑا ہو گیا، وہ شخص اس مخصوص صوفے پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر خاموشی سے مجھے پرکھتا رہا، پھر گجراتی نما اردو میں مجھ سے مخاطب ہوا، ''آپ مجھ سے ملنا چاہتے تھے فرمایئے کیا کام ہے''۔ میں نے جواب دیا ''میں آپ سے چند منٹ بالکل علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں''۔ ''یہ دونوں میرے قابل اعتماد ساتھی ہیں۔ ان کے سامنے آپ بلا جھجک ہر بات کہہ سکتے ہیں''۔ اس لمبے آدمی نے کہا۔ میں نے اس کی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے کہا کہ مجھے صرف چند منٹ علیحدگی میں آپ سے بات کرنی ہے۔ اس کے بعد اگر آپ نے مناسب سمجھا تو بے شک اپنے ساتھیوں کو بتا دیں۔ اس نے دونوں کو اشارہ کیا اور وہ فوری کمرے سے باہر چلے گئے۔ اب ہم دونوں کے سوا کمرے میں کوئی نہ تھا۔ سوالیہ نظروں سے اس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے کہا ''مجھے آپ کا نام معلوم نہیں۔ میں پاکستانی ہوں اور (اپنے ادارے کا نام بتاتے ہوئے) ٹریننگ کے دوران مجھے کہا تھا کہ اگر کسی مشکل میں پڑ جاؤں تو اس نامکمل ایڈریس پر بڑے سیٹھ سے ملوں۔ میں اور میرے ساتھی دو سال سے زیادہ عرصہ دہلی میں دیئے گئے اہداف اور مشنوں کی تکمیل کرتے رہے۔ میں DMI کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا اور ایک ماہ چھ دن انتہائی تشدد سہنے کے بعد DMI کے دو گارڈز کو ہلاک کر کے فرار ہوا۔ میں نے دوران تشدد اپنی زبان نہیں کھولی۔ میرے ساتھی دہلی میں بالکل محفوظ اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ میں زخمی ہونے اور اپنے ساتھیوں کی سلامتی کی خاطر بمبئی آ گیا ہوں اور ہدایات کے مطابق آپ سے ملنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ میں نے اسے اپنا کوڈ نمبر بتایا اور کہا آپ کا میرے ادارے سے یقیناً رابطہ ہوگا۔ آپ ان سے میری تصدیق کر سکتے ہیں۔ اخبارات میں میرے فرار ہونے کی خبر کے ساتھ میری تصویر بھی چھپی ہے۔

میری باتیں وہ بڑے غور سے سن رہا تھا۔ میں نے بات ختم کی تو اس نے کچھ دیر خاموشی کے بعد کہا۔ ''میرا نام حاجی مستان خان ہے۔ جن اخباروں میں تمہاری تصویریں شائع ہوئی ہیں۔ وہ سب اخبار میں منگوالوں گا، بھارتی پولیس، آئی بی اور فوجی جاسوسی ادارے جانتے ہیں کہ میں بھارتی مسلمانوں اور پاکستان کا نہ صرف حامی ہوں بلکہ ان کے مفاد میں کوئی خطرناک کام کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ وہ ہمیشہ اسی تاک میں رہتے ہیں کہ ان کے ہاتھ میرے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت آجائے اور وہ مجھے گرفتار کر لیں۔ تمہاری تمام باتوں پر یقین کرنے کے باوجود اس بات کا امکان موجود ہے کہ تم کسی بھارتی جاسوسی ادارے کے فرد ہو اور تمہارے فرار کی خبر اور تصویروں کو اخبار میں اس لئے چھپوا دیا گیا ہو کہ تمہارا ادارہ مجھے اپنے جال میں پھانس سکے۔ میرا تمہارے پاکستانی ادارے سے وائرلیس پر دو ہفتے میں ایک بار رابطہ ہوتا ہے۔ تمہارے کوڈ نمبر، نام اور حلیئے سے میں تمہارے ادارے سے تمہاری تصدیق کروں گا، تم اپنا پورا نام کوڈ نمبر اور اپنے افسروں کے نام لکھ کر مجھے دے دو۔ تم اصلی ہو یا نقلی، دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ میں گیسٹ ہاؤس سے تمہارا سامان منگوا لیتا ہوں۔ جب تک پاکستان سے تمہاری تصدیق نہیں ہو جاتی تم کو میرے آدمیوں کی نگرانی میں ایک آرام دہ گھر میں رہنا ہوگا اور اس گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس گھر میں ڈاکٹر تمہارا علاج بھی کرے گا اور تمہاری ضرورت کی ہر شے مہیا کی جائے گی۔ میرے آدمی تمہارے ساتھ نہایت عزت سے پیش آئیں گے جب تک تم ان کے فرائض میں مداخلت نہیں کرو گے۔ پاکستان نے اگر تمہاری سچائی کی تصدیق کر دی تو تم ہمارے انتہائی قابل احترام مہمان ہو گے اور ہم تمہاری ہر خواہش پوری کرنے میں فخر محسوس کریں گے۔ دوسری صورت میں یعنی پاکستان نے اگر تمہاری تصدیق نہ کی۔ تو ہم تمہیں بغیر تشدد کے ہلاک کر دیں گے۔ تمہیں جہاں رکھا جائے گا۔ وہاں نہ تو میرے آدمی تمہاری اصلیت جاننے کی کوشش کریں گے اور نہ ہی تم اپنے متعلق انہیں کچھ بتانا۔ یہ ہدایات دے کر حاجی مستان نے میز میں لگی گھنٹی بجائی اور ملازم کو کاغذ اور پین لانے کا کہا۔ میں نے کاغذ پر اپنے متعلق تمام تفصیل لکھ دی۔ حاجی مستان نے مجھے یہاں تک پہنچانے والے دونوں آدمیوں کو ایک دوسری گھنٹی بجا کر بلایا اور گجراتی میں انہیں میرے متعلق ہدایات دیں۔ اس کے بعد حاجی مستان اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھ سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور بولا ''مجھے تمہاری باتوں پر پورا یقین ہے، لیکن احتیاطاً یہ ناگوار کام کرنا ضروری ہے جونہی پاکستان سے تمہاری تصدیق ہو جائے گی، میں تم سے نہ صرف معافی مانگوں گا بلکہ اس ناخوشگوار کام کے بدلے میں میرے پاس تمہارے لئے ایسے Surprises ہوں گے جن کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ کہہ کر حاجی مستان چلا گیا۔ ان دو آدمیوں نے بڑے احترام سے مجھے چلنے کو کہا۔ گیرج پہنچنے پر گاڑی میں بیٹھتے ہی میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔ گاڑی تقریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ایک جگہ رکی۔ میری آنکھوں سے پٹی ہٹا دی گئی۔ یہ ایک بہت اونچی دیواروں والا بنگلہ تھا جس سے باہر صرف ناریل کے درختوں کا اوپری حصہ دکھائی دیتا تھا اور سمندر کی لہروں کی آواز سنائی دیتی تھی اس بنگلے میں ایک نہایت آراستہ بیڈ روم اور ایک خوب صورتی سے سجا ہوا ڈرائنگ روم مجھے دیا گیا۔ ان دو آدمیوں نے مجھے کہا کہ وہ گیسٹ ہاؤس سے میرا سامان اور ڈاکٹر کو لے کر چار بجے آجائیں گے۔ میں نے انہیں مختلف انگریزی اور اردو کے میگزین اور چند کتب لانے کا کہا، پاکستان سے تصدیق ہونے تک مجھے اس مکان میں ہی وقت بسر کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔

اونچی چار دیواری سے گھرے اس بنگلے میں مجھے گھومنے پھرنے کی پوری آزادی تھی۔ بیڈ روم اور ڈرائنگ روم دونوں ایئر کنڈیشنڈ تھے۔ ڈرائنگ روم میں Grundig 191 ریڈیو گرام، اور بہت سارے ریکارڈ اور ٹیپ کے اسپول تھے۔ بیڈ روم میں بھی ایک اعلیٰ ریڈیو تھا۔ دوپہر کا کھانا بہت سی ڈشوں پر مشتمل تھا۔ سہ پہر 4 بجے ڈاکٹر کو لے کر ایک آدمی آ گیا۔ ڈاکٹر نے میرے زخموں کی ڈریسنگ کی۔ میں نے اسے انجکشن لکھوا دیئے تو اس نے کہا کہ ان انجکشنوں سے بہت زیادہ اچھے اور زود اثر انجکشن وہ لایا ہے۔ انجکشن لگانے کے بعد ڈاکٹر چلا گیا۔ اس کے ہمراہ آنے والا آدمی ڈھیر سارے رسالے اور کتابیں لے آیا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ اگر پینا چاہیں تو اعلیٰ اسکاچ وسکی موجود ہے، میں نے شکریئے کے ساتھ معذرت کر لی۔ وہ کہنے لگا، جس چیز کی بھی ضرورت ہو، آپ بتا دیں، فوری مہیا کر دی جائے گی، میں ہر روز دو مرتبہ آپ کے پاس آؤں گا، ہر روز چار بجے ڈاکٹر آیا کرے گا، اپنی صحت کے علاوہ اس سے اور کوئی بات نہ کریں۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

غازی

بمبئی کی گلیوں میں

مکمل ریسٹ، تحفظ کے احساس، اعلیٰ ڈاکٹری علاج اور اچھی خوراک سے میں تیزی سے تندرست ہونے لگا، اسی طرح آٹھ روز گزر گئے۔ نویں روز 11 بجے وہی دونوں آدمی آئے اور مجھے کہا کہ بڑے سیٹھ نے بلوایا ہے۔ میں تیار ہو کر ان کی گاڑی میں سوار ہو گیا۔ اس بار انہوں نے میری آنکھوں پر پٹی نہیں باندھی۔ اسی بڑی گیرج میں گاڑی جا کر ٹھہری۔ میں چونکہ بمبئی سے ناواقف تھا اس لئے پٹی نہ ہونے کے باوجود مجھے اس علاقے کا پتہ نہ چل سکا۔ ڈرائنگ روم میں ہمیں بیٹھے تھوڑا ہی وقت گزرا ہو گا کہ حاجی مستان آ گیا۔ ہم سب اس کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ حاجی مستان نے آتے ہی مجھے گلے لگا لیا اور بولا پاکستان سے آپ کی تصدیق ہو گئی ہے مجھے کیا علم تھا کہ اتنے محب وطن، نڈر اور جاں فروش کی میزبانی کا شرف مجھے ملے گا۔ میں نے آج اور کل کیلئے اپنے تمام کام معطل کر دیئے ہیں۔ میں آپ کے سرانجام دیئے مشنوں کے واقعات سننے کو بیتاب ہوں۔ آپ کیلئے اب کوئی پابندی نہیں۔ آپ جہاں جانا چاہیں۔ میرے چار محافظ آپ کے ہمراہ جائیں گے۔ یہ چاروں محافظ اور ایک گاڑی چوبیس گھنٹے آپ کے Disposal پر ہو گی۔ آپ کو جس چیز کی بھی ضرورت ہو، بلا جھجک مجھے کہہ دیں یا میرے آدمی کو جو روزانہ دو بار آپ کے پاس آیا کرے گا۔ اس نے مزید کہا کہ پاکستان سے آپ کے مکمل صحت یاب ہونے تک آپ کو میرے پاس قیام کرنے کا کہا گیا ہے یا یوں کہہ لیں کہ جب تک میں آپ کے مکمل صحت یاب ہونے کی اطلاع ان کو نہ دوں اور جب تک آپ کے متعلق مزید احکام نہ آئیں۔ آپ میرے معزز مہمان رہیں گے۔

ہم نے دوپہر کا کھانا اکٹھے کھایا اور تین بجے تک میں اسے اپنے مشنوں کے متعلق مختصراً بتاتا رہا۔ حاجی مستان پوری دلچسپی اور شوق سے میری باتیں سنتا رہا۔ وہ حیران تھا تو اس بات پر کہ بغیر کسی مادی لالچ کے میں نے اس جان جوکھم اور خطرناک مہم کے لئے خود کو والنٹیر کیا۔ کہنے لگا کہ میرے ساتھ کام کرنے والے تو آپ کے انجام دیئے مشنوں سے سینکڑوں گنا کم خطرناک کاموں کے لئے لاکھوں روپے معاوضہ لیتے ہیں۔ تین بجے میں نے اس سے اگلے روز ملنے کا وعدہ کر کے اجازت لی۔ اس نے خود بتایا کہ یہ گھر مالابار ہل پر ہے اور جہاں میری رہائش ہے۔ وہ جوہو کا علاقہ ہے اور بنگلہ ساحل سمندر کے بالکل قریب ہے۔ میری روانگی سے پہلے ہی اس نے محافظوں کا انتظام کر دیا تھا اور ایک شیورلیٹ 57 ماڈل کی کار میرے لئے مخصوص کر دی تھی۔ اسی کار میں، میں محافظوں کے ساتھ جوہو والے بنگلے میں پہنچا۔ حاجی مستان کو میں نے دہلی سے بھیجے گئے اپنے سامان کی بلٹی کے کاغذات بھی دے دیئے تھے میرا سامان اگلے روز میری غیر موجودگی میں بنگلے پر پہنچ گیا۔ میں اس وقت حاجی مستان سے ملنے گیا ہوا تھا۔

میری داستان سننے کے شوق میں حاجی مستان نے واقعی دن کے بیشتر وقت کی اپنی ملاقاتیں اور دوسری سرگرمیاں معطل کر دی تھیں۔ اس کے سوال و جواب میں ایک دن اور داستان ختم کرنے میں لگا۔ ایک طرف وہ میرے، میرے ساتھیوں اور لڑکوں کے کارنامے سن کر محو حیرت تھا تو دوسری طرف میں برصغیر کے اس سب سے بڑے اسمگلر کی زندگی کے ایک نئے پہلو سے روشناس ہو رہا تھا۔ "بڑے سیٹھ" کو تو میں نہیں جانتا تھا لیکن حاجی مستان کے متعلق تو مجھے پاکستان میں ہی اچھا خاصا علم تھا۔ وہ بمبئی کا بے تاج بادشاہ تھا۔ اس کے ہاتھ اتنے لمبے تھے کہ بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے بھی بمبئی کے انتظامی معاملات چلانے میں صوبائی حکومت کو واضح ہدایات دے رکھی تھیں کہ حاجی مستان کی خواہشات کو اہمیت دی جائے۔ دلیپ کمار کو بمبئی کا میئر بنانے میں بھی حاجی مستان کا ہی ہاتھ تھا۔ بمبئی میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس علاقے کے دوسرے تمام اسمگلنگ کے گروہ یا تو خود ہی حاجی مستان کے خوف سے ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئے تھے یا پھر کوئی چارہ نہ دیکھتے ہوئے اسکے گروہ میں شامل ہو گئے۔ حاجی مستان سے غداری کی سزا صرف موت تھی۔ یوسف پٹیل جسے میں پہلے تلاش کرتا رہا تھا۔ واحد اسمگلر تھا جس نے حاجی مستان کی سرپرستی میں آنے سے انکار کر دیا تھا وہ ان دنوں خوف سے زیر زمین تھا اور حاجی مستان کے کارندے اسے ڈھونڈ رہے تھے۔ اتنے زیادہ اثر و رسوخ کا مالک برصغیر کا سب سے بڑا اسمگلر میرے سامنے بیٹھا بالکل بچوں کی طرح میری داستان سے محظوظ ہو رہا تھا۔ مسلمانوں اور پاکستان سے اس کی محبت اس کے ہر ہر لفظ ہر ہر بات سے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھی۔ میری داستان سن کر اس نے کہا کہ سقوط ڈھاکہ کا جتنا صدمہ بھارتی مسلمانوں کو ہوا ہے اتنا شاید پاکستانیوں کو بھی نہیں ہوا ہو گا۔ ہم تو پاکستان کو اپنا دفاعی قلعہ اور محافظ سمجھتے تھے۔ ہر بھارتی مسلمان کی آنکھیں مشکل وقت میں پاکستان کی طرف اٹھتی تھیں۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد ہمارا یہ واحد دنیاوی سہارا بھی ختم ہو گیا تھا لیکن آپ کی داستان سن کر مجھے یقین ہے کہ بھارت چاہے کتنی جنگی تیاریاں کر لے اسلحوں کے ڈھیر لگا دے سارے ہندوؤں کو فوج میں بھرتی کر لے لیکن جب بھی پاکستان اپنے زخم مندمل ہونے پر بھارت سے بدلہ لینے کے لئے دھاڑ لگائے گا تو بھارتی ہندوؤں کی دھوتیاں خراب ہو جائیں گی۔ آپ جب پاکستان واپس جائیں تو وہاں سب پاکستانی بھائیوں کو بتائیں کہ بھارت میں ہندوؤں نے بھارتی مسلمانوں کے ساتھ ذلت آمیز سلوک کر کے ان میں اتنی نفرت پیدا کر دی ہے کہ اب ہر بھارتی مسلمان ایک چھوٹا پاکستان ہے۔ ہم نے کسمپرسی کی حالت کے باوجود اتنی تیاری کر لی ہے کہ وقت آنے پر پاکستان کو پاکستانیوں سے زیادہ ہمدرد اور جانثار بھارت میں ملیں گے۔

حاجی مستان نے مجھے بتایا کہ وہ ایک انتہائی غریب گھرانے میں پیدا ہوا اور اس نے بہت ہی کم پڑھا ہے۔ چودہ برس کی عمر سے ہی اس نے والدین کی غربت کی وجہ سے عام مزدور کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا اور اپنے زور بازو سے اس مقام تک پہنچا ہے۔ اپنی غربت کے زمانے میں ہندوؤں کے متعصبانہ اور ہتک آمیز سلوک نے اس کے دل میں نفرت کا جو شعلہ بھڑکا دیا تھا وہ اس کے طاقت پکڑنے تک جوالا مکھی بن گیا اور اب وہ ہر ہر طریقے سے اس متعصبانہ اور ہتک آمیز سلوک کا بدلہ لے رہا ہے "میں جو کام کر رہا ہوں اس سے میرا واحد مقصد اس دشمن اسلام ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنا اور مسلمانوں کو ہر ممکن تحفظ دینا ہے"۔ میں حاجی مستان کے متعلق یہ باتیں اتنے کھلے طور پر اس لئے لکھ رہا ہوں کہ یہ مسلمان اور پاکستان کا ہمدرد چند سال پہلے اپنے مالک حقیقی سے جا ملا ہے اس کی آخری رسومات کا منظر بھارتی ٹی وی پر بھی دکھایا گیا اور اس کا گروہ اب ختم ہو چکا ہے۔

حاجی مستان نے کہا کہ میں چند روز میں اپنے اکٹھے کئے گئے اسلحہ کے ذخائر بھی آپ کو دکھاؤں گا۔ میں نے اسے کہا کہ پاکستان میں مجھے اپنی کور اسٹوری (Cover Story) کے لئے نیوناگ پاڑہ کا ایک ایڈریس دیا گیا تھا جہاں پر میری تصدیق کرنے والوں نے میرا نام ونود چوپڑا اور کھلی چائے کا بیوپاری بتانا تھا۔ میں اس ایڈریس پر بھی جانا چاہتا ہوں۔ حاجی مستان نے کہا کہ نیوناگ پاڑے میں ڈائمنڈ بلڈنگ میں ایک کشمیری النسل اسمگلر خواجہ اختر رہتا ہے۔ جو ظاہری طور پر قالینوں کا بیوپاری اور اندرونی طور پر اس کے لئے کام کرتا ہے۔ میں اسے یہاں بلوا لوں گا۔ اسے اپنی اصل حقیقت نہ بتانا۔ وہ تمہیں اس ایڈریس پر میرے محافظوں کے ساتھ لے جائے گا۔ میں نے حاجی مستان کو کہا کہ بمبئی میں میرا کوئی کام نہیں ہے اپنے مشنوں کی تکمیل اور بھارتی تشدد کے باعث میں بے حد ذہنی تناؤ (Tension) کا شکار ہوں۔ میرے زخم ٹھیک ہو جائیں تو میں سارے بمبئی اور گرد و نواح کے علاقوں میں گھومنے پھرنے جانا چاہتا ہوں۔ کالج کے زمانے سے ہی بمبئی کی فلم انڈسٹری کے متعلق ہوش ربا قصے سن رکھے ہیں۔ میں تمام فلم اسٹوڈیوز اور مصروف فلمی ستاروں سے بھی ملنا چاہتا ہوں۔ حاجی مستان نے کہا کہ جب بھی آپ خود کو فٹ محسوس کریں مجھے اطلاع بھجوا دیں۔ فلم اسٹوڈیوز اور فلمی ستاروں تک عوام کی رسائی نہیں ہوتی لیکن میری وجہ سے آپ کو تمام فلم اسٹوڈیوز اور فلمی ستاروں کے گھروں میں نہایت عزت و احترام سے خوش آمدید کہا جائے گا۔ آپ کو صرف یہ احتیاط کرنا ہو گی کہ آج سے آپ کا نام آصف علی اور نیشنلٹی برٹش ہو گی آپ کا "برٹش پاسپورٹ" کل آپ کو مل جائیگا۔ آج آپ کے بنگلے میں فوٹو گرافر پاسپورٹ کیلئے آپ کی تصویریں اتارے گا۔ آپ مزید تندرست ہو جائیں تو آپ کی ہر پسندیدہ جگہ پر آپ کو لے جایا جائے گا۔ آج حاجی مستان سے مسلسل ملتے ہوئے یہ تیسرا دن تھا۔ سہ پہر ساڑھے تین بجے میں رخصت لے کر واپس جوہو کے بنگلے میں آ گیا۔ آج میرا اسلحہ بھی واپس کر دیا گیا تھا۔

آج کی شام ڈاکٹر کے چیک اپ کے علاوہ فوٹو گرافر بھی میری تصویریں اتار کر لے گیا۔ کھانے کے بعد میں سیر کے لئے جوہو کے ساحل کی طرف چل دیا۔ تقریباً آدھے کلومیٹر کے بعد لوگوں کی بھیڑ بھاڑ نظر آئی۔ چاندنی رات میں چمکتی ریت اور بیسیوں ٹھیلے والے چاٹ اور ناریل کا پانی فروخت کر رہے تھے۔ مختلف ٹولیوں میں سیر کیلئے آنے والے درختوں اور چٹائیاں بچھائے خوش گپیوں میں لگے ہوئے تھے جبکہ جوان جوڑے ناریل کے درختوں کی اوٹ میں جگہ جگہ راز و نیاز میں مشغول تھے۔ یہ سب یقیناً بمبئی کے مڈل کلاس کے لوگ تھے جو اپنی کھولیوں سے نجات پانے کے لئے مہینے میں ایک آدھ بار کھلی فضا میں پکنک منانے آ جاتے تھے۔ میں نے یہ اندازہ اس بنیاد پر لگایا کہ کافی آگے تک جانے کے باوجود مجھے کوئی پرائیویٹ کار دکھائی نہیں دی جبکہ وہاں بیسیوں ٹیکسیاں موجود تھیں۔ میرے چاروں محافظ مجھ سے دس قدم پیچھے یوں چل رہے تھے کہ کسی کو بھی یہ خیال نہیں آ سکتا تھا کہ وہ میرے محافظ ہیں۔ اونٹوں اور گھوڑوں والے بھی ساحل پر سیر کرانے کے لئے جگہ جگہ موجود تھے۔ میں کافی دیر یونہی گھومتا رہا۔ ناریل کا پانی پیا۔ بمبئی کی خاص چاٹ بھیل پوری کھائی اور واپس لوٹ آیا۔ گھڑ سواری میں بچپن سے ہی کرتا آیا تھا اور شہسوار نہیں تو اچھا سوار ضرور تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ساحل پر گھوڑا بھگاؤں لیکن زخموں کی وجہ سے میرا گھوڑے پر بیٹھنا اور بھگانا ناممکن تھا۔ دوسرے یہ گھوڑے بہت مریل اور چھوٹی قامت کے تھے اور میں وہ منہ زور گھوڑا پسند کرتا تھا جو سوار کے بیٹھنے کے بعد ایک آدھ منٹ اپنی اگلی ٹانگیں اٹھائے رکھتا اور اپنے سوار کی مہارت پرکھنے کے بعد ہی قابو آتا تھا۔ رات گیارہ بجے مٹر گشت کے بعد ہم واپس لوٹ آئے۔ فیملیز کو دیکھ کر مجھے اپنی والدہ، بیوی اور بچے کی یاد ستانے لگی۔ جب میں پاکستان میں گھر سے آخری بار نکلنے لگا تھا تو میرا اس وقت اکلوتا لڑکا شجاع ایک سال سے بھی چھوٹا تھا۔ وہ اپنی دادی اور ماں کو توتلا کر اپنی توتلی زبان سے پکارتا تھا۔ لیکن اس نے مجھے کبھی بھی مخاطب نہیں کیا تھا۔ میں گھر والوں سے رخصت ہو کر جب صحن کے درمیان پہنچا تو اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے پانچ چھ مرتبہ مسلسل ابو کہہ کر پکارا۔ اس وقت مجھ پر جو کیفیت گزری اس کا احساس صاحب اولاد ہی کر سکتے ہیں۔ اس کی پکار سن کر میرے قدم وہیں رک گئے لیکن میں نے واپس پلٹ کر نہ دیکھا کہ کہیں میرے قدم شفقت پدری میں لڑکھڑا نہ جائیں۔ میری آنکھوں میں ضبط کے باوجود آنسو بھر آئے اور میں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اپنے گھر سے باہر آ گیا۔ دہلی میں قیام کے دوران سینکڑوں مرتبہ گھر والوں کی یاد آئی لیکن اپنے فرائض کی تکمیل کے احساس نے اس یاد کو پیچھے دھکیل دیا۔ اب جبکہ کوئی مشن میرے سامنے نہ تھا اس سحر زدہ ماحول میں، میں اپنے گھر اور گھر والوں کی یاد دل سے نہ نکال سکا۔ وہ رات میں نے سوتے جاگتے انہی خیالوں میں جکڑے گزاردی۔

آئندہ بیس بائیس دن میں نے زیادہ تر بنگلے میں ہی ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ہلکی ورزش کرنے خصوصاً ٹانگ پر بوجھ ڈالنے اور اسے پوری حرکت دینے میں گزارے۔ مجھے کسی وقت بھی یہاں سے Move کرنے کا حکم آ سکتا تھا اس موقعہ کو میں نے غنیمت جانا اور خود کو ذہنی اور جسمانی طور پر نارمل حالت میں لانے کی کوشش میں جت گیا۔ یہ اللہ پاک کا کرم تھا کہ اس بنگلے میں ایک مہینے میں ہی، میں جسمانی اور ذہنی طور پر نارمل ہو گیا۔ ادویات اور انجکشنوں کی وجہ سے مجھے وقتی طور پر دمے اور معدے کی تکلیف سے بھی نجات مل جاتی تھی۔ ڈاکٹر نے بھی مجھے فٹ قرار دے دیا تھا۔ بوقت ضرورت اس نے مجھے خود انجکشن لگانا سکھا دیا اور دوائیوں، انجکشنوں اور ڈسپوزیبل سرنجوں کا اسٹاک بھی دے دیا تھا اب وہ ہفتے میں دو بار میرے چیک اپ کے لئے آتا۔ یہ بمبئی میں برسات کا موسم تھا تقریباً ہر روز اور بعض اوقات تو دن میں کئی مرتبہ بارش ہوتی تھی اب میرا زیادہ وقت کتابیں پڑھنے اور ریڈیو اور میوزک سننے میں صرف ہونے لگا۔ اس دوران تین مرتبہ حاجی مستان نے مجھے مالابار ہل والی کوٹھی میں بلایا اور دو مرتبہ وہ خود مجھے ملنے جوہو کے بنگلے پر آیا۔ ایک بار میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ دھندے کے کام کو بمبئی گیرج سے مانیٹر کیا جاتا ہے اور اکثر و بیشتر Transaction رات کو ہوتی ہے۔ مجھ پر اتنا اعتماد ہو چکا تھا کہ اس نے مجھ سے اپنی انتہائی خفیہ اور ذاتی زندگی کی وہ باتیں بھی کہہ ڈالیں جو شاید اس کے انتہائی قابل اعتماد ساتھیوں کو بھی معلوم نہ ہوں گی۔

یہ اکتوبر 74ء کا وسط تھا۔ جب میں نے حاجی مستان کو کہا کہ اب میں بالکل تندرست اور شہر گردی اور گھومنے کے لئے بالکل فٹ ہوں۔ میں نے سب سے پہلے نیوناگ پاڑہ میں اپنے کور اسٹوری والے مکان کو دیکھنا چاہا۔ حاجی مستان نے اپنے ایک آدمی کو کہا کہ خواجہ اختر کو فون کر کے یہاں بلا لے۔ خواجہ صاحب دو گھنٹے میں آ گئے۔ حاجی مستان نے اس سے میرا تعارف کروایا کہ یہ آصف علی لندن سے آئے ہیں۔ انہیں اپنے ایک واقف ونود چوپڑا سے ملنا ہے جو تمہارے علاقے میں رہتا ہے۔ خواجہ اختر کو میں نے ایڈریس بتایا تو اس نے کہا کہ ابھی چلیئے۔ خواجہ اختر اپنی گاڑی میں اور میں چار محافظوں کے ساتھ اپنی گاڑی میں روانہ ہوا۔ نیوناگ پاڑے میں ٹوٹی پھوٹی سڑکوں سے گزر کر ہم ایک جگہ رکے۔ یہ ایک چار منزلہ بلڈنگ تھی جس کے دوسرے مالے (منزل) پر وہ فلیٹ تھا۔ میں اپنے چاروں محافظوں اور اختر کے ساتھ اس فلیٹ پر گیا۔ گھنٹی بجانے پر ایک گھاٹن (بمبئی کی زبان میں گھریلو کام کرنے والی عورت) نے دروازہ کھولا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ "ونود چوپڑا" تو کاروبار کے سلسلے میں "اتر" شمال کی طرف گئے ہوئے ہیں۔ کئی کئی مہینے باہر رہ کر یہاں چند روز کے لئے آتے ہیں۔ میرے مزید پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ونود سیٹھ کا چائے کا کاروبار ہے اور کلکتہ سے چائے کی پیٹیاں یہاں آتی ہیں، جنہیں سیٹھ کے حکم کے مطابق ہم مختلف جگہوں پر بھیج دیتے ہیں۔ اس وقت بھی پانچ پیٹیاں یہاں موجود ہیں۔ اس نے ہمیں فلیٹ کے اندر آنے کو کہا۔ چار کمروں کا یہ فلیٹ اچھے فرنیچر اور ضرورت کی ہر شے سے مزین تھا۔ ایک کمرے میں چائے کی پیٹیاں، لیبارٹری کا ترازو اور بہت سارے چائے کے کپ پڑے تھے (چائے کی بلنڈنگ Blending کیلئے ان کی ضرورت پڑتی ہے) چائے کی بہت ساری پڑیاں بھی ایک ریک میں پڑی تھیں جن پر مختلف نمبر اور مختلف چائے کے نام مثلاً Orange pecol اور Dargling flavour وغیرہ لکھے ہوئے تھے۔ گھاٹن نے بتایا کہ ونود سیٹھ کے ایک حصہ دار آٹھ دس روز بعد یہاں آتے ہیں۔ وہی میری اور میرے پتی کی تنخواہ دیتے ہیں۔ میں نے گھاٹن سے پوچھا کہ اس نے کیا ونود سیٹھ کو دیکھا ہوا ہے اور آخری مرتبہ وہ یہاں کب آئے تھے تو وہ پورے یقین سے بولی۔ "واہ سیٹھ یہ بھی بھلی کہی تم نے بھلا ہم اپنے سیٹھ کو نہ پہچانیں ہیں۔ وہ آپ ہی کی طرح لمبے اور گورے چٹے ہیں۔ پچھلے مہینے ہی تو وہ یہاں دس روز رہ کر "اتر" گئے ہیں۔ میں اس گھاٹن کی باتوں سے حیران ہو رہا تھا۔ اسے خوب اچھی طرح سے "پڑھایا" گیا تھا۔ وہ پورے Confidence سے میرے سوالوں کا جواب دے رہی تھی۔ اس گھاٹن کی باتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ونود سیٹھ کا حصہ دار بھی یہاں آتا رہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میرے ہی محکمے کا کوئی گروپ یہاں بھی مصروف عمل تھا اور اسے اس مکان پر نگاہ رکھنے کی ہدایت بھی کی گئی تھی۔

میں نے گھاٹن کو کہا کہ میں لندن سے آیا ہوں اور تمہارے ونود سیٹھ کا دوست ہوں۔ انہیں میرا نمسکار کہنا۔ میرا نام آصف علی ہے۔ یہ کہہ کر میں نے گھاٹن کو دو سو روپئے دیئے اور ہم واپس چلے آئے۔ میرے محکمے نے میرے Cover کیلئے واقعی بہت پختہ انتظام کیا ہوا تھا۔ گاڑیوں میں بیٹھنے سے پہلے ایک 6 منزلہ بلڈنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خواجہ اختر نے بتایا کہ وہ ڈائمنڈ بلڈنگ ہے جس میں، میں رہتا ہوں۔ آپ یہاں تک آئے ہیں تو چائے پی کر جائیں۔ میں نے خواجہ اختر کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ چائے پھر کبھی سہی اس سے رخصت لیکر ہم واپس جوہو چلے آئے۔

اگلے روز ہم حاجی مستان کے ترتیب دیئے ہوئے پروگرام کے مطابق میرین ڈرائیو پر پہلے اپنے وقت کی معروف ہیروئن اور گلوکارہ ثریا کے فلیٹ پر گئے۔ ثریا کو اسکول اور کالج کے دنوں میں فلموں میں دیکھا تھا۔ اس دور میں اس کی ہر طرف دھوم تھی۔ وہ ہالی ووڈ کے مشہور ہیرو گریگوری پیک سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ یہی خواہش دل میں لئے وہ ابھی تک غیر شادی شدہ تھی۔ اس کی آخری فلم مرزا غالب تھی۔ ثریا ان دنوں سوشل ورکس کے کاموں میں مصروف تھی۔ اسی خدمت کے اعتراف میں بمبئی کی ایک سڑک کا نام ثریا روڈ رکھا گیا۔ قدیم تہذیب کی دلدادہ ثریا کے ڈرائنگ روم میں مغربی تہذیب کے صوفوں کے علاوہ ایک جانب فرشی نشست کا بھی انتظام تھا۔ ثریا نے چائے اور لوازمات سے میری تواضع کی۔ اس نے بتایا کہ ابھی تک وہ بمبئی فلم انڈسٹری کی واحد شخصیت ہے جس کے پاس رولز رائس گاڑی ہے۔ تقریباً ایک گھنٹہ ثریا کے پاس گزارنے کے بعد میں واپس چلا آیا۔ نیچے گاڑی میں میرے چاروں محافظ میرے انتظار میں بیٹھے تھے۔ اس کے بعد ہم میرین ڈرائیو سے ہی ایک اونچائی کو جاتی سڑک پر گھومے اور Hill Top ہوٹل کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک پرانی وضع کے چھوٹے سے بنگلے میں گئے۔ یہاں فلم ایکٹریس نمی اپنے شوہر (غالباً رضا علی) کے ہمراہ رہتی تھی۔ آگرے کی مشہور طوائف وحیدن بائی (جس کے گانوں کے ریکارڈ کسی زمانے میں بہت مقبول تھے) نمی کی والدہ تھیں۔ روایتی لکھنوی انداز سے سلام کرتی ہوئی نمی اور اس کا شوہر میرے منتظر تھے (یہ سب حاجی مستان کے اثر و رسوخ کے باعث تھا) وہاں بھی تقریباً ایک گھنٹہ ماضی کی فلموں کی باتیں کرتے گزرا۔ نمی بھی فلمی دنیا سے ریٹائر ہو چکی تھی اور خالصتاً گھریلو عورت لگتی تھی۔ ان دونوں میاں بیوی سے رخصت ہو کر ہم واپس چلے آئے کیونکہ آج کے دن کا یہی پروگرام طے تھا۔

(جاری ہے)

غازی

دہلی میں گرفتاری کے بعد سے میرا گھر والوں کے کوئی رابطہ نہ تھا۔ میری والدہ اکثر بیمار رہتی تھیں۔ اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے ان کی تمام تر ذمہ داری مجھ پر تھی۔ میں نے بالآخر انہیں اپنے محکمے کے لندن کے دفتر کی معرفت خط لکھا۔ لندن سے یہ خط میرے محکمے کو جانا تھا اور محکمے کی طرف سے یہ خط میرے گھر جاتا اور جواب اسی ذریعے سے مجھ تک پہنچنا تھا۔ بیس اکیس روز کے بعد میری والدہ اور بیوی کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے خطوط مجھے لندن سے موصول ہوئے۔ انہیں غالباً بتا دیا گیا تھا کہ وہ پاکستان کے متعلق کچھ نہ لکھیں۔ خطوں میں بھی از لندن لکھا ہوا تھا۔ یہ خطوط ملنے سے مجھے دلی سکون ملا۔ میرے بیٹے شجاع کی تصویر بھی تھی۔ وہ اب تین سال اور چند ماہ کا تھا۔ خط و کتابت کا یہ سلسلہ میرے بمبئی میں قیام تک جاری رہا۔

آئندہ ہفتے کی دوپہر کھنڈالا جانے کا پروگرام تھا جہاں سے پیر کو واپسی ہونی تھی۔ کھنڈالا بمبئی سے تقریباً 80 کلومیٹر دور ایک پرفضا نہایت خوبصورت پہاڑی مقام ہے۔ بمبئی کے روسا کی وہاں کوٹھیاں بنی ہوئی ہیں اور ہوٹل بھی ہیں اور کھنڈالا میں بھی حاجی مستان کا بہت خوبصورت سفید بنگلہ تھا۔ لیکن میں نے ہوٹل میں قیام کیا۔ دراصل میں مسلسل تنہائی اور محافظوں کے گھیرے سے اکتا چکا تھا۔ میں نے ہوٹل میں رہنے کا ارادہ کھنڈالا پہنچ کر کیا۔ میرے محافظ میرے اس فیصلے سے گھبرا گئے۔ میں نے حاجی مستان کو فون کیا تو اس نے کہا کہ کوئی ہرج نہیں۔ وہ فوری انتظام کر دیتا ہے۔ ہم ہوٹل کی ریسپشن میں بیٹھے تھے کہ ہوٹل کا منیجر آیا اور نہایت مودب ہو کر بولا۔ ہوٹل کا بہترین کمرہ آپ کیلئے حاضر ہے۔ میں ہوٹل میں انٹری کے لئے ریسپشن پر جانے لگا تو منیجر نے کہا۔ اس کی ضرورت نہیں۔ حاجی صاحب نے یہ کمرہ اپنے نام پر بک کروالیا ہے۔ آپ کی خواہش کے مطابق ہر شے مہیا کی جاسکتی ہے۔ آپ حکم کریں۔ میں نے کہا فی الحال تو آپ میرے چار آدمیوں کی رہائش کا انتظام کریں۔ منیجر نے جواب دیا کہ حاجی صاحب کے حکم کے مطابق آپ کے فلور پر ہی ان کے لئے بھی ایک بڑا کمرہ بک کر دیا گیا ہے۔ محافظوں کی طرف سے مطمئن ہو کر میں اپنے کمرہ میں چلا آیا۔ یہ کمرہ واقعی Royal Suite تھا۔ ایک بیڈروم، ایک ڈرائنگ روم اور ایک ویٹر صرف اس کمرے کیلئے مخصوص تھا۔ ہفتے کی شام تھی۔ ہوٹل میں کیبرے پروگرام بھی تھا۔ وہ شام میں نے کیبرے پروگرام دیکھنے اور فلور ڈانس کرنے میں گزاری۔ مجھے پاکستان میں تربیلہ ڈیم کے کلب، انٹرکانٹی نینٹل ہوٹلز اور دہلی میں اکبر، اشوکا اور لودھی ہوٹل میں گزری ہوئی شامیں یاد آگئیں۔ میں رات بارہ بجے تک کیبرے ہال میں ہی رہا۔ تھک ہار کر واپس کمرے میں آیا تو ایک میز کی دراز کھولتے ہی قرآن مجید، بائیبل اور گیتا اکٹھی رکھی ملیں۔ قرآن مجید دیکھتے ہی مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔ DMI کی قید اور تشدد کا ایک ایک لمحہ، موت مانگنے کی دعائیں اور فرار میں کامیابی سب ایک تیز فلم کی طرح میری آنکھوں کے سامنے سے گزر گئے۔ یہ محض اور محض اللہ پاک کی مجھ پر کرم نوازی تھی کہ مجھے اتنے کٹھن حالات سے گزرنے کے بعد ایک نئی زندگی ملی۔ میرا جگہ جگہ سے زخمی جسم ٹھیک ہو چکا تھا اور میں دشمن کے کتوں کی پہنچ سے دور محفوظ ہاتھوں میں تھا اور اپنے رب کی اتنی مہربانیوں کا شکر ادا کرنے کے بجائے میں نے یہ شام ناچ و درنگ کی محفل میں گزاردی تھی۔ میری زخمی ٹانگ جسے ڈاکٹر کے بقول اگر دو تین دن مزید بغیر علاج کے رکھا جاتا تو کاٹنی پڑتی، جب بالکل ٹھیک اور نارمل ہوگئی تو بجائے رکوع و سجود کے ڈانسنگ فلور پر ناچتا رہا۔ تف ہے مجھ پر اور میری زندگی پر۔ اپنی غفلت اور ندامت سے مجھ پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ ندامت کے آنسو بے اختیار میری آنکھوں سے بہنے لگے۔

(جاری ہے)

غازی

یہ سنتے ہی دلیپ میرے سامنے اکڑوں بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔ ”سیٹھ میں تو آپ کو ایسے لطیفے سناؤں گا کہ آپ کھانا بھول جائیں گے۔ حصہ کوتاہ ہم تقریباً دو گھنٹے اس کے بیسیوں لطیفوں سے محظوظ ہوئے۔ اس کا سنایا ہوا صرف ایک لطیفہ پیش خدمت ہے۔ بھارتی افواج کے بہادری کے تمغے اشوک چکر، بھارت چکر، ویر چکر اور مہاویر چکر وغیرہ ہیں۔ 65ء کی جنگ میں بھارتی افواج کی ”اعلیٰ کارکردگی“ دیکھتے ہوئے بھارتی حکومت نے ایک نیا تمغہ اپنی بہادر افواج کے لئے بنوایا جس کا نام رفو چکر رکھا گیا۔

کھانے کے بعد حاجی مستان نے اسے ایک ہزار روپے انعام دیا اور اس کے آدمی اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے میلوں دور باندرہ کے قریب چھوڑ آئے۔

میں نے اکثر یہ محسوس کیا کہ حاجی مستان باتیں کرتے کرتے اچانک کہیں کھو جاتا تھا۔ ایک روز میں نے اس سے پوچھ ہی لیا کہ اسے ایسی کون سی پریشانی ہے جس کے باعث اس کی یہ حالت ہو جاتی ہے۔ حاجی مستان سے ملے اگرچہ مجھے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے لیکن اس مختصر مدت میں ہم ایک دوسرے کے اتنے قریب آ چکے تھے کہ ذاتی باتیں بھی بڑی بے تکلفی سے کرتے تھے۔ میرے پوچھنے پر پہلے تو وہ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر بجھے لہجے میں بولا۔ ”میرے اس سارے غیر قانونی کاروبار کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ میں غریب اور نادار مسلمانوں کی مالی مدد کروں اور کمزور مسلمانوں کو ہندوؤں کے ظلم و تشدد سے بچاؤں۔ میرے دھندے میں پولیس اس لئے مداخلت نہیں کرتی کہ جان کے خوف کے ساتھ ساتھ میں نوٹوں سے ان کا منہ بند کئے رکھتا ہوں۔ جتنے بھی غیر مسلم اسمگلر بمبئی میں ہیں۔ ان کے گروہ بہت چھوٹے چھوٹے ہیں اور وہ یا تو میرے لئے کام کرتے ہیں یا مجھے باقاعدہ حصہ دیتے ہیں۔ صرف ایک مسلمان اسمگلر یوسف پٹیل ہے۔ جو میرے مقابلے میں ڈٹا ہوا ہے۔ چونکہ اس میں سامنے آ کر مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں اس لئے وہ آج کل زیرزمین رہ کر اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہے۔ وہ بھی مسلمانوں کا بہت حامی ہے لیکن اپنی ایک الگ سلطنت بنانا چاہتا ہے۔ الگ سلطنت وہ بنا نہیں سکا، مارنا میں اسے چاہتا نہیں کیونکہ اس کا اور میرا مقصد ایک ہی ہے۔ اس کے بارے میں میرے اس رویئے کی وجہ سے میرے گروہ میں یہ سوچ پھیلتی جا رہی ہے کہ میں اس کا مقابلہ کرنے سے کتراتا ہوں۔ ہمارے دھندے کا اولین اصول یہ ہے کہ اگر لیڈر کی صلاحیت اس کی پہنچ اور اس کی دلیری کے متعلق رائی برابر بھی شک پیدا ہو جائے تو گروہ کے کارکن یہ خطرناک اور جان لیوا کام کرنے سے کترانے لگتے ہیں۔ جب یوسف پٹیل کا ذکر آ ہی گیا تو میں نے اس سے چھپانا مناسب نہ سمجھا اور اسے بتا دیا کہ یوسف پٹیل کے متعلق مجھے بھی میرے محکمے والوں نے کہا تھا کہ بوقت ضرورت اس سے بھی رابطہ کروں اور تمہارے ملنے سے پہلے میں یوسف پٹیل کو تلاش بھی کرتا رہا ہوں۔ میں نے حاجی مستان سے کہا کہ جب تم دونوں کے مقاصد ایک جیسے ہی ہیں تو انشاء اللہ صلح صفائی کی صورت بھی نکل آئے گی چونکہ تم دونوں کے گروہ کے افراد کے اپنے ذاتی مقاصد بھی ہوتے ہیں اس لئے عین ممکن ہے کہ وہ تم دونوں کے درمیان خلیج کو پاٹنے کے بجائے اسے مزید وسیع کرنے کے درپے ہوں۔ اگر تم اجازت دو تو میں یوسف پٹیل تک پہنچ کر اسے سمجھانے کی کوشش کروں۔ میرا چونکہ اس میں کوئی ذاتی مفاد نہیں ہے اس لئے مجھے امید ہے کہ تمہاری طرح یوسف پٹیل بھی میری اصلیت جان کر مجھ پر اعتماد کرے گا اور بہتری کی کوئی صورت پیدا ہو جائے گی۔ حاجی مستان کچھ دیر سوچتا رہا اور بولا ”مجھے آپ پر پورا بھروسہ ہے اگر آپ کے ہاتھوں یہ کام ہو جائے تو بمبئی کی پوری مسلم آبادی اپنے ان دیکھے محسن کی ممنون ہو گی۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو تو نہیں بتایا کہ یوسف پٹیل آج کل کہاں ہے ورنہ ساتھیوں اور کارکنوں کا پھر فوری مطالبہ ہو گا کہ یوسف اور اس کے گروہ کا قلع قمع کیا جائے۔ آپ کو بتاتا ہوں کہ یوسف پٹیل آج کل محبوب اسٹوڈیوز کے عقب میں رہائشی مکانوں میں جینت فلم ایکٹر کے مکان میں رہتا ہے۔ اس تک پہنچنے کے لئے آپ کو اکیلے ٹیکسی میں جانا ہو گا۔ میرے آدمی ہماری دو گاڑیوں میں دور سے آپ کی حفاظت کریں گے۔ میں نے اس کی ہامی بھر لی۔ بھارت میں خطروں سے کھیلتے کھیلتے اب میں اس مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں زندگی کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ ہم نے اگلے دن صبح دس بجے کا پروگرام سیٹ کیا۔ مجھے جوہو سے نکلتے ہی ٹیکسی لے لینی تھی اور حاجی مستان کے 10 آدمیوں نے اس کی دو گاڑیوں میں مجھ سے فاصلہ رکھ کر میری حفاظت کرنی تھی۔

اگلے روز ٹھیک دس بجے میں جوہو والے بنگلے سے نکلا۔ گاڑی کو میں نے ٹیکسی اسٹینڈ کے قریب ہی چھوڑ کر ٹیکسی لی اور اسے داور محبوب اسٹوڈیوز چلنے کا کہا۔ کچھ دور جا کر میں نے پلٹ کر دیکھا تو دو گاڑیاں ہمارے تعاقب میں آ رہی تھیں۔ مجھے محبوب اسٹوڈیوز کے عقب میں جینت کے فلیٹ پر جانا تھا۔ میں نے ٹیکسی اسٹوڈیوز کے گیٹ پر رکوائی۔ گیٹ پر فلم آرٹسٹوں کو دیکھنے اور فلم میں ہیرو، ہیروئن بننے کے شوقین جوان لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک ہجوم تھا۔ میں تو چاہتا تھا کہ اسٹوڈیوز کے چوکیدار یا کسی کارکن سے جینت کے مکان کی صحیح لوکیشن پتہ کروں۔ لیکن یہ ہیرو، ہیروئن بننے کے شوقین لڑکے، لڑکیاں تو بمبئی فلم انڈسٹری کی انسائیکلو پیڈیا نکلے۔ ان میں سے بہت سے جینت کے فلیٹ کو جانتے تھے۔ مجھے وہ کوئی فلم پروڈیوسر سمجھے۔ ایک لڑکے نے مجھے فلیٹ تک پہنچانے کی پیشکش کی۔ میں نے اسے ٹیکسی میں بٹھا لیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ٹیکسی جینت کے مکان پر جا پہنچی۔ میں نے ڈرائیور کو اس لڑکے کو اسٹوڈیوز چھوڑنے اور یہاں واپس آ کر انتظار کرنے کا کہا۔ ٹیکسی واپسی گھومی تو میں سڑک پر ہی کھڑا رہا تا کہ محافظ مجھ دیکھ لیں۔ ایک گاڑی آگے بڑھی اور مجھ سے دو سو قدم دور جا کر رک گئی۔ میں دونوں گاڑیوں کے درمیان تھا۔ محافظوں کو قطعی علم نہیں تھا کہ میں یہاں کس سے ملنے آیا ہوں۔ انہیں صرف میری حفاظت کا کام سونپا گیا تھا۔ میں اس بلڈنگ میں داخل ہوا۔ لڑکے کے مطابق جینت کا فلیٹ دوسری منزل پر دائیں جانب تیسرا تھا (بعد میں معلوم ہوا کہ دائیں جانب کے پانچوں فلیٹ جینت ہی کے تھے۔ جینت کوئی بہت کامیاب اور پیسے والا اداکار نہ تھا۔ یہ اعلیٰ فلیٹ یوسف پٹیل نے جینت کے نام پر خریدے ہوئے تھے)

دوسری منزل پر دائیں طرف مڑتے ہی دو مسلح پہرے داروں نے میرا ”سواگت“ کیا۔ مجھے علم تھا کہ روپوش یوسف پٹیل سے ملنا آسان نہ ہو گا۔ میں اپنے پسٹل کے علاوہ لفافے میں بند اپنے محکمے کے نام کے Initials (نام کے پہلے حروف) اور کوڈ نمبر لکھ لایا تھا۔ اس سے پہلے کہ پہرے دار مجھ سے کوئی سوال کرتے میں نے لفافہ ایک پہرے دار کو تھمایا اور کہا کہ یہ لفافہ فوری طور پر یوسف پٹیل کو پہنچا دے۔ پہرے دار پہلے تو ہکا بکا مجھے دیکھتے رہے۔ پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے ایک پہرے دار لفافہ لے کر آگے والے فلیٹوں کی طرف چلا گیا اور میں نے اس کے اسٹول پر بیٹھ کر سگریٹ سلگا لیا۔ یوسف پٹیل کا حلیہ مجھے حاجی مستان نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک آدمی پہرے دار کے ہمراہ آیا اور مجھے کہا ”فرمایئے“ میں نے کہا ”مجھے صرف یوسف پٹیل سے ملنا ہے اور تم وہ نہیں ہو۔ اتنا سمجھ لو کہ اگر مجھ فوری طور پر یوسف سے نہ ملایا گیا تو اس بلڈنگ کے دونوں اطرف کھڑے حاجی مستان کے آدمی یہاں حملہ کر دیں گے۔ میرا یہ زبانی حملہ اتنا اچانک تھا کہ وہ تینوں بوکھلا گئے۔ میں اسی موقع کے انتظار میں تھا۔ میں نے فوری اپنا پسٹل نکال کر آنے والے شخص کی کنپٹی پر لگا دیا اور کہا کہ دونوں پہرے داروں کو کہو کہ اپنے ہتھیار فوری نیچے رکھ دیں اور ہمارے آگے آگے چلیں۔ خلاف ورزی کی صورت میں تمہاری کھوپڑی اڑا دوں گا۔ اس آدمی نے بے بسی سے پہرے داروں کی طرف دیکھا۔ پہرے داروں نے اپنی اسٹین گنیں فرش پر رکھ دیں اور ہمارے آگے چل دیئے۔ اسی حالت میں چلتے ہوئے ہم ایک فلیٹ میں داخل ہوئے۔ (جاری ہے)

غازی

شروع میں ہی ڈرائنگ روم تھا۔ ہم ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو وہ خالی تھا۔ اس آدمی نے بتایا کہ یوسف سیٹھ کی طبیعت ٹھیک نہیں اور وہ اسے بلا کر لاتا ہے۔ میں اس کی چالاکی سمجھ چکا تھا۔ اسے یا کسی پہرے دار کو جانے کی اجازت دینے کا مطلب تھا کہ چاروں طرف سے مجھ پر گولیوں کی بوچھاڑ ہو جائے۔ میں نے اس کی کنپٹی پر پسٹل کی نال کا دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ہم سب اسی طرح یوسف کے پاس جائیں گے۔ بچاؤ کی کوئی دوسری صورت نہ دیکھتے ہوئے وہ آدمی ہمیں اس ڈرائنگ روم سے واپس گیلری میں لے آیا اور اس فلیٹ سے ملحقہ اگلے فلیٹ میں لے گیا اور اس فلیٹ کے دو کمروں سے گزرنے کے بعد تیسرے کمرے میں ہم اسی پوزیشن میں داخل ہوئے۔ اس وسیع کمرے میں کئی صوفہ سیٹ اعلیٰ ایرانی قالین اور دیواروں پر پینٹنگز آویزاں تھیں۔ ایک صوفہ سیٹ پر ایک درمیانے قدوقامت کا کافی حد تک گنجا شخص بیٹھا تھا۔ مستان کے بتائے ہوئے حلیے سے میں نے اسے فوری پہچان لیا کہ یہی یوسف پٹیل ہے۔

پہرے داروں کے اٹھے ہوئے ہاتھ اور اپنے آدمی کی کنپٹی پر میرا پسٹل دیکھ کر یوسف بوکھلا کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے لئے یہ صورت حال قطعی غیر متوقع تھی۔ میں نے کہا "یوسف سیٹھ! آپ بیٹھ جائیں اور میری بات غور سے سنیں۔ میں نے جو کچھ لکھ کر بھیجا تھا کیا وہ آپ کے پاس ہے"۔ یوسف نے خاموشی سے لفافہ اور میرا لکھا ہوا پرچہ میرے سامنے کر دیئے"۔ "اس پرچے میں جو کچھ لکھا ہے وہ سو فیصد درست ہے۔ مجھے آپ تک پہنچنے کے لئے یہ ناگوار ذریعہ صرف اس لئے اختیار کرنا پڑا کہ آپ کا یہ آدمی مجھ سے وہ سوالات پوچھنے لگا تھا جن کا جواب میں صرف آپ کو دے سکتا ہوں"۔ میں یہ کہہ کر یوسف پٹیل کی طرف بڑھا۔ اس کی آنکھوں سے یقینی اور بے یقینی دونوں کیفیتیں صاف جھلک رہی تھیں۔ میں نے اپنا پسٹل یوسف پٹیل کے سامنے میز پر رکھ دیا اور کہا "اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ علیحدگی میں میری بات سنیں یا میرے پسٹل سے ہی مجھے گولی مار دیں"۔ یہ کہہ کر میں یوسف کے برابر پڑے صوفے پر بیٹھ گیا اور اطمینان سے سگریٹ جلا کر پینے لگا۔ یہ میرا نفسیاتی حربہ تھا جس میں، میں کامیاب رہا۔ چند لمحے گومگو کی حالت میں رہنے کے بعد یوسف پٹیل نے اپنے آدمی اور پہرے داروں کو باہر جانے کا کہا۔ اس آدمی نے یوسف پٹیل کو بتایا کہ میرے کہنے کے مطابق مستان کے مسلح آدمی سڑک پر دونوں طرف موجود ہیں۔ میں نے اس کی بات کاٹی اور کہا کہ یہ درست ہے لیکن وہ صرف میری حفاظت کیلئے آئے ہیں۔ حاجی مستان کو آپ کے اس ٹھکانے کا بخوبی علم ہے۔ اسی نے مجھے ان فلیٹوں کا بتایا ہے لیکن اس کے آدمی اس سے بے خبر ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ یوسف پٹیل اس کے نمائندے اور پہرے داروں کی ایسی حالت تھی کہ کمانڈ اب مجھے ہاتھ میں لینی چاہئے۔ میں نے اس آدمی اور پہرے داروں کو کہا "کیا تم نے سنا نہیں کہ یوسف سیٹھ نے تمہیں کمرے سے باہر جانے کا کہا ہے یاد رکھو کہ تم نہ تو حاجی مستان کے آدمیوں کے سامنے جاؤ گے اور نہ ہی ایسی حرکت کرو گے کہ انہیں اپنے تحفظ میں کچھ کرنا پڑے۔ ان کو بالکل بھول جاؤ اور مجھے یوسف سیٹھ سے آرام سے بات کرنے دو۔ ہمارے کافی اور کھانے کے لئے کچھ بھجوا دو۔ بالکل روبوٹس کی طرح انہوں نے میرے کہنے پر عمل کیا اور تھوڑی ہی دیر میں ہمارے لئے کافی اور لوازمات آ گئے۔

میں نے یوسف پٹیل کو اپنے محکمے، دہلی میں اپنی گرفتاری اور فرار کے متعلق بتایا اور کہا کہ اپنے محکمہ کی ہدایت کے مطابق میں بمبئی میں پہلے اسے ہی ایرانی امام باڑے کے علاقے میں تلاش کرتا رہا ہوں تلاش میں ناکامی کے بعد میں مجبوراً حاجی مستان کے پاس چلا گیا۔ میں اپنی صداقت کے ثبوت کے طور پر دو اخبار بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا جن میں میری تصویر اور فرار کے متعلق مہیا تھا۔ یوسف پٹیل کو جب میری باتوں کا یقین ہو گیا تو اس نے کہا کہ یہ درست ہے کہ تمہارے محکمے سے میرا تعلق ہے (جاری ہے)

غازی

اور میری لانچوں کے ٹرانسمیٹر زنے تمہارے محکمے کے کراچی سے بھیجے ہوئے وائرلیس پیغام بھی موصول کئے ہیں جن میں تمہارے متعلق ہدایات دی گئی ہیں۔ میں آج کل مجبوراً اپنے ٹھکانے پر نہیں جا رہا بلکہ یہیں سے اپنے کام کی نگرانی کر رہا ہوں۔ اب جبکہ تم مجھ تک پہنچ گئے ہو تو مجھے بتاؤ کہ میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں۔ میں اپنے تمام وسائل سے تمہاری ہر طرح سے مدد کرنے کو تیار ہوں۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ تمہاری روپوشی کی وجہ صرف حاجی مستان سے تمہارے اختلافات ہیں۔ حالانکہ حاجی مستان نے تمہارے اس ٹھکانے کا علم ہونے کے باوجود نہ صرف تمہارے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا بلکہ اپنے آدمیوں کو بھی اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ اپنے دھندوں میں صرف ''میں'' کی بے معنی، بے وقعت اور لا حاصل سوچ نے نہ صرف تم دونوں کے کاروبار کو نقصان پہنچایا ہے بلکہ تمہارے ہی دھندوں میں مصروف ان لوگوں کو بھی سر اٹھانے کا موقعہ دیا ہے جو پہلے تم دونوں کے سامنے ایسا سوچنے کی جرات نہیں کر سکتے تھے۔ تمہارے اختلافات کا سب سے زیادہ نقصان ان مسلمانوں کو ہو رہا ہے جو تم دونوں کی وجہ سے بمبئی میں خود کو محفوظ سمجھتے تھے۔ تم دونوں کی وہ توانائی اور طاقت جس سے یہاں کے غیر مسلم مسلمانوں کیخلاف قدم اٹھانے سے پہلے سو بار سوچتے تھے۔ اب تمہارے آپس کے اختلافات اور جھگڑوں میں صرف ہو رہی ہے۔ اسی موضوع پر حاجی مستان سے میری سیر حاصل گفتگو ہو چکی ہے اور اسی کے ایماء پر میں تمہارے پاس آیا ہوں۔ خدارا نمبر ون اور نمبر ٹو کے جھگڑے ختم کرو۔ تم دونوں نمبر ون ہو۔ دو نمبر ون یکجا ہو جائیں تو گیارہ بن جاتے ہیں۔ ان سطحی اختلافات کو چھوڑو اور اپنے اصل اور عظیم مقصد کو پورا کرو۔ کئی گھنٹوں پر محیط لمبی گفتگو کے بعد میں نے یوسف پٹیل کو بالآخر اس بات پر رضامند کر لیا کہ کل شام اپنے کارندوں سے اپنی حفاظت کی پوری تسلی کروا کر وہ ساڑھے چار بجے حاجی علی کے مزار پر پہنچ جائیں۔ حاجی مستان کو بھی ٹھیک ساڑھے چار بجے وہاں لانے کی ذمہ داری میں نے اٹھائی۔ میرے منصوبے کے مطابق پہرے داروں کے بغیر میرے ہمراہ دونوں نے رات وہیں گزارنی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ دونوں کے اختلافات کو ختم کرنے کی میری یہ کوشش بارآور ثابت ہو گی۔

یوسف پٹیل سے پوری تسلی کے بعد میں 5 بجے رخصت ہوا اور سیدھا حاجی مستان کے پاس پہنچا اور اسے سارے دن کی کارروائی بتائی اور کہا کہ اس کی اجازت کے بغیر ہی میں نے دونوں کی ملاقات کا یہ انتظام کیا ہے۔ حاجی مستان نے بھی حامی بھر لی۔ دوسرے دن شام چار بجے ہم روانہ ہوئے۔ حاجی علی کے مزار پر پہنچے تو یوسف پٹیل بھی جو سڑک پر پہلے سے ہی اپنے ہمراہیوں کے ساتھ اپنی موٹروں کے کارواں میں موجود تھا۔ بالکل اکیلا درگاہ پر آ گیا۔ مجھے وہیں معلوم ہوا کہ ان دونوں نے الگ بیٹھنے کے لئے درگاہ کے ایک جانب خواتین اور چلہ کاٹنے والوں کے بنے دو کمرے رات کے لئے بک کئے ہیں اور قالین، گاؤ تکیئے اور کھانے پینے کا وافر سامان اپنے اپنے طور پر پہلے ہی بھجوا دیا ہے۔

رات 9 بجے درگاہ سے اٹھ کر ہم تینوں ایک کمرے میں گئے۔ مجاوروں نے کھانا گرم کر کے تیار رکھا تھا۔ کھانے کے بعد ہم دوسرے کمرے میں گئے۔ دونوں میں گفتگو کا آغاز پہلے میری معرفت ہوا پھر تھوڑی دیر بعد دونوں ڈائریکٹ باتیں کرنے لگے۔ میرے سمجھنے کی خاطر دونوں نے ساری گفتگو گجراتی کے بجائے اردو میں کی۔ دونوں نے پہلے ایک دوسرے کی زیادتیاں بیان کیں۔ پھر شکوے شکایت شروع ہوئے۔ اس کے بعد دونوں کے ساتھیوں کی طرف سے کی گئی غلط باتیں اور ان باتوں کی صفائی اور اپنی لاعلمی بتائی گئی۔ پھر دھندے کی باتیں شروع ہوئیں۔ مسلمانوں کے تحفظ کے لئے اپنی اپنی خدمات کا ذکر ہوا۔ میں اس دوران صرف کبھی کبھی داخل اندازی کرتا رہا ورنہ دونوں کو اپنے دلوں کا غبار نکالنے کا پورا موقعہ دیا۔ غرضیکہ صبح ہونے تک دونوں میں باعزت سمجھوتہ اپنے دھندوں کے لئے علاقوں کی تقسیم پر ہوا۔ ایک دوسرے کے کاموں میں دخل اندازی نہ کرنے کے عہد و پیمان ہوئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دی گئی معلومات کی روشنی میں اپنے اپنے گروہوں کے ان لوگوں کو جو یا تو غدار ثابت ہوئے تھے اور یا دونوں کے اختلافات کو ہوا دیتے تھے جانی طور پر ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ صبح جب ہم درگاہ سے باہر نکلے تو ہماری پوزیشن یہ تھی کہ رات بھر کے رت جگے کی وجہ سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ درمیان میں، میں تھا۔ میرے ایک طرف حاجی مستان اور دوسری طرف یوسف تھا۔ ہم سڑک کے قریب پہنچے تو دونوں کے درجنوں محافظ اور کارندے پھٹی آنکھوں سے ان دونوں کو اس طرح باہم شیر و شکر باتیں کرتے اور ہنستے دیکھ رہے تھے۔ سڑک پر اپنے ساتھیوں اور محافظوں کو دکھانے کے لئے دونوں بغل گیر ہوئے۔ یوسف پٹیل نے اگلی رات کے کھانے پر مجھے انہی فلیٹوں میں دعوت دی۔ باری باری، دونوں نے مجھ سے معانقہ کیا اور اپنی گاڑیوں کے کارواں میں اپنے اپنے ٹھکانوں کو روانہ ہو گئے۔ میری گاڑی بھی میرے چاروں محافظوں کے ساتھ ایک جانب کھڑی تھی۔ ہم جوہو کے بنگلے کی طرف چل دیئے۔ میں قلبی اطمینان سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ جو مجھے بمبئی کے ان دو عظیم مسلمانوں کے سرپرستوں کو یکجا کرنے سے حاصل ہوا تھا۔

حاجی مستان اور یوسف پٹیل کی صلح صفائی سے دونوں کو کیا فائدہ پہنچا اور بمبئی کے مسلمانوں کا کتنا بھلا ہوا، اس کے بارے میں تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ مجھے جو فائدہ ہوا وہ یہ تھا کہ اب بجائے چار محافظوں کے میرے لئے چھ محافظ اور دو گاڑیاں مخصوص کر دی گئی تھیں۔ دوسری گاڑی اور دو نئے محافظ یوسف پٹیل کی عنایت تھے۔ ان محافظوں کے جلو میں اب میں بمبئی کے ان علاقوں میں بھی بلا کھٹکے جا سکتا تھا جو ہندوؤں کے گڑھ تھے۔

بمبئی میں بہت بڑا اور (Cosmopolitan) یعنی بین الاقوامی شہر ہے۔ لیکن ایک سیاح کے دیکھنے کیلئے بہت کم جگہیں ہیں۔ شہر بذات خود لوہے اور سیمنٹ کا جنگل ہے۔ بحیثیت پاکستانی میرے لئے بمبئی کی فلم نگری اور اس کے باسی سب سے زیادہ پرکشش تھے۔ مستان اور پٹیل نے اسٹوڈیوز اور میرے پسندیدہ فنکاروں سے میرے لئے وقت لے لئے تھے۔ ثریا اور نمی سے میں مل چکا تھا۔ اب دلیپ کمار، نرگس اور سنیل دت سے سب سے پہلے ملنے کا پروگرام طے تھا۔ دلیپ کمار کی رہائش پہاڑی کے دو ہموار تختوں پر دو حصوں پر مشتمل ایک بہت بڑے بنگلے (21، پالی ہل) میں تھی۔ سہ پہر چار بجے ملاقات کا وقت تھا۔ کوٹھی کے بڑے دروازے پر موجود دربان نے انٹرکام پر میری آمد کی اطلاع دی۔ چند منٹوں میں ہی دلیپ کمار کا چھوٹا بھائی مجھے لینے کیلئے آ گیا۔ دونوں گاڑیاں بھی گیٹ کے اندر بنگلے کے اندر جانے والی گزرگاہ میں پارک کی گئیں اور میں دلیپ کے بھائی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ ڈرائنگ روم کی سادگی اور نفاست اس عظیم فنکار کے ذوق کی مظہر تھی۔ مجھے وہاں چند لمحے ہی گزرے ہوں گے کہ اوپر کی منزل سے ڈرائنگ روم میں اترتی سیڑھیوں پر دلیپ کمار نظر آئے۔ وہ سفید پینٹ قمیص اور پاؤں میں چپل پہنے ہوئے تھے۔ مجھے ایسی بے تکلفی سے ملے جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ بہت ہی سادہ طبیعت اور دنیا کے تمام علوم میں گہرائی تک دسترس رکھنے والا یہ فنکار میرے ساتھ چند ہی منٹوں میں بے تکلف ہو گیا۔ کافی کے ساتھ ڈھیر سارے لوازمات تھے۔ میرے بتانے پر کہ میں برٹش نیشنل ہوں، دلیپ کمار نے مسکراتے ہوئے کہا کہ میں تو سائنس کے تجوبات کا قائل ہوں۔ آپ خود ہی دیکھئے کہ آپ برٹش نیشنل ہیں لیکن آپ نے برطانیہ کی روایتی تہذیب نہیں اپنائی۔ آپ کی جگہ کوئی انگریز ہوتا تو تھری پیس ایوننگ سوٹ میں ملبوس ہوتا۔ آپ کو دیکھ کر محسوس ہی نہیں ہوتا کہ آپ برٹش ہیں یا آپ نے کبھی برطانیہ دیکھا بھی ہے۔

اس کی ذو معنی بات اور مسکراہٹ سے ظاہر تھا کہ حاجی مستان نے شاید اسے میری اصلیت بتا دی ہے۔ میں اسے سمجھنے کی کوشش میں ہی تھا کہ دلیپ کمار نے مجھ پر دوسرا حملہ کیا ''میرے سارے دوست مجھے یوسف لالہ کہتے ہیں (جاری ہے)

غازی

آپ بھی مجھے اس نام سے مخاطب کر سکتے ہیں۔ پاکستانی مہمانوں کیلئے تو میرے گھر اور دل کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں" ۔ یہ کہہ کر یوسف لالہ ہنسنے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ عظیم فنکار اندرونی طور پر ایک ایسا بچہ ہے جو کسی کی چوری پکڑ کر اور بے ضرر طور پر اسے ظاہر کر کے خوش ہوتا ہے۔ ہم تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ مختلف موضوعات پر چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے رہے۔ یوسف لالہ نے مجھے کئی لطیفے بھی سنائے۔ ہر لطیفہ سنانے کے بعد وہ داد طلب نگاہوں سے مجھے دیکھتا۔ اب میری باری تھی۔ ہر لطیفہ سننے کے بعد کہتا" سنا ہوا ہے" میرے دو تین بار سنا ہوا کہنے پر یوسف لالہ کو احساس ہوا کہ جان بوجھ کر ایسا کہہ رہا ہوں۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا اور بولا" فوراً ہی بدلہ لے رہے ہو"۔ میں نے کہا" یوسف لالہ مزا تو اسی میں ہے کہ ہاتھ کے ہاتھ جواب ملے"۔ اس تمام ہنسی مذاق اور گفتگو کے دوران میں نے اس عظیم فنکار کی آنکھوں میں چھپا ہوا درد محسوس کیا۔ یہ درد اس کے بے اولاد ہونے کا تھا۔ اس کی بے شمار دولت اور بے مثال شہرت کا کوئی حقیقی وارث نہ تھا۔ بھائی بہنوں کی ایک فوج تھی جسے وہ فراخ دلی سے پال رہا تھا وہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ دلیپ کی کوئی اولاد ہو جو انہیں اپنے متوقع ورثے سے محروم کر دے۔ چلتے ہوئے میں نے کہا" یوسف لالہ میں دل کی گہرائیوں سے دعا کروں گا کہ اللہ پاک آپ کو اولاد کی نعمت سے نوازے"۔ دلیپ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور زور سے دباتے ہوئے سرگوشی میں کہا" یہ دعا نہ مانگنا۔ اولاد نہ ہونے کا دکھ تو میں برداشت کر رہا ہوں لیکن اولاد کے قتل ہو جانے کا دکھ برداشت نہ کر سکوں گا"۔ اس نے ایک فقرے میں اپنے انتہائی قریبی خونی رشتہ داروں کے عزائم اور اپنی مجبوری اور بے بسی کا پورا اظہار کر دیا تھا۔

دلیپ سے رخصت ہو کر ہم نمبر 22 پالی ہل پہنچے۔ یہ کمال امروہوی کی رہائش گاہ تھی۔ کمال نے محل اور پاکیزہ جیسی فلمیں بنائی ہیں۔ وہ گھر پر موجود نہ تھا۔ وہاں سے ہم راسی پالی ہل پر بنے نرگس اور سنیل دت کے بنگلے پر گئے۔ ان سے ملنے کے وقت میں ابھی ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔ لیکن دونوں نے بڑی اپنائیت اور گرم جوشی سے مجھے خوش آمدید کہا۔ یہ دونوں فنکار شہرت کی بلندیوں پر تھے۔ نرگس نے مدر انڈیا کے بعد فلمی دنیا کو خیرباد کہہ دیا تھا اور مکمل گھریلو زندگی بسر کر رہی تھی۔ اس نے کہا کہ مدر انڈیا میں اس کے لازوال کردار سے اس کا جو Image بن گیا تھا اسے وہ کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اسی لئے اس نے درجنوں ملکی اور غیر ملکی پیشکشیں ٹھکرا دیں۔ پھر ہنستے ہوئے سنیل دت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگی۔ دت مدر انڈیا میں تو میرا نالائق بیٹا تھا۔ لیکن اب بہت ہی فرماں بردار شوہر ہے۔ انہیں میرے متعلق یہی علم تھا کہ میں برطانوی نیشنل اور حاجی مستان کا دوست ہوں۔ اگرچہ رات کا کھانا پروگرام میں شامل نہ تھا لیکن انہوں نے بزور مجھے کھانے میں شریک کیا۔ کوٹھی کے شروع میں ہی بائیں جانب کمروں کی ایک لائن میں سنیل دت کے فلمی دفاتر وغیرہ تھے۔ میرے محافظوں کو بھی ان کمروں میں نہایت عمدہ کھانا بھجوایا گیا۔ کھانے کی ایک ہی میز پر سنیل دت کیلئے ویجی ٹیرین (Vegetarian) اور نرگس اور میرے لئے نان ویجی ٹیرین (Non-vegetarian) کھانے چنے ہوئے تھے۔ بقول ان کے دونوں میں کبھی بھی مذہبی تکرار نہیں ہوئی تھی۔ اولاد کے متعلق بھی انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ مسلمان یا ہندو جس مذہب کو بھی اپنانا چاہیں انہیں کھلی اجازت ہوگی۔ پاکستان میں نرگس کے انتقال کے وقت میں نے پڑھا کہ اسے اسلامی طریقے سے دفنایا گیا تھا۔

چند روز بعد میرا Elephantae (ایلیفنٹا) جزیرے پر جانے کا پروگرام تھا۔ یہ جزیرہ بمبئی سے تقریباً 10 میل کے فاصلے پر کھلے سمندر میں واقع ہے۔ یہاں جانے کے لئے لانچیں گیٹ وے آف انڈیا سے چلتی ہیں۔ ساحل سمندر پر بنی انگریزی دور حکومت کی یہ یادگار برصغیر پر ان کی حکمرانی اور بزور شمشیر حکومت کرنے کی داستان بیان کرتی ہے۔ گیٹ وے آف انڈیا کو دیکھ کر مجھے 1950ء کے عشرے کی یاد آ گئی۔ میں 1951ء میں گارڈن کالج راولپنڈی میں فرسٹ ایئر کا طالب علم تھا۔ (جاری ہے)

غازی

راولپنڈی صدر میں مال روڈ اور G.H.O سے آنے والی سڑک کے چوراہے پر فلیش مینز ہوٹل کے بالکل قریب لارڈ کرزن کا مجسمہ نصب تھا۔ برصغیر میں برطانوی حکومت کا یہ نمائندہ برصغیر ۹ کے محکوم عوام پر اپنے ظلم و ستم اور فرعونیت کے لئے مشہور تھا۔ اس مجسمے میں اس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں قلم تھا۔ شروع میں مجسمے پر یہ الفاظ کنندہ تھے We will rule you by sword and pen (ہم تم پر تلوار اور قلم کے ساتھ حکومت کریں گے) اس مجسمے پر یہ الفاظ دوسری جنگ عظیم کے آغاز تک (تقریباً سو سال) برصغیر کے عوام کو یہ باور کراتے رہے کہ تم ہمارے غلام ہو اور ہم اپنی طاقت کے بل بوتے پر تم پر حکومت کریں گے۔ دوسری جنگ عظیم (1939-1945) کے آغاز میں برطانیہ کو ہندوستانی سپاہیوں کی اشد ضرورت پڑی۔ برطانوی سامراج میں انڈین آرمی کا اسی فیصد اٹک، کیمبل پور، میانوالی، سرگودھا اور جہلم کے اضلاع سے لیا گیا تھا۔ مسلسل احتجاج اور مصلحت کی بنا پر انگریزوں نے مجسمہ تو نہ ہٹایا لیکن کنندہ الفاظ میں Rule کی جگہ Serve لکھ دیا۔ اب مطلب یوں ہو گیا ''ہم تلوار اور قلم سے تمہاری خدمت کریں گے''۔ انگریزوں نے پتھر بدلنے کی بھی زحمت گوارہ نہ کی۔ Rule کے الفاظ میں سیمنٹ بھر کر اس جگہ Serve لکھ دیا گیا تھا۔ تعجب تو یہ ہے کہ آزادی ملنے کے بعد بھی دس سال سے زیادہ عرصہ یہ مجسمہ وہیں ایستادہ اپنے سابقہ محکوموں کا منہ چڑاتا رہا اور کسی بھی صاحب اختیار نے اسے ہٹانے کی طرف توجہ نہ دی۔ بالکل یہی صورت حال مال گیٹ وے آف انڈیا کی تھی۔

یوسف پٹیل کی بھیجی ہوئی لانچ میں ہم ایلیفنٹا کی طرف روانہ ہوئے۔ ہماری لانچ انڈین نیوی کی برتھوں کے بالکل قریب سے گزری۔ یوسف پٹیل نے ایک دوربین بھی میرے لئے بھجوا دی تھی۔ میں نے ایک دوسرے کے پیچھے بالکل جڑے ہوئے انڈین نیوی کے دو فریگیٹ جہازوں کے پیچھے اس وقت بھارت کے واحد طیارہ بردار جہاز ''وکرنت'' دیکھا۔ جہاز پر اس وقت پانچ یا چھ Harrier ہوائی جہاز موجود تھے۔ باقی جہاز یقیناً نچلی ڈیک پر ہوں گے۔ اس طیارہ بردار جہاز کا مکمل نقشہ میرے ذہن میں نقش تھا۔ دوران تربیت اس جہاز کے ایک ایک حصے کے متعلق ہمیں تفصیلاً بتایا گیا تھا۔ میں اس جہاز کے اسلحہ خانے، پیٹرول ٹینکس نچلی ڈیک اور ہینگر کی سو فیصد نشاندہی کر سکتا تھا۔ اگر میرے پاس وسائل یا کم از کم ایک یا دو جانباز غوطہ خور، آکسیجن ٹینکس اور مقناطیسی بارودی سرنگیں ہوتیں تو اس جہاز اور اس کے ساتھ کھڑے فریگیٹ جہازوں کو تباہ کرنا کچھ مشکل نہ تھا۔ میں نے بعد میں حاجی مستان اور یوسف پٹیل سے اس بارے میں گفتگو بھی کی۔ وہ سب سامان مہیا کر سکتے تھے لیکن جانباز غوطہ خور ملنے ناممکن تھے ان کے اپنے کارندوں میں ایسے ماہر تیراک اور غوطہ خور تھے لیکن ان کی پیراکی اور غوطہ خوری صرف دولت اور سونے کے حصول کے لئے ہی مخصوص تھی۔ ملک و ملت کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہ تھی۔ بہر حال میں نے ہمت نہیں ہاری اور اس منصوبے کو حتمی شکل دینے لگا۔ حاجی مستان نے بتایا کہ گوا میں سابقہ پرتگیز حکومت کے حامی اور بھارتی حکومت کے مخالف بہت سے لوگ موجود ہیں اور ان میں اچھے غوطہ خور بھی ہیں جو اگرچہ اسمگلنگ میں ملوث ہیں لیکن انہیں اس کام کے لئے آمادہ کرنا آسان ہوگا۔ حاجی مستان اور یوسف پٹیل نے باہمی مشورے سے اپنے معتمد ساتھی گوا بھیجے۔ کافی چھان بین کے بعد وہ تین غوطہ خوروں کو اپنے ہمراہ بمبئی لائے ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ان غوطہ خوروں کو فوری ہی اپنا اصل ٹارگٹ نہیں بتائیں گے بلکہ انہیں مختلف چھوٹے چھوٹے ٹارگٹ دے کر ان کا امتحان لیں گے۔ حاجی مستان کا کہنا تھا کہ یہ جہاز تو یہاں موجود ہی ہیں ہمیں پہلے ان غوطہ خوروں کی اہلیت اور خلوص کو اچھی طرح پرکھنا چاہئے۔ جب ہمیں پورے طور پر اطمینان ہو جائے۔ تب ہی انہیں اصل ٹارگٹ بتایا جائے ورنہ بے فائدہ راز افشا ہونے پر ان جہازوں کی سیکورٹی میں دو چند اضافہ ہو جائے گا۔ ابھی ہم کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچے تھے کہ میرے نیپال جانے کے احکامات آ گئے اور یہ مشن ادھورا چھوڑ کر میں مکمل پلان لئے نیپال چلا گیا۔ ایلیفنٹا جزیرے پر پہنچنے میں ایک گھنٹے سے زائد وقت صرف ہوا۔ یہ جزیرہ 4 میل کے قطر میں پھیلا ہوا ہے۔ بے شمار درختوں، سبزہ اور ہزاروں بندروں سے آباد یہ جزیرہ آج کل ایک پکنک اسپاٹ ہے۔ اس جزیرے پر بلند چٹانوں، گہرے غاروں اور گہری کھائیوں میں چٹانوں کو تراش کر رہائشی کمرے، بڑے ہال، پانی کے حوض، سیڑھیاں اور راستے بنائے گئے ہیں۔ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کے مطابق مہا بھارت کی جنگ سے پہلے پانڈو اپنے ساتھیوں اور حامیوں کے ہمراہ اس جزیرے میں آئے اور چٹانوں کی یہ تراش خراش انہوں نے ہی کی اور یہیں پر وہ کوروں سے جنگ سے پہلے جنگی تیاریوں میں مصروف رہے۔ میں نے وہاں دو غاریں دیکھیں، جن کے منہ خاردار تاروں سے بند تھے ان کے متعلق بتایا گیا کہ یہ سرنگیں سمندر کی تہہ کے نیچے سے ہوتی ہوئی کلیان کے نزدیک (کلیان بمبئی سے 80 میل دور ہے) سطح زمین پر ختم ہوتی ہیں ان سرنگوں کی حقیقت تو اللہ ہی جانے لیکن چٹانوں میں ہال اور کمرے بنانے میں کم از کم چالیس پچاس سال صرف ہوئے ہوں گے۔ بلا مقصد انہیں بنانے کی بھی کوئی وجہ دکھائی نہیں دیتی۔ بمبئی کی بہت ساری فیمیلیز پکنک منانے اس جزیرے پر آئی ہوئی تھیں۔ یہاں پر بندروں کی اتنی بہتات تھی کہ اللہ کی پناہ۔ بندر اتنے نڈر تھے کہ چاروں طرف بیٹھے لوگوں کے درمیان دھرے کھانے کو بلا خوف اٹھا لیتے اور درختوں پر چڑھ کر وہ کھانا کھاتے اور لوگوں کا منہ چڑاتے تھے۔ ہمارے سامنے ایک آدمی نے زچ ہو کر ایک بندر کو پتھر مارا۔ پتھر نہ تو بندر کو لگا اور نہ کسی انسان کو لیکن بندر کو پتھر مارتے ہوئے کئی لوگوں نے دیکھا۔ بس پھر کیا تھا بیسیوں لوگ اس کے اردگرد جمع ہو گئے اور اسے ''ہنومان جی'' کی ہتک کرنے پر کوسنے لگے۔ اس آدمی نے غلطی سے بتا دیا کہ وہ مسلمان ہے۔ بس پھر کیا تھا اسے ہندوؤں کے دھرم پر مسلمانوں کا ڈائریکٹ حملہ سمجھا گیا اور بہت سارے ہندو اس مسلمان کو پیٹنے لگے۔ اس کی بیوی اور دو بچے سہمے ہوئے ہندوؤں کی منت سماجت کر رہے تھے لیکن ہندو اپنی فطرت سے مجبور اکیلے مسلمان کو دیکھ کر آپے میں نہ سما رہے تھے۔ مجھ سے یہ برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے اپنا پسٹل نکال کر ایک ہوائی فائر کیا۔ میرے چھ محافظوں نے بھی فوراً اپنے ریوالور اور پسٹل نکال لئے اور دو تین ہوائی فائر کئے ان فائروں نے ہندوؤں کے بلڈ پریشر کو اتنا (LOW) کر دیا کہ جس کا ہاتھ جہاں تھا وہیں رک گیا اور وہ اس پکنک سپاٹ سے یوں غائب ہوئے کہ اس مسلمان فیملی اور ہمارے سوا وہاں کوئی انسان دکھائی نہ دیتا تھا۔ ہندوؤں کے بہادر دیوتا ہنومان جی بھی وہاں سے یوں کھسکے کہ صرف دور سے ان کی آوازیں ہی سنائی دیتی رہیں۔ ہندوستانی حکومت خود اپنے ہنومان جی کو سرجری کی عملی تعلیم اور تجربوں کی بھینٹ چڑھانے کے لئے لاکھوں کی تعداد میں مغربی ممالک کو برآمد کر کے ڈالر کماتی ہے لیکن کسی ہندو کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ اور اگر ایک مسلمان ہنومان جی کی حرکتوں سے تنگ آ کر اسے محض ڈرانے کے لئے پتھر اٹھا کر پھینکے اور وہ پتھر ہنومان جی کو لگے بھی نہ۔ پھر بھی اسے ہندو دھرم پر ایک ملیچھ مسلے کا ڈائریکٹ حملہ سمجھ کر ہندو مسلم فساد کی فضا پیدا کر دی جاتی ہے۔ ہم اس مسلمان فیملی کو اپنے ہمراہ اپنی لانچ میں بمبئی لے آئے۔ میں گیا تو تھا ایلیفنٹا کے جزیرے کی سیر کو لیکن واپسی پر میں سوچ رہا تھا کہ ہندو چاہے بھارت کا ہو یا بنگلہ دیش کا، سری لنکا کا ہو یا پاکستان کا رانا چندر سنگھ سب مسلمان سے ازلی نفرت کرتے اور موقعہ ملنے پر انہیں ہر طرح سے نقصان پہنچانے کے درپے ہوتے ہیں۔

بمبئی میں میرے شب و روز گھومنے پھرنے اور حاجی مستان کے ترتیب دیئے ہوئے پروگرام کے مطابق نگار خانوں اور مشہور فلمی ستاروں سے ملنے میں گزرنے لگے۔ جن سے قارئین کو شاید دلچسپی نہ ہو۔ صرف ایک واقعہ مختصراً پیش خدمت ہے۔ بمبئی میں یونہی گھومتے ہوئے ایک روز ہم مشہور انڈین کامیڈی محمود کے ایک فلور کے اسٹوڈیو کے پاس سے گزرے۔ یہاں جانا اگرچہ ہمارے پروگرام میں شامل نہ تھا۔ لیکن میں اپنے محافظوں کی گاڑیاں سڑک پر رکوا کر اسٹوڈیو کے طرف چل دیا۔ پہلے اسٹوڈیو کے دفاتر آئے۔ معلوم ہوا کہ محمود بھی وہاں بیٹھا ہے۔

(جاری ہے)

قسط نمبر 56

غازی

میں نے محمود کے سیکریٹری سے محمود کے فین کی حیثیت سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔وہ مجھے اپنے کمرے میں بٹھا کر محمود کے پاس گیا۔ان دونوں کمروں کے درمیان لکڑی کی پارٹیشن تھی۔اوراس پارٹیشن میں شیشے کی ایک سلائیڈنگ چھوٹی کھڑکی لگی تھی۔ سیکریٹری کے پاس ایک شخص آیا جس نے بتایا کہ وہ محمود کا چھوٹا بھائی الطاف ہے،اور ملنے کی وجہ پوچھی ، مجھے دیکھتے ہی وہ گہری نظروں سے میرا جائزہ لینے لگا تھا۔کچھ دیر بعد وہ بولا کہ میں محمود بھائی سے پوچھ کر آتا ہوں۔سلائیڈنگ کھڑکی شاید تھوڑی سی کھلی رہ گئی تھی یا پتلی پارٹیشن کی وجہ تھی مجھے الطاف کی محمود کے ساتھ بات صاف سنائی دی۔وہ کہہ رہا تھا ’’الطاف محمود یہ شخص یقیناً وہی مفرور پاکستانی ہے جس کی تصویر اخبار میں چھپی تھی اور میں نے آپ کو دکھائی بھی تھی۔محمود کے پوچھنے پر کہ اب ہم کیا کریں۔الطاف نے کہا ’’ ہم فوراً پولیس کو اطلاع دے دیتے ہیں،اسے ہم اپنے اسٹوڈیو سے گرفتار کرائیں گے۔یہ سب گفتگو انگریزی میں ہورہی تھی الطاف نے کہا Bhai over a night you will become all india national hero (بھائی تم رات بھر میں سارے ہندوستان کے قومی ہیرو بن جاؤ گے) یہ سن کر اب میرا وہاں رکنا خود مصیبت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔میں اٹھا اور تیز قدموں سے سڑک کی طرف چل دیا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہناتے یا مجھے روکنے کی کوشش کرتے ، ہماری گاڑیوں کا کاروان وہاں سے روانہ ہو چکا تھا۔

ایسا ہی ایک واقعہ میرین ڈرائیو پر Hill top ہوٹل میں دوپہر کے کھانے کے دوران پیش آیا۔اس ہوٹل کے فرائیڈ جھینگے بہت مشہور تھے۔میں نے پہلا جھینگا ابھی اٹھایا ہی تھا کہ بمبئی پولیس کے کئی افراد اور درجنوں سپاہی ہوٹل میں دوڑتے ہوئے داخل ہوئے ، کچھ ریسیپشن کی طرف گئے اور کچھ لابی میں ملحقہ ریسٹورنٹ میں آگئے جہاں میں بیٹھا ہوا تھا میرا ہاتھ جہاں تھا وہیں رک گیا۔پولیس افسروں کے پاس کچھ تصویریں تھیں جنہیں دیکھ کر وہ لابی اور ریسٹورنٹ میں بیٹھے لوگوں کی شناخت کررہے تھے۔مجھے یقین ہوگیا کہ میں بڑی مصیبت میں گھر چکا ہوں۔میں نے جلدی سے اپنا پسٹل نکال کر اپنے سفاری سوٹ کی بیلٹ میں اڑوس لیا۔پولیس کو یوں ہوٹل میں آتے دیکھ کر میرے چھ محافظ بھی خطرے کی بو سونگھتے ہوئے ہوٹل کی لابی میں آچکے تھے۔میں نے دیکھا کہ ان سب کے ہاتھ کپڑوں میں چھپے اسلحے پر تھے۔پولیس مجھے گرفتار کرنے میں کامیاب ہوتی یا نہیں ، لیکن اس کوشش میں بہت سے پولیس والوں کی لاشیں ضرور گرنی تھیں۔ریسیپشن پر گئے پولیس افسروں کو لابی اور ریسٹورنٹ میں گئے پولیس والوں کو بلایا۔ان میں سے کچھ تو ہوٹل کی دولفٹوں میں اور باقی سیڑھیوں سے اوپر کی منزلوں کی طرف چلے گئے اور دس پندرہ منٹ میں ہی وہ دو آدمیوں کو ہتھکڑیاں لگائے اور مارتے پیٹتے لابی میں آگئے۔کچھ سپاہیوں نے پانچ سوٹ کیس اٹھا رکھے تھے۔ان کے جانے کے بعد میں نے بے دلی سے تھوڑا سا کھانا کھایا۔لابی میں ریسیپشن والوں نے بتایا کہ یہ افغانستان سے بھاری مقدار میں جعلی بھارتی کرنسی لائے تھے اور مخبری پر پکڑے گئے۔بعد میں حاجی مستان نے مجھے بتایا کہ ہل ٹاپ ہوٹل اسی طرح کے ناجائز کام کرنے والوں کا گڑھ ہے۔

بمبئی میں رہتے ہوئے اب مجھے اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔دہلی میں قیام کے دوران تقریباً ہر روز ساتھیوں اور لڑکوں سے ملنا،دیئے گئے مشنوں کی تکمیل کے لئے پلاننگ کرنا، ڈاک وصول کرنا ،اور بھیجنا اور آزادی سے بلا خوف ہر جگہ جانے اور خطرناک مشن انجام دینے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔بمبئی میں معذوری کی حالت میں سب سے الگ تھلگ اور پہرے داروں کے ساتھ صرف مخصوص جگہوں پر جاتے ، جاتے میں اکتا گیا تھا۔اس کیفیت کا ذکر میں نے حاجی مستان اور یوسف پٹیل سے بھی کیا۔پاکستان سے بھارت آتے وقت میرے دل میں 71ء کی پاک بھارت جنگ کے نتیجے میں پاکستان کے دولخت ہونے کا صدمہ اور اپنی اس ذلت کا بدلہ لینے کا عزم تھا۔ دہلی میں میری گرفتاری اور تشدد کے دوران تشدد کے علاوہ میرے مذہب اور میرے وطن کا تمسخر اڑانے سے بھارت سے میری نفرت اور بدلہ لینے کی خواہش میں دوچند اضافہ ہو چکا تھا اور نفرت کی اس آگ کو بجھانے کا کوئی موقع نہیں مل رہا تھا۔میں نے ان دونوں کو کہا کہ میری ذہنی کیفیت بالکل ایسی ہو چکی ہے جیسے کسی بہت ہی دلچسپ کتاب پڑھنے والے کی آخری صفحات کتاب میں نہ ہونے سے ہوتی ہے۔میں نے انہیں کہا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ واپس دہلی چلا جاؤں۔میرے ساتھیوں کو تو اب پاکستان سے نیا گروپ لیڈر مل چکا ہوگا اور وہ میرے کسی پلان کو پورا کرنے کے پابند نہ ہوں گے۔لیکن بشیر کے گیرج کے لڑکے تو میرے لئے ہر کام کرنے کو ہمہ وقت تیار ہوں گے۔حاجی مستان نے کہا کہ بھارت صرف دہلی تک ہی محدود نہیں۔

وہاں جانے کے بجائے یہاں بھی تم اپنے دل کے ارمان پورے کر سکتے ہو۔اگر یہاں جی اکتا گیا ہے تو کلکتہ یا مدارس چلے جاؤ۔ لیکن یہ یاد رکھنا کہ تمہاری حفاظت کی ذمہ داری ہم دونوں پر ہے اور یہاں تمہیں ہمارا اور ہمارے گروپوں کا پورا تعاون حاصل ہے۔ جس بڑے پیمانے پر تمہاری تلاش جاری ہے۔بمبئی میں تو تم بچ سکتے ہو لیکن مدارس اور کلکتہ میں تو تم ہزاروں میں پہچان لئے جاؤ گے۔ میں نے جب جذبات کو الگ کرتے ہوئے سوچا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ ان حالات میں بمبئی سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔میں نے انہیں کہا کہ مجھے ایک اسٹین گن اور تین چار فالتو بھرے ہوئے میگزین دیں اور پہرے دار محافظوں کو ہٹا دیں۔

(جاری ہے)

غازی

میں اکیلا ڈرائیو کر کے بمبئی میں گھومنا چاہتا ہوں۔ اسی روز میری گاڑی میں ڈرائیور کی سیٹ کے نیچے بنے خانے میں ایک اسٹین گن اور چار Extra میگزین رکھوا دیئے گئے، گاڑی کی چابی مجھے دے دی گئی۔ اگلے روز میں گاڑی لے کر نکلا تو کوئی محافظ نہ تھا۔ میرا رخ سانتا کروز ایئرپورٹ کی طرف تھا۔ Back view mirror میں، میں نے دیکھا کہ خاصے فاصلے پر محافظوں کی دونوں گاڑیاں میرا تعاقب کر رہی تھیں۔ مجھ سے وعدہ کرنے کے باوجود وہ اپنی ذمہ داری نہیں بھولے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں ان کے اس اقدام کو سراہا اور اس بارے میں خاموشی کو ہی بہتر جانا۔

اس دوران میں نے دو مختلف دنوں میں اجنتا اور ایلورا کے غار دیکھے۔ ان غاروں میں پتھروں سے تراشیدہ فن کے بہترین نمونے تھے۔ ایک فنکار کی حیثیت سے انہیں جتنا بھی سراہا جائے کم ہے لیکن ان کی تفصیل بیان کرنے کی ہماری اقدار بالکل اجازت نہیں دیتی۔

ایک روز شام ڈھلے حاجی مستان نے مجھے فون کیا اور جلد از جلد اپنے مالابار ہل کے بنگلے پر آنے کو کہا۔ میں تیار ہو کر اسکے گھر پہنچ گیا۔ یوسف پٹیل بھی وہاں موجود تھا حاجی مستان نے کہا کہ اس کے مال کی ایک بڑی کھیپ آج رات آنے والی ہے اور کھیپ اتارنے کے دوران گوا سے بلوائے گئے غوطہ خوروں کا بھی ٹیسٹ ہوگا۔ رات 12 بجے کے بعد سب کی طرح مجھے بھی ایک اوورہال پہننے کو دیا گیا اور چہرے پر گریس لگا دی گئی۔ اس حلیئے میں ہم سب کمانڈوز دکھائی دے رہے تھے۔ کام بھی خطرناک تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہاں مزید دولت جمع کرنے کی خواہش تھی اور وہاں وطن کی محبت اور مملکت کی سالمیت پیش نظر۔ دونوں کے کارکن تو پہلے ہی اپنے لئے متعین مقامات پر پہنچ چکے تھے۔ ہم تقریباً ایک بجے رات وہاں پہنچے اس جگہ کا نام گھاس بندر تھا اور یہاں مچھیروں کی سینکڑوں چھوٹی بڑی کشتیاں اور لانچیں موجود تھیں۔ ہم گاڑیوں سے اتر کر ایک لانچ میں بیٹھ گئے۔ یہ لانچ سمندر کے اندر دو میل جا کر رک گئی۔ ہماری لانچ پر میرے، حاجی مستان اور یوسف پٹیل کے علاوہ دس بارہ محافظ بھی تھے۔ اس لانچ کو صرف نگرانی کرنی تھی۔ ہماری لانچ سے کچھ ہی فاصلے پر ایک اور لانچ لنگر ڈالے کھڑی تھی۔ اس لانچ میں سے دو ننگے جسم آدمی گیس سلنڈر باندھے سمندر میں کود ے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ دونوں آدمی سطح سمندر پر ابھرے اور لانچ میں سوار ہو گئے۔ وہ لانچ ساحل کی طرف چل پڑی تو ہم بھی اس کے پیچھے ہو لئے۔ ہماری لانچ تیز تھی سو اس لانچ سے پہلے ہم ہی ساحل پر پہنچ گئے اور اپنی گاڑیوں میں جا بیٹھے۔ دوسری لانچ ساحل کے قریب پہنچی ہی تھی کہ اس کے دونوں غوطہ خور سمندر میں اتر گئے۔ اور وہ لانچ تھوڑی دیر بعد دوبارہ سمندر میں کسی دوسری طرف چلی گئی۔ تقریباً پندرہ منٹ میں یکے بعد دیگر دونوں غوطہ خور ساحل پر نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں دو دو زنجیریں تھیں۔ ساحل پر کھڑے کارکن ان کی طرف لپکے اور ان سے زنجیریں لے کر کھینچنے لگے۔ چند منٹوں میں ہی زنجیروں کے دوسرے سرے پر بندھے ہوئے چار بڑے صندوق ساحل پر آ گئے۔ ساحل پر کھڑا گھاس سے آدھا لدا ایک ٹرک الٹا چلتا ہوا ان صندوقوں کے قریب آن رکا۔ کارکنوں نے جلدی جلدی وہ صندوق اٹھا کر ٹرک میں ڈالے اور انہیں گھاس سے ڈھانپ دیا۔ چار پانچ اسلحہ برداروں کے ہمراہ ٹرک تیزی سے روانہ ہوا۔ اس کے آگے اور پیچھے پانچ چھ گاڑیاں تھیں۔ وہ ٹرک مراٹھا مندر سینما کے قریب ایک بڑی گلی میں داخل ہوا۔ ٹرک کے پیچھے چلنے والی گاڑیوں سے نکل کر کارکن ٹرک کی طرف بھاگے۔ اور چاروں صندوق چار چار آدمی اٹھائے گلی میں غائب ہو گئے۔ ہم بڑی سڑک پر اپنی گاڑیوں میں بیٹھے یہ کارروائی دیکھتے رہے۔

(جاری ہے)

غازی

بس گورکھ پور پہنچی تو بارش جاری تھی۔ میں نے بس سے اترنے سے پہلے رین کوٹ کی ٹوپی سے اپنے چہرے کو اور اچھی طرح سے ڈھانپ لیا۔ گورکھ پور کے ہوائی اڈے کو تباہ کرنے کے مشن کے دوران میں ساتھیوں سمیت کئی روز رہا تھا۔ چھوٹا شہر ہونے کی وجہ سے ان دنوں کئی لوگوں نے مجھے دیکھا ہوگا۔ دونوں کاروں کے مالکان بھی جنہیں ہم بے ہوش کرکے زندہ چھوڑ آئے تھے، گورکھ پور کے رہنے والے تھے۔ جن ہوٹلوں میں ہم ٹھہرے تھے ان کے ملازمین بھی اچھی طرح سے ہمارے چہرہ شناس تھے۔ میں اب تیسری مرتبہ یہاں آیا تھا۔ اس سارے سفر کے دوران یہ شہر میرے لئے سب سے خطرناک تھا۔ بس سے اترتے ہی میں نے بغیر کرایہ طے کئے ایک رکشہ لیا اور اسٹیشن پہنچ کر اسے دس روپے دیئے۔ قلی نے میرا سامان اٹھایا اور میں ریلوے اسٹیشن میں داخل ہو گیا۔

گورکھپور ایک بڑی فوجی چھاؤنی بھی ہے۔ اسٹیشن پر ایک پوری رجمنٹ کے جوان اور افسر موجود تھے۔ یہ غالباً جاٹ رجمنٹ تھی جس کو لے جانے کے لئے اسپیشل ٹرین آرہی تھی۔ پلیٹ فارم پر رجمنٹ کے جوانوں اور افسروں کے علاوہ ملٹری پولیس کے چاق و چوبند جوان بھی ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ میں جلدی سے ٹکٹ ونڈو کی طرف بڑھ گیا۔ بدحواسی میں مجھ سے وہاں ایک ایسی فاش غلطی ہوئی جسے سوچ کر میں اب بھی تھرا اٹھتا ہوں۔ تربیت کے دوران مجھے بھارتی فوجی معلومات کے علاوہ نہ صرف عام ہندی بول چال سکھائی گئی تھی بلکہ بھارتی ہندوؤں کے رہن سہن، تہذیب و تمدن، ادب آداب کے علاوہ ان تمام باتوں سے تفصیلاً آگاہ کیا گیا تھا۔ جن سے مجھے بھارت میں قیام کے دوران واسطہ پڑ سکتا تھا۔ بھارت میں قیام کے دوران میں نے بیسیوں بار ٹرین کا سفر کیا لیکن مجھ سے کبھی ایسی غلطی نہ ہوئی تھی۔ اس کی وجہ غالباً تین برس تک مسلسل خوف و ہراس کے درمیان رہنے، خطرناک مشن سرانجام دینے، گرفتاری، تشدد اور فرار کے بعد اب آزاد فضاؤں میں سانس لینے کی امید اور اسٹیشن پر فوجیوں کی بڑی تعداد کو دیکھ کر خطرے کے احساس کا مجموعی REACTION (ردعمل) تھا۔

ٹکٹ ونڈو پر میں نے رکسول کا انٹر کلاس کا ٹکٹ مانگا۔ انٹر کلاس کا سنتے ہی ٹکٹ بابو مجھے گھورنے لگا۔ آدھا منٹ وہ پلک جھپکائے بغیر ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتا رہا۔ اس دوران مجھے بھی اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔ اب میں صرف ٹکٹ بابو کے رحم و کرم پر تھا۔ اگر میں وہاں سے بھاگتا تو اس کی ایک ہی آواز پر ادھر ادھر پھیلے فوجی مجھے پکڑ لیتے۔ میرے لئے وہاں کھڑے رہنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ غلطی کا احساس ہوتے ہی میرے لبوں پر مہر سی لگ گئی تھی۔ میں اپنی غلطی کی تردید میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن آواز ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ ٹکٹ بابو کو میرے چہرے پر پھیلی دہشت یقیناً صاف نظر آرہی ہوگی وہ آدھا منٹ مجھ پر صدیوں سے بھاری گزرا۔ ٹکٹ بابو نے بالآخر کرخت لیکن دھیمی آواز میں کہا "یہاں انٹر کلاس نہیں ہوتا" تربیت کے دوران مجھے اچھی طرح سے ذہن نشین کرایا گیا تھا کہ بھارت میں کئی سال پہلے ریلوے میں انگریزوں کے دور کی درجہ بندی یعنی تھرڈ، انٹر، سیکنڈ اور فرسٹ کلاس ختم کرکے لوئر کلاس اور اپر کلاس میں بدل دی گئی تھی جب کہ پاکستان میں اس وقت وہی پرانا سلسلہ جاری تھا۔ یہ غلطی میری جلد بازی اور ذہنی کیفیت کی آئینہ دار تھی۔ ٹکٹ بابو نے گھورتی آنکھوں اور ایک فقرے سے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ میری اصلیت جان چکا ہے۔ اول قد کاٹھ اور رنگ سے ہی میں بھارتی نہیں لگتا تھا۔ پھر POW کیمپوں سے فرار ہونے اور ہتھیار نہ ڈالنے والے پاکستانی فوجیوں کی گرفتاری کی داستانوں سے اخبارات کے صفحے بھرے ہوئے تھے۔ کیمپوں سے جو بھی فرار ہوئے ان میں سے اکثر نے نیپال کی راہ لی اور اپنی لاعلمی کے باعث چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر ہی پکڑے گئے تھے۔ اس وقت میری حالت یقیناً دیدنی ہوگی۔ تین سال سے زیادہ مدت پر ہر لمحے زندگی اور موت کا کھیل کھیلنے کے بعد جب میں آزادی کی منزل کے اتنے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس وقت ایک چھوٹی لیکن فاش غلطی کی وجہ سے پھر گرفتاری اور گھٹا گھپ اندھیرے میں ڈوب جانے کا تصور ہی اتنا بھیانک تھا جسے بیان کرنا محال ہے۔ غیر ارادی طور پر میرے ہاتھوں نے برساتی کے بٹن کھولے اور پسٹل کو مضبوطی سے تھام لیا ہزاروں مسلح دشمنوں کا مقابلہ اکیلا تو نہیں کر سکتا تھا لیکن اپنی جان تو لے سکتا تھا۔ اب میری زندگی اور موت کا دارومدار اللہ کے بعد ٹکٹ بابو پر تھا۔

میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ وہ ٹکٹ بابو انتہائی رحم دل تھا انسان کے روپ میں فرشتہ تھا یا قادر مطلق نے اس کی زبان بند کر دی تھی۔ خود بھارتی مسلمانوں نے مجھے پکڑوانے کی کوشش کی تھی یہ بابو ہندو تھا یا مسلمان لیکن میرے لئے تو رحمت کا فرشتہ بن گیا۔ اس نے خاموشی سے مجھے رکسول کا لوئر کلاس کا ٹکٹ دیا۔ اسے پیسے دیتے وقت میری آنکھیں تشکر کے جذبات سے لبریز تھیں اور اس کی آنکھوں سے قلبی سکون اور اطمینان جھلک رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس منظر کو اگر کیمرہ فلم میں قید کر لیتا تو وہ تصویر دو مختلف جذبوں کی ترجمانی کے حوالے سے انعام کی حقدار ٹھہراتی۔

قلی نے میرا سامان اٹھا رکھا تھا۔ ہم اس پلیٹ فارم پر چلے گئے جہاں رکسول جانے والی گاڑی کھڑی تھی۔ چھوٹی پٹڑی پر چلنے والی اس گاڑی کا سفر صرف گورکھپور سے رکسول اور واپسی تک محدود تھا۔ آدھ گھنٹے بعد گاڑی نے حرکت کی۔ اس دوران میری حالت بالکل ایک زندہ لاش جیسی تھی۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو چکی تھی۔ پلیٹ فارم پر فوجیوں اور مسافروں کی چہل پہل تھی لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کچھ سائے ہیں وہ جو میری آنکھوں میں پھیلتے اور سکڑتے جاتے ہیں۔

گاڑی چلنے کے خاصی دیر بعد میرے حواس کچھ بحال ہوئے اور میں نے ڈبے میں بیٹھے مسافروں کا جائزہ لیا چھ، سات مسافروں میں ایک غیر ملکی بھی تھا۔ میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر جا بیٹھا اور تھرموس سے کافی نکال کر خود بھی پی اور اسے بھی آفر کی۔ مغربی سیاح خود چاہے کتنی ہی ابتر حالت میں کیوں نہ ہوں، مشرقی اقوام خصوصاً برصغیر کے باشندوں کو ہمیشہ ہیچ سمجھتے ہیں۔ ادھر ہم برصغیر کے باسی ان سے بات کرنے یا ان کی ایک مسکراہٹ کو اپنے لئے باعث صد افتخار جانتے ہیں۔ ڈبے کے دوسرے مسافروں کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے اسے کافی پیش کی تھی جسے اس نے اپنی برتری کا حق سمجھتے ہوئے مسکراتے ہوئے قبول کیا۔ ادھر میرے دماغ میں ایک نئے منصوبے نے جنم لیا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ جرمن نیشنل ہے اور سیر و تفریح کے لئے کھٹمنڈو جا رہا ہے۔ ان مغربی سیاحوں کی "سیر و تفریح" اور کھٹمنڈو جانے کا مقصد مجھے وہاں پہنچ کر معلوم ہوا جس کا ذکر آگے آئے گا۔ گورکھپور میں کی ہوئی غلطی کا مجھے شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ گاڑی جیسے ہی کسی اسٹیشن پر رکتی، میں سہمی نظروں سے پلیٹ فارم پر ادھر ادھر دیکھتا۔ مجھے ایسے محسوس ہوتا تھا کہ مجھے پکڑنے کے لئے پولیس یا فوجی اچانک کسی طرف سے جھپٹ پڑیں گے۔

کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی اور رہ رہ کر وقفے وقفے سے بارش ہو رہی تھی۔ اپنے منصوبے کے مطابق میں نے جرمن کو اپنے متعلق بتایا کہ میں دہلی میں کاروبار کرتا ہوں اور اسی سلسلے میں کھٹمنڈو جا رہا ہوں۔ میں نے اسے کہا کہ اس بارش نے تو سفر کا سارا مزہ کرکرا کر دیا ہے۔ اگر ہم بذریعہ سڑک چلیں تو بہت سے دلفریب مناظر دیکھنے کو ملیں گے۔ جرمن نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا تو میں نے کہا کہ اگلے اسٹیشن سے میں تو گاڑی چھوڑ دوں گا اور رکسول تک بس سے سفر کروں گا۔ میں نے اسے بھی بس میں چلنے کی دعوت دی تو اس نے کہا کہ میرے پاس ریل کا ٹکٹ ہے اور بس سے سفر کرنے کے لئے میں مزید پیسے ضائع نہیں کر سکتا۔

اس کی انگریزی ٹوٹی پھوٹی تھی لیکن وہ اپنا مقصد بخوبی بیان کر لیتا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ مختصر سے دوران سفر ساتھ نے مجھے اس کا گرویدہ کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ میں اس سے جرمنی کے متعلق معلومات بھی حاصل کرنا چاہتا ہوں کیونکہ عنقریب ہی مجھے میونخ جانا ہے اس لئے اگر وہ میرا ساتھ دینے کو تیار ہو تو میں نہ صرف اس کا رکسول تک بس کا ٹکٹ خریدنے کو تیار ہوں (جاری ہے)

غازی

گاڑی کا عقبی دروازہ میں نے پہلے ہی کھول رکھا تھا۔ اپنے ساتھیوں کی لاشیں دیکھ کر ان کی آنکھیں حلقوں سے باہر آ رہی تھیں۔ وہ بولنا چاہتے تھے لیکن ان کے منہ بندھے ہوئے تھے۔ میں نے محافظوں کو کہا کہ ایک ایک کر کے ان کو عقبی دروازے سے داخل ہونے کی جگہ پر لے جائیں۔ محافظ میرا مطلب اور مقصد سمجھ چکے تھے۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر محافظ انہیں وہاں لے گئے اور میں نے دونوں کے سینوں پر عین دل کی جگہ پر پسٹل رکھ کر ایک ایک گولی داغ دی۔ محافظوں نے دونوں کی لاشوں کو پہلی دونوں لاشوں پر ڈال دیا۔ میں نے محافظوں کو کہا کہ پہلی دونوں لاشوں کی تلاشی لو۔ ان لاشوں سے چاروں کے آئی بی کے کارڈ، دو پسٹل اور چار بٹوے ملے۔ محافظوں نے میرے کہنے پر میری اسٹین گن اور فالتو میگزین گاڑی کی اگلی سیٹ کے نیچے رکھ دیئے۔

مجھ پر اس وقت جنون طاری تھا۔ میں نے محافظوں کو کہا کہ میرے بیڈروم سے پسٹل کے دو فالتو میگزین اور اگر پیٹرول بھرے ورنہ خالی کین ہی مجھے لا کر دیں اور دو محافظ اور ڈرائیور میری گاڑی لے کر مجھے فالو (Follow) کریں۔ اور دو محافظ پتوں والی شاخ سے بنگلے سے اس گاڑی تک ریت پر قدموں کے نشان مٹا دیں۔ بنگلے سے پیٹرول بھرے دو کین اور پسٹل کے دو میگزین لئے ایک محافظ آ گیا جسے میں نے ساتھ کی سیٹ پر بٹھا لیا۔ اس دوران میری گاڑی لے کر دو محافظ اور ڈرائیور آ گئے اور دو محافظوں نے بڑے جھاڑووں سے ریت پر قدموں کے نشان مٹانے شروع کر دیئے اور میں نے گاڑی موڑی اور نیوٹاگ پاڑے کا رخ کیا۔ ہمارے پیچھے ہی دو محافظ میری گاڑی میں آ رہے تھے۔ نیوٹاگ پاڑے میں، میں نے اپنے کور (Cover) والے فلیٹ کے بالکل قریب گاڑی روکی۔ پچھلی گاڑی سے دونوں محافظ بھی ہمارے پاس آ گئے۔ میں ان تینوں محافظوں کے ہمراہ اپنے فلیٹ پر آیا اور ایک محافظ مسلسل بیل بجانے لگا۔ اس دوران میں نے اپنے پسٹل میں نیا میگزین ڈال لیا تھا۔ دروازہ آدھی سوئی جاگتی گھاشن نے کھولا۔ اتنی رات گئے اچانک مجھے دیکھ کر گھاشن گھبرا گئی اور دروازہ بند کرنے لگی۔ دروازہ کھلتے ہی میں نے اپنا پاؤں اندر رکھ دیا تھا۔ ادھر محافظوں نے دروازے کو دھکا دیا۔ ہم چاروں کمرے میں داخل ہو گئے۔ محافظوں نے گھاشن پر اپنا اسلحہ تان لیا۔ میں دوسرے کمرے میں گیا۔ وہاں اس کا شوہر بے سدھ سو رہا تھا۔ اس کی کنپٹی پر میں نے دو فائر کئے وہ اچھلا اور وہیں ڈھیر ہو گیا۔ باقی دونوں کمرے خالی تھے۔ میں پہلے کمرے میں آیا۔ گھاشن محافظوں کے حصار میں سہمی ہوئی کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے بولنا یا چلانا چاہا۔ میں نے اس کا موقع دیئے بغیر دو گولیاں اس کے ماتھے پر داغ دیں۔ دہشت سے پھٹی ہوئی آنکھوں والی گھاشن بغیر آواز نکالے فرش پر گرنے لگی تو ایک محافظ نے اسے تھام کر آہستہ سے فرش پر لٹا دیا۔ موٹی گھاشن کے گرنے کے دھماکے سے نچلی منزل والے یقیناً چونک اٹھتے۔ میں نے محافظوں کو کہا کہ ان دونوں کی لاشوں کو بھی ان ہی کی چادروں میں لپیٹ کر میری گاڑی کی ڈگی میں ڈال دی۔ دو پھیروں میں محافظوں نے یہ کام بھی کر دیا۔ اس دوران میں نے فلیٹ کا تالا ڈھونڈ نکالا اور فلیٹ بند کر کے ہم اپنی گاڑیوں میں آ بیٹھے۔ مجھ پر اس وقت فی الحقیقت خون سوار تھا۔ اس حالت میں اگر مجھے درجنوں لوگوں کو بھی مارنا پڑتا تو میں دریغ نہ کرتا۔ مجھ میں زندہ رہنے کی بے انتہا خواہش پیدا ہو چکی تھی اور اپنی زندگی کے عوض میں بلا تفریق قصوروار یا بے گناہ سینکڑوں کو مارنے کو بھی تیار تھا۔ میری یہ کیفیت کئی روز تک رہی۔ پاکستان میں CMH کے ڈاکٹروں نے اسے ایک خاص نفسیاتی بیماری بتایا جو بھارتی تشدد کے بعد مجھ میں پیدا ہو گئی تھی۔ پاکستان میں ادویات کے مسلسل ایک سال استعمال سے یہ عارضہ دور ہوا۔ (جاری ہے)

غازی

لیکن اب بھی یہ حالت ہے کہ میری ڈسپلنڈ (Disciplined) زندگی میں خلل ڈالنے اور بلاوجہ وعدہ خلافی کرنے والوں سے میں غصے میں بے قابو ہو جاتا ہوں چاہے وہ میری اولاد ہی کیوں نہ ہو۔

میری گاڑی میں چھ لاشیں پڑی تھیں اور انہیں میں بے جان کتوں سے زیادہ اہمیت نہیں دے رہا تھا ان لاشوں اور گاڑی کو ٹھکانے لگانے کے لئے میں نے محمود کے اسٹوڈیو کو چنا۔ مین روڈ سے اسٹوڈیو کو جانے والی چڑھائی کے خاتمے پر گاڑیوں کی پارکنگ تھی۔ پارکنگ کے ساتھ ہی دفاتر اور اسٹوڈیو تھا۔ کلا مندرا سٹوڈیو میں آج میں اپنی ''کلا'' دکھانا چاہتا تھا۔ پارکنگ میں جا کر میں نے گاڑی روکی۔ چوکیدار کے لٹھ کی کھٹ کھٹ قریب آتی سنائی دے رہی تھی۔ یقیناً وہ اپنا راؤنڈ مکمل کر کے اس طرف آ رہا تھا۔ میں اور میرے ساتھی محافظ نے پھرتی سے گاڑی کے اندر اور ڈگی میں پڑی لاشوں پر پیٹرول ڈالا اور کچھ پیٹرول گاڑی کی فرنٹ سیٹ اور فرش پر انڈیل دیا۔ میں پیٹرول کی ایک پتلی دھار بناتا ہوا تین میٹر کی دوری تک لے آیا اور اس دھار کو دیا سلائی دکھا دی۔ آگ یک بیک گاڑی تک جا پہنچی اور ساری گاڑی کو لپیٹ میں لے لیا۔ گورکھا چوکیدار بھاگتا ہوا گاڑی کی طرف آیا اور ادھر ہم دونوں بھاگتے ہوئے مین روڈ پر کھڑی اپنی گاڑی تک آئے اور تیزی سے جوہو کے بنگلے کی طرف روانہ ہوئے۔ میں نے محافظوں کو الرٹ رہنے اور اسلحہ ہاتھ میں رکھنے کو کہا کیونکہ عین ممکن تھا کہ آئی بی کے ڈپٹی ڈائریکٹر نے سچ کہا ہو اور اس کی فورس کے آدمی جوہو میں موجود ہوں۔ لیکن ایسا کچھ نہ تھا۔ مرتے مرتے بھی یہ ہندو مجھ پر جعلی عکس ڈالتا رہا۔ انعام کے لالچ اور اپنی اسپیشل ترقی کی خواہش میں اس نے گھاٹن کی انفارمیشن کو صرف اپنے تک محدود رکھا تھا اور اسی لالچ کی وجہ سے اپنے تینوں ماتحتوں سمیت جہنم رسید ہوا۔ گھاٹن بھی لالچ کی وجہ سے ہی اپنے انجام سے دوچار ہوئی۔ سویا ہوا شخص نامعلوم اس کا شوہر تھا یا چاہنے والا۔ مخبری کرنے میں گھاٹن کا شریک کار تھا یا لاعلم۔ لیکن ایسے موقعوں پر گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ مجھے بہر حال اپنے خلاف شواہد اور ہر ثبوت مٹانا تھا۔ چاہے اس میں کتنے ہی گناہ گار یا بے گناہ مارے جاتے۔ بنگلے میں آ کر میں نے چائے بنوائی۔ ڈاکٹر کے دیئے ہوئے Tranquilizer (مسکن دوا) کھائی اور سو گیا۔

صبح میں بالکل تازہ دم تھا۔ دل و دماغ پر گزشتہ رات چھ افراد کو موت کے گھاٹ اتارنے کا ذرا بھی اثر نہ تھا۔ گیارہ بجے میں حاجی مستان سے ملنے گیا اور تفصیلاً اسے رات کا واقعہ سنایا۔ حاجی مستان نے کہا کہ صبح 9 بجے سے پہلے محافظ اسے تمام تفصیل بتا چکے ہیں۔ مستان نے کہا کہ اچھا ہوا جو یہ آئی بی کا ڈپٹی ڈائریکٹر ختم ہو گیا۔ اس نے ان کے کاروبار کو بھی نقصان پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ شام تک جلنے والی گاڑی کے متعلق بھی اطلاعات آ گئیں۔ گاڑی بالکل جل گئی تھی اور لاشیں ناقابل شناخت تھیں۔ اور آئی بی والے تا حال اپنے ڈپٹی ڈائریکٹر اور عملے کے تین ارکان کے انجام سے بے خبر تھے۔

سی بی آئی کے آدمیوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد اگر چہ جوہو کے علاقے میں ان کی تلاش کے کوئی آثار نہ ملے لیکن حاجی مستان نے بنگلے کے پہرے داروں میں اضافہ کر دیا۔ اس واقعے کو گزرے دس بارہ روز ہی ہوئے تھے کہ میں نے پونا جانے کا فیصلہ کیا۔ حاجی مستان اور یوسف پٹیل نے بے حد اصرار کر کے مجھے حفاظت کے لئے 6 آدمی ساتھ لے جانے پر مجبور کر دیا۔ پونا میں، میں بھارت کے 39 ماؤنٹین ڈویژن 39 Mountain Div اور خصوصاً 17 پونا ہارس (ٹینک رجمنٹ) کا مشاہدہ کرنا چاہتا تھا۔ یہ پہاڑی ڈویژن بھارت نے 1962ء میں چینی بھارت جنگ کے بعد Raise کیا تھا۔ اس ڈویژن کے جوانوں کو پہاڑی جنگ کی خصوصی تربیت دی گئی اور اسے ہلکے خودکار امریکن اسلحے سے لیس کیا گیا تھا۔ اس ڈویژن کے پاس خصوصی طور پر تیار کی گئی جیپیں، ٹرک اور Tracks والے A.P.C (آرمرڈ پرسونل کیریئر) اور توپ خانے کے پاس خصوصی مارٹر گنوں کے علاوہ ہلکی اور زیادہ رینج والی توپیں تھیں۔ نمبر 17 پونا ہارس بھی اس ڈویژن میں شامل تھیں۔ 71ء کی پاک بھارت جنگ میں 17 پونا ہارس کی بہادری کی پاکستانی جرنیلوں نے بھی تعریف کی۔ میں اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ اگر پاکستان کے پاس بہترین لڑاکا فوج ہے تو بھارت کے پاس بھی کم معیاری فوج نہیں۔ دونوں ممالک کی فوجوں کی تربیت کا انداز (Pattern) بھی ایک ہی ہے۔ ان کے پاس اسلحہ بھی ہمیشہ ہم سے بہتر اور وافر مقدار میں رہا ہے۔ فوجوں کی تعداد بھی ہم سے کئی گنا زیادہ ہے۔ کمی ہے تو جذبہ ایمان اور شوق شہادت کی۔ بھارتی فوجیوں کو دلیر بنانے کے لئے شراب دی جاتی ہے جبکہ پاکستانی فوجیوں نے 65ء اور 71ء کی جنگوں کے دوران بیشتر وقت صرف چنے اور گڑ کھا کر دشمن کے دانت کھٹے کئے۔ پاکستانی فوجی لڑتے وقت اپنے اسلاف کی بہادری کے کارناموں کو دہراتے اور بدر و حنین اور قادسیہ کے مجاہدوں کی جانبازی کو پیش نظر رکھتے ہیں جبکہ بھارتی افواج کو اپنے ماضی کی جنگوں میں سوائے شکست اور محکومی کے کچھ نظر نہیں آتا۔

پونا بمبئی سے سو کلومیٹر سے کچھ زیادہ فاصلے پر ایک پہاڑی اور صحت افزا شہر ہے۔ دو گاڑیوں پر مشتمل ہمارے قافلے نے پونا میں ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ دوسرے روز ہم شہر کی سیر کو نکلے۔ سیر سے میرا مقصد چھاؤنی کا سروے کرنا تھا۔ میرا چھاؤنی کے اندر جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہاں بھی چھاؤنی کے ارد گرد فوجیوں کے لئے بے شراب خانے موجود تھے۔ میں نے انہی شراب خانوں میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ (جاری ہے)

غازی

نیپال کے سرحدی قصبے بیر گنج میں رات گزارنے کے لئے ہوٹل کا کرایہ اور کھانے پینے کا خرچہ بھی اٹھاؤں گا۔ جرمن نے کچھ دیر سوچنے کے بعد میری دعوت قبول کر لی۔ اگلا بڑا اسٹیشن مظفر آباد تھا۔ ہم ٹرین سے اتر آئے۔ جرمن نے میرا ایک سوٹ کیس اٹھایا۔ اس کا اپنا مختصر سامان اس کی پشت پر بندھا ہوا تھا۔ اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی بڑی سڑک دکھائی دی۔ بارش نے پھر زور پکڑ لیا تھا۔ سڑک کے کنارے ایک درخت تلے ہم کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں ہی رکسول جانے والی بس نمودار ہوئی۔ بارش کی وجہ سے گنتی کے چند ہی مسافر بس میں موجود تھے۔ ہم بس میں سوار ہوئے اور ڈرائیور کے بالمقابل خالی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ کنڈیکٹر بھی کرایہ لینے کے بعد ڈرائیور کے پاس بیٹھ کر اس سے باتیں کرنے لگا۔ ڈرائیور کوئی ٹھاکر تھا۔ دونوں کی باتوں سے معلوم ہوا کہ چند روز پیشتر تین پاکستانی فوجی (یقیناً یہ وہ فوجی تھے جو (REPATRIATION) پاکستان واپسی سے کچھ قبل کیمپوں سے فرار ہو گئے تھے اور خاصا وقت بھارت میں بھٹکنے اور پناہیں لینے کے بعد نیپال جا رہے تھے) اسی ڈرائیور نے شک پڑنے پر بھارتی پولیس کو پکڑوائے تھے۔ وہ اپنے اس کارنامے پر اترا رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ ایک بڑا اشکار اس کے کتنے قریب بیٹھا تھا۔

قارئین کی دلچسپی کے لئے عرض ہے کہ 16 دسمبر 71ء کو مشرقی پاکستان میں تمام فوجیوں نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ کچھ آسام سے ہوتے ہوئے برما چلے گئے جہاں برمی حکومت نے انہیں کچھ عرصہ قید رکھ کر پاکستان کے حوالے کر دیا۔ کچھ جیسور چھاؤنی کے قریبی بارڈر سے بھارت میں داخل ہوئے اور چھپتے چھپاتے بھارتی پنجاب کی راہ لی اور کچھ سندھ میں بارڈر کی طرف بڑھے لیکن راستوں سے عدم واقفیت اور مضبوط بھارتی جاسوسی نظام کی وجہ سے راستے میں ہی پکڑے گئے۔ جو بارڈر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے وہ وطن کے اتنے قریب کامیابی سے پہنچنے کی خوشی اور جلد بازی کے نتیجے...... میں بھارتی سرحدی فوج BSF کے ہاتھوں گرفتار ہو کر کیمپوں میں بھیج دیئے گئے جہاں انہیں سخت تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور بغیر یونیفارم گرفتاری کے باعث کئی برس کیلئے جیل بھیج دیا گیا۔ نیپال جانے والوں کا بھی یہی حشر ہوا۔ ایسے خوش نصیب بہت کم تھے جو بغیر گرفتار ہوئے پاکستان پہنچے۔

کئی گھنٹوں کے سفر کے بعد رکسول آ گیا۔ یقین جانیے کہ وہاں بارش کی اتنی بڑی بڑی بوندیں گر رہی تھیں جن سے جسم پر چوٹ لگنے کا احساس ہوتا تھا۔ میرا جرمن ساتھی مسلسل بارش سے جھنجلا کر بولا THISRAIN IS HELL!! (یہ بارش تو عذاب ہے)۔ مجھے اسی بارش میں اپنی نجات دکھائی دیتی تھی۔ میں نے کہا FOR SOME IT IS BLESSING (کچھ کیلئے یہ نعمت ہے) اور حقیقت بھی یہی تھی۔ سخت بارش کی وجہ سے دور دور تک کوئی انسان نظر نہ آیا تھا۔ اڈے پر بس سے اتر کر میں نے رکشا والوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ نیپال کے سرحدی قصبے بیر گنج جانے والے صرف پیلے رنگ کے رکشا ہیں جنہیں دونوں جانب جانے کا خصوصی پرمٹ ملا ہوا ہے۔ میں نے دو پیلے رکشا لئے اور بارڈر کی طرف روانہ ہو گئے۔ بارڈر ایک ندی تھی جس پر تقریباً ساٹھ میٹر لمبا پل بنا ہوا تھا۔ آدھا پل بھارتی اور آدھا نیپالی تھا۔ پل کے ساتھ ہی امیگریشن آفس تھا۔ جرمن اس میں جانے لگا تو میں نے اسے کہا کہ مجھے یہاں کچھ کام ہے۔ تم سے بیر گنج کے DELUX ہوٹل میں ایک دو گھنٹے بعد ملوں گا۔ میں نے اسے پچاس بھارتی روپے دیئے اور کہا کہ میرے دونوں سوٹ کیس اور تھرموس بھی وہ ہمراہ لے جائے۔ نوٹوں بھرا پیکٹ میں نے ٹرین میں ہی اپنے جسم کے ساتھ باندھ لیا تھا اور سوٹ کیسوں میں کپڑوں اور جوتوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ (جاری ہے)

غازی

جرمن کو امیگریشن دفتر بھیج کر میں نے اپنا رکشہ بھی فارغ کر دیا اور بارڈر کراس کرنے کی تدبیریں سوچنے لگا اگر ندی بارش کی وجہ سے چڑھی نہ ہوتی تو رات کے اندھیرے میں اسے کراس کرنا ایسا مشکل نہ تھا۔لیکن اس وقت تو وہ بپھری ہوئی تھی۔ایک خیال آیا کہ رات رکسول میں ٹھہرا جائے لیکن فوراً ہی اس کو جھٹک دیا۔رکسول جیسے سرحدی قصبے کے ہوٹل میں ٹھہرنا مصیبت کو خود دعوت دینے کے مترادف تھا۔میں انہی سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ جرمن امیگریشن آفس سے باہر آیا اور رکشے میں بیٹھ کر پل کی جانب روانہ ہو گیا۔ میں نے اسے پل کراس کرتے دیکھا۔نیپال کی طرف کوئی امیگریشن آفس نہ تھا (نیپال کی بھارت کے ساتھ پوزیشن بالکل آزاد کشمیر اور پاکستان جیسی ہے۔کوئی غیر ملکی پاکستان آجائے اس کے آزاد کشمیر میں داخل ہونے کے لئے کوئی علیحدہ امیگریشن نہ ہوگی)۔بارش اور تیز ہوگئی اور رات کا اندھیرا چھانے لگا تھا۔میں پھر پل کے قریب چلا آیا آزادی مجھ سے صرف تیس میٹر دور تھی۔پل کے شروع میں ایک کیبوبی میں ایک اکتایا ہوا منحنی سا گارڈ کھڑا تھا۔میں نے کوئی اور صورت دکھائی نہ دینے پر اسے ہی آزمانے کا فیصلہ کیا۔میں اس کے پاس چلا گیا نہایت عاجزی سے پرنام کیا اور کہا "مہاراج میں اپنے ایک جرمن دوست کو چھوڑنے یہاں تک آیا تھا جو ابھی رکشے میں بیرگنج گیا ہے۔میرے قدم آج تک دھرتی ماتا سے باہر نہیں گئے۔اپنے متروں میں شرط لگا کر آیا تھا کہ ودیش دھرتی میں ضرور جاؤں گا۔مجھے وشواش ہے کہ آدھا پل ہمارے دیش کا ہے۔اگر آپ آگیا دیں تو میں اپنے حصے کے پل کے آخر جا کر ایک پاؤں نیپال دھرتی پر رکھ کے واپس آجاؤں اس طرح میری شرط پوری ہو جائے گی اور میں سوگند کھا کر کہہ سکوں گا کہ میں ودیش ہو آیا ہوں"۔یہ کہتے کہتے میں نے پچاس روپے اس گارڈ کی مٹھی میں دے دیئے۔اس نے سر ہلا کر مجھے اجازت دے دی۔میں نے پل پر آہستہ قدمی سے چلنا شروع کیا۔میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔آزادی مجھ سے قدم بقدم قریب آتی جا رہی تھی۔جب مجھے یقین ہو گیا کہ میں آدھا پل طے کر چکا ہوں تو پہلے تو میں نے اپنی رفتار تیز کی اور پھر بھاگنے لگ گیا۔بھارتی گارڈ نے یہ کیفیت دیکھی تو اسے رشوت کے پچاس روپے بھاری پڑتے دکھائی دیئے۔پل پر بارش کے قطروں کی آواز میں شامل پہلے مجھے ہالٹ،ہالٹ کی آواز سنائی دی اور پھر رائفل کے دو فائر ہوئے۔اس اثنا میں سارا پل کراس کر کے میں نیپال کی سرزمین میں داخل ہو چکا تھا۔نیپالی پولیس نے بھارتی گارڈ کے فائروں سے چوکنا ہو کر مجھ پر رائفلیں تان لیں۔میں ہاتھ اٹھائے ان کے پاس چلا گیا اور زور زور سے کہنے لگا۔"نو فائر،نو فائر۔پاکستانی ریفیوجی۔پاکستانی ریفیوجی"۔نیپال کا پاکستان سے معاہدہ تھا کہ کسی بھی پاکستانی ریفیوجی کو بغیر سفری کاغذات کے نیپال میں داخل ہونے کی اجازت ہوگی۔کھٹمنڈو میں پاکستانی سفارت خانے نے اگر اس کی تصدیق کر دی تو اس ریفیوجی کو پی آئی اے کے افغان ایئر کے چارٹرڈ جہازوں میں سیٹ ملنے تک نیپال میں قیام کی اجازت ہوگی۔تصدیق نہ ہونے کی صورت میں اس ریفیوجی کو واپس بھارت میں دھکیل دیا جائے گا۔

نیپالی پولیس کے دو سپاہی مجھے حراست میں لئے قریب ہی بنے تھانے لے گئے۔تھانیدار کو میں نے پاکستانی ریفیوجی والی بات دہرائی تو اس نے کہا کہ دو تین دنوں میں تھانے کی حوالات میں بند دیگر پاکستانی ریفیوجیوں کی کھیپ کے ساتھ مجھے بھی کھٹمنڈو میں پاکستانی سفارت خانے میں بھیج دیا جائے گا اور اس وقت تک مجھے حوالات میں رہنا ہوگا۔یہ کہہ کر تھانے دار نے اپنے حوالدار کو مجھے لاک اپ میں بند کرنے کا حکم دیا۔تھانیدار تھوڑی انگریزی اور خاصی بھارتی ہندی جانتا تھا۔ (جاری ہے)

غازی

میں نے چہرے کو ذرا بگاڑ کر امریکن لہجے میں انگریزی میں کہا کہ میں ایک باعزت پاکستانی شہری ہوں۔ نیپال اور پاکستان کے معاہدے کے مطابق مجھے آپ کے ملک میں حوالات نہیں بلکہ پناہ ملنی چاہئے۔ میں نے خود اپنے کو آپ کے حوالے کیا ہے۔ آپ کی مہربانی ہوگی اگر آپ مجھے بیرگنج میں کسی ہوٹل میں قیام کی اجازت دے دیں۔ میں خود کل صبح آپ کے پاس حاضر ہو جاؤں گا اور اپنے خرچ پر ٹیکسی لے کر پولیس کے ہمراہ کھٹمنڈو پاکستانی سفارتخانے جاؤں گا۔ تھانیدار تو سوچ میں پڑ گیا اور ہیڈ کانسٹیبل نے مجھے کمرے کے کونے میں لے جا کر کہا کہ 500 روپے تھانیدار کیلئے اور بارہ سو اس کی ٹیکسی کیلئے دے دو تو تمہاری بات مان لی جائے گی۔ میں نے فوراً دو ہزار روپے نکال کر اسے دیئے اور کہا کہ مدد کرنے کے عوض تین سو روپے تمہارے لئے ہیں۔ دو ہزار روپے دونوں کی جیب میں جانے کی دیر تھی کہ مجھے ہوٹل میں ٹھہرنے کی اجازت مل گئی۔ یہ اجازت ملنے میں سارا روپے کا ہی نہیں بلکہ امریکن لہجے میں انگریزی بولنے کا بھی حصہ تھا جس سے برصغیر کے بسنے والے خواہ مخواہ احساس کمتری کا شکار رہیں۔ ہیڈ کانسٹیبل مجھے ہوٹل چھوڑنے کے لئے ہمراہ چل پڑا۔

بمبئی سے روانگی سے قبل میں نے خصوصی طور پر بھارت نیپالی سرحد اور نیپال کے تفصیلی اور جامع نقشے اور ٹورسٹ گائیڈ بکس لی تھیں۔ کیونکہ میں اگر رکسول سے سرحد عبور کرنے میں ناکام ہو جاتا تو پھر کسی دوسری جگہ سے مجھے یہ سرحد کراس کرنی تھی۔ گائیڈ بک کے مطابق بیرگنج میں ڈی لکس ہوٹل سب سے بہتر تھا اور یہاں سے سالم ٹیکسی صرف چار سو میں کھٹمنڈو جاتی تھی۔ جس کے بارہ سو روپے تھانیدار صاحب نے وصول کئے تھے۔ ہم ہوٹل پہنچے تو جرمن لابی میں بیزار بیٹھا دکھائی دیا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے ریسپشن پر جا کر میرے کہنے پر ڈبل کمرہ میرے لئے بک کیا اور سنہالی زبان میں منیجر کو میرے متعلق ہدایات دیں۔ وہ واپس جانے لگا تو مجھ سے سو روپے مزید اینٹھ لئے۔ رجسٹر میں ENTRY کروا کے میں جرمن کو لے کر کمرے میں آ گیا۔ ہم دونوں نے اگرچہ رین کوٹ پہن رکھے تھے لیکن یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کپڑے جسم سے چپک گئے ہوں۔ بوٹ تو من من بھر وزنی معلوم ہوتے تھے۔ ویٹر نے آتشدان میں آگ سلگا دی تو ہم نے سارے کپڑے اتار دیئے اور صرف انڈرویئر پہن کر آگ تاپنے لگے۔ اگرچہ رات کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا لیکن میں نے پہلے کافی اور لوازمات کا آرڈر دیا۔ دراصل میں آزادی کی خوشی میں پاگل ہو رہا تھا اور رات بھر اس خوشی کو CELEBRATE کرنا چاہتا تھا۔ میری خوشی کی اس حالت کو قلم لکھنے سے قاصر ہے۔ میں اپنے مقصد میں اللہ پاک کے کرم سے مکمل کامیاب ہوا تھا۔ اپنی ہمت سے بہت بڑھ کر میں نے بھارت کو ناکوں چنے چبوائے تھے۔ میرے ساتھیوں اور دہلی میں میرے تربیت یافتہ لڑکوں نے گورکھپور کے ہوائی اڈے کو مکمل طور پر تباہ کر دیا تھا اور بھارت کے کروڑوں کے جہاز بھسم کر دیئے تھے۔ میں نے آرمی ہیڈ کوارٹرز دہلی میں سیکورٹی کو توڑ کر انتہائی اہم معلومات کے حصول کے لئے پل بنا دیا تھا۔ میں نے بھارت کے جدید ترین ٹینکوں کی پاکستان کی سرحدوں پر خفیہ DEPOLYMENT کو طشت ازبام کر دیا تھا اور پاکستان میں بھارتی جاسوسوں کی مکمل فہرست اپنے محکمے کو پیش کر دی تھی۔ میں نے بھارت کی ایٹمی قوت کے انتہائی اہم اور خفیہ راز حاصل کئے تھے۔ میں نے بھارتی تشدد کی انتہا کو برداشت کیا اور اپنی زبان نہ کھولی اور DMI کی سیکورٹی کے حصار کو توڑ کر ان کے منہ پر ذلت کے طمانچے مارے تھے اور یہ ثابت کر دیا

[illegible]

غازی

کافی آئی تو میں نے کپ بنا کر جرمن کو دیا اور ٹوسٹ کرتے ہوئے کہا IN THE NAME OF MY FREEDOM اور گرم کافی حلق میں انڈیل لی۔ جرمن نے میرا ساتھ تو دیا لیکن ٹوسٹ کا مقصد نہ سمجھتے ہوئے پوچھا کہ فریڈم سے میری مراد کیا ہے۔ میں خوشی میں اتنا بے سدھ ہو رہا تھا کہ ہر قسم کی احتیاط بالائے طاق رکھتے ہوئے اسے بتایا کہ میں بھارتی نہیں بلکہ پاکستانی ہوں اور بھارت میں بہت سے خطرناک مشن انجام دے کر اور ان کی حراست سے فرار ہو کر بمبئی سے یہاں آیا ہوں اور بھارت میں میری گرفتاری پر انعام مقرر ہے۔ میں نے اپنی رو میں بہتے ہوئے اسے وہ اخبار بھی دکھا دیئے جن میں میری تصویر اور انعام کی رقم شائع ہوئی تھی۔ جرمن کی حالت کھسیانی بلی جیسی تھی۔ اپنی ٹوٹی پھوٹی انگلش میں کہنے لگا۔

(میں کتنا احمق ہوں کہ میں تمہیں اس وقت بھی نہ سمجھ سکا جب تم نے مجھے بلاوجہ بس کا ٹکٹ اور بیر گنج میں ہوٹل میں رہائش کی پیشکش کی تھی اور میں تمہیں اس وقت بھی نہ سمجھ سکا جب رکسول میں، میں نے کہا تھا کہ اتنی شدید بارش ایک زحمت ہے اور تم نے کہا تھا کہ کسی کے لئے یہ رحمت ہے۔ تم نے مجھے سارا وقت بے وقوف بنایا لیکن میں تمہیں آزادی کی مبارک باد دیتا ہوں۔ لیکن میں یہ اقرار کروں گا کہ اگر بھارت میں مجھے معلوم ہو جاتا کہ تمہارے اوپر انعام مقرر ہے تو میں تمہیں ضرور گرفتار کروا دیتا)۔ جرمن نے میری خوشی میں بھرپور ساتھ دیا۔ ہم اپنی اپنی زبانوں میں گیت گانے لگے۔ دیر تک خوشی کے یہ نغمے گونجتے رہے پھر ہم نے لذیذ کھانے کھائے اور مدہوشی کی نیند سو گئے۔ میں تو سمجھا تھا کہ نیپال میں داخل ہو کر میرا کام ختم ہو گیا ہے اور میں اب چین کی بانسری بجاؤں گا لیکن مجھے کیا علم تھا کہ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں جن سے مجھے بہر طور گزرنا ہے۔

اگلی صبح ہم دن چڑھے تک سوتے رہے۔ تین سال سے زیادہ عرصہ بھارت میں قیام کے دوران میں کبھی بھی بھرپور نیند نہ سو سکا تھا۔ سوتے ہوئے آدھا دماغ جاگتا رہتا۔ ہر وقت ایک انجانا خوف طاری رہتا تھا ذرا سی بھی آواز آتی تو میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا۔ اب آزاد سرزمین میں آزادی کی پہلی رات ایسی مدہوشی کی نیند آئی کہ ویٹر کے کافی دیر دروازہ پیٹنے کے نتیجے میں پہلے جرمن جاگا اور اس نے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر مجھے جگایا۔ ویٹر نے بتایا کہ کھٹمنڈو جانے کے لئے ٹیکسی اور دو سپاہی آگئے ہیں۔ رات بھر کی بھرپور نیند کے باوجود میرا جسم ٹوٹ رہا تھا اور بے حد تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ میری حالت اس مسافر جیسی تھی جو تین برس تک مسلسل دشوار گزار راستوں پر اپنی لو اور جذبات کے سہارے چلتے چلتے بالآخر منزل پر پہنچ کر نڈھال ڈھے جاتا ہے۔ بیڈ ٹی پینے کے بعد میں نے جرمن کو کہا کہ میں آج تو کھٹمنڈو کا سفر کرنے کے قابل نہیں اگر وہ جانا چاہتا ہے تو میں اسے بس کا کرایہ دینے کو تیار ہوں۔ ورنہ میرے ساتھ کل کھٹمنڈو چلے۔ جرمن جس کا نام سائمل تھا کہنے لگا ''میں تمہارے ساتھ کل جانا بہتر سمجھتا ہوں اگر تم مجھے کچھ حشیش منگوا دو تو میں تمہارا بہت مشکور رہوں گا''۔ میں نیچے ریسیپشن پر گیا اور منیجر سے کہا کہ مجھے تھانے کے انچارج سے بات کرنی ہے۔ منیجر نے ٹیلی فون ملایا اور ریسیور مجھے دیتے ہوئے کہا کہ تھانیدار لائن پر ہے۔ تھانیدار کو میں نے کہا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس لئے میں آج کے بجائے کل صبح کھٹمنڈو جاؤں گا۔ آج کے انتظامات کے لئے آپ کو جو تکلیف ہوئی ہے۔ اس کے عوض میں ایک ہزار روپیہ آپ کو دونوں سپاہیوں کے ہاتھ بھیج رہا ہوں۔ ہزار روپے کا سنتے ہی تھانیدار کہنے لگا۔ ''سر کوئی بات نہیں آپ ایک رات تو کیا، جتنی راتیں چاہیں، یہاں قیام کر سکتے ہیں۔ میرے لائق کوئی اور خدمت ہو تو بتائیں۔ آپ ہمارے معزز مہمان ہیں''۔ (جاری ہے)

غازی

اس کے رویے میں تبدیلی کی وجہ محض نوٹوں کی گرمی تھی۔ میں نے سپاہیوں کو بلا کر تھانیدار سے ان کی بات کروائی اور اپنے کمرے سے روپے لا کر ہزار روپیہ تھانیدار کے لئے اور سو روپیہ دونوں سپاہیوں کو دیا۔ وہ دونوں بھی خوشی خوشی مجھے سلیوٹ مار کر چلے گئے۔ کمرے میں واپس آ کر میں نے ویٹر کو ناشتہ لانے کا کہا اور ساتھ ہی پوچھا کہ کیا حشیش مل سکتی ہے؟ حشیش کا نام سنتے ہی ویٹر کی باچھیں کھل اٹھیں۔ وہ خود حیران تھا کہ دو غیر ملکی (مجھے بھی وہ مغربی سیاح ہی سمجھ رہا تھا) جب سے آئے ہیں انہوں نے حشیش کیوں نہیں طلب کی۔ ویٹر نے جواب دیا۔ جتنی چاہئے ابھی لا دیتا ہوں۔ میں نے اسے پچاس روپے دیئے اور وہ چند منٹوں میں ہی چرس کے کئی ٹکڑے لے کر آ گیا۔ جرمن تو حشیش دیکھتے ہی اس پر ایسے جھپٹا جیسے بھوکی بلی چھیچھڑوں پر۔ ناشتے سے پہلے ہی وہ چرس بھرے سگریٹ بنا کر پینے لگا۔ میں نے کمرے کی کھڑکیاں کھول دیں تاکہ یہ تلخ دھواں باہر جا سکے۔ ناشتے کے بعد میں لابی میں آیا تو کئی نیپالی اور غیر ملکی وہاں کھلے عام چرس پی رہے تھے۔ میرے پوچھنے پر منیجر نے بتایا کہ نیپال کے قانون کے مطابق چرس رکھنا اور پینا ممنوع نہیں۔ صرف چرس بیچنا ممنوع اور خلاف قانون ہے۔ اس عجیب و غریب قانون کا کیا مقصد اور فائدہ ہے اسے آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ یہ بالکل ویسا ہی قانون ہے جیسا پاکستانی جیلوں میں قیدیوں کو کھانا پکانے کے لئے گوشت سبزی، دالیں اور گھی وغیرہ لانے کی اجازت ہے۔ ہر اقسام کے سگریٹ بھی وہ جیل میں رکھ سکتے ہیں۔ لیکن ماچس یا لائٹر رکھنے کی اجازت نہیں۔

ناشتے کے بعد میں نے جرمن کو کہا کہ چرس تو میں نے تمہیں منگوا دی ہے لیکن آئندہ تم کمرے میں چرس نہیں پیو گے بلکہ لابی یا سڑک پر جا کر پیو۔ یہاں کا قانون اس کی کھلی اجازت دیتا ہے۔ جرمن نے گزشتہ رات دہکتے آتشدان کے پاس ہمارے جوتے رکھ دیئے تھے۔ میں نے ویٹر کو کپڑے دھونے اور جوتے پالش کرنے کے لئے دیئے اور تھوڑی دیر بعد ہم نہا دھو کر بیر گنج کی سڑ گشت کو نکل کھڑے ہوئے۔ آسمان بالکل صاف اور سورج کی تپش بھلی محسوس ہو رہی تھی بیر گنج ایک چھوٹا سا قصبہ تھا اور اس کی اہمیت صرف یہ تھی کہ یہاں سے کھٹمنڈو کے طویل اور خطرناک سفر کے لئے بسیں صبح صرف 9 بجے تک اور ٹیکسیاں گیارہ بجے تک ملتی تھیں۔ ان اوقات کے بعد پہنچنے والے مسافروں کو بقیہ دن اور رات کو یہاں قیام کرنا پڑتا تھا جس کیلئے معمولی سرائیں اور مہنگی بستر والے ہوٹلوں سے لیکر DELUX جیسے اعلیٰ معیار کے ہوٹل بنے ہوئے تھے۔ سیسنا اور فوکر فرینڈ شپ جیسے جہازوں پر مشتمل بیر گنج اور کھٹمنڈو کے درمیان ایک برائے نام ہوائی سروس بھی تھی۔ جو شیڈول کے مطابق تو دن میں ایک بار چلتی تھی لیکن عملی طور پر دو تین روز بلکہ کئی بار ایک ہفتے تک موسم کی خرابی کے باعث معطل رہتی تھی۔ بیر گنج میں گھومتے پھرتے ہم بارڈر کے پل کی جانب ہوئے۔ پل کی دوسری جانب اب موسم صاف ہونے کی وجہ سے چہل پہل دکھائی دیتی تھی میں سوچنے لگا کہ یہ پل تو میرے لئے ایک طرح سے پل صراط ثابت ہوا۔ جس کے دوسری جانب بھارتی مسلمانوں اور خصوصاً میرے لئے جہنم تھا۔ میں دیر تک وہاں کھڑا ماضی کے دریچوں میں جھانکتا رہا۔ وہیں پر مجھے معلوم ہوا کہ سقوط ڈھاکہ سے قبل بھارت اور نیپال کے درمیان امیگریشن کا کوئی دفتر نہ تھا۔ بھارتی اور نیپالی بلا روک ٹوک دونوں ممالک میں آتے جاتے تھے۔ بھارت نے مشرقی پاکستانی مہاجروں اور پاکستان افواج کے مفرور جوانوں کو پکڑنے کے لئے یکطرفہ طور پر امیگریشن آفس کھول دیا تھا۔ اس کے علاوہ بھارتی سی بی آئی کا ایک بڑا فعال دفتر بھی رکسول میں تھا۔ یہ تو میری خوش قسمتی تھی کہ طوفانی بارش کی وجہ سے سی بی آئی کا کوئی کارندہ اس طرف موجود نہ تھا۔ نیپال میں پہنچ کر میں یہ سمجھ بیٹھا کہ میں جنت میں آ گیا ہوں لیکن نیپال میرے لئے جنت نہیں بلکہ اعراف ثابت ہوا جہاں جنت کی ہواؤں کے ساتھ ساتھ جہنم کے شعلوں کی شدید حدت کا بھی مجھے سامنا پڑا۔

بعد دوپہر تک ہم گھومتے پھرتے رہے۔ ہوٹل واپس آ کر ہم نے کھانا کھایا۔ میں آرام کرنے کیلئے بستر میں گھس گیا۔ جبکہ جرمن چرس بھرے سگریٹ پینے کیلئے لابی میں چلا گیا۔ (جاری ہے)

غازی

شام تک میرے کپڑے دھل کر آ چکے تھے۔نو بجے تک جرمن نہ آیا تو میں نے اکیلے کھانا کھایا۔رات 11 بجے کے بعد جرمن آیا تو اس کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔لڑکھڑاتا ہوا وہ اپنے بیڈ پر آ کے ڈھیر ہو گیا۔میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ لابی میں بیٹھے کچھ نیپالی اسے تیز ترنشے کا کہہ کر اپنے ہمراہ کہیں لے گئے۔وہاں ایک کمرے میں چھوٹے حقے کی چلم جیسی کسی چیز میں چرس پر آگ رکھ کر ربڑ پائپ کے ساتھ چرس کا دھواں کھینچا جاتا تھا۔اسے بہت لطف آیا لیکن پھر حواس ساتھ چھوڑ گئے جب وہ بالکل بے سدھ ہو گیا تو اسے رکشے میں ڈال کر یہاں چھوڑ گئے۔

9 بجے ٹیکسی اور دونوں سپاہی آ گئے بارش نہ ہونے کے باوجود میں نے برساتی ٹوپی پہن لی کیونکہ کھٹمنڈو کے راستے میں بھی دو تین چیک پوسٹیں تھیں جہاں سرسری چیکنگ ہوتی تھی۔ٹیکسی میں، میں فرنٹ سیٹ پر اور جرمن اور سپاہی پچھلی سیٹوں پر بیٹھ گئے چیک پوسٹوں سے ہم آسانی سے گزر گئے سڑک گیارہ ہزار فٹ کی بلندی تک پہنچ کر پھر ڈھلوان میں ہو جاتی تھی۔راستے میں ہم کئی جگہ چائے اور خوب صورت مناظر دیکھنے کے لئے رکے ایک جگہ ایک بڑی ٹیلی اسکوپ (دوربین) لگی ہوئی تھی۔وہاں سے ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی صاف دکھائی دیتی تھی۔غرضیکہ چلتے رکتے ہم شام 7 بجے کھٹمنڈو میں داخل ہوئے۔جرمن کو میں نے راستے میں ہی اتار دیا اور پاکستانی سفارتخانے کی راہ لی۔یہ ایک درمیانے درجے کی کوٹھی تھی جس کے گیٹ کے اندر پاکستان کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔اپنے ہلالی پرچم کو دیکھ کر میرے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اس پرچم کی آن کی خاطر میں پرخطر اور سنگلاخ وادیوں سے گزرا تھا۔میں نے اسی پرچم کی خاطر انتہائی خطرناک مشن انجام دیئے تھے۔اسی پرچم کو شان اور وقار سے لہراتے دیکھنے کے لئے میں نے تھرڈ ڈگری سے بھی زیادہ تشدد برداشت کیا اور نہ زبان کھولی اور نہ ہی آنکھ میں ایک آنسو بھی آنے دیا اور اب اسی پرچم کو لہراتے دیکھ کر میرے ضبط کی قوت جواب دے گئی تھی میری آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہہ رہے تھے۔میں دھاڑیں مار کر رو رہا تھا اور میرا دایاں ہاتھ اپنے پرچم کو مسلسل سلامی دے رہا تھا۔نجانے میں کتنی دیر اسی کیفیت میں رہا کہ سفارت خانے کے بوڑھے چوکیدار نے دروازہ کھولا۔

سفیر صاحب تو مجھے ہوٹل پہنچا کر چلے گئے۔سیکنڈ فلور پر میرے لئے کمرہ ریزرو تھا۔ریسپشن پر میں ENTRY کرنے لگا تو انٹری کارڈ پر کمرے کے کرائے کے کالم میں کمرے کا کرایہ اور ادائیگی بذمہ پاکستانی سفارت خانہ درج تھا۔یہ پہلی غلطی تھی جو سفیر صاحب نے میرے بارے میں کی۔میں نیپال میں ایک سویلین پاکستانی مہاجر کی حیثیت سے داخل ہوا تھا۔اپنی مالی حیثیت کے مطابق میں سب سے مہنگے ہوٹل یا سب سے کم کرائے والے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرتا لیکن پاکستانی سفارت خانے کی مہمان نوازی کا تحریری ثبوت نیپال میں میری حیثیت کو مشکوک بنانے کے لئے کافی تھا۔میں نے وہ کارڈ پھاڑ دیا اور دوسرا کارڈ لے کر ادائیگی کے خانے میں 5 ہزار روپے ایڈوانس میں جمع کروائے اور کمرے میں آ گیا۔دوسرے دن گیارہ بجے میں سفارت خانے گیا تو وہاں حشر کا سماں تھا۔چار پانچ سو پاکستانی مہاجر سفارت خانے کے کمپاؤنڈ اور سڑک پر مختلف گروہوں میں کھڑے سفارت خانے کی بے حسی کے قصیدے پڑھ رہے تھے۔میں مختلف گروہوں کے پاس تھوڑی تھوڑی دیر ٹھہرتا ہوا سفارت خانے کی عمارت میں داخل ہونے لگا تو ایک گارڈ نے مجھے زور سے دھکا دیا اور انتہائی کرختگی سے کہا کہ کس سے ملنا ہے۔گارڈ کے رویئے سے مجھے بخوبی احساس ہو گیا کہ پاکستانی مہاجروں سے یہاں کیسا سلوک کیا جاتا ہے۔میں دھکے سے سنبھل کر پھر گارڈ کے قریب گیا اور ایک زوردار ٹھڈا اس کی ناف کے نیچے مارا۔درد کی شدت سے دہرا ہو کر وہ فرش پر گر کر پھڑکنے لگا۔میرا یہ رویہ اس گارڈ اور وہاں کھڑے دوسرے دو گارڈز کے لئے انتہائی غیر متوقع تھا۔اپنی شکل و صورت اور قد سے یہ تینوں مغربی پاکستانی لگتے تھے۔وہ لٹے پٹے بے بس بہاری اور مغربی پاکستانی مہاجروں کو بلاوجہ ذلیل و خوار کرتے تھے۔مغربی پاکستانی مہاجروں کے تو پاکستان میں اپنے گھر اور عزیز و اقارب تھے انہیں صرف پاکستان پہنچنا مقصود تھا۔اصل بے کس تو بہاری مہاجر تھے جو دوسری مرتبہ بے گھر ہوئے تھے اور پاکستان پہنچنے کے بعد بھی ان کا نہ کوئی گھر تھا اور نہ ہی روزگار انہیں اپنی زندگی کو پھر ابتدا سے شروع کرنا تھا۔آج بھی بنگلہ دیش میں 4 لاکھ کے قریب پاکستانی بہاری 26 سال سے کیمپوں میں کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ان کا صرف یہ قصور ہے کہ وہ پاکستانی ہیں۔دنیا بھر میں اپنی نوعیت کی غالباً یہ واحد مثال ہے کہ چار لاکھ انسان ایسے ہیں جن کی کوئی نیشنلٹی نہیں وہ پاکستانی ہیں لیکن پاکستان انہیں قبول کرنے کو تیار نہیں۔بنگلہ دیش انہیں اپنی شہرت نہیں دیتا۔26 سال میں آدھے تو اپنے ''گمشدہ وطن'' جانے کی آرزو میں انتقال کر چکے ہیں اور نئی نسل کا وطن ان کے کیمپ اور وطن کی سرحدیں خاردار تاریں ہیں۔میں تو اس بات پر حیران ہوں کہ صرف کراچی میں غیر قانونی رہائش پذیر برمی، سری لنکن اور بنگلہ دیشیوں کی تعداد ان پاکستانیوں سے دوچند ہے جو بنگلہ دیش کے کیمپوں میں دکھ بھری زندگی کی گھڑیاں گن رہے ہیں اور ان پاکستانیوں کے حال زار پر حکمرانوں اور صاحب اقتدار کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔

گارڈ کی بدتمیزی پر اسے ٹھڈا پڑتے دیکھ کر ایمبیسی کے احاطے میں کھڑے سارے لوگ ہمارے گرد جمع ہو گئے۔ان کے پژمردہ چہروں پر اطمینان اور آسودگی سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ان سب کی آرزو اور حسرت کو میں نے پورا کر دیا ہے۔میں ایمبیسی کی عمارت میں داخل ہوا تو دوسرے دونوں گارڈ ایک طرف خاموشی سے کھڑے ہو گئے۔میں سیڑھیاں چڑھ کر سفیر کے پی اے کے کمرے میں گیا۔اس سے بغیر کوئی بات کئے، اس کی ٹیبل سے ایک کاغذ اٹھا کر اس پر ''گزشتہ رات کا مہمان'' لکھا اور پی اے کو کہا کہ یہ چٹ سفیر صاحب کو دے دو۔ملاقاتی چٹ پر یہ انوکھی عبارت پڑھ کر پی اے کچھ پوچھنا چاہتا تھا کہ میں نے غراتے ہوئے خالص فوجی لہجے میں کہا۔ANY DOUBT ANY QUESTION (کوئی شک کوئی سوال) پی اے جس کے متعلق بعد میں معلوم ہوا کہ ایمبیسی کا فرعون ثانی تھا۔ہکلاتے ہوئے بولا نو سر اور ایمبیسیڈر صاحب کے کمرے میں چلا گیا۔تین چار منٹوں میں وہ واپس آیا اور دروازے پر کھڑے ہوئے ہی بولا ''آیئے سر ایمبیسیڈر صاحب بلا رہے ہیں''۔ایمبیسیڈر بڑے پرتپاک طور پر ملا خیریت دریافت کی اردلی کو کافی لانے کا کہا اور پھر ہنستے ہوئے کہنے لگا ''اچھا کیا جو گارڈ کی مرمت کر دی۔اب اسے تمیز آ گئی ہو گی کہ کس کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہئے''میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اسے میرے اس کے کمرے تک پہنچنے سے پہلے ہی گارڈ والے واقعے کی اطلاع مل چکی تھی۔آج سفارت خانے میں میرا پہلا دن تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ پہلے دن ہی جھگڑا مول لے لوں۔کافی پینے کے بعد سفیر صاحب نے چابیوں کا سربمہر پیکٹ مجھے دیا۔اس کے ساتھ ایک چار مختلف جگہوں پر لاکھ کی مہریں لگا لفافہ بھی تھا۔میں نے دونوں کی مہریں چیک کر کے وصولی کی رسید پر دستخط کر دیئے۔سفیر صاحب لفافے میں خط کے مندرجات جاننے کے خواہش مند تھے۔لیکن میں نے لفافہ جیب میں رکھ لیا اور پوچھا کہ ڈاک کس روز پاکستان جاتی اور کب آتی ہے پھر جیسے اچانک کچھ یاد آ گیا ہو، سفیر سے پوچھا'' آپ نے یہ کیا غضب کر دیا جو ہوٹل میں کرائے اور دوسرے بلوں کی ادائیگی سفارت خانے کے ذمے لکھوا دی آپ کو تو اچھی طرح سے معلوم ہے کہ یہاں سویلین ریفیوجی کی حیثیت سے آیا ہوں پھر بھلا ایمبیسی کو میرے اخراجات ادا کرنے کا تحریری ثبوت دینے کی کیا ضرورت تھی۔میں نے وہ کارڈ پھاڑ اور نیا کارڈ بھر کر 5 ہزار ایڈوانس ادا کیا ہے۔آپ نے بلا سوچے سمجھے جو کیا وہ میرے اور سفارت خانے کے حق میں بے حد خطرناک ثابت ہو سکتا تھا''سفیر صاحب تو اپنی اس حماقت کا انجام سوچ کر گھبرا گئے اور بولے'' واقعی مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔آپ یوں کیجئے کہ ہوٹل میں 20 ہزار ایڈوانس جمع کروا دیں اور 5 ہزار اپنے خرچ کیلئے رکھیں'' یہ کہہ کر اس نے اکاؤنٹنٹ کو کہا کہ 15 ہزار روپے اور سادہ پے منٹ واؤچر لیکر آ جائے اکاؤنٹنٹ نے مجھے 15 ہزار روپے دیئے اور 25 ہزار کا واؤچر بنا کر سفیر سے پوچھنے لگا'' سر کیا نام لکھوں'' اس سے پہلے کہ سفیر جواب دے میں نے کہا کہ UNDER CODE CAT EYES SUSPENCE لکھ دے۔سفیر صاحب نے نہ سمجھتے ہوئے بھی سر ہلا کر ہاں کہا۔اکاؤنٹنٹ نے واؤچر بھر کر پہلے سفیر کو اور پھر مجھے دستخط کرنے کو دیا۔میں نے اپنے اصلی نام کے INTIALS الٹے لکھے۔تھوڑی دیر بعد میں نے جانے کی اجازت چاہی اور پوچھا کہ کونسا اہم مشن مجھے سونپا گیا ہے۔سفیر نے مجھے بتایا کہ میرے سربمہر لفافے کے ساتھ ایک خط اسے بھی ملا تھا جس میں لکھا تھا کہ مشن کی تفصیلات میرے لفافے میں موجود ہیں اور میں آپ کے ساتھ پورا تعاون کروں تاکہ مشن بخوبی پورا ہو سکے۔میں نے جانے کی اجازت چاہی تو سفیر صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے کہ وقت ہو گیا ہے۔آپ لنچ میرے ساتھ ہی کریں۔میں آپ کو یہاں کے حالات بتانا چاہتا ہوں۔لنچ کے بعد میں دفتر نہیں آؤں گا۔گھر پر ہی باتیں کریں گے۔وہ تو مجھے اپنی مرسیڈیز 200 میں ساتھ لے جانا چاہتے تھے لیکن میں نے کہا کہ آپ جائیں آپ کی کوٹھی نزدیک ہی ہے۔میں پیدل آ جاؤں گا۔آپ کے ساتھ آپ کی گاڑی میں دیکھ کر یہاں پر موجود لوگ نا معلوم مجھے کیا سمجھ بیٹھیں جبکہ میں یہاں ریفیوجی کے COVER میں ہی رہنا چاہتا ہوں۔

سفیر صاحب کی گاڑی چلی تو میں بھی نیچے اتر آیا۔ایمبیسی کے لان میں کھڑے ریفیوجی مجھے دیکھتے ہی میرے آگے پیچھے ہوئے۔کئی نے براہ راست مجھ سے مخاطب ہو کر مجھے اپنی پریشانیوں اور سفارت خانے کی بے حسی کے متعلق بتانا شروع کر دیا۔سفارت خانے کے بیرونی گیٹ پر پہنچ کر میں نے انہیں کہا کہ میں بھی ان کی طرح ریفیوجی ہوں بھارت میں ایک عزیز کے گھر پناہ لے کر اب تک چھپا رہا۔اب حالات کچھ بہتر ہوئے ہیں میں تو پاکستان جانے کے لئے کل ہی کھٹمنڈو پہنچا ہوں۔ (جاری ہے)

غازی

سفیر چونکہ میرے آبائی علاقے کا رہنے والا ہے اس سے رجسٹریشن اور اس سے ملنے میں دقت نہ ہوئی۔ جہاں تک گارڈ کا معاملہ ہے تو اس کی بدتمیزی کے باعث اسے سبق سکھانا پڑا۔ ویسے کچھ قصور آپ لوگوں کا بھی ہے جو سفارتی عملے کو اتنا سر چڑھا رکھا ہے ورنہ سفارت خانے کی چاردیواری کے اندر نیپال نہیں بلکہ پاکستان ہے۔ یہاں پاکستان کا قانون ہے اور سارا سفارتی عملہ آپ کا ہم وطن اور آپ کی خدمت کے لئے ہے۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ اس عملے کو اپنا حاکم سمجھیں یا ان کی اصل حقیقت بتا کر ان سے کام لیں۔ میری اس گفتگو کا شاید ہی کسی پر اثر ہوا ہو۔ پے در پے مصائب اور مشکلات کا شکار یہ ریفیوجی ہزاروں عزیزوں کی قربانی دے کر جب نیپال پہنچے تو ان سے جو سلوک کیا جا رہا تھا۔ اس کے باعث وہ بے جان اور بے حس ہو چکے تھے ان کے لبوں سے شکایتی الفاظ بھی سہمے سہمے سے لگتے تھے میں نے انہیں دلاسا اور حوصلہ دیا اور ہر ممکن مدد کرنے کا وعدہ کر کے ایمبیسیڈر کے گھر چلا گیا۔ قریب ہونے کے باعث یقیناً بہت سے ریفیوجیز نے مجھے ایمبیسیڈر کے گھر داخل ہوتے دیکھا ہوگا۔ میں نے انہیں سفیر کو اپنے آبائی علاقے کا بتا کر قیاس آرائیوں کو کنٹرول کرنے کی ٹھوس کوشش کی تھی۔ بعد کے حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ میری کوشش خاصی حد تک کامیاب رہی۔

کھانا حسب معمول پر تکلف تھا کھانے کے بعد ہم ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ سفیر صاحب نے بتایا کہ کھٹمنڈو میں سقوط ڈھاکہ کے وقت پاکستانی ایمبیسیڈر بنگالی تھا۔ وہ DEFECTIVE ہو گیا اس نے پاکستانی سفارت خانے پر بنگلہ دیش کا جھنڈا لگا دیا اور سفارت خانے کے مغربی پاکستانی تمام ملازمین نکال باہر کئے۔ پاکستان کے دنیا بھر کے سفارتخانوں میں پاکستانی وزارت خارجہ اور دوسرے سفارت خانوں سے ٹرانسمیٹر پر رابطے کے لئے ایک ہی کوڈ استعمال ہوتا ہے اور کوڈ ٹوٹ جانے کی صورت میں STAND BY کے طور پر ایک دوسرے کوڈ پر سفارت خانے میں موجود رہتا ہے۔ بنگالی DEFECTOR سفیر نے دونوں کوڈ بکس بھی اپنے قبضے میں کر لیں اور دنیا بھر میں پاکستان کے سفارتی راز کھلی کتاب بن گئے۔ مغربی پاکستانی عملے نے کسمپرسی کی حالت میں ایک کوٹھی کرائے پر لے کر اپنا سفارت خانہ قائم کیا اور کئی مہینوں بعد پاکستان نے انہیں نئے ٹرانسمیٹر سیٹ اور نئی کوڈ بکس فراہم کیں۔ تمام سفارت خانوں کو پرانی کوڈ اور ڈی کوڈ بکس ضائع کر کے نئی کوڈ بکس دی گئیں یہاں پاکستان سے نیا عملہ بھیجا گیا۔ اس دوران بنگلہ دیش سے پاکستان جانے کے خواہشمند مہاجروں کا یہاں سیلاب آ گیا۔ UNO نے پاکستان مہاجروں کے لئے دنیا کی سب سے چھوٹی افغان ایئر کے چند چھوٹے جہاز چارٹر کئے اس وقت افغانستان کے بھارت سے بہت قریبی روابط تھے اس لئے افغان ایئر کے جہاز جان بوجھ کر تیل لینے کا عذر کر کے دہلی میں اترتے تھے۔ جہاں بھارتی DMI اور CBI والے جہاز کے اندر جا کر مہاجروں کو چیک کرتے اور کسی پر ذرا سا بھی شک پڑنے پر اسے پاکستانی فوجی کہہ کر اتار لیتے۔ سردیوں میں چار ماہ تو برف باری کا عذر گھڑ کر جہاز آتے ہی نہیں جبکہ نیپال ایئر کے علاوہ دوسری ایئر لائنز کے جہاز بارہ مہینے پرواز کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ شیڈول کے مطابق ہفتے میں ایک بار آنے کے بجائے افغان ایئر کے جہاز تکنیکی خرابی کا بہانہ بنا کر مہینوں نہیں آتے اور جہاز میں سیٹوں کی تعداد سے صرف نصف تعداد لے کر پرواز کرتے ہیں۔ اس بارے میں ان کا کہنا ہے کہ رن وے کے اطراف پہاڑوں کی وجہ سے وہ مقررہ لوڈ سے نصف لوڈ لے کر ہی پرواز کر سکتے ہیں۔ ان کا یہ عذر بھی بالکل بے معنی ہے۔ کیونکہ دوسرے جہاز فل لوڈ کے ساتھ پرواز کرتے ہیں۔ ان وجوہات کی بنا پر نیپال میں پاکستانی مہاجروں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے (جاری ہے)

غازی

اور ہمارا سفارت خانہ اپنے محدود وسائل کی وجہ سے ان مہاجروں کی توقعات پر پورا نہیں اتر تا۔ نتیجتاً ہر روز سفارتخانے میں مہاجروں کا ہجوم رہتا ہے۔ سفیر صاحب نے ایسی ہی کچھ تفصیلات بتا کر مجھے پھر لفافہ کھولنے کا کہا۔ طوہاً و کرہاً میں نے لفافہ کھولا تو اس میں ایک بڑے سفید کاغذ کی پیشانی پر انگریزی میں صرف دو ٹائپ شدہ سطریں تھیں۔ CONGRATULATIONS ON YOUR ARRIVAL IN NEPAL WE HOPE YOU HAVE NOT FORGOTTENYOUR TRAINING (نیپال آمد پر مبارک باد۔ ہمیں امید ہے کہ تم نے اپنی ٹریننگ بھولی نہیں ہوگی) میں نے کاغذ سفیر کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ بھی یہ دو سطریں دیکھ کر حیران ہو گیا کہ ان میں ایسی کیا بات تھی جو لفافہ چار جگہوں پر لاکھ کی مہریں لگا کر بھیجا گیا۔ میں یہ پڑھتے ہی اس کاغذ کی اہمیت سمجھ چکا تھا۔ کاغذ واپس لے کر میں نے حفاظت سے جیب میں رکھ لیا اور تھوڑی دیر بعد سفیر سے اجازت لے کر ہوٹل چلا گیا۔

کمرے میں لگے ہیٹر سے میں نے کاغذ کو گرمی پہنچائی تو دونوں طرف حروف ابھرنے لگے اور چند منٹوں میں ہی خفیہ روشنائی سے لکھا ہوا خط کا مکمل مضمون میرے سامنے تھا۔ اس خط میں مجھے ہدایت کی گئی تھی کہ سفارت خانے کی ''اعلیٰ کارکردگی'' کی تفصیلاً چھان بین کروں اور مفصل رپورٹ بھیجوں۔ مجھے جو مشن سونپا گیا تھا اس کے متعلق مختصراً عرض کرتا ہوں۔ بھارت نے اپنے تربیت یافتہ ایجنٹ مہاجروں کے بھیس میں نیپال بھیج دیئے تھے جن میں سے کئی پاکستان پہنچ کر تخریبانہ کارروائیاں کر رہے تھے۔ مجھے نیپال میں ان بھارتی ایجنٹوں کا پتہ چلانا اور غیر محسوس طریقے سے انہیں ایمبیسی کے ذریعے جلد از جلد پاکستان بھیجنا اور ان کے تفصیلی کوائف پاکستان بذریعہ ڈاک یا ایمرجنسی کی صورت میں ٹرانسمیٹ کروانے تھے۔ خط میں لکھا تھا کہ ٹرانسمیٹر آپریٹر ہی CODE اور ڈی کوڈ کرتا ہے اور ہمارے ہی محکمے کا آدمی ہے۔ میں اس پر پورا بھروسہ کر سکتا اور اپنے پیغامات بھجوا سکتا ہوں جس کی ایمبیسی کے کسی دوسرے ملازم کو خبر نہ ہو۔ مشن کا دوسرا حصہ یہ تھا کہ مشرقی پاکستان سے آنے والے مہاجرین کی بہت کم تعداد سیدھی نیپال آئی تھی۔ تقریباً 90 فیصد مہاجر بھارت میں اپنے عزیز و اقارب کے پاس مہینوں بلکہ برسوں قیام کر کے نیپال آئے تھے۔ بھارت میں ان کے قیام کے دوران ان کے میز بانوں کے ہندو ہمسایوں یا دیگر ذرائع سے سی بی آئی والوں کو ان کی بھارت آمد کی اطلاع مل جاتی تھی۔ لہٰذا سی بی آئی اور پولیس والے ان کے گھر جا دھمکتے، اور میز بانوں کو انہیں پناہ دینے اور مہمانوں کو سفری دستاویزات کے بغیر بھارت داخل ہونے کے جرم میں گرفتار کر لیا جاتا تھا۔ بالآخر فیصلہ یہ ہوتا تھا کہ بھارتی میز بان یہ جرم لکھ کر قبول کریں کہ انہوں نے دشمن ملک کے شہریوں کو بغیر سفری دستاویزات کے جانتے بوجھتے غیر قانونی پناہ دی اور مہمانوں کو اس بات پر مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ پاکستان پہنچ کر بھارت کو مطلوبہ اطلاعات اپنے میز بانوں کے توسط سے پہنچائیں۔ بصورت دیگر میز بانوں کے تحریر شدہ اقبال جرم کے تحت انہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔ پاکستان پہنچنے والے مہاجروں کی خاصی بڑی تعداد بہ امر مجبوری یہ قبیح فعل کر رہی تھی۔ پاکستان میں تو ایسے بہت سے لوگ تلاش بسیار کے بعد پکڑے گئے تھے۔ میرے ذمے یہ ڈیوٹی لگائی گئی کہ مہاجروں میں گھل مل کر ایسے لوگوں کا پتہ چلاؤں جو انڈیا کے PLANTED تھے اور ایمبیسی کے ذریعے انہیں جلد از جلد پاکستان بھجواؤں۔ نیپال میں تو حکومت پاکستان کا بس نہ چلتا تھا لیکن لاہور ایئرپورٹ پر ایسے PLANTED مہاجروں کے ''استقبال'' کے لئے میرے محکمے کے افراد موجود ہوں گے۔ میں نے اس خط کو اپنے سوٹ کیس میں سنبھال کر رکھ لیا تا کہ اگر سفیر صاحب تعاون سے انکار کریں تو انہیں خط کا یہ حصہ دکھلا سکوں۔ (جاری ہے)

غازی

اگلے روز میں پھر سفارت خانے گیا لیکن عمارت کے اندر جانے کے بجائے لان میں موجود سینکڑوں مہاجروں کے درمیان ہی گھومتا رہا۔ گزشتہ روز گارڈ کی مرمت کا چرچا ہر ایک کی زبان پر تھا۔ ان میں سے بیشتر کا خیال تھا کہ مجھے حکومت پاکستان نے سفارت خانے کی دھاندلیوں کی انکوائری کے لئے بھیجا ہے۔ میں نے انہیں دوبارہ سمجھایا کہ میں بھی ان کی طرح ایک مہاجر ہوں۔ میں نے ان میں سے چند پڑھے لکھے لوگوں کو چنا اور انہیں کہا کہ مجھے شام 5 بجے انا پورنا ہوٹل میں ملیں تو باہم صلاح و مشورہ کر کے بہتری کی کوئی تدبیر کرتے ہیں۔

شام 5 بجے میں لابی میں آیا تو ان لوگوں کے علاوہ تیس چالیس مہاجر ہوٹل کے وسیع لان میں کھڑے تھے۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ باوجود ہزار منع کرنے کے یہ آپ سے ملنے چلے آئے ہیں۔ سردی سے ٹھٹھرتے میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس ان مہاجروں کو ہوٹل کی انتظامیہ لابی میں بھی داخل نہ ہونے دیتی۔ نسبتاً بہتر لباس میں لابی میں بیٹھے مہاجروں سے میں نے پوچھا کہ کیا کوئی ایسا ہوٹل یا ریسٹورنٹ ہے جہاں ہم سب چائے پی سکیں۔ انہوں نے بتایا کہ شیر پنجاب نامی ایک سکھ کا ریسٹورنٹ ہے۔ وہاں جگہ بھی کافی ہے اور وہ مہاجر دوست بھی ہے۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ ان سب کو اپنے ساتھ لے کر وہاں چلیں۔ میں بھی ان کے پیچھے ہی وہاں پہنچتا ہوں۔ وہ سب شیر پنجاب کو چلے اور تھوڑی دیر بعد میں نے رکشہ پکڑ ادھر کی راہ لی۔ ہم تقریباً ساتھ ساتھ ہی اس ریسٹورنٹ میں پہنچے۔ ریسٹورنٹ کا مالک خود ہی گدی پر بیٹھا تھا۔ میں اس کے پاس گیا اور پنجابی میں کہا کہ میرے ان مہمانوں کو چائے اور کیک رس دیں۔ مجھے پنجابی بولتے دیکھ کر وہ گدی سے اٹھ کر نیچے آیا اور بڑی بے تکلفی سے مجھے گلے لگاتے ہوئے بولا۔ ''بلے بلے آج تے شیر پنجاب وچ پنجاب دا شیر آیا ہویا ہے''۔

سردار جی کی یہ بے تکلفی صرف پنجابی زبان بولنے کی وجہ سے تھی، وہ غالباً اپنی مادری زبان بولنے اور سننے کو ترسا ہوا تھا۔ ورنہ اسے میری اصلیت کا ہرگز علم نہ تھا۔ میرے چائے کے آرڈر دینے پر اس نے ریسٹورنٹ میں کام کرنے والے لڑکوں کو سارے ٹیبل اور کرسیاں صاف کرنے اور مہمانوں کو چائے اور کیک رس پیش کرنے کا حکم دیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں پاکستانی مسلم اور سابقہ مشرقی پاکستان سے جان بچا کر بھارت میں کئی برس چھپتا چھپاتا یہاں پہنچا ہوں۔ سردار جی مسکراتے ہوئے میری بات سنتے رہے۔ میں خاموش ہوا تو بولے ''بادشاہو! ساڈے کولوں اصلی گل نہ چھپاؤ، سن سب پتہ ہے تسی کون او، میں چھ مہینے جالندھر رہ کر ہنی واپس آیاں ہاں، تے او اخباروی نال لایاں آں جس وچ تو ہاڈی فوٹو چھپی ہے۔ تسی نے پنجابیاں داناں روشن کردتا اے'' میں نے سردار جی کو کہا ''واہگورو دے واسطے چپ کردتے ہوئے بولو، میں پن دی دشمنان وچ پھسیا ہوہاں آں'' سردار جی خوشی سے بے حال ہو رہے تھے کہنے لگے کہ تمہارا راز صرف مجھ تک ہی رہے گا اور میری کرپان تمہارے دشمنوں کا سر اتار دیگی۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے سردار جی جذبات سے بے قابو ہو کر وہیں کرپان نکال کر اسے ہوا میں لہرانے نہ لگ جائیں۔ میں نے انہیں سمجھا بجھا کر گدی پر بیٹھنے کو کہا تو وہ کہنے لگے کہ پہلے میرے ساتھ کچن میں چلو، میں مجبوراً ان کے ساتھ ہولیا۔ کچن میں انہوں نے زندہ مرغوں کے ڈربے سے ایک مرغا نکالا اور چھری میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا کہ اسے ذبح کروں۔ میں نے مرغ ذبح کیا تو انہوں نے کہا کہ اب میں اسے آپ کیلئے روسٹ کروں گا۔ سارے بھارت اور نیپال میں مسلمانوں کے طریقے سے ذبح جانور کا گوشت نہیں ملتا۔ اسے آپ

(جاری ہے) اگلے صفحے پر جانے کے لئے یہاں کلک کریں

غازی

اس کے دیئے ہوئے دن اور وقت کے مطابق بذریعہ جہاز حاجی مستان کا ایک آدمی جس نے مجھے بمبئی میں بخوبی دیکھا ہوا تھا ہوٹل آیا اور پچاس لاکھ روپے مجھے دیتے ہوئے بتایا کہ تیس لاکھ حاجی مستان اور بیس لاکھ یوسف پٹیل نے بھیجے ہیں۔ وہ جلدی میں تھا کیونکہ اسے جہاز سے واپس بمبئی جانا تھا۔ ان دونوں کے خطوط بھی تھے جن میں اور باتوں کے علاوہ یہ تحریر تھا کہ اگر مزید ضرورت ہو تو فون کر دیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ حاجی مستان اور یوسف پٹیل مجھے گیارہ بجے رات کے لگ بھگ فون کریں گے۔ رات کو ان دونوں کی مجھ سے فون پر بات ہوئی۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور انہوں نے مزید امدادی رقم بھیجنے کا وعدہ کیا۔ اب میرے پاس اتنی رقم تھی کہ میں کھلے ہاتھ سے امدادی کام شروع کر سکتا تھا اور مہاجرین سے اپنے مشن کیلئے معلومات بھی باآسانی حاصل کر سکتا تھا۔ آئندہ دو تین دن ضرورت مند مہاجروں کی فہرستیں تیار کرنے میں لگ گئے۔ ان فہرستوں میں کھٹمنڈو میں مقیم سب مہاجروں کے نام درج نہیں تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ دو سو سے زیادہ ایسے مہاجر کنبے ہیں جو فارغ البال ہیں۔ میں نے انہیں کہا کہ مجھے ان مہاجروں کے محلے داروں یا کم از کم اسی شہر کے رہنے والوں اور یہاں پر ان سے زیادہ ربط ضبط رکھنے والوں سے ملنا ہے۔ فہرست بنانے والوں نے کہا کہ وہ دو تین روز میں ان مطلوبہ لوگوں سے مجھے ملا دیں گے۔ اگلے روز میں سفارت خانے گیا۔ وہاں گیٹ کے دونوں اطراف میری ہدایت پر فہرست بنانے والے مہاجروں نے دو بڑے گتوں پر جلی حروف میں یہ لکھوا کر لٹکا دیا تھا کہ مالی امداد، ادویات اور کپڑوں کے ضرورت مند فہرست میں اپنا نام پتہ اور رجسٹریشن نمبر درج کروائیں۔ تصدیق کے فوری بعد ان کی ضرورت پوری کر دی جائے گی۔ فہرست میں دھڑا دھڑ نام درج ہو رہے تھے۔ میرے منع کرنے کے باوجود فہرست تیار کرنے والوں نے مجھے اٹھ کر سلام کیا۔ میں ایمبیسی میں داخل ہونے لگا تو مجھ سے مار کھائے ہوئے گارڈ سمیت سب گارڈز نے مجھے سیلوٹ کیا۔ سفیر کے پی اے کے پاس گیا تو اس نے اٹھ کر خیر مقدم کیا اور سفیر کو میری آمد کی اطلاع دی۔ سفیر نے مجھے فوری بلوایا۔ اس کے پاس فسٹ اور سیکنڈ سیکریٹری بیٹھے ہوئے تھے سفیر نے ان سے میرا بحیثیت مہاجر تعارف کروایا۔ یہ محض مجھے دکھانے کیلئے تھا مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ گارڈ کو مارنے والے روز ہی سفیر نے انہیں میری اصلیت بتا دی تھی۔ سفیر تو خاموش بیٹھا رہا لیکن سیکنڈ سیکریٹری جس کا اصل عہدہ میں بوجوہ نہیں بتا سکتا، بولا" یہ کیا تماشہ ہو رہا ہے، اس روز تم نے گارڈ کو مارا اور آج مہاجروں کو امداد دینے کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ یہ ایمبیسی کے کاموں میں صریحاً دخل اندازی ہے" میں نے جواب دیا کہ گارڈ کو تو میں نے اس کی بدتمیزی پر مارا ہے اور جو بھی بدتمیزی کرے گا اس کا بلا تخصیص برا حشر کروں گا۔ جہاں تک مہاجروں کی امداد کا سوال ہے، تو امداد دینے والے کا نام کہیں بھی نہیں لکھا ہے لیکن درحقیقت چند مخیر لوگ میری وساطت سے یہ امداد کر رہے ہیں۔

سیکنڈ سیکریٹری بولا" وہ مخیر لوگ ایمبیسی کی معرفت امداد کیوں نہیں دیتے؟" میں نے جواب دیا کہ اس سوال کا جواب تو ان سے ہی پوچھو تو بہتر ہے۔ ویسے میری اطلاع کے مطابق ایمبیسی کو مہاجروں کیلئے پہنچنے والی امداد سیدھی کھٹمنڈو کے بازاروں میں پہنچ جاتی ہے۔ میری یہ بات سنتے ہی فرسٹ اینڈ سیکنڈ سیکریٹری اس الزام کی پرزور تائید کرنے لگے ان کی آواز میں کبھی کبھی سفیر کی آواز بھی شامل ہو جاتی تھی۔ جب وہ ذرا خاموش ہوئے تو میں نے تینوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اب تک ایمبیسی میں جو بھی دھاندلیاں ہوئی ہیں میں نے ان کے ٹھوس ثبوت حاصل کر لئے ہیں۔ سیکنڈ سیکریٹری جو زیادہ ہی جوشیلا دکھائی دیتا تھا۔ کہنے لگا" کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم کہاں بیٹھے ہو اور میں کون ہوں" میں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا" میں پاکستانی سفارت خانے یعنی پاکستانی سرزمین میں بیٹھا ہوں اور تم جس محکمے سے سفارشوں کے ذریعے سفارت خانے میں آئے ہو اسے بھی بخوبی جانتا ہوں اور تمہارے یہاں پر بھی جو ذاتی کرتوت ہیں ان سے بھی بخوبی واقف ہوں۔ (جاری ہے)

غازی

اوران سب کی رپورٹ اپنی پہلی ڈاک میں پاکستان بھجواؤں گا اور تمہیں میں چیلنج کرتا ہوں کہ میرا کچھ بگاڑ سکتے ہوں تو بگاڑ لو۔ یہ کہہ کر میں اٹھا اور دروازے کو اتنے زور سے بند کیا کہ اندر بیٹھے تینوں کرسیوں سے اچھل پڑے ہوں گے۔

میرے تلخ رویے اور ایمبیسیڈر کی سیاست کے باعث یا کسی نامعلوم وجہ سے یہ دونوں سیکریٹری شام کو میرے ہوٹل پہنچ گئے۔ لابی میں مجھے ملنے کیلئے چند مہاجر بھی بیٹھے تھے۔ میں نے مہاجروں کو پہلے Attend کیا اور قریباً ایک گھنٹہ ان کے ہمراہ رہا۔ اس دوران دونوں سیکریٹری بار بار اپنی گھڑیاں اور مجھے مہاجروں سے محو گفتگو دیکھتے رہے۔ میں نے ان کیلئے کافی بھجوادی تھی۔ مہاجروں سے فارغ ہو کر میں ان کے پاس آیا تو دونوں اٹھ کر مجھ سے ملے اور بغیر وقت لئے آنے کی معذرت چاہی۔ قصہ مختصر ان کے آنے کی وجہ دن کو سفیر کے کمرے میں ہونے والی تلخ گفتگو کو بھلا دینے اور آئندہ میرے ساتھ پورے تعاون کا وعدہ تھا۔ میں نے انہیں صاف کہہ دیا کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں نے نہ تو ان کے درشت رویئے کو کوئی اہمیت دی ہے اور نہ ہی کوئی اثر لیا ہے۔ جہاں تک مہاجروں کیلئے آنے والے سامان کی خورد برد اور بازار میں فروختگی کا سوال ہے تو اس کے متعلق تفصیلی رپورٹ میں نے بہر حال اپنی ڈاک میں بھیجنی ہے۔ سامان کی فروختگی اور مہاجروں میں تقسیم نہ ہونے کے ثبوت میرے پاس ہیں۔ اگر آپ فوری تفتیش کر کے خورد برد کرنے والوں کے نام اور تحقیقاتی رپورٹ مجھے دیں تو وہ بھی میں اپنی ڈاک میں بھیج دوں گا۔ دو روز بعد ان دونوں نے مجھے اپنی تحقیقاتی رپورٹ اور دو گارڈز اور چوکیدار کے نام دیئے جو ان کی تفتیش کے مطابق سامان بیچنے اور خورد برد کے ذمہ دار تھے۔ میں نے اپنی تفصیلی رپورٹ پورے ایک ہزار مہاجروں کے دستخطوں اور رجسٹریشن نمبروں کے ساتھ بھیجی۔ ساتھ ہی دونوں سیکریٹریوں کی رپورٹ پر اپنے Comments میں لکھا کہ اگر صرف گارڈز اور چوکیدار ہی چوری میں ملوث تھے تو آج سے پہلے مال کی گمشدگی اور چوری کی تفتیش کیوں نہ کی گئی۔ UNO کے کھٹمنڈو کے دفتر سے سفارت خانے کے سامان وصول کرنے کی رسید کی کاپی بھی میں نے اپنی رپورٹ کے ساتھ منسلک کر دی تھی میں نے اپنے Comments کے آخر میں لکھا کہ ایک بچہ بھی اس نتیجے پر آسانی سے پہنچ سکتا ہے کہ خورد برد میں گارڈز اور چوکیدار نہیں بلکہ اوپر والے ملوث ہیں۔ بہر حال میرا کام صرف رپورٹ بھیجنا ہے۔ فیصلہ آپ نے کرنا ہے۔ 20ہزار کمبلوں کی فروخت کا بھی تفصیلی ذکر کیا۔

میں نے اپنی ڈاک کے مخصوص تھیلے کو بند کر کے تالا لگایا اور اسے اپنے سامنے سفارتی ڈاک کے تھیلے میں رکھوا کر سفارتخانے میں بیٹھا رہا جب سفارت خانے کی گاڑی ڈاک لیکر ایئر پورٹ جانے لگی تو میں ایئر پورٹ جانے کا بہانہ کر کے اسی گاڑی میں ایئر پورٹ پہنچا اور اپنے سامنے ڈاک کارگو سیکشن کے حوالے کروائی۔ بھارتیوں سے تو خیر کی توقع ہی عبث تھی لیکن اپنوں کا رویہ دیکھ کر میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ ایئر پورٹ سے واپسی پر میں اپنے ہوٹل چلا گیا جہاں مہاجروں کے علاوہ ایجنسی کا وائرلیس آپریٹر بھی ایک کونے میں بیٹھا میرا منتظر تھا۔

(جاری ہے)

قسط نمبر 75

غازی

یہ وہی شخص تھا جس کے متعلق میرے محکمے نے خفیہ خط میں ''اپنا آدمی'' ہونے کا لکھا تھا۔ میں اسے لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ کچھ رسمی گفتگو کے بعد میں نے اسے محکمے کا خفیہ خط دکھایا۔ خط دیکھنے کے بعد تو وہ پھٹ پڑا اور اس نے مجھے میرے خلاف ہونے والی اپنوں کی دو ایسی خفیہ سازشوں کا بتایا کہ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

اس نے بتایا کہ سفیر صاحب نے ایک پیغام وزارت خارجہ کو ٹرانسمیٹ کروایا ہے کہ میں سفارت خانے کے سرکاری کاموں میں رخنہ اندازی کر رہا ہوں اور مہاجروں کو سفارت خانے پر حملہ کرنے اور سفارتی نمائندوں کو ہلاک کرنے کی ترغیب دے رہا ہوں جس کیلئے بھارت سے بہت سارے روپے بھی لایا ہوں اور مہاجروں میں تقسیم کر کے انہیں اپنا ہم نوا بنا رہا ہوں۔ سفیر نے سوالیہ نشان کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ بھارتی حکومت نے مجھے یہ روپیہ اس کام کیلئے دیا ہو۔ دوسری سازش یہ ہے کہ سفیر نے دو نیپالی جرائم پیشہ افراد کو گھر پر بلا کر کچھ ہدایات دی ہیں۔ ہدایات کیا ہیں اس کا تو علم نہیں لیکن آج جب آپ سفارتی ڈاک والی گاڑی میں بیٹھ رہے تھے تو ان دونوں نیپالیوں نے سیکنڈ سیکریٹری کے کمرے سے نکل کر آپ کی خفیہ طور پر تصویریں اتاری تھیں۔ انہیں تصویریں اتارتے میں نے خود دیکھا ہے چونکہ آپ کے متعلق مجھے محکمے سے ہدایات مل چکی ہیں اس لئے میں آپ کو ان باتوں سے آگاہ کرنے کیلئے چلا آیا میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اسے ہوٹل کی پچھلی جانب سے واپس بھیج دیا۔ نیپالی جرائم پیشہ افراد سے سفیر کا ملنا اور میری تصویریں اتارنے کا مقصد واضح تھا کہ مجھے بے خبری میں ہلاک کر دیا جائے۔ اپنی دھاندلیوں پر پردہ ڈالنے کیلئے سفیر کو صرف یہی رستہ نظر آیا تھا کہ مجھے راستے سے ہٹا دیا جائے۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ ان سازشوں کی تفصیلی رپورٹ پاکستان ٹرانسمیٹ کروا دوں لیکن فوراً ہی دوسری سوچ آئی کہ سفارت خانے کے ٹرانسمیٹر کا رابطہ صرف پاکستانی وزارت خارجہ سے تھا اور وزارت خارجہ سے ہو کر ہی میرے محکمے سے متعلقہ رپورٹس میرے محکمے کو بھیجی جاتی تھیں۔ براہ راست محکمے سے کوئی رابطہ نہ تھا۔ اگلی ڈاک جانے میں بہت دن پڑے تھے۔ میں اپنے اور انجانے دشمنوں میں گھر چکا تھا۔ جب دنیاوی کوئی راستہ نظر نہ آئے تو انسان رب جلیل سے رجوع کرتا ہے جو ہر شے کا مالک اور خالق ہے اور ہر شے پر قادر ہے۔ اسی ذات پاک کی رحمت پر پورا یقین انسان کو بڑی سے بڑی مصیبت سے نکال دیتا ہے میں نے بھی اپنے خالق حقیقی سے مدد مانگی اور ان مشکلات کا خود ہی سامنا کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے یقین تھا کہ میری بھیجی گئی رپورٹس کی روشنی میں میرا محکمہ میرے خلاف سفیر کی رپورٹ کو چیتھڑے سے زیادہ اہمیت نہ دے گا۔ بہر حال میں اب چوکنا رہنے لگا کہ ہمیشہ تین چار ہمدرد مہاجروں کے ساتھ ہی باہر نکلتا۔ سفارت خانے جانا بھی میں نے بہت کم کر دیا۔

غداروں سے دو دو ہاتھ

آئندہ چند روز میں مجھے نہ صرف ان مہاجروں کی لسٹ مل گئی جو مالی اعتبار سے مستحکم تھے اور بعض ضرورت مند مہاجروں کی خاطر خواہ امداد بھی کرتے تھے بلکہ ان کے قدیم جاننے والے مہاجروں سے بھی رابطہ ہو گیا انہوں نے مجھے جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ تھا کہ ان مہاجروں میں سے کچھ تو سابقہ مشرقی پاکستان میں بھی صاحب حیثیت تھے اور فراخ دلی سے ضرورت مندوں کی امداد کرتے تھے۔ 25 مارچ 71ء سے پہلے اور بعد میں خانہ جنگی کے دوران انہوں نے بہت سے بہاری اور پاکستانی مہاجروں کو اپنے ہاں پناہ دی تھی۔ ان میں سے ایک شاہی مرزا بھی تھے جو آج کل پاکستان میں ٹی وی ڈراموں میں کام کرتے ہیں یہ اپنے ہمراہ جو کچھ بھی نیپال لا سکے وہ انہوں نے باوجود کثیر الاولاد ہونے کے ضرورت مندوں میں بانٹ دیا تھا۔ کچھ مہاجر ایسے تھے جن کے سابقہ جاننے والوں نے بتایا کہ مشرقی پاکستان میں ان کی مالی حالت اچھی نہ تھی لیکن نیپال پہنچنے کے بعد وہ اچھے مکانوں میں رہتے اور کھلا خرچ کرتے تھے۔ ان لوگوں نے نیپال میں ضرورت مند مہاجروں کے اپنے اپنے حلقے بنا رکھے تھے جن کے ساتھ کم و بیش ہر روز محفلیں جمتی تھیں۔ ان فارغ البال مہاجروں کی تیسری قسم وہ تھی جنہیں سابقہ مشرقی پاکستان (ان کے بتائے ہوئے ایڈریس کے مطابق) کوئی بھی نہ جانتا تھا۔ حتیٰ کہ ان کے شہر، محلے اور گلی میں رہنے والوں کیلئے بھی وہ بالکل اجنبی تھے۔ سفارت خانے سے مجھے رجسٹرڈ مہاجرین کی فہرستیں مل چکی تھیں۔ ان کے علاوہ مہاجروں نے بھی اپنے طور پر مکمل فہرست تیار کی ہوئی تھی۔ دونوں فہرستوں میں ان تیسری قسم کے مہاجروں کے مکمل کوائف اور پتے درج تھے لیکن ان کو جاننے اور پہچاننے والا کوئی نہ تھا۔ ایک بڑی ہی عجیب بات یہ تھی کہ ان تیسری قسم کے مہاجروں کے کوئی افراد خانہ نہ تھے۔ بقول ان کے ان کے گھر والے تو مشرقی پاکستان میں فسادات کے دوران مارے گئے یا سقوط ڈھاکہ کے بعد مکتی باہنی کے ہاتھوں شہید ہوئے اور وہ بالکل اکیلے نیپال پہنچے تھے۔ مجھے سونپے گئے مشن کے مطابق میری سب سے زیادہ ''دلچسپی'' ان مہاجروں میں تھی۔ اس مشن کیلئے میں نہ تو سفارت خانے کے ارکان کو اعتماد میں لے سکتا تھا اور نہ ہی کسی اور پر اندھا بھروسہ کر سکتا تھا۔ میں نے اس کا حل یہ ڈھونڈا کہ روزانہ پانچ چھ ایسے مہاجروں کو ملنے اور اپنے ہمراہ ان کے شہر، محلے اور گلی میں رہنے والوں کو ساتھ لے جانے کا پروگرام بنایا تا کہ ان کی اصلیت معلوم ہو سکے۔ پہلے روز ہم اللہ کا نام لے کر ایسے مہاجر کے گھر گئے جس نے خود کو کھلنا میں سلیم ہوٹل سے ملی ہوئی عمارت کا رہائشی بتایا تھا۔ میرے ہمراہ کھلنا کے تین معتبر مہاجر تھے۔ جب ہم اس کے گھر پہنچے تو اس نے بڑی رکھائی سے ہم سے بات کی۔ اس نے تین چار کمروں پر مشتمل گھر کرائے پر لے رکھا تھا اور اس کا فرشی ڈرائنگ روم خوب آراستہ تھا۔ میں نے اسے اپنی آمد کا یہ سبب بتایا کہ میرے ہمراہی مہاجر مجھ سے بطور قرض کچھ رقم لینا چاہتے ہیں۔ چونکہ آپ بھی کھلنا کے رہائشی ہیں۔ اس لئے اگر آپ ان کی تصدیق کر دیں تو میں انہیں رقم قرض دے دوں۔ اس مہاجر کا مجھے دیکھتے ہی رنگ تو فق ہو چکا تھا لیکن اس نے خود پر قابو پائے رکھا اس نے تصدیق کرنے سے انکار کر دیا تو میں نے کہا کہ کھلنا تو میں کبھی گیا نہیں آپ صرف اتنا بتا دیں کہ جو ایڈریس یہ بتا رہے ہیں وہ درست بھی ہے یا نہیں۔

(جاری ہے)

غازی

ان مہاجروں کو میں نے جیسے کہا تھا، انہوں نے اپنے ایڈریس اور محلہ، گلی وغیرہ وہ بتائے جو کھلنا میں موجود ہی نہ تھے۔ صاحب خانہ نے بڑی بے رخی سے یہ ایڈریس سنے اور کہا کہ ہاں ٹھیک ہے ٹھیک ہے اب آپ جائیں۔ میں نے اس کے رویے پر کوئی توجہ نہ دیتے ہوئے اس سے پوچھا کہ آپ کا کھلنا میں کیا کام تھا اور آپ تو ریکارڈ کے مطابق سلیم ہوٹل سے ملحقہ بلڈنگ میں رہتے تھے۔ اس بلڈنگ کے مالک کا کیا نام تھا۔ میرے سوالات سن کر تو وہ آپے سے باہر ہو گیا اور ہمیں فوراً گھر سے نکل جانے کا کہا۔ میرے ساتھ آئے ہوئے مہاجروں کے بھی رنگ اڑے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ میرا ارادہ سمجھ سکتا، میں نے اسے گردن سے پکڑ کر فرش پر گرا دیا۔ میں نے اس کی گردن ایسے طریقے سے پکڑی تھی کہ اسکے منہ سے سوائے خرخر کے کوئی آواز نہ نکلتی تھی۔ مجھے اس پر شک تو پورا تھا لیکن اسے یقین میں بدلنے کیلئے میں نے پسٹل نکالا اور اس کے سینے پر رکھ کر اپنے ساتھی مہاجروں کو کہا کہ اس کا لباس اتار کر مسلمان ہونے کی تصدیق کریں۔ وہ غیر مسلم نکلا۔ میں نے اس کے ہاتھ پاؤں بندھوا دیئے اور کہا کہ اب شرافت سے اپنی حقیقت بتاؤ گے یا میں دوسرا طریقہ استعمال کروں۔ اس کا راز کھل چکا تھا وہ ادھر ادھر کی ہانکنے لگا لیکن دو تین تھپڑ کھاتے ہی سیدھے راستے پر آ گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ کلکتے کا رہنے والا اسو بلین اور مکتی باہنی میں شامل رہا ہے۔ مشرقی پاکستان میں تخریبی کارروائیوں میں پاک فوج کے زیر استعمال رہنے والے پل اڑانے میں اس کا نمایاں کردار تھا کیونکہ وہ ہوڑا برج کلکتہ کے نزدیک بارود بنانے کی فیکٹری میں کام کرتا رہا ہے۔ اس کا نیپال آنے کا مقصد پاکستان جانا نہیں بلکہ یہاں سے مہاجروں کی ایک ٹیم تیار کرنا ہے جو پاکستان جا کے تخریبی کارروائیاں کر سکے۔ قارئین یقیناً سوچتے ہوں گے کہ اتنی آسانی سے اس نے اپنے راز کیسے اگل دیئے۔ اس کی وجہ (اول) یہ تھی کہ ہم دونوں ایک نیوٹرل ملک میں تھے جہاں دشمن ہونے کے باوجود قانونی طور پر ایک دوسرے کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے (دوئم) اسے میری اصلیت کا علم نہ تھا۔ میرے نیپال آنے سے بہت پہلے سے وہ اپنی کارروائیوں میں مصروف تھا۔ اس نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ اس کے علاوہ آٹھ اور بھارتی مہاجروں کے بھیس میں یہاں موجود ہیں اور اپنے اپنے فیلڈ میں پاکستان کے خلاف مہاجروں کو Plant کرنے میں مصروف ہیں۔ یہ سب کچھ بتا کر اس نے اسی کرخت لہجے میں مجھے کہا کہ تم چاہے کوئی بھی ہو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہو کہ اپنی ایمبیسی کو ہمارے متعلق بتا کر ہماری رجسٹریشن ختم کروا دو۔ ایسی صورت میں بھی ہم جتنا عرصہ چاہیں، نیپال میں رہ سکتے ہیں۔

وہ اپنی بکواس کئے جا رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اسے اور اس جیسے آٹھ دوسرے بھارتیوں کو زندہ چھوڑ دینا ہمارے لئے کتنا خطرناک ہو گا۔ یہاں پر حاجی مستان اور یوسف پٹیل جیسے دبنگ دوست بھی نہ تھے جو میرے مددگار ثابت ہوتے۔ ان کم بختوں نے یہاں مہاجروں کی کسمپرسی سے فائدہ اٹھا کر یقیناً بہت سوں کو اپنا ہم نوا بنا لیا ہو گا۔ میں تو اپنے ساتھ آنے والے مہاجروں پر بھی پورا اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔ اس کو مار دینے کے بعد اس کی لاش کو ٹھکانے لگانا بھی بڑا دشوار تھا۔ نہ تو کھٹمنڈو بڑا شہر تھا اور نہ ہی میرے پاس اپنی یا کسی ہمدرد کی گاڑی تھی۔

(جاری ہے)

غازی

سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس کے بقول آٹھ اور بھارتی یہاں پاکستان دشمن سرگرمیوں میں مصروف تھے۔سوچ سمجھ کر میں نے ایک فیصلہ کیا۔عام حالات میں یہ ایک انتہائی کمزور پلان تھا لیکن حالات کے تقاضے کے مطابق مجھے فوری طور پر اس سے بہتر کوئی تجویز سمجھ میں نہ آئی۔

میں نے اپنے ساتھ آنے والے تینوں مہاجروں کو رخصت کیا اور سختی سے ہدایت کی کہ کسی سے بھی حتیٰ کہ اپنے گھر والوں کو بھی یہاں آنے کا نہ بتائیں۔میں نے سارا پلان پہاڑی کوئلے سے بھری اس انگیٹھی کو دیکھ کر بنایا تھا جو تکی باہنی کے اس کارکن کے فرشی ڈرائنگ روم میں پڑی تھی۔کھٹمنڈو کی ہڈیوں میں جم جانے والی سردی میں کوئلے کی انگیٹھی جلانے کا رواج عام تھا۔میں نے وہ دہکتی انگیٹھی اٹھا کر اس کے سونے کے کمرے میں رکھی جہاں ویسی ہی ایک ان جلی انگیٹھی پڑی تھی جسے اٹھا کر میں ڈرائنگ روم میں لے آیا۔مکتی باہنی کا یہ ایجنٹ سابقہ مشرقی پاکستان میں اپنی کامیابی، پاکستان کے دولخت ہونے اور نوے ہزار پاکستانی افواج کے بھارتی قیدی بننے کے زعم میں ابھی بھی بےخوف نظروں سے مجھے دیکھتا اور دھمکا رہا تھا۔پاکستان میں ٹریننگ کے دوران مجھے گردن کی مخصوص نسوں کو دبا کر ہلاک کرنے کی ٹریننگ دی گئی تھی لیکن یہ ٹریننگ صرف چارٹوں سے ان نسوں کو دکھانے اور دبانے کے طریقے بتانے تک محدود تھی میں ہاتھوں پیروں بندھے اس ایجنٹ کے سینے پر بیٹھ گیا اور ٹٹول کر ان نسوں کو اپنے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے اور انگشت شہادت سے زور سے دبایا۔دو منٹ تک اسی کیفیت میں رہنے کے بعد میں نے اس کی گردن سے ہاتھ اٹھائے تو اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔مجھے بالکل یقین نہیں تھا کہ وہ مر چکا ہے۔کافی دیر میں اسی حالت میں اس کے سینے پر سوار بیٹھا رہا۔ہر لمحے مجھے یہی شک گزرتا کہ وہ ابھی سانس لے گا یا حرکت کرے گا لیکن وہ تو واقعی مر چکا تھا۔میں نے مزید تسلی کیلئے اس کی نبض ٹٹولی۔اسی کمرے میں پڑا ایک آئینہ اس کے نتھنوں کے ساتھ لگائے رکھا۔جب اس میں زندگی کے کوئی آثار دکھائی نہ دیئے تو میں نے اسکے ہاتھ اور پاؤں کھولے۔اسے اٹھا کر اس کے سونے کے کمرے میں لے جا کر پلنگ پر ڈال دیا جلتی انگیٹھی جس کا زہریلا دھواں کمرے میں پھیل رہا تھا اس کے پلنگ کے قریب رکھی۔اس کے دو سوٹ کیسوں کی تلاشی لی۔جن سے مجھے اس کا بھارتی حکومت کا جاری کردہ شناختی کارڈ اور ہندی میں ٹائپ شدہ کچھ کاغذات ملے۔پلنگ پر پڑے دو کمبل میں نے اس کے اوپر ڈالے اور بتی بجھا کر دروازہ اچھی طرح سے بند کر دیا۔ڈرائنگ روم میں آ کر اس کی بتی بجھائی۔باہر کا دروازہ کھول کر اچھی طرح سے دیکھا کہ کوئی مجھے دیکھ نہ رہا ہو۔پوری تسلی کے بعد میں نے باہر آ کر دروازہ بند کیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس گھر سے خاصا دور نکل آیا اور ایک رکشہ لے کر اپنے ہوٹل پہنچ گیا۔مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنی آسانی سے اس دشمن ملک کو میں نے واصل جہنم کر دیا ہے۔

دوسرے روز دوپہر کے قریب میں سفارت خانے پہنچا تو وہاں ہر طرف ایک ہی بات ہو رہی تھی کہ ایک مہاجر جو تھر بلے کوئلے کے زہریلے دھویں سے گزشتہ رات ہلاک ہو گیا۔اسے غسل دینے والوں کو بھی اس کے غیر مسلم ہونے کا پتہ نہ چلا۔بعد دوپہر جب بہت سے مہاجر اس کی نماز جنازہ میں شریک ہوئے اور شہر سے دور قبرستان میں اسے دفنا دیا گیا شام کو ہوٹل میں روزمرہ کے ملاقاتی مہاجروں کے بعد گزشتہ شام والے تینوں مہاجر بھی ملنے آئے۔ان تینوں کو اس ایجنٹ کی موت کی وجوہات کا تو علم تھا لیکن وہ یہ نہ جان سکے کہ اس کی موت کیسے واقع ہوئی۔نہ تو انہوں نے اس کی موت کا تذکرہ کیا اور نہ ہی میں نے کوئی بات چھیڑی۔اگلے روز سے میں نے فی مہاجر کنبہ ایک ہزار روپیہ دینے کا پروگرام بنایا تھا۔میں نے ان تینوں کو 3 ہزار روپے دیئے اور کہا کہ وہ اس کام میں میری مدد کریں۔فہرستیں میرے پاس تھیں اور روپیہ لینے کیلئے مہاجرین نے مجھے رجسٹریشن نمبر دکھانے تھے۔ان کو رخصت کر کے میں لباس تبدیل کرنے ہی والا تھا کہ ریسپشن سے فون آیا کہ ایک آدمی آپ سے ملنے کیلئے بضد ہے اور کہتا ہے کہ اگر آپ ابھی نہ ملے تو وہ ساری رات لابی میں بیٹھا رہے گا۔میں لابی میں آیا تو اس سے پہلے کہ ریسپشن والے مجھے بتاتے ایک آدمی لپکتا ہوا میرے پاس آیا۔اور بولا" جناب میں نے آپ کو اس وقت ملنے کی تکلیف دی ہے۔

(جاری ہے)

غازی

میں چٹاگانگ (سابقہ مشرقی پاکستان کا ایک شہر) کا رہنے والا ہوں۔ ریلوے میں گڈز کلرک تھا۔ 25 مارچ 71ء کے فوری بعد میں البدر میں شامل ہوگیا اور افواج پاکستان کے شانہ بشانہ غداروں سے لڑتا رہا سقوط ڈھاکہ کے بعد جب ہم بالکل بے آسرا رہ گئے تو پاکستان کے غداروں اور مکتی باہنی والوں نے میرے سامنے میرے تین بچوں، بیوی اور والدہ کو شہید کر دیا اور مجھے اذیتیں دے کر دو گولیاں ماریں اور مردہ سمجھ کر چلے گئے۔ مجھے جب ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ ایک محب وطن بنگالی مجھے اپنے گھر اٹھا لایا تھا۔ مجھ میں زندگی کی کچھ رمق باقی تھی۔ اس نے مجھے اپنے گھر میں پناہ دی اور خفیہ طور پر میرا علاج کرتا رہا۔ دو برس کے علاج کے بعد میں اس قابل ہوا کہ چل پھر سکوں۔ ہم دونوں ریلوے کالونی میں رہتے تھے اور دوست تھے۔

اس نے مجھے زاد راہ دی اور چھپتا چھپاتا قریب ایک برس تک بھارت میں بھٹکنے کے بعد چند ماہ پہلے یہاں پہنچا ہوں۔ آپ کی یہاں آمد کے بعد مہاجروں میں طرح طرح کی چہ مگوئیاں ہو رہی ہیں۔ میں یہاں اکیلا اور تنہا ہوں اور ایک پڑھے لکھے بزرگ جو شاعر بھی ہیں کے ہمراہ ایک کمرے میں رہتا ہوں۔ چونکہ دن میں آپ کے گرد مہاجروں کا ہجوم ہوتا ہے یا آپ ایمبیسی میں ہوتے ہیں جہاں ہمارا داخلہ ممنوع ہے اس لئے اس وقت ملنے کو چلا آیا۔ میں اس بے وقت کی ملاقات کی وجہ سے چڑ چڑا سا ہو رہا تھا۔ ایسی کہانیاں تقریباً ہر مہاجر کی زبان سے ہر روز سنتا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ اگر تمہیں پیسے کی ضرورت ہے تو کل صبح اپنا رجسٹریشن کارڈ لے کر ایمبیسی چلے آنا وہیں سب کو فی کارڈ ایک ہزار روپے دیئے جائیں گے۔ ''جناب یہ درست ہے کہ میں آپ سے مالی امداد لینے آیا ہوں لیکن میرے ساتھ جو بیتی ہے وہ کہانی نہیں بلکہ حقیقت ہے''۔ اس کی آنکھوں میں بے خوفی اور سچائی کی چمک تھی جسے میں نے دیکھا لیکن تہہ تک نہ پہنچ سکا۔ میں نے اسے کہا کہ میرے ساتھ واش روم میں چلو اور مجھے اپنے جسم پر تشدد کے نشان دکھاؤ۔ میں سمجھتا تھا کہ اب وہ اپنی فرضی کہانی کا بھانڈا پھوٹنے سے بچنے کیلئے یا بہانے گھڑے گا یا چلا جائے گا لیکن وہ واش روم میں میرے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ اس نے سخت سردی میں پھٹی ہوئی قمیص اور میلا سا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ واش روم میں اس نے اپنی قمیص اتار کر مجھے اپنی پیٹھ اور سینہ دکھایا۔ یقین جانیئے اس کی ساری پیٹھ اور سینہ زخموں کے ایسے درجنوں گہرے گھاؤ سے بھرا پڑا تھا جنہیں دیکھ کر میں تھرا اٹھا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے روکتا اس نے اپنا پاجامہ نیچے کیا۔ اس کے دونوں HIPS پر رائفل کی گولیوں کے تقریباً چھ چھ انچ پر پھیلے دو ایسے گھاؤ تھے جن سے خاصا گوشت اڑ چکا تھا۔ رانوں پر ان کے عین سامنے رائفل کی گولیاں جسم میں داخل ہونے کے ایک ایک انچ گہرے نشان تھے (تھری ناٹ تھری کی گولی رائفل کی نال کے Groves کی وجہ سے گھومتے ہوئے نکلتی ہے۔ جہاں سے جسم میں داخل ہو وہاں گولی کا نشان چھوٹا ہوتا ہے لیکن گھومنے کی وجہ سے جہاں سے نکلتی ہے وہاں بہت بڑا زخم بناتی ہے) اس کے جسم پر تشدد کے ہولناک نشان ایسے تھے جن کے مقابلے میں مجھے خود پر کیا گیا بھارتی تشدد، پہاڑ کے مقابلے میں رائی محسوس ہونے لگا میں تو حیران تھا کہ وہ زندہ کیسے بچا۔ اس ذات پاک پر میرے یقین کامل کا ثبوت اس کا زندہ رہنا تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ کا قول ہے کہ ''موت تمہاری زندگی کی محافظ ہے'' کی سچائی کا وہ جیتا جاگتا ثبوت تھا۔ اس نے کپڑے درست کئے تو میں نے اسے گلے لگا لیا جتنا ظلم و ستم اس پر آدھ گھنٹے میں کیا گیا تھا۔ اتنا کوئی شاید سو برس میں بھی برداشت نہ کر سکے۔ اس آدھ گھنٹے میں اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے تین معصوم بچوں، جوان بیوی اور ضعیف والدہ کو شہید کیا گیا اور اسے جس ظلم، تشدد اور بربریت کا نشانہ بنایا گیا اس کی مثال ملنا دشوار ہے (اس رات سے وہ میرا گہرا دوست بن گیا۔ کھٹمنڈو میں اس نے میرے مشنوں میں میری بھرپور مدد کی۔ وہ بفضل خدا بقیہ حیات فیصل آباد میں ریلوے میں ملازمت کر رہا ہے۔ پاکستان آ کر اس نے نئی زندگی کا آغاز کیا۔ شادی کی اور اب چار بچوں کا باپ اور بھرے پرے گھر میں آسودگی کی زندگی گزار رہا ہے۔ سیکورٹی کی بنا پر میں آئندہ اسے محسن کے نام سے مخاطب کروں گا)

اس نے مجھے بتایا کہ اس وقت اس کے آنے کی وجہ یہ تھی کہ گزشتہ تین گھنٹوں سے وہ اور اس کا بزرگ ساتھی بھوکے ہیں اور بھوک اور بیماری کے باعث اس کے ساتھی کی حالت نازک ہو چکی ہے۔ میں نے ریسپشن کے ذریعے ہوٹل کے ڈاکٹر کو فوری بلوایا اور ہوٹل سے دودھ اور کھانا لے کر ڈاکٹر کے ہمراہ ہوٹل کی ٹیکسی میں ہم سب اس کے گھر گئے۔ ایک کمرے کے اس گھر میں فرش پر دو پھٹی پرانی دریاں اور دو بوسیدہ کمبل تھے۔ کمرہ سردی سے یخ ہو رہا تھا اس کا ساتھی ایک دری پر لیٹا بخار میں پھنک رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے انجکشن اور دوا دی اور بتایا کہ سردی اور بھوک کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہو رہی تھی اس وقت بازار بند ہو چکے تھے جہاں سے میں ان کیلئے گرم کپڑے اور بستر وغیرہ لیتا۔ میں انہیں ہمراہ لے کر انا پورنا ہوٹل کے قریب ہی ایک گیسٹ ہاؤس میں گیا اور ان کیلئے ایک کمرہ اور ایکسٹرا پے منٹ پر ہیٹر لیا۔ ہیٹر سے کمرہ جلد ہی گرم ہو گیا اور گرم بستروں نے دونوں کو گرم کر دیا۔ میں نے محسن کو دس ہزار روپے دیئے اور کہا کہ کل صبح وہ اپنے اور بزرگ ساتھی کیلئے گرم کپڑے اور ضرورت کا دوسرا سامان خریدے۔ ڈاکٹر کو میں کہہ دوں گا کہ وہ صبح اور شام بزرگ ساتھی کے علاج کیلئے گیسٹ ہاؤس میں آئے۔ آئندہ شام میں خود بھی دونوں کو ملنے اس گیسٹ ہاؤس میں آؤں گا۔ یہ کہہ کر میں ان سے رخصت لے کر اپنے ہوٹل واپس چلا آیا۔ رات کا خاصا حصہ میں یہ سوچتا رہا کہ ہر انسان اپنی مشکل اور مصیبت کو بہت بڑی سمجھتا ہے لیکن اگر ایسا ممکن ہو کہ ہر انسان کی مشکلات اور مصیبتوں کو الگ الگ ڈھیر کی صورت رکھ دیا جائے اور ان انسانوں کو کہا جائے کہ جو ڈھیر پسند ہو اسے اٹھا لے تو یقیناً ہر انسان دوسرے کے ڈھیر کے بجائے اپنا ڈھیر ہی اٹھائے گا یہ انسانی فطرت ہے کہ انسان اپنی مصیبت اور مشکل کو بہت بڑی اور دوسروں کی بہت کم سمجھتا ہے جب کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔

دوسرے روز صبح ہی میں نے بازار سے بریف کیس خریدا اور اس میں 5 لاکھ انڈین کرنسی ڈال کر بینک سے نیپالی روپوں میں تبدیل کروائی۔ اس کے عوض مجھے 5 لاکھ پچاس ہزار نیپالی روپے ملے۔ ایمبیسی پہنچا تو وہاں مہاجروں کا ایک ہجوم تھا ان کے 10 نمائندوں نے انہیں فہرست کے مطابق ترتیب سے بٹھایا ہوا تھا۔ میں پہلے سیدھا سفیر کے کمرے میں گیا۔

(جاری ہے)

غازی

''میں حکمران پارٹی سے تعلق رکھتا ہوں۔ پاکستان میں تمہیں دیکھ لوں گا''سفیر نے اپنے ترکش کا آخری تیر چھوڑا۔'' میں عوام سے تعلق رکھتا ہوں اور تمہیں پاکستان میں ہی نہیں بلکہ یہیں دیکھنے اور سبق سکھانے کا اہل ہوں''میرے اس جواب سے سفیر صاحب نے حوصلہ بالکل ہی چھوڑ دیا۔ اونچی آواز میں ہماری گفتگو اور نمائندوں کی آواز احاطے سے باہر کھڑے ہزاروں مہاجروں تک صاف پہنچ رہی تھی۔ چار فٹ اونچی چار دیواری کے اندر کیا ہو رہا تھا۔ اسے بھی باہر کھڑے مہاجر دیکھ رہے تھے ان میں بے چینی بڑھ رہی تھی۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں جذبات کی رو میں بہہ کر یہ مہاجر سفارت خانے پر دھاوا ہی نہ بول دیں اور سفیر کی وزارت خارجہ کی بھیجی گئی رپورٹ اور اندیشہ سچ ثابت ہی نہ ہو جائے۔

میں نے نمائندوں اور ملٹری اتاشی کو ساتھ لیا اور چار دیواری کے اندر سے ہم نے باہر کھڑے مہاجروں کو پہلے اشاروں اور پھر باتوں سے خاموش ہونے کی تلقین کی۔ وہ ذرا ٹھنڈے ہوئے تو میں نے کہا'' خدارا دنیا کو تماشہ نہ دکھائیں۔ آپ کے ساتھ جو بھی زیادتیاں ہوئی ہیں وہ بجا سہی لیکن یہ ہمارا اندرونی معاملہ ہے۔ گرد ونواح میں دنیا بھر کے سفارت خانے ہیں۔ وہ ہماری ایک ایک بات کی تفصیلی رپورٹ اپنے ممالک کو بھیجیں گے اور ہم جگ ہنسائی کا موجب بنیں گے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ آپ کے ساتھ ناانصافی اور دھاندلی نہ ہوگی''۔ میری اس مختصر سی تقریر سے سب خاموش ہو گئے۔ میں نے ملٹری اتاشی سے جو کرنل تھے اور سفارت خانے کے افسران کی دھاندلیوں سے خاصے نالاں دکھائی دیتے تھے کہاں کہ وہ امدادی رقوم کی تقسیم کے دوران ہمارے ساتھ رہیں۔ اللہ کے بعد اب افواج پاکستان پر ہی بچے کھچے پاکستان کی سالمیت کا انحصار ہے۔ شکست کھانے کے باوجود پاکستانی عوام کو آپ پر مکمل اعتماد ہے۔ قصہ کوتاہ ہم نے کرسیاں اور میز وہیں رہنے دیئے اور ملٹری اتاچی کی موجودگی میں فہرستوں کے مطابق ایک ہزار روپیہ فی کنبہ ادائیگی شروع کی۔ ادائیگی اتنے سلجھے ہوئے اور منظم انداز میں ہوئی کہ روپیہ کم پڑنے لگا۔ بینکوں کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ میں ٹیکسی لے کر بھاگم بھاگ ہوٹل پہنچا اور مزید دس لاکھ بھارتی کرنسی لے کر ایمبیسی پہنچا۔ بھارتی اور نیپالی کرنسی کا ایکسچینج ریٹ مجھے صبح ہی معلوم ہو چکا تھا میں نے بقیہ مہاجروں کو سو روپیہ بھارتی کرنسی میں دینا شروع کیا اور دو روز میں ہم نے چودہ سو سے زائد کنبوں میں روپیہ تقسیم کیا اس کے علاوہ میں نے ملٹری اتاشی کے توسط سے نیپالی بازاروں میں بکے ہوئے کمبل واپس لینے کی کوشش کی ہمیں بمشکل چار ہزار کمبل بکنے والے ریٹ پر واپس ملے۔ میں نے دو ہزار مزید کمبل بازار سے خریدے اور سارے کمبل مہاجروں میں تقسیم کر دیئے۔ بیمار مہاجروں کیلئے 6 نیپالی ڈاکٹروں نے معاہدہ کیا کہ وہ مریض کی حالت کے مطابق کلینک یا گھر جا کر ان کا علاج کریں گے اور دو کیمسٹ اور ڈرگ اسٹورز میں ایڈوانس رقم جمع کروا دی کہ ڈاکٹروں کی Prescription اور مہاجروں کے رجسٹریشن نمبر نوٹ کر کے دوا فراہم کی جائے۔ میں نے سارا روپیہ اس لئے تقسیم نہ کیا کہ مجھے اور ان مہاجروں کو نامعلوم کتنا عرصہ نیپال میں گزارنا تھا اور اس دوران روپے کی ہمیں کتنی اور کب ضرورت پڑ جائے اس کا علم نہ تھا۔

سفیر صاحب نے میرے متعلق کیسی کیسی رپورٹیں اپنے محکمے اور اپنے پارٹی لیڈروں کو بھیجیں۔ یہ تو معلوم نہ ہو سکا لیکن پاکستان واپس آنے پر اور کچھ عرصے بعد محکمے سے علیحدگی پر مجھے احساس ہوا کہ مجھ پر نیپال میں'' اپنے جرائم'' کی سزا کی وجہ سے ہر قسم کی ملازمت کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے خفیہ والوں نے میری مستقل نگرانی شروع کر دی اور مجھے بلاوجہ تنگ کیا جانے لگا تھا یہ سب اس محبوب اور ہر دلعزیز لیڈر کے دور حکومت میں ہوا جو پاکستان کو دولخت کرنے کا ذمہ دار تھا جو قوم کو جھوٹے نعروں سے بہلا کر حکمران ہی نہیں بلکہ پہلا سول مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بنا۔ مجھے دو برس تک ملک کے باہر جانے کی اجازت نہ ملی۔ میرے محکمے نے اپنے وسائل اور حدود سے بڑھ کر میری مدد کی اور 78ء کے اواخر میں بے حد کوشش کے بعد مجھے پاسپورٹ ایشو کیا گیا۔

اس مصروفیت میں تین روز گزر گئے۔ مہاجروں کے روپ میں 8 مکتی باہنی والے میرے دل و دماغ میں کیلوں کی طرح ٹھکے ہوئے تھے میں اکیلا انہیں ختم نہ کر سکتا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے نذیر کو دہلی فون کیا۔ میری آواز سن کر وہ خوشی سے پاگل ہو رہا تھا۔ میں نے اس سے ساتھیوں عارف اور لڑکوں کی خیریت دریافت کی۔ اس نے بتایا کہ سب ٹھیک اور خوش خرم ہیں۔ میں نے اسے کہا کہ عارف کو بلا لائے میں آدھے گھنٹے میں دوبارہ فون کروں گا۔

نذیر نے مجھے بتایا تھا کہ نیا گروپ لیڈر آ چکا ہے اسی لئے میں نے باوجود بے انتہا خواہش کے ساتھیوں سے بات کرنا مناسب نہ سمجھا کہ مبادا نیا گروپ لیڈر ساتھیوں سے میرے رابطے کو اپنے کام میں مداخلت سمجھے اسی لئے میں نے ان کی خیریت دریافت کی تھی ٹھیک آدھ گھنٹے بعد کھٹمنڈو سے انتہائی اہم فون کال پر دہلی سے دوبارہ رابطہ ہوا تو نذیر کے ساتھ عارف بھی موجود تھا میں کھلے طور پر انہیں یہاں کے حالات اور اپنی ضرورت کے بارے میں بتا نہیں سکتا تھا۔ ڈھکے چھپے الفاظ میں انہیں کہا کہ یہاں کھٹمنڈو میں اکیلا بہت بور ہو رہا ہوں اور دوستوں سے ملنے کی بہت خواہش ہے۔ آپ قیصر (اب بشیر مرحوم کی گیرج کے انچارج اور گورکھپور کے مشن کے انتہائی اہم کردار) کو کہیں اپنے تین چار ساتھیوں سمیت فوراً کھٹمنڈو آ جائے اور پوری تیاری سے آئے۔ یہاں بہت سردی ہے ان کی آمد سے ماحول گرم ہو جائے گا۔ عارف میرا مطلب سمجھ چکا تھا اس نے جواب دیا کہ کل صبح ہی وہ قیصر سے ملے گا اور انشاءاللہ اگلے روز تمہارے دوست کھٹمنڈو کیلئے روانہ ہو جائیں گے۔ اس نے مجھے کل اسی وقت دوبارہ فون کرنے کو کہا۔ میں نے انہیں پھر اپنے سابقہ ساتھیوں کو میرا اسلام کہنے اور Compartmentation کی وجہ سے فون پر گفتگو نہ کرنے کی وجہ سے معذرت کی۔ اگلے روز شام کو جب میں نے دہلی فون کیا تو قیصر بھی موجود تھا۔ قیصر نے بتایا کہ کل صبح ہی وہ اپنے چار ساتھیوں سمیت بذریعہ ٹرین کھٹمنڈو کیلئے روانہ ہو رہا ہے۔ جہاز سے اس لئے نہیں آ رہے کہ کھٹمنڈو کی سردی کی وجہ سے پوری تیاری سے آنا ہے۔ بین السطور گفتگو سے ہم نے ایک دوسرے کو وضاحت سے سب باتیں سمجھا دی تھیں۔

دہلی میں قیصر سے بات ہونے کے پانچویں روز شام کو قیصر اپنے چار ساتھیوں سمیت کھٹمنڈو پہنچا۔ ہم یوں گلے ملے جیسے برسوں کے بچھڑے بھائی اچانک ملتے ہیں۔ میں ان سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن مسلسل سفر سے تھکاوٹ کے آثار ان کے چہروں پر نمایاں تھے۔ میں نے ان کیلئے اناپورنا ہوٹل کے قریب ہی ایک اعلیٰ درجے کے ٹورسٹ ہوٹل میں کمرے بک کروائے تھے۔ انہیں ہوٹل میں چھوڑ کر میں واپس آ گیا اور مفصل گفتگو اگلے روز دوپہر کے کھانے کے دوران کرنے کا فیصلہ کیا۔ شام کو حسب معمول محسن آ گیا۔ میں اسے بھی اپنے Cofidence (اعتماد) میں لینا چاہتا تھا۔ چھوٹا شہر، بادشاہ کی رہائش اور دارالحکومت ہونے کے باعث کھٹمنڈو کی پولیس ہر نووارد پر کڑی نگاہ رکھتی تھی۔ محسن چونکہ کئی ماہ سے یہاں مقیم تھا اس لئے اسے سب مہاجروں اور انکے روپ میں چھپے پاکستان دشمن عناصر کے متعلق معلومات حاصل کرنے اور ان تک رسائی میں نسبتاً کم دشواری تھی۔ میں نے محسن سے اس بارے میں بات کی تو وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ کہنے لگا'' آصف بھائی۔ اگر چہ جسمانی طور پر اب کمزور ہوں لیکن مکتی باہنی کے وحشی درندوں سے انتقام لینے کی خواہش اس شدت سے میرے دل میں ہے کہ موقعہ آنے پر آپ کو مجھ میں انشاءاللہ شیر جیسی طاقت دکھائی دے گی۔ (جاری ہے)

غازی

"میں نے محسن سے کہا کہ مکتی باہنی کے آٹھ آدمی یہاں مہاجروں کے روپ میں موجود ہیں۔ وہ اکیلے رہتے اور مہاجروں کو مالی لالچ کے دھوکے میں پھنسا کر پاکستان کے مفاد کے خلاف کام کرنے کی تربیت دیتے ہیں۔

میرے پاس ایک فہرست ہے لیکن اس میں ایسے لوگوں کی زیادہ تعداد درج ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی بے گناہ مہاجر مسلمان مارا جائے۔ میں اس لسٹ میں درج تمام لوگوں کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے اس لسٹ میں درج لوگوں میں بے گناہ بھی ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے علاوہ بھی مکتی باہنی کے کچھ لوگ یہاں موجود ہوں جن کے نام لسٹ میں نہ ہوں۔ محسن میری تمام گفتگو کے دوران خاموش رہا۔ مشرقی پاکستان میں اس پر توڑے گئے ظلم و ستم کے بدلے کی خواہش اس کی آنکھوں کی سرخی سے صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ کہنے لگا" آپ کو تو یہاں آئے چند روز ہی گزرے ہیں جبکہ میں مہینوں سے یہاں مقیم ہوں۔ اس دوران میں بھی یہاں پاکستان کے دشمنوں کی کھوج میں رہا ہوں۔ مجھے جن کا پتہ چلا ہے، ان کے نام، پتے اور دیگر کوائف مجھے ازبر ہیں۔ آپ اپنی لسٹ نکالیں اور مجھے نہ دکھائیں۔ میں نام لیتا جاؤں گا اور آپ دیکھیں کہ آپ کی لسٹ میں ان کے نام ہیں یا نہیں۔

میں نے لسٹ نکالی۔ محسن میرے سامنے ہی صوفے پر بیٹھا تھا۔ وہ ایک ایک کر کے نام لینے لگا۔ میں حیران تھا کہ اس کے بتائے ہوئے تمام نام لسٹ میں موجود تھے۔ لسٹ کے سارے نام ختم ہو گئے لیکن وہ نہ رکا۔ میں نے ایک علیحدہ کاغذ پر وہ سب نام اور پتے لکھ لئے۔ یہ ان مہاجروں کے نام تھے جنہیں مکتی باہنی والے Plant کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ محسن نے بتایا کہ ان میں سے 3 مہاجر اپنی فیملی یہیں چھوڑ کر پاکستان جا چکے ہیں اور ان سے یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ جب وہ پاکستان سے مطلوبہ معلومات کھٹمنڈو بھیج دیں گے تو ان کی فیملی کو بھی پاکستان بھیج دیا جائے گا۔ میں نے محسن کو ٹوکا اور سوال کیا کہ پاکستان بھیجنے کے تمام انتظام جانے والوں کی لسٹیں اور شیڈول تو پاکستانی سفارت خانے کے ہاتھ میں ہے۔ پھر مکتی باہنی کے یہ ایجنٹ اپنی مرضی سے کیونکر پوری فیملی میں سے ایک فرد کو پاکستان بھجواتے اور بقیہ فیملی کو رکوا سکتے ہیں۔ محسن ہنس پڑا اور کہنے لگا۔" آصف بھائی۔ سب کچھ ممکن ہے۔ ایمبیسی میں دس ہزار روپے دے کر اگلے روز جانے والی فلائٹ پر جانے والوں کی فہرست سے کسی کا بھی نام کٹوا کر اپنا نام لکھوایا جا سکتا ہے اور اسی طریقے سے میرے بتائے تینوں مہاجر پاکستان جا چکے ہیں' میرا اگلا سوال تھا کہ جب دس ہزار سے کہیں کم روپوں میں نیپال سے بینکاک اور پھر کراچی پہنچا جا سکتا ہے۔ پھر ان مہاجروں کو افغان ایئر سے ہی کیوں بھیجا گیا۔ میں نے سوال تو کر دیا لیکن فوراً ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ افغان ایئر کے جہاز UNO نے مہاجروں کیلئے چارٹر کئے تھے۔ ان پر جانے والوں کو پاسپورٹ کی ضرورت نہ تھی جبکہ کسی دوسری ایئر لائن اور کسی دوسرے روٹ سے پاکستان جانے کے لئے پاسپورٹ لازمی تھا اور سفارت خانہ ملکی پالیسی کے تحت پاسپورٹ ایشو نہیں کرتا تھا۔

مجھے محسن پر پورا بھروسہ تھا لیکن جب تک میں اسے عملی طور پر کام سرانجام دیتے دیکھ نہ لیتا میں اسے دلی سے آئے ہوئے لڑکوں سے ملوانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی وجہ وہ خوف اور بے اعتباری تھی جو پاکستانی کوریئر کی غداری کے سبب میری گرفتاری کا موجب بنی۔ میں نے محسن سے پوچھا اگر میں اس کے ہمراہ رہوں تو کیا وہ ان مکتی باہنی والوں میں سے کسی ایک کو انجام تک پہنچانے کو تیار ہے؟ محسن کہنے لگا" آصف بھائی ایک تو کیا میں ان سب کو عبرتناک طریقے سے ہلاک کرنے کو تیار ہوں۔ کھکھڑی سے وار کرنے کی میں نے یہاں کافی پریکٹس کر لی ہے۔ میں نے بہت پہلے ہی انہیں ٹھکانے لگا دیا ہوتا لیکن اپنی جسمانی کمزوری کی وجہ سے یہ کام نہ کر سکا آپ ساتھ ہوں اور اگر میں کہیں کمزور پڑ جاؤں تو میری مدد کریں تو یہ کام بلا توقف کرنے کو تیار ہوں۔ میں نے محسن کو اچھی طرح ٹھونک بجا کر اسے آئندہ رات 8 بجے اپنی کھکھڑی ساتھ لانے اور اپنا پہلا شکار خود منتخب کرنے کا کہہ کر رخصت کر دیا۔

دوسرے روز دوپہر کو میں ٹورسٹ ہوٹل گیا۔ قیصر اور چاروں لڑکے میرے انتظار میں تھے۔ کھانے کے بعد ہم سب قیصر کے کمرے میں گئے اور وہاں میٹنگ شروع ہوئی۔ میں نے انہیں یہاں کے تمام حالات تفصیلاً بتا کر کہا کہ مکتی باہنی کے آٹھ آدمی یہاں پوری آزادی سے اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ انہیں ٹھکانے لگانا ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ ایک بہاری مہاجر بھی ہمارے ساتھ اس کام میں شریک ہو گا اور پہلا شکار وہی کرے گا۔ لڑکے اپنے ساتھ ریوالور، پستول اور بڑے چاقو لائے تھے۔ میں نے انہیں کہا یہاں صرف چاقو استعمال کئے جائیں کیونکہ بارودی اسلحہ کی آواز سے ہمسائے فوراً بیدار ہو جائیں گے۔ میں نے انہیں کہا کہ اگر ہم نے ہر روز ایک دو شکار کئے تو پولیس چوکنا ہو جائے گی۔ اس لئے ایسا پروگرام بنانا چاہئے کہ ایک رات میں ہی سب کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔ پولیس کے علاوہ چونکہ مکتی باہنی والوں کا بھی آپس میں رابطہ ہے۔ اس لئے اگر ہر روز ان کی ایک یا دو لاشیں گرنے لگیں تو باقی خوفزدہ ہو کر غائب ہو جائیں گے اور مشن ادھورا رہ جائے گا۔ بالآخر فیصلہ یہ ہوا کہ اس رات کے مشن کو جسے محسن نے سرانجام دینا تھا، ملتوی کر دیا جائے۔ آج رات محسن سب کے گھر اور اگر ممکن ہو تو ان کی شکلیں دکھلا دے اور لڑکے ان گھروں سے بھاگ نکلنے کے محفوظ رستے بھی دیکھ لیں۔ مکتی باہنی والوں کے ٹائمنگ بھی نوٹ کی جائے کہ کب وہ اپنی محفلیں برخواست کرتے ہیں اور جب سب تیاریاں مکمل ہو جائیں تو محسن کو ملا کر 6 افراد کے دو گروپ بنائے جائیں اور ایک رات میں ہی دونوں گروپ مشن مکمل کر لیں۔ میں دونوں گروپوں کی نگرانی کروں اور اگر ضرورت محسوس ہو تو اسلحہ استعمال کروں۔ پہلا گروپ رات 9 بجے اپنا کام شروع کرے گا جبکہ دوسرا گروپ اس کی نگرانی کرے گا۔ پہلے گروپ کے کام ختم کرتے ہی دوسرا گروپ اپنے ٹارگٹس کو جائے گا جبکہ پہلا گروپ اس کی نگرانی کرے گا۔ سب لازماً دستانے پہنیں گے اور کام کے بعد اپنے چاقو ایک تھیلے میں ڈال کر مجھے دیں گے۔ جنہیں میں شہر سے باہر کسی پہاڑی کھوہ میں پھینک دوں گا۔ ان سے تمام تفصیلات طے کر کے میں اپنے ہوٹل چلا آیا اور لڑکے دو دو ٹولیوں میں شہر کی سیر کو نکل گئے۔ قیصر مجھ سے تنہائی میں کوئی بات کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے میں اسے اپنے ہمراہ ہوٹل میں لے آیا۔

ہوٹل کے کمرے میں آ کر میں نے کافی کا آرڈر دیا اور قیصر سے دہلی کے حالات پوچھے۔ اس نے بتایا کہ لڑکوں کی سرگرمیاں اور جوش بالکل ختم ہو کے رہ گئے ہیں۔ گیرج میں جہاں بلا ناغہ ہر شام لڑکے اکٹھے ہوتے تھے۔ اب کبھی کبھار ہی آتے ہیں اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے چلے جاتے ہیں۔ میں نے وجہ پوچھی تو پہلے وہ جواب دینے سے کترانے لگا لیکن میرے زور دینے سے آخر وہ پھٹ پڑا۔" کیا کہوں" آپ نے جس محبت اور جذبے سے سب کو اکٹھا کیا اور تربیت دی تھی وہ اب سرے سے مفقود ہے۔ آپ کے جانے کے بعد جب تک حبیب گروپ لیڈر رہا۔ وہ ہم سے بالکل آپ کی طرح گھل مل کر رہتا تھا ہمیں آپ کی کمی ضرور محسوس ہوتی تھی لیکن اس نے ہمارے جذبے، جرات اور ولولے میں کوئی فرق نہ آنے دیا لیکن جب سے نیا گروپ لیڈر آیا ہے۔ اس کے رویے سے حالات بالکل بدل گئے ہیں اس نے حبیب اور دوسرے ساتھیوں کو ہم سے ملنے سے روک دیا ہے اس نے اپنی رہائش بھی نذیر صاحب کے ہاں باقی ساتھیوں کے ہمراہ رکھی ہے ہم پہلے کی طرح جب بھی حبیب اور دوسرے ساتھیوں سے ملنے گئے وہ بڑی رکھائی سے پیش آیا۔

(جاری ہے)

غازی

اس کے رویے سے لڑکے بہت بددل ہو چکے ہیں یہ سب کچھ بتا کر قیصر نے مجھے نذیر کا خط دیا۔ نذیر نے لکھا تھا کہ وہ اپنی جوان بچیوں کے ہمراہ گھر میں رہتا ہے۔ یہ معلوم ہونے کے بعد بھی کہ آپ لوگ کون تھے اور دہلی میں کیا کر رہے تھے اس نے ہر طرح کا خطرہ مول لیا اور اپنے گھر کو آپ کیلئے پناہ گاہ بنا دیا لیکن آخر کب تک وہ اور اس کے گھر والے خوف و دہشت کی حالت میں رہیں گے۔ میری گرفتاری کے دوران اور فرار کے بعد انہیں ہر دم یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ نجانے کس وقت فوج اور پولیس والے دھاوا بول دیں۔ میرے بمبئی جانے کے بعد اس نے حبیب کو اپنے خدشات بتائے تو اس نے نئے گروپ لیڈر کے آنے تک کی مہلت مانگ لی۔ نیا گروپ لیڈر آ گیا تو اس سے بات کی اور اسے سرائے بیرم خان میں ایک متبادل جگہ بھی دکھائی لیکن ابھی تک انہوں نے گھر خالی نہیں کیا۔ نذیر نے بڑے درد بھرے انداز میں لکھا تھا کہ مسلمان ہونے کے ناطے اس نے اتنا بڑا خطرہ مول لیا لیکن اب اس بات کا انتظار کیا جا رہا ہے کہ کب بھارتی ہندو فوجی اس کی بیٹیوں کی رسوائی کریں۔ نذیر نے خط کے آخر میں لکھا تھا ”خدارا ہمیں اس اذیت سے نجات دلانے کی کوئی تدبیر کریں اور ہمیں اس ”جرم“ کی سزا نہ دیں کہ ہم نے اپنے مسلمان بھائیوں کو بے پناہ خطرات کے باوجود پناہ دی“ خط پڑھ کر میں نے قیصر کی طرف بڑھا دیا۔ وہ میرے چہرے سے تاثرات کا اندازہ لگا رہا تھا کہنے لگا ”نذیر نے یہ خط مجھے پڑھا کر ہی لفافے میں بند کیا تھا۔ ہم نے حبیب سے بھی یہاں آنے سے پہلے اس مسئلے پر بات کی تھی۔

وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی مجبور ہے۔ ڈاک کا پیکٹ گروپ لیڈر اپنے سامنے بند کرواتا ہے۔ اسی گھر میں رہنے کی وجہ سے ٹرانسمیٹر پر مختصر پیغام بھی اسی کی موجودگی میں بھیجا جاتا ہے نذیر نے آپ کو یہ خط اپنی آخری کوشش سمجھتے ہوئے بھیجا ہے۔ اگر جلد ہی کوئی مثبت جواب نہ ملا تو پھر ہم گیرج والے اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔ ہمارے متعلق تو آپ جانتے ہیں کہ ہم نے کبھی اپنی جان کی پرواہ نہیں کی۔ پاکستان کی خاطر اگر ہم فوج اور DMI والوں سے بھڑ سکتے ہیں تو اپنی بہنوں کی عزت بچانے کیلئے ایک لاوارث پاکستانی جاسوس کو ٹھکانے لگانا ہمارے لئے بچوں کا کھیل ہوگا۔

میں نے اسے تسلی دی اور یقین دلایا کہ میں اپنی پوری کوشش کروں گا کہ یہ مسئلہ جلد از جلد سلجھ جائے۔ تین روز بعد میں نے پاکستان جانے والی ڈاک میں اپنے تھیلے میں نذیر کا خط اور قیصر کے ارادوں کے متعلق تفصیلاً لکھ کر بھیجا۔ نتیجتاً اس گروپ لیڈر کو واپس بلا کر حبیب کو گروپ لیڈر بنا دیا گیا۔ جس نے سرائے بیرم خان میں شفٹ ہو کر دہلی میں بنائے ہوئے ہمدرد جانثاروں کے نیٹ ورک کو بکھرنے سے بچا لیا۔ یہ تفصیلات مجھے بعد میں قیصر اور نذیر کے خطوط سے ملیں جن سے کھٹمنڈو قیام کے دوران میں نے مستقل رابطہ رکھا۔

آئندہ تین روز ہم سب نے محسن کی رہنمائی میں مکتی باہنی والوں کی نگرانی، ان کے گھروں سے باہر جانے اور واپس لوٹنے اور ان کی محفلوں کے ختم ہونے کے اوقات اور مشن کی تکمیل کے بعد واپس لوٹنے کے راستوں کے تعین میں گزارے۔ ہم نے بازار سے دستانے اور جیبی ٹارچیں بھی خرید لیں۔ دستانے تو ہاتھوں کے نشان نہ پڑنے کیلئے تھے۔ جوتوں کے نشان پڑنے کی ہمیں کوئی فکر نہ تھی کیونکہ کھٹمنڈو کی ساری زمین پتھریلی تھی۔ میں نے شیر پنجاب ریسٹورنٹ کے مالک سردار جی سے ان کی گاڑی بھی مانگ لی تھی۔ غرضیکہ سب تیاریاں مکمل تھیں۔ ہمیں اب صرف ایکشن کی رات کا تعین کرنا باقی تھا کہ اچانک ایک مسئلہ سامنے آ گیا جس کی طرف میں نے پہلے توجہ نہ دی تھی۔ کھٹمنڈو کے ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤسز میں ننانوے فیصد غیر نیپالی ہی قیام کرتے تھے جن میں سے بیشتر یورپین، امریکی اور خال خال جاپانی ہوتے تھے یہ ٹورسٹ اکثر کھٹمنڈو کے اطراف کے پہاڑوں پر HIKING (چڑھنے) کیلئے علی الصبح نکل جاتے۔ کھٹمنڈو اور اطراف کے دیہاتوں کے وارداتیے ان کی تاک میں رہتے تھے اور جونہی کوئی ان کے ہاتھ چڑھتا تو ان کے پیسے، گھڑی اور کمپاس تک چھین لیتے اور ذرا سی مزاحمت پر کھکھری کے وار سے ہلاک کر کے گہری کھائیوں میں پھینک دیتے تھے۔ جب ایسی وارداتوں میں اضافہ ہو گیا تو حکومت نے ہوٹل اور گیسٹ ہاؤسز والوں کو پابند کیا کہ ہر رات 9 بجے مہمانوں کی واپسی کی رپورٹ بنا کر پولیس کو بھیجیں۔ سردیوں میں ویسے بھی کھٹمنڈو رات آٹھ بجے ہی ویران ہو جاتا تھا۔ ہمارا مسئلہ یہ تھا کہ ہمارا مشن رات 8 بجے کے بعد شروع ہو کر معلوم کب تک جاری رہتا۔ ایک ہی رات میں آٹھ ”مہاجروں“ کے کھٹمنڈو جیسے پرامن شہر میں قتل ہونے کی خبر نہ صرف کھٹمنڈو بلکہ پورے نیپال کی پولیس کو ہلا کر رکھ دیتی۔ ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤسز کی اس رات کی رپورٹ کے مطابق جو مہمان اس رات 9 بجے تک واپس نہ آئے ہوتے وہ پولیس کی نظر میں ضرور مشتبہ بن جاتے۔ پولیس اگر ذرا بھی ہوشیاری دکھاتی تو تان لڑکوں اور بالآخر مجھ پر ان کی ٹوٹتی۔ میں پہلے ہی مہاجروں میں ”بلا وجہ“ روپے تقسیم کرنے سے موضوع گفتگو بن چکا تھا۔ شیر پنجاب کے مالک سردار جی کی طرح نا معلوم کتنے ہی لوگ بھارتی اخباروں نے میری تصاویر اور خبریں پڑھ کر میری اصلیت جان چکے تھے۔ بھارتی سفارت خانے میں یقیناً میرے متعلق اطلاعات موجود تھیں۔ نیپالی پولیس کو میری اصلیت کا پتہ چل جاتا تو بھارت کے ساتھ معاہدے کے مطابق مجھے پابند سلاسل کر کے بھارت کے حوالے کر دیا جاتا اور میرے ساتھ قیصر اور لڑکے بھی مارے جاتے۔

یہ مسئلہ سامنے آیا تو ہم نے عارضی طور پر مشن ملتوی کر دیا۔ میرا ہوٹل وسیع رقبے پر پھیلا ہوا اور دو منزلہ تھا۔ میں اپنے کمرے کی عقبی کھڑکی سے رسے کے ذریعے بآسانی اتر سکتا تھا اور شام کو واپسی کے اندراج کے بعد کھڑکی سے اتر کر اندھیرے میں غائب ہو سکتا تھا۔ میں نے ہوٹل کے چاروں طرف گھوم کر اچھی طرح سے جائزہ لیا۔ میرے فلور پر جتنے کمرے تھے ان کی عقبی کھڑکیاں میرے کمرے کی کھڑکی کی طرح ہمارے کام کیلئے موزوں تھیں۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر میں نے قیصر سے مشورہ کیا اور اگلے دن یہ پانچوں اناپورنا ہوٹل میں CHECK-IN ہو گئے۔ اب دوسرا مسئلہ ہمارے سامنے یہ تھا کہ ہوٹل سے نکلتے وقت سارے ہوٹل کی بجلی بند کی جائے ہوٹل کی بلڈنگ کے علاوہ اس کے دونوں لانوں (LAWNS) میں نیلگوں روشنی کے گارڈن لیمپس تھے۔ ان کی روشنی میں ہوٹل کے گارڈز ہمیں کھڑکیوں سے اترتے ہوئے ضرور دیکھ لیتے۔ بجلی گل ہونے کے باعث ایک تو اندھیرا ہو جاتا دوسرا گارڈز نے فطری طور پر مرکزی بلڈنگ کے مین گیٹ کی طرف متوجہ ہو جانا تھا اور ہمیں نکل بھاگنے کا بآسانی موقع مل جاتا۔ اب ہمیں ہوٹل کے سوئچ روم کی تلاش تھی جو ہمیں جلد ہی مل گیا۔ لابی کے آخری کونے میں واش روم کے ساتھ بغیر دروازوں کے ایک کمرہ نما جگہ میں دیوار پر تین بڑے مین سوئچ لگے ہوئے تھے۔ دن کے وقت سوئچ آن اور ایک آف رہتا تھا۔ آف سوئچ یقیناً ہوٹل کی بیرونی لائٹیں اور لان کی بتیوں کا تھا جبکہ دوسرے دو سوئچ دونوں فلورز کے تھے۔ قیصر نے لابی میں ٹہلنا شروع کر دیا جبکہ چاروں لڑکے ایسی مختلف جگہوں پر کھڑے ہو گئے جہاں سے قیصر کو اشاروں سے پیغام دیا جا سکے۔ میں نے ریسپشن پر جا کر ان سے نیپال کے مختلف بروشر مانگ کر انہیں اپنی طرف الجھا لیا۔ لابی میں بیٹھے چند لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کیلئے ایک لڑکا یکایک زور زور سے چلانے لگا کہ اس نے فرش پر بچھے کارپٹ کے اندر ایک سانپ کو گھستے دیکھا ہے۔ سب کی توجہ اس کی طرف مبذول ہوئی اور قیصر سوئچ روم میں داخل ہو گیا اور ایک منٹ کے اندر ہی باہر آ گیا ہم ابھی ”سانپ“ دیکھنے والے لڑکے سے سوال ہی کر رہے تھے کہ قیصر نے اشارہ کیا اور ہم ایک ایک کر کے باہر آ گئے۔ قیصر نے بتایا کہ اس نے بیرونی روشنی والے مین سوئچ کا ایک فیوز نکال لیا ہے اور بازار سے ویسے ہی دو فیوز خریدنے ہیں۔ باقی لڑکے واپس ہوٹل چلے گئے اور قیصر اور میں بازار سے ایک گھنٹے میں دو فیوز خرید لائے۔ قیصر نے موقع ملتے ہی سوئچ روم میں اصل فیوز لگا دیا اب ہم نے اپنے مشن کی باقی جزئیات پر سوچنا شروع کیا۔ چھوٹا شہر ہونے کے باعث کھٹمنڈو میں دہلی اور بمبئی کی نسبت مشن کامیابی سے پورا کرنا بہت زیادہ دشوار تھا۔ بجلی گل کرنے کا ذمہ قیصر نے لیا۔ ایک فیصلہ یہ ہوا کہ اگر ایک کمرہ گراؤنڈ فلور پر لے لیا جائے تو نہ تو ہم کو رسیوں کے ذریعے کھڑکیوں سے اترنا پڑے گا اور نہ ہی قیصر کو اندھیرے میں سوئچ روم میں اپنی کارروائی کر کے اوپر اپنے کمرے تک جانے اور پھر کھڑکی کے ذریعے اترنے میں وقت ضائع کرنے کی ضرورت ہوگی۔ شام کو محسن آیا تو میری ہدایت پر وہ اپنے گھر گیا اور نئے کپڑوں سے بھرا اپنا سوٹ کیس لے کر ہوٹل میں آ کر گراؤنڈ فلور میں ایک کمرہ لے لیا۔ اگلے روز ہم بازار گئے اور میں نے سب کیلئے خاکی رنگ کے اوورکوٹ خریدے جیسے کھٹمنڈو کی پولیس سردیوں میں پہنتی ہے۔ قیصر نے نیپالی روپے کے چوتھائی اور آدھی قیمت کے (ہمارے 25 اور 50 پیسے جیسے) کئی سکے لئے۔ میں شام کو شیر پنجاب ریسٹورنٹ گیا اور سردار جی کی گاڑی لے آیا۔ اب ہم مشن کیلئے پوری طرح سے تیار تھے اور ہمیں آج رات ہی اسے سرانجام دینا تھا۔

ہم نے اپنے آپریشن کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ پہلا حصہ ہوٹل کی تمام روشنیاں گل کرنا اور ہوٹل سے نکلنا۔ دوسرا حصہ دو ٹولوں میں تقسیم دو گروپوں کا مکتی باہنی والوں کو ٹھکانے لگانا اور تیسرا کسی کی نظروں میں آئے بغیر ہوٹل میں داخل ہونا تھا۔ آپریشن شروع کرنے کا وقت 2200HRS یعنی رات 10 بجے رکھا گیا پونے دس بجے ماسوا ایک لڑکے کے جس نے اپنے کمرے سے اوپر کے فلور کی لائٹ اڑانی تھی۔ باقی سب نے اپنی مکمل تیاری کے ساتھ محسن کے کمرے میں اکٹھے ہونا اور تمام لائٹس اڑانے کے بعد اسی کمرے کی کھڑکی سے باہر نکلنا تھا۔

(جاری ہے)

غازی

سردار جی نے ان کی طرف سے مطمئن ہو کر داد طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اشارے سے انہیں باہر چلنے کا کہا۔ سردار جی نے ملازموں کو سب کیلئے چائے بنانے اور کیک لانے کا کہا اور خود میرے اور قیصر کے ہمراہ باہر آ گئے۔ باہر آ کر قیصر نے سرگوشی میں مجھے کہا کہ سب کام بخوبی مکمل ہو گیا ہے اور چاقوؤں کا تھیلا گاڑی کے پچھلے پائیدان میں پڑا ہے۔ اسی میں سب کے دستانے بھی ہیں کیونکہ کئی دستانوں پر خون کے داغ لگ چکے ہیں میں نے قیصر کو واپس ریسٹورنٹ میں بھیجا اور سردار جی کو لے کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سردار جی کو میں نے کہا کہ اس طرف گاڑی لے چلیں جہاں گہری کھائیاں ہوں۔ سردار جی کو اصل واقعے کا علم نہ تھا۔ وہ گاڑی چلاتے ہوئے ہنستے ہوئے کہنے لگے۔ ''کہو جی کیسی ایکٹنگ کی۔ سب ڈر گئے تھے نا!''۔ میں نے بھرپور داد دی اور کہا کہ آپ کو تو فلموں میں کام کرنا چاہئے۔ سردار جی کے پوچھنے پر میں نے بتایا کہ کھائیوں میں کچھ پھینکنا ہے۔ کھائیوں میں، میں نے چاقو نکال کر الگ الگ دور دور پھینک دیئے۔ سردار جی نے جب خون آلود چاقو دیکھے تو ان کی ہنسی فوراً غائب ہو گئی۔ پوچھنے پر میں نے کہا کہ واپس ریسٹورنٹ میں جا کر بتاؤں گا۔

ہم ریسٹورنٹ میں پہنچے تو لڑکے اور محسن بجائے آرام کرنے کے چائے پینے اور خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کے قہقہے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی اور کھوکھلے تھے۔ محسن کی آواز ان میں سب سے نمایاں تھی اور اس کی وجہ بھی میں سمجھ چکا تھا۔ کسی بے ہتھیار انسان کو مارتے وقت قدرتی طور پر دل و دماغ پر بوجھ سا چھا جاتا ہے۔ انہوں نے ڈھائی گھنٹوں میں آٹھ مکتی باہنی والوں کو ہلاک کیا تھا جو سب کے سب قتل ہوتے وقت نہتے تھے۔ ان لڑکوں کے دل و دماغ پر جو اثر ہوا تھا وہ اسے اپنے قہقہوں سے زائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے انہیں سر کی جنبش سے بتا دیا کہ میں بھی اپنا کام مکمل کرا آیا ہوں۔ سردار جی سے میں نے کہا کہ میں گاڑی سے تھیلا لا کر کچن کے چولہوں میں جلاتا ہوں۔ آپ ملازموں کو کہیں کہ گاڑی کو اندر اور باہر سے اچھی طرح دھولیں۔ سردار جی کے حواس ابھی تک بحال نہیں ہوئے تھے۔ وہ گم سم سے میری ہر بات مانتے جا رہے تھے۔ تھیلے میں خون سے بھرے ہوئے دستانے تھے۔ میں نے چولہے میں ایک ایک کر کے دستانے ڈالے اور پھر تھیلا اور جب تک سب راکھ نہ بن گئے، میں وہاں سے نہ ہٹا۔ اس دوران سردار جی کے ملازموں نے گاڑی کو پانی کے پائپ سے اندر اور باہر سے دھو کر بالکل صاف کر دیا تھا۔ دو لڑکوں کے اوورکوٹس پر بھی خون کے دھبے لگے ہوئے تھے۔ ان دھبوں کو بھی لڑکوں نے دھو کر بالکل صاف کر دیا۔ ملازم میرے لئے اور سردار جی کیلئے بھی چائے لے آیا تھا۔ چائے پینے کے دوران سردار جی نے مجھ سے پھر پوچھنا چاہا۔ میں نے انہیں سرگوشی میں کہا کہ سب کے سامنے نہیں بلکہ کل دن کو آپ کو بتاؤں گا۔ صبح چار بجے میں نے سردار جی سے کہا کہ ہمیں اناپورنا ہوٹل کے قریب چھوڑ آئیں۔ ہم آٹھ بندے گاڑی میں ایک دوسرے کے اوپر ٹھس ٹھسا کر بیٹھے۔ ہوٹل کے قریب آنے پر میں نے گاڑی رکوائی اور سردار جی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انہیں دوبارہ تنبیہ کی کہ گزشتہ شام میرے آپ سے گاڑی لینے سے اب تک کی کسی بات کا ذکر کسی سے بھولے سے بھی نہ کریں۔ سردار جی کو ابھی تک رات کے آپریشن کی سنگینی کا علم نہ تھا۔ وہ خاموشی سے چلے گئے۔ ہوٹل کی باؤنڈری وال سے ہم نے اندر کا جائزہ لیا، اس وقت صبح کے ساڑھے چار بج رہے تھے اور سخت سردی اور اندھیرا تھا۔ ہم ایک ایک کر کے مین گیٹ سے ذرا پرے باؤنڈری وال سے کود کر ہوٹل کی حدود میں داخل ہوئے۔ پہرے دار بھی رات کی ڈیوٹی یا شاید سردی کی وجہ سے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ پھر بھی ہم چھپتے چھپاتے سنگل فائل میں محسن کے کمرے کی کھڑکی تک پہنچے اور خاموشی سے کمرے میں داخل ہو گئے۔ ہمارے جانے کے وقت اس کمرے کی لائٹ بھی چلی گئی تھی اب کمرہ پوری طرح سے روشن تھا۔

(جاری ہے)

غازی

سارے مہاجر بہت مشتعل ہیں اور سفارت خانے کے باہر نعرہ بازی کر رہے ہیں۔سفارت خانے نے مدد کیلئے پولیس بلوالی ہے۔ جس نے مہاجروں کو سفارت خانے سے باہر نکال کر سڑک کی دوسری طرف اور دائیں بائیں دھکیل دیا ہے۔مہاجر سفارت خانے پر تحفظ مہیا نہ کرنے اور بلاوجہ نیپال میں روکے رکھنے کے خلاف نعرہ بازی کر رہے تھے۔

اصل حقائق اور مہاجروں کے احتجاجی مظاہروں کا سن کر مجھے ایک انوکھی تجویز سوجھی۔مجھے یقین تھا کہ اگر میری تدبیر کارگر ہوئی تو مہاجروں کا احتجاجی مظاہرہ یکلخت الٹا رخ اختیار کرلے گا۔میں نے محسن کو کہا کہ وہ فوری طور پر کشمیری مسجد میں جائے جہاں بقول اس کے گزشتہ رات "شہید ہونے والے مہاجروں" کی تجہیز و تکفین کے انتظامات ہو رہے تھے اور نہایت چالاکی اور ہوشیاری سے یہ بات پھیلا دے کہ مرنے والے نہ تو مسلم تھے اور نہ مہاجر۔اس سے زیادہ کچھ نہ کہے اور مسجد کے قریب ہی میرا انتظار کرے۔

محسن کے جانے کے آدھ گھنٹہ بعد میں لڑکوں کو ہوٹل میں ٹھہرنے یا بازار کی سیر کرنے کا کہہ کر خود سائیکل رکشہ لے کر کشمیری مسجد کی طرف چل دیا۔کشمیری مسجد پہنچا تو دور ایک گوشے میں محسن کو کھڑے دیکھا۔اس نے بتایا کہ اس نے بات تو اچھی طرح پھیلا دی ہے لیکن لاشیں پوسٹ مارٹم نہ ہونے کے باعث ابھی یہاں نہیں پہنچی ہیں۔قریب تین ہزار مہاجران کے انتظار اور جنازہ پڑھنے کیلئے وہاں موجود تھے۔کھٹمنڈو میں کشمیری مسجد کا ہونا عجیب سی بات تھی درحقیقت تقریباً اسی برس پہلے کشمیر کا ایک تاجر خاندان ڈوگروں کے تشدد کے باعث کھٹمنڈو میں آکر آباد ہو گیا تھا۔رفتہ رفتہ اس خاندان کے باقی افراد اور کئی دوسرے کشمیری تاجر بھی کھٹمنڈو ہجرت کر گئے۔ یہاں ان کا کاروبار خوب چمکا اور وہ یہیں کے ہو لئے۔ان کشمیریوں کا کھٹمنڈو کے خاصے وسیع حصے میں اپنا محلّہ اور اپنی مسجد تھی۔یہ بلا تفریق قومیت اور وطن کے ہر مسلمان کی حتی المقدور مدد کرتے تھے۔مشرقی پاکستان کے مہاجروں میں ان کی سخاوت کا چرچا تھا اور آج انہوں نے ہی ان "لاوارث مسلمان مہاجروں" کی تجہیز و تکفین کے انتظامات کئے تھے۔ان میں سے چند معتبر مسجد کے قریب ہی اپنی کوٹھی کے لان میں بیٹھے تھے۔میں شکل و صورت سے بھی پٹھان یا کشمیری لگتا تھا۔میں لان میں ان کے پاس چلا گیا۔اگرچہ ہمارا پہلے کبھی تعارف یا آمنا سامنا نہیں ہوا تھا لیکن انہوں نے بڑے تپاک سے میرا خیر مقدم کیا۔میں نے انہیں بتایا کہ میں چٹاگانگ میں ملازم تھا۔بڑی مشکل سے کھٹمنڈو پہنچا ہوں اور اب پاکستان جانے کے انتظار میں ہوں چونکہ گزشتہ رات بہت بڑا واقعہ ہو چکا تھا۔اس لئے گفتگو کا موضوع جلد ہی اس طرف پھر گیا۔میں نے باتوں کے درمیان کہا کہ یہاں آکر میں نے ایک عجیب بات سنی ہے کہ مرنے والے غیر مسلم تھے۔وہ سب میری بات سن کر ہنسنے لگے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔میں نے کہا کہ بے شک یہ افواہ ہی ہو لیکن تصدیق کرنے میں کیا حرج ہے۔غرضیکہ میرے زور دینے پر اس بات پر رضامند ہو گئے کہ غسال کو کہہ دیں گے کہ میتوں کو غسل دیتے وقت اس افواہ کی اصلیت جانچیں۔میتیں آئیں تو مہاجروں میں جوش و خروش بہت بڑھ گیا۔یہاں بھی پاکستانی، سفارت خانے اور نیپالی پولیس کے خلاف نعرے بازی شروع ہو گئی۔دو غسال تھے۔دونوں نے بیک وقت دو میتوں کو غسل دینا شروع کیا۔غسل دیتے وقت یکے بعد دیگرے دونوں لاحول ولاقوۃ پڑھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔مہاجروں کے پوچھنے پر انہوں نے سرگوشی میں انہیں کچھ کہا۔مہاجروں کو ان کی بات پر یقین نہ آیا۔دو بزرگ اور معتبر مہاجروں نے خود تصدیق کی تو وہ بھی حیرت میں ڈوب گئے۔انہوں نے ساری میتوں کو دیکھا، اور اعلان کر دیا کہ یہ آٹھوں غیر مسلم تھے۔اب غسل دینا تو ایک طرف رہا میتوں کو ہندوؤں کے حوالے کرنے کی تدابیر ہونے لگیں۔میں نے ان دو بزرگ مہاجروں کو کہا کہ آپ میرے ہمراہ سفارت خانے چل کر وہاں مشتعل مہاجروں کو حقیقت حال سے آگاہ کریں ورنہ وہاں کے حالات خراب ہو جائیں گے۔وہ میرے ہمراہ فوراً کشمیری خاندان کی موٹر میں سفارت خانے پہنچے اور پولیس کے میگافون پر مہاجروں کو اصلیت بتائی۔ مشتعل مہاجر جو سفارت خانے پر حملہ کرنے کو تقریباً تیار تھے، اصل حقیقت جان کر ٹھنڈے ہوئے اور کشمیری مسجد کو چل دیئے تاکہ خود یہ تماشہ دیکھ سکیں۔اب یہ چہ مگوئیاں شروع ہو گئیں کہ مرنے والے کون تھے اور انہیں ہلاک کس نے کیا۔جتنے منہ تھے اتنی باتیں تھیں۔میرا مشن بخوبی مکمل ہو چکا تھا۔اب مجھے لڑکوں کو فوری نیپال سے باہر کرنا تھا چنانچہ میں اپنے ہوٹل چلا آیا۔

میں قیصر کے کمرے میں گیا اور اسے کہا کہ تمام لڑکوں کو یہیں بلا لے۔جب سب جمع ہو گئے تو میں نے انہیں آج کی ساری صورتحال بتائی اور کہا کہ نیپالی پولیس اب تک تو انہیں مہاجر سمجھی ہوئی تھی انہوں نے تفتیش کی محض خانہ پری کی لیکن پاکستان کے سفارتخانے کو بچانے کیلئے میں نے اصلیت ظاہر کر دی

(جاری ہے)

غازی

جس کے نتیجے میں اب نیپالی پولیس ان مقتول نام نہاد ہندو مہاجروں کی اصلیت جاننے کیلئے تفتیش کا دائرہ کار بڑھا دے گی۔ بھارتی سفارت خانہ بھی حرکت میں آ جائے گا اور ان مکتی باہنی والوں کو یہاں بھیجنے والے بھی خاموش نہیں بیٹھیں گے۔ ان حالات کے پیش نظر اب انہیں نیپال سے جلد از جلد چلا جانا چاہئے۔ میں نے قیصر سمیت تمام لڑکوں کو دس دس ہزار بھارتی کرنسی دی اس کے علاوہ ان کے سفر کے اخراجات اور کھٹمنڈو میں شاپنگ کیلئے دو دو ہزار روپے علیحدہ دیئے انہوں نے یہ رقم لینے سے پہلے تو انکار کیا لیکن میرے اصرار پر مان گئے۔ میں نے انہیں شاپنگ کرنے کیلئے بھیجا اور محسن کے ذریعے اگلے روز صبح پہلی بس پر بیر گنج کیلئے 6 سیٹیں بک کروالیں نذیر اور عارف کیلئے علیحدہ علیحدہ خط بھی قیصر کو دیئے۔ میں نے نذیر کو لکھا تھا کہ میں پوری کوشش کروں گا کہ ایک ماہ کے اندر آپ کا مکان خالی کر دیا جائے اگر میں کوشش میں ناکام ہو جاؤں تو آپ کو مکمل آزادی ہے کہ مکان خالی نہ کرنے والوں سے جیسا چاہیں سلوک کریں ایک خط حبیب کے نام دیا جس میں مکان خالی نہ کرنے کی صورت میں ان کے ارادوں کا بھی اشارہ دے دیا۔ میں نے قیصر سے کہا کہ دہلی پہنچ کر فوری طور پر اپنی اور لڑکوں کی خیریت سے آگاہ کرے۔ دوسری صبح 8 بجے کی بس پر چھ مجاہدوں کا یہ قافلہ بیر گنج کو روانہ ہو گیا۔ چوتھے روز دہلی سے نذیر اور عارف نے ٹیلی فون پر مجھ سے بات کی اور بتایا کہ قیصر کا گروپ بخیر و عافیت دہلی پہنچ گیا ہے میں نے نذیر کو کہا کہ اس کے گھر کو خالی کرنے کی اہمیت اور وجہ میں نے تفصیلی طور پر اپنے محکمے کو بھیج دی ہے اور مجھے یقین ہے کہ جلد از جلد اس کا گھر خالی ہو جائے گا۔ متبادل جگہ سرائے بیرم خان سے بہتر کوئی نہیں ہو سکتی اس لئے وہ سرائے بیرم خان میں انہیں محفوظ گھر لیکر دے اور انہیں وہاں SET کرنے میں ان کی مدد کرے۔

کھٹمنڈو میں اب تک مہاجروں کے بھیس میں چھپے 9 مکتی باہنی والوں کو نہایت قلیل وقت میں ٹھکانے لگایا گیا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ ابھی اور بھی طاعونی چوہے یہاں موجود ہوں گے جو یا تو ہماری نظروں میں آنے سے رہ گئے یا وہ یہاں اپنی فیملی کے ساتھ رہتے ہوں گے۔ ابھی تک ہم نے جن کو واصل جہنم کیا تھا وہ اکیلے رہتے تھے اور مہاجروں کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھے۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ مکتی باہنی یا بھارتی انٹیلی جنس کے اور بہت سے افراد یہاں موجود ہوں گے۔ بھارتی سفارت خانے کا حجم بہت بڑا اور اس کے عملے کی تعداد دو سو سے اوپر تھی جس کے مقابلے میں پاکستانی سفارت خانے کا عملہ صرف اٹھارہ افراد پر مشتمل تھا۔ بھارتی سفارت خانہ یہاں سے صرف پاکستان کی ہی نہیں بلکہ چین کی بھی جاسوسی کرتا تھا۔ چین نے کھٹمنڈو سے اپنے بارڈر تک 134 میل لمبی سڑک بنائی تھی جو چینی انجینئرنگ کا شاہکار تھی۔ بلند پہاڑوں سے گزرتی یہ سڑک بالکل سیدھی تھی اور اس میں کوئی ZIG ZAG نہ تھا جہاں پہاڑ کو چیرا نہ جا سکا وہاں سرنگ بنا دی گئی تھی۔ اس سڑک پر بڑے بڑے ٹرالے بڑی آسانی سے چل سکتے تھے۔ یہ سڑک بنانے کے دو مقاصد تھے اول یہ کہ اگر بھارت اپنی فطرت سے مجبور ہو کر نیپال پر حملہ آور ہو تو چینی افواج کو نیپال کے دفاع میں پہنچنے میں دشواری نہ ہو۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ نیپال کی چھوٹی سی پہاڑی ریاست کو بھارت بلاوجہ دھمکاتا رہتا تھا کہ وہ اس کی درآمد اور ضروری اشیا کی سپلائی روک دے گا۔ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ نیپال کی بھارت کے ساتھ جغرافیائی حالت بالکل ایسی تھی کہ جیسے آزاد کشمیر کی پاکستان کے ساتھ، بھارت کی نیپال کو سپلائی روک دینے کی صورت میں چین اس سڑک کے ذریعے نہایت سرعت سے نیپال کی ضروریات پوری کر سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نیپال میں سب سے فعال چینی اور بھارتی سفارت خانے تھے۔

میرے کہنے پر لڑکوں نے انا پورنا ہوٹل میں اپنے نام، ایڈریس اور شہر بھی علی گڑھ، لکھنو اور الہ آباد لکھوائے تھے۔ ہوٹل میں بل بھی انہوں نے خود ادا کئے ان کی روانگی سے پہلے میں نے ان بلوں کی رقم بھی انہیں ادا کر دی۔ بعد دوپہر محسن بھی ہوٹل چھوڑ کر گیسٹ ہاؤس چلا گیا۔ محسن کو بھی میں نے 12 ہزار روپے دیئے۔ پیسے کی لاچاری انسان کو بزدل بنا دیتی ہے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ محسن جس میں ہمت اور حوصلہ دوبارہ عود کر آیا تھا پھر لاچاری کا شکار ہو جائے نیپال میں میرے مشن کا ابھی صرف آغاز ہوا تھا۔ مجھے ایک قابل اعتماد ساتھی کی ضرورت تھی اور کھٹمنڈو میں محسن سے زیادہ نڈر، جرات مند، انتقام کے جذبے سے لبریز، قابل اعتماد ساتھی ملنا ناممکن تھا۔

میں نے اگلا ایک ہفتہ نہایت خاموشی میں گزارا۔ میں اس واقعے پر مہاجروں، بھارتی سفارت خانے اور نیپالی حکومت کا ردعمل دیکھنا چاہتا تھا۔ محسن ہر روز دن چڑھے پاکستانی سفارت خانے اور مہاجروں کے ٹھکانوں پر چلا جاتا اور ہر روز شام ڈھلے میرے پاس اکیلا یا اپنے ساتھی شاعر کے ہمراہ آ جاتا اور تنہائی میں مجھے سارے دن کی رپورٹ دیتا۔ اسی کے ذریعے معلوم ہوا کہ بھارتی سفارت خانے نے اپنے ہمدرد نیپالیوں کے ذریعے ان لاشوں کو شمشان گھاٹ میں چتا کے سپرد کیا ہے۔ ان کا سامان بھی نیپالی پولیس لے گئی تھی جسے بعد میں بھارتی سفارت خانے کے حوالے کر دیا گیا۔ پاکستانی سفارت خانے نے رجسٹریشن سے ان کے نام خارج کر دیئے تھے اور کھٹمنڈو میں مقیم سارے رجسٹرڈ مہاجروں کی نئے سرے سے رجسٹریشن شروع کر دی گئی تھی اس بار رجسٹریشن سے پہلے سفارت خانے کے ایک کمرے میں انہیں بے لباس ہو کر مسلمان ہونے کا ثبوت دینا پڑتا تھا۔ فیملی کے بغیر اکیلے مہاجروں کیلئے رجسٹریشن کو خصوصی طور پر بہت سخت کر دیا گیا اور ایسے مہاجروں کو مشرقی پاکستان میں اپنے شہر یا گاؤں میں مقیم تین رجسٹرڈ مہاجروں سے تصدیق کروانی لازمی تھی۔

محسن اور بزرگ شاعر بھی اسی زمرے میں آتے تھے۔ میں کئی روز سے سفارت خانے نہیں گیا تھا ایک روز محض یہ دیکھنے کیلئے کہ ہمارا سفارت خانہ مجھ پر کس حد تک اعتماد کرتا ہے میں ان دونوں کو اپنے ہمراہ لے گیا۔ یہ دونوں تو ایمبیسی کے لان میں دوسرے مہاجروں کے ساتھ رک گئے۔

(جاری ہے)

غازی

میں ان کے سابقہ رجسٹریشن کارڈ لے کر سیدھا سفیر کے پاس گیا۔سفیر صاحب سیاسی آدمی تھے۔ روپے تقسیم کرتے وقت ہونے والی تلخی کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے بڑی گرم جوشی سے ملے۔کئی روز نہ آنے کا گلہ کیا۔کافی اور بسکٹ منگوائے۔میں نے دونوں کے رجسٹریشن کارڈ انہیں دیتے ہوئے کہا۔''ان دونوں کی فیملی نہیں ہے۔کیا میری ضمانت پر ان کی رجسٹریشن ہو سکے گی؟''سفیر صاحب نے بڑی اپنائیت سے جواب دیا صرف ان کی ہی نہیں،آپ بے شک دو ہزار مہاجر لے آئیں۔ آپ کی ضمانت پر سب کی فوری طور پر رجسٹریشن کر دوں گا سفیر صاحب نے یہ کہتے ہوئے انٹر کام پر اپنے پی اے کو بلایا اور دونوں کارڈ اسے دے کر کہا کہ فوری طور پر ان کی نئی رجسٹریشن لا دے۔پندرہ منٹ میں ہی تمام پروسیجر بالائے طاق رکھتے ہوئے دونوں کیلئے رجسٹریشن کارڈ بن کر آ گئے۔میں نے پوچھا کہ ضمانت نامے میں کیا لکھ کر دوں۔تو سفیر صاحب نے کہا''آپ کا کہنا ہی ضمانت ہے'' میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اجازت چاہی تو سفیر صاحب نے پر زور اصرار سے اپنے گھر رات کھانے کی دعوت دی۔میں نے معذرت کی تو انہوں نے کہا''آپ کو لازماً آنا ہو گا۔آپ سے کئی ایسی ضروری باتیں اور اہم باتیں کرنی ہیں جو یہاں مناسب نہیں''میں نے کھانے پر آنے کی حامی بھر لی۔دراصل ہم دونوں مکتی باہنی والوں کے متعلق گفتگو کرنا چاہتے تھے۔سفارت خانہ تو نئی رجسٹریشن شروع کر کے پہلے ہی اپنی کوتاہی تسلیم کر چکا تھا اس لئے اب سفیر صاحب مجھ سے کچھ اگلوانا اور ہم نوا بنانا چاہتے تھے۔ادھر میری حالت یہ تھی کہ میں کالے چور پر تو بھروسہ کر لیتا لیکن سفیر اور اس کے حواریوں کو اپنا راز کبھی نہ دیتا۔

کھانے کے بعد ڈرائنگ روم میں کافی آ گئی۔سفیر صاحب نے مجھے ہوانا سگار کے دو خوش نما ڈبے عنایت کئے۔جن پر حکومت پاکستان کا سرکاری نشان کھدا ہوا تھا۔میں نے شکریہ ادا کیا اور ایک ڈبہ کھولنا چاہا تو سفیر صاحب نے بڑی بے تکلفی سے کہا''نہیں، انہیں یہاں نہ کھولیں۔یہاں پر میرے ڈبے کے سگار پئیں''سفیر صاحب نے یہ کہتے ہوئے اپنے ڈبے میں سے ایک سگار مجھے دیا۔ ہر سگار سلور کی ٹیوب میں بند تھا جس پر بھی اوپر والے الفاظ کندہ تھے۔''اب بتائیے یہ سب کیسے کیا؟''سفیر صاحب نے مسکراتے اور گہری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا،کیا''یہ سب کیسے ہوا؟''میں نے انجان بنتے ہوئے ان سے ہی سوال کر دیا۔سفیر صاحب شاید یہ جان کر کہ میں ان کی بات سمجھ نہیں سکا،بولے''بھئی،میں ان آٹھ غیر مسلموں کی بات کر رہا ہوں جو گزشتہ دنوں ایک ہی رات میں مار دیئے گئے''۔میں نے جواب دیا''سنا تو میں نے بھی ہے میں تو یہ سمجھتا تھا کہ یہ کارروائی آپ نے کروائی ہے کیونکہ یہ غیر مسلم مہاجروں کے بھیس میں ہمارے سفارت خانے میں رجسٹرڈ تھے اور ان کے Expose ہونے کے بعد آپ کو نئے سرے سے رجسٹریشن کرنی پڑ رہی ہے۔میرا اس سارے واقعے میں کوئی عمل دخل نہیں۔میرے پاس تو صرف پسٹل ہے اور میری اطلاع کے مطابق انہیں خنجروں اور کلہاڑیوں سے مارا گیا ہے میں اکیلا بھلا اتنے افراد کو ایک رات میں کیسے مار سکتا ہوں''میرا نفی میں اور مدلل جواب سن کر سفیر صاحب مخمصے میں پڑ گئے اب میرا وار کرنے کا موقعہ تھا میں نے کہا''چلیئے چھوڑیئے۔وہ بد بخت اسی سزا کے مستحق تھے وہ تو مر گئے لیکن آپ کیلئے مصیبت کھڑی کر گئے۔نئے سرے سے رجسٹریشن سے آپ آئندہ تو شاید ایسے جاسوسوں سے بچ جائیں لیکن جن مہاجروں کو آپ پہلے ہی پاکستان بھجوا چکے ہیں ان میں کتنے غیر مسلم جاسوس ہوں گے،اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ جب ان آٹھ غیر مسلم جاسوسوں کی سفارت خانے میں بحیثیت مسلم مہاجر رجسٹریشن کے حوالے سے میں اس واقعے

(جاری ہے)

غازی

مہاجر اپنی اپنی مشکلات میں گھرے ہوئے تھے اور ان کا کوئی ایسا گروپ بھی نہ تھا جس پر قتل کرنے کا شبہ کیا جا سکتا۔ پولیس نے کھٹمنڈو کے سارے ہوٹل اور گیسٹ ہاؤس کھنگال ڈالے کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ انا پورنا ہوٹل کے رجسٹر بھی دیکھے گئے لیکن کسی گروپ کا وہاں ٹھہرنا ثابت نہ ہوا۔ اس ہوٹل میں ہر روز پندرہ سے بیس مہمانوں کا آنا (CHECK-IN) اور جانا (CHECK-OUT) ہونا روز کا معمول تھا۔ قیصر اور لڑکوں کا اس ہوٹل میں اندراج مختلف ناموں اور ایڈریس سے تھا۔ ہر روز پانچ چھ بسیں بھر کر رکسول سے کھٹمنڈو آتی اور جاتی تھیں۔ دنیا بھر سے ٹورسٹ اور چرس کے رسیا یہاں آتے تھے جن میں بھارتی بھی شامل تھے۔ کوئی بھی خلاف معمول بات سامنے نہ آئی تو پولیس تھک ہار کر خاموش ہو بیٹھی۔ اس دوران میں نے محسن کے ساتھ نہایت احتیاط سے ان متمول مہاجروں کی تفصیلات اکٹھی کر لیں جو ان کے مشرقی پاکستان جاننے والے مہاجروں کے مطابق مفلوک الحال تھے لیکن کھٹمنڈو میں مالی فراغت کی زندگی بسر کر رہے تھے اور انہوں نے اپنے پیسے کے زور پر مہاجروں کے چھوٹے چھوٹے گروہ اپنے گرد جمع کر رکھے تھے۔ میں نے ان پر ڈائریکٹ ہاتھ ڈالنے کے بجائے محسن کو ان متمول مہاجروں کے گرد جمع ہونے والی منڈلیوں سے روابط بڑھانے اور ان کے ذریعے اصلیت کی تہہ تک پہنچنے کی ذمہ داری سونپی۔ میری ہدایت کے مطابق محسن نے اپنا معمول بنا لیا کہ جہاں بھی چند مہاجر جمع ہوتے وہ پاکستان کے خلاف بولنا شروع کر دیتا۔ اگر کوئی اس کی گفتگو پر اعتراض کرتا تو وہ فوراً اپنی قمیص اوپر کر کے انہیں اپنی پیٹھ دکھاتا اور کہتا کہ میں نے بیوی بچوں اور ماں کو اذیتوں سے مرتے دیکھا ہے اور میرا یہ حشر کیا گیا۔ کس لئے! صرف پاکستان کا نام لیوا ہونے کے جرم میں اور جب مصیبتیں اور مشکلات اٹھا کر یہاں پہنچا تو امید تھی کہ پاکستانی حکومت سر آنکھوں پر بٹھائے گی لیکن یہاں تو کوئی گھاس بھی نہیں ڈالتا۔ ایسی باتوں سے وہ معترض ہونے والوں کو چپ کرا دیتا اور سب اس سے الٹا اظہار ہمدردی کرنے لگتے۔ محسن کو اسی طرح پاکستان کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے آٹھ دس دن گزر گئے تو ایک روز ایک مہاجر نے اس سے ہمدردی جتاتے ہوئے اسے شام کو اپنے ساتھ کسی کے پاس چلنے کی دعوت دی۔ شام کو محسن اس کے ساتھ ہو لیا۔ اسے ایک اچھے خاصے سجے سجائے گھر میں لے جایا گیا جہاں کئی مہاجر پہلے سے ہی بیٹھے تھے۔ بقول محسن کے میزبان بڑی تمکنت اور شان سے فرشی ڈرائنگ روم میں گدوں پر بیٹھا تھا۔ چائے اور مقامی شراب کے دور چل رہے تھے۔ محسن کو میزبان نے خوش آمدید کہا اور شریک محفل کر لیا۔ جب سب کے معدے گرم ہو گئے تو میزبان نے محسن کو کہا کہ اس کے متعلق جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ بہت ہی افسوسناک ہے محسن نے جھٹ قمیص اٹھا کر اسے اپنی پشت دکھائی اور پاکستان کے خلاف رٹی رٹائی نازیبا گفتگو کرنے لگا۔ میزبان نے اسے دلاسا دیا اور کہا کہ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس کا باعث پاکستان (مغربی پاکستان) والوں کی ہٹ دھرمی تھی ہم سب اسی وجہ سے دوسری بار بے گھر ہوئے ہیں اور یہاں ہمارے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے اسے تم بخوبی جانتے ہو۔ ہم نے اپنے پیاروں کو اپنے سامنے اذیتوں سے ہلاک ہوتے دیکھا، خود گہرے زخم کھائے، ہمارے گھر بار لوٹ لئے گئے۔ ان سب کا مداوا یہ نہیں کہ ہم پاکستان جانے کی آس لگائے یہاں خاموشی سے بیٹھے رہیں بلکہ ہمیں چاہئے کہ ہم یہاں ہم خیال لوگوں کا گروپ بنائیں اور جہاں تک ممکن ہو، یہاں اور پھر پاکستان جا کر ان ظالم حکمرانوں اور بے حس پاکستانیوں کا جینا حرام کر دیں جو ہمارے پیاروں کی لاشوں پر اپنے محل تعمیر کرتے ہیں۔

(جاری ہے)

غازی

ہمیں وہ ایک کنیا اور دو وقت کا کھانا بھی دینے کو تیار نہیں ہیں محسن کے بیان کے مطابق اس نے بڑی جذباتی تقریر کی اور ہمیں اس بات پر اکساتا رہا کہ ہم پاکستان کو ہر ہر طریقے سے نقصان پہنچائیں۔ محسن نے بتایا کہ اس کے پاس بیٹھے مہاجر سچے یا جھوٹے دل سے اس کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ وہ فوری ہی اپنے اصل مقصد او رٹاسک تک نہیں پہنچا۔ بلکہ بتدریج برین واشنگ کے مرحلے طے کر رہا تھا۔ محفل برخواست ہونے سے پہلے اس نے وہاں موجود سب مہاجروں کو پچاس پچاس روپے دیئے اور محسن کو آئندہ باقاعدگی سے اپنی محفلوں میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ میں نے محسن کو کہا کہ وہ بلا ناغہ اس کے گھر جائے اور وہاں جمع ہونے والے مہاجروں کے کوائف معلوم کرے اور خصوصی طور پر اس متمول مہاجر کے سابقہ مشرقی پاکستان میں کاروبار اور رہائش کے متعلق تفصیلاً معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ محسن اپنے کام میں جت گیا اور میں نے محسن جیسے اور مہاجروں کی تلاش شروع کر دی۔ کیونکہ اکیلے محسن سے ان تمام لوگوں کو کور کرنا مشکل تھا، جو اس گھناؤنے کام میں کافی عرصے سے مشغول تھے۔

چند دنوں سے میں محسوس کر رہا تھا کہ غیر محسوس طریقے سے میری نگرانی کی جا رہی ہے۔ ہوٹل کی لابی ہو یا سفارت خانے کا کمپاؤنڈ، شیر پنجاب ریسٹورنٹ ہو یا بازار، ہر جگہ مختلف لوگ بلاوجہ میرا پیچھا کرتے دکھائی دیتے۔ تربیت کے مطابق میں نے ان پیچھا کرنے والوں کو ''جھٹکنے'' اور ان سے جان چھڑانے کے بجائے ان کی اصلیت اور ارادے جاننے کی کوشش شروع کر دی۔ میں بعد دوپہر ہوٹل سے نکلتا تو لابی میں بیٹھے چند ایسے لوگ جو اس اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں کسی صورت بھی رہنے والے یا کسی مہمان سے ملنے والے دکھائی نہ دیتے تھے۔ میرے باہر نکلتے ہی میرے پیچھے چل دیتے بعض اوقات ہوٹل کے باہر کھڑے چند اجنبی جس طرف اور جس سواری (کھٹمنڈو میں خال خال ہی ٹیکسیاں نظر آتی تھیں جو صرف غیر ملکی مغربی سیاحوں کی تاک میں گھنٹوں بلاوجہ کھڑی رہتیں اور ملکی یا بھارتی مسافروں کو لے جانے سے احتراز کرتیں۔ سائیکل رکشاؤں کی یہاں بہتات تھی) پر میں جاتا میرے پیچھے لگ جاتے۔ میں نے نگرانی کے شبہ کو جانچنے کیلئے کئی بار ایسا کیا کہ سائیکل رکشہ پر سفارت خانے کے آدھے رستے تک گیا اور پھر رکشہ والے کو واپس اسی راستے سے بازار کی جانب چلنے کو کہا۔ (اناپورنا ہوٹل کے سامنے کی سڑک بائیں طرف پاکستانی سفارتخانے اور دائیں طرف بازار کو جاتی ہے) میرے آدھے رستے سے اچانک واپس پلٹنے سے میرا پیچھا کرنے والے بھی اپنے رکشاؤں کو واپس میرے پیچھے لے آتے۔ اس سے میرا شک یقین میں بدل گیا۔ میں اپنا پسٹل تو لباس کے نیچے چھپا کر رکھتا لیکن ایک کھکھری کمر کے گرد ہمیشہ باندھے رکھتا تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ مختلف اوقات میں میرا پیچھا کرنے والے آٹھ نو افراد تھے۔ ان میں سے تین قد و قامت اور رنگ سے بنگالی لگتے تھے جبکہ باقی پانچ چھ مضبوط جسم والے قد آور تھے ایک روز میں نے ایمبیسی جاتے ہوئے راستے میں اپنا رکشہ اچانک رکوایا۔ میرا پیچھا کرنے والے اتنے نااہل تھے کہ بجائے سیدھا آگے جانے کے انہوں نے بھی اپنا رکشہ رکوا لیا۔ میں رکشے سے اتر کر ان کے پاس چلا گیا اور کرختگی سے پیچھا کرنے کی وجہ پوچھی وہ اس اچانک صورت حال کا سامنا کرنے کیلئے تیار نہ تھے۔ لگے ادھر ادھر کے بے مقصد جواز دینے۔ میں نے کھکھری نکال کر حملہ کرنے انداز میں پکڑ لی اور کہا کہ بکواس مت کرو۔ آئندہ اگر میں نے تمہیں دیکھا تو یاد رکھنا تمہارا وہ حشر کروں گا جو تمہارے نو ساتھیوں کا ہو چکا ہے۔ انہوں نے خاموشی سے میری بات سنی اور اپنے رکشے میں واپس چلے گئے۔ یہ دو تھے اور غیر بنگالی لگتے تھے۔ اس واقعے کے بعد میں نے ان کی صورت دوبارہ نہیں دیکھی۔ یقینی طور پر وہ بھارتی سفارت خانے کے نچلے درجے کے ملازم تھے جنہیں اصولی طور پر اس لئے دوبارہ نہ بھیجا گیا کہ میں ان کی اصلیت جان چکا تھا۔ جاسوسی کی اصطلاح میں اسے ''چہرہ ہو جانا'' کہتے ہیں۔

اسی شام ہوٹل کی لابی میں تین افراد بیٹھے تھے جنہیں میں پہلے بھی اپنا پیچھا کرتے دیکھ چکا تھا۔ میں ریسپشن پر گیا اور منیجر کو کہا کہ اس اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں جسے آپ فائیو اسٹار کہتے ہیں۔ بھانت بھانت کے لوگ بلاوجہ لابی میں بیٹھے رہتے ہیں۔ اگر ایسے ہی لوگوں کے درمیان یہاں ٹھہرے ہوئے Guests کو رہنا ہے تو پھر اتنا کرایہ دینے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے اسے کہا کہ یہ تین افراد یہاں اکثر نظر آتے ہیں ان سے پوچھیں کہ یہ کسے ملنے آئے ہیں۔ منیجر میرے ساتھ ان کے پاس آیا اور پوچھا کہ کس سے ملنا ہے۔ معقول جواب نہ ملنے پر منیجر نے گورکھا گیٹ کیپر کو کہا کہ انہیں دھکے دے کر باہر نکال دیں۔ ان کے ساتھ ہی میں بھی ہوٹل سے باہر آ گیا اور انہیں کہا کہ تم میرا کئی دن سے پیچھا کر رہے ہو۔ یہاں میری آمد و رفت کے اوقات دیکھتے ہو اور مجھ سے ملنے والوں کی بھی نگرانی کرتے ہو۔ تمہاری اصلیت میں جان چکا ہوں۔ اس دفعہ تو تمہیں چھوڑ رہا ہوں۔ آئندہ اگر ایسی حرکت کی تو بلاوارننگ گولیوں سے بھون ڈالوں گا۔ یہ بھی دوبارہ کبھی نظر نہ آئے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میری Surveillance (نگرانی) ختم کر دی گئی تھی۔ اب منجھے ہوئے تجربہ کار اور ٹرینڈ آدمی میرے پیچھے لگائے گئے۔ یہ سب بھارتی سفارت خانے کی طرف سے ہو رہا تھا۔ بھارت کے مقابلے میں یہاں صورت حال بالکل مختلف تھی۔ وہاں میں اور میرے ساتھی چھپ کر وار کرتے تھے لیکن یہاں دو دشمن کھلے طور پر آمنے سامنے تھے۔ دونوں میں صرف ایک فرق تھا۔ بھارتی مقابلے پر سینکڑوں کو لا سکتے تھے اور ان کے وسائل بھی بے پناہ تھے دوسری طرف میں اکیلا تھا۔

(جاری ہے)

غازی

میرے دنیاوی وسائل میرا اکلوتا پسٹل اور کھکھری تھے لیکن میں نہتا اللہ کی مدد اور صحیح مقصدیت کے سہارے ان کے دو بدو آ گیا۔

اب بھارتی سفارت خانے نے ایک نئی چال چلی۔ میری نگرانی کے بجائے مجھے اپنے جال میں پھانسنے کیلئے ایک تجربہ کار اور انتہائی چالاک بھارتی ایجنٹ کو میرے پیچھے لگا دیا گیا۔ یہ ایجنٹ اپنی خفیہ سرگرمیوں کے کور Cover دینے کیلئے کھٹمنڈو میں ایک کاروباری کی حیثیت سے رہتا تھا۔ اسی مین روڈ پر دو دکانیں تھیں۔ ایک دکان دیوی کی محل نما حویلی کے قریب اور دوسری اسی سڑک کے شروع میں مسلمان کشمیریوں کی شالوں کی دکانوں سے ملحقہ کیسٹ کی دکان تھی۔ اس کے متعلق مجھے ملنے والے مہاجروں نے بتایا کہ یہ شخص مہاجروں کا ہمدرد ہے۔ بھارتی ہندو ہے لیکن بڑا دردمند اور انسان دوست ہے۔ جنرل مرچنٹ کی دکان پر صرف رجسٹریشن کارڈ کا نمبر لکھ کر مہاجروں کو مختلف برانڈ کے سگریٹ، چیونگ گم اور دوسری اشیا تھوک سے بھی کم قیمت پر بیچنے کو دیتا ہے۔ لکڑی کی ٹرے جس سے چمڑے کے بیلٹ گلے میں ڈالنے کیلئے بندھی ہوتی ہے، مفت فراہم کرتا ہے۔ مہاجر ان ٹریوں میں سامان رکھ کر شہر کے مختلف علاقوں اور خصوصاً ان گھٹیا اور کم کرائے والے گیسٹ ہاؤس کے قریب یہ سامان بیچتے ہیں جہاں مغرب سے آنے والے ہپی ٹھہرتے ہیں۔ وہ صحیح ضرورت مند مہاجروں کی مالی امداد کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ مہینے میں ایک آدھ بار بھارت جاتا اور فروختگی کیلئے سامان لاتا ہے۔ جب سے اسے آپ کے مہاجروں میں نقد رقم کمبل اور ادویات تقسیم کرنے کا علم ہوا ہے وہ آپ کا پرستار بن گیا ہے۔ ہر وقت آپ کی تعریف کرتا ہے۔ آپ سے ملنے کا بے حد شائق ہے لیکن کہتا ہے کہ میں بھارتی ہندو ہوں، ممکن ہے وہ مجھ سے اچھا برتاؤ نہ کریں۔

مہاجروں نے کچھ اس انداز سے اس کے قصیدے پڑھے کہ میں اس سے ملنے کو تیار ہو گیا اور ان ہی کے ذریعہ اسے ایک شام اپنے ہوٹل میں اسے مدعو کر لیا۔ ٹھیک وقت پر وہ آ گیا اور میں اسے کافی شاپ میں لے گیا۔ شکل وصورت اور لب ولہجے سے وہ بھارتی پنجاب کا لگتا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کا نام وجے کمار ہے اور وہ انبالے کا رہنے والا ہے۔ شرنارتھی (مہاجر) ہے تقسیم ہند سے پہلے وہ گوجرانوالہ میں محلّہ گوروناتک پورہ میں رہتے تھے۔ وہیں اس نے میٹرک پاس کیا اور اپنے پتا کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے لگ گیا۔ والدین کا اکلوتا بیٹا ہونے کے باعث ماں باپ کا بہت لاڈلا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد وہ انبالہ آ گئے۔ جہاں اس کے پتا کے کاروبار نے بہت ترقی کی۔ انبالے میں ہی اس کی شادی ہوئی اور دو لڑکے پیدا ہوئے۔ اس کا گھرانہ نہایت آسودہ اور خوش وخرم زندگی بسر کر رہا تھا۔ گوجرانوالہ سے آتے ہوئے اس کے پتا کے مسلمان دوستوں نے ان کی بہت مدد کی اور سوائے مکان اور دکان کے ان کا تمام سامان انہی مسلمان دوستوں نے خرید لیا تھا اور اسی سرمائے سے اس کے پتا نے کاروبار شروع کیا آج سے چھ سال پیشتر تیرتھ یاترا سے واپسی پر اس کے گھر کے تمام افراد ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو گئے۔ وہ اس لئے بچ گیا کہ کاروبار کی دیکھ بھال کیلئے انبالے میں رہ گیا تھا۔ اتنے بڑے حادثے اور بھرے پرے گھر کے یوں اجڑنے سے وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا۔ کئی ماہ کے علاج ومعالجے کے بعد اسے کچھ افاقہ ہوا۔ انبالہ اسے کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ ایک دوست نے اسے کھٹمنڈو جانے کا مشورہ دیا تاکہ حادثے کی تلخ یادوں کو بھلا سکے۔ وہ کھٹمنڈو آیا تو یہیں کا ہو کر رہ گیا اور انبالے کا کاروبار بند کر کے یہاں دو دکانیں کرائے پر لے کر روزی کمانا شروع کی۔ اس نے دوبارہ شادی نہیں کی۔ اکیلا رہتا اور ماضی کو بھلانے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ مہاجر آئے تو ان کی کسمپرسی دیکھ کر اس کے اپنے زخم تازہ ہو گئے۔ اپنی محدود آمدنی سے چونکہ وہ تمام مہاجروں کی ضروریات پوری نہیں کر سکتا تھا لہٰذا اس نے انہیں Street Hawker (پھیری والا) بننے کی ترغیب دی وہ تھوک ریٹ پر ادھار میں سامان انہیں دیتا ہے جس سے وہ پچیس تیس روپے روزانہ کما تے ہیں۔ آپ کے متعلق سنا کہ بہت بڑی رقم سے آپ نے مہاجروں کی مدد کی آپ کا ان دیکھا پجاری بن گیا اور آج آپ کے چرنوں میں بیٹھا ہوں۔

وجے نے اپنی داستان بڑے دکھ بھرے لہجے میں سنائی۔ مہاجروں کے ساتھ اس کی بے لوث ہمدردی اور حسن سلوک بھی بڑا متاثر کر دینے والا تھا۔ اس نے مہاجروں کو ایک طرح سے روزگار پر لگا دیا تھا۔ اس نے اور بعد میں مہاجروں نے بتایا کہ گزشتہ سالوں سے وہ ان کی بے لوث خدمت کر رہا ہے۔ مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے اس کا لہجہ اور انداز ایسا بے ساختہ تھا کہ جس پر بے اختیار یقین کرنے کو جی چاہا۔ میں نے اس کی بے حد تعریف کی اتنے بڑے گھریلو صدمے کو سہنے اور اپنے زخموں کا علاج دوسروں کے زخموں پر مرہم لگانے سے کرنے پر داد دی۔ بہت سی باتیں ہوئیں غرض یہ کہ جب وہ جانے لگا تو میں اسے ہوٹل سے باہر تک چھوڑنے آیا۔ اس کے کردار نے مجھ پر گہرا اثر کیا تھا۔ مذہب وملت سے بالاتر ہو کر انسانیت کی خدمت کرنے والا وجے کمار واقعی قابل تحسین تھا۔ آئندہ دس بارہ دنوں میں کئی بار میں اس کی دکان پر گیا اور اسے مہاجروں کو بیچنے کی اشیا دیتے دیکھا۔ وہ بھی کئی دفعہ میرے بلانے پر میرے ہوٹل آیا اور ہم غیر محسوس طور پر ایک دوسرے کے کافی قریب آ گئے۔ شام کا وقت کاٹنا میرے لئے کافی تکلیف دہ ہوتا تھا۔ محسن پر گو مجھے پورا اعتبار تھا لیکن ذہنی طور پر وہ میرا دوست نہ بن سکا۔ وہ اپنے دیئے گئے مشن کو نہایت خوش اسلوبی سے پورا کر رہا تھا۔

(جاری ہے)

غازی

اس نے شام کی محفلیں سجانے والے کئی ایجنٹوں کی اصل سرگرمیوں کو بے نقاب (uproot) کیا تھا میرے لئے وہ بہت ہی کارآمد تھا لیکن صرف مشن کی حد تک۔ ایک بے تکلف دوست کی کمی کو دجے نے پورا کیا اور ہماری اکثر شامیں اکٹھی گزرنے لگیں۔ دجے چند روز کیلئے بھارت سامان لینے گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ تمام سامان لکھنو کی تھوک مارکیٹ سے خریدتا ہے جو رکسول تک ٹرین اور آگے ٹرک پر کھٹمنڈو آتا ہے۔ میرے لئے وہ میرے بغیر کہے بہت سارا نمکین کاجو لے آیا جو مجھے خشک فروٹ میں سب سے زیادہ پسند ہے۔ میرے استفسار پر کہ اسے میری پسند کا کیسے پتا چلا اس نے کہا کہ ایک روز باتیں کرتے ہوئے آپ نے کہا تھا کہ کاجو کھاتے ہوئے میں کبھی سیر نہیں ہوتا۔ آپ کی اسی بات سے مجھے آپ کی پسند کا پتہ چلا اور میں لے آیا۔ دجے میں ایک خاص خوبی تھی جو ہر انسان کی فطری کمزوری ہے یعنی وہ کبھی نہ بحث کرتا اور نہ ہی دوران گفتگو اس کا اپنا کوئی خاص موضوع ہوتا۔ میں جو بھی بات کرتا وہ میری ہاں میں ہاں ملاتا۔ میں نے جس موضوع پر بھی بات کی اس نے اسی کو پسند کیا اور گفتگو کا رخ کبھی نہ بدلا۔ میں بھی فطرت کی خامیوں سے بھرا ہوا انسان تھا۔ بھارت میں تشدد سہنے کے باعث مجھ میں نفسیاتی طور پر اپنی مخالفت برداشت نہ کرسکنے کی خامی پیدا ہو چکی تھی اور میرے لئے وہ انسان بہت قابل قبول تھا جو مجھ سے بحث نہ کرے۔ دجے کی ایک اور خاص بات میں نے نوٹ کی کہ اس نے اپنا ماضی تو میرے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا لیکن میرے ماضی اور حال کے متعلق کبھی کچھ نہ پوچھا۔ اس کی اس خوبی نے بھی مجھے اس کے زیادہ قریب کر دیا تھا۔ ایک شام وہ میرے پاس آیا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے کہا کہ انبالے سے اس کے چند دوست آئے ہیں جو کھٹمنڈو میں چند روز ٹھہریں گے۔ اگرچہ وہ اس کے پرانے اور گہرے دوست ہیں لیکن متعصب ہندو ہیں۔ وہ نہیں چاہتا کہ ان سے میرا تعارف کرائے۔ اس لئے یہاں ان کی موجودگی کے دوران اگر میرا اس سے آمنا سامنا ہو جائے تو میں لاتعلقی ظاہر کروں۔ وہ بھی ایسا ہی کرے گا۔ دجے کی اس صاف گوئی سے اس کی قدر و منزلت میرے دل میں اور بڑھ گئی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میرے خلاف سازش کا جو جال بنایا جا رہا ہے دجے اس کا مرکزی کردار ہے۔

دجے کے دوستوں کی موجودگی کے دوران میں نے اپنے سفارت خانے کے ملٹری اتاشی سے فون پر رابطہ کیا اور کہا کہ کچھ اہم معلومات ملی ہیں جو میں انہیں بتانا چاہتا اور ان پر مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ ایمبیسی میں اگر ان سے ملوں تو باقی افراد چوکنا ہو جائیں گے۔ میرا ہوٹل بھی اس ملاقات کیلئے موزوں نہیں کیونکہ یہاں پر بھی میری نگرانی ہو رہی ہے۔ ملٹری اتاشی نے کچھ سوچ کر جواب دیا کہ ایسی صورت میں سب سے بہتر جگہ ''چنگ وا'' چائنیز ریسٹورنٹ ہے۔ آج رات 8 بجے میں وہیں آجاؤں۔ یہ ریسٹورنٹ کھٹمنڈو کے پوش علاقے میں تھا۔ میں رات آٹھ بجے وہاں پہنچ گیا۔ اتاشی صاحب بھی تقریباً اسی وقت وہاں پہنچے۔ ہم ایک کیبن میں بیٹھ گئے اور کھانے کا آرڈر دیا۔ میں نے محسن کی اکٹھی کی ہوئی معلومات انہیں بتائیں اور کہا کہ پاکستان بھیجنے کیلئے جاسوسوں کی ٹیم تیار کی جا رہی ہے۔ کئی مکانوں میں ان کی برین واشنگ کا سلسلہ جاری ہے۔ میرا Planted آدمی ان میں سے کچھ جگہوں پر خود برین واشنگ کی ان محفلوں میں شریک ہوا ہے۔

(جاری ہے)

غازی

مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے کہ جب افغان ایئر کی فلائیٹس کا دوبارہ آغاز ہوگا تو انجانے میں سفارتخانے کے ذریعے جاسوسوں کی ایک بڑی کھیپ پاکستان پہنچ جائے گی۔ ملٹری اتاشی نے میری ساری بات غور سے سنی اور جواب دیا۔ میرے اپنے مخبروں نے بھی مجھے ایسی اطلاعات دی ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ مہاجروں کے بھیس میں چھپے مکتی باہنی کے جاسوسوں کو ٹھکانے لگانے میں تمہارا ہاتھ ہے۔ فی الوقت تو تمہیں ان سے نجات مل گئی ہے لیکن ہم سب کچھ جانتے ہوئے بھی ان برین واش کرنے والے مہاجروں کا کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ مسلمان ہیں اور سقوط ڈھاکہ کے بعد مشرقی پاکستان سے آئے ہیں۔ بھارت میں قیام کے دوران ان کی کسی مجبوری یا کمزوری کے باعث بھارتی جاسوسی ایجنسیوں نے انہیں یہ مذموم کام کرنے پر آمادہ کیا ہے اور وہی انہیں مالی امداد بھی کر رہے ہیں۔ ملٹری اتاشی نے اپنی مجبوری بتا دی۔

اسے ہر کام اپنی حدود اور قانون کے دائرے میں رہ کر کرنا پڑتا تھا۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ ملٹری اتاشی نے یہ وعدہ کیا کہ اگر اس کے علم میں کوئی نئی بات آئی تو وہ مجھے ضرور آگاہ کرے گا۔ ہماری یہ میٹنگ ختم ہوئی تو میں افسردہ دل لے کر اپنے ہوٹل واپس چلا آیا۔ میرے سامنے میرے بچے کھچے گھر کو جلا ڈالنے کے اسباب ہو رہے تھے اور میں اکیلا کچھ نہ کر سکتا تھا۔ ایسے حالات میں مجھے قانون کے دائروں میں کام کرنے والوں کی نہیں بلکہ ایسے سر پھرے دیوانوں کی ضرورت تھی جو میرے گھر کو بچانے کیلئے بے خطر میرے دشمنوں سے بھڑ جاتے۔ دہلی سے قیصر اور لڑکوں کو دوبارہ بلانا ان کیلئے خطرے کا موجب بن سکتا تھا۔ نیپال پولیس نے ظاہراً مکتی باہنی والوں کے قتل کی تفتیش داخل دفتر کر دی تھی لیکن مجھے علم تھا کہ ان کا جاسوسی کا محکمہ خاموش نہیں بیٹھا ہے۔ اگر معاملہ صرف برین واشنگ کرنے والوں تک ہی محدود ہوتا تو اس کا حل یہ تھا کہ فلائیٹس شروع کرنے کے بعد انہیں پہلی پرواز سے پاکستان بھجوا دیا جاتا جہاں ایئر پورٹ پر میرا محکمہ ان کے استقبال کیلئے موجود ہوتا اور وہ ان سے سب کچھ اگلوا لیتا۔ لیکن فلائیٹس شروع ہونے کا دور دور تک نشان نہ تھا۔ جب تک فلائیٹس شروع ہوتیں۔ یہ برین واشنگ کرنے والے نامعلوم کتنے مہاجروں کو اپنے چنگل میں پھانس چکے ہوتے۔ پاکستان پہنچنے والے تمام مہاجرین کی جانچ پڑتال کرنی ناممکن تھی۔ میں بڑے مخمصے میں پھنس گیا۔ یہ مہاجر اکیلے نہیں بلکہ اپنی فیملیوں کے ساتھ یہاں ٹھہرے ہوئے تھے اور انہیں ہلاک کرنے کی صورت میں ان کے بال بچے بے یار و مددگار رہ جاتے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ اسی سوچ میں کئی دن گزر گئے لیکن کوئی حل نہ ملا۔

میں ایک روز رات کے کھانے کیلئے چنگ وا ریسٹورنٹ میں گیا۔ اس ریسٹورنٹ کے مالک چینی مسلم تھے اور شام کو کاؤنٹر پر ان کی جوان لڑکی بیٹھتی تھی۔ سر کو مسلم انداز سے ڈھانپنے سے ہی مجھے معلوم ہوا کہ وہ مسلمان ہیں۔ کھانے کے بعد میں قہوہ پی رہا تھا کہ کاؤنٹر والی لڑکی میرے پاس آئی اور انگریزی میں کہا کہ تین چینی مسلم مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں حیران تھا کہ کھٹمنڈو میں تو میرا کوئی چینی واقف نہ تھا پھر یہ کون تھے۔ میں نے لڑکی کو کہا کہ میں یہاں کسی چینی کو نہیں جانتا۔ تمہارے ریسٹورنٹ میں بھی صرف چند مرتبہ آیا ہوں۔ بہر حال میں ان انجانے لوگوں سے ملنے کو تیار ہوں۔ لڑکی جو میرے جواب کے انتظار میں خاموش کھڑی تھی، مسکراتی ہوئی بولی ''ریسٹورنٹ کے ساتھ ہی ہمارا گھر ہے۔ وہاں پر ملنا بہتر اور محفوظ ہوگا'' محفوظ لفظ سن کر میں چونکا۔ گویا یہاں بھی میری وجہ شہرت پہنچ چکی تھی۔ لڑکی کی راہنمائی میں ان کے گھر گیا۔ مجھے ایک چائنیز انداز کے سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا۔ اس کی دیواروں پر لگی خانہ کعبہ اور روضہ رسول مقبولؐ کی تصاویر سے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ مسلمان گھرانہ ہے۔ لڑکی نے مجھے بتایا کہ ملنے کے خواہش مند آدھے گھنٹے کے اندر یہاں پہنچ جائیں گے کیونکہ انہیں ان کے گھروں سے بلایا گیا ہے۔ لڑکی نے بتایا کہ وہ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو میں مترجم کا کام کرے گی کیونکہ وہ لوگ انگلش نہیں جانتے۔ اس نے بتایا کہ کئی روز پہلے ان لوگوں نے ریسٹورنٹ میں میرا پیچھا کیا تھا لیکن چونکہ میرے ساتھ پاکستانی سفارت خانے کا افسر تھا۔ اس لئے بات نہ ہو سکی انہوں نے لڑکی سے کہہ دیا تھا کہ آئندہ جب بھی میں ریسٹورنٹ میں آؤں وہ انہیں فوری اطلاع کر دے۔ میرے مزید کریدنے پر لڑکی نے صرف یہ بتایا کہ وہ میرے دشمن نہیں بلکہ خیر خواہ ہیں۔ آدھا گھنٹہ پورا ہونے سے پہلے ہی جوان اور ورزشی جسم کے تین چینی آ گئے۔ انہوں نے چینی لہجے میں السلام وعلیکم کہا اور مجھ سے مصافحہ کر کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے ہی گفتگو کا آغاز کیا اور کہا کہ انہیں محکمے کی طرف سے میری حفاظت کرنے اور میری مدد کرنے کا کام سونپا گیا ہے۔ میں ان کی بات نہ سمجھ سکا اور پوچھا کہ میں نے تو کبھی بھی اپنی حفاظت اور مدد کیلئے کھٹمنڈو میں کسی سے نہیں کہا۔ وہ تفصیلاً بتائیں کہ وہ کون ہیں اور کس محکمے نے انہیں یہ کام سونپا ہے۔ لڑکی مترجم بنی ہوئی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ وہ میرا سوال صاف صاف انہیں سمجھائے اور یہ بھی کہے کہ وہ شاید کسی دوسرے کے مغالطے میں مجھ سے بات کر رہے ہیں۔ لڑکی نے انہیں میرا سوال سمجھایا تو انہوں نے آپس میں کھسر پھسر کی اور پھر لڑکی کو جو کچھ کہا اس کا لب لباب یہ تھا کہ وہ مجھے اپنے محکمے کا نام نہیں بتا سکتے۔ میری حفاظت اور مدد کرنے کے احکام انہیں ان کے محکمے نے دیئے ہیں اور اپنی سچائی اور میرے کسی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی صورت میں یہ لفافہ مجھے دینے کی ہدایت کی ہے۔ میں نے لفافہ لے کر چاک کیا تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ایک چھوٹے سے کاغذ پر میرے محکمے کا نام، میرا اصل نام اور میرا بنیادی کوڈ نمبر لکھا ہوا تھا۔

(جاری ہے)

غازی

بھارت میں قیام کے دوران کھٹمنڈو میں، میں نے یہ کوڈ نمبر کسی کو بھی نہیں دیا تھا۔ وہ ایک دوسرا کوڈ تھا جو دہلی میں اپنے ہمدردوں، بمبئی میں حاجی مستان اور کھٹمنڈو میں سفیر کو دیا تھا۔ یہ میرا ابنیادی کوڈ تھا جس کا علم صرف مجھے اور میرے محکمے کو تھا۔

پرچہ میرے ہاتھ میں تھا اور میں بڑی حیرانی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ان چینیوں کے چہرے بالکل سپاٹ تھے اور لڑکی کی نگاہیں بھی میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں کاغذ کے اس ٹکڑے پر لکھے الفاظ سے صاف ظاہر تھا کہ میرے محکمے نے اپنے وسائل سے ان کے محکمے سے رابطہ کیا اور میرے تحفظ اور مجھ سے تعاون کرنے کیلئے اسے اعتماد میں لے کر ان کے آدمی حاصل کئے۔ چین جیسے عظیم ملک سے پاکستان کے برادرانہ تعلقات روز روشن کی طرح عیاں تھے۔ 65ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران چین نے بھارت کو مشرقی پاکستان پر حملہ کرنے سے روکنے کیلئے جس طرح دباؤ ڈالا تھا اس پر ساری دنیا حیران تھی۔ جنگ کے دوران چین نے بھارت کو 24 گھنٹے کا الٹی میٹم دیا تھا کہ اس کی ملکیت جو بھیڑیں بھارت نے بارڈر پر چوری کی تھیں اگر ہو بہو وہی بھیڑیں واپس نہ کی گئیں تو وہ بھارت پر حملہ کر دے گا۔ اسی دھمکی کی وجہ سے بھارت کو مشرقی پاکستان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرات نہ ہوئی۔ شاید بعض قارئین کو یہ علم نہ ہو کہ چین اور مشرقی پاکستان کے بارڈر کے درمیان ایک جگہ پر بھارتی زمین کی صرف 18 میل چوڑی پٹی ہے جسے سرعت سے عبور کر کے چینی فوجیں مشرقی پاکستان میں اس کے دفاع کیلئے داخل ہو سکتی تھیں۔ بھارت چرائی ہوئی بھیڑیں تو واپس نہ کر سکا لیکن ان کے عوض ہزاروں بھارتی بھیڑیں پیش کیں لیکن چین صرف اپنی چوری شدہ بھیڑیں لینے پر ہی مصر رہا۔ 62ء میں چین بھارت چند روزہ جنگ نے بھارت پر چین کی ایسی دہشت طاری کر دی تھی کہ 65ء میں بھیڑوں کی واپسی کے مطالبے میں چھپی ہوئی وارننگ کو وہ بخوبی سمجھ گیا اور مشرقی پاکستان اس جنگ کے دوران بھارتی ہاتھوں سے بالکل محفوظ رہا۔

مجھے ان تینوں چینی ہمدردوں سے مزید کسی تصدیق کی ضرورت نہ تھی۔ صرف ایک دشواری تھی کہ میں ان سے زبان کی ناواقفیت کے باعث ڈائریکٹ بات نہ کر سکتا تھا اور یہ بیس بائیس سالہ چینی لڑکی کس حد تک قابل اعتماد تھی۔ اس کا مجھے کچھ علم نہ تھا میں نے کوئی اور چارہ نہ دیکھتے ہوئے لڑکی سے سوال کیا کہ کئی اہم اور خفیہ معاملے ہیں جن کی رازداری اولین شرط ہے۔ بطور مترجم کے کیا میں اس پر بھروسہ کر سکتا ہوں۔ لڑکی کا چہرہ بجھ گیا۔ شاید اسے میرے اس سوال پر اپنی تحقیر دکھائی دی تھی۔ اس نے چند لمحے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میری بے اعتباری کا شکوہ کیا اور پھر Please wait one moment کہہ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور چند منٹوں میں ہی تین مختلف بھارتی انگریزی اخبار لا کر میرے سامنے رکھ دیئے۔ ان تینوں اخباروں میں میری تصاویر، انعامی رقوم اور تفصیلات درج تھیں۔ اس نے مجھے میرے اصلی نام سے جو اخباروں میں درج تھا مخاطب کرتے ہوئے پوچھا ”کیا یہی کافی ہے یا کسی مزید تصدیق کی ضرورت ہے؟“ میں ہنس پڑا۔ اس کے سوال پر بھی اور اپنی اس شہرت یا بدنامی پر بھی جو بھارت سے نکل کر نیپال اور نا معلوم کہاں کہاں تک پہنچ چکی تھی۔ میری ہنسی میں سب شریک ہو گئے اور لڑکی کے چہرے سے ناگواری کے تاثرات بھی ختم ہو گئے۔ نیپال میں قیام کے آخری روز تک میرے یہ نئے ساتھی میری ہر طرح سے حفاظت کرتے رہے بلکہ ان کے ذریعے مجھے اپنے مشن کی تکمیل کیلئے کئی اہم معلومات حاصل ہوئیں۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تینوں چینی ہانگ کانگ کے رہنے والے تھے اور چین کی حکومت سے ان کا ظاہری کوئی رابطہ نہ تھا۔ لڑکی جو چہرے سے کم عمر دکھائی دیتی تھی دراصل 26 سال کی تھی۔

(جاری ہے)

غازی

اس نے مترجم کے علاوہ اپنے ریسٹورنٹ میں آنے والے گاہکوں کی خصوصاً بھارتی سفارت خانے کے ارکان کی گفتگو کو خفیہ طور پر ریکارڈ کرنے کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ اس کے والدین چین کے صوبے یوہان سے ہجرت کر کے نیپال میں آ بسے تھے۔ والدین کی یہ اکلوتی بیٹی اپنے نڈر پن، صاف گوئی اور ذہنی ہم آہنگی سے غیر محسوس طور پر میرے خاصے قریب آ گئی۔ اس کے والدین نے مجھے کھٹمنڈو میں مستقل قیام یا نکاح کے بعد اپنی بیٹی کو پاکستان بھیجنے کی پیشکش بھی کی۔ میں نے بہت سنجیدگی سے اس بارے میں سوچا۔ میں اگرچہ شادی شدہ اور ایک بچے کا باپ تھا لیکن اس لڑکی میں جو خوبیاں تھیں میرے ساتھ اس کی جو ہم آہنگی تھی اس سے میں اپنی ازدواجی زندگی میں یکسر محروم تھا۔ ہم دونوں مثبت فیصلے پر پہنچنے کے بالکل قریب تھے کہ یہ لڑکی تیزی سے موڑ کاٹتے ہوئے اسٹیرنگ پر قابو نہ رکھ سکی۔
کار سینکڑوں فٹ گہری کھائی میں جا گری اور لڑکی اپنی والدہ سمیت اس حادثے میں ہلاک ہو گئی۔ ہمارے سارے پروگرام ادھورے کے ادھورے رہ گئے۔ اگر انسان کی سب ہی خواہشات پوری ہو جائیں تو وہ خود کو خدا سمجھ بیٹھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے ''میں نے اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے اللہ کو پہچانا'' واقعی انسان بے حد مجبور اور محدود ہے۔ بے حد و حساب قوتوں اور ہر شے کی خالق اور مالک صرف ذات باری تعالیٰ ہے جو ہر بات پر قادر ہے ہم فانی انسان اپنی کامیابیوں کو اپنا کارنامہ سمجھتے ہیں حالانکہ ہماری ہر کامیابی اور ناکامی اس ذات باری تعالیٰ کی رضا کی محتاج ہے۔ جو کسی کا محتاج نہیں (د)۔
میں نے ان چینی ہمدردوں کو کہا کہ ٹھیک ایک ہفتے بعد آج ہی کے دن اسی وقت وہ مجھے ملیں تا کہ اس دوران میں اپنے مشن کو آخری شکل دے سکوں۔ اس طرح انہیں یہ بتانے میں آسانی ہو گی کہ وہ میرا کس حد تک ساتھ دے سکتے ہیں۔ وہ ملنے کا وعدہ کر کے بڑی گرمجوشی سے رخصت ہوئے۔ میں نے لڑکی سے اس پر شک کرنے کی معذرت کی اور اپنے ہوٹل واپس چلا آیا۔ اب مجھے یہ تسلی ہو گئی تھی کہ کھٹمنڈو میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں، میں تنہا نہیں بلکہ بے لوث ہمدرد بھی میرے ہمراہ ہیں۔ ہوٹل پہنچا تو محسن میرے انتظار میں لابی میں بیٹھا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ محفلیں جمانے اور برین واش کرنے والوں کی رہائش گاہوں اور ان تک جانے کے مکمل نقشے مجھے بنا کر دے۔ ان کے نام اور محفلیں ختم کرنے کے اوقات بھی نوٹ کرے اور یہ سب تفصیلات مجھے 6 دنوں میں لازماً پہنچا دے۔ محسن نے اپنی ڈائری میں ان کے متعلق پہلے ہی بہت کچھ نوٹ کر رکھا تھا۔ باقی مطلوبہ تفصیلات اس نے تین چار روز میں اکٹھی کر کے مجھے دے دیں۔ پانچ افراد ایسے تھے جن کے گھروں میں برین واشنگ ہوتی تھی۔ ان کی مزید تصدیق کیلئے میں نے ملٹری اتاشی سے اس کو فراہم شدہ لسٹ مانگی تو اس میں بھی صرف انہی پانچ لوگوں کے نام تھے پورے طور پر اپنی تسلی کر لینے کے بعد بھی میں اس کے تذبذب میں تھا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ مجھے بار بار ان کی فیملیز کا خیال آتا کہ ان کا کیا بنے گا اور وہ بے سہارا رہ جائیں گے اور ان کو ڈھیل دینے کا مطلب تھا کہ پاکستان کے مفاد کے خلاف کام کرنے والوں سے صرف نظر کیا جائے اور اپنی آنکھوں کے سامنے دشمنان پاکستان کو بے ضرر مہاجروں کو پاکستان دشمنی کے انجکشن لگاتے دیکھوں اور چپ رہوں۔ اس صورت میں، میں اپنے وطن سے غداری اور اپنے فرض سے جان بوجھ کر چشم پوشی کا مرتکب ہوتا۔ اگر میں ان کی سرگرمیوں پر خاموش رہ کر ان کے پاکستان پہنچنے اور وہاں اپنے محکمے کو ان سے نمٹنے کیلئے چھوڑ دیتا تو اس عرصے میں نا معلوم کتنے سادہ اور نا سمجھ مہاجروں کو چنگل میں پھنسا چکے ہوتے۔

(جاری ہے)

غازی

پاکستان میں بھی ان کا یہی حشر ہونا تھا جو میں یہاں کر سکتا تھا لیکن یہاں پر میں برائی کو مزید پھیلنے سے روک سکتا تھا۔ میں نے بالآخر یہ طے کر لیا کہ ان سے یہاں ہی نبٹا جائے۔

ساتویں روز میں ان کے متعلق پوری تفصیلات لے کر چنگ وار ریسٹورنٹ میں گیا اور چینی ہمدردوں کو ان کے گھروں اور راستوں کی تمام تفصیل بتا دی۔ انہوں نے آئندہ شام ملنے اور اسی رات ایکشن لینے کا فیصلہ کیا۔ ان کے گھروں تک پہنچانے اور ان غداروں کو پہچاننے کی ذمہ داری محسن کے سپرد تھی۔ واپسی پر میں نے محسن کو آئندہ رات کا سب پروگرام سمجھایا۔ اسے صرف چینی دوستوں کو ان کے گھروں تک لے جانا اور دروازے کھلوا کر ان کی نشاندہی کرنی تھی۔ باقی کام چینی دوستوں نے کرنا تھا۔ شام کو میں محسن کے ہمراہ ریسٹورنٹ تک گیا۔ محسن کو باہر چھوڑ کر میں چینی دوستوں سے ملا۔ ان کا طریقہ واردات بڑا انوکھا اور نیا تھا۔ ان کے پاس ایئر ریفریشنر کے سائز کے تین سلنڈر تھے جن میں انتہائی زہریلی گیس بھری ہوئی تھی۔ ان کے بقول یہ گیس کسی کے چہرے پر خارج کرنے سے سیکنڈوں میں ان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ گیس سے محفوظ رہنے کیلئے وہ 5 گیس ماسک بھی لائے تھے۔ رات گیارہ بجے ایکشن کا وقت مقرر ہوا۔ جب سب باتیں طے ہو گئیں تو میں نے محسن کو ان سے ملوایا۔ اس مشن میں چونکہ عملی طور پر میرا کوئی حصہ نہ تھا۔ اس لئے میں محسن کو ان کے سپرد کر کے اپنے ہوٹل واپس چلا آیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی فون کی گھنٹی بجی۔ لائن پر لڑکی تھی اس نے کہا کہ میں فوراً ریسٹورنٹ آ جاؤں۔ ہوٹل میں میری انٹری درج ہو چکی تھی۔ میں ٹہلنے کے بہانے باہر نکلا اور رکشے پر ریسٹورنٹ پہنچ گیا۔ لڑکی نے بتایا کہ ایک تو محسن کو انگریزی نہیں آتی۔ دوسرے گاڑی چاہئے۔ پروگرام چونکہ اچانک تھا اس لئے گاڑی کا انتظام کرنا ہم سب بھول گئے تھے۔ اب مجھے سردار پرنام سنگھ شیر پنجاب ریسٹورنٹ کے مالک سے گاڑی لینی تھی۔ لڑکی نے میری یہ مشکل اپنی گاڑی دے کر آسان کر دی۔ رات ساڑھے دس بجے ہم پانچوں اپنے ہدف کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے محسن کے کہنے کے مطابق گاڑی مین سڑک پر روک دی اور محسن ان تینوں کے ساتھ ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ تقریباً بیس منٹ کے بعد وہ واپس لوٹے۔ محسن نے بتایا کہ کام ہو گیا ہے اب ہم دوسرے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ مجھے یہ واقعہ تحریر کرتے ہوئے بھی بڑی ذہنی کوفت اٹھانی پڑ رہی ہے مجھے ان بدبختوں کے بیوی بچوں کا پردیس میں بے یارومددگار رہ جانے کے خیال نے پریشان کر رکھا تھا۔ یہ انتہائی اقدام میں نے بہت مجبوری کی حالت میں اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ دوسری کوئی بھی صورت نظر نہ آتی تھی۔ ان موذیوں سے پیچھا چھڑانا بھی لازمی امر تھا۔ تین گھنٹے میں ان پانچوں کو ٹھکانے لگا کر ہم واپس لوٹے۔ چینی راستے میں ہی اتر گئے۔ ان کے جانے سے پہلے بہت ہی مشکل سے میں انہیں صرف یہ سمجھا سکا کہ دس روز بعد شام کو وہ مجھے ریسٹورنٹ میں ملیں۔ بہت بوجھل دل کے ساتھ میں ریسٹورنٹ تک پہنچا۔ محسن کو بھی میں نے راستے میں ہی اس کے گیسٹ ہاؤس کے قریب اتار دیا تھا۔ لڑکی اور اس کے والدین ابھی تک ہماری راہ دیکھتے ہوئے جاگ رہے تھے۔ اس وقت رات کے اڑھائی بج رہے تھے۔ میرے سر میں سخت درد ہونے لگا۔ اس وقت ہوٹل جانا بھی مناسب نہ تھا۔ لڑکی نے میری حالت دیکھتے ہوئے چائے بنائی اور اپنے والدین کی ایما پر مجھے بقیہ رات وہیں گزارنے کا کہا۔ میں بھی بے حال ہو رہا تھا۔ ان کا گھر خاصہ بڑا تھا۔ ایک کمرے میں میرے سونے کا انتظام کیا گیا۔ لڑکی نے چائے کے ساتھ مجھے اسپرو دی اور میں نے پریشان دل و دماغ کے ساتھ چند گھنٹے سوتے جاگتے گزار دیئے۔ بادی النظر میں میرا یہ قتل و غارت کا سلسلہ دہشت و بربریت کی داستان دکھائی دیتا تھا۔ لیکن اگر قارئین اس وقت کھٹمنڈو کے حالات، مہاجرین کی بے بسی اور ان کی بے بسی کا فائدہ اٹھانے والے بھارتی ایجنٹوں کی پاکستان دشمن کارروائیوں اور مہاجرین کے ورغلانے کے واقعات کو پیش نظر رکھیں تو وہ میرے اس انتہائی اقدام کو میری مجبوری سمجھ کر جائز قرار دیں گے۔ سانپ کو اس لئے زندہ چھوڑ دینا کہ اس کے بچے ہیں خود اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ جنگ کے دوران زد میں سامنے آئے دشمن کے بیوی بچوں کا خیال اگر ایک سیکنڈ کیلئے بھی لبلبی پر انگلی کی گرفت کو کمزور کر دے تو دشمن کے ہاتھوں اپنی ہلاکت لازمی ہے۔

دشمن کو اس سے پہلے ہلاک کر دو کہ وہ تمہیں ہلاک کر دے محض محاورہ نہیں بلکہ وہ ٹھوس حقیقت ہے، جس پر دنیا میں سب سے پہلی لڑی جانی والی جنگ سے لے کر آج تک عمل ہو رہا ہے۔ بھارت اور کھٹمنڈو میں میرے اور میرے ساتھیوں کے ہاتھوں جتنے لوگ بھی مارے گئے، ان سے ہماری نہ تو ذاتی دشمنی تھی اور نہ ہی کوئی مذہبی جھگڑا یقیناً سب ہی بال بچوں والے تھے۔ گورکھپور کے ہوائی اڈے پر بھی کام کرنے والوں میں بھی کئی مسلمان ہوں گے جو آگ میں جل کر راکھ ہو گئے۔ ہم نے جو کچھ بھی کیا تھا وہ اپنے وطن کی آبرو اور سالمیت کی بقا کی خاطر کیا۔ جس پر ہمیں کوئی پشیمانی اور ندامت نہیں۔ اسی تناظر میں کھٹمنڈو میں کیے گئے مشنوں پر بھی مجھے کوئی شرمندگی نہیں۔ کیونکہ یہ بھی وطن عزیز کے وسیع تر مفاد میں انجام دیئے گئے تھے یہ اسی زنجیر کی کڑیاں تھیں جسے توڑنے کیلئے میں اور میرے ساتھی پاکستان میں اپنے اہل و عیال کو سپرد خدا کر کے تین سال سے زیادہ عرصے سے دن رات بھارت اور کھٹمنڈو میں موت سے کھیل رہے تھے۔

اگلے روز دن چڑھے میں اپنے ہوٹل گیا۔ شام کو محسن آ گیا اور گزشتہ رات کی کارروائی تفصیلاً بتائی۔ مرنے والوں کے گھروں میں رات کو ہی واویلا شروع ہو گیا تھا ان گھروں کے باقی افراد کو کچھ علم نہ تھا کہ دروازے کس نے کھٹکھٹائے اور وہ کیونکر موت سے ہمکنار ہوئے اس بار پولیس میں بھی کوئی رپورٹ درج نہ کی گئی چونکہ لواحقین کے پاس نہ تو کوئی چشم دید گواہ تھا اور نہ ہی مرنے والوں کے جسم پر کوئی ایسا نشان جس سے انہیں ہلاک کیے جانے کا ثبوت مل سکے۔ ہر کوئی قیاس کے گھوڑے دوڑا رہا تھا۔ لیکن تہہ تک کوئی نہ پہنچ سکا۔ مجھے بھارتی جاسوسی ایجنسیوں کی پست ذہنیت سے پوری توقع تھی۔

(جاری ہے)

غازی

اپنے ضمیر اور غیرت کو بیچنے والے ان وطن فروشوں کے مرنے کے بعد ان ایجنسیوں نے مالی امداد تو دور کی بات ہے ان کے پسماندگان سے اظہار تعزیت بھی نہ کیا ہوگا۔ اس واقعے کو دس بارہ روز گزر گئے تو میں نے مہاجروں کے نمائندوں کے ذریعے ان پانچوں کے اہل خانہ کو دس دس ہزار روپے بھیجے اور پاکستانی سفیر کے ذریعے پانچوں کے اہل خانہ کو فلائیٹس شروع ہونے کے بعد ابتدائی پروازوں میں پاکستان بھجوانے کا انتظام کروایا۔ کھٹمنڈو میں اب کم از کم میرے علم کے مطابق مہاجروں کے روپ میں نہ تو کوئی مکتی باہنی والا باقی تھا اور نہ ہی کوئی وطن فروش۔ ان کی محفلوں میں شریک ہونے والے مہاجر بھی تتر بتر ہو چکے تھے۔ محسن کا ان سے کئی بار آمنا سامنا ہوا بھی تو وہ کنی کترا کر نکل گئے۔ وطن فروشوں کا انجام دیکھ کر بھی شرکائے محفل کو جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ یہ ہمیں تھے جو جان ہتھیلی پر لئے پھرتے تھے۔

ان کی طرف سے فراغت ملی تو میں نے دن کو دو بجے کمار اور شام کو چنگ ریسٹورنٹ میں جانا شروع کر دیا۔ وجے کمار کی کسر نفسی ویسی ہی تھی۔ اس کے ہمراہ میں جتنا وقت بھی گزرتا، مجھے اک گونا اطمینان قلب اور سکون ملتا۔ اس کی باتیں ہی تھیں کہ ہر کسی کا دل موہ لیتیں۔ میرا کئی بار جی چاہا کہ اسے چنگ وار ریسٹورنٹ میں لے جاؤں یا اس آگ کے بارے میں بتاؤں جس کی تپش میں اور چینی لڑکی مریم دونوں محسوس کر رہے تھے۔ لیکن ہر بار اس لئے رک جاتا کیونکہ دلوں کا یہ معاملہ ابھی بالکل ابتدائی مرحلوں میں تھا۔

سفارت خانے بھی اکثر جانا ہوتا۔ سفیر صاحب میری طرف سے بے فکر ہو چکے تھے اور کسی حد تک ممنون احسان بھی تھے۔ اکثر مجھے کھانے کی دعوت دیتے جسے میں اپنی مصروفیات کا بہانہ بنا کر معذرت کر لیتا۔ ایک دن دفتر میں بڑی رازداری سے کہنے لگے کہ تمہارے متعلق وزارت خارجہ نے کہا ہے کہ تمہیں جلد از جلد پاکستان بھیج دیا جائے۔ کہو کیا خیال ہے۔ میں ابھی کھٹمنڈو سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے ابھی کچھ فیصلے کرنے تھے۔ ذاتی بھی اور مشن کے متعلق بھی میں نے کہا کہ ابھی تو میں کچھ عرصہ یہیں رہنا چاہتا ہوں۔ جب تک میرا محکمہ مجھے واپس نہیں بلاتا، میں واپس نہیں جا سکتا۔ اگر وزارت خارجہ میرے اخراجات ادا نہیں کر سکتی تو میں اپنے ذاتی وسائل سے یہاں رہوں گا۔ میں اصل حقیقت جانتا تھا۔ سفارت خانہ مجھ پر اٹھنے والے خرچ کے ایک ایک پیسے کی تفصیلی رپورٹ وزارت خارجہ کو بھیجتا تھا جسے میرے محکمے سے وصول کر لیا جاتا تھا۔ میں نہ تو وزارت خارجہ کے ماتحت تھا اور نہ ہی ان کے حکم کا پابند۔ میری خصوصی ڈاک میں میرے محکمے نے میری واپسی کے متعلق کوئی اشارہ تک نہیں کیا تھا۔ بلکہ چینی ہمدرد بھیج کر مجھے اپنا مشن مکمل کرنے میں سہولت میسر کی تھی۔ سفیر صاحب میرا جواب سن کر خاموش ہو گئے۔ آئندہ آنے والے دنوں میں مجھے معلوم ہوا کہ سفیر صاحب میری کھٹمنڈو سے روانگی کیوں چاہتے تھے۔ UNO کی طرف سے ادویات، کپڑوں اور خشک دودھ کی ایک بڑی لاٹ آنے والی تھی۔ میری موجودگی میں اس امداد کی ایک رائی بھی بازار میں فروخت کرنا ان کیلئے ناممکن تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ UNO کا ایک سینئر نمائندہ بھی آنے والا ہے۔ جو امدادی سامان اور رقوم کی تقسیم کا جائزہ بھی لے گا۔ ایمبیسی کی طرف سے مہاجرین کو ابھی تک امدادی الاؤنس صرف تین روپیہ مہینہ فی کنبہ ملتا تھا۔ جب کہ رقوم سو روپیہ فی خاندان کے حساب سے بھیجی گئی تھیں۔ سفیر صاحب اور سفارت خانے کے ان افراد کو جو اس بندر بانٹ میں شریک تھے۔ میرے ذریعے اس راز کے طشت از بام ہونے کا خطرہ تھا۔ میں نے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے اور سفیر صاحب کی سیاسی اور سفارتی چالاکیوں سے بچنے کیلئے ایک فیصلہ کیا اور رجسٹرڈ ڈاک سے ایک خط سفیر صاحب کے نام بھیجا جس میں، میں نے لکھا تھا کہ چند ذاتی وجوہات کی بنا پر میں کھٹمنڈو میں مزید قیام کرنا چاہتا ہوں۔

بہت سے واقعات ایک ساتھ ہو رہے تھے اس لئے کچھ کو ادھورا چھوڑ کر مجھے باقی لکھنے پڑتے ہیں پھر بھی میری کوشش ہے کہ تسلسل برقرار رہے۔ چینی دوست مجھے ٹھیک دسویں روز چنگ وار ریسٹورنٹ میں ملے۔ مریم نے بتایا کہ بھارتی سفارت خانے کی گاڑی میں کچھ لوگ ریسٹورنٹ میں گزشتہ دنوں آئے تھے۔ وہ ہندی میں بات چیت کر رہے تھے جسے وہ سمجھ تو نہ سکی لیکن تمام گفتگو ریکارڈ کر لی۔ مریم کے گھر اپنے چینی دوستوں کے ہمراہ میں نے یہ ساری گفتگو سنی۔ گفتگو میں تین افراد شامل تھے اس ساری بات چیت کا موضوع کسی کام کو انجام دینے کی تاریخ طے کرنا تھا۔ دو آوازیں تیسرے کو قائل کرنے اور دباؤ ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ان کے مطابق ساری منصوبہ بندی ہو چکی تھی بھارت سے آئے ہوئے لوگ کئی دنوں سے بھارتی سفارتخانے میں بیکار پڑے ہوئے تھے مزید تاخیر کسی طرح بھی مناسب نہ تھی۔ تیسری آواز والا اپنی صفائی دیتا اور مجبوری ظاہر کر رہا تھا "سر آپ بالکل درست فرماتے ہیں میں اسے اپنے ہمراہ پکنک پر چلنے کی دعوت تو دے سکتا ہوں لیکن زبردستی ہمراہ نہیں لے جا سکتا۔ میں نے ہر طرح سے اس کے دل میں گھر کر لینے کی کوشش کی ہے اور اس میں کامیاب بھی ہوا ہوں وہ ہر دو تین دن کے بعد دکان پر آتا تو ہے لیکن اس کی آمد کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ جب جی چاہا آ گیا میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ اس کو ایسا کروں کہ وہ میرے ساتھ باہر جانے سے انکار نہ کر سکے۔ میری دکان کے علاوہ وہ اور بھی کہیں جاتا ہوگا اگر اس کی نگرانی کی جائے تو اس کے دوسری جگہوں پر جانے کے راستوں میں کئی سنسان جگہیں بھی آتی ہوں گی۔ کیا وہاں کارروائی نہیں ہو سکتی"

(جاری ہے)

غازی

اس کے جواب میں کہا گیا کہ ہمارے نگرانی کرنے والے لوگوں کو اس نے پہچان لیا تھا لہٰذا وہ لوگ اس کام کیلئے بیکار ہو گئے۔ سنسان جگہوں پر اسے ہلاک کرنا تو کوئی مشکل نہیں لیکن اوپر کے احکام کے مطابق ہمیں اسے زندہ DMI کے حوالے کرنا ہے۔ چھوٹے کنٹینر والی پک اپ ہر وقت تیار رہتی ہے ہمارے آدمی بیٹھے بیٹھے اکتا گئے ہیں۔ ہماری ایمبیسی کے سامنے سے وہ کئی بار گزرتا ہے لیکن اس کے گزرنے کے اوقات معلوم نہ ہونے کے باعث اب تک وہاں بھی کوشش نہیں کی گئی۔ کیونکہ ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہماری ناکامی کی صورت میں وہ چوکنا ہو جائے۔ اسی گفتگو کے دوران بالآخر یہ فیصلہ کیا گیا کہ تیسری آواز والا ایک رکشہ دو تین روز کیلئے کرائے پر لے۔ جسے رکشہ چلانے والے کے بجائے ان کا آدمی رکشہ ڈرائیور کے روپ میں میرے ہوٹل کے سامنے میرا منتظر رہے جبکہ دوسرا آدمی واکی ٹاکی کے ذریعے میرے اس رکشے پر بیٹھتے ہی بھارتی ایمبیسی کو اطلاع دے۔ جیسے کہ پہلے بھی کسی قسط میں عرض کر چکا ہوں کہ بھارتی سفارت خانہ پاکستانی ایمبیسی کو جاتے ہوئے راستے میں عین اس جگہ واقع تھا جہاں سڑک 45 کا زاویہ بناتے ہوئے بائیں جانب گھومتی تھی۔ واکی ٹاکی پر پیغام ملتے ہی بھارتی سفارت خانے کے دروازے کھول دیئے جائیں اور رکشہ ڈرائیور تیزی سے سیدھا سفارت خانے کے اندر جائے۔ سفارت خانے کے اندر پہنچتے ہی میں بھارتی سرزمین میں ہوتا اور وہاں مجھے بڑی آسانی سے قابو کر کے بے ہوش کیا جاتا اور کنٹینر والی پک اپ میں بھارت بھیج دیا جاتا۔ یہ پروگرام طے ہو گیا کہ اگلے روز تیسری آواز والے نے رکشے کا انتظام کرنا تھا اور اس کے آئندہ دن سے اس پلان پر عملدرآمد شروع ہو جانا تھا۔ مریم اور چینی دوست بے صبری سے اس گفتگو کا ترجمہ سننے کو بے تاب تھے۔ میں نے شروع سے آخر تک مریم کیلئے ساری گفتگو کا انگریزی میں ترجمہ کیا جسے مریم نے چینی زبان میں دوستوں کو سمجھایا۔ اس ساری گفتگو میں میرا نام کہیں نہ لیا گیا تھا۔ صرف "مسلے، ہوٹ اور DMI" کے لفظوں نے سب کچھ واضح کر دیا تھا کہ پلان میرے خلاف تھا۔ چینی دوستوں نے کہا کہ آج بلکہ ابھی سے وہ بطور گارڈز کے یا میرے ہمراہ اور یا تعاقب میں رہیں گے۔ مریم یہ سب پلان سن کر پریشان ہو گئی اور والدین سے اجازت لے کر مجھے اپنی گاڑی مستقل استعمال میں رکھنے کی آفر کی۔ میں نے انکار کیا تو اس نے بڑے پرزور دعویٰ سے پوچھا کہ آخر کیوں نہیں۔ کیا تم مجھے غیر سمجھتے ہو۔ میں نے اسے سمجھایا کہ مستقل طور پر گاڑی اپنے استعمال میں رکھنے سے میں اور زیادہ غیر محفوظ ہو جاؤں گا۔ گاڑی میں بم بھی پلانٹ کیا جا سکتا ہے۔ اس پر گرنیڈ بھی پھینکا جا سکتا ہے اور گولی بھی چلائی جا سکتی ہے۔ بڑی مشکل سے میں نے اسے سمجھایا ورنہ وہ تو مانتی ہی نہ تھی۔ چینی دوستوں نے بھی صبح 10 بجے سے رات جب تک کہ میں اپنے ہوٹل پہنچ جاؤں گارڈز کے طور پر میری حفاظت کی ذمہ داری اٹھائی۔ باری باری ایک گارڈ نے چھٹی کرنی اور دو نے میری حفاظت کرنی تھی۔ ہمارا Counter plan بالکل تیار تھا ایک بات میرے دماغ میں اٹکی ہوئی تھی۔ یہ تیسری آواز والا کون تھا جو باقی دونوں کو سر کہہ کر مخاطب کرتا تھا اور جس کی دکان پر بھی میں اکثر جاتا تھا۔ قارئین تو اب تک سمجھ چکے ہوں گے کہ وہ کون تھا کیونکہ گزشتہ صفحات میں اس کے حوالے سے میں نے خاصے صاف اشارے دیئے ہیں لیکن مریم کے گھر میں ریکارڈ شدہ گفتگو سن کر اس تیسرے شخص کو فوری پہچاننا دشوار تھا۔

(جاری ہے)

غازی

میں کئی دکانوں پر اکثر جاتا تھا۔ ریکارڈ میں آواز بھی جانی پہچانی لگتی تھی۔ میں نے ٹیپ دوبارہ چلوائی اور جب تیسری آواز کے یہ الفاظ کہ "میں نے ہر طرح سے اس کے دل میں گھر کر لینے کی کوشش کی ہے اور اس میں کامیاب بھی ہوا ہوں" دوبارہ سنے تو یکبارگی میری آنکھوں کے سامنے وہ شخص آ گیا جس کی دکان پر اکثر جاتا تھا اور جس کی موہ لینے والی باتوں اور انکساری نے مجھے اس کا دوست بنا لیا تھا یہ وجے کمار بھی بھارت کی کسی جاسوسی ایجنسی کا رکن تھا ہر کوئی اپنے اپنے رنگ میں میرے ساتھ دشمنی میں رنگا ہوا تھا۔ بھارت اور کھٹمنڈو میں اپنے سارے قیام کے دوران میں نے کسی کو سمجھنے میں پہلی بار غلطی کی تھی میں نے دل میں کہا "وجے کمار۔ دوستی کے روپ میں مجھے دھوکہ دے کر تو نے جو جال مجھے پھانسنے کیلئے بنا تھا۔ اسی جال میں تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو ایسا جکڑوں گا کہ سانس بھی رک جائے گی"۔

کھکھری تو پہلے ہی میری بیلٹ میں لٹکی رہتی تھی اب میں نے اپنا پسٹل بھی لباس کے اندر سے نکال کر جیکٹ کی جیب میں رکھنا شروع کر دیا۔ میرے چینی محافظ صبح کے ٹھیک دس بجے لابی میں آ کر بیٹھ گئے۔ میں نے ہوٹل انتظامیہ کو کہہ دیا کہ یہ میرے مہمان ہیں چند روز میں، میں نے محسوس کیا کہ لابی میں مسلسل بیٹھے رہنے سے ان کے چہروں پر اکتاہٹ طاری ہونے لگی تھی۔ میں نے ان کیلئے اپنے کمرے کے ساتھ والا کمرہ لے لیا جہاں وہ آرام کر سکتے اور اپنی ٹیپ پر پسندیدہ گانے سن سکتے تھے کھٹمنڈو میں میرے قیام کے آخری دن تک وہ اسی ہوٹل میں رہ کر میری حفاظت کرتے رہے۔ شام کو مریم نے مجھے فون پر بتایا کہ وہ مجھے لینے کیلئے گاڑی لے کر آ رہی ہے۔ میرے اقرار یا انکار کرنے سے پہلے ہی اس نے فون بند کر دیا اس طرح کے رویے کو شاید اب وہ اپنا حق سمجھتی تھی۔

اگلے روز میں گیارہ بجے ہوٹل سے باہر آیا تو کئی رکشے کھڑے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بھارتی ایجنٹ والا رکشہ کونسا تھا۔ میں نے ایک رکشہ لیا اور اسے شہر کی جانب چلنے کا کہا۔ شہر کی مین روڈ پر میں نے اسے چھوڑ دیا اور کچھ دیر دوسرا رکشہ لے کر اپنے سفارت خانے چلا گیا۔ سفیر صاحب نے روپوں کی تقسیم کے دوران کھینچی گئی تصویریں دکھائیں۔ وہ بہت خوش تھے انہوں نے ان تصویروں میں روپے دیتے ہوئے صرف اپنی مسکراہٹ ہی دیکھی تھی۔ مہاجروں کے چہروں پر پھیلی ہوئی بیزاری نہیں دیکھی جو ہر تصویر پر عیاں تھی

ہوٹل سے نکلتے وقت میں نے وہاں کھڑے سارے رکشہ ڈرائیوروں کے چہرے ذہن نشین کر لئے تھے دوسرے روز بھی چار پانچ رکشہ کھڑے تھے۔ ان میں دو کل والے اور باقی نئے تھے۔ میں نے کل والے دونوں رکشاؤں میں سے ایک رکشہ لیا اور شیر پنجاب ریسٹورنٹ چلا آیا۔ میرے پیچھے دونوں چینی دوست تھے۔ ہم نے رکشے چھوڑ دیئے۔ ایک گھنٹہ وہاں سردار ہرنام سنگھ سے گپ شپ لگانے کے بعد میں باہر نکلا تو وہاں صرف ایک رکشہ موجود تھا۔ یہ اجنبی چہرہ تھا میں کچھ دور پیدل جا کر مین روڈ پر آ گیا اور وہاں سے رکشہ لے کر ہوٹل آ گیا ہوٹل کے باہر اب صرف ایک رکشہ تھا کل والے دونوں میں سے ایک۔ ہم ہوٹل کے اندر گئے وہاں محسن میرا منتظر تھا میں نے محسن سے کہا کہ وہ فوراً جائے باہر ایک رکشہ کھڑا ہے اسے لے کر شیر پنجاب ریسٹورنٹ تک جائے اور 5 منٹ بعد ہوٹل واپس آ جائے۔ محسن کے پیچھے پیچھے میں باہر نکلا۔ رکشے والے نے محسن کو لے جانے سے انکار کر دیا تھا وہ دوسرے رکشے کی تلاش میں ذرا آگے بڑھا تو میں نے اس رکشے والے سے چلنے کو کہا وہ فوراً رضامند ہو گیا۔ اس نے میرے کہے بغیر پاکستانی ایمبیسی کی راہ لی۔ میں نے اسے روکا اور کہا کہ مجھے بازار جانا ہے۔ واپس چلو۔ یہ سن کر اس کے چہرے پر بیزاری کے اثرات پھیل گئے۔ (جاری ہے)

غازی

ہم ہوٹل سے بمشکل پچاس فٹ سے ہی واپس لوٹ پڑے۔ محسن اور میرے چینی دوست ابھی تک سواری کی تلاش میں تھے میں نے محسن کو اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر میں نے رکشہ پھر رکوایا اور محسن کو دکان سے سگریٹ لانے کو بھیجا۔ دراصل میں چینی دوستوں کے انتظار میں تھا۔ ادھر محسن دکان سے باہر نکلا ادھر دور سے چینی دوست آتے دکھائی دیئے۔ ہمارے رکشے والا بالکل اناڑی تھا۔ اسے رکشہ کنٹرول کرنا خصوصاً موڑ کاٹنا دشوار ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ آج اسے رکشہ ڈرائیوری کی سزا دی جائے۔ ہم چار گھنٹے سے زیادہ بلاوجہ ادھر ادھر گھومتے رہے۔ رکشہ چلاتے چلاتے وہ بے حال ہو رہا تھا۔ واپسی پر ہم وجے کمار کی دکان پر اتر گئے۔ رکشے والے کو میں نے جو کچھ دیا وہ اس نے بغیر کسی بحث کے لے لیا۔ حالانکہ میں نے اسے تمام سفر کے جائز پیسوں سے بھی آدھی رقم دی تھی میرے چینی دوست بھی ہم سے کچھ دور رکشہ چھوڑ کر ایک بیکری میں چلے گئے۔ وجے کمار نے مجھے مخصوص رکشے سے اترتے دیکھ لیا تھا اس نے بڑی آؤ بھگت سے میرا خیر مقدم کیا میں بھی بڑی بے تکلفی سے اسے ملا۔ دکان کے سفری گوشے میں چند کرسیاں پڑی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح ہم انہی پر جا کر بیٹھ گئے اور باتیں شروع کر دیں۔ وجے کمار اپنی عادت کے مطابق میری ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں اس کا راز جان چکا ہوں۔ بظاہر دوست لیکن دل میں ایک دوسرے کی جان لینے کے درپے ہم دونوں اپنے اپنے مہرے بڑی احتیاط سے چل رہے تھے۔ وجے کمار سوچ رہا ہوگا کہ وہ جلد ہی مجھے زیر کرے گا لیکن وہ اس حقیقت سے لاعلم تھا کہ میں نے اسے شہ مات ہی نہیں بلکہ پوری بساط الٹ دینے کا منصوبہ بنا رکھا ہے۔

دو گھنٹے سے زیادہ میں وجے کمار کے پاس بیٹھا رہا۔ اب چونکہ میں اس کی اصلیت جان چکا تھا اس لئے اس کی زبان سے نکلنے والے ہر لفظ کو غور سے سن رہا تھا۔ جتنی روانی اور بے ساختگی سے وہ مجھ سے اپنی چاہت اور عقیدت کا اظہار کر رہا تھا کوئی بڑے سے بڑا ایکٹر بھی اس کی گرد کو نہ پہنچ سکتا۔ واقعی ہندو کی سرشت میں یہی لومڑی جیسی مکاری بھری ہوئی ہے۔ چانکیہ ان کا گرو تھا جس کے قول گیتا کے اشلوکوں میں یہ جھوم جھوم کر پڑھتے ہیں۔ چانکیہ کا ایک قول یا نصیحت یہ بھی ہے کہ اگر تمہارا دشمن تم سے کمزور ہے تو جھپٹ کر اسے زیر کر لو اور اگر وہ تم سے تگڑا ہے تو اس کے سامنے بھیگی بلی بن جاؤ اور جونہی وہ تمہاری طرف سے ذرا غافل ہو تو پیچھے سے اس پر وار کرو۔ بغل میں چھری، منہ میں رام رام اسی کا دیا ہوا درس ہے جس پر ہندو آج تک اسے اپنا مذہبی فرض جان کر عمل کر رہے ہیں۔ بھارت اور نیپال میں قیام کے دوران وجے کمار پہلا غیر مسلم تھا جس پر میں نے اعتبار کیا اور اس اعتبار کی وجہ اس کی اتنی اونچے درجے کی ایکٹنگ تھی جس سے میں بھی دھوکہ کھا گیا۔ اس کی آتما نرک میں ہو یا سورگ میں۔ اس کی کامیاب ایکٹنگ پر میں اسے داد دیتا ہوں۔

وجے کی دکان سے اٹھ کر میں اپنے ہوٹل میں آیا تو وہی رکشے والا اپنی "خاص" سواری کے انتظار میں کھڑا تھا۔ یہ نہ تو نیپالی تھا اور نہ ہی اس کا لب و لہجہ نیپالی تھا اس نے مجھے پرنام کیا اور پوچھا کہ کہیں جانا ہے میں نے کہا کہ آج تو نہیں البتہ کل 11 بجے پاکستانی سفارت خانے جاؤں گا۔ میں نے اسے اپنا پروگرام محض اس لئے بتایا تھا کیونکہ میں اس چوہے بلی کے کھیل سے اکتا چکا تھا اور اب میرا پہلا شکار یہ رکشے والا تھا۔ رات کو میں اپنے چینی ساتھیوں کے ساتھ چنگ وا ریسٹورنٹ گیا اور مریم کے ذریعے چینی دوستوں سے زہریلی گیس کا سلینڈر مانگا۔ وہ سلینڈر لینے چلے گئے تو مریم نے مجھ سے پوچھا کہ اگر پھر مار دھاڑ کا کام کرنا ہے تو میں یہ کام چینیوں کے ذریعے کیوں نہیں کرواتا۔ وہ دراصل پرسکون زندگی کے خواب دیکھ رہی تھی اور چاہتی تھی کہ اس خون خرابے کی دلدل سے باہر نکل آؤں۔ میں نے اسے کہا کہ اب زیادہ وقت باقی نہیں۔ صرف سامنے آئے ہوئے چند دشمنوں کو ختم کرنا ہے اور اس کے بعد میں خود بھی پرامن زندگی گزارنے کا خواہشمند ہوں۔ کھٹمنڈو میں مجھے زندہ رہنے کیلئے انہیں ہلاک کرنا ضروری ہے۔ جونہی مجھے محکمے نے واپس بلایا میں اس کے ہمراہ سکون اور امن کی وادیوں میں چلا جاؤں گا۔ چینی ساتھی میرے لئے دو سلینڈر لے کر واپس لوٹے۔ ہر سلینڈر دس افراد کیلئے کافی تھا اور گیس کے موثر ہونے کی زیادہ سے زیادہ رینج 3 فٹ تھی۔ میں نے ایک سلینڈر مریم کے پاس چھوڑا اور واپس ہوٹل لوٹ آیا چینی دوست مجھے ہوٹل چھوڑ کر اپنی رہائش گاہ پر چلے گئے۔

اگلے دن ٹھیک گیارہ بجے میں ہوٹل سے باہر آیا۔ وہاں کئی رکشے کھڑے تھے۔ مجھے نکلتے دیکھتے ہی وہ مخصوص رکشے والا آگے بڑھا۔ میں نے اس کے رکشے کے پاس کھڑے ہو کر سگریٹ نکالنے اور جلانے میں اتنا وقت لگایا کہ میرے چینی دوست بھی دوسرا رکشہ لے لیں۔ میری جیکٹ کی ایک جیب میں پسٹل اور دوسری میں سلینڈر تھا۔ پروگرام یہ تھا کہ میرا رکشہ رکنے کے 20 سیکنڈ بعد وہ مجھے پاس (pass) کرتے ہوئے مجھ سے پسٹل اور سلینڈر لے کر آگے بڑھ جائیں گے اور پاکستانی سفارت خانے کے پاس میرا انتظار کریں گے۔ سیدھی سڑک پر دور بھارتی سفارت خانے کے لوہے کی سلاخوں والے دروازے کھلے دکھائی دے رہے تھے۔ رکشہ ڈرائیور اپنی کامیابی کو اتنا قریب دیکھ کر اپنی پوری طاقت سے رکشہ چلا رہا تھا۔ میں نے سلینڈر جیب سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور رکشہ والے کو کمر پر ٹھوکا دیا۔ جونہی اس نے گردن پھیری میں نے اس کے چہرے پر گیس چھوڑ دی۔ گیس اس کے نتھنوں میں گھسی تو وہ لڑکھڑایا اور چلتا رکشہ ڈولنے لگا۔ اس سے پہلے کہ رکشہ الٹ جاتا میں چھلانگ مار کر سڑک پر آ گیا۔ عین اسی وقت چینی ساتھیوں کا رکشہ پہنچ گیا۔ میرا رکشہ الٹ چکا تھا جس کے ساتھ ہی رکشہ ڈرائیور کا بے جان جسم پڑا تھا۔ چینی ساتھیوں کا رکشہ ڈرائیور یہ منظر دیکھ کر رکا اور اس دوران میں نے سلینڈر اور پسٹل انہیں دے دیا۔ انہوں نے چینی زبان میں اپنے رکشہ ڈرائیور کو آگے بڑھنے کو کہا۔ اس دوران وہاں سڑک کے دونوں جانب آنے جانے والے رکشے رکنے لگے۔ دو تین کاریں بھی وہاں آ کر ٹھہر گئیں۔

(جاری ہے)

غازی

سب یہی سمجھے کہ بچارا ڈرائیور رکشے کو کنٹرول نہ کر سکا رکشہ الٹ گیا اور ڈرائیور اس کے نیچے گر کر بے ہوش ہو گیا۔ دوسرے رکشہ ڈرائیوروں نے اس کے رکشے کو سیدھا کیا اور ڈرائیور کی ہتھیلیاں اور تلوے مساج کرنے لگے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ شخص مر چکا ہے۔ میں نے اپنی ایمبیسی کی جانب جانے والے ایک گاڑی والے سے لفٹ لی اور بھارتی سفارت خانے کے سامنے سے گزرتے ہوئے پاکستانی سفارت خانے کے قریب اتر گیا۔ گاڑی کا مالک کوئی نیپالی تھا اور اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں افسوس کر رہا تھا کہ غربت کے مارے ہوئے یہ ڈرائیور اپنی ہمت اور طاقت سے زیادہ کام لینے کے باعث چڑھائی پر اکثر اسی طرح بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ بھارتی سفارت خانے کے کھلے دروازوں کے اندر دس پندرہ افراد کھڑے تھے اور سب کی نگاہیں اس رکشے اور زمین پر پڑی ڈرائیور کی لاش پر تھیں جسے ''ہوش'' میں لانے کیلئے کئی ڈرائیور اس کے جسم کا مساج کر رہے تھے۔

پاکستانی سفارت خانہ بند ہونے تک میں وہیں رہا اور واپسی پر بجائے اپنے ہوٹل آنے کے میں نے چنگ وا ریسٹورنٹ کا رخ کیا۔ ہم سب کا بھوک سے برا حال ہو رہا تھا۔ مریم نے خاص طور پر میرے لئے پکوڑے اور چینی ساتھیوں کیلئے نوڈلز Noodles بنوائے۔ ہم نے سیر ہو کر کھایا۔ چینی دوستوں نے میرا پسٹل اور سلینڈر مجھے واپس کر دیا۔ میں نے انہیں اگلے دن دس بجے آنے کا کہا لیکن انہوں نے مجھے میرے ہوٹل چھوڑنے تک وہیں رہنے پر اصرار کیا رات کو نو بجے میں اپنے ہوٹل واپس لوٹا۔ میں نے مریم سے اپنا پسٹل لے لیا اور دونوں گیس سلینڈر اسی کے پاس رہنے دیئے۔

اگلے دن میں گیارہ دن بجے وجے کمار کی دکان پر گیا تو معلوم ہوا کہ وہ ابھی تک نہیں آیا۔ ادھر ادھر گھوم کر میں اپنے ہوٹل واپس آ گیا اور شام 5 بجے پھر وجے کی دکان پر گیا اس بار وجے مل گیا۔ اس کا چہرہ بجھا ہوا اور آنکھوں سے خوف صاف عیاں تھا اس نے اپنی اس کیفیت پر قابو پانے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ آج میری وہ پہلے والی آؤ بھگت بھی نہ ہوئی۔ میرے پوچھنے پر اس نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کیا۔ میں نے اسے عمداً کل والے رکشہ ڈرائیور کے اچانک بے ہوش ہو کر گرنے کا واقعہ سنایا۔ اس کے چہرے کی رنگت اور پھیکی پڑ گئی تھی۔ میں اس کی کیفیت سے حقیقی معنوں میں لطف اندوز ہو رہا تھا۔ جب میں نے اسے یہ کہا کہ یہ واقعہ بھارتی سفارت خانے کے قریب پیش آیا تھا اور اس وقت خلاف معمول سفارت خانے کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور دس پندرہ آدمی دروازوں کے ساتھ یوں کھڑے تھے جیسے کسی اہم شخصیت کے استقبال کیلئے جمع ہوں۔ وہ میری باتیں سنتا جا رہا تھا اور اس کے چہرے کی رنگت سیاہ ہوتی جا رہی تھی۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ کیا واقعی کوئی اہم شخصیت اس وقت آنے والی تھی تو جواب میں وہ ہاں یا نہ بھی نہ کہہ سکا۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑی جم چکی تھی۔ میں وار پر وار کئے جا رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کل بعد دوپہر سے تم دکان سے ایسے غائب ہوئے کہ آج شام کو ملے۔ میں نے تو یونہی کل کا کہہ دیا تھا لیکن اس نے بتایا کہ کل دوپہر سے اس کی طبیعت خراب ہے وہ گھر چلا گیا تھا اور ابھی تھوڑی دیر پہلے دکان پر آیا ہے۔ میرے وار جاری تھے۔ میں نے کہا آج صبح یہاں آتے ہوئے ایک رکشے والے نے بتایا کہ کل والا رکشہ ڈرائیور موقعے پر ہی مر گیا تھا۔ بالکل اچانک میں نے وجے کو ہمراز بناتے ہوئے آہستہ سے کہا کہ کل اس رکشے پر میں سوار تھا۔ جب یہ حادثہ پیش آیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے وجے کو کہا کہ بہت جلد اس کے گھر بغیر اطلاع دیئے آؤں گا تا کہ Surprise رہے اور اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی ماش کی دال کھاؤں گا۔ جس کی وہ ہمیشہ تعریف کرتا ہے وجے کی جو کیفیت ہو رہی تھی۔ وہ دیکھنے کے لائق تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے جسم کا سارا خون نچڑ گیا ہو۔ میں اس کی اس کیفیت سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔

(جاری ہے)

غازی

وجے نے دوستی کا لبادہ اوڑھ کر مجھے بے وقوف بنانا چاہا تھا یہ تو اللہ پاک کا کرم تھا کہ بروقت اس کی اصلیت مجھے معلوم ہوگئی۔ورنہ میں تو دوستی کے بھروسے اس پر اندھا اعتماد کرنے والا تھا۔

وجے کو اسی ذہنی اذیت میں چھوڑ کر میں اس کی دکان سے چلا آیا، اپنے ریسٹورنٹ میں مریم نے جو ریکارڈنگ کی تھی اس سے صاف ظاہر تھا کہ مجھے اغوا کرنے کا مشن بنیادی طور پر وجے کو سونپا گیا تھا۔رکشے کے ذریعے مجھے بھارتی ایمبیسی میں لے جانے کی کوشش یقیناً ان کا Stand by attampt جس پر وجے کو Rileif دینے کیلئے پہلے عمل کیا گیا۔یہ منصوبہ فیل ہونے کے بعد وجے پر اسے مکمل کرنے کی پوری ذمہ داری آ چکی تھی۔میری وجے سے گفتگو اسے نفسیاتی طور پر زیر اور مایوس کرنے کیلئے تھی۔میں چاہتا تھا کہ وجے کو نفسیاتی طور پر اس مقام پر لے آؤں جہاں وہ انتہائی Desperate (مایوس) ہو کر ایسا قدم اٹھائے جو غلطیوں سے بھرا ہوا ور مجھے اس کو انجام تک پہنچانے میں دشواری پیش نہ آئے۔

میں نے محسن کی یہ ڈیوٹی لگا دی کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت وجے اور اس سے سامان لینے والے مہاجروں کی اس کی دکان پر آمد کی نگرانی (Survellance) کرے۔اس نگرانی کے فوری ہی مثبت نتائج سامنے آنے شروع ہو گئے اس نے پہلے تو مہاجروں سے بدزبانی کی اور پھر سامان دینا بند کر دیا۔وہ گھبرایا ہوا اور انتہائی پریشان رہنے لگا اسے مزید پریشان کرنے کیلئے میں نے محسن کے ذریعے نئے شادی شدہ چھ مہاجروں کی خدمات معقول معاوضے پر حاصل کر لیں انہیں صرف یہ کرنا تھا کہ وہ وجے کا ہر وقت پیچھا کریں اور خصوصی طور پر جب وہ گھر جائے تو اس کے گھر کے دروازے تک اس کا پیچھا کریں اور اپنی حرکات سے اس پر یہ ظاہر کریں کہ اس کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔محسن اور ان چھ مہاجروں نے اپنا کام اتنی خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ چند روز بعد جب میں وجے کی دکان پر گیا تو اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ برسوں کا مریض ہو ہر وقت چہکنے والے وجے نے کئی روز سے شیو نہیں بنائی تھی۔ذرا سے کھٹکے پر وہ چونک جاتا۔سڑک پر سے گزرنے والے جس شخص کو بھی وہ اپنی دکان کی طرف دیکھتا پاتا اس کی نگاہیں دیر تک اس کا تعاقب کرتیں۔نگرانی کرنے والے مہاجر ہر پانچ سات منٹ بعد اس کی دکان کے سامنے سے اسے گھورتے ہوئے گزرتے۔وہ اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ بے اختیار بول اٹھا۔نا معلوم یہ لوگ بار بار میری دکان کے سامنے سے کیوں گزرتے ہیں؟ یہ میرے گھر تک میرے پیچھے جاتے ہیں میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے؟ میں وجے کے ساتھ بیٹھا تھا میں نے اس کی پشت پر ہاتھ سے تھپکی دینے سے پہلے اپنی شہادت کی انگلی اکڑا کر ایسی رکھی جیسے پستول کی نال ہو۔انگلی پشت سے لگتے ہی وجے کی چیخ نکل گئی اور اس نے بے اختیاری میں دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے۔میں نے ہنستے ہوئے اس کی پیٹھ کو سہلایا اور پوچھا کہ اسے کیا ہوا ہے وجے کی حالت ایسی ہو چکی تھی جسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔اسے چاروں طرف موت ہی موت دکھائی دیتی تھی میں یہی چاہتا تھا کیونکہ ایسی حالت میں ہی انسان انتہائی مایوس ہو کر Desperate قدم اٹھاتا ہے۔قارئین کو یاد ہوگا کہ دہلی میں DMI کے ہاتھوں گرفتاری کے بعد سبزی منڈی اسٹیشن پر دوسری بار جا کر میرے فرار کی کوشش اور DMI ہیڈ کوارٹر میں گارڈز کو ہلاک کر کے میرا زخمی حالت میں فرار ہونا ایسی ہی کیفیت کے زیر اثر تھا۔مجھے توقع تھی کہ ایک آدھ روز میں ہی وجے کا ردعمل سامنے آ جائے گا۔لیکن یہاں پھر غلطی کر گیا میں نے ہندو کی بزدلانہ ذہنیت کو فراموش کر دیا تھا۔

(جاری ہے)

غازی

موت اور چتا کی آگ سے ڈرنے والی یہ قوم آسانی سے موت کا نہ تو سامنا کرتی ہے اور نہ ہی اسے قبول کرتی ہے۔ دوسرے روز مجھے محسن اور دوسرے مہاجروں سے معلوم ہوا کہ دو جے صبح پہلی بس پر کھٹمنڈو سے بیر گنج چلا گیا ہے کھٹمنڈو سے دو جے دو مہینے غائب رہا اور جب واپس لوٹا تو خاصا سنبھل چکا تھا اس بار وہ نئے ارادوں اور نئی چالوں کے سہارے آیا تھا۔ کھٹمنڈو سے بھاگنے سے پہلے اس کی موت کا وقت نہیں آیا تھا اور واپسی پر موت خود اس کے تعاقب میں تھی جس سے وہ اس بار نہ بچ سکا۔

دو جے سے جو مہاجر سامان لیتے تھے ان کا کام بند ہو چکا تھا میں نے محسن کے ذریعے انہیں بلوایا اور انہیں ایک ایک ہزار روپیہ دیا کہ وہ تھوک کی دوسری دکانوں سے سامان خریدیں میں نے انہیں کہا کہ وہ مجھے یہ روپیہ واپس نہ لوٹائیں بلکہ اسے اپنی پونجی سمجھ کر کام کریں رزق حلال کمانے والے یہ مہاجر بہت خوش ہوئے کیونکہ دو جے انہیں صرف تین سو کا سامان فی کس دیتا تھا انہوں نے بتایا کہ تھوک کی دوسری دکانوں پر سامان دو جے کے سامان سے مقابلتاً سستا ملتا ہے۔ دو جے کے بقول وہ مہاجروں کو سامان کار خیر سمجھ کر بغیر منافع کے دے رہا تھا لیکن لالہ جی اس کار خیر میں بھی ڈنڈی مارنے سے نہیں چوکے۔ دو جے کے جانے کے بعد دشمن ظاہری طور پر سامنے نہ تھے۔ بھارتی سفارت خانے میں یقیناً کئی لوگ سر جوڑ کر بیٹھے مجھے زندہ گرفتار کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے جن سے میں بے خبر تھا اپنی حفاظت کیلئے مجھے قادر مطلق کی ذات پاک پر یقین کامل اور اپنے پسٹل پر بھروسہ تھا۔ زندگی کے گزشتہ تین برس کے حالات نے میری ذہنی حالت میں یہ تبدیلی کر دی تھی کہ یکسوئی اور بغیر ہنگامے کے زندگی مجھے بہت گراں گزرتی۔ لپکنا، جھپٹنا، جھپٹ کر پلٹنا میری عادت بن چکا تھا میں نے جب بھی اپنی اس بیزاری کا مریم سے ذکر کیا اس نے غصے بھری آنکھوں سے مجھے دیکھا کہ مجھے اپنا موضوع بدلنا پڑا۔ وہ ہر وقت میری حفاظت اور سیکورٹی کے پلان بناتی رہتی اور میری باتیں سن کر اسے طیش آجاتا۔ وہ ان عورتوں میں سے نہیں تھی جو ایسے موقعوں پر پسپا یا خاموش ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنی بات منوانے کی اہل تھی اس کی یہی بات مجھے اچھی لگتی تھی۔ مجھے اکثر خیال آتا کہ دنیا بھر میں میری والدہ کے علاوہ ایک اور ایسی ہستی بھی ہے جسے میری زندگی عزیز ہے۔ ورنہ جس سے توقع ہونی چاہئے تھی وہ تو میری والدہ کے سامنے میری موت کی دعائیں مانگتی تھی۔ اب میرا روز کا معمول صرف یہ رہ گیا کہ دن میں کبھی مین بازار (راجہ بازار) کبھی شیر پنجاب ریسٹورنٹ اور کبھی سفارت خانے چلا جاتا۔ شام کو چنگ وار ریسٹورنٹ جانا لازمی تھا بلکہ لازمی بنا دیا گیا تھا وہاں سے واپسی پر محسن اکثر میرے انتظار میں ہوتا۔ اس سے دن بھر کی خبریں ملتیں اور گپ شپ رہتی۔ میرے پندرہ سولہ شب و روز اسی طرح بسر ہوئے۔ اس دوران UNO کی بھیجی ہوئی امداد ہمارے سفارت خانے کو موصول ہوئی۔ مہاجروں کی شکایات اور بھارتی سفارت خانے کے پروپیگنڈے کی وجہ سے UNO کا ایک افسر بھی آیا جس نے کپڑے اور دودھ کے ڈبے اپنے سامنے تقسیم کروائے اور مالی امداد کی تین ماہوار اقساط پر بھی مہاجروں کو یکمشت دے دی گئیں۔ میرے متعلق بھی مہاجروں کے ایک وفد نے اسے بتایا۔ لہٰذا مجھے اپنے سفارت خانے میں طلب کیا گیا جہاں مجھے ایک بہت متمول ایسے پاکستانی کے طور پر UNO کے افسر سے متعارف کروایا گیا جو مہاجروں کی ہمدردی میں یہاں اپنی خوشی سے رکا ہوا تھا۔ سفیر صاحب اور دونوں سیکریٹری اس ملاقات کے دوران موجود تھے مجھے انہوں نے بادل ناخواستہ بلوایا تھا کہ کہیں میں ان کے پول نہ کھول دوں۔ میرا جی تو بہت چاہتا تھا لیکن محض اس لئے خاموش رہا کہ ایک غیر ملکی کے سامنے اپنے ملک کے نمائندوں کی ذلت کو میں اپنے ملک کی اور اپنی ذلت سمجھتا تھا۔

اسرائیلی ایجنٹ بھی سرگرم ہو گئے

انہی دنوں میں نے محسن اور اپنے چینی ساتھیوں کے ہمراہ کھٹمنڈو سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر شمبھوناتھ کے مندر جانے کا پروگرام بنایا۔ اس مندر سے متعلق بہت سی روایات مشہور تھیں جن کا ذکر آگے کروں گا۔ اس بار میرے جانے کا مقصد کچھ اور ہی تھا۔ جیسے ماؤنٹ ایورسٹ دنیا کی سب سے بلند چوٹی ہے ویسے ہی یورپین اور امریکی نشے بازوں کی منزل کی انتہا کھٹمنڈو ہے۔ ان دنوں افغانستان بالکل محفوظ تھا۔ چرس اور افیون کے رسیا امریکہ اور یورپ سے بھری جیبوں کے ساتھ روانہ ہوتے تھے ان کی پہلی منزل ترکی ہوتی جہاں مہنگے داموں وہ چرس اور افیون خریدتے۔ وہاں سے افغانستان پہنچتے جہاں انہیں یہ نشہ آور چیزیں بہت سستی مل جاتیں۔ یہ بھی مرد اور عورتیں اپنی تقریباً تمام پونجی سے انہیں خرید لیتے۔

(جاری ہے)

غازی

وہاں کے معاشرتی ماحول سے ڈرتے ہوتے یہ وہاں قیام نہ کرتے بلکہ پاکستان اور بھارت سے ہوتے ہوئے کھٹمنڈو پہنچ جاتے۔ کھٹمنڈو کا موسم اور معاشرہ انہیں موافق آتا اور یہ وہیں کے ہو جاتے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ نیپال میں چرس اور دوسرے نشے کرنے کی کھلی اجازت ہے۔ صرف خرید و فروخت ممنوع ہے اور یہ بھی رسمی طور پر۔ یہ کھٹمنڈو میں آزادی سے چرس اور مدھک کے دھوئیں اڑاتے اور اپنے گرو رجنیش کے گن گاتے (رجنیش ایک انٹرنیشنل فراڈ یا تھا جس نے امریکہ، یورپ اور بھارت میں بھی ایک نئے مذہب کا آغاز کیا جس کے ماننے والے ہر بات میں مادر پدر آزاد ہوتے۔ نہایت سرعت سے یہ مذہب پھیلا۔ اس کے ماننے والوں میں امریکہ، یورپ اور بھارت کی بڑی مشہور ہستیاں اور خصوصی طور پر فلموں کے سپر اسٹار ل جاتے تھے۔ آج سے چند برس پہلے گرو رجنیش جوفراڈ کے ایک بڑے کیس میں ملوث تھا اچانک منظر سے غائب ہو گیا لیکن امریکہ، یورپ اور بھارت میں اس کے بنائے گئے آشرم یا گناہ کے مراکز بھی ابھی تک بھرپور انداز میں چل رہے ہیں) کھٹمنڈو کے گیسٹ ہاؤسز میں ٹھہرے ہوئے ان ہپیوں کی چرس اور پیسے ختم ہو جاتے تو یہ شمبھوناتھ کے مندر کا رخ کرتے۔ ایک پہاڑی کی چوٹی پر بنے ہوئے اس مندر تک پہنچنے کیلئے تقریباً 85 پتھروں کی بنی ہوئی بڑی بڑی سیڑھیاں چڑھنی ہوتی ہیں۔ ان ہپیوں کی آخری منزل سیڑھیاں ہوتی ہیں جہاں یہ بھوک اور نشے سے سوکھ کر کانٹا بنے ہر گزرنے والے کو دیکھ کر Charity- charity (بھیک، خیرات) کی صدائیں لگاتے، (ان مشرقی اقوام کو جو مغرب کو خود سے افضل سمجھتی ہیں، انہیں کھٹمنڈو میں شمبھوناتھ کے مندر کی سیڑھیاں ضرور یاد رکھنی چاہئیں تاکہ ان کا احساس کمتری ختم ہو) اس مندر میں میرے جانے کا مقصد ان تین اسرائیلی لڑکیوں کے متعلق معلومات حاصل کرنا تھا جو بظاہر تو ہپی کے روپ میں یہاں آئی تھیں لیکن خاصے مہنگے گیسٹ ہاؤس میں رہتی تھیں۔ ان میں میری دلچسپی کی وجہ یہ تھی کہ چار مہاجر جوان لڑکے کھٹمنڈو سے غائب ہو چکے تھے ان کا کوئی سراغ نہیں ملتا تھا اور ان کے متعلق مصدقہ اطلاعات یہ تھیں کہ یہ چاروں آخری بار ان اسرائیلی لڑکیوں کے ساتھ دیکھے گئے تھے اس کے بعد زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا یہ کسی کو پتہ نہ چلتا تھا یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ یہ چاروں مہاجر لڑکے گریجویٹ تھے۔

شمبھوناتھ کے مندر کی سیڑھیوں پر میں نے پہلا قدم ہی رکھا تھا کہ ہر سیڑھی پر بیٹھے ایک یا دو ہپیوں نے Charity- Charity کی صدائیں لگانا شروع کر دیں۔ آپ یقین جانئے کہ ان کی حالت بندر روڈ پر صابری ریسٹورنٹ کے قریب فٹ پاتھ پر ڈیرے ڈالنے والے ہیروئنچیوں سے کچھ مختلف نہ تھی۔ بڑھے ہوئے شیو، الجھے گندے بال، میلے بدبودار کپڑے پہنے یہ ہپی ''ہرے راما ہر کرشنا'' کا ورد اپنے لہجے اور سر میں مسلسل کرتے جاتے۔ اس وقت میں مغربی ممالک میں نہ گیا تھا اور نہ ان کی اصلیت جانتا تھا ان ''برتر'' مغربی اقوام کے لوگوں کو اس حالت میں بھیک مانگتے دیکھ کر مجھے دلی خوشی ہوئی اور یہ خوشی دوچند اس وقت ہوئی جب میں نے ان سب میں پچاس پچاس روپے بانٹنے شروع کئے۔ اوپر کی سیڑھیوں پر بیٹھے سارے ہپی نیچے آ کر میرے ارد گرد اکٹھے ہو گئے وہ ہاتھ بڑھا بڑھا کر مجھ سے جوتے اور چیریٹی مانگتے، اسی دوران کسی ہپی نے مجھے بازو سے پکڑ لیا، مجھے اس کی یہ حرکت نا گوار گزری میں نے پلٹ کر دیکھا تو اس کا چہرہ جانا پہچانا دکھائی پڑا، میں نے ذہن میں اسے لانے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ اس نے کہا Friend we travelled to Gorakh pur to Nepal (دوست۔ ہم نے گورکھپور سے نیپال تک اکٹھے سفر کیا تھا) یہ وہی جرمن تھا لیکن نشے اور بھوک نے اس کی ایسی بری حالت کر دی تھی کہ میں اسے فوری طور پر پہچان بھی نہ سکا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور کہا کہ میرا انتظار کرو، میں ان سے فارغ ہو کر تم سے ملتا ہوں۔ ہپی نے مجھ سے پیسے لے جاتے اور نیچے ایک جانب بھاگتے ہوئے چلے جاتے۔ میں ان سے فارغ ہو کر جرمن کے پاس آیا اور اس سے حال احوال پوچھا اس نے جواب کیا دینا تھا۔ اس کی حالت میرے سامنے تھی، کہنے لگا مجھے جو کچھ دینا ہے جلدی سے دے دو ورنہ یا تو چرس ختم ہو جائے گی یا اس کے دام یکدم بڑھ جائیں گے۔ میں نے اس کو دو سو روپے دیتے ہوئے کہا کہ میں ان تین اسرائیلی لڑکیوں سے ملنا چاہتا ہوں جو تم لوگوں میں شامل ہیں، ان کے متعلق اگر تم مجھے معلومات دو گے تو میں تمہیں ڈھیر سارے روپے دوں گا، نشے سے ٹوٹے ہوئے جرمن کیلئے 2 سو روپے اس کی توقع سے کہیں زیادہ تھے۔ کافی ہیں کافی ہیں۔ تم ان کیتاؤں کو ٹورسٹ ان میں رات کو تلاش کرو یہ کہتے کہتے یہ جرمن بھی بقایا ہپیوں کی طرف بھاگ گیا۔ ہم لوگ کچھ دیر ادھر ادھر گھومنے کے بعد ہوٹل واپس لوٹ آئے۔ شام کو حسب معمول میں چینگ وا ریسٹورنٹ گیا۔ میں نے مریم کو بتایا کہ مجھے ان لڑکیوں کی تلاش میں جانا ہے۔ مریم نے حسب عادت میرے وہاں جانے کی مخالفت کی۔ میرے کافی دیر اسے سمجھانے اور اس تلاش کی اصل حقیقت بتانے پر وہ با دل ناخواستہ رضامند ہوئی اور مجھے جانے کی اجازت دی۔

ٹورسٹ ان ایک معمولی گیسٹ ہاؤس تھا، جس کے اندر ایک بڑا ہال چرس نوشی کیلئے مخصوص تھا۔ میرے ہمراہ دونوں چینی ساتھی تھے۔ یہ یہاں چرس کی بو سے بھرا پڑا تھا اور کم و بیش چالیس ہپی عورتیں اور مرد چرس کے نشے میں ڈوبے ہر چیز سے بے نیاز بے ہنگم ناچ گانے میں مصروف تھے، اسی ہال کے گوشوں میں یہ ہپی عورتیں اور مرد شرم و حیا کی تمام حدود کو پھلانگ کر ان حرکات میں مصروف تھے۔ جنہیں قلم لکھنے سے عاجز ہے، اس ماحول اور چرس کے دبیز دھوئیں میں میرا دم گھٹنے لگا۔ میں اپنے چینی دوستوں کے ہمراہ باہر آ گیا، اتنی بہت ساری عورتوں میں ان اسرائیلی لڑکیوں کو تلاش کرنا بھی ناممکن تھا۔ میں نے ریسپشن پر ان لڑکیوں کا پوچھا تو معلوم ہوا کہ دن کے بارہ سے دو کے درمیان یہ لڑکیاں اپنے کمروں سے باہر آتی ہیں۔ میں اپنے ہوٹل واپس لوٹ آیا اور مریم کو فون پر ساری روداد سنائی، کیونکہ مجھے اس شرط پر ٹورسٹ ان میں جانے کی ''اجازت'' ملی تھی کہ واپسی پر فوری اپنی خیریت کی اطلاع دوں رات چاہے کتنی ہی کیوں نہ بیت چکی ہو۔

جس ماحول میں لڑکیاں رہتی تھیں میرا وہاں جانا اور ان سے کچھ منگوانا ناممکن تھا۔ اگر یہ اسرائیلی جاسوس ادارے موساد کیلئے کام کر رہی تھیں تو ان کی جرات پر میں حیران تھا کیونکہ انہوں نے اپنے ایڈریس اسرائیل کے ہی لکھوائے ہوئے تھے۔ ہوٹلوں میں غیر ملکیوں کیلئے پاسپورٹ جمع کروانا لازمی تھا۔ موساد تو دنیا بھر کی جانی پہچانی ایجنسی تھی، کوئی معمولی جاسوسی ادارہ بھی اپنے ایجنٹوں کو اپنے ملکی پاسپورٹوں پر غیر ممالک میں کام کرنے کیلئے نہیں بھیجتا۔ موساد کیلئے ان کیلئے کسی دوسرے ملک کے پاسپورٹ حاصل کرنا بہت معمولی کام تھا۔

(جاری ہے)

غازی

میری اطلاع کے مطابق موساد کے ہیڈکوارٹرز میں دنیا بھر کے ممالک کے جعلی پاسپورٹ موجود تھے۔ کھٹمنڈو میں موساد کیلئے پاکستان کے خلاف کام کرنے کے مواقع نہ ہونے کے برابر تھے۔ یہاں پاکستان کا چھوٹا سفارت خانہ اور چند ہزار پاکستانی مہاجر تھے جو انگریزی اور عربی بولنے پر قادر نہ تھے۔ نیپال جیسے چھوٹے اور بے ضرر ملک میں دنیا بھر کے سفارت خانے موجود تھے اور کوئی یورپی ممالک اور خصوصاً امریکہ کی جاسوسی ایجنسیاں یہاں بھرپور طور پر سرگرم تھی، ان کا مشترکہ ٹارگٹ چین تھا جو بہت تیزی سے عالمی طاقت بن کر ابھر رہا تھا۔ ان اسرائیلی لڑکیوں (اگر وہ موساد کیلئے کام کر رہی تھیں) کے پاسپورٹ اسی لئے اصل تھے کہ بوقت ضرورت وہ دوسرے ممالک کی جاسوسی ایجنسیوں سے مدد حاصل کر سکیں یا انہیں اطلاعات فراہم کر سکیں۔ کیونکہ چین کی جاسوسی کرنا ان سب کا مشترکہ مقصد تھا، ان تمام پہلوؤں پر اچھی سے طرح غور کر کے میں نے اپنی ما ئیگی کو دیکھا۔ میں اور میرے تین محافظ کسی طرح بھی ان بے پناہ وسائل کی حامل ایجنسیوں سے الجھنے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ چاروں مہاجر لڑکے اپنی مرضی سے ان لڑکیوں تک پہنچے اور پھر غائب ہوئے تھے۔ انہیں سڑک سے جبراً اغوا نہیں کیا گیا تھا اور اس کا ابھی کوئی ٹھوس ثبوت نہ تھا کہ آخری بار وہ ان لڑکیوں کے ساتھ دیکھے گئے، سب سے زیادہ تعجب اس بات پر تھا کہ لڑکوں کے والدین اور لواحقین نے پاکستانی سفارت خانے میں بھی اس واقعہ کی کوئی اطلاع دی تھی اور نہ ہی مدد مانگی تھی۔ میں نے اس معاملے میں خاموشی ہی بہتر سمجھی اور اسے دل و دماغ سے نکال دیا۔

ٹورسٹ ان میں جانے کے تیسرے روز رات کو جب میں چنگ وا ریسٹورنٹ سے اپنے ہوٹل واپس آیا تو ریسپشن والوں نے بتایا کہ کافی شاپ میں ایک مرد اور عورت میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میری جان پہچان کے حلقے میں کوئی ایسا نہ تھا جو رات کے گیارہ بجے بغیر اطلاع دیئے مجھے ملنے آتا۔ میں نے اپنا پسٹل اندرونی بیلٹ سے نکال کر جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا اور کافی شاپ میں چلا گیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے کافی شاپ کے خاصے بڑے ہال میں صرف ایک ٹیبل OCCUPIED دیکھا۔ جس پر ایک اسرائیلی لڑکی اور ایک مرد بیٹھا تھا مجھے دیکھتے ہی لڑکی مسکرائی اور میرے اصلی نام سے مخاطب کر کے مجھے اپنے پاس آنے کا کہا میں حیرتوں کے سمندر میں غرق اس کے ٹیبل پر گیا تو لڑکی نے اس مرد سے میرا تعارف کرایا اور ٹیبل پر بیٹھنے کی دعوت دی۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا تو لڑکی نے اس مرد سے میرا تعارف کرایا اور ٹیبل پر بیٹھنے کی دعوت دی۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا تو لڑکی نے بغیر تمہید باندھے مجھے کہا ''آپ میری تلاش میں پہلے بھٹو ناتھ کے مندر اور پھر ٹورسٹ ان میں آئے۔ میں اور میرے ساتھی آپ کے متعلق سب کچھ جانتے ہیں اور مجھے بڑی حیرت ہوئی جب آپ نے مجھ تک پہنچنے کی کوشش کی۔ پاکستان سے بے شک ہمارے بڑے اختلاف ہیں لیکن یہاں کھٹمنڈو میں ہمارا پاکستان کے خلاف کوئی مشن نہیں۔ جاسوسی کے بین الاقوامی اصولوں کے تحت ہمیں بلاوجہ ایک دوسرے کے کاموں میں مداخلت نہیں کرنی چاہئے اور اسی وجہ سے ہم آپ کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ حالانکہ آپ کی کھٹمنڈو آمد کے تیسرے روز ہی ہمیں آپ کے متعلق پوری معلومات مل چکی تھیں۔ یہاں بھی آپ نے جو کچھ کیا ہمیں اس کا پورا علم ہے۔ اگر آپ آپ ہمارے ساتھ یہاں معلومات کا تبادلہ کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں شمال (چین) سے دلچسپی ہے اگر ایسی کوئی بات نہیں تو آپ نہ ہمارے متعلق سوچیں اور نہ ہی ہم آپ کے متعلق سوچیں گے بھارت اور کھٹمنڈو میں آپ کے کامیاب مشنوں پر میں ذاتی طور پر آپ کو مبارکباد دیتی ہوں۔ ہماری ہمیشہ یہ خواہش رہے گی کہ کھٹمنڈو میں ہمارا ٹکراؤ نہ ہو۔'' یہ کہہ کر لڑکی اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کا ساتھی بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ لڑکی نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا'' مجھے امید ہے کہ آئندہ جب کبھی بھی ہمارا اچانک آمنا سامنا ہوا تو ہم بالکل اجنبیوں کی طرح BEHAVE کریں'' میں نے اسے جواباً کہا'' میں تمہاری دلیری پر ابھی تک حیرت میں ڈوبا ہوں۔ میری تم سے ملنے کی خواہش تمہارے کاموں میں مداخلت کرنے کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ میں ان چار مہاجر لڑکوں کی وجہ سے تم سے ملنا چاہتا تھا جو کھٹمنڈو سے یکا یک غائب ہو گئے اور میری اطلاعات کے مطابق انہیں آخری بار تمہارے یا تمہاری ساتھی لڑکیوں کے ساتھ دیکھا گیا'' اسرائیلی لڑکی مسکرائی اور کہنے لگی'' تم بہت چالاک ہو۔ نہ نہ کرتے ہوئے بھی مجھ سے اپنے مطلب کی بات پوچھ لی۔ مزید کوئی سوال نہ کرنا۔ میں صرف اتنا بتا سکتی ہوں کہ وہ چاروں اپنی مرضی سے بھارت چلے گئے ہیں اور وہاں کسی بھارتی کیمپ میں جاسوسی کی تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ یہ کہہ کر اس لڑکی نے دوبارہ مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولی'' کافی شاپ میں ہمارا بل تم ادا کرنا۔ اسے اس معمولی سی اطلاع کی قیمت سمجھ لینا جو میں نے تمہیں دی ہے۔'' وہ دونوں تو چلے گئے لیکن میں دو گھنٹے تک کافی شاپ میں حیران و غلطاں بیٹھا رہا۔

رات دو بجے میں اپنے کمرے میں گیا اور دن چڑھے تک سوتا رہا، اسرائیلی لڑکی کی بے باک اور کافی حد تک صحیح گفتگو نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

(جاری ہے)

غازی

میں کھٹمنڈو میں درحقیقت بالکل تنہا تھا۔ میرے تینوں چینی ساتھی بالکل روبوٹس کی طرح تھے۔ وہ میری حفاظت کرتے تھے اور میرے کہنے پر کسی کو بھی ٹھکانے لگانے کو ہر دم تیار تھے لیکن میں ان سے کسی بھی مشن کے متعلق مشورہ نہیں کر سکتا تھا۔ پاکستانی سفارت خانے کے ارکان اول تو تعداد میں اتنے کم تھے کہ اپنے سفارتی فرائض ہی بمشکل پورے کر سکتے تھے دوسرے انہیں اس بات سے کوئی سروکار نہ تھا کہ پاکستان کے خلاف جو سازشیں کھٹمنڈو میں ہو رہی تھیں اور جنہیں ان کے علم میں بھی لایا گیا تھا ان کے خلاف کوئی عملی قدم اٹھاتے۔

مجھے یقین تھا کہ 9 ملکی باہنی والوں اور 5 غداروں کو جنہیں میری ٹیم نے میری ہدایات پر ٹھکانے لگایا تھا، ان کی رپورٹ بھی ہمارے سفارت خانے پاکستان نہیں بھیجی ہو گی۔ اپنے سفارت خانے کے متعلق میرا مجموعی تاثر یہ تھا کہ وہ پیسے بنانے اور سفارتی حقوق کی آڑ میں ڈیوٹی فری گاڑیاں اور ایسا سامان جس کی سفارت خانے کو اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوئی ضرورت نہ تھی غیر ممالک سے سستے داموں منگوانے کے لئے یہاں آئے تھے۔ ان اہم کاموں کے بعد جو فالتو وقت بچ جاتا اس میں وہ بادل ناخواستہ سفارتی فرائض بیگار سمجھ کر انجام دیتے۔ کھٹمنڈو میں میری موجودگی اور سرگرمیوں کو انہوں نے کبھی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ صرف ایک ٹرانسمیٹر آپریٹر تھا جو میرے محکمے سے آیا تھا۔ سفارت خانے میں اس کی پوزیشن اتنی محدود تھی کہ وہ میرے لئے نیک خواہشات کے سوا کچھ اور نہ کر سکتا تھا۔ بھارت میں گورکھپور کا مشن اور کھٹمنڈو میں ساری کارروائیاں میں نے اپنے ذاتی فیصلے سے کی تھیں۔ مجھے اپنے محکمے سے ان کے متعلق کوئی ہدایات نہیں ملی تھیں۔ یہ سب بھارت سے میری نفرت اور سقوط ڈھاکہ میں اٹھائی گئی ذلت کیخلاف انتقامی جذبے کا ردعمل (REACTION) تھا۔ اگر میں بھارت میں گرفتار نہ ہوتا اور مجھے وہاں مزید کام کرنے کا موقع ملتا تو میں وہاں اپنے انتقام کے جذبے کو ٹھنڈا کرتا، لیکن گرفتاری کے بعد میرے ساتھ جو سلوک کیا گیا اور جس طرح میرے وطن اور میرے مذہب کے متعلق مجھے زنجیروں میں جکڑ کر جو بے ہودہ بکواس کی گئی اس سے میری بجھتی ہوئی انتقامی آگ دوبارہ مزید شدت سے بھڑک اٹھی تھی۔ پڑھنے والوں کو یاد ہو گا کہ میں نے بھارت میں گرفتاری سے پہلے جتنے بھی مشن انجام دیئے ان میں کسی کو خود ہلاک نہیں کیا۔ گورکھپور میں ان دو شہریوں کو بھی میں نے محض انسانیت کی بنا پر مارنے سے گریز کیا تھا لیکن گرفتاری سے فرار کے بعد میں نے صرف بمبئی میں خود 6 افراد کو پسٹل سے ہلاک کیا۔ فرار کی کوشش کے دوران میں گارڈز کو زخمی کر سکتا تھا لیکن میں بیونٹ ان کے جسموں کی ایسی جگہوں میں داخل کی جس سے ان کا زندہ بچنا ناممکن تھا۔ کھٹمنڈو میں بھی میں ہلاکت سے کم درجے کا قدم اٹھا سکتا تھا لیکن یہ انتہائی اقدام میری بھارت سے نفرت کا مظہر تھے۔ اسرائیلی لڑکیوں کی باتوں نے مجھے ایک نئی راہ دکھائی۔ وہ اپنے ملک کے مفاد میں اس حد تک آگے جا چکی تھیں کہ نشے کی لت اور جسم کی آبرو تک کی پرواہ نہ کی لیکن ان کے سامنے ایک واضح مقصد اور مقررہ ٹیم نے اسے ٹھکانے لگا دیا۔ میں وقتی طور پر تو دشمنوں پر غالب آیا تھا لیکن ایک کی جگہ دس دشمن آ جاتے تھے۔ ان دشمنوں اور دوسرے ممالک کی پاکستان دشمن ایجنسیوں سے بلا وجہ بھڑ جانا کسی طور مناسب نہ تھا۔ مجھے اپنی توانائیاں محفوظ رکھنے کی ضرورت تھی تاکہ صحیح ضرورت پڑنے پر ان کا بھرپور استعمال کر سکوں۔ مریم بھی بار بار مجھے یہی بات سمجھاتی تھی انہی چار مہاجر لڑکوں کے بارے میں اس نے مجھے کہا تھا کہ جب ان کے والدین کو ان کی فکر نہیں تو تم کیوں ان کے غم میں گھلے جا رہے ہو۔

(جاری ہے)

غازی

تم پولیس نہیں ہو،فوج نہیں ہو،صرف ایک فرد واحد ہو اور دشمن کی قید میں سختیاں جھیلنے کے بعد نیم شکستہ حالت میں کھٹمنڈو پہنچے ہو۔یہاں تم نے موت کا جو کھیل کھیلا ہے وہ قطعاً تمہارے فرائض میں شامل نہیں۔اب بس کرو اور اپنی طاقت اور ہمت کو یوں بیکار ضائع نہ کرو، پاکستان دشمن کارروائیاں تو ہمیشہ جاری رہیں گی۔تم بہت کرو گے تو مزید دس بیس دشمن مار لو گے یا ان کے ہاتھوں مارے جاؤ گے تمہارے سفارت خانے والے تو تمہاری لاش لینے سے بھی انکار کر دیں گے اور تم لاوارثوں کی طرح یہاں دفن کر دیئے جاؤ گے۔یہ سب باتیں سوچ کر میں نے بالآخر فیصلہ کیا کہ میں آئندہ بلاوجہ ایسے کاموں میں ہاتھ نہیں ڈالوں گا اپنی زندگی کو سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے کے مصداق بیکار میں داؤ پر نہیں لگاؤں گا۔پہلے سے مارک شدہ وجے کمار کو بلاشبہ اس کو ملتے ہی ضرور ہلاک کروں گا لیکن اس کے علاوہ اپنا پسٹل اور گیس سلنڈر اس وقت تک استعمال نہیں کروں گا جب تک دشمن خود سامنے نہ آ جائے اور بچنے کا کوئی چارہ نہ رہے۔

میں نے مریم کو اسرائیلی لڑکی سے ملنے کا سارا واقعہ سنایا اور اپنے فیصلے کا بتایا تو وہ بہت خوش ہوئی کہنے لگی مجھ سے تو وہ اسرائیلی لڑکی بہتر رہی جس نے ایک ملاقات میں ہی تمہارے ارادے بدل دیئے کہیں وہ تمہیں بھا تو نہیں گئی اور کہیں اسرائیل جانے کے پروگرام تو نہیں بن گئے؟ یہ مریم نہیں بلکہ عورت کی فطری کمزوری بول رہی تھی۔میں نے خود کو مصروف رکھنے کیلئے کھٹمنڈو میں مختلف ممالک کی جاسوس ایجنسیوں اور ان کے ٹارگٹس کے متعلق اپنی ممکنہ معلومات پر تفصیلی رپورٹس پاکستان بھیجنے کا پروگرام بنایا اس کے علاوہ بھارت میں انجام دیئے مشنوں کی تفصیلاً رپورٹ لکھنی شروع کر دیں ان رپورٹس کی تیاری میں دن کا خاصا وقت صرف ہو جاتا۔شام کو مجھے بہر حال چنگ وا ریسٹورنٹ جانا ہوتا تھا۔مریم کے بے حد اصرار پر میں اس بات پر راضی ہو گیا کہ رپورٹس کی تیاری میں ایک دن اپنے ہوٹل اور دوسرے روز اس کے گھر میں قیام کروں اس نے اس کا جواز یہ بتایا کہ ہوٹل کے کمرے میں ہر روز سارا دن گزار دینے سے اول تو میں بور ہو جاؤں گا اور حفاظتی نقطہ نظر سے بھی یہ ٹھیک نہیں کیونکہ اس طرح ان دیکھے دشمنوں کو وار کرنے کا بہت اچھا موقع مل جائے گا میرے لئے یہ پروگرام اس لئے بھی بہتر تھا کہ ہوٹل میں محسن کے علاوہ کئی مہاجر بھی ہر روز ملنے آ جاتے تھے جن کی وجہ سے لکھنے کیلئے یکسوئی میں خلل پڑتا تھا۔

بھارت میں قیام کی رپورٹس تو میں دہلی اور بمبئی سے دو مرتبہ پاکستان بھیج چکا تھا اس لئے انہیں تیسری بار تفصیلاً لکھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔کھٹمنڈو میں قیام کے دوران اپنے مشنز کی رپورٹس تفصیلاً لکھنے میں مجھے اس لئے دشواری پیش آ رہی تھی کہ یہ مشن میں نے محکمے کی ہدایت کے بغیر اپنی صوابدید پر کئے تھے۔چینی محافظوں کو بھی صرف میری حفاظت کے لئے بھیجا گیا تھا جن سے میں نے انہیں تفویض کئے گئے فرائض سے زیادہ کام لیا تھا۔ان مشنوں کے معقول جواز لکھنے کیلئے میرے پاس ٹھوس ثبوت نہ تھے۔یہ بات روز روشن کی طرح عیاں تھی پوری چھان بین اور مکمل تسلی کے بعد میں نے کھٹمنڈو میں 9 مکتی باہنی والوں اور 5 غداروں کو ہلاک کیا تھا لیکن ان دونوں الزامات کا میرے پاس کوئی ثبوت نہ تھا میرے خیال میں بھارتی ایجنسی والوں نے ان واقعات کو اس پس منظر میں لکھا ہو گا کہ میری ان حرکات کی وجہ سے ایمبیسی کو اپنے فرائض انجام دینے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔مہاجروں میں بھی سوائے محسن کے کوئی ایسا نہ تھا جو میری تائید میں کچھ لکھ کر دینے کو تیار ہوتا۔مرنے والوں کی اصلیت جاننے کے باوجود وہ ایسی تحریر دینے سے کتراتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اکیلا تھا اور انہیں پاکستان پہنچنے کے لئے پہلے ہمارے سفارت خانے سے اور پاکستان پہنچ کر وزارت خارجہ اور وزارت داخلہ سے اپنی بحالیات سے واسطہ پڑتا تھا۔میں نے اس ذہنی پریشانی سے نکلنے کے لئے بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ فی الحال کھٹمنڈو کی رپورٹس کی تفصیلات لکھنی چھوڑ دوں جب پاکستان جاؤں گا تو وہاں ان کی تفصیل زبانی بتاؤں گا اور انہیں قائل کروں گا کہ میرے اقدام جائز تھے میں نے یہ فیصلہ تو کر لیا لیکن اس کی سوچ کو دماغ سے جھٹک نہ سکا۔

میں انہی دنوں میں ایک رات چنگ وا سے رکشے پر واپس اپنے ہوٹل آ رہا تھا۔میرے چینی دوست میرے پیچھے دوسرے رکشے میں تھے۔میں اپنی سوچوں میں گم تھا کہ میرا رکشہ چلتے چلتے اچانک الٹ گیا اور میں لڑھکتا ہوا دور جا پڑا اسی وقت پانچ چھ فائر ہوئے۔دو گولیاں تو میرے بالکل قریب سڑک سے ٹکرائیں باقی میرے سر کے اوپر سے گزر گئیں۔میرے چینی ساتھی سڑک کی ہلکی روشنی میں پہلے ہی غائب ہو چکے تھے۔میرے رکشے والا سڑک پر ابھی تک گرا پڑا تھا میں نے اسے اٹھایا اور ہم دونوں نے رکشہ سیدھا کیا۔چینی ساتھیوں کے رکشے والا گولیوں کی آواز سنتے ہی اپنا رکشہ لے کر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔میں ابھی واقعے کو پوری طرح سمجھ نہ سکا تھا کہ میرے دونوں چینی ساتھی دو آدمیوں کو گردن سے اس سختی سے دبوچے لے کر آئے کہ ان کی آواز تک نہ نکلتی تھی ان کے ہاتھوں میں خنجر چمک رہے تھے اس سے پہلے کہ وہ خنجر انہیں بھونک دیتے میں نے انہیں روکا اور اشاروں سے کہا کہ انہیں زندہ چنگ وا میں لے جانا ہے۔

میرا مطلب سمجھ کر انہوں نے ان دونوں اجنبیوں کی کنپٹیوں پر جوڈو کے دو ایسے ہاتھ رسید کئے کہ دونوں فوراً بے ہوش ہو گئے۔انہیں رکشے میں ڈال کر میں نے رکشے والے کو سو روپے دیئے اور اسے واپس چنگ وا چلنے کا کہا۔ریسٹورنٹ سے کچھ آگے جا کر ایک نسبتاً سنسان جگہ تھی۔وہاں رکشے سے ان دونوں کو اتار کر چینی دوستوں کو اوٹ میں لٹا دیا اور میں نے ریسٹورنٹ جا کر مریم کو ساری روداد سنائی۔مجھ پر قاتلانہ حملے کا سنتے ہی مریم کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا میں نے اسے سمجھایا کہ یہ وقت جوش سے نہیں بلکہ ہوش سے کام لینے کا ہے۔بڑی مشکل سے میں نے اسے قابو کیا اور کہا کہ مجھے اپنی گاڑی میں شیر پنجاب ریسٹورنٹ لے چلے۔شیر پنجاب ریسٹورنٹ پہنچ کر میں نے سردار ہرنام سنگھ سے چند منٹ ادھر ادھر کی باتیں کر کے ان کی گاڑی مانگی وہ کچھ گھبرا گیا اور پوچھنے لگا کہ آج پھر کسی کا جھٹکا کرنا ہے میں نے کہا کہ سردار جی یہ بات نہیں باہر گاڑی میں ایک لڑکی بیٹھی ہے۔یہ گاڑی اس کی سہیلی کی ہے جسے اس نے اب واپس کرنا ہے اور میں مزید دو چار گھنٹے اس لڑکی کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں اس لئے تمہاری گاڑی کی ضرورت ہے سردار جی نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا کہ ذرا ہم بھی اسے دیکھ لیں پھر موجیں لو لو۔یہ کہتے ہوئے سردار جی نے گاڑی کی چابی مجھے دی اور گدی سے اٹھے۔میں نے جلدی سے باہر نکلتے ہوئے مریم کو اشارہ کیا اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور جب سردار جی باہر پہنچے وہ گاڑی چلائی مریم کی صرف معمولی سی جھلک دیکھ سکے۔سردار جی کی گاڑی لے کر میں چینی ساتھیوں کے پاس پہنچا۔انہوں نے دونوں بے ہوش آدمیوں کو گاڑی میں ڈالا۔اتنی دیر میں مریم بھی اپنی گاڑی پارک کر کے آ گئی اور میرے ساتھ بیٹھ گئی۔چینی ساتھی بھی پیچھے بیٹھ گئے اور میں نے گاڑی چین کی تعمیر کردہ سڑک کی طرف موڑ دی۔مریم کے مطابق اس سڑک پر چند کلومیٹر کے فاصلے پر ایک تنگ سڑک نیچے گھاٹی میں اترتی تھی جو بڑی سڑک پر بنے پل کے ستونوں تک جاتی تھی۔پل کی تعمیر کے دوران سامان اسی تنگ سڑک کے ذریعے نیچے گھاٹی میں لایا جاتا تھا۔ہماری منزل اس تنگ سڑک کا آخری حصہ تھا جس پر دور دور تک کوئی انسان دکھائی نہ دیتا تھا۔

تنگ سڑک سے اتر کر ہم گھاٹی میں اس مقام پر پہنچے جہاں بجری کے چند ڈھیر ابھی تک پڑے ہوئے تھے جو پل کی تعمیر کے دوران استعمال ہوئی تھی میں نے گاڑی روکی اور باہر نکل آیا میرے ساتھ ہی مریم اور دونوں چینی ساتھی بھی گاڑی سے باہر آ گئے۔

(جاری ہے)

غازی

ابھی تک مجھے اور مریم کو اس واقعے کے متعلق صرف اتنا علم تھا کہ مجھ پر گولیاں چلائی گئیں۔ گولیاں چلنے سے چند سیکنڈ پہلے میرا رکشہ الٹا اور پھر چینی ساتھی دو اجنبیوں کو دبوچے ہوئے لے آئے۔ میں نے مریم کے ذریعے ان چینی ساتھیوں سے سارا واقعہ پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ میرے رکشے کے پیچھے ان کا رکشہ تھا انہوں نے میرے رکشے سے آگے سڑک کی دوسری جانب دو آدمیوں کو مجھے اپنے اسلحے کی شست میں لیتے دیکھا۔ مجھے بچانے کے لئے ان کے پاس بہت کم وقت تھا سو پہلے تو ان دونوں نے میرے رکشے کو دھکا دے کر الٹ دیا۔ اسی دوران فائرنگ شروع ہوگئی۔ یہ دونوں فائر کرنے والوں کی طرف لپکے جنہیں غالباً یہ علم نہیں تھا کہ یہ دونوں چینی میرے محافظ ہیں۔ اس سے پہلے کہ فائر کرنے والے ان کی طرف متوجہ ہوتے، انہوں نے ان کے نازک اعضا پر ایسی ککس لگائیں کہ وہ بے حال ہوگئے۔ دونوں کے پاس دو ریوالور اور بیسیوں فالتو گولیاں تھیں۔ ان سے اسلحہ لے کر اور دونوں کی گردن کی نسیں دبا کر ان کی قوت گویائی ختم کرکے وہ انہیں میرے پاس لے آئے جہاں وہ رکشہ سیدھا کرکے کھڑا ہوا ہی تھا آگے کے واقعات مجھے معلوم تھے۔ مریم کے پاس ٹارچ تھی روشنی میں یہ دونوں بھارتی دکھائی دیتے تھے ٹارچ لے کر میں نے مریم سے کہا کہ وہ ذرا ہٹ کر کھڑی ہو جائے اور چینی دوستوں کی مدد سے میں نے چیک کیا وہ دونوں ہندو تھے۔

میں نے چینی دوستوں سے کہا کہ انہیں ہوش میں لانا ہے۔ مارشل آرٹ انسانی جسم پر اس قدر حاوی اور قدرت رکھتا ہے کہ مختلف حصوں پر ضرب پہنچا کر ہلاک یا بے ہوش بھی کیا جاسکتا ہے اور بعض حصوں پر یہی ضرب بے ہوش کو ہوش میں بھی لا سکتی ہے۔ چینیوں نے انہیں گاڑی سے باہر نکال کر بجری پر ڈال دیا اور ان کے ماتھوں پر اس ڈھب سے پاؤں سے ضرب لگائی کہ چند لمحوں میں ہی وہ ہوش میں آگئے۔ میرے کہنے پر ایک کو ایک چینی ساتھی گردن سے پکڑ کر کھائی میں ہم سے دور لے گیا۔ میں چاہتا تھا کہ ان حملہ آوروں سے الگ الگ انکوائری کروں۔ بجری پر لیٹے حملہ آور پر میں نے اپنا سائلنسر والا پسٹل تان لیا اور کہا کہ اگر 5 منٹ کے اندر اس نے سب کچھ بالکل ٹھیک ٹھیک نہ بتایا تو پستول کی ساری گولیاں اس پر خالی کروں گا۔ میں نے اسے یہ وارننگ بھی دی کہ اگر اس کا بیان اس کے ساتھی سے مختلف ہوا تب بھی وہ دونوں نہ بچ سکیں گے۔ یہ آدمی اس سنسان جگہ پر خود کو اس حالت میں دیکھ کر ڈر سے کانپنے لگ گیا اور ہاتھ جوڑ کر منمیانے لگا کہ اس کی جان بخش دوں۔ اس کے بیان کے مطابق وجے کمار نے لکھنؤ سے ان دونوں کو مجھے مارنے کے لئے HIRE کیا تھا۔ یہ دونوں لکھنؤ کے بڑے بدمعاشوں میں شمار ہوتے تھے اور وجے نے ان کے استاد کے ذریعے چالیس ہزار میں یہ سودا کیا تھا۔ ریوالور اور گولیاں بھی وجے نے ہی انہیں دی تھیں۔ وجے گزشتہ رات ہی ان کے ہمراہ کھٹمنڈو پہنچا تھا اور اپنے گھر میں موجود تھا۔ چینی دوست اسے لے کر دور اندھیرے میں چلا گیا اور دوسرا چینی دوسرے حملہ آور کو لے آیا۔ اس کا بیان بھی بالکل پہلے والے حملہ آور جیسا تھا۔ میں نے انہیں زندہ تو چھوڑنا تھا نہیں کیونکہ مجھ پر حملہ کرنے کے علاوہ انہوں نے مریم اور چینی دوستوں کو بھی دیکھ لیا تھا اور میں کسی صورت بھی مریم اور چینی دوستوں کو اس قتل و غارت میں ملوث کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے ان دونوں کے نام پوچھے اور بجری پر انہیں الٹا لیٹنے کو کہا۔ ان کے لیٹتے ہی میں نے اپنے پسٹل کی ساری گولیاں ان دونوں پر ایک ایک کرکے داغ دیں۔ سائلنسر کی وجہ سے گولیوں کی آواز بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔

(جاری ہے)

غازی

جب چینی دوستوں نے ان کی نبضیں ٹٹول کر ان کے مرنے کی تصدیق کر دی تو میں نے پسٹل میں دوسری میگزین ڈالی اور گاڑی لے کر مین روڈ پر آ گیا۔

مریم نے زندگی میں پہلی بار اس طرح لوگوں کو ہلاک ہوتے دیکھا تھا۔ اس کی ساری دلیری اس وقت ایک خوفزدہ عورت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ تحفظ کے احساس کیلئے اس کا ایک ہاتھ بے اختیاری میں میرے بائیں ہاتھ کو تھامے ہوئے تھا جس سے میں گاڑی کے گیئر بدل رہا تھا۔ شہر پہنچ کر جب میں نے گاڑی ایک نئی سڑک پر موڑی تو مریم نے پوچھا کہ اب ہم کہاں جا رہے ہیں میں نے کہا'' کام مکمل کرنے'' مریم اتنی ڈری ہوئی تھی کہ بجائے لمبے لمبے لیکچر دینے کے اس نے صرف یہ کہا AS YOU LIKE (جیسے تم چاہو)۔ وجے کے گھر سے تھوڑی دور میں نے گاڑی روکی۔ مریم گاڑی میں ہی بیٹھی رہی اور میں دونوں چینی دوستوں کے ہمراہ وجے کے گھر پر جا پہنچا۔ دومنزلہ بلڈنگ کی دوسری منزل پر اس کا کارنر فلیٹ تھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے بیل بجائی تو تھوڑی دیر بعد وجے کی دروازے کے قریب سے آواز آئی'' کون ہے'' میں نے آواز بدل کر اور کھانستے ہوئے ایک حملہ آور کا نام لیا۔'' کام ہو گیا؟'' وجے نے اندر سے پوچھا'' ہاں، لیکن میرا بازو زخمی ہو گیا ہے دروازہ کھولو ورنہ باہر فرش پر دھپ پڑ جائیں گے''۔ میں نے حتی الامکان اپنی آواز کو چھپاتے ہوئے کہا۔ وجے نے دروازہ کھولا تو میں ذرا پیچھے ہو گیا لیکن میرے چینی دوست یکبارگی دروازے کو زور سے دھکا دے کر اندر داخل ہوئے اور وجے کو مدد کیلئے چلانے کا موقع دیئے بغیر اسے فرش پر گرا کر اس کے منہ میں رومال ٹھونس دیا۔ میں نے اندر آ کر دروازہ بند کیا۔ انتہائی وحشت زدہ وجے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کچھ بولنے کیلئے اوں آں کی تو میں نے کہا'' مسٹر وجے کمار آج تم نہیں صرف میں بولوں گا اور تم سنو گے تم نے مجھے دوست بن کر اپنے جال میں پھانسنا چاہا اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی رہے۔ میں تم پر اعتبار کرنے لگا اور اگر چنگ وا ریسٹورنٹ میں تمہاری اور بھارتی سفارتکاروں کی آواز کی خفیہ ریکارڈنگ سے مجھے تمہاری اصلیت کا پتہ نہ چلتا میں تم پر دوستی کے اعتبار میں جانے کہاں سے کہاں چلا جاتا۔ یہ سب کچھ میں تمہیں اس لئے بتا رہا ہوں کہ تم نے میرے اعتماد اور بھروسے کو دوستی کے پردے میں ٹھیس پہنچائی۔ چنگوا ریسٹورنٹ اور اپنے چینی دوستوں کا بھی اس لئے تمہیں بتایا ہے کہ تم کسی سے ان کا ذکر کرنے کیلئے زندہ نہیں رہو گے۔ لکھنؤ سے تمہارے لائے ہوئے دونوں بدمعاش بھی اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں۔ تمہاری دوستی کے بہروپ میں گزارے ہوئے چند دنوں کی وجہ سے تمہیں گولی سے ہلاک نہیں کروں گا۔ یہ کہتے ہوئے میں نے اپنے ایک چینی دوست سے گیس سلنڈر لیا ہم نے اپنے ناک رومالوں سے بند کر لئے۔ میں نے سلنڈر وجے کے چہرے کے بالکل قریب لے جا کر گیس خارج کی۔ بلکہ یوں کہئے کہ اس کے نتھنوں میں گیس چھوڑی۔ چند لمحوں کیلئے وجے کی آنکھیں ابل کر باہر آ گئیں اس کا جسم ایک دو بار پھڑکا اور پھر بے جان ہو گیا۔ ہم تینوں اسے وہیں اسی حالت میں چھوڑ کر اندرونی دو کمروں میں گئے۔ ایک الماری سے ہمیں ساٹھ ہزار سے زیادہ بھارتی کرنسی اور ایک بڑا بریف کیس ملا جس میں سرکاری کاغذات اور فائلیں تھیں۔ کاغذات کو ایک نظر دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ یہ دہلی سے وجے کے رابطے اور ہدایات سے متعلق تھے میں نے کرنسی چینی دوستوں کو دے دی۔ بریف کیس خود اٹھایا وجے کی آنکھیں بند کیں اس کے منہ سے رومال نکال کر اور دروازہ بند کر کے ہم آہستہ قدموں سے چلتے سڑک پر آ گئے۔ گاڑی میں مریم بے چینی سے ہماری منتظر تھی۔ اس پر یہ ایک ایک لمحہ قیامت کا گزرا ہو گا۔ میرے گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے چینی دوستوں کی موجودگی سے بے پرواہ ہو کر میرے سینے پر سر ٹکا دیا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بہنے لگی۔ میں نے بڑی مشکل سے اس کا رونا بند کیا۔ میں نے حملہ آوروں کے دونوں پسٹل بھی چینی ساتھیوں کو دینے چاہے تو انہوں نے بتایا کہ ان کے پاس پستولوں کے علاوہ کئی قسم کا خطرناک اسلحہ موجود ہے۔ چنگ وا پہنچ کر مریم نے اپنی گاڑی نکالی۔ دونوں گاڑیاں شیر پنجاب ہوٹل کے قریب روک کر چینی دوست مریم کی گاڑی میں بیٹھ گئے میں گاڑی لے کر شیر پنجاب پر آ گیا۔ سردار جی ریسٹورنٹ بند کروا کے صفائی کروا رہے تھے۔ کہنے لگے:'' بہت جلدی واپس آ گئے''۔

میں نے کہا'' کچھ جھگڑا ہو گیا تھا'' سردار جی نے ہنستے ہوئے کہا'' بادشاہو، عورت کو کیسے راضی رکھا جاتا ہے۔ یہ گر آپ ہم سے سیکھنا۔ ہم تو اس علم کے استاد ہیں''۔ میں نے سردار جی سے گر سیکھنے کا وعدہ کیا۔ گاڑی کی چابی واپس کی اور شکریہ ادا کر کے واپس چل دیا رات خاصی بیت چکی تھی مریم نے میرے اصرار کے باوجود مجھے میرے ہوٹل میں اتارنے سے انکار کر دیا۔ راستے میں چینی دوستوں کو اتارا اور ہم مریم کے گھر چلے آئے جہاں ایک کمرہ میرے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ مریم نے میرے پہننے کیلئے چائنیز اسٹائل کے کئی جوڑے سلوائے تھے یہ آرام دہ کپڑے پہن کر میں بستر میں دراز ہو گیا اور مریم اس دوران کافی بنا کر لے آئی۔ حملہ آوروں کے دونوں پستول اور گولیاں میں نے مریم کو دیں تاکہ محفوظ کر لے۔ مریم نے مجھے شب بخیر کہا تو میں بڑا حیران ہوا کہ اس نے اردو کیسے بولی۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ایک پڑھی لکھی پاکستانی مہاجر لڑکی سے اس نے ٹیوشن لینی شروع کر دی ہے۔ (جاری ہے)

غازی

مریم تو شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور میں مستقبل کے سہانے خیالوں میں کھویا بہت جلد نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

اگلے روز دن چڑھے ناشتہ کر کے میں اپنے ہوٹل پہنچا تو محسن میرے انتظار میں لابی پر بیٹھا تھا۔ وہ گزشتہ شام مجھے ملنے آیا تھا اور اس کے بقول وہ رات بارہ بجے تک میری راہ دیکھتا رہا۔ میرے نہ آنے سے وہ فکر مند تھا اس لئے صبح ہی وہ ہوٹل میں چلا آیا۔ میں نے اسے گزشتہ رات کے واقعات کے متعلق کچھ نہ بتایا کیونکہ میں چاہتا تھا کہ رات کے واقعے کی خبریں اس کے ذریعے مجھ تک پہنچیں۔

محسن کو لابی میں چھوڑ کر میں اپنے کمرے میں آیا۔ نہا دھو کر دوسرا لباس پہنا اور لابی میں آ کر محسن کو کافی شاپ میں لے گیا۔ ہمیں وہاں بیٹھے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ نیپالی پولیس کے دو انسپکٹر آ گئے۔ وہ مجھے اور میرے چینی ساتھیوں سے گزشتہ رات کی فائرنگ کے متعلق پوچھنا چاہتے تھے۔ ان کو یہ رپورٹ چینی دوستوں کے رکشہ والے نے دی تھی جو فائرنگ کی آواز سنتے ہی وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ میں نے انہیں کہا کوئی فائرنگ وغیرہ نہیں ہوئی۔ میرے رکشے کے پہیے تلے پتھر آ جانے سے رکشہ الٹ آ گیا تھا جسے ہم نے سیدھا کر لیا۔ چینیوں کے متعلق میں بالکل انجان بن گیا اور کہا کہ میں کسی ایسے چینی کو نہیں جانتا جو میرے پیچھے رکشے میں آ رہا ہو۔ وہ مجھ سے مزید سوال کرنا چاہتے تھے، کافی پینے کے دوران میں نے انہیں کہا کہ میں نے اپنے سفارت خانے جانا ہے میں ایک معزز شخص ہوں اور یہ نہیں چاہتا کہ ایک رکشہ ڈرائیور نے چرس کے نشے میں آپ سے جو غلط بیانی کی ہے اس کی بنا پر آپ مجھ سے بلا جواز سوال کریں یہ کہتے ہوئے میں نے ایک ہزار روپے کے نوٹ ٹیبل پر رکھ دیئے اور ان سے پوچھا کہ آپ یہ روپیہ لے کر رکشہ ڈرائیور کی غلط رپورٹ کو بھول جانا چاہیں گے یا مجھ سے سوال و جواب کا بیکار اور بے فائدہ سلسلہ جاری رکھنا چاہیں گے۔ میں نے بڑے اعتماد سے یہ روپے ٹیبل پر رکھے تھے۔ بیر گنج میں پولیس کے رویے کو میں دیکھ چکا تھا۔ کھٹمنڈو میں چرس ممانعت کے باوجود کھلے عام فروخت ہوتی تھی۔ میری معلومات کے مطابق چرس فروخت کرنے کے کئی اڈے پولیس والوں کی ملکیت تھے۔ قیام پاکستان سے پہلے ہندوستان کی مطلق العنان سینکڑوں ریاستوں میں نظم و نسق کا جو فقدان تھا نیپال میں بھی تقریباً وہی حالت تھی دونوں پولیس افسروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا نوٹ اٹھا کر جیب میں ڈالے مجھ سے ہاتھ ملا کر سیلوٹ کیا اور چلے گئے۔ ان سے پیچھا چھڑا کر میں نے محسن کو کہا کہ وہ مین بازار میں کشمیری شالوں کی دکان پر جائے اور دکان کا ٹیلی فون نمبر لا ئے۔ میرا اسے بازار بھیجنے کی وجہ ٹیلی فون نمبر لینا نہیں بلکہ وجے کی موت کا رد عمل دیکھنا تھا۔ محسن کو میں قابل اعتبار تو سمجھتا تھا لیکن اس میں ایک خامی تھی راز کی کوئی بات اس کے پیٹ میں ٹھہرتی نہیں تھی اور میں چاہتا تھا کہ حتی الامکان خود کو وجے کے قتل ہونے کے واقعے سے دور رکھوں۔ قتل ہونے کی کوئی نشانی وجے کے جسم پر نہ تھی۔ اس کی موت ہارٹ فیل ہونے کے سبب بھی ہو سکتی تھی۔ زہریلی گیس کی موجودگی عام پوسٹ مارٹم سے معلوم نہ ہو سکتی تھی اور کھٹمنڈو میں ایسی کوئی لیبارٹری نہ تھی جہاں اس گیس کا تجزیہ ہو سکے۔ مجھے یقین تھا کہ بھارتی انٹیلی جنس والے اپنے ایک منجھے جاسوس کی ہلاکت کو آسانی سے ہضم نہ کریں گے۔ ابھی لکھنؤ کے دو بدمعاشوں کے لاشوں کی دریافت بھی باقی تھی۔ دشمنوں کی نظروں میں تو میں پہلے روز سے ہی تھا لیکن کھٹمنڈو میں میری موجودگی کے دوران پے در پے مکتی باہنی اور بھارتی ایجنٹوں کی ہلاکت میں میرا ہاتھ ہونے کا کوئی ثبوت نہ تھا لیکن اگر بھارت میں میرے قیام کے دوران کے واقعات اور پھر کھٹمنڈو میں میری آمد کے بعد کے واقعات کا ایک ساتھ تجزیہ کیا جاتا تو یہ حقیقت سامنے آتی کہ جہاں جہاں میں گیا پاکستان دشمن ایک ایک کر کے ختم ہوتے گئے۔ میرا یہ سب تحریر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قارئین کو بتا سکوں کہ گو کہ میرے ظاہری دشمن تو ختم ہو رہے تھے لیکن پوشیدہ دشمنوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ DMI نے مجھے زندہ گرفتار کرنے کی جو پابندی عائد کی تھی اس کی وجہ سے میں اب تک بچا ہوا تھا۔ ورنہ کہیں سے ایک گولی آتی اور میرا کام تمام کر دیتی۔ وجے نے صرف اپنی جان کے خوف سے لکھنؤ کے بدمعاشوں کی خدمات ذاتی طور پر حاصل کی تھیں اور اگر اس کی پلاننگ کامیاب ہو جاتی تو وہ اس سے اپنی لاتعلقی ظاہر کرتا۔

محسن شام کو لوٹا۔ ٹیلی فون نمبر دینے کے ساتھ ہی اس نے بتایا کہ وجے کا گزشتہ رات انتقال ہو گیا ہے اور اس کی لاش کو بذریعہ جہاز دہلی بھیج دیا گیا ہے۔ محسن کو گزشتہ رات میری ہوٹل سے غیر حاضری کی وجہ یقیناً سمجھ میں آ چکی ہوگی لیکن اس نے اس سلسلے میں کوئی بات نہ کی۔

(جاری ہے)

غازی

گزشتہ رات رکشے پر فائرنگ اور روبے کی ہلاکت پر بھارتی سفارت خانہ یقیناً بھنا اٹھا ہوگا اور بدلے کی آگ میں جلتے ہوئے وہ کوئی بھی قدم اٹھا سکتا تھا میں نے مریم کو فون پر اپنے خدشات سے آگاہ کیا تو اس نے بھی ان کی تائید کی اور یہ فیصلہ ہوا کہ میں آئندہ شام کو کبھی چینگ وا ریسٹورنٹ میں ڈائریکٹ نہیں جاؤں گا بلکہ مختلف سڑکوں سے ہوتا ہوا وہاں پہنچوں گا اور واپسی پر مریم مجھے اپنی گاڑی میں ہوٹل چھوڑ جایا کرے گی۔ میں نے وقتی طور پر تو اس پروگرام پر عمل شروع کر دیا لیکن آئندہ چار پانچ دنوں میں برٹش پہیوں کی ایک وین خرید لی تھی جسے وہ پیسے ختم ہونے پر سستے داموں فروخت کر رہے تھے۔ ہوٹل کے ایک گارڈ کو میں نے معقول معاوضے پر گاڑی کی خصوصی دیکھ بھال، صفائی اور نگرانی پر رضامند کر لیا اس وین کے باعث رکشاؤں کے سفر سے میری اور میرے چینی محافظوں کی جان چھوٹ گئی اور میرا کہیں آنا جانا بھی نسبتاً زیادہ محفوظ ہو گیا۔

آئندہ چند روز بڑے سکون اور خاموشی سے کٹے۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یہ سکون اور خاموشی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہے یہ بالکل حقیقت ہے کہ مریم اور میں اس خاموشی اور سکون کے دوران بڑی بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ میرے چینی دوستوں نے مریم کے ذریعے میرے اصرار پر اپنے وہ خطرناک ہتھیار مجھے دکھائے جن کی وجہ سے انہوں نے وہ ریوالور لینے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ عام سائز کے سگریٹ کیس جتنا بڑا اور موٹائی میں کچھ زیادہ تھا۔ لمبائی کے رخ اس کے کونے میں ایک چھوٹی سے ناب لگی ہوئی تھی جس میں سوئیاں تھیں۔ ناب کھینچنے سے 14 انچ تک باہر آ جاتی اور ایک زہریلی سوئی ناب کی سلاخ کے اندرونی سرے پر بنے پوائنٹ پر فٹ ہو جاتی۔ پسٹل کی میکانکی کے اصول پر کام کرنے والے اس ڈبے میں بنے ایک بٹن کو دبانے سے ناپ زہریلی سوئی کو پورے زور سے باہر دھکیلتی اور اس سوئی کی رینج بیس فٹ تک تھی۔ چہرے، گردن، ہاتھ یا جسم کے کسی بھی کھلے حصے میں یہ سوئی داخل ہو کر آدھے منٹ سے بھی کم وقت میں اپنے شکار کو ہلاک کر دیتی۔ اس کے چلنے کی نہ تو کوئی آواز آتی اور نہ ہی اس کا شکار جب تک ہلاک نہ ہو جاتا کسی کو بھی اس کی ہلاکت آفرینی کا علم ہوتا۔ چینی دوستوں نے اس ہتھیار کا ایک ڈبہ مجھے تحفے میں دیا۔ اس وقت مجھے علم نہ تھا کہ اس ہتھیار کو ٹیسٹ کرنے کا موقع بہت جلد ملنے والا ہے۔

آئندہ چند روز بڑے امن اور سکون میں کٹے۔ موسم میں تبدیلی کے آثار بھی دکھائی دے رہے تھے۔ UNO کے نمائندے نے اپنی نگرانی میں امدادی سامان کی تقسیم کی تھی۔ واپسی سے پہلے اس نے مہاجروں کی رہائش گاہوں کو بھی دیکھا تھا۔ اس نے مہاجروں کی حالت زار کی ایسی رپورٹ لکھی کہ افغان ایئر کے جہازوں کی پرواز کا شیڈول بھی سفارتخانے میں آ گیا۔ اس خبر نے مہاجروں میں خوشی کی لہر دوڑا دی۔ پروازیں شروع ہونے میں اگرچہ ابھی تین ماہ باقی تھے۔ لیکن جہازوں میں جگہ حاصل کرنے کیلئے مہاجروں کے ٹھٹ کے ٹھٹ سفارت خانے میں جمع ہونے لگے اور ایمبیسی والوں کیلئے پھر روپیہ کمانے کے ذرائع پیدا ہو گئے۔ ٹرانسمیٹر آپریٹر نے مجھے بتایا کہ اس بار جہاز میں سیٹ حاصل کرنے کا ریٹ دو ہزار روپے رکھا گیا ہے دو سال سے کھٹمنڈو میں بے یارو مددگار مہاجروں کو تو ٹالا جا رہا ہے کیونکہ وہ جو کچھ بھی سابقہ مشرقی پاکستان سے لانے میں کامیاب ہوئے تھے ان دو سالوں میں ختم کر بیٹھے ہیں لیکن بالکل نئے آنے والے مہاجروں کو جن کے پاس کچھ جمع پونجی ہے انہیں سیٹیں الاٹ کی جا رہی ہیں۔ اس سکھا شاہی کے خلاف پرانے مہاجروں نے سخت احتجاجی رویہ اپنایا ہے۔ وہ نہ صرف سفارت خانے بلکہ سفیر کے گھر کے باہر بھی نعرے لگاتے ہیں۔ مہاجروں کے ایک گروپ نے سفارت خانے کے باہر بھوک ہڑتال شروع کی تو سفارت خانے نے نیپالی پولیس کے ذریعے بھوک ہڑتالیوں کو لاٹھی چارج سے منتشر کروا دیا۔ اس سارے معاملے پر افسوس کرنے اور اپنی بے بسی کا اظہار کرنے کے علاوہ ایک ایسی خبر تھی جس نے مجھے چونکا دیا۔

مایوس مہاجروں کو انسانی ہمدردی کے لبادے میں بھارتی سفارت خانہ اپنی طرف راغب کر رہا تھا اور اس کے کارکن دیوالی کے تہوار کی آڑ میں مہاجروں میں خوردنی اجناس کے علاوہ روپے بھی تقسیم کر رہے تھے درجنوں مہاجر یہ امدادی سامان لینے ہر روز بھارتی سفارت خانے میں جاتے تھے جہاں مصدقہ اطلاع کے مطابق ان کا برین واش کرنے کے علاوہ انہیں ترغیب دی جاتی تھی کہ وہ ناانصافیوں کے خلاف اپنی آواز دنیا میں پہنچانے کیلئے پاکستانی اور بنگلہ دیشی سفارت خانوں کو نذر آتش کر دیں۔ یہ باتیں سن کر میری پہلی سوچ تو یہ تھی کہ اچھا ہو اگر مہاجر اسی طرح کریں۔ اس طرح کم از کم ان کی آواز تو بین الاقوامی میڈیا تک پہنچے گی۔ اس بارے میں بعد میں جوں جوں میں سوچتا گیا۔ بھارت کی اس سازش کے نقوش واضح ہونے لگے۔ وہ ایک تیر سے بیک وقت تین شکار کرنا چاہتا تھا۔ پاکستان کی رسوائی، پاکستان اور بنگلہ دیش کے حال ہی میں اچھے تعلقات کی ابتدا کو سبوتاژ کرنا اور مہاجروں کو نظم و نسق توڑنے اور جلاؤ گھیراؤ کے جرم میں نیپالی حکومت کے قانون کے مطابق لمبی مدت کیلئے جیلوں میں سڑوانا اور نیپال میں نئے مہاجروں کی آمد پر پابندی لگوانا۔ بھارت کو یہ گھناؤنی چال چلنے کا موقعہ صرف پاکستانی سفارت خانے کی دھاندلیوں کے باعث ملا۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ان ممکنہ پیش آنے والے حالات کی رپورٹ اپنے محکمے کو بھیجنے کے سوا میں کچھ نہ کر سکا۔

محسن نے اپنے ساتھ نئے شادی شدہ لڑکے بھی شامل کر لئے تھے۔ یہ بھارتی سفارت خانے جانے والے مہاجروں کی ٹوہ میں رہتے تھے انہوں نے ان کے نام پتے بھی حاصل کر لئے اور بھارتی اشاروں پر ان کے آئندہ ارادوں کے بارے میں بھی جان کاری حاصل کی۔ ان مہاجروں کا قطعاً کوئی ایسا ارادہ نہ تھا کہ پاکستانی اور بنگلہ دیشی سفارت خانوں کو آگ لگائیں۔ یہ محض اپنی مالی ضروریات پوری کرنے کیلئے بھارتی سفارت کاروں کی ہاں میں ہاں ملا دیتے تھے۔ مشرقی پاکستان میں مکتی باہنی اور بھارتی فوج کے ہاتھوں زخم خوردہ یہ مہاجر خود پر بیتے ظلم و رسوائی کے واقعات کو ہرگز نہیں بھولے تھے۔ پھر بھی حالات کی نزاکت کے پیش نظر میں نے محسن اور لڑکوں کے ذریعے ان مہاجروں میں بھارت کے اصل مقصد اور نتیجتاً مہاجروں کی گرفتاری کی بات ان میں پھیلا دی۔ اپنی طرف سے یہ اضافہ بھی کر دیا کہ بھارتی سفارت خانے جانے والے مہاجروں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو ایک ایک بات کی رپورٹ پاکستانی سفارت کاروں کو پہنچا دیتے ہیں۔ اس رپورٹ کی روشنی میں سفارت خانہ ان کی رجسٹریشن کینسل کر دے گا اور ان مہاجروں کو لامحالہ بھارت میں دھکیل دیا جائے گا۔ یہ سن کر مہاجروں کے تو ہوش اڑ گئے ان کی مالی ضروریات کے متعلق انہیں کہا گیا کہ اپنی جائز ضروریات کی فہرست بنا کر انا پورنا ہوٹل میں مجھ سے ملیں جہاں میں حتیٰ الوسع ان کی مدد کروں گا اب ان مہاجروں نے بھارتی سفارت خانے جانا چھوڑ دیا اور میرے ہوٹل کا رخ کیا۔ الگ الگ مہاجروں سے ملنے کے بجائے میں نے انہیں محسن کے ذریعے مشورہ دیا کہ اپنے پہلے دس نمائندوں کو اپنی ضروریات بتا کر میرے پاس بھیجیں یہ نمائندے آئے تو پہلے تو میں نے انہیں بھارتی سفارتخانے جانے پر بہت شرمندہ کیا اور بعد میں ان مہاجروں کی جائز مالی ضروریات پوری کیں جو پچیس ہزار روپے سے بھی کم تھیں قارئین کرام میں ان واقعات کو بلاوجہ تفصیلاً نہیں لکھ رہا میرا مقصد آپ کے یہ ذہن نشین کرانا ہے کہ مالی مجبوری انسان کو کس حد تک صحیح راستے سے ہٹا سکتی ہے۔ میری یہ کوشش ان مہاجروں کو بے خبری کے عالم میں غداری سے روکنے کیلئے تھیں جن کا خمیازہ آخر کار مجھے بھگتنا پڑا۔ انہی میں سے ایک مہاجر کو اپنی بیوی کے اپنڈکس کے فوری آپریشن کیلئے بھارتی سفارت خانے نے چار ہزار روپے دیئے تھے جب مجھے اس بات کا علم ہوا تو میں نے اسے روپے دے کر بھارتی سفارت خانے بھیجا کہ شکریے کے ساتھ روپے لوٹا دے اس کے جی میں نجانے کیا آئی اس نے روپے تو نہ لوٹائے الٹا سفارت خانے والوں کو یہ بتا دیا کہ مہاجروں کی مالی ضروریات پوری کر کے میں نے انہیں سفارت خانے جانے سے روک دیا ہے۔ روپے لے کر جب وہ سفارت خانے جا رہا تھا تو میں نے محسن اور چار لڑکوں کی ڈیوٹی لگائی کہ سفارت خانے سے باہر نکلتے ہی اسے گھیر گھار کر میرے ہوٹل میں لے آئیں جب اسے ہوٹل میں لایا گیا تو میرے پوچھنے پر اس نے کہا کہ روپے اس نے لوٹا دیئے ہیں میں نے چینی دوستوں کو کہا کہ اس کی تلاشی لیں تلاشی پر میرے دیئے ہوئے نشان زدہ نوٹ اس کی اندرونی جیب سے برآمد ہوئے۔ مجھے بے حد طیش آیا کہ ایک طرف تو میں ان کی بھلائی اور بہتری کیلئے اپنی زندگی کو ہر طرف خطرے میں ڈالے رکھتا تھا اور اس کے بدلے میں یہ میرے ساتھ منافقانہ سلوک کر رہے تھے اسی غصے کی حالت میں اسے میں نے پانچ سات چپت لگا دیئے اس نے اور تو کچھ نہ کیا موقعہ ملتے ہی تیر کی سی تیزی سے بھاگ کھڑا ہوا میں نے بھی اسے جانے دیا اور سوچا کہ اتنا سبق ہی کافی ہے۔

(جاری ہے)

غازی

اس نے اپنے دل میں گرہ باندھ لی وہ مجھ سے بدلہ لینے کیلئے بھارتی سفارت کاروں سے ملا اور اپنی وفا داری کے وعدے کر کے انہیں ایسا رام کیا کہ ان کے مشورے سے یہ شخص دو روز بعد میرے ہوٹل آیا اور فی الحقیقت میرے پاؤں پکڑ کر مجھ سے اپنی غلطی کی معافی مانگی۔ میں نے بھی اس کی مالی مجبوری کو سامنے رکھتے ہوئے اسے صدق دل سے معاف کر دیا اور چند روز میں ہی یہ میرے اردگرد منڈلاتے ہوئے بالآخر میرا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ سارا دن میرے ہوٹل کی لابی میں بیٹھا رہتا اور میرے پوچھنے پر کہتا کہ آپ کی وطن پرستی کا معتقد ہو چکا ہوں اور آپ سے ملے بغیر رہا نہیں جاتا۔ اس سے پیچھا چھڑانے کیلئے میں نے کئی بار بے رخی سے ہوٹل میں آنے سے منع کیا لیکن وہ باز نہ آیا۔ ہوٹل کی لابی سے نکالا تو ہوٹل کے باہر کھڑا رہنے لگا میرے دماغ پر وہ ایک بوجھ سا بن گیا تھا اس کی انہی حرکات نے مجھے اس کے بارے میں شک میں مبتلا کر دیا میں نے محسن اور لڑکوں کو اس کی نگرانی پر لگا دیا صبح سے لے کر اس کے اپنے گھر پہنچنے تک اس کی نگرانی ہوتی تھی لیکن کوئی ایسا سراغ نہ ملا جس سے اس کا بھارتی سفارت خانے سے اس کے رابطے کا ثبوت ملتا۔

میں حسب معمول ہر شام چنگ وا ریسٹورنٹ جاتا اور رات گئے واپس لوٹتا۔ مریم نے اب خالصتاً مشرقی لباس اپنا لیا تھا۔ اس کی ٹیوٹر نے اسے مشرقی اسلامی رسم و رواج بھی ذہن نشین کروا دیئے تھے۔ شلوار قمیض یا چست پاجامہ اور کرتہ پہنے مجھے دیکھ کر جب وہ ذرا جھک کر اور دایاں ہاتھ پیشانی تک لے جا کر آداب کرتی تو بہت بھلی دکھائی دیتی۔ اٹک اٹک کر جب وہ اردو کے چھوٹے چھوٹے فقرے بولنے میں کوئی غلطی کرتی اور میں اس کی تصحیح کرنا چاہتا تو وہ فوراً انگلش میں مجھے ٹوک کر خود تصحیح کرنے کی کوشش کرتی اور تب تک اس فقرے کا پیچھا نہ چھوڑتی جب تک اسے خود ہی ٹھیک نہ کر لیتی۔

حسب معمول ایک روز میں رات دس بجے مریم کے گھر سے واپس لوٹ رہا تھا۔ وین میں میرے ساتھ میرے دونوں چینی ساتھی بھی تھے۔ میں نے اپنے ہوٹل سے ریسٹورنٹ اور واپسی کا سیدھا راستہ چھوڑ کر ایک لمبا روٹ اپنا لیا تھا تاکہ بھارتی سفارت خانہ راستے میں نہ پڑے۔ جس روز سے وین خریدی تھی میں اسی نئے روٹ سے آتا جاتا تھا اس روٹ پر خاصا رستہ بے آباد اور سنسان تھا گاڑی کی ہیڈلائٹس میں، میں نے جینز پہنے ایک عورت کو بھاگتے اور اس کا پیچھا کرتے تین ہپیوں کو دیکھا۔ وین عورت کے قریب پہنچی تو عورت بے حد خوفزدہ انداز میں چلا رہی تھی۔ میں نے وین روکی تو وہ عورت Help- Help چلاتے ہوئے وین کے قریب آ گئی۔ وہ بہت ڈری ہوئی تھی۔ بھاگنے سے بال اس کے چہرے کو ڈھانپے ہوئے تھے۔ اس عورت نے مجھے میرے اصلی نام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ پلیز میری جان بچاؤ یہ جرمن نازی پارٹی کے ممبر ہیں یہ وہی اسرائیلی جاسوسہ تھی جو میرے ہوٹل میں رات کو آئی تھی صورت حال کو نہ سمجھتے ہوئے بھی میں وین سے اتر آیا اور میرے ساتھ ہی میرے چینی دوست بھی وین سے باہر آ گئے۔ یہ سب کچھ پانچ چھ سیکنڈ میں ہوا اتنے میں پیچھا کرنے والے تینوں مرد بھی وہاں پہنچ گئے ان تینوں کے ہاتھ میں خنجر تھے اور سب سے آگے وہ جرمن ٹورسٹ تھا جو گورکھپور سے کھٹمنڈو تک میرا ہمسفر رہا اور شمبوناتھ کے مندر کی سیڑھیوں پر روپے دیتے ہوئے جب میں نے اس سے ان اسرائیلی لڑکیوں کے متعلق پوچھا تو ان کا پتہ بتاتے ہوئے اس نے ان لڑکیوں کیلئے Bitces (کتیا) کا لفظ استعمال کیا تھا۔

(جاری ہے)

قسط نمبر 112

غازی

جرمن ٹورسٹ اور اس کے دونوں ساتھی میرے قریب آ کر رک گئے۔ مجھے پہچانتے ہوئے وہ بولا "یہی وہ یہودی جاسوسہ ہے جس کے متعلق تم نے مجھ سے پوچھا تھا یہ تمہارے ملک کی دشمن ہے یہ ہماری قوم کی بھی دشمن ہے آج یہ اکیلی ہمارے ہتھے چڑھ گئی ہے ہم اسے مار ڈالیں گے تمہارے اور ہمارے دشمنوں میں ایک کی کمی ہو جائے گی"۔ یہ جرمن ہاتھ میں خنجر پکڑے میرے اتنے قریب آ چکا تھا کہ مجھے اپنے ہتھیار نکالنے سے پہلے ہی ہلاک کر سکتا تھا میں نے صورتحال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اسے زبانی سمجھانے کی کوشش کی اور کہا "تم بے شک اسے مار دینا لیکن پہلے اپنا خنجر جیب میں ڈالو اور میرے ایک سوال کا جواب دو۔ تمہارے ملک نے تو نہ صرف اسرائیل کو تسلیم کیا ہوا ہے بلکہ اس سے گہری دوستی بھی ہے اور بڑی مالی امداد اور ہتھیار بھی دیئے ہیں پھر یہ تمہاری دشمنی کیسے ہوئی" جرس کا مارا یہ سوکھا سڑا جرمن عام حالات میں میرے ایک گھونسے سے ہی چیت ہو جاتا لیکن اس وقت مجھ سے دو فٹ کے فاصلے پر کھڑا یہ مدقوق ایک ہی وار سے میرا کام تمام کر سکتا تھا۔ اس نے نہ تو خنجر جیب میں ڈالا اور نہ ہی میرے سوال کا جواب دیا۔ میری پشت وین سے لگی ہوئی تھی اپنے بچاؤ کیلئے میں پیچھے ہٹ نہیں سکتا تھا۔ میری اس کمزوری کا اسے بھی علم تھا۔ "ہم تمہیں بھی مار ڈالیں گے تم پر بھی انعام ہے" یہ کہتے ہوئے اس جرمن نے مجھے اپنے خنجر کی زد میں لے لیا اور اپنا وار پوری طاقت سے کرنے کیلئے ایک قدم پیچھے ہٹا اب سمجھنے سمجھانے کا وقت نہیں تھا یہ ایک لمحہ تھا جسے اگر میں ضائع کر دیتا تو اس کا وار نشانہ ضرور بن جاتا۔ مجھے اپنے بچاؤ کیلئے اپنے اور جرمن کے درمیان دو فٹ سے زیادہ فاصلہ درکار تھا وہ جونہی مجھ پر وار کرنے کیلئے پیچھے ہٹا میں نے بیک وقت اس کے نازک اعضا پر کک جمائی اور خنجر والے ہاتھ کی کلائی پکڑ لی۔ جرمن کک لگنے کے درد سے دہرا ہو رہا تھا اس کی کلائی کو میں اس کی پشت کی طرف لے جا رہا تھا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جرمن پیٹھ کے بل سڑک پر چیت ہو گیا۔ میں ڈی ایم آئی کی حراست سے نکلنے کے بعد اپنی ذہنی حالت کے بارے میں تحریر کر چکا ہوں کہ مجھے اپنی زندگی سے پیار ہو گیا تھا اور مجھے گرفتار ہلاک کرنے کی کوشش کرنے والوں کو دیکھ کر میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا تھا اسی کیفیت سے میں اس وقت دوچار تھا میں نے جو دھپوری جوتے پہن رکھے تھے سڑک پر گرے جرمن کی خنجر والی کلائی پر میرا ایک پاؤں تھا اور گردن پر دوسرا۔ جب یہ حواس بحال ہوئے تو جرمن مر چکا تھا اس کی گردن پر میں نے اتنا دباؤ ڈالا تھا کہ اس کی گردن پچک گئی تھی۔ اس جرمن کے دونوں ساتھی غائب تھے اور وین کے پیچھے اندھیرے میں میرے چینی دوستوں کے ہیولے دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے جلدی سے پسٹل نکالا اور چینی دوستوں کے قریب گیا سڑک پر دونوں جرمن بے سدھ پڑے تھے۔ میں نے پسٹل سے ان پر فائر کرنا چاہتا تھا تو چینی دوستوں نے نو نو کہتے ہوئے اور ہاتھوں کے اشارے سے مجھے روک دیا اور گیس سلنڈر مجھے دکھا دکھا کر جرمنوں کی طرف اشارے کرنے لگے وہ جرمنوں کے بازو اوپر اٹھا کر چھوڑ دیتے اور ان کے بے جان بازو دھڑام سے نیچے گر جاتے اس طرح وہ مجھے یقین دلا رہے تھے کہ گیس سے وہ دونوں ہلاک ہو چکے ہیں۔ ہم نے ان تینوں کی جیبوں کی تلاشی بھی لی اور ان کے پاسپورٹ اور بٹوے وغیرہ نکال لئے تاکہ ان کی آسانی سے شناخت نہ ہو سکے۔ اسرائیلی جاسوسہ اس وقت جاسوسہ نہیں بلکہ ایک ڈری ہوئی خوفزدہ لڑکی دکھائی دے رہی تھی۔

(جاری ہے)

غازی

موقعہ واردات سے جلد از جلد دور ہونے کیلئے میں نے چینی دوستوں اور اسرائیلی لڑکی کو وین میں بیٹھنے کو کہا اور اپنے ہوٹل آ گیا۔لابی میں بیٹھنے کے بجائے میں انہیں کافی شاپ میں لے گیا۔میں نے مریم کو فون کر کے اسے بھی بلا لیا تھوڑی دیر میں ہی مریم بھی آ گئی وہ حیران تھی کہ کچھ دیر پہلے میں اس کے گھر سے بخیریت چلا تھا پھر ایسی کیا بات ہو گئی جو اسے بلایا ہے فون پر میں نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا اتنے دنوں کی قربت سے وہ میری اس عادت کو اچھی طرح سے جان چکی تھی کہ اپنی کسی بھی مشکل میں کسی کو اور خصوصاً اسے شامل نہیں کرتا تھا۔مریم کو آتے دیکھ کر میں اسے لابی میں لینے کیلئے چلا گیا اور کافی شاپ تک پہنچنے کے دوران اسے صرف اتنا کہہ سکا کہ وہاں بیٹھی عورت کو دیکھ کر وہ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو اور بھڑک نہ اٹھے، پہلے ساری بات سنے اور حقیقت جان لے جس سے میں بھی خاص حد تک نا واقف تھا۔مریم خاموشی سے میرے ساتھ بیٹھ گئی میں نے اسرائیلی لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”میں تم سے تمہارا نام نہیں پوچھوں گا کیونکہ یہ ہمارے پیشہ ورانہ اصولوں کے خلاف ہے۔لیکن آج کے واقعے کی تفصیل ضرور جاننا چاہوں گا کہ جس کے نتیجے میں ہمارے ہاتھوں تین ان انسانوں کا خون ہوا جن سے ہماری نہ تو ذاتی عداوت ہے اور نہ ہی ملکی دشمنی۔میں نے محض انسانیت کے ناطے تمہاری مدد اس لئے کی کیونکہ جب تم مدد کیلئے چلا رہی تھیں اس وقت تم میرے لئے ایک موساد کی جاسوسہ نہیں بلکہ صرف ایک عورت تھیں جسے ہلاک کرنے کیلئے تین درندہ صفت مرد بہت قریب پہنچ چکے تھے۔میرے مذہب میں تمہاری مدد کرنا میرا فرض بنتا ہے میں تمہیں مجبور تو نہیں کر سکتا لیکن حقیقت بتا کر تم مجھے اس احساس سے نجات دلا سکتی ہو کہ ہم نے تین انسانوں کا ناحق خون کیا“۔

ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتے ہوئے اسرائیلی لڑکی خاموشی سے میری باتیں سن رہی تھی۔اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے دل و دماغ میں جذبات کے دو سمندر آپس میں ٹکرا رہے تھے۔وہ کچھ دیر خاموش رہی اور پھر یوں گویا ہوئی ”میرے ماں باپ جرمن یہودی تھے۔بون (BONN) میں میرے والد کی کیمروں کی کئی دکانیں تھیں۔دوسری جنگ عظیم کے دوران جب جرمنی کی نازی پارٹی اور ہٹلر کے یہودیوں پر مظالم انتہائی سے بڑھ گئے یہودیوں کیلئے یہ لازم ہو گیا کہ وہ اپنی شناخت کیلئے اپنے لباس پر پیلا پھول لگائیں۔بغیر کسی جرم اور خطا کے یہودیوں کا قتل عام ہونے لگا اور انتہا یہ کہ لاکھوں یہودیوں کو گیس چیمبرز میں ڈال کر ہلاک کیا گیا اور ان کی چربی سے جنگی ہتھیار کیلئے گریس بننے لگی تو میرے والدین اپنے اکلوتے بیٹے کے ہمراہ چھپتے چھپاتے پہلے آسٹریا اور پھر فرانس سے ہو کر 1951 میں اسرائیل پہنچے۔میں 1955 میں حیفہ میں پیدا ہوئی۔نقل مکانی کے دوران میرے والد کی ساری پونجی جان بچانے کی رشوت اور سفری کاغذات کے حصول میں ختم ہو چکی تھی۔میرے والد اور بھائی نے حیفہ میں بندرگاہ پر مزدوری کر کے اور ماں نے مالٹوں کے باغوں میں کام کر کے نئی زندگی کا آغاز کیا۔ہم سمجھتے تھے کہ اسرائیل ہمارے لئے امن کا گہوارہ ثابت ہو گا لیکن یہ خوش فہمی بھی سراب ثابت ہوئی مسلم عرب ممالک جن کی سرحدیں اسرائیل سے ملتی تھیں ہمیں ختم کر دینے کے درپے تھے۔اسرائیل میں ہر مرد اور عورت کیلئے فوجی تربیت لازمی قرار دی گئی تھی۔1967ء کی عرب اسرائیل جنگ کے وقت اسرائیل کی کل آبادی سے زیادہ ان مسلم ممالک کی افواج تھی جن سے ہمیں بیک وقت لڑنا پڑا۔

(جاری ہے)

غازی

ہم بے جگری سے لڑے اور کامیاب ہوئے کیونکہ یہ ہماری Survival (زندگی اور موت) کی جنگ تھی۔ ہمارے سامنے مسلح افواج اور پیچھے سمندر تھا۔ اس جنگ میں میرے والد اور بھائی وطن کے تحفظ میں ہلاک ہوئے اور کچھ ہی عرصے بعد میری والدہ کا بھی انتقال ہوگیا۔ میں بالکل اکیلی رہ گئی۔ اس وقت میں اسرائیلی فوج میں دوسری دفاعی لائن میں تھی۔ ہماری جاسوسی ایجنسی موساد دن دُگنی رات چوگنی روز بروز طاقت پکڑ رہی تھی اور اس کا دائرہ کار ہمسایہ ممالک سے بڑھ کر لیبیا، الجزائر، سوڈان اور مشرق میں پاکستان انڈونیشیا اور ملائشیا تک پھیل چکا تھا۔ سخت تربیت کے بعد مجھے موساد میں فیلڈ ایجنٹ کے طور پر شامل کرلیا گیا۔ میں عربی نہایت روانی سے بول سکتی ہوں اور اسی زبان دانی اور جوانی کے سہارے میں نے اور میرے جیسی فیلڈ ایجنٹوں نے مسلم عرب ممالک کے عیاش افسران سے ان کے انتہائی خفیہ ملکی راز اس حد تک حاصل کئے کہ یہ ملک اور ان کے دفاعی راز اب ہمارے لئے ایک کھلی کتاب کی طرح ہیں۔ اپنے متعلق اس سے زیادہ بتانا میرے لئے اپنے وطن سے غداری کے مترادف ہوگا جس کی میں کسی صورت میں مرتکب نہیں ہوسکتی۔ اب میں کھٹمنڈو کی طرف آتی ہوں۔ آپ کی یہاں آمد کے تیسرے روز ہی مجھے اور میرے ساتھیوں کو آپ کی اصلیت کے بارے میں مکمل اطلاع مل چکی تھی۔ بمبئی میں آپ کے میزبانوں کے کارندوں کے قدردان ہیں چاہے وہ ہمارا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ کھٹمنڈو میں آپ کی سرگرمیوں سے ہم نے واقف ہونے کے باوجود اس لئے تعرض نہیں کیا کیونکہ ہمارے ٹارگٹ مختلف تھے اور ان میں کوئی ٹکراؤ نہ تھا۔ یہ تینوں جرمن جو آج آپ کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچے، جرمنی کی زیر زمین نازی پارٹی کے ممبر تھے جرمنی میں بظاہر ہٹلر کی نازی پارٹی اور یہودی دشمنی ختم ہو چکی ہے لیکن جس طرح پاکستان کے دشمن نئے لبادے اوڑھ کر پاکستان کے دو ٹکڑے کرنے کے بعد بچے کھچے پاکستان کو بھی ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ بالکل اسی طرح جرمنی میں بھی زیر زمین نازی پارٹی کے بے شمار ارکان ہٹلر کو اپنا آئیڈیل جانتے اور جرمن قوم کو افضل ترین سمجھتے ہیں اور یہودیوں کو صفحۂ ہستی سے ختم کرنا ان کا اولین مقصد ہے۔ آج شام میں اپنے مشن کے سلسلے میں اکیلی گئی تھی یہ تینوں جرمن نامعلوم کب سے میری تاک میں میرا پیچھا کر رہے تھے اور آج میں ان کے ہتھے چڑھ گئی۔ جوڈو کی ماہر ہونے کے باوجود میں ان تینوں مسلح نازیوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ ہتھیار میں اس لئے ساتھ نہیں رکھتی کیونکہ یہاں ہمارا کسی سے ڈائریکٹ ٹکراؤ نہیں بلکہ صرف اپنے ٹارگٹ کے حصول کیلئے ایسے لوگوں کو تیار (Cultivate) کرنا ہے جو بآسانی شمال میں جاسکیں۔ ایسے لوگوں میں میل جول بڑھانے کیلئے مجھے اور میرے ساتھیوں کو تقریباً ہر روز حشیش کی محفلوں میں جانا اور حشیش پینی پڑتی ہے جس سے میرا اسٹیمنا (Stamina) بہت کم رہ گیا ہے۔ بھاگتے ہوئے میں بے حال ہو چکی تھی اور گرنے کے قریب ہی تھی کہ آپ پہنچ گئے۔ آپ کی بروقت مدد سے میری جان بچ گئی ورنہ آج میری ہلاکت یقینی تھی۔ وہ دم لینے کو رکی تو میں نے مریم کو بعد کے واقعات اور جرمنوں کے مجھ پر حملے اور ان کی ہلاکت کے متعلق بتایا۔ میں نے اسرائیلی لڑکی سے مریم کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ ہم جلد ہی شادی کرنے والے ہیں کسی دوسرے کے سامنے پہلی بار میرے اس انکشاف سے مریم شرما گئی اور اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اسرائیلی لڑکی نے ہم دونوں کو مبارکباد دی اور ہمارے ممالک میں کتنا ہی اختلاف سہی، لیکن آپ نے آج جس طرح خطرے میں کود کر میری جان بچائی اس سے ان باتوں کی نفی ہوئی ہے جو میں نے اپنی کتابوں میں پاکستانیوں کے پست کردار کے متعلق پڑھی ہیں۔

(جاری ہے)

غازی

آپ کا آج کا احسان مجھ پر ادھار ہے جسے میں موقعہ آنے پر چکانے کی پوری کوشش کروں گی"۔ یہ کہہ کر وہ کھڑی ہوئی ہم نے پہلے اس لڑکی کو اس کے گیسٹ ہاؤس میں چھوڑا۔ مریم، میں اور وہ لڑکی مریم کی گاڑی اور چینی دوست میری وین چلا رہے تھے۔ واپسی پر ہم مریم کو چھوڑنے اس کے گھر گئے۔ میں نے مریم کو آج رات کی واردات اپنے والدین کو بتانے سے منع کر دیا۔ اس کے گھر جانے اور واپسی پر ہم نے بھارتی ایمبیسی والا راستہ اختیار کیا تا کہ اگر جرمنوں کی لاشیں موقعہ واردات پر پڑی ہوں تو دیکھ کر دماغ پراگندہ نہ ہو۔ واپسی پر میں سوچ رہا تھا کہ اسرائیلی عورتیں تو سخت تربیت لے کر جاسوسی اور جنگ میں حصہ لیتی ہیں جبکہ ہماری پاکستانی خواتین ان دونوں شعبوں میں انتہائی ماہر ہیں۔ یقین نہ آئے تو پاکستان کے کسی بھی شہر، قصبے اور دیہات میں جا کر دیکھ لیں۔ گھروں کے دروازوں، کھڑکیوں اور چھتوں اور گلیوں میں کھڑی ہماری خواتین ہمسائیوں کے ساتھ ایسی خوفناک جنگ لڑتی ہیں کہ کسی بھی ملک کی باقاعدہ فوج ان کے طریقہ جنگ سے گھبرا کر دم دبا کر بھاگ جائے اور اس جنگ کے دوران جاسوسی کیلئے ایسے ایسے "انکشاف" ہوتے ہیں کہ جاسوسی کے دنیا بھر کے ماہر دانتوں میں انگلیاں داب کر رہ جائیں یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارا یہ بیش قیمت Talent (صلاحیت) بے فائدہ ضائع ہو رہا ہے۔

اگلے روز دن چڑھے محسن آیا۔ اس کی زبانی پتہ چلا کہ تین غیر ملکی چرسی ایک سڑک پر مردہ پائے گئے چونکہ ان کے لباس سے پاسپورٹ یا کوئی ایسے کاغذات نہیں ملے جن سے ان کی شناخت ہو سکتی۔ اس لئے پولیس نے ان کی لاشوں کو سرد خانے میں رکھوا دیا ہے۔ ان کی موت کی بظاہر کوئی وجہ بھی معلوم نہیں ہو سکی۔ حالانکہ تینوں کی لاشوں کے قریب تین کھلے چاقو بھی پڑے تھے۔ پولیس ان چاقوؤں سے فنگر پرنٹ لے کر قاتلوں کو تلاش کرے گی۔ عام خیال یہی ہے کہ ان چرسیوں نے مالی تنگدستی سے مجبور ہو کر رات کے اندھیرے میں کچھ لوگوں کو لوٹنے کی کوشش کی اور چاقو بھی انہی کے تھے لیکن خود ہی اس کوشش میں ہلاک ہو گئے۔ قیاس آرائیوں کا سلسلہ اس سوال پر آ کر ٹوٹ جاتا تھا کہ انہیں ہلاک کیونکر کیا گیا ان کے جسموں پر کسی بھی قسم کے ہتھیار استعمال کرنے کے نشان نہ تھے۔ نیپال میں گورکھپور کا ایک قبیلہ ابھی تک موجود ہے جو دو سو سال قبل کے لٹیروں کی طرح اپنے شکار کو ہلاک کرنے کا پرانا طریقہ اب بھی استعمال کرتا ہے۔ ایک رومال میں سکہ باندھ کر شکار کے گلے کے گرد رومال اس طرح کس دیا جاتا ہے کہ سکے کا پورا زور گلے کے منکے پر پڑتا ہے۔ منکا اتنا دباؤ برداشت نہ کر سکنے کے باعث ٹوٹ جاتا ہے اور شکار ہلاک ہو جاتا ہے۔ مجھے ان نیپالی لٹیروں کے متعلق مریم نے بتایا تھا۔ میں محسن کی باتیں خاموشی سے سنتا رہا اور کوئی تبصرہ نہ کیا کیونکہ جب کسی واقعے کے متعلق ایک سے زیادہ آرا ہو جائیں تو معاملہ عموماً unsolved (غیر حل شدہ) رہ جاتا ہے۔

قارئین کے ذہن میں یہ سوال یقیناً اٹھتا ہوگا کہ بھارت میں تین سالہ قیام کے دوران سوائے گورکھپور کے ہوائی اڈے کے جہاں سینکڑوں افراد جل کر بھسم ہو گئے تھے، ہم نے ہمیشہ دشمنوں کو ہلاک کیا اور یہ انتہائی اقدام صرف اسی وقت کیا جب کوئی دوسری صورت باقی نہ رہی۔ لیکن نیپال میں تین ماہ سے بھی کم عرصے میں میں نے اور میرے ساتھیوں نے اتنے لوگوں کو ہلاک کیا کہ ان کی لائن لگ گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بھارت میں اپنے محکمے کی طرف سے ہمیں ٹارگٹ دیئے گئے تھے۔ گورکھپور کا مشن بھی ہمیں دیئے گئے ٹارگٹس کی لسٹ میں نہیں تھا۔ بھارت میں ہم نے روپوشی اور کور (cover) میں وقت گزارا تھا اور ہم Hit and run (حملہ کرو اور بھاگ جاؤ) کی حکمت عملی سے کام لے رہے تھے۔

(جاری ہے)

غازی

ہماری تلاش میں بھارتیوں کی کامیابی میری گرفتاری کی صورت میں سامنے آئی۔لیکن کھٹمنڈو میں صورت حال بھارت سے بالکل مختلف تھی۔یہاں بھارتی جاسوس اپنے پورے وسائل کے ساتھ موجود تھے۔وہ میرے متعلق پوری معلومات رکھتے تھے۔میں ان کے سامنے موجود اور میرے ساتھ عملی طور پر صرف تین چینی دوست تھے۔یہاں ہمارے مقاصد بھی مختلف تھے۔بھارتی مجھے زندہ گرفتار کرنے یا اس میں ناکامی کی صورت میں ہلاک کرنا چاہتے تھے اور میں ان کی نفری اور ان کے planted آدمیوں کو زیادہ سے زیادہ ہلاک کر کے ان کے پلان (plan) کو ناکام اور انہیں خوفزدہ کر رہا تھا۔اس آمنے سامنے کی جنگ میں جو بھی رکاوٹ میرے سامنے آئی تھی۔اسے میں ختم کرتا جاتا تھا۔چاہے وہ غدار اور Planted مہاجروں کی صورت میں سامنے آئے یا جرمن ٹورسٹوں کی شکل میں غرض کہ بھارت کی نسبت کھٹمنڈو میں مجھے جانی خطرہ بہت زیادہ تھا اور اسی خطرے کو کم کرنے کیلئے یہاں میرے ہاتھوں پے در پے ہلاکتیں ہو رہی تھیں۔

آئندہ تین چار روز میں جرمنوں کے متعلق یہی معلوم ہوا کہ ان کی Identity (شناخت) کا کوئی ثبوت نہ ملنے کے باعث کسی سفارت خانے نے بھی پولیس سے رجوع نہیں کیا۔انہیں لاوارث سمجھتے ہوئے اور شہریت کا تعین نہ ہوسکنے کے سبب نیپال کے قانون کے مطابق ان کی لاشوں کو جلا دیا گیا۔ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا۔چرس کے رسیا ہی کھٹمنڈو میں اکثر سردی اور بھوک سے ہلاک ہو جاتے تھے۔میں نے ان کے پاسپورٹ اپنے کمرے کے آتش دان میں جلا دیئے تھے چند روز میں ان جرمن ہپیوں کی ہلاکت بھی ماضی کا قصہ بن گئی۔میری فوری ذہنی پریشانی وہ مہاجر تھا جو کسی صورت میرا پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔محسن اور لڑکے اس کی مکمل نگرانی کرتے رہے تھے لیکن بھارتی سفارت خانے سے اس کے ظاہری رابطے کا کوئی ثبوت نہ مل سکا۔سڑک پر ہوٹل کے سامنے کھڑے ہونے سے میں اسے روک نہیں سکتا تھا لیکن اس کے دن کا بیشتر حصہ وہاں گزارنے سے وہ میرے ذہن کا بوجھ بن گیا تھا اس سے چھٹکارے کی کوئی اور صورت نہ دیکھتے ہوئے میں نے ایک روز ہوٹل سے نکلتے ہوئے اسے اپنی وین میں بیٹھنے کی دعوت دی وہ گھبرا گیا اور وین میں بیٹھنے سے انکار کرتے ہوئے بھاگ کھڑا ہوا۔اس سے میرا شک یقین میں بدل گیا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیسے اس سے پیچھا چھڑاؤں یا کم از کم صحیح صورت حال ہی معلوم ہو جائے تا کہ اس کا سدباب کرسکوں۔

ایک رات مریم کے گھر میں اسے میں اپنی عملی زندگی کے اولین دور کے واقعات سنا رہا تھا جو میں نے چٹا گانگ میں اصفہانی ٹی کمپنی کی ملازمت میں گزارا تھا اسے بنگال ٹائیگر کے شکار کا ایک واقعہ سناتے ہوئے جب شیر کو راغب کرنے کیلئے'' چارہ باندھنے'' کے مقام پر پہنچا تو اسے میری بات پوری طرح سمجھ میں نہ آئی۔میں نے اسے تفصیلاً بتایا کہ گائے کے بچھڑے کو جنگل میں کسی کھلے مقام پر باندھ کر شکاری درختوں پر چڑھ جاتے ہیں اور شیر بچھڑے کی بو پر اس تک آجاتا اور شکاریوں کی گولیوں کا نشانہ بن جاتا ہے میں مریم کو یہ سمجھا ہی رہا تھا کہ اچانک میرے دماغ میں بجلی سی کوندی اور اس مہاجر کی وہاں موجودگی کی وجہ سمجھ میں آنے لگ گئی۔بھارتی سفارت کار بھی اسے چارے کے طور پر استعمال کر رہے تھے انہیں بخوبی علم تھا کہ کھٹمنڈو میں مکتی باہنی کے 9 غدار مہاجروں اور روبے کمار کی اموات میں میرا عمل دخل تھا لیکن کوئی ایسا ثبوت انہیں نہ مل سکا۔جس کے ذریعے وہ مجھے ان اموات کا ذمہ دار ٹھہرا سکیں۔میرے خیال میں انہیں پورا یقین تھا کہ اس مہاجر کی ہر روز کی نگرانی سے تنگ آکر میں جھنجلاہٹ میں اسے ختم کر دوں گا۔اگر ایسا ہوتا اور انہوں نے اس مہاجر سے پہلے ہی ایسی کوئی تحریر لے لی ہوتی کہ اسے مجھ سے اپنی جان کا خطرہ ہے یا اس کی موت کا ذمہ دار میں ہوں تو وہ بڑی آسانی سے مجھے قتل کے الزام میں گرفتار کروا سکتے تھے اگر ان کے پاس ایسی تحریر موجود تھی تو وہ خود بھی اسے ہلاک کر کے اس کا قتل میرے سر منڈھ سکتے تھے۔ابھی تک یہ صرف مفروضہ تھا لیکن ہر تحقیق اور تفتیش مفروضوں سے ہی شروع ہوتی ہے۔ان حالات میں یہ مہاجر میرے کچھ کام نہ آنے کے باوجود میرے لئے فوری خطرے کا باعث تھا میں نے مریم کے مشورے سے فوری طور پر ایک پلان بنایا جس پر اگلے روز صبح ہی سے عمل کرنا تھا۔مریم کے گھر سے میں معمول کے خلاف جلد اٹھ آیا اور محسن کے گھر پہنچا۔محسن کو میں نے کہا کہ مہاجروں کے دس نمائندوں کو لے کر وہ کل دو بجے میرے ہوٹل میں پہنچ جائے۔اسے میں نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا اگلے دن صبح دس بجے اپنے چینی ساتھیوں کے ہمراہ میں وین میں ہوٹل سے باہر آیا۔وہ مہاجر حسب معمول ہوٹل کی بیرونی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔میں نے چینی دوستوں کو اس سے چند قدم پہلے ہی اتار دیا اور وین مہاجر کے بالکل قریب کھڑی کر دی۔وہ ابھی میرے اس اقدام کی وجہ سے متعلق سوچ ہی رہا ہوگا کہ میرے چینی دوستوں نے دونوں طرف سے اسے نرغے میں لے کر انتہائی پھرتی سے وین میں ڈالا۔منہ پر ٹیپ چسپاں کی اور اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے وین کے فرش پر ڈال دیا ادھر ادھر کے بلاوجہ چکر کاٹ کر ہم اسے شیر پنجاب ریسٹورنٹ لے آئے۔ابھی ریسٹورنٹ کا کام شروع نہیں ہوا تھا۔سردار جی سے چند باتیں کر کے ہم اسے چنگ وا ریسٹورنٹ لے آئے۔وہاں بھی مناسب جگہ نہ ہونے کے باعث ہم پاکستان ایمبیسی پہنچے۔میں نے وین خاصی آگے لے جا کر کھڑی کی اور ٹرانسمیٹر آپریٹر کے کمرے میں چلا گیا۔ٹرانسمیٹر اور دوسرے آلات پچھلے کمرے میں تھے۔آپریٹر کچھ دیر پہلے ہی گھر سے آیا تھا جہاں وہ اکیلا رہتا تھا۔میں نے اسے کہا کہ اپنے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں چند گھنٹوں کیلئے اس کے گھر کی ضرورت ہے۔وہ خاموشی سے اٹھا اور میرے ساتھ ایمبیسی سے باہر آ گیا اور وین میں بیٹھنے سے پہلے بولا''میرا گھر حاضر ہے صرف یہ خیال رکھیں کہ میں سفارت خانے کا ملازم ہوں اور افسران مجھے پسند نہیں کرتے۔کوئی ایسی بات نہ ہو۔جس سے انہیں میرے خلاف کوئی موقع مل جائے''۔میرے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ وین میں میرے ساتھ بیٹھ گیا (جاری ہے)

غازی

اس کا گھر سفارت خانے سے تین کلومیٹر سے زیادہ فاصلے پر تھا اس نے دور سے مجھے اپنا مکان دکھایا۔ چابیاں دیں اور وین سے اتر گیا میں نے وین اس کے چھوٹے سے گھر کے دروازے کے بالکل سامنے کھڑی کی۔ مکان کا دروازہ کھولا اور میرے چینی ساتھی اس مہاجر کو لے کر اندر داخل ہو گئے۔ میں نے باہر آ کر وین مکان سے ذرا پرے ایک کھلی جگہ پر کھڑی کی اور مکان کے اندر چلا گیا پہلے کمرے کو چھوڑ کر ہم پچھلے کمرے میں چلے گئے۔ میرے ساتھیوں نے اس کی آنکھوں سے پٹی اتار دی۔ مہاجر خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا میں نے اپنا پسٹل اور ہتھکڑی نکال کر میز پر رکھ دیئے۔ میرے کہنے پر چینی ساتھیوں نے اسے فرش پر اکڑوں بٹھایا، میں نے اسے مزید خوفزدہ کرنے کیلئے پسٹل کے چیمبر سے گولی باہر نکالی پھر میگزین علیحدہ کی۔ اس کے سر کا نشانہ لیا۔ پھر پسٹل کی نال پر سائیلنسر لگایا میگزین میں گولی ڈال کر پسٹل میں فٹ کی۔ میں یہ سب کچھ اسے خوفزدہ کرنے کیلئے کر رہا تھا۔ میں نے پسٹل دوبارہ میز پر رکھا۔ چینی ساتھیوں نے میرے اشارے پر اسے کھڑا کر دیا۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور منہ پر ٹیپ لگی تھی۔ چینی دوستوں نے اشارے سے مجھے دکھایا۔ خوف کے مارے اس کی یہ حالت تھی کہ اس نے فرش بھی گندا کر دیا تھا۔

یہی وہ وقت تھا جب اس سے سب کچھ اگلوا لیا جاتا۔ چینی دوستوں نے اسے دونوں طرف سے پکڑا ہوا تھا ایک نے میرے اشارے پر اس کے سر کے بال کھینچ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا اور میں نے اوپر تلے آٹھ دس زوردار تھپڑ اسے رسید کئے۔ اسے گرنے سے چینی دوستوں نے روک رکھا تھا۔ منہ پر ٹیپ لگی ہونے کے باعث وہ نہ تو بول سکتا اور نہ ہی شور وغل مچا سکتا تھا۔ صرف غوں غوں کی آواز اس کے منہ سے نکل رہی تھی۔ میں نے پسٹل اٹھا کر اس کی طرف کرتے ہوئے کہا ''خاموش ہو جاؤ ورنہ گولی تمہارے سینے کے آر پار کر دوں گا'' وہ یکدم خاموش ہو گیا۔ ''مجھے سب معلوم ہو چکا ہے کہ تم کس لئے میری نگرانی کر رہے ہو۔ جن لوگوں نے تمہیں اس کام پر مامور کیا ہے ان میں میرا ایک آدمی بھی شامل ہے۔ مجھے ان سے تمہارے رابطے کی مفصل رپورٹ مل چکی ہے۔ میں تمہیں کبھی کا اوپر بھیج چکا ہوتا اور آج بھی اسی ارادے سے تمہیں اٹھا کر یہاں لایا ہوں۔ میں تمہیں صرف ایک موقع دیتا ہوں کہ سب کچھ اپنی زبان سے بتا دو۔ اگر تمہارے بیان اور مجھے ملی ہوئی رپورٹ میں ذرا سا بھی فرق ہوا تو تمہاری لاش ان کھائیوں میں پھینک دی جائے گی جہاں جنگلی جانور تمہاری ہڈیاں تک چبا جائیں گے۔ اپنا سر ہلا کر مجھے ہاں اور نہ میں جواب دو کہ تمہیں میری بات منظور ہے یا نہیں'' میں نے محض ہوا میں تیر چلاتے ہوئے اس سے یہ بات کہی تھی۔ خوف سے تھر تھر کانپتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اسے کہا کہ اسی طرح سر ہلا کر میرے سوالوں کا جواب دو۔ میں چاہتا تھا کہ اس کے منہ سے ٹیپ ہٹانے سے پہلے ان بنیادی باتوں کا ہاں اور نہ میں جواب لے لوں جن سے وہ بعد میں مکر نہ سکے۔ ''بھارتی سفارت کاروں نے تمہیں میری نگرانی کرنے کا کہا ہے'' اس نے ہاں میں سر ہلایا۔ تم ہر روز ان سے رابطہ کرتے اور رپورٹ دیتے ہو'' اس نے پھر اثبات میں سر ہلایا ''تم سے انہوں نے تحریر بھی لکھوائی ہے اور تمہاری آواز بھی ریکارڈ کی ہے'' اس نے ایک بار ہاں میں اور ایک بار نہ میں جواب دیا ''تمہیں اس کا معاوضہ بھی مل رہا ہے'' اس کا جواب ہاں میں تھا۔ مجھے بنیادی باتوں کا جواب مل چکا تھا اور انہی جوابوں کی روشنی میں مجھے اس سے تفصیلات حاصل کرنا تھیں۔ اس کی حالت اتنی ناگفتہ ہو چکی تھی کہ اسے ہوش میں رکھنے اور سوالوں کا جواب دینے کیلئے میں دوسرے کمرے سے اس کیلئے پانی لے کر آیا اور اسے کہا کہ منہ سے ٹیپ اترنے کے بعد بالکل مدہم آواز میں میرے سوالوں کا جواب دے۔ اگر اس نے چیخنے چلانے یا بھاگنے کی کوشش کی تو میں بے دریغ اسے گولی مار دوں گا۔ ہاتھ پشت پر بندھے ہونے کے باعث وہ بھاگ تو نہیں سکتا تھا لیکن شور مچا کر ہمسایوں کو متوجہ کر سکتا تھا اس لئے پیش بندی کے طور پر میں نے اسے وارننگ دی تھی۔

چینی دوستوں نے اسے پھر اکڑوں بٹھا دیا۔ میں نے اس کے منہ سے ٹیپ اتاری، پانی پلایا اور کہا کہ شروع سے ہر بات سچ سچ تفصیلاً بتائے۔ جو کچھ اس نے بتایا اس کا لب لباب یہ تھا کہ جب وہ بھارتی سفارت خانے چار ہزار روپے واپس کرنے گیا تو سیکنڈ ملٹری اتاشی میجر باسو (Basu) نے اس سے کہا کہ وہ یہ روپے خود رکھ لے اس کے علاوہ اسے مزید دو ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا اور کہا کہ وہ صرف اتنا کرے کہ مجھ سے قریب ہو کر میری نقل وحرکت کی مفصل رپورٹ ہر روز انہیں دیا کرے۔ اس روز سفارت خانے سے واپسی پر ہی جب میں نے اس کی جیب سے چار ہزار روپے برآمد کر لئے اور اسے طمانچے مارے تو اسی روز اس نے پھر بھارتی سفارت خانے جا کر سارا واقعہ کہہ سنایا۔ اب اسے نئی ہدایات ملیں کہ میرے پاؤں پڑ کر خوشامد اور چاپلوسی سے مجھ سے معافی مانگے اور مجھ سے زیادہ سے زیادہ قریب ہونے کی کوشش کرے اور ساتھ ہی میری نقل وحرکت کی نگرانی کرے۔ معافی تو اسے مل گئی لیکن میرے قریب ہونے کی اس کی ہر کوشش رائیگاں گئی۔ اس نے جب یہ صورت میجر باسو کو بتائی تو اسے اگلے روز آنے کا کہا گیا۔ اگلے روز اسے پانچ ہزار روپے دیئے گئے اور اس سے یہ تحریر لکھوائی گئی کہ اسے مجھ سے جان کا خطرہ ہے کیونکہ میں نے کھٹمنڈو میں بہت سے آدمیوں کو ہلاک کیا ہے۔ جن میں سے دو کی میرے ہاتھوں ہلاکت کا وہ چشم دید گواہ ہے۔ اس نے اتفاقاً دونوں کو قتل کرتے وقت مجھے دیکھا تھا ایک دن غلطی سے میں نے ان دونوں کی ہلاکت کے بارے میں اسے بتا دیا۔ آصف چونکہ قتل کرتے وقت کوئی ثبوت پیچھے نہیں چھوڑتا اس لئے اسی دن سے وہ میرے پیچھے پڑا ہوا ہے اور مجھے ہلاک کرنا چاہتا ہے آصف مہاجر نہیں بلکہ پاکستانی انٹیلی جنس کا آدمی ہے اور تین چینی جاسوس ان وارداتوں میں اس کے ساتھ شامل ہیں پاکستانی سفارت خانہ بھی اس کی پشت پناہی کرتا ہے۔ خوف کے مارے میں نے بھارتی سفارت خانے سے مدد مانگی ہے اور یہ تحریر اس لئے دے رہا ہوں کہ اگر مجھے ہلاک کیا گیا یا کوئی گزند پہنچا تو اس کا کلی طور پر ذمہ دار آصف ہو گا۔

میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ میری نگرانی کی ہر روز کی رپورٹ لکھ کر وہ اپنی بیوی کو دے دیتا ہے جسے اس کی بیوی اگلے روز ایک سبزی فروش کو دے دیتی ہے جو دراصل بھارتی ایجنٹ ہے اور گھوم پھر کر سودا بیچتا ہے۔ اپنے قیافے کے سو فیصد درست ہونے اور اس مہاجر سے اتنی جلد سچ اگلوانے پر میں بڑا خوش تھا۔ میں نے اسے کہا کہ میں اسے معاف کر دوں گا لیکن پہلے اسے یہ سب باتیں مہاجر نمائندوں کے سامنے دہرانی اور تحریر کرنی ہوں گی۔ اس نے خوشی سے حامی بھر لی۔ میں نے چینی دوستوں سے کہا کہ اس کے ہاتھ کھول دیں ہاتھ کھلے تو کھڑے ہوتے وقت اس کے منہ سے بے اختیار ہائے رام نکلا۔ گاڑی کے فرش پر ڈالتے وقت شاید اس کے گھٹنے پر چوٹ آ گئی تھی جس میں درد کے باعث اس سے وہی غلطی ہوئی جو مجھ سے دہلی سے آگرہ جاتے ہوئے ریل کے انجن سے نکلنے والے کوئلے کے دھوئیں کے باعث چھینکنے پر بے ساختہ الحمدللہ کہنے سے ہوئی تھی۔ ہائے رام کی غلطی کو ''مہاجر'' اور میں نے بیک وقت محسوس کیا۔ وہ میرے پستول کی طرف جھپٹا جو میز پر پڑا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ پستول تک پہنچے میں نے اس کی کنپٹی پر زوردار مکہ مارا۔ وہ تیورا کر نیچے گرا اور میری دو تین ٹھوکروں سے بے ہوش ہو گیا۔ چینی دوست حیران تھے کہ یک بیک ایسی کیا بات ہو گئی جو میں نے پہلے اس کے ہاتھ کھلوائے اور پھر اسے مار کر بے ہوش کر دیا۔ میں نے مزید تسلی کیلئے اس کا زیریں لباس اتروایا وہ مسلمان نہیں تھا۔ میرا گزشتہ رات کا مفروضہ بالکل غلط ثابت ہوا تھا۔ واقعات اتنی تیزی سے پیش آ رہے تھے کہ میں ان کی جزئیات پر توجہ نہ دے سکا۔ منہ ٹیپ سے بند ہونے کی وجہ سے وہ میرے ہر سوال کا جواب سر ہلا کر دے رہا تھا۔

(جاری ہے)

غازی

اس کا دماغ اتنا تیز تھا کہ میرے سوالات کے گرد اس نے فوری طور پر ایک کہانی بنالی۔ جو میرے مفروضے کے عین مطابق تھی۔ اپنی ''کامیابی'' کی خوشی میں اس کی کہانی کے اس حصے کو بھی میں بغیر چبائے نگل گیا تھا۔ جس میں اس نے میرے ہاتھوں دو ہلاکتوں کا خود کو چشم دید گواہ بتایا تھا۔ اس کے بقول یہ تحریر بھارتی سفارت کاروں نے لکھوائی تھی لیکن اب جبکہ اس کی اصلیت معلوم ہوگئی تو یہ ساری داستان بھی اس کی ذہنی اختراع ہی بنتی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ بھارتی سفارت خانہ کسی اصل مہاجر کو میرے مفروضے کے مطابق استعمال کررہا ہو۔ جس کا علم اس نقلی مہاجر کو بھی ہو اور اپنی جان بچانے اور میرا اعتماد حاصل کرنے کیلئے اس نے اس کردار کا سہارا لیا ہو، میرے چاروں طرف سازشوں کا جال بنا جارہا تھا۔ ہندوؤں کی مکارانہ چالوں کا مقابلہ میں چالوں سے نہیں کرسکتا تھا۔ کھٹمنڈو میں اپنی بھارتی حکومت نے مہاجروں کے روپ میں اپنے ایجنٹ بھیجے، مہاجروں کی برین واشنگ کرنے اور انہیں پاکستان دشمنی پر آمادہ کرنے میں اپنا پورا زور صرف کردیا تھا۔ ایسا نادر موقع انہیں پھر کبھی نہیں ملنا تھا اور اس موقع کا وہ پوری طرح فائدہ اٹھا رہے تھے۔ کھٹمنڈو میں میری آمد سے تین برس پہلے ہی سے مہاجر آنے شروع ہوگئے تھے۔ بھارت نے اس دوران اپنی جاسوسی کی جڑیں اس قدر پھیلا رکھی تھیں جنہیں جاسوسی کے مروجہ اصولوں سے اکھاڑنا میرے اکیلے کے بس میں نہ تھا۔ ادھر پاکستانی سفارت خانے نے ایسی چپ سادھی ہوئی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں رہا۔ ان کی مجبوری کی بھی ایک وجہ تھی جو کافی بعد میں مجھے اپنے ملٹری اتاشی سے معلوم ہوئی۔ بے انتہا سیاسی دباؤ کے باعث نیپال گورنمنٹ پاکستانی مہاجروں کو پناہ دینے پر رضامند ہوئی تھی۔ ادھر بھارت ہر روز کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر نیپال کی درآمدات کو معطل کرنے کی دھمکیاں دیتا تھا۔ پاکستانی سفارت خانہ اس لئے دم سادھے بھارت کی ساری کارروائیاں خاموشی سے دیکھے جارہا تھا کہ کہیں کسی چھوٹی سی بات کو جواز بنا کر بھارت نیپال پر اس قدر دباؤ نہ بڑھا دے کہ نیپال گورنمنٹ کو مجبوراً پاکستانی مہاجروں کی آمد کو روکنا پڑے۔ ملٹری اتاشی کے مطابق سفارت خانہ اگر ایک طرف میری کارروائیوں سے خوش تھا تو دوسری طرف خوفزدہ بھی تھا کہ کہیں ان کی وجہ سے مہاجروں کی آمد کا سلسلہ نہ رک جائے (اندرونی طور پر اس لئے کہ ان کی ''آمدنی'' کا سلسلہ رک جائے گا) میرے پاس بھارتی سازشوں کا ایک ہی جواب تھا کہ جو بھی جاسوس اور غدار نظر آئے اسے ختم کرتا جاؤں۔ یہ صرف میرا ذاتی فیصلہ نہیں تھا بلکہ میرے محکمے کی رضامندی بھی اس میں شامل تھی۔ اسی لئے مجھے واپس نہیں بلایا جاتا تھا اور میری مدد کیلئے تین چینی دوستوں کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔

اس بھارتی جاسوس کو میرے چینی دوستوں نے زہریلی سوئی کے ذریعے وہیں پر انجام تک پہنچایا سوئی فائر کرنے کا عملی مظاہرہ بھی میں نے دیکھا۔ اب لاش کو ٹھکانے لگانے کا مسئلہ درپیش تھا بھارتی نمایاں سفارت کاروں کے نام مجھے معلوم تھے۔ بھارتی سیکنڈ ملٹری اتاشی میجر باسو مسلمانوں سے اپنے تعصب اور پاکستان دشمنی میں سب سے آگے تھا۔ اس بھارتی ایجنٹ نے بھی اسی کا نام لیا تھا میں نے کمروں میں تلاش کرکے ایک سفید کاغذ لیا اور خط بگاڑ کر بڑے Capital حروف میں Gift For Major Basu (میجر باسو کیلئے تحفہ) لکھ کر لاش کے ساتھ نتھی کردیا۔ وین لے کر میں دروازے کے سامنے آگیا۔ چینی ساتھی لاش کو اٹھا کر دونوں طرف سے سہارا دے کر اس طرح باہر لائے جیسے کسی لڑکھڑاتے شرابی کو تھاما ہو۔ پچھلی سیٹ پر لاش کو بٹھا کر دونوں جانب وہ بیٹھ گئے۔ میں نے مکان کو لاک کیا اور پاکستانی ایمبیسی کے پاس گاڑی کھڑی کرکے چابی ٹرانسمیٹر آپریٹر کو واپس کی۔

(جاری ہے)

غازی

لاش دن کو ٹھکانے نہیں لگائی جا سکتی تھی اور میرا جو پروگرام تھا اس کیلئے بھی رات کے اندھیرے کی ضرورت تھی۔ ہم سارا دن شہر کی بیرونی سڑکوں پر وین کبھی دوڑاتے اور کبھی ریسٹ کرتے رہے۔ دوپہر کا کھانا بھی اسی وجہ سے گل ہوا۔ بسکٹ کے تین پیکٹ ہم نے شہر کے نواحی علاقے کی ایک دکان سے خریدے اور بھوک مٹائی۔ جب رات خاصی گہری ہوگئی تو میں وین بھارتی سفارت خانے کے عقب میں لے گیا جہاں سفارت خانے کی حدود کے اندر افسران کے فلیٹ تھے اور آمد و رفت کیلئے ایک گیٹ تھا۔ تھی تو یہ خطرناک اور جنونی بات لیکن میں نے چل سو چل کے مطابق اب کھلے طور پر میدان میں آنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سڑک پر آنے جانے والوں سے ہوشیار اور نظر بچا کر میرے ساتھیوں نے لاش کو وین سے اتارا اور بند گیٹ کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھنے کی پوزیشن میں رکھ کر آ گئے۔ وین پر چکر لگا کر ہم مخالف سمت سے انا پورنا ہوٹل میں داخل ہوئے۔ ریسیپشن سے معلوم ہوا کہ بعد دوپہر بہت سے مہاجر مجھے ملنے آئے تھے اور شام گئے تک انتظار کے بعد واپس چلے گئے۔ مریم نے بھی کئی بار فون کیا تھا چینی دوستوں کیلئے کمرہ تو میں نے بہت پہلے سے لیا ہوا تھا میں نے انہیں وہیں رکنے کیلئے کہا لیکن وہ واپس جانا چاہتے تھے بھوک اور تھکن سے میرا برا حال ہو رہا تھا کمرے میں جا کر میں نے مریم کو فون کیا اور کہا کہ اگر آج کی روداد سننی ہے تو کھانا لے کر تیار ہو جاؤ چینی دوست تمہیں لے کر ہوٹل آ جائیں گے اور واپسی پر میں تمہیں چھوڑ آؤں گا۔ آدھ گھنٹے میں ہی مریم آ گئی اس دوران میں گرم پانی سے نہا کر تازہ دم ہو چکا تھا کھانا کھاتے ہوئے میں نے مریم کو صبح سے اب تک کے تمام واقعات سنا دیئے۔ اس کا ردعمل اس کے جذبات کے مطابق تھا۔ کہنے لگی مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمہارا یہ زندگی اور موت کا کھیل شاید کبھی ختم نہ ہو اور میں نے پرسکون مستقبل کے جو خواب دیکھے ہیں وہ شاید کبھی بھی پورے نہ ہوں۔ میں نے مریم کو دلاسہ دیا اور کہا کہ یہ کھیل میں خوشی سے نہیں کھیل رہا کسی کی ہلاکت پر مجھے کبھی خوشی نہیں ہوتی۔ ایک انسان کو مارنا ایک دنیا کو ختم کرنا ہے۔ مجھے اس پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ بہرحال میں پوری کوشش کروں گا کہ جہنم کی وادی سے ہم جلد از جلد نکل جائیں۔ مریم کو واپس چھوڑ کر جب میں ہوٹل آیا تو نیند میری آنکھوں سے غائب ہو چکی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کھٹمنڈو میں تو ہر روز نت نئی مصیبتوں میں گھرتا جا رہا ہوں اور ان کا خاتمہ دور دور تک دکھائی نہیں دیتا۔ کھٹمنڈو میں مجھے جو مشن سونپا گیا تھا اس میں مجھے صرف Planted مہاجروں کے متعلق معلومات پاکستان بھیجنی تھیں یا اگر کسی بھارتی جاسوس کا پتہ چل جاتا تو اپنے سفارت خانے اور محکمے کو اس کی اطلاع دینی تھی لیکن میں غیر دانستہ طور پر ان فرائض کی انجام دہی میں اس قدر Involve ہو گیا کہ چاروں طرف سے دشمن میری زندگی کے درپے آزار ہو چکے تھے اور حالت یہاں تک بگڑ چکی تھی کہ ایک طرف تو پاک بھارت دشمنی کو دوستی میں بدلا جا رہا تھا اور ہمارا برسر اقتدار طبقہ بھارت سے محبت کی پینگیں بڑھا رہا تھا اور میں یہاں بھارت دشمنی اور اپنی جان بچانے کیلئے قتل پر قتل کئے جا رہا تھا۔ اپنے وطن کی محبت اور سالمیت کے تحفظ کیلئے دنیا بھر میں لاکھوں لوگوں نے خوشی خوشی اپنی جانوں کے نذرانے پیش کئے ہیں اور ان کے ملک اور قوم نے انہیں بے حد سراہا ہے لیکن پاکستان میں صورت حال مختلف تھی۔ سقوط ڈھاکہ کے فوری بعد اندرا گاندھی نے اپنی تقریر میں دو قومی نظریئے کو خلیج بنگال میں ڈبو دینے اور ہزار سالہ بدلہ لینے کا فخریہ ذکر کیا تھا اور پاکستان میں بھارت سے ہزار سال تک لڑنے اور شکست کا بدلہ لینے کی قسمیں کھانے والے اقتدار کے نشے میں ڈوب کر اپنی کرسی کی سلامتی کیلئے بھارت سے دوستی کر رہے تھے۔ یہ دوستی مسلسل بڑھتی گئی اور آج نوبت یہاں آن پہنچی ہے کہ خانہ جنگی اور اندرونی بغاوت کو فرو کرنے والوں کو مورد الزام ٹھہرایا جا رہا ہے۔ ان کے جذبہ حب الوطنی پر ندامت کا اظہار کیا جا رہا ہے اور ہزاروں لاکھوں بے گناہ پاکستانیوں کے قاتلوں کی قبروں اور یادگاروں پر پھول چڑھائے جا رہے ہیں۔ یاد رکھئے کہ جس قوم نے بھی وطن کی خاطر جان دینے والوں کی قربانیوں کو فراموش کر کے دشمن اور غداران وطن کو سراہا وہ قوم ذلت کی گہرائیوں میں ایسی گری کہ پھر کبھی بھی سر نہ اٹھا سکی۔ یہ فطرت کا اٹل قانون ہے اور اس سے مفر نہیں۔ 71ء میں سیاست دانوں کی ریشہ دوانیوں کے باعث پاکستان کی شکست کو افواج پاکستان کے سر منڈھا جا رہا تھا۔ افواج پاکستان کی مسلسل تذلیل کر کے اس کے جذبہ حب الوطنی اور Moral کو تباہ کرنے کی بھرپور کوششیں کی جا رہی تھیں تا کہ بھارت سے بدلہ لینے کا وہ کبھی سوچ بھی نہ سکیں اور حکمران چین کی بنسی بجاتے ہوئے آرام سے حکومت کے مزے لوٹیں۔ پاکستان سے جو اخبار سفارت خانے میں آتے تھے وہ سب حکمرانوں کے ہاتھوں بکے ہوئے ان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے تھے۔ صحیح حالات کا علم مجھے برطانوی اخباروں سے ہوتا تھا جنہیں میرے ہوٹل کی انتظامیہ بڑے اہتمام سے بمبئی سے منگواتی تھی۔ بعد میں میری کوششوں سے مجھے برطانوی اور امریکی سفارت خانوں سے بھی پرانے اخبار ملنے لگ گئے جنہیں ان سفارت خانوں کے نیپالی ملازم معقول معاوضے کے عوض مجھے پہنچا دیتے۔ اپنے ملکی حالات کی ابتری کا پڑھ میں اتنا دل گرفتہ ہو چکا تھا کہ میرے پاس اگر پاسپورٹ ہوتا تو میں مریم کو اپنی زوجیت میں لے کر کسی تیسرے ملک میں جا کر Settle ہو جاتا۔ لیکن سفارت خانہ یک طرفہ اور صرف پاکستان جانے کا اجازت نامہ جاری کرتا تھا۔ اگر میں اس اجازت نامے پر پاکستان چلا آتا تو میرا محکمہ مجھ سے بغیر اجازت واپس آنے پر سختی سے باز پرس کرتا۔ ایسے حالات میں مریم کی دیکھ بھال کون کرتا جس کا پاکستان میں میرے سوا کوئی نہ تھا۔ کھٹمنڈو میں میری حالت ایک قیدی سے بھی بدتر تھی۔

(جاری ہے)

غازی

قیدی کو جیل کی سلاخوں کے اندر زندگی کا تحفظ مل جاتا ہے لیکن میرے لئے نیپال ایک ایسی جیل تھی جس میں اپنی جان بچانے کیلئے مجھے خون پر خون کرنے پڑ رہے تھے۔ چاروں طرف سے دشمن مجھ پر ٹوٹ پڑے تھے آخر کب تک میں ان کا مقابلہ کرتا۔ مجھے اپنا انجام صاف دکھائی دے رہا تھا کہ کسی روز دشمن کی گولیاں میرے سینے میں پیوست ہو جائیں گی اور لاوارثوں کی طرح مجھے کھٹمنڈو میں دفن کر دیا جائے گا۔ یہاں صرف ایک ہستی ہی میری مونس اور رازدار تھی بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ پوری دنیا میں میری خیر خواہ صرف میری والدہ اور مریم ہی تھیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اللہ پاک کے حضور گڑگڑا کر میری سلامتی کیلئے دعائیں مانگنے والی میری والدہ کی دعاؤں ہی کا نتیجہ ہے کہ آج میں زندہ سلامت اپنی آپ بیتی آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ مریم سے بھی میں اپنی مایوسی چھپاتا تھا وہ بہت حساس تھی اور ایسی باتیں سن کر وہ فوراً آزردہ ہو جاتی۔ وہ پہلے ہی میرے لئے بہت متفکر تھی اور میں اسے دلاسہ دیتا رہتا تھا۔ اگر میں ہی اس سے مایوسی کی باتیں شروع کر دیتا تو وہ حوصلہ بالکل ہی ہار دیتی۔

آئندہ چند روز میں نے بھارتی سفارت خانے کے ردعمل کے انتظار میں گزارے لیکن اس طرف تو یکسر خاموشی چھائی ہوئی تھی میں نے میجر باسو کو تحفہ بھیج کر اسے چیلنج کیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میرے اشتعال دلانے سے بھنا کر وہ کھل کر سامنے آ جائے اور اپنا سارا زور مجھے زیر کرنے پر لگا دے۔ اس طرح اس کے گرگے اور ایجنٹ میری نظر میں آ جائیں گے جنہیں میں چن چن کر ہلاک کر دوں گا یا ان کے ہاتھوں مارا جاؤں گا۔ کچھ نہ کچھ فیصلہ تو ہو جائے گا۔ اس کے سوا میرے پاس کوئی دوسری صورت بھی نہ تھی۔ میں اس راستے پر اتنا آگے بڑھ چکا تھا کہ واپسی بھی ناممکن تھی۔ انہیں دنوں پاکستانی سفارت خانے نے 23 مارچ کو یوم پاکستان کے موقع پر ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ مجھے بھی دعوتی کارڈ دیا گیا۔ اس تقریب میں نیپالی وزیر خارجہ اور اعلیٰ حکام کے علاوہ اسرائیل کے سوا تمام سفارت کاروں کو مدعو کیا گیا تھا۔ میرے لئے کسی سرکاری تقریب میں شریک ہونے کا یہ پہلا موقع تھا۔ اچکن وغیرہ تو میرے پاس نہیں تھی اسلئے میں نے ایوننگ سوٹ پہنا۔ تقریب میں رسمی کلمات کے بعد مدعوئین کو مشروبات پیش کیے گئے۔ سارے مدعوئین اپنے ہم رتبہ لوگوں کے ساتھ ٹولیوں میں کھڑے تھے۔ نیپالی کمانڈر انچیف اور سفارتی فوجی عہدے دار فوجی ڈنر جیکٹس میں اپنے کندھوں پر اپنے عہدوں کے تمغے BRASS اور سینوں پر CEREMONIOUS تمغے لگائے اپنی محفلیں جمائے کھڑے تھے۔ میں ایک عراقی سفارت کار سے محو گفتگو تھا کہ کرنل کے اسٹار لگے ایک فوجی میرے قریب آیا اور کرنل آنند اور بھارتی ملٹری اتاشی کہہ کر اپنا تعارف کروایا۔ جواباً میں نے آصف علی اور ریفیوجی کہا۔ کرنل آنند کو میں نے پہلے بھی کئی بار دیکھا تھا لیکن تعارف آج پہلی بار ہوا۔ کرنل آنند نشے میں چور تھا MR.ASIF, YOU ARE AN ASSEST OF PAKISTAN (مسٹر آصف تم پاکستان کا سرمایہ ہو) کرنل آنند نے یہ کہتے ہوئے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں جواباً کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ کرنل آنند نے مسکراتے ہوئے کہا MAJOR BASU IS REALLY NOT HAPPY WITH YOUR GIFT (میجر باسو تمہارے تحفے سے خوش نہیں ہے) I THINK YOU ARE MISTAKEN. I NEVER SENT ANY GIFT TO BASU (میرے خیال میں تمہیں مغالطہ ہوا ہے۔ میں نے باسو کو کوئی تحفہ نہیں بھیجا) میں نے اس شرابی کرنل سے پیچھا چھڑاتے ہوئے کہا NO-NO WE INDIANS ARE NEVER MISTAKEN. IN 67 WE CHOSE TWO PERSONS FROM YOUR COUNTRY. ONE FROM EAST AND ONE FROM WEST WING. WE WORKED ON THEM AND THEY FULFILLED OUR DESIRES MORE THEN OUR EXPECTATION. WE ARE NEVER MISTAKEN. (نہیں نہیں، ہم بھارتی کبھی دھوکہ نہیں کھاتے۔ 67ء میں ہم نے تمہارے ملک کے مشرقی اور مغربی بازوؤں سے ایک ایک آدمی چنا، ان پر محنت کی اور انہوں نے ہماری امیدوں سے بڑھ کر ہماری خواہشات کی تکمیل کی۔ ہم کبھی مغالطے کا شکار نہیں ہوئے) کرنل آنند کو میں ایسا جواب دے سکتا تھا کہ اس کا سارا نشہ ہرن ہو جاتا لیکن یہ پاکستان کی تقریب تھی اور میں کوئی بدمزگی پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کرنل آنند سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا: WELL IF YOU INSIST, I AGREE THAT I SENT THE GIFT TO MAJOR BASU. I THINK HE IS NOT ARTISTIC MINDED. AS A TOKEN OF GESTURE NET TIME I WILL SEND A GIFT TO YOU AND I AM SURE THAT YOU WOULD DEFINITELY LIKEIT. (اگر تم اصرار کرتے ہو تو میں مان لیتا ہوں کہ باسو کو تحفہ میں نے بھیجا تھا۔ میرے خیال میں وہ فنکارانہ ذہن نہیں رکھتا۔ اگلی بار ایک تحفہ میں تمہیں بھیجوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں وہ ضرور پسند آئے گا مدہوش کرنل آنند پھٹی ہوئی آنکھوں سے میری بات سن رہا تھا۔ ازلی بزدل ہندوؤں نے چالاکی سے ہمارا ملک دولخت تو کر دیا تھا لیکن ایک پاکستانی مسلمان کی کھری باتیں سن کر یہ CELEBRATED کرنل اتنا خوفزدہ ہو گیا تھا کہ اس کے تمغے کانپنے لگے۔ یہ کہہ کر میں تقریب سے چلا آیا۔ قارئین ہماری ساری گفتگو انگریزی میں ہوئی تھی اور دوسرے تمام واقعات کی طرح یہ بھی مجھے حرف بحرف یاد ہے۔ جس طرح بھارت میں DMI والوں کے دیئے ہوئے زخموں کے نشان آج بھی میرے جسم پر واضح طور پر موجود ہیں۔ اسی طرح تمام واقعات اور ان کی تفصیل بھی میرے ذہن پر نقش ہے۔

یوم پاکستان کی تقریب میں کرنل آنند سے ملاقات ہوئے پانچواں دن تھا۔ میں سہ پہر کو کافی شاپ میں اکیلا بیٹھا تھا مجھ سے تین چار ٹیبل پرے میرے چینی دوست بیٹھے تھے۔ اچانک کسی نے مجھے میرے اصلی نام سے پکارا اپنا نام سن کر میں چونک تو اٹھا لیکن کوئی ردعمل ظاہر کیے بغیر کافی پینے میں مشغول رہا۔ دوبارہ نام پکارے جانے پر بھی میں نے کوئی دھیان نہ دیا۔ چند لمحوں بعد مجھے اپنے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ کرنل آنند تھا۔ میں اخلاقاً اس سے اٹھ کر ملا۔ چند رسمی کلمات کے بعد میں نے اسے اپنے ساتھ بیٹھنے کی دعوت دی تو اس نے کہا کہ میں اس کے ٹیبل پر آ جاؤں کیونکہ وہاں اس کے دو ساتھی بیٹھے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ اس کے ساتھیوں کے لئے میرے ٹیبل کی باقی کرسیاں حاضر ہیں۔ آنند نے یہ کہتے ہوئے کہ تم بہت ضدی ہو، اپنے دونوں ساتھیوں کو جو ہماری طرف ہی دیکھ رہے تھے اشارے سے بلایا۔ وہ دونوں میری ٹیبل پر آئے تو میں نے انہیں خوش آمدید کہا۔ کرنل آنند نے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا یہ میجر باسو ہیں سیکنڈ ملٹری اتاشی اور یہ کیپٹن مان ہیں تھرڈ ملٹری اتاشی اور یہ ہیں مسٹر (میرا اصلی نام) اوہ! مجھے افسوس ہے (OH-I AM SORRY) مسٹر آصف علی میں نے انہیں بیٹھنے کی دعوت دی اور ان کے لئے کافی منگوائی۔ میجر باسو بنگالی اور شکل سے ہی متعصب لگتا تھا۔ کیپٹن مان نوجوان اور موٹا سکھ تھا۔ ہم خاموشی سے کافی پینے لگے۔ بڑا عجیب منظر تھا ایک دوسرے کے جانی دشمن ایک دوسرے کے خطرناک ارادوں کو جانتے ہوئے بھی ایک ہی ٹیبل پر اس انتظار میں بیٹھے تھے کہ گفتگو کا آغاز دوسرا کرے۔ اس خاموشی کو آخرکار میجر باسو نے توڑا۔ میرا اصلی نام لیتے ہوئے وہ بولا کیا تم سمجھتے ہو کہ اس قسم کی حرکتوں سے جیسے تم نے چند روز پہلے لاش کے ساتھ چٹ لگا کر کی ہمیں خوف زدہ کر دو گے؟

(جاری ہے)

غازی

میں نے جواب دیا میجر باسو سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ میرا نام آصف علی اور میں غلط نام سے پکارے جانے کو پسند نہیں کرتا۔ دوسری بات کہ لاش کے ساتھ تمہارے نام کی چٹ لگی تھی تو اس بارے میں تم کو صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ میرا اصول ہے کہ میں تحائف قبول نہیں کرتا اور انہیں بھیجنے والوں کو واپس کر دیتا ہوں۔ تم نے ایک تحفہ میری نگرانی کے لئے بھیجا تھا۔ اپنے اصول کے مطابق میں نے تمہارا تحفہ تمہیں لوٹا دیا۔ لوٹانے کے عمل میں صرف یہی فرق پڑا کہ اس کی سانس بند ہو گئی۔'' تم نے ہمیں بہت UNDER ESTIMATE کیا ہے ہم جب چاہیں تمہیں ختم کر سکتے ہیں''۔ میجر باسو نے جھلاتے ہوئے کہا'' تم نے میرے منہ کی بات چھین لی''۔ میں نے کہا۔'' حقیقت یہ ہے کہ تم نے مجھے بھی بہت UNDER ESTIMATE کیا ہے۔ میں چاہوں تو تمہیں ابھی یہیں بیٹھے ہوئے ختم کر سکتا ہوں''۔ میجر باسو بے یقینی کی کیفیت سے دو چار میرے چینی ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔'' ان دو تین چینی لوگوں کے ساتھ تم ہمارا مقابلہ کرو گے؟'' میں نے ہنستے ہوئے کہا کہ'' میجر باسو، میں نے تو سمجھا تھا کہ بنگالی دماغ کے تیز اور بڑے ہوشیار ہوتے ہیں لیکن اب مجھے اپنے اس خیال پر نظر ثانی کرنی پڑے گی میں اور یہ چینی تو محض نمائشی طور پر تمہارے سامنے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ بھارت میں میرے قیام DMI کے ہاتھوں گرفتاری فرار اور بمبئی میں میری کارروائیوں کے متعلق تم جانتے ہو گے۔ کھٹمنڈو میں تو سب کچھ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ گورکھپور کا ہوائی اڈہ کیا میں اکیلے اڑا سکتا تھا؟ میں تو DMI کے CELL میں تھا۔ پھر بیرونی دیوار کس نے اڑائی تھی۔ وہ دو گارڈز جنہیں ہلاک کر کے میں فرار ہوا تھا کس نے ان کے ہاتھ پکڑے اور منہ بند کئے تھے تاکہ ان کی آواز نہ نکل سکے۔ کن کے ساتھ میرے TIMING SET تھے جن کی گاڑیاں مجھے لینے کے لئے بیرونی دیوار کے ساتھ کھڑی تھیں، میری تو ٹانگ زخمی تھی کس نے مجھے سہارا دے کر دیوار پر چڑھایا۔ میں فرار کے بعد کہاں روپوش رہا۔ کھٹمنڈو میں وہ کون تھے جنہوں نے مکتی باہنی والوں کو تلاش کیا اور انہیں مرگھٹ پہنچایا۔ میجر باسو تم تو کچھ بھی نہیں جانتے۔ تمہارے آدمی DMI ہیڈ کوارٹرز اور تمہارے آرمی، نیول اور ایئر فورس ہیڈ کوارٹرز میں بھی ہمارے PAY ROLL (تنخواہ دار) پر ہیں۔ تمہارے سفارت خانے کی کوئی بات ہم سے پوشیدہ نہیں۔ تم چاہو تو میں تمہارے فیملی ممبروں کے نام، عمریں اور تعلیم کے متعلق بھی سب کچھ بتا سکتا ہوں کہو تو تمہارے ڈرائنگ روم کے فرنیچر کی تفصیل میں تمہیں بتا دوں۔ مجھے یہ بھی علم ہے کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو اور تمہارے والدین کا کیا نام ہے۔ تمہارے جس ایجنٹ کو تھے میں، میں نے تمہیں واپس بھیجا ہے۔ اس کے متعلق مجھے کوئی خواب نہیں آیا تھا۔ تمہارے سفارت خانے کے تین آدمی بھی ہمارے PAY ROLL پر ہیں جو ہمیں پل پل کی خبریں دیتے ہیں۔ میں تو ایک معمولی کارکن ہوں اور یہ چینی میرے محافظ ہیں۔ صرف ہم ہی تمہارے سامنے ہیں۔ ہم تو ان ڈی جہازوں کی طرح ہیں جو فوجی ہوائی اڈوں پر حملہ آوروں کو دھوکہ دینے کے لئے PANS میں رکھے جاتے ہیں یہاں مجھے اور میرے چینی محافظوں کو ہلاک کرنا تمہارے لئے ناممکن ہے۔ اس وقت بھی کم از کم بیس آنکھیں تمہیں دیکھ رہی اور میرے اشارے کی منتظر ہیں۔ بھارت اور کھٹمنڈو میں ہماری جڑیں بہت گہری اور پھیلی ہوئی ہیں۔ 65ء میں ہم تم سے آمنے سامنے مردانہ وار لڑے اور تم نے دیکھ لیا کہ اسلحے کی برتری، پانچ گنا زیادہ نفری اور بغیر اعلان کے رات کے پچھلے پہر اچانک حملہ کرنے کے باوجود تمہاری بہادر افواج سترہ روز میں بارڈر سے صرف 14 میل کا فاصلہ طے کرنے میں ناکام ہو گئیں اور تمہارے کمانڈر انچیف جنرل چوہدری کی لاہور جیم خانہ میں چھوٹا پیگ پینے کی حسرت دل میں ہی رہ گئی۔ اس جنگ کے دوران تم پاکستان سے اتنے خوف زدہ تھے کہ دہلی سے اپنا دارالخلافہ الٰہ آباد منتقل کر دیا۔ UNO میں تمہارا نمائندہ بار بار دہائی دیتا رہا کہ ہم ابھی اور اسی وقت جنگ بند کرنے کو تیار ہیں۔ معاہدہ تاشقند کے وقت ہمارے صدر ایوب خان سے ہاتھ ملاتے وقت تمہارے وزیر اعظم لال بہادر شاستری کو خوف سے دل کا جان لیوا دورہ پڑا۔

65ء کی جنگ کے بعد تمہاری وزیر اعظم اندرا گاندھی نے تمہاری وزارت خارجہ کے سیکریٹری ڈی پی دھر کو خصوصی طور پر اسپین بھیجا کہ وہ لائبریریوں میں پرانی کتابیں کھنگالے اور ان مسلمانوں کے زوال کے اسباب معلوم کرے جنہوں نے اسپین پر آٹھ سو سال دھڑلے سے حکومت کی۔ ڈی پی دھر کی رپورٹ کی روشنی میں تم نے اپنی حکمت عملی بدلی اور پاکستان کے دونوں بازوؤں میں ایسے غدار ڈھونڈے جو فوری مالی لالچ اور اقتدار کے وعدے پر تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہو گئے 71ء میں جب ہم خانہ جنگی کو ختم کرنے میں مصروف تھے تو تمہاری حکومت نے موقع غنیمت جانا اور مشرقی پاکستان پر حملہ کر کے پاکستان کو دولخت کر دیا۔ یہ ہماری فوجی نہیں بلکہ سیاسی شکست تھی جس میں غدار ان وطن نے بھر پور حصہ لیا۔ ہماری صفوں میں میر صادق اور میر جعفر جیسے غدار ہمیشہ شامل رہے ہیں جن کی وجہ سے ہی ہمیں ہزیمت اٹھانی پڑی۔ ہم تو میدانوں، پہاڑوں، دریاؤں اور صحراؤں میں لڑنے والے تھے لیکن تمہارے محکمہ جاسوسی نے ہمارے ملک میں نہ صرف غداروں سے رابطہ کیا بلکہ یونیورسٹیوں میں اساتذہ کے روپ میں اپنے جاسوس بھیجے۔ جنہوں نے طلبہ کے ناپختہ ذہنوں کو برین واش کر کے وطن سے غداری پر آمادہ کیا۔ اب ہم نے بھی تمہارا طریقہ اپنا لیا ہے۔ سارے بھارت میں بکھرے ہوئے ہمارے ہزاروں تربیت یافتہ جاسوس اپنا کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں بھارتی مسلمان ذہنی اور دلی طور پر ہمارے ساتھ ہیں (جاری ہے)

غازی

وہ بھارتی آبادی کا پانچواں حصہ ہیں اور تم نہ تو ان سب کو جیل میں ڈال سکتے ہو اور نہ ہی ختم کر سکتے ہو۔ ہم جو بھی کام کرتے ہیں، دل و جان سے کرتے ہیں۔ میری طرف ہی دیکھو۔ ساڑھے تین سال سے زیادہ وقت میں نے بھارت میں گزارا اور درجنوں مشن کامیابی سے انجام دیئے۔ DMI والے مجھے میرے ایک ہم وطن غدار کی وجہ سے گرفتار کرنے میں کامیاب ہوئے تو ایک لفظ تک نہ اگلوا سکے۔ الٹا ان کے دو گارڈز مارے گئے۔ کھٹمنڈو میں تم میری کارکردگی سے واقف ہو۔ بیس سے زیادہ مکتی باہنی والے اور غدار ہم نے ہلاک کئے یہاں تم پر یہ ہماری پہلی ضرب ہے تم اب تک اس کا کیا جواب دے سکے۔ ہماری ٹیم یہاں پر بہت مربوط اور طاقتور ہے میں نے یہ سب باتیں تمہیں صرف اس لئے بتائی ہیں کہ تم کسی مغالطے کا شکار نہ رہو اور بھول میں کوئی ایسا قدم نہ اٹھاؤ جس کا خمیازہ تمہیں بہت بڑی قیمت دے کر اٹھانا پڑے۔ ہندو یا مسلمان چاہے کوئی بھی ہو۔ اسے ہلاک کرتے وقت ہمیں دکھ ہوتا ہے لیکن تم نے ان ہلاکتوں کو ہماری مجبوری بنا دیا ہے۔ تم یہاں پر اپنی جاسوسی کی کارروائیوں سے باز آ جاؤ تو ہم بھی تمہیں تحفے بھیجنے بند کر دیں گے"۔ اپنے چینی دوستوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے کہا "ان کے متعلق مجھ سے زیادہ تم جانتے ہو۔ 1962ء کی جھڑپ میں تم ان سے خوف زدہ ہو کر محاذ چھوڑ کر اس طرح بھاگے تھے کہ تزپور سے اپنی سرکاری فائلیں اور خزانہ تک نہ اٹھا سکے اور نہ ہی انہیں نذر آتش کر سکے۔ جیسے کہ میں نے پہلے کہا ہے۔ تمہارے سامنے صرف یہ دو ہیں لیکن ان کے درجنوں ہم وطن یہاں پر ہمارے دست و بازو ہیں"۔

قارئین آپ جانتے ہیں کہ ان سفارتی نمائندوں کے سامنے میں نے بہت سی غلط بیانی کی۔ خصوصاً اپنے وطن کے محکمہ جاسوسی اور نیپال اور بھارت میں اس کی بالادستی کا ذکر میں نے اس لئے کیا کہ یہ میری گفتگو سے اس حد تک سراسیمہ ہو جائیں کہ انہیں اپنے چاروں طرف پاکستانی جاسوس ہی نظر آئیں۔ سفارت خانے DMI تینوں افواج کے دفاتر میں بھی انہیں پاکستانی جاسوس دکھائی دیں انہیں میری باتوں کا یقین اس لئے آ گیا ہو گا کیونکہ کھٹمنڈو میں میرے آنے کے بعد بیس سے زیادہ افراد کی پراسرار اموات کا ذمہ دار وہ مجھے سمجھ رہے تھے اور ان میں سے تین جرمنوں کو چھوڑ کر باقی سارے بھارتی ایجنٹ یا پاکستان کے غدار تھے۔ میری بات ختم ہوئی تو یہ تینوں منہ کھولے اور آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھے جا رہے تھے۔ ان کے چہروں سے پریشانی اور خوف صاف عیاں تھا اور اس منظر سے میں بڑا لطف اندوز ہو رہا تھا اس وقت مجھے کسی کا یہ مقولہ یاد آ گیا کہ چوہے کو جنرل کی وردی پہنا کر بہادری کے تمغوں سے لاد دو لیکن وہ کبھی بھی بلی کا سامنا نہیں کرے گا۔

بھارت اور کھٹمنڈو میں میرے قیام کے دوران آج پہلی بار مجھے ایسا موقع ملا تھا کہ ان بھارتی فوجی افسران کے ساتھ جو میری حقیقت سے آگاہ تھے پوری آزادی کے ساتھ گفتگو کروں اور آئینے میں ان کا اصلی چہرہ انہیں دکھا سکوں اس کوشش میں، میں نے اپنا پورا زور بیان صرف کر دیا تھا میری یہ کوشش اس حد تک کامیاب رہی کہ کیپٹن مان نے ایک بار مجھے ٹوکنا چاہا تو میں نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا "کیپٹن کیا تمہاری اکیڈمی اس حد تک ناقص ہے جہاں تمہیں یہ بھی نہیں سکھایا گیا کہ جب دو سینیئرز بات کر رہے ہوں تو جونیئرز کو اپنا منہ بند رکھنا چاہئے" میری بات سن کر کیپٹن مان کو تو ایسی چپ لگی کہ اس SITTING کے دوران وہ ایک لفظ تک نہ بولا صرف رخصت ہوتے وقت گڈ بائی کہا۔ میری بات ختم ہونے کے بعد خاصی دیر تک یہ تینوں چپ رہے ان کی حالت صاف بتا رہی تھی کہ میں پوری طرح ان پر غالب آ چکا ہوں۔ اس خاموشی کو بالآخر کرنل آنند نے توڑا۔ "مسٹر آصف ہمیں آج پہلی بار آپ کی زبانی معلوم ہوا کہ گورکھپور کے ہوائی اڈے کی تباہی میں بھی آپ شامل تھے۔ مجھے آپ کا رینک تو معلوم نہیں لیکن میں آپ کی دلیری اور جرات پر آپ کو سلیوٹ کرتا ہوں I TAKE OFF MY HAT ON YOUR BRAVERY AND COURAGE) غیر ارادی طور پر ہماری آج کی پہلی SITTING میں ہی کشیدگی پیدا ہو گئی جس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔ رخصت ہونے سے پہلے میں آپ سے اپنی اس دلی خواہش کا اظہار ضرور کروں گا کہ میں آپ سے ایک بار نہیں بلکہ بار بار ملنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کو یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ ہماری آئندہ ملاقاتیں دوستانہ ماحول میں ہوں گی۔ میجر باسو ابھی تک ہم پنجابیوں کی یگانگت اور وسعت قلب کو نہیں سمجھ سکا۔ جس طرح بارڈرز کی لائن ہوا اور بادلوں کو آنے جانے سے نہیں روک سکتی، اسی طرح ہم پنجابیوں کی آپس میں محبت کے جذبے کو بھی تقسیم نہیں کر سکتی"۔ یہ کہہ کر کرنل آنند اٹھ کھڑا ہوا۔

(جاری ہے)

غازی

اس کے ساتھ ہی میجر باسو اور کیپٹن مان بھی کھڑے ہو گئے سب نے مجھ سے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور رخصت ہوئے۔ان کے ہاتھوں میں محبت کی گرمی نہیں بلکہ غصے اور بدلے کی آگ کی تپش تھی۔واپس جاتے ہوئے وہ کافی شاپ اور لابی میں چاروں جانب اور اوپر کی طرف اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے اچانک کہیں سے گولیاں چلیں گی اور انہیں چھلنی کر دیں گی۔کرنل آنند فوجی تھا لیکن سفارت خانے کے ماحول نے اسے سیاسی زبان سکھا دی تھی جس میں جھوٹ اور تصنع کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا اگلے روز ہی میں نے اس ملاقات کے بارے میں مفصل رپورٹ لکھ کر اور اس کی تین کاپیاں بنوا کر ایک اپنے سفیر کو دی اور دوسری پر اس سے وصولی کے دستخط کروائے۔اصل رپورٹ میں نے اپنے محکمے کو بھیجنے کیلئے اور تیسری کاپی اپنی فائل کے لئے رکھ لی۔مجھے اپنے سفیر پر کبھی بھی اعتماد نہیں ہوا کیونکہ اس کی گفتگو کا ایک ایک لفظ سفارتی اور سیاسی مبہم زبان میں ہوتا جس سے میں بے حد الرجک تھا۔

کھٹمنڈو کا موسم تیزی سے بدل رہا تھا۔تکلیف دہ سردی اب خوشگوار خنکی میں بدل چکی تھی۔میں نے ہوٹل انتظامیہ کے ذریعے اپنے کمرے کے دونوں کھڑکیوں پر مضبوط گرل اور جالی لگوا لی۔اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ میں اپنے کمرے کو دستی بم کے حملے سے محفوظ کرنا چاہتا تھا۔میرے فلور پر باہر سے پسٹل یا رائفل سے حملہ کرنا تو ناممکن تھا لیکن دستی بم کارگر ہو سکتا تھا یہ احتیاطی تدبیر بھی میں نے مریم کی ضد سے مجبور ہو کر کی تھی مہاجروں کیلئے افغان ایئر کے جہازوں کا حتمی شیڈول بھی آ گیا تھا۔پہلا جہاز 10 اپریل کو آنا تھا اور پھر باقاعدگی سے ہفتے میں دو پروازیں آنی تھیں۔پہلی پرواز پر جانے والے مہاجر خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے۔پاکستانی سفارت خانے میں گہما گہمی بہت بڑھ گئی تھی مہاجروں نے میرے پاس بھی ٹولیوں کی شکل میں آنا شروع کر دیا۔وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ میں اپنے اثر ورسوخ سے سفارت خانے کی جاری کردہ لسٹ میں ان کے نام لکھوا سکتا ہوں۔میں نے انہیں صاف بتا دیا کہ سفارت خانے میں میرے اثر ورسوخ کا یہ عالم ہے کہ میرے سفارشی مہاجروں کو تو شاید آخری فلائٹ پر بھی جگہ نہ دی جائے۔ان مہاجروں میں بہت سے ایسے بھی تھے جو مہینوں نہیں بلکہ برسوں سے یہاں مقیم تھے۔جب وہ آئے تھے تو رجسٹریشن کے وقت اگر ان کے افراد خانہ کی تعداد 4 تھی تو اب وہ پانچ یا چھ ہو چکے تھے اپنی غفلت یا سفارت خانے کی سرد مہری کے باعث وہ نومولود کی رجسٹریشن نہ کروا سکے۔سفارت خانے نے اسی کو بنیاد بنا کر انہیں اب تک کھٹمنڈو میں روک رکھا تھا۔بعض مہاجروں کو کھٹمنڈو کی پرامن زندگی اتنی پسند آئی کہ انہوں نے وہیں مستقل قیام کا ارادہ کر لیا اور جتنے عرصے تک نیپال حکومت نے انہیں پاکستان جانے پر مجبور نہ کر دیا وہ کھٹمنڈو میں ہی مقیم رہے۔میں نے محسن اور بزرگ شاعر سے جواب ماشاءاللہ عیال دار ہو چکے تھے پوچھا کہ اگر وہ چاہیں تو میں شروع کی چند پروازوں میں ان کے جانے کا انتظام کر دوں۔محسن نے تو صاف انکار کر دیا۔بزرگ شاعر نے شرماتے ہوئے کہا کہ بیگم امید سے ہیں اس لئے بچے کی پیدائش کے بعد ہی وہ پاکستان جائیں گے ان دونوں کے انکار کی اصل وجہ یہ تھی کہ پاکستان پہنچنے کے بعد انہیں اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا تھا۔یہاں کھٹمنڈو میں کوئی اور نہ سہی، مجھ پر انہیں یہ یقین تو ضرور تھا کہ میں ان کی دیکھ بھال اور ضروریات کا خیال رکھوں گا۔میں نے ان دونوں کے پاکستان پہنچنے کے بعد کی فوری ضروریات کے لئے دس دس ہزار روپیہ مریم کے والد کے پاس جمع کروا دیا اور ان دونوں کو بھی بتایا کہ پاکستان روانگی سے پہلے وہ یہ رقم حاصل کر لیں۔میرا یہ اقدام اس لئے تھا کہ میں خود اپنے متعلق کوئی بات بھی حتمی طور پر نہیں کہہ سکتا تھا اچانک ہی میری پاکستان واپسی کا حکم بھی آ سکتا تھا اور یہ بھی عین ممکن تھا کہ میں دشمنوں کی اندھی گولیوں کا نشانہ بن جاؤں۔مریم کو اپنی زوجیت میں لینے میں بھی صرف دوسری بات مانع تھی۔حاجی مستان اور یوسف پٹیل سے بھی ہر دس پندرہ روز بعد فون پر بات چیت ہوتی تھی۔میں نے انہیں مریم کے متعلق بتایا تو وہ بہت خوش ہوئے اور انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ ضرور بالضرور اس مبارک موقع پر کھٹمنڈو آئیں گے۔

(جاری ہے)

غازی

میں اپنے محکمے کو بھیجی جانے والی ڈاک میں اپنے گھر والوں کے لئے خط ضرور بھیجتا تھا جن کا جواب بھی اسی ذریعے سے مجھے ملتا تھا جن میں ہمیشہ خطوط کا کچھ حصہ سیاہی سے مٹایا ہوا ہوتا تھا۔ پاکستانی مہاجروں کی دیکھا دیکھی میں نے بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک کئی خط ڈائریکٹ اپنے گھر بھیجے تھے۔ جن کا کوئی بھی جواب مجھے موصول نہ ہوا۔ ایک روز خلاف معمول دن کے دس گیارہ بجے محسن میرے ہوٹل آیا۔ اس نے بتایا کہ تمام غیر ملکیوں کے خطوط بڑے ڈاک خانے میں ایک میز پر رکھ دیئے جاتے ہیں۔ جہاں سے سب اپنے اپنے خط چھانٹ کر لے جاتے ہیں رجسٹرڈ خط بھی ڈاک خانے کے ایک کلرک کے پاس ہوتے ہیں جو رجسٹریشن کارڈ یا پاسپورٹ دکھا کر حاصل کئے جاتے ہیں آج جب وہ اپنا رجسٹرڈ خط لینے اس کلرک کے پاس گیا تو اس کے پاس آصف علی کے نام کے چار خط تھے مجھے یہی بتانے کے لئے وہ آیا تھا۔ میں فوراً ہی تیار ہو کر محسن کے ساتھ ڈاک خانے پہنچا اور چاروں بھاری بھرکم خط وصول کئے۔ اسی تیزی سے میں اپنے ہوٹل واپس پہنچا۔ پردیس میں کٹھن حالات میں زندگی گزارنے والے کو گھر سے خط ملنے سے جو خوشی اور مسرت ہوتی ہے اس سے قارئین بخوبی واقف ہوں گے۔ میں نے محسن کو رخصت کیا اور اپنے کمرے میں جا کر خط جیب سے نکالے۔ میں اپنی والدہ اور بیوی کی تحریر کو بخوبی پہچانتا تھا۔ دو خط میری والدہ کے اور دو بیوی کے تھے میں نے پہلے والدہ کے خط کھولے۔ دونوں خطوں میں ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ یہ شکوے تھے کہ میں واپس کیوں نہیں آتا۔ میرے لڑکے شجاع کے متعلق لکھا تھا کہ وہ واکر کے ذریعے بہت جلد بغیر سہارے کے چلنے لگ گیا ہے اور اکثر پوچھتا ہے کہ میرے ابو کہاں ہیں والدہ نے یہ بھی لکھا تھا کہ کوئی ایسی ہی مجبوری ہوگی جس کے باعث میں اتنے سالوں سے گھر نہیں آیا۔ ان کے اس فقرے سے میری آنکھوں میں آنسو چھلک آئے کہ جلد واپس آنے کی کوشش کرو کہیں تمہیں سینے سے لگانے کی حسرت لئے ہی میں قبر میں نہ چلی جاؤں اور پھر جب تم آؤ تو "روؤ گے تم مزار پر، روئیں گے ہم مزار میں" والی بات نہ ہو۔

قارئین۔ میری یہ ذاتی باتیں گو کہ آپ بیتی سے ڈائریکٹ تعلق نہیں رکھتیں لیکن ان ڈائریکٹ تعلق ضرور ہے جس کا انتہائی مختصر الفاظ میں ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میری والدہ اپنے زمانے کی میٹرک اور اردو اور فارسی یکساں روانی سے بولتی لکھتی اور پڑھتی تھیں۔ وہ انتہائی حساس اور شوہر پرست تھیں ان کی انہی صفات کے باعث میرے والد نے اپنی تمام جائیداد اپنی زندگی میں ہی ان کے نام منتقل کر دی تھی۔ میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ میری والدہ نے بھی اپنے شوہر کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچائی اور شہر کی رہنے والی اس خاتون نے میرے والد کے انتقال کے بعد پورے 34 برس گاؤں میں گزارے اور سوائے میرے ہمراہ ہونے کے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا اسی گاؤں سے ان کا جنازہ اٹھا اور میرے والد کے پہلو میں دفن ہوئیں۔ میرے پاس ابھی تک وہ خطوط موجود ہیں جو میرے والد اور والدہ ایک دوسرے کو لکھا کرتے تھے ان کے خطوط کا آدھے سے زیادہ حصہ تو حافظ اور اقبال کے اشعار سے بھرا ہوتا تھا۔

جب میں نے اپنی بیوی کے خط کھولے تو پہلا مژدہ تو یہ پڑھا کہ اس نے گھر میں اپنا چولہا الگ کر لیا ہے "میرا تمہاری ماں کے ساتھ گزر نہیں ہو سکتا اور آئندہ اپنی تنخواہ مجھے علیحدہ بھیجنے کا انتظام کرو" جب میں خط کے ان الفاظ پر پہنچا تو جہاں میری بیوی نے میری والدہ کو "بڑھیا" کہہ کر مخاطب کیا تھا تو مجھ سے مزید برداشت نہ ہو سکا اور بغیر پڑھے میں نے اس کے خطوط پھاڑ دیئے۔ میری والدہ کے متعلق ایسے گھٹیا الفاظ والے خطوط میں پڑھنا تو کجا، اپنے پاس رکھنا بھی گناہ سمجھتا تھا۔ جیسا کہ میں شروع کے صفحات میں عرض کر چکا ہوں۔ سقوط ڈھاکہ کے وقت میں تربیلہ ڈیم بنانے والی غیر ملکی کمپنی تربیلہ جوائنٹ وینچر میں بحیثیت PRO (پبلک ریلیشن آفیسر) ملازم تھا اور میں نے خود اس حساس محکمے کو اپنی خدمات پیش کی تھیں اس انتہائی خطرناک کام کیلئے والنٹیر کرنے میں اگر نوے فیصد وجہ میری اپنے وطن سے محبت اور شکست کا بدلہ لینے کی خواہش تھی تو دس فیصد وجہ گھر کی بے سکونی اور اس کا کوئی حل نہ ملنے پر اس سے فرار حاصل کرنا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان واپسی کے بعد میں نے صرف چند ماہ بمشکل گھر میں گزارے۔ دو سال پشاور میں ملازمت کی اور پھر سات سال سے زیادہ عرصہ سعودی عرب اور 8 سال سنگاپور میں بسر کئے اور ان پندرہ سالوں کے دوران میں مجموعی طور پر 5 ماہ گھر میں رہا۔ میں جب بھی گھر آیا ملکی سامان اور تحفے تحائف سے بھری ہوئی ویگن لایا اور ہمیشہ ہنستے ہوئے گھر میں داخل ہوا لیکن وقت سے پہلے واپس جاتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو ہوتے تھے اور زبان پر دوبارہ کبھی واپس نہ آنے کا عہد جسے میں اپنی والدہ کی آہ وزاری کے باعث کبھی پورا نہ کر سکا۔

آئندہ کئی روز کوئی خلاف معمول بات نہ ہوئی۔ صبح شام بھی خاموشی اور روزمرہ کی مصروفیت میں گزرے۔ میرے پاس حاجی مستان اور یوسف پٹیل کی بھیجی ہوئی رقم میں سے ابھی خاصے روپے موجود تھے۔ اس رقم میں سے میں نے پاکستان جانے والی ہر فیملی کو تین ہزار روپے دینے کا فیصلہ کیا۔ گو کہ یہ بہت کم رقم تھی لیکن پاکستان پہنچتے ہی ان کو فوری مالی پریشانیوں سے بچا سکتی تھی۔ میرے سامنے صرف ایک مشکل تھی۔ پاکستان میں بھارتی کرنسی کا لین دین سختی سے ممنوع تھا اور نیپالی کرنسی کی کوئی ویلیو نہ تھی۔ کھٹمنڈو میں امریکی ڈالر بلیک میں بہت اونچے داموں ملتے تھے۔ حکومت پاکستان اور میرے محکمے کیلئے بھارتی کرنسی خاصی کشش رکھتی تھی۔ (جاری ہے)

غازی

دنیا بھر میں پاکستانی سفارت خانوں کے اخراجات کیلئے حکومت پاکستان امریکی ڈالر بھیجتی تھی اور ان میں نیپال میں ہمارا سفارت خانہ بھی شامل تھا۔ حکومت پاکستان کو تو اس نہایت معمولی بھارتی کرنسی سے دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی لیکن میں نے جب اپنے محکمے کو اپنی ڈاک میں 15 لاکھ بھارتی کرنسی بھیج کر یہ لکھا کہ اس کے عوض 15 لاکھ پاکستانی روپے مجھے بھیج دیں تو واپسی ڈاک میں ہی پاکستانی کرنسی مجھے مل گئی۔ بھارت میں رہائش کے دوران مجھے بخوبی علم ہو چکا تھا کہ میرا محکمہ بھارت میں کام کرنے والے اپنے متعدد گروپس کو جو بھارتی کرنسی بھیجتا تھا اور جو روپیہ بھارت میں ہمدردوں سے یہ گروپ حاصل کرتے تھے ان سب کی ادائیگی پاکستان کے قیمتی زرمبادلہ کے ذخائر سے امریکی ڈالر اور برٹش پاؤنڈ میں کی جاتی تھی۔ یہ پاکستانی روپیہ ملنے سے پانچ سو مہاجر خاندانوں کیلئے زادِ راہ کا انتظام ہو گیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق افغان ایئر کے فلائٹ شیڈول کے مطابق پانچ سو سے کم ہی مہاجر خاندان اس سیزن میں جا سکتے تھے۔ مریم اور میں نے پانچ سو لفافوں میں تین تین ہزار روپے رکھے۔ ہم نے یہ پروگرام بنایا کہ ہر فلائٹ سے پہلے ایئر پورٹ پر ہم دونوں یہ لفافے جانے والے مہاجروں کو بطور تحفہ دیں گے اور پہلے سے کسی کو اس بارے میں نہیں بتائیں گے۔ نئے مہاجروں کی آمد بھی ابھی جاری تھی اگرچہ ان میں خاصی کمی آ چکی تھی۔

ابھی فلائٹس شروع نہیں ہوئی تھیں اور یہ اپریل کی غالباً چار یا پانچ تاریخ تھی۔ میں حسب معمول رات کو مریم کے گھر سے واپس آیا تو میرے ہوٹل کی کافی شاپ میں اسرائیلی جاسوسہ میری منتظر تھی۔ ریسپشن سے مجھے اس کے متعلق پتہ چلا وہ کافی شاپ کے ایک کونے میں بیٹھی تھی، سر پر رنگ برنگی پٹیاں باندھے، گلے میں بڑے منکوں کے ہار پہنے اور چہرے پر مختلف رنگوں کی لکیریں لگائے اس نے خود کو پہچانے نہ جانے کی کافی حد تک کامیاب کوشش کی تھی۔ میں اس کی ٹیبل پر گیا اور اس کی آمد کی وجہ پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ وہ بولی ''میرے پاس بہت کم وقت ہے سب سے چھپ چھپا کر یہاں پہنچی ہوں۔ بھارتی سفارت کاروں نے تمہیں اغوا کرنے کیلئے ہمارے سفارت خانے سے مدد مانگی ہے۔ ہمارے دو ایجنٹ آئندہ دو تین روز میں امریکیوں کے بھیس میں تمہارے ہوٹل میں ٹھہریں گے اور تم سے بے تکلف ہونے کی کوشش کریں گے ان کے پاس اسلحے کے علاوہ بے ہوش کرنے والی گیس بھی ہے، ان سے بچ کے رہنا'' یہ کہتے ہوئے اس نے فلم کا ایک رول مجھے دیا'' رول میں ان کی کئی تصویریں ہیں جو میں نے خفیہ طور پر اپنے سفارت خانے میں اتاری ہیں۔ میں اپنے سفارت خانے سے سیدھی یہاں آئی ہوں۔ فلم خود دھلوا لینا۔ تمہارے احسان کا سارا تو نہیں لیکن کچھ بدلہ میں نے اتار دیا ہے'' یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ '' کافی اور سینڈوچز کا بل تم ادا کر دینا'' یہ کہتے ہوئے اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور نشے میں ہونے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے ''ہرے راما۔ ہرے کرشنا'' کا جاپ کرتی ہوئی ہوٹل سے باہر جا کر اندھیروں میں غائب ہو گئی۔ میں نے اپنے لئے کافی منگوائی اور خاصی دیر تک وہاں بیٹھا اس اسرائیلی لڑکی کے کردار کے متعلق سوچتا رہا۔ اپنے وطن اور قوم کیلئے جاسوسی کرنا اس کا پیشہ تھا بالکل میری طرح لیکن ہم دونوں اپنے پیشوں کے علاوہ انسان بھی تھے اور انسانی ہمدردی کے تحت احسان کرنا اور احسان کا بدلہ چکانے کا جذبہ دوسرے انسانوں کی طرح ہماری فطرت میں بھی شامل تھا۔ انسان تو انسان جانور بھی اس جذبے سے عاری نہیں۔ کتے سے لے کر ہاتھی اور چڑیا سے لے کر باز تک سب جانوروں اور پرندوں میں یہ جذبہ موجود ہے۔ صرف بتوں کے پجاری ہندوؤں میں ہی مسلمانوں کے خلاف اس قدر بغض اور عناد بھرا ہوا ہے جس نے ان میں انسانیت کی یہ حس بھی ختم کر دی ہے۔

اگلے روز میں نے محسن کو یہ فلم رول دیا جسے ڈیویلپ اور پرنٹ نکلوا کر وہ شام کو آ گیا۔ دونوں اسرائیلی ایجنٹوں کی 6 واضح تصاویر تھیں۔ محسن کو ان کے بارے میں میں نے کچھ نہیں بتایا کیونکہ وہ اپنی غیر معمولی حرکات اور خود پر قابو نہ رکھ سکنے کی وجہ سے ان اسرائیلیوں کو چوکنا کر دیتا اور بیچاری اسرائیلی جاسوسہ مفت میں ماری جاتی۔ مریم کی محبت، خلوص اور میری سلامتی کیلئے ان کے متفکر رہنے کے باعث میں اس کے سامنے اتنا بزدل بن گیا تھا کہ میں نے اس نئی آفت کے بارے میں اسے کچھ نہیں بتایا میں مسلسل نوٹ کر رہا تھا کہ پاکستانی لباس پہنے، اردو سیکھنے اور ہر روز مستقبل کے پلان بنانے کے باوجود اس کے چہرے کی شادابی کم ہو گئی تھی میں جب بھی مستقبل کے متعلق اس سے باتیں کرتا وہ خلاؤں میں گھورنے لگتی، جیسے اسے میری باتوں پر یقین نہ ہو اور وہ خلاؤں میں کسی سے میری باتوں کی تصدیق چاہتی ہو۔

اسرائیلی لڑکی کے مطابق دونوں اسرائیلی جاسوس مسلح تھے اور ان کے پاس بے ہوش کرنے والی گیس بھی تھی۔ میں نے اس جنگی اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے Kill your enemy before he kills you (دشمن کو اس سے پہلے ہلاک کرو کہ وہ تمہیں ہلاک کرے) خود پہلے حملہ کرنے کا پلان بنایا جس دن انہوں نے ہوٹل میں Check-In ہونا تھی، اسی رات میں نے انہیں ختم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ سائینا ائڈ والے میرے سلنڈر مریم کے پاس تھے اسے میں بتانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے چینی دوستوں کو سمجھایا کہ مجھے ان کا ایک گیس سلنڈر درکار ہے اور وہ مریم کو اس بارے میں کچھ نہ بتائیں۔ وہ گیس سلنڈر لے آئے۔ گیس ماسک پہلے ہی میرے پاس موجود تھی اپنی طرف سے مکمل تیاری کر کے اور منصوبے کو آخری ٹچ دے کر میں نے اسرائیلی جاسوسوں کا انتظار کرنا شروع کر دیا۔ اس دوران میں نے اپنے روز کے معمولات میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ دو دن بعد میں نے ان اسرائیلیوں کو کافی شاپ میں بیٹھے دیکھا۔ ان کے قریب ہی ایک ٹیبل پر میں بیٹھ گیا۔ کافی کا آرڈر دے کر میں نے سگریٹ نکالا اور'' جیبوں میں ماچس تلاش'' کرنے کے بعد میں ان کے پاس گیا اور ماچس مانگی۔ سگریٹ سلگا کر میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اپنا تعارف آصف علی نام سے کروایا اور انہیں بتایا کہ میں پاکستانی مہاجر ہوں اور گزشتہ کئی ماہ سے اس ہوٹل میں مقیم ہوں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ امریکن ٹورسٹ ہیں اور آج ہی اس ہوٹل میں آئے ہیں اپنے شکار کو اتنے قریب پا کر انہوں نے مجھے اپنے ٹیبل پر بیٹھنے کی دعوت دی۔ میں ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ ویٹر میری آرڈر دی ہوئی کافی اسی ٹیبل پر لے آیا۔ میں نے بلا جھجک یہ کافی پی اس میں کسی چیز کی ملاوٹ کا اس لئے احتمال نہیں تھا کیونکہ اس کا آرڈر میں نے اپنی ٹیبل سے دیا تھا۔ اسرائیلی سفارت خانے نے محض خانہ پری اور بھارتی مطالبے کو پورا کرنے کیلئے اپنے تھرڈ کلاس جاسوس بھیجے تھے۔ ان بظاہر امریکنوں کی نہ تو انگریزی امریکی تلفظ میں تھی اور نہ ہی امریکہ کے متعلق ان کی معلومات کسی پاکستانی اسکول کے طالب علم سے زیادہ تھیں۔ ہم باتیں کرتے ہوئے ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں تول بھی رہے تھے۔ ان کے متعلق میرا اندازہ یہ تھا کہ یہ جاسوسی کے علم سے کافی حد تک نابلد اور صرف قتل کرنے والے تھے۔ اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد آج رات ہی ان کا کام تمام کرنا اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔ ان سے رخصت ہو کر میں ریسپشن پر چلا آیا اور ان'' امریکیوں'' کے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ ان کا کمرہ میرے فلور پر ہی 15 نمبر تھا۔ میں حسب معمول شام کو مریم کے گھر گیا لیکن جلد ہی لوٹ آیا اور لابی میں بیٹھ کر مختلف رسالوں کی ورق گردانی کرنے لگا۔ میں چاہتا تھا کہ انہیں اپنے کمرے میں جاتا دیکھ لوں تو پھر اپنے کمرے میں جاؤں۔ رات 10 بجے کے قریب یہ باہر سے واپس لوٹے اور سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ بیس منٹ کا وقفہ دے کر میں بھی اپنے کمرے میں چلا آیا۔

(جاری ہے)

غازی

اپنا گیس سلنڈر اور زہریلی سوئیوں والا ڈبہ چیک کیا۔ ہوٹل میں آتشیں اسلحے کے استعمال سے سو فیصد قتل کی واردات بنتی تھی۔ ٹھیک 11 بجے گیس ماسک لگا کر اور گیس سلنڈر ہاتھ میں لئے میں نے اپنے کمرے کی بتیاں بجھائیں اور دروازے سے باہر جھانکا۔ ہر طرف خاموشی تھی میں بے آواز قدموں سے چلتا ان کے کمرے کے دروازے تک گیا اور دستک دی۔ اندر سے آواز آئی Who is there (کون ہے) میں نے حتی الامکان اپنی آواز بدلتے ہوئے کہا "Waiter Sir" میں "ONE MESSAGE FOR YOU SIR" میں نے ویٹروں جیسی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا۔ "ONE MOMEHNT" اندر سے آواز آئی میں بائیں دروازے کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا کیونکہ دایاں دروازہ پہلے کھلتا تھا۔ گیس سلنڈر میں نے اس طرح پکڑا ہوا تھا کہ گیس نکلنے کے بٹن پر میری انگلی تھی میں یہ دعا مانگ رہا تھا کہ دروازہ کھلنے سے پہلے کوئی اور گیسٹ اس فلور پر نہ آ جائے۔ دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی ایک اسرائیلی ''ویٹر'' سے پیغام لینے کیلئے دروازے سے تھوڑا سا باہر نکل آیا۔ سامنے کسی کو نہ دیکھتے ہوئے اس نے بائیں طرف دیکھا جہاں میں کھڑا تھا ماسک والا چہرہ دیکھ کر اسے فوری خطرے کا احساس ہوا۔ ادھر میں نے اس کے اپنی طرف دیکھتے ہی سلنڈر سے گیس خارج کرنے کا بٹن دبا دیا تھا۔ بیک وقت دو کام ہوئے۔ گیس اس کے نتھنوں میں گھسی اور وہ اپنے بچاؤ کیلئے ہٹا لیکن اسے دیر ہو چکی تھی اس کے گرنے سے پہلے ہی میں نے اسے دھکا دے کر اندر پھینکا اور اسے پھلانگتے ہوئے دوسرے اسرائیلی کے بیڈ پر جا پہنچا۔ دروازہ کھلنے سے اب تک صرف سات یا آٹھ سیکنڈ ہی گزرے تھے۔ دوسرے اسرائیلی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی خطرے کو بھانپتے ہوئے تکیے کے نیچے سے ریوالور اٹھانا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی میں اس کے چہرے پر گیس پھینک چکا تھا۔ وہ چند لمحے بستر میں ہی پھڑپھڑایا اور ٹھنڈا ہو گیا میں نے پہلے دروازہ اندر سے لاک کیا اور دونوں کھڑکیاں کھول دیں تاکہ گیس نکل جائے۔ دروازے کے قریب پڑے اسرائیلی کی لاش کو میں نے اس کے بیڈ پر ڈالا۔ دونوں نے سلیپنگ سوٹ پہن رکھے تھے۔ میں نے ان کے ہینگروں پر لٹکے لباس، مختصر سامان اور بیڈز کے ساتھ جڑی سائیڈ ٹیبلز کی تلاشی لی۔ تکیوں کے نیچے سے دو بھرے ہوئے ریوالور سامان میں سے فالتو گولیاں، دو سلنڈر اور دونوں کے بٹوے ملے۔ جن میں امریکی پاسپورٹ اور تھوڑے سے ڈالر تھے۔ دونوں کے بٹوؤں سے میری ایک ایک تصویر بھی ملی۔ یہ تصویریں اخباری نہیں بلکہ کیمرے سے کھینچی ہوئی تھیں۔ پس منظر میں انا پورنا ہوٹل تھا۔ گویا کسی نے ہوٹل سے میرے باہر نکلتے وقت کی تصویر اتاری تھی۔ میں نے کھڑکیاں بند کر دیں۔ یہ سب سامان اٹھایا اور کمرے کی لائٹ بند کر کے نائٹ بلب جلا کر دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں آ گیا۔ ان کا سب سامان اور اپنا پسٹل، گولیاں زہریلی سوئیوں کا ڈبہ، سلنڈر اور گیس ماسک ایک ایئر بیگ میں ڈالے اور دروازہ لاک کر کے نیچے لابی میں آ گیا۔ ہوٹل میں میری اس رات داخلے کی انٹری ہو چکی تھی۔ اس لئے ریسیپشن پر کسی کو بتائے بغیر میں آنکھ بچا کر ہوٹل سے باہر آ گیا اور وین لے کر سیدھا مریم کے گھر پہنچا۔ وہ میری آمد کا سن کر ہڑبڑا کر اٹھی۔ میں نے بیگ اس کے حوالے کیا اور کہا کہ ہوٹل میں مجھ سے دو اسرائیلی جاسوس مارے گئے ہیں۔

(جاری ہے)

غازی

بیگ کو وہ کسی محفوظ جگہ پر چھپا کے رکھ لے۔ مجھے فوری واپس ہوٹل پہنچنا ہے۔ کیونکہ میری IN کی انٹری ہو چکی ہے۔ سارا واقعہ تفصیلاً کل اسے بتاؤں گا۔ مریم نے بھی مجھے اس وقت روکنا مناسب نہ سمجھا۔ میں اپنے ہوٹل واپس پہنچا۔ میری غیر حاضری کسی نے محسوس نہ کی تھی۔ کافی شاپ میں کافی پینے کے بعد میں اپنے کمرے میں چلا آیا اور لمبی تان کر سو گیا۔ میری ذہنی حالت ایسی ہو چکی تھی کہ دشمن کو مارتے وقت مجھے اتنا بھی افسوس نہیں ہوتا تھا جتنا کسی کو چوہا مارنے پر ہو۔

اگلے روز بعد دوپہر ہوٹل کی انتظامیہ کو ان (امریکنوں) کی ہلاکت کا پتہ چلا۔ ان کا دروازہ میں نے باہر نکلتے وقت اندر سے لاک کر دیا تھا اور دروازے پر DO NOT DISTURB کا بورڈ پہلے ہی سے لٹکا ہوا تھا وہ تو HOUSE KEEPING (کمرے کی صفائی) والوں نے کئی بار ان کے کمرے کے چکر لگانے کے بعد بالآخر صفائی کیلئے ماسٹر چابی سے دروازہ کھولا اور انہیں سوتے پا کر بیڈ شیٹس تبدیل کرنے کیلئے انہیں جگانا چاہا تو معلوم ہوا کہ وہ ابدی نیند سو چکے تھے۔ ہوٹل میں شور مچ گیا۔ انتظامیہ نے پولیس کو فوری طور پر اطلاع دی۔ پولیس نے آ کر تفتیش شروع کی تو انہیں بتایا کہ کمرہ اندر سے بند تھا اور HOUSE KEEPING والوں نے اسے کھولا پولیس کو فوری طور پر کوئی سراغ نہ مل سکا۔ ان کی لاشیں اٹھوا کر سرد خانے میں بھجوا دی گئیں۔ رسمی کاغذی کارروائی اور ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے مہمانوں کی لسٹ اور مرنے والوں کا سامان لے کر پولیس واپس چلی گئی۔ ان کے شناختی کاغذات اور پاسپورٹ بھی پولیس کو نہ ملے اس لئے ہوٹل میں ''تفتیش کے دوران امریکن سفارت خانے سے بھی پولیس نے رجوع نہیں کیا۔ میں جانتا تھا کہ پولیس کوئی سراغ نہ ملنے پر خاموشی سے واپس تو چلی گئی ہے لیکن اس کی فائلوں میں اندھے قتلوں کی فہرست میں دو اور کا اضافہ ہو گیا ہے۔ جسے وہ یونہی ہضم نہیں کرے گی اور یہی ہوا۔ مریم کو ساری واردات کا تفصیلاً بتا کر اور اس سے یہ عہد کر کے کہ آئندہ اس کو جانتے بوجھتے لاعلم رکھ کر میں کوئی ایسی بات نہیں کروں گا جب میں رات گئے اپنے ہوٹل واپس لوٹا تو معلوم ہوا کہ پولیس کی خاصی بڑی نفری ہوٹل میں ایس پی کی سربراہی میں موجود ہے اور ایس پی اپنے ماتحتوں کے ساتھ ہوٹل کے ملازمین کے علاوہ وہاں ٹھہرے ہوئے مہمانوں سے پوچھ گچھ کر رہا ہے اور سب کے کمروں کی تلاشی بھی لی جا رہی ہے۔

ہر کمرے کی طرح میرے کمرے کے باہر بھی ایک سپاہی کھڑا تھا۔ دروازہ کھولنے پر وہ میرے ساتھ ہی کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے چند منٹ یونہی گزارے اور کمرہ بند کر کے کافی شاپ میں آ بیٹھا۔ کئی مہمانوں سے تفتیش کر کے جب میری باری آئی تو S.P نے کافی شاپ میں ہی نہایت شرافت سے مجھ سے تفتیش کا آغاز کیا۔ میں نے اسے گھڑی گھڑائی کہانی سنائی کہ میں مشرقی پاکستان میں چٹا گانگ میں تھا جب سقوط ڈھاکہ کا سانحہ پیش آیا۔ میں کئی برس چٹا گانگ کے پہاڑی سلسلے میں چکمہ قبائل کے مرکزی گاؤں رانگا مائی میں رہا کیونکہ چکمہ قبائل کا سردار راجہ تری دیو رائے میرا گہرا دوست تھا۔ چند ماہ پہلے ہی میں کھٹمنڈو پہنچا ہوں اور پاکستانی سفارت خانے میں رجسٹرڈ پاکستانی مہاجر ہوں۔ ایس پی نے میری ساری روداد خاموشی سے سنی۔ اب سوال، جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایس پی ''آپ اتنے مہنگے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں جبکہ پاکستانی مہاجر تو ایک خستہ حالی میں زندگی گزار رہے ہیں'' میں ''مہاجر ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ مالی طور پر بھی لازمی کمزور ہو۔ میں اپنا تمام سرمایہ ہمراہ لایا ہوں اور اپنے معیار کے مطابق رہ رہا ہوں۔ میں ضرورت مند مہاجروں کی مالی امداد بھی کرتا ہوں'' S.P جب آپ مالی طور پر خوشحال ہیں تو اپنا ٹکٹ خرید کر پاکستان کیوں نہیں چلے جاتے۔ میں' میرا چھوٹا بھائی بھی ڈھاکہ میں تھا۔ میں اسی کے انتظار میں ہوں۔ آخری اطلاعات کے مطابق اس نے بھی ڈھاکہ میں کہیں پناہ لے رکھی ہے۔ وہ یہاں آ جائے تو میں اسے لے کر فوری یہاں سے چلا جاؤں گا۔ S.P ہمیں معلوم ہوا ہے کہ پاکستانی سفارت خانے میں آپ کے ساتھ خصوصی طور پر اچھا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ میں'' یہ درست ہے اور اس کی وجہ محض میری مالی خوشحالی ہے۔ آپ نے بھی اس ہوٹل میں اپنی تفتیش کے دوران میرے ساتھ جو رویہ اپنایا ہے۔ وہ ہر مہاجر کے ساتھ یقیناً نہیں ہوگا'' S.P ہمیں آج ہی کسی ذریعے سے ایک بھارتی اخبار ملا ہے۔ جس میں آپ کی تصویر کے ساتھ یہ لکھا ہوا ہے کہ آپ مہاجر نہیں بلکہ پاکستانی جاسوس ہیں'' میں نے ہنستے ہوئے جواب'' ایس پی صاحب، بھارت ہمارا دشمن ہے۔ (جاری ہے)

غازی

حکومت سونپنے کے بجائے اسے گرفتار کر کے مغربی پاکستان لے جایا گیا۔ کیا آپ آج کے ڈیموکریٹک ورلڈ (DEMOCRATIC) میں کوئی ایک بھی ایسی مثال دے سکتے ہیں کہ اکثریتی پارٹی کے لیڈر کو (CHIEF EXECUTIVE) بنانے کے بجائے جیل میں ڈال دیا جائے۔ یحییٰ خان کے اس عمل کو مشرقی پاکستان کے ووٹروں نے انتہائی سنجیدگی اور جذباتی طور پر محسوس کیا۔ ہمارے لئے یہ سنہری موقع تھا ہم نے انہیں اس بات کا بھرپور یقین دلایا کہ مشرقی پاکستان والے چاہے ہاریں یا جیتیں، حکومت ہمیشہ مغربی پاکستان والے ہی کریں گے، یحییٰ خان کے فوجی ہونے اور مارشل لاء کو بنیاد بنا کر ہمیں مشرقی پاکستانیوں کو پاکستانی فوج کے خلاف بھڑکانے کا بھی اچھا موقع مل گیا۔ ان دنوں پاکستان میں ایسے عجوبے ہوئے جن کی دنیا بھر میں مثال نہیں ملتی۔ اکثریتی پارٹی کے لیڈر کو جیل میں ڈالا گیا۔ لاکھوں بنگالیوں (مشرقی پاکستانیوں) کو محض اس جرم میں گولیوں کا نشانہ بنایا گیا کہ وہ بنگالی بولتے تھے۔ بھٹو کو سول چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنایا گیا۔ یہ ''نیا عہدہ'' بھی دنیا میں پہلی بار معرض وجود میں آیا تھا مسئلہ کشمیر پر پاکستان اور بھارت کے درمیان تین جنگوں نے دونوں ملکوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا رکھا تھا۔ پاکستان کی سالمیت اور دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کو ٹکڑے کرنے کیلئے جب بھٹو، مجیب اور یحییٰ خان ہی در پے تھے تو ہم کیوں خاموش رہتے۔ ہم نے تینوں کی پیٹھ تھپکی، مالی اور مادی امداد دی اور جب ضرورت پڑی تو اپنی فوج بھی جھونک دی۔ مسٹر آصف غیر جانبدار ہو کر سوچئے۔ مجیب کو ہم نے نہیں بلکہ یحییٰ خان نے جیل میں ڈالا تھا۔ سلامتی کونسل میں بھٹو صاحب کو پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے عین اسی وقت ''شدید فلو'' ہو گیا جب پاکستان بھارت جنگ فیصلہ کن موڑ پر پہنچ چکی تھی۔ پولینڈ کی قرارداد (جس میں فوری جنگ بندی، دونوں ملکوں کی افواج کو واپس اپنی سرحدوں میں جانے اور مشرقی پاکستان کا سیاسی تصفیہ کرنے کا کہا گیا تھا اور اس قرارداد کو دونوں سپر پاورز یعنی روس اور امریکہ کی تائید حاصل تھی) کو ہمارے نمائندے نے نہیں بلکہ بھٹو صاحب نے پھاڑا تھا۔ حالانکہ اس قرارداد کے مطابق بھارتی افواج کو جو ڈھاکہ کے مضافات میں پہنچ چکی اور یقینی فتح سے ہمکنار ہونے والی تھی۔ واپس بھارتی سرحدوں پر لوٹنا پڑتا۔ جبکہ پاکستانی افواج مشرقی پاکستان میں ہی رہتی۔ مغربی پاکستان کا پانچ ہزار مربع میل علاقہ بھی پاکستان کو واپس مل جاتا۔ نوے ہزار پاکستانی افواج کو بھی ہتھیار ڈالنے نہ پڑتے اور نہ ہی وہ جنگی قیدی بنتے۔ بھٹو نے یہ سب ذلت و خواری منظور کر لی کس لئے؟ صرف مغربی پاکستان میں اپنی حکومت قائم کرنے کی خواہش میں۔ مسٹر آصف میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ پاکستان اور بھارت دونوں کے لیڈروں کو جب اپنی کرسی ڈگمگاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے تو وہ اسے سہارا دینے کیلئے پاک بھارت جنگ کی باتیں شروع کر کے عوام کی توجہ ملکی مسائل سے ہٹا دیتے ہیں لیکن ہمارے اور آپ کے لیڈروں میں ایک بہت بڑا فرق ہے۔ پاکستان اور بھارت کو آزادی ملے آج 28 سال ہو چکے ہیں ہمارے پہلے پردھان منتری (وزیر اعظم) پنڈت جواہر لال نہرو تھے وہ سورگباش ہوئے تو دوسرے پردھان منتری لال بہادر شاستری بنے۔ انہوں نے پنڈت جی کی ملکی سیوا کو بہت سراہا اور کہا وہ پنڈت جی کے TRACKS پر ہی اپنے ملک کی سیوا کریں گے اور یہی الفاظ شریمتی اندرا گاندھی جی نے لال بہادر شاستری کے سورگباش (مرنے) پر، پردھان منتری بننے پر شاستری جی کے متعلق کہے۔ ہمارے ملک میں ان 28 برسوں میں تین حکومتیں بدلیں اور وہ بھی پردھان منتریوں کے سورگباش ہونے کی وجہ سے ان دوران آپ کے ملک میں گیارہ حکومتیں بدلیں ہر حکومت کا تختہ الٹا گیا ہر نئے اقتدار سنبھالنے والے نے پچھلوں کو کوسا انہیں بے حد برا بھلا کہا اور ان پر ملک دشمنی کے بدترین الزام لگائے گئے۔ ہمارے اور آپ کے لیڈروں میں فرق یہ ہے کہ اپنی ذاتی کمزوریوں کے باوجود ہمارے لیڈر اپنے ملک کے وفادار ہیں جبکہ آپ کے لیڈر اپنے ملک کے بھی وفادار نہیں۔ اگر ہمیں مجیب اور بھٹو کی آشیر واد میسر نہ ہوتی تو ہم کبھی بھی جنگ میں نہ کودتے ہم پاکستانی فوج کی دلیری اور حب الوطنی سے 65ء کی جنگ میں بخوبی واقف ہو چکے تھے ہمیں علم تھا کہ پاکستانی فوج کٹ تو سکتی ہے پیٹھ نہیں دکھا سکتی۔ یہ صرف آپ کے مقبول ترین لیڈروں کی شہ اور سبز جھنڈی تھی جس نے ہمیں پاکستان کی سیاسی بے چینی سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ دیا''۔

کرنل آنند اور اس کے ساتھیوں سے میری گفتگو کافی دیر جاری رہی۔ جب وہ رخصت ہوئے۔ تو میرے لئے ایک سوالیہ نشان چھوڑ گئے تھے جسے میں آج تک اپنے دل و دماغ سے کھرچ نہ سکا۔ شائد قارئین اس سوال کا مناسب جواب دے سکیں۔

کافی شاپ میں کافی دیر تک بیٹھا میں بھارتی فوجی افسران سے آج کی گفتگو کے متعلق سوچتا رہا۔ کرنل آنند نے دراصل گزشتہ ملاقات کے دوران میری کہی ہوئی باتوں کا آج جواب دیا تھا۔ سقوط ڈھاکہ سے پہلے پاکستان کے سیاسی حالات، ہمارے لیڈروں کی خود غرضی اور پاکستان کی سالمیت کے خلاف ان کی سازشوں جن کے نتیجے میں پاکستان دولخت ہوا کو دہرا کر مجھے بلکہ پوری قوم کو آئینہ دکھایا تھا۔ اس نے سب کچھ سو فیصد صحیح کہا تھا اور کسی حقیقت کو محض اس لئے جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ وہ دشمن کے منہ سے نکلی ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ بھارت کو خود ہم نے موقع فراہم کیا کہ ان حقائق کی روشنی میں ناپختہ ذہن (IMMATURE BRAIN) نوجوانوں کی برین واشنگ کرے جس میں وہ سو فیصد کامیاب رہا۔ بھارت نے پاکستانی جوانوں کی برین واشنگ کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھا اور آج 1998ء میں بھی پاکستان کے داخلی انتشار اور سیاسی کمزوری اور اپنے مضبوط پروپیگنڈے کے باعث وہ اس حد تک کامیاب ہو چکے ہیں کہ 65ء کی پاک بھارت جنگ میں یک جان ہو کر لڑنے والی قوم آج بیسیوں سیاسی، مذہبی اور لسانی جماعتوں میں بٹ چکی ہے۔ سب کا اپنا اپنا علیحدہ راستہ ہے ان میں نفرت کی دیواریں اتنی اونچی ہو چکی ہیں کہ انہیں ان دیواروں کے پار کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ لا الہ الا اللہ کی بنیاد پر معرض وجود میں آنے والے اسلامی جمہوریہ پاکستان میں سیاسی، لسانی اور مذہبی اختلافات کو دشمن نے اتنی ہوا دی ہے کہ مسلمان ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں اور اس حقیقت کو بالکل فراموش کر چکے ہیں کہ ان کی شناخت پاکستان ہے۔ اگر خدانخواستہ پاکستان ہی نہ رہا تو ان کی شناخت بھی باقی نہ رہے گی۔ میں آپ کو حلفیہ کہتا ہوں کہ بھارت میں DMI کی قید کے دوران مجھ سے ایک بار بھی مجھ سے میرا مسلک، سیاسی نظریات اور آبائی وطن یا صوبے کا نہیں پوچھا گیا۔ مجھ پر ظلم و تشدد کے پہاڑ توڑنے کیلئے میرا صرف پاکستانی اور مسلم ہونا ہی کافی تھا۔ آج پاکستانی قوم کے بیشتر افراد مسئلہ کشمیر کو ایک DEAD ISSUE سمجھتے ہیں۔ یہ بھی بھارتی پروپیگنڈے کا کمال ہے ورنہ اگر کشمیر ایک DEAD ISSUE ہوتا تو 48ء میں مقبوضہ کشمیر میں تعینات 20 ہزار بھارتی فوج کی تعداد آج بڑھ کر 7 لاکھ نہ ہوتی۔

کرنل آنند اس ملاقات کے بعد کئی مرتبہ مجھے ملنے آیا ہر ملاقات میں اس کی باتیں میں خاموشی سے سنتا رہتا اور اگر جواب دیتا تو وہ بھی انتہائی مختصر اور اس کی توقع کے مطابق۔ کرنل آنند یہ سمجھ رہا تھا کہ میری خاموشی کی وجہ یہ ہے کہ میں اس کی برین واشنگ کے زیر اثر آ چکا ہوں جب کہ میں چاہتا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ بولے تاکہ میں بھارتی پروپیگنڈے کی وسعت اور گہرائی کے آخری سرے تک پہنچ سکوں۔

کرنل آنند سے اپنی ہر ملاقات کی تفصیلی رپورٹ میں اپنے سفارت خانے اور محکمے کو باقاعدگی سے بھیجتا تھا۔ ایسی ہی ایک ملاقات کے دوران کرنل آنند نے یہ سوچتے ہوئے کہ میں اس کے دلائل سے متاثر ہو چکا ہوں، ایک قدم آگے بڑھایا اور مجھ سے پوچھا کہ بھارتی سفارت خانے میں ہم نے کن لوگوں کو PLANT کر رکھا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ بحیثیت ملٹری اتاچی کے اس کے فرائض میں شامل ہے کہ اپنے سفارت خانے کو ایسے لوگوں سے پاک رکھے اور یہ میرا اس پر ذاتی احسان ہوگا اگر میں اس معاملے میں اس کی مدد کروں۔ ہوٹل میں پہلی ملاقات کے دوران میں نے کرنل آنند اور اس کے جونیئرز پر ان کے سفارت خانے، DMI اور تینوں افواج کے ہیڈ کوارٹرز میں LEAKAGE اور پاکستانی پے رول پر کام کرنے والوں کا ایسا مدلل ذکر کیا تھا کہ انہیں میری باتوں پر یقین آ گیا۔ ویسے بھی یہ انسانی فطرت ہے کہ کسی راہ چلتے کو آپ اگر یونہی کہہ دیں کہ تمہاری قمیص یا شلوار پھٹی ہوئی ہے تو وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایسا نہیں ہو سکتا، ضرور بالضرور اپنے لباس کو چیک کرے گا۔ میں جانتا تھا کہ میری اس روز کی گفتگو ضائع نہیں اور ان تمام محکموں میں جن کی میں نے ''نشاندہی'' کی تھی یقیناً سراسیمگی پھیل گئی ہوگی اور ان جگہوں پر کام کرنے والا ہر شخص دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہوگا۔ میں نے کرنل آنند کو کہا THIS IS TOO EARLY TO TOUCH THIS SUBJECT (اس موضوع کو اس وقت چھیڑنا بہت قبل از وقت ہے) میں نے ہنستے ہوئے کہا'' کرنل تم ہی پہل کر دو تاکہ میں تمہارے زیر احسان ہو جاؤں۔ (جاری ہے)

غازی

اس ہوٹل میں تمہارے پلانٹڈ PLANTED آدمی کو اگرچہ میں پہچان چکا ہوں اور اس کا برا حشر کرنے والا ہوں لیکن تمہارے منہ سے اس کا نام سن کر مجھے یہ یقین ہو جائے گا کہ تم مجھ سے سچائی اور دیانت داری سے میل ملاقات بڑھا رہے ہو، جو آگے جا کر اعتماد کا وہ مقام بھی حاصل کر سکتی ہے۔ جہاں میں تم کو ایسے سربستہ راز بھی بتا دوں جنہیں سن کر تم انگشت بدنداں ہو جاؤ'' لیکن ہمارا تو کوئی آدمی بھی اس ہوٹل میں نہیں ہے'' کرنل آنند نے جواب دیا'' اتنی معمولی بات کو جسے میں جان بھی چکا ہوں تم اگر مجھ سے چھپانا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی ۔ میں تم سے اس بارے میں مزید بات نہیں کروں گا۔ لیکن تمہیں یہ یقین دلانے کیلئے کہ میں اس آدمی کو پہچان چکا ہوں، اس کے بے جان جسم کا تحفہ تمہیں ضرور بھیجوں گا'' میں نے لاپرواہی برتتے ہوئے کرنل آنند کو جواب دیا۔ کرنل آنند نے '' سربستہ رازوں'' تک پہنچنے کی سیڑھی پر پہلا قدم ہی الٹا پڑتے دیکھا تو فوراً پینترا بدل کر بولا'' بہت ممکن ہے کہ میری لاعلمی میں میجر باسو نے یہ کام کیا ہو۔ مجھے بھگوان کی سوگند ہے میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔ میں اس بارے میں تمام جانکاری حاصل کر کے تمہیں بتاؤں گا۔ کوئی ایسا ویسا قدم نہ اٹھانا کل شام تک تمہیں صحیح حقیقت بتا دوں گا اور اگر میجر باسو نے کوئی آدمی اس کام کیلئے ENGAGE کر رکھا ہے تو اسے فوراً ہٹا دیا جائے گا۔ کرنل آنند میری تحفہ بھیجنے کی دھمکی سے بھی گھبرا گیا تھا۔ اس کی باتوں سے میرا یقین اور پختہ ہو گیا کہ ہوٹل میں ضرور کوئی آدمی PLANT کیا گیا ہے۔ میں نے تو اندھیرے میں تیر چلایا تھا لیکن وہ ٹھیک نشانے پر جا کر لگا۔ کرنل آنند کے جانے کے بعد میں ٹہلتے ٹہلتے ٹیلی فون آپریٹر کے کمرے میں گیا۔ بغیر کسی تمہید کے میں نے اسے پانچ سو روپے دیئے۔ اور کہا کہ مجھے امریکیوں کے ہلاک ہونے والے دن بعد دوپہر کی جانے والی تمام OUT GOING CALLS اور کرنے والوں کی لسٹ چاہئے روپے میں بڑی کشش ہے۔ آپریٹر نے پیسے جیب میں رکھے۔ اور اس روز رات کے بارہ بجے تک کی جانے والی کالوں کی لسٹ جس میں کال کرنے والوں کے کمروں کے نمبر ہوٹل اسٹاف کے نام جنہوں نے اس روز فون کئے تھے اور تمام کالوں کے نمبر درج تھے مجھے دے دی۔ اس کی ڈیوٹی سیکنڈ شفٹ میں بعد دوپہر سے رات 12 بجے تک تھی۔ میں نے اسے یہ لسٹ اگلے روز اس کی ڈیوٹی کے دوران لوٹانے کا وعدہ کیا اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔

بھارتی سفارت خانے کے نمبر میں نے ڈائریکٹری سے نکالے اور لسٹ سے ملانے لگا۔ اس روز بعد دوپہر سے لے کر رات 11 بجے تک بھارتی سفارت خانے کو تین فون کئے گئے تھے اور یہ فون کسی گیسٹ نے نہیں بلکہ ہوٹل کے ایک ملازم نے کئے تھے جو HOUSE KEEPING میں ملازم تھا۔ یہ معلومات مجھے دوسرے روز ملیں۔ اس کی ڈیوٹی سیکنڈ شفٹ کی تھی۔ سیکنڈ شفٹ کے دوران میں نے اس کا پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہ نہیں آیا اور میرے کھٹمنڈو میں قیام کے آخری دن تک وہ نہ تو ڈیوٹی پر آیا اور نہ ہی اپنے واجبات لینے کیلئے اس نے ہوٹل انتظامیہ سے رابطہ کیا کرنل آنند سے اگلی میٹنگ کے دوران میں نے کہا کہ تم نے مجھے تحفہ بھیجنے کی زحمت سے بچا دیا اور اس ہاؤسنگ کیپنگ کے ملازم کی جان بھی بچ گئی۔ تو کرنل آنند نے کھسیانے لہجے میں جواب دیا کہ ہماری اتنی تعریف تو کرو کہ بعض باتوں میں ہم بہت تیز ہیں۔

میں کھٹمنڈو میں رہتے ہوئے بہت تنگ آ چکا تھا۔ پاکستان جانے والی ہر ڈاک میں بلاناغہ میں اپنے محکمے سے درخواست کرتا تھا کہ مجھے واپس آنے کی اجازت دی جائے ۔ لیکن ہر بار مجھے یہی جواب ملتا کہ بہت جلد ہی واپس بلا لیا جائے گا۔ لیکن اس بہت جلد میں دنوں سے ہفتے اور ہفتوں سے مہینے بنتے جا رہے تھے۔ ادھر میری حالت یہ تھی کہ دشمن کا میرے گرد گھیرا روز بروز تنگ ہو رہا تھا۔ میری کیفیت بالکل اس بھیڑیئے کی تھی جو شکاری کتوں کے گھیرے میں آ چکا ہو۔ بھیڑیئے کے خوف سے کتے قریب بھی نہیں آتے۔ اور اس امید میں بھاگنے کی راہ بھی نہیں دیتے تھے کہ بھیڑیا کسی جانب سے ذرا غافل ہو تو وہ یکبارگی اس پر حملہ کر دیں۔ میں جو کبھی جنگ لڑ رہا تھا اور میرا حوصلہ اور قوت مدافعت روز بروز کم ہو رہی تھی صرف مریم تھی جو ان حالات میں مجھے حوصلہ دیتی لیکن اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ مجھے درپیش خطرات سے وہ خود اندر سے ٹوٹ پھوٹ رہی ہے۔ مجھ سے ذہنی وابستگی اور ہم آہنگی اور چاہت کے علاوہ مریم کو میرے بغیر اپنا مستقبل بالکل تاریک دکھائی دیتا تھا۔ صرف ایک چائنیز فیملی کھٹمنڈو میں رہتی تھی جو غیر مسلم تھی۔ مریم کے والد کھٹمنڈو میں آ کر آباد تو ہو گئے تھے لیکن ان کی بیٹی کا مستقبل اندھیرے میں ڈوب چکا تھا۔ 26 برس کی عمر ہونے کے باوجود اس کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی۔ کھٹمنڈو میں صرف ایک نمایاں مسلم خاندان تھا جو کشمیر سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوا تھا۔ وہ خاندان سے باہر شادی نہیں کرتے تھے۔ اس پس منظر میں مریم نے یہ سمجھتے ہوئے کہ زندگی بھر اس کی شادی نہیں ہو سکتی اور والدین کے بعد اسے اکیلے ہی ریسٹورنٹ چلانا اور زندگی کے نشیب و فراز سے گزرنا ہے، اپنی ذات میں خود اعتمادی، جرات اور حوصلہ پیدا کر لیا تھا۔ مجھ سے ملنے کے بعد اسے پھر گھریلو زندگی گزارنے کے آثار نظر آنے لگے اس کی نسوانیت، جسے اس نے سلا دیا تھا، پوری شدت سے جاگ اٹھی تھی، اس کا میرے ساتھ والہانہ پن روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ ذہنی طور پر اس نے مجھے اپنا شوہر تصور کر لیا تھا اور ایک باوقار اور غمخوار بیوی کی طرح وہ میری سلامتی کیلئے مجھ سے زیادہ متفکر رہتی۔ میں بھی ایک پر سکون اور نئی زندگی گزارنے کیلئے بے تاب تھا۔ اسی لئے جب میری محکمانہ ڈاک میں ہر بار بہت جلد کی '' خوشخبری'' ملتی تو میں بھنا اٹھتا۔

دن یونہی بے کیفی کے عالم میں گزرتے جا رہے تھے۔ اس دوران مجھ سے ملنے کیلئے مہاجروں کے نمائندے کئی بار آئے اپنی روزمرہ کی پریشانیوں کے علاوہ ایک بار دبی زبان میں انہوں نے مجھے بتایا کہ جو مہاجر افغانی ایئر کے جہازوں سے عنقریب پاکستان پرواز کرنے والے ہیں وہ بیک وقت خوشی اور پریشانی کی حالت سے دوچار ہیں۔ انہیں پاکستان جانے کی خوشی کے ساتھ ساتھ یہ پریشانی بھی ہے کہ پاکستان پہنچتے ہی انہیں رہائش اور روزمرہ کی ضروریات کیلئے روپیہ درکار ہوگا۔ جو ان کے پاس نہیں ہے۔ یہاں کھٹمنڈو میں تو دو وقت کی روٹی کی فراہمی کیلئے وہ اسٹریٹ ہاکر بن کر اور مختلف جگہوں پر اشیاء بیچ کر جیسے تیسے زندگی گزار رہے ہیں۔ دکاندار انہیں ادھار پر فروختگی کیلئے سامان بھی دے دیتے ہیں لیکن پاکستان پہنچنے پر انہیں آگے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ مفادات خانہ بھی اس مسئلے پر بالکل خاموش ہے اور کسی قسم کی یقین دہانی کرا رہا۔ مہاجرین کے اس مسئلے کو میں نے بہت پہلے محسوس کر لیا تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ ہر پرواز پر روانگی سے پہلے ہر مہاجر کنبے کو دینے کیلئے میں نے تین ہزار پاکستانی روپوؤں کے لفافے تیار رکھے ہیں یہ رقم گو کہ ان کی ضروریات کے مقابلے میں بہت کم ہے لیکن انہیں فوری پریشانی سے بچا سکتی ہے۔ میرے اس انتظام سے مہاجر نمائندے بہت خوش ہوئے۔ میں نے انہیں یہ بھی کہا کہ وہ پاکستان جانے والے سارے مہاجروں کو یہ بتا دیں اور یہ بھی کہیں کہ پاکستانی حکومت اور عوام بھی ان کے بے سروسامانی سے غافل نہیں اور وطن پہنچنے پر انہیں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ انہی دنوں معلوم ہوا کہ پاکستانی مہاجروں کے ایک گروپ نے سفارت خانے کے باہر مظاہر کیا ہے۔ یہ وہ مہاجر تھے جو بیر گنج سے لے کر کھٹمنڈو کے نواحی قصبات اور دیگر شہروں میں مقیم تھے۔ سفارت خانے نے صرف اپنے نوٹس بورڈ پر فلائٹ شیڈول اور ان پروازوں پر جانے والے مہاجروں کی لسٹ لگائی تھی اور یہ احکامات بھی تھے کہ اگر ایک مقررہ تاریخ تک لسٹ میں درج مہاجروں نے سفارت خانے میں رپورٹ کر کے FINAL COFIRMATION نہ کرائی تو ان کی جگہ دوسرے مہاجروں کو ان پروازوں پر بھیج دیا جائے گا۔ میں سمجھتا تھا کہ اس میں نہ تو سفارت خانے کا کوئی قصور تھا اور نہ مہاجروں کا۔

(جاری ہے)

غازی

ان پروازوں پر ہی ہاف لوڈ اور جہاز کی PASSENGER CAPICITY سے آدھے مہاجر لے کر جاتی تھیں۔ ان کی محدود نشستوں کو بھی خالی تو نہیں بھیجا جا سکتا تھا۔ سفارت خانے میں ان مہاجروں نے اپنے رابطے کیلئے کوئی ایڈریس بھی نہیں چھوڑا تھا۔ جس پر سفارت خانہ انہیں بذریعہ ڈاک ہی مطلع کر سکتا۔ مہاجر اپنی جگہ سچے تھے کہ وہ ایسے قصبوں میں اور ایسی غیر نمایاں جگہوں پر رہتے تھے جہاں ڈاک کا ملنا ناممکن تھا۔ کھٹمنڈو جیسے مرکزی شہر اور دارالحکومت میں ڈاک کا اتنا ناقص نظام تھا کہ ڈاک لینے کیلئے ڈاک خانے جانا پڑتا تھا اور میزوں پر بکھرے ہزاروں خطوط میں سے اپنے خط تلاش کرنے آتے تھے۔ مہاجرین کے مظاہرے کی بات سن کر میں خاموش رہا کیونکہ خاموش رہنے کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا۔ کھٹمنڈو میں مجھے میرے محکمے نے ایک نہایت محدود ٹارگٹ دیا تھا میں اگر صرف اسی حد تک محدود رہتا تو میرا کام صرف رپورٹس بھیجنے اور سفارت خانے کو اطلاع دینا تھا۔ یہ تو کھٹمنڈو میں مہاجروں کی بے بسی اور بھارتی سازشوں کے بچھے ہوئے ان گنت جال دیکھ کر میں اس جھنجھٹ میں کود پڑا تھا۔ مہاجروں کو تو میں نے ان جالوں سے نکال لیا لیکن خود ان میں پھنس گیا۔ سفارت خانہ الگ میرا مخالف ہو رہا تھا کسی طرف سے مجھے بھی کوئی مدد یا کمک ملنے کی توقع نہیں تھی۔ چینی دوست بے شک میری حفاظت کیلئے موجود تھے۔ میرے کہنے پر وہ بڑے سے بڑا جوکھم کام کرنے کو تیار تھے۔ لیکن بھارتی سازشوں کو سمجھنا، ان سے نبٹنا اور ان کا توڑ کرنا میرے چینی دوستوں کے بس کی بات نہ تھی۔ یہ سارا بوجھ مجھے اکیلے ہی اٹھانا تھا۔

انہی دنوں ایک شام جب میں ہوٹل کی لابی میں مہاجر نمائندوں سے بات چیت کر رہا تھا کیپٹن مان خلاف توقع اکیلا آ کر کافی شاپ میں چلا گیا اور ویٹر کے ہاتھ ایک چٹ مجھے بھیجی جس پر لکھا تھا کہ فوری اہمیت کے معاملے پر آپ سے ملنے آیا ہوں۔ مہاجروں سے معذرت کر کے میں اس کے پاس گیا تو بڑے گھبرائے ہوئے لہجے میں وہ بغیر کسی تمہید کے بولا ''آپ کی وین میں بم نصب کیا گیا ہے جو گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی پھٹ جائے گا۔ مجھے جونہی معلوم ہوا میں آپ کو بتانے کیلئے بھاگا آیا۔ میں نے آرٹلری اور اسلحہ ڈمپ کرنے کے علاوہ بم ڈسپوزل کرنے کی ٹریننگ بھی لی ہوئی ہے اگر آپ چاہیں تو میں بم نکال کر اسے DEFUSE کر سکتا ہوں''۔ میں حیران تھا کہ میرے دشمنوں میں سے ایک یہ بھارتی سفارت کار ایکا ایکی میرا اتنا ہمدرد بن گیا کہ میری جان بچانے کیلئے اپنے ملک سے غداری پر بھی آمادہ ہو گیا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ چلو اور نکالو وہ میرے ساتھ وین کی طرف آیا اور مجھے قدرے فاصلے پر کھڑا ہونے کا کہہ کر وین کے نیچے چلا گیا اور پانچ چھ منٹ EXPLOSIVE STICKS (بارودی سلاخوں) کا بنا ہوا بم اور اس کے ساتھ لگی تاروں کو لے کر باہر آ گیا۔ چھوٹا کٹر وہ اپنے ہمراہ لایا تھا اس نے تاروں کو بم سے علیحدہ کیا اور بولا ''اب یہ محفوظ ہے'' بم کو چھپانے کیلئے اس نے مجھ سے کپڑا مانگا اور فوراً ہی بولا ''اب تو یہ بے ضرر ہو چکا ہے میں اسے کوٹ کی جیب میں ڈال لیتا ہوں۔ مجھے یہاں سے فوری جانا ہے تاکہ کوئی مجھے دیکھ نہ لے'' اس نے بم جیب میں ڈالا اتنی دیر میں، میں نے تاریں اٹھائیں اور ان کا گچھا بنا لیا۔ کیپٹن مان نے مجھ سے تاریں مانگیں تو میں نے کہا ''تم ان کا کیا کرو گے انہیں میرے پاس رہنے دو'' تاریں میں نے اپنی جیب میں ڈال لیں اور کیپٹن مان کا شکریہ ادا کیا۔ مان گھبرایا ہوا تھا وہ تیزی سے پارکنگ سے باہر چلا گیا اور میں خیالوں کے ہجوم میں کھڑا لابی میں واپس آ گیا۔ مہاجر نمائندوں کو میں نے جلد ہی رخصت کیا اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میری وین میں بم کس نے لگایا ہے میرے ظاہری دشمنوں میں بھارت سفارت خانہ اور ان کے حواری تھے اگر یہ کام ان کا تھا تو کیپٹن مان کو کیا ضرورت تھی کہ مجھے بچانے کیلئے آگے آتا۔ اگر یہ کسی دوسرے کی کارروائی تھی تو کیپٹن مان کو اس کی اطلاع کیسے ملی اس کا اپنے ہمراہ کٹر لانا بھی اس بات کی دلیل تھی کہ اسے سو فیصد یقین تھا کہ بم وین میں لگا ہوا ہے۔ اگر بم کی نوعیت اور ساخت کا اسے علم نہیں تھا تو یہ ٹائم بم بھی ہو سکتا تھا جسے DEFUSE کرنے کیلئے پیچ کس کے علاوہ کئی ٹولز TOOLS کی ضرورت تھی۔ اس نے کافی شاپ میں یقینی طور پر کیسے کہا تھا کہ وین اسٹارٹ کرتے ہی بم پھٹ جائے گا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ بم پلانٹ کا واقعہ سازش در سازش ہے۔ میں نے تاروں کا گچھا نکالا۔ ڈبل تاریں دونوں طرف سے کٹی ہوئی تھیں بم کے ساتھ لگی تاریں تو کیپٹن مان نے میرے سامنے کاٹی تھیں لیکن وین کی کرنٹ والی تاروں کے ساتھ لگی۔ بم کی تاریں بھی کٹی ہوئی تھیں اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ وین کی تاروں کے ساتھ بم کی تاروں کا کچھ حصہ ضرور لگا ہونا چاہئے۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں نے تاریں چیک کرنا اگلی صبح تک ملتوی کر دیا اور مریم کو فون پر کہا کہ آج وہ ہوٹل آ جائے کیونکہ وین کے انجن میں کچھ خرابی ہے میں نے اس سے یہ بات اس لئے چھپائی کیونکہ میں اسے مزید سراسیمہ کرنا نہیں چاہتا تھا

اگلی صبح میں وین کو ایک سروس اسٹیشن پر لے گیا۔ وین سروس بھی کرائی اور لفٹ پر چڑھی وین کا اچھی طرح جائزہ بھی لیا۔ وین کا نچلا حصہ لوہے کی ایک بڑی چادر نے ڈھانپ رکھا تھا اور سوائے ریڈی ایٹر کے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا نہ ہی کوئی تار دکھائی دی۔ سروس کے دوران ہی میں نے انجن کا بھی اچھی طرح جائزہ لیا کوئی ایسی تار دکھائی نہ دی جس سے بم والی تاروں کا کوئی ٹکڑا منسلک ہو۔ ساری گیم مجھے سمجھ میں آ گئی۔ کیپٹن مان بارودی سلاخیں نہیں بلکہ ان کی ڈمی ہمراہ لایا تھا جسے اس نے اسی طرح کوٹ کے جیب میں چھپایا ہوا تھا جسے واپسی پر لے گیا۔ وین کے نیچے گھس کر اس نے ڈمی نکالی اور باہر نکل کر مجھے دکھائی اور کوٹ کی جیب میں ڈال کر رفو چکر ہو گیا۔ یہ مجھے ہراساں کرنے کی ایک ناکام اور کمزور کوشش تھی۔ میں نے اسی وقت یہ فیصلہ کر لیا کہ انہیں سبق سکھانے کیلئے ان کی گاڑی میں اصلی دھماکہ کروں گا۔

اس واقعے کے تیسرے دن ہی کرنل آنند اور کیپٹن مان میرے پاس آئے۔ گو کہ کیپٹن مان نے مجھے بم کی بات صرف اپنے تک رکھنے کا کہا تھا لیکن کرنل آنند نے کافی شاپ میں بیٹھتے ہی کہا ''آصف دیکھو تمہاری جان بچانے کیلئے میں نے اپنی ملازمت اور اپنے مستقبل کو داؤ پر لگا دیا۔ تم یقین نہیں کرو گے کہ جب ہم سفارت خانے کے غیر پنجابی لوگوں سے بات کرتے ہیں تو فخریہ تمہارا ذکر کرتے ہیں کہ کیا ہوا جو آصف پاکستانی ہے لیکن اس نے اپنے جراتمندانہ کارناموں سے پنجابیوں کا نام روشن کر دیا ہے۔ پنجابی چاہے بارڈر کے دوسری جانب کا ہو یا ہماری طرف کا، جب کوئی کارنامہ انجام دیتا ہے تو ہمارا سر فخر سے اونچا ہو جاتا ہے'' کرنل آنند نے اب باقاعدہ میری برین واشنگ شروع کر دی تھی۔ گزشتہ ملاقاتوں کے دوران میں زیادہ تر خاموش رہا اور اس کی باتیں سنتا رہتا تھا میری خاموشی سے اس نے یقیناً یہ نتیجہ اخذ کیا ہوگا کہ اس کی گفتگو مجھ پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ بم کے ڈرامے کے بعد یہ اس کا اگلا قدم تھا کہ مجھ سے اپنی ہمدردی کی وجہ ''پنجابی'' ہونے کو بنائے، اور اسی طرح غیر محسوس طور پر میرے ذہن اور خیالات کو بدلے۔ ادھر میرے ذہن میں کبھی پاکستان سے ہٹ کر صوبائی یا لسانی بنیادوں پر سوچ کا سایہ تک نہ پڑا تھا۔ میری نگاہ میں پاکستان کی سرحدوں کے اندر کوئی اور لکیر نہیں تھی۔ ایک آنند تو کیا ہزاروں آنند بھی آ جاتے اور میری برین واشنگ کرتے تو ان کی ساری کوشش مجھ پر سے اثر کئے بغیر یوں گزر جاتی جیسے بارش میں برساتی پر سے بارش کی بوندیں گزر جاتی ہیں۔ میں کرنل آنند اور کیپٹن مان کی ہاں میں ہاں ملاتا چلا گیا تاکہ وہ پورے طور پر کھل کر میرے سامنے آ جائیں۔

یونہی دن گزرتے جا رہے تھے کہ افغان ایئر کا جہاز پہلی پرواز کیلئے آ گیا۔ مریم اور میں جہاز پہنچنے سے پہلے ہی ہوائی اڈے پر پہنچ گئے تھے۔ ہوائی اڈے پر عجب گہما گہمی تھی۔ جانے والے مہاجروں کے چہروں سے خوشی اور مسرت پھوٹ رہی تھی۔ (جاری ہے)

غازی

انہیں رخصت کرنے والے اپنی حسرت ویاس کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ ہم امیگریشن کے ساتھ ہی کھڑے کلیئرنس ملتے ہی انہیں خیریت سے پاکستان پہنچنے کی دعاؤں کے ساتھ روپوں کا لفافہ تھماتے جاتے۔ سفارتخانے کا نچلے درجے کا ایک ملازم بھی وہاں موجود تھا اور بڑی بیزاری سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ افغان ایئر ان دنوں دنیا کی گھٹیا ترین ایئر لائنز میں شمار ہوتی تھی۔ ان پروازوں کیلئے UNO نے معقول معاوضے پر ان کے جہاز چارٹر کئے تھے۔ اس کے باوجود ان کے عملے کی فرعونیت عروج پر تھی۔ مہاجروں کے سامان کو وہ اس بے دردی سے اٹھا کر پھینکتے اور لے جانے سے انکار کر رہے تھے جیسے یہ پروازیں وہ مفت میں چلا رہے ہوں۔ دوسری طرف مہاجروں نے بھی انتہا کر دی تھی۔ گھر کی جھاڑو تک وہ ساتھ لے جا رہے تھے۔ سامان انہوں نے اس طرح باندھا ہوا تھا جیسے جہاز پر نہیں کسی بیل گاڑی پر سفر کرنے والے ہوں۔ کسی دل جلے مہاجر نے جس کا نام شاید ان پروازوں میں شامل نہیں تھا، ایک کاغذ پر جلی حروف میں ''خوش رہو اہل وطن ہم تو SUFFER کرتے ہیں'' لکھ کر جہاز پر چسپاں کر دیا تھا۔ ان دنوں ہوائی اڈوں پر سیکورٹی کا نظام برائے نام ہی تھا۔ الوداع کہنے والے جہاز کے بہت قریب بلا روک ٹوک چلے جاتے تھے۔ جہاز کا عملہ محض زیادہ پروازوں کے بہانے UNO سے روپیہ بٹورنے کیلئے آدھی خالی سیٹوں کے ساتھ پرواز کرتا تھا جبکہ دوسری ایئر لائنز والے فل لوڈ کے ساتھ اڑتے تھے۔ شروع میں ہفتے میں اور بعد میں تین پروازیں شروع ہو گئیں۔ یہ سن 75ء کے اپریل کا مہینہ تھا۔ ایک طرف مہاجروں کی پاکستان روانگی شروع ہو چکی تھی۔ دوسری طرف ہر روز پانچ، دس نئے مہاجر کھٹمنڈو پہنچ رہے تھے۔ بنگلہ دیش سے نکلنے کے بعد کم وبیش تین سال کا عرصہ نامعلوم انہوں نے بھارت میں کیسے گزارا ہوگا اور یہ کیسے ممکن ہوا کہ اس تمام عرصے میں بھارتی جاسوسی ایجنسیوں اور پولیس سے ان کا کبھی پالا نہ پڑا اور کھٹمنڈو آتے ہوئے اسٹیمر پر چڑھتے ہوئے بھی CBI والوں کی نظر سے وہ بچ گئے۔ اتنے اتفاقات کسی ایک کے ساتھ پیش آنا تو ممکن ہو سکتے ہیں لیکن سب ہی کے ساتھ نہیں۔ ہر نئے مہاجر کی آمد پر شکوک و شبہات میں مزید اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ پروازیں جاری تھیں کہ مجھے پاکستان سے آنے والی سرکاری ڈاک میں ایک ہدایت نامہ اور ایک شخص کی دو تصاویر ملیں۔ ہدایت نامے میں لکھا تھا کہ یہ شخص بہاری اور DMI کا تجربہ کار جاسوس ہے۔ اس نے جسمانی طور پر مسلمان دکھائی دینے کے تقاضے بھی پورے کر رکھے ہیں۔ دو خاصی خوبصورت اور پڑھی لکھی عورتیں جو تربیت یافتہ بہاری جاسوسہ ہیں، اس کے ہمراہ بحیثیت بیوی اور بیٹی کے ہم سفر ہوں گی۔ تمہارے متعلق تمام تفصیلات ان کو DMI نے مہیا کر دی ہیں۔ تمہیں دیکھتے ہی یہ تمہیں پہچان جائیں گے۔ بہاری جاسوس حلیہ بدلنے کا ماہر ہے اور کبھی کلین شیو، کبھی نقلی داڑھی لگا کر، کبھی پاجامہ قمیص اور کبھی تھری پیس سوٹ پہن کر نیا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ اس کی شکل وصورت نہ بالکل بہاری ہے اور نہ بنگالی اور نہ یہ پورا پنجابی یا پٹھان لگتا ہے۔ یہ تینوں عنقریب کھٹمنڈو پہنچنے والے ہیں۔ ہدایت نامے کے آخر میں لکھا تھا "Give them a good treat"۔ ہمیشہ کی طرح میری واپسی کو بہت جلد کہہ کر مجھے ٹرخا دیا تھا۔ ''بہت جلد'' پڑھ کر مجھے اتنا غصہ آیا کہ ایک بار تو یہ سوچ بھی آئی کہ اب میں انہیں ٹرخانہ شروع کر دوں لیکن اس سوچ کو اس خیال نے فوراً ہی ختم کر دیا کہ میں افراد کے مفاد کیلئے نہیں بلکہ وطن کی محبت اور آبرو کیلئے آگ کے سمندر میں کودا تھا۔ خدا وطن کو قائم و دائم سلامت اور تابندہ رکھے، حکومتیں اور اچھے برے افراد تو آنی جانی چیزیں ہیں۔ ممکن ہے کھٹمنڈو میں مجھے مزید رکھنے کا فیصلہ کرنے والا کوئی ایسا شخص ہو جو میرے جسم سے خون کا آخری قطرہ تک نکالنا چاہتا ہو۔ وہ شخص چاہے میرے لئے کتنا ہی بے رحم کیوں نہ ہو لیکن اس کا یہ عمل بھی وطن کی محبت میں ہی ہے کیونکہ اسے مجھ سے کوئی ذاتی دشمنی تو ہے نہیں۔ میں نے بھی بھارت اور کھٹمنڈو میں خون کی جو ہولی کھیلی تھی وہ کسی سے ذاتی دشمنی کیلئے نہیں بلکہ وطن دشمنوں کے ساتھ کھیلی تھی۔ اپنے وطن کی محبت میں انسانی سوچ میں اگر ذرا سا بھی ذاتی مفاد شامل ہو جائے تو وہ وطن پرستی کو غداری میں بدل دیتا ہے۔ وطن پرستوں کو اس وادی میں بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ میں نے مریم کو اس آنے والی نئی مثلث مصیبت کے بارے میں بتایا۔ چونکہ اس میں دو عورتیں بھی شامل تھیں۔ اس لئے مریم نے مجھ سے وعدہ لیا کہ اسے بھی کسی حد تک ان سے نمٹنے میں حصہ لینے دوں گا۔ میں نے یہ وعدہ محض اس حد تک کیا تھا کہ وہ کبھی کبھار ان سے الجھنے میں میرے ہمراہ رہے گی۔ ورنہ میں بخوبی جانتا تھا کہ DMI کا جو کارکن اس حد تک Commited ہو کہ اپنے دھرم کے خلاف مسلمان دکھائی دینے کیلئے جسمانی تبدیلی بھی مان جائے اور تجربہ کار اتنا ہو کہ ہر بہروپ دھار لے۔ اس کا جوشیلی لیکن سیدھی سادی مریم بھلا کیا مقابلہ کر سکے گی۔ غرضیکہ میں نے ان تینوں کے ''استقبال اور Good Treat'' کیلئے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا۔ میں نے محسن اور نئے شادی شدہ لڑکوں کی ڈیوٹی لگا دی کہ ہر نئے آنے والے مہاجر کے متعلق مجھے مکمل معلومات دیں۔ ادھر سفارت خانے میں سفیر صاحب کے ذریعے میں نے گزشتہ دو ماہ میں رجسٹر ہونے والے نئے مہاجروں کی مکمل لسٹ دوبارہ لے لی۔ یہ عین ممکن تھا کہ وہ جاسوس پہلے ہی کھٹمنڈو پہنچ چکے ہوں اور بحیثیت ایک کنبے کے یا علیحدہ علیحدہ طور پر رجسٹریشن بھی کروا چکے ہوں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ بھارتیوں کی حیثیت سے کھٹمنڈو آ چکے ہوں اور کسی مناسب موقعے کی تلاش میں ہوں کہ پاکستانی سفارت خانے میں رجسٹریشن کروا کر اور مٹھی گرم کر کے انہی پروازوں پر پاکستان چلے جائیں۔ ان کی منزل بہر طور پاکستان تھی اور کھٹمنڈو میں ان کا مہاجر بن کر قیام کرنا ان کے مفاد میں نہ تھا۔

میں نے پاکستان سے آنے والے ہدایت نامے کو کئی بار پڑھا اتنی مفصل ہدایات اور تینوں جاسوسوں کی تفصیلات اور تصاویر بھیجنے کا مطلب تھا کہ میرے محکمے کا رابطہ DMI کے کسی ایسے اہم رکن سے ہو چکا تھا جس نے انہیں اس قدر مفصل تفصیلات مہیا کی تھیں دوسری بات جو میرے ذہن میں کھٹک رہی تھی کہ نارمل پروسیجر کے مطابق یہ معلومات بھارت سے پاکستان پہنچی۔ اس کے Analysis (تجزیہ) ہونے اور پھر انہیں مجھ تک پہنچنے میں کم وبیش ایک ماہ لگا ہوگا دونوں تصویریں بھی اسٹوڈیو کی بنی ہوئی نہیں بلکہ چلتے پھرتے کھینچی گئی تھیں۔ ان تمام باتوں سے میں اس نتیجے میں پہنچا کہ بھارت میں ہمارے کسی گروپ کو یہ معلومات دینے والے کو خود اس کا علم ڈیڑھ ماہ قبل ہوا ہوگا۔ پاکستان جانے والی پروازیں چونکہ شروع ہو چکی تھیں اور ان تینوں جاسوسوں نے پروازوں کے اسی شیڈیول (Schedule) میں پاکستان جانا تھا۔ سفارت خانے کی فائنل لسٹ تیار ہو کر نوٹس بورڈ پر لگ چکی تھی اس لئے ان کے نام اس لسٹ میں ہونا چاہئیں۔ میں نے لسٹ کو کئی بار پڑھا لیکن کوئی مہاجر فیملی ایسی دکھائی نہ دی جو ایک مرد اور دو خواتین پر مشتمل ہو۔ میں صرف مفروضوں پر کام کر رہا تھا۔ لیکن اکثر مفروضے ہی حقیقت ثابت ہوتے ہیں۔ یہ تو مجھے یقین تھا کہ یہ لوگ کھٹمنڈو پہنچ چکے ہیں اور ان پروازوں پر انہیں جانا بھی ہے ان دو باتوں کو Base بنا کر میں نے امکانات پر سوچنا شروع کیا تو دو باتیں سامنے آئیں اول یہ کہ سفارت خانے کی فائنل لسٹ میں کھٹمنڈو کے گرد ونواح کے رہنے والے کئی مہاجر کنبے لیٹ ہونے کی وجہ سے شامل ہونے سے رہ گئے تھے اور ان کی جگہ پر دوسرے مہاجروں کو بھیجنے کے صوابدیدی اختیارات ہمارے سفارت خانے کو اور اسے مزید Shrink اور Definite کرتے ہوئے سفارت خانے کے کسی ایک شخص کے پاس تھے۔ لیکن وہ شخص بھی صرف رجسٹرڈ مہاجروں کو ہی بھیج سکتا تھا۔

(جاری ہے)

غازی

گزشتہ دو ماہ میں رجسٹر ہونے والے مہاجروں کی لسٹ کو بھی میں نے کئی بار پڑھا لیکن کوئی سراغ ہاتھ نہ لگا۔ اس عقدے کو حل کرنے میں کسی حد تک میرا ذاتی مفاد بھی تھا اپنے محکمے کی طرف سے کھٹمنڈو میں مجھے پہلی بار ایک خاص مشن سونپا گیا تھا ورنہ ہمیشہ عام ہدایت ہی ملتی تھی۔ میں نے کھٹمنڈو میں پاکستان کے مفاد میں اب تک جو کچھ بھی کیا تھا یہاں کے حالات کو دیکھتے ہوئے اپنی صوابدید پر ہی کیا تھا اگر میں اس مشن کو کامیابی سے مکمل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو پھر پاکستان واپسی کیلئے میں اپنے محکمے کو زیادہ زور دے سکتا تھا۔

محسن اور لڑکے کھٹمنڈو بھر میں پھیل گئے تھے لیکن انہیں بھی ناکامی ہوئی۔ ہر روز شام کو محسن مجھے آ کر رپورٹ دیتا۔ انہوں نے سارے کھٹمنڈو کو کھنگال ڈالا تھا۔ راجہ بازار کے علاوہ ڈھول کھولا، ہنومان ڈھوکا اور کشمیری مسجد کے گرد و نواح کے تمام رہائشی علاقوں میں ان کو تلاش کیا۔ دیوی کی حویلی اور کاٹھ کے مندر کے پیچھے کی گلیوں میں بھی رہنے والوں کے کوائف لئے لیکن ہر جگہ انہیں ناکامی ہوئی۔ (ابھی ان کا آغاز تھا اور ہفتے میں صرف دو فلائٹس تھیں) دن کا بیشتر وقت اسی گتھی کو سلجھانے میں گزار دیتا۔ شام کو کرنل آنند اور کیپٹن مان کی برین واشنگ سے فیضیاب ہوتا ان کے جانے کے بعد محسن کی ناکامی کی رپورٹس سنتا اور پھر مریم کے گھر چلا جاتا اور دن بھر کی پریشانی اور دماغی بوجھ کو اس سے باتیں کر کے دور کرتا۔ مریم نے ریسٹورنٹ کے کاؤنٹر پر بیٹھنے کے لئے ایک پڑھے لکھے نیپالی کا انتظام کر لیا تھا اور خود وہ دن بھر اردو سیکھنے اور پاکستانی رسم و رواج اور معاشرے میں خود کو ڈھالنے کی کوشش میں مصروف رہتی۔ اس کی اردو دانی میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ ہر شام وہ مجھے اردو کے نئے سیکھے ہوئے فقرے سناتی۔ مجھے ملتے وقت السلام علیکم کہتی کئی بار اس نے دایاں ہاتھ ماتھے کی طرف لے جاتے ہوئے سلام بھی کیا۔ انہی دنوں ایک شام جب میں اس کے گھر گیا تو اس نے ہاتھ ماتھے تک لے جاتے ہوئے مجھے آداب کیا اور اٹک اٹک کر بولی ”قدم رنجہ فرمائیے“ میں نے اسے اتنی جلد اردو سیکھنے پر داد دی اور کہا کہ اگر تمہارے شوق کا یہی عالم رہا تو پاکستان جا کر تم خود کو اجنبی ہرگز محسوس نہیں کرو گی۔ مریم کے ساتھ میں باتیں تو کر رہا تھا لیکن میرے دماغ کے ایک گوشے میں یہ سوال کلبلانے لگا کہ بہاری مہاجر تو ایسی سلیس اور لکھنؤ کی انداز کی اردو نہیں بولتے ان کی اردو کا ایک اپنا ہی انداز ہوتا ہے اور گزشتہ اٹھائیس سالوں میں انہوں نے 24 سال مشرقی پاکستان میں بنگالیوں کے ساتھ گزارے ہیں اور اسی وجہ سے ان کی اردو پر بنگالی رنگ بھی چھا چکا ہے۔ پھر مریم کسی بہاری خاتون سے اتنی سلیس اردو کیسے سیکھ رہی ہے۔ میں نے مریم سے پوچھا کہ اس کی ٹیوٹر کی عمر کیا ہے اس نے بتایا کہ اکیس بائیس سال ہو گی میں حیران تھا کہ جو لڑکی مشرقی پاکستان میں پیدا ہوئی اور جس کے گھر میں بھی بہاری اور بنگالی ملی جلی اردو بولی جاتی ہوئی وہ کیسے اتنی صحیح اردو بول سکتی ہے میں نے مریم سے پوچھا کہ اس کا رنگ اور قد کاٹھ کیسا ہے؟ میرے اس سوال پر مریم نے کچھ اور ہی سمجھا اور مجھ سے سوال کرنے لگی کہ تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو تمہیں اس لڑکی سے کیا دلچسپی ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے سمجھایا کہ میری اس لڑکی سے جسے میں نے دیکھا تک نہیں، کوئی بھی ذاتی دلچسپی نہیں صرف ایک شک سا ہے جسے میں دور کرنا چاہتا ہوں میری طرف سے پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد مریم نے بتایا کہ اس کا رنگ صاف اور قد نارمل ہے۔ ”نارمل سے تمہاری مراد یہاں کی بہادی خواتین جیسا“ میں نے پوچھا ”نہیں ان سے تو وہ خاصی لمبی ہے“ مریم نے جواب دیا۔ ”پندرہ بیس روز پہلے ہی میں نے اس سے ٹیوشن لینا شروع کی ہے۔ وہ خود ہمارے ریسٹورنٹ میں ملازمت تلاش کرنے آئی تھی۔ انگریزی بھی وہ بہت اچھی بولتی ہے۔ بڑے دکھ جھیل کر وہ اپنی ماں کے ساتھ یہاں گزشتہ ماہ ہی پہنچی ہے۔ اس کی ماں بھی دو بار اس کے ہمراہ ہمارے گھر آئی ہے وہ بھی قد آور اور صاف رنگ کی ہے۔ یہ دونوں ماں بیٹی بہت ہی اچھی ہیں۔ ماں بھی بہت عمدہ انگریزی اور اردو بولتی ہے لیکن تم تفصیلات کیوں جاننا چاہتے ہو؟“ مریم کے دل میں شکوک نے پھر سر ابھارا۔ میں نے مریم کو سمجھایا کہ ایک محکمانہ گتھی کو میں کئی روز سے سلجھانے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن کوئی سرا ہاتھ آتا ہی نہیں۔ ممکن ہے یہ محض میرا وہم ہو لیکن کل صبح تمہاری ٹیوشن کے دوران آؤں گا اور سیدھا اسی کمرے میں گھس آؤں گا جہاں تم ٹیوشن پڑھتی ہو تم اس سے میرا تعارف اپنے منگیتر کے طور پر کروانا۔ اس سے تمہاری بھی تسلی ہو جائے گی کہ میرے ارادے نیک ہیں میں اس سے بے ضرر سے چند سوال کروں گا۔ اس دوران تم بالکل خاموش رہنا تم اپنا ٹیپ ریکارڈ اسی کمرے میں چھپا کر رکھنا اور اس کا مائیک ایسی جگہ پر اوٹ میں رکھنا کہ اسے معلوم نہ ہو میرے آتے ہی تم ٹیپ چلا دینا“ لیکن وہ تو پورا برقعہ پہنتی ہے اور پردہ کرتی ہے۔ تمہارے سامنے وہ کیسے آئے گی۔“ مریم نے پوچھا۔ ”دیکھو مریم جیسے کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ ممکن ہے یہ محض میرا وہم ہو لیکن دوسری صورت میں یہ ایک بہت تجربہ کار بھارتی جاسوسی کے گینگ کی اہم رکن بھی ہو سکتی ہے۔ مجھے اس گینگ کی اطلاع کئی روز پہلے ہی پاکستان سے موصول ہو چکی ہے۔ محسن اور اس کے ساتھ اس گینگ کی تلاش میں ہر روز صبح سے شام تک سارے کھٹمنڈو کی بے سود خاک چھان رہے ہیں اور میرا دماغ ان کے متعلق سوچتے سوچتے پک چکا ہے اگر یہ محض میرا شک ثابت ہوا تو میں تمہارے سامنے اس لڑکی سے اس کی بے پردگی کیلئے معافی مانگ لوں گا اور اگر وہ میرے شک کے مطابق جاسوسہ نکلی تو پھر بے پردگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ وہ مسلمان نہیں بلکہ ہندو ہے۔ میری دوسری بات بھی غور سے سنو آئندہ نہ تو اس کے ہاتھ سے کوئی چیز لینا اور نہ ہی اس کی لائی ہوئی کوئی چیز بھی کھانا یا پینا اور چاہے کچھ بھی ہو جائے اس کے ہمراہ کبھی بھی گھر سے باہر نہ جانا۔“ میں نے مریم کو اسی سلسلے میں کچھ مزید ہدایات بھی دیں۔ جب میں نے مریم کو بتایا کہ میرے خیال میں یہ لڑکی جاسوسی کی تکون کا ایک خط ہے جس کے متعلق میں نے اسے کچھ دن پہلے ہی بتایا تھا اور اس نے خود اس میں حصہ لینے کا مجھ سے وعدہ کیا تھا تو مریم فوری ہی ریڈ الرٹ ہو گئی۔ مریم کے گھر سے واپسی پر میں سوچ رہا تھا کہ اگر یہ واقعی جاسوسہ ثابت ہوئی تو چراغ تلے اندھیرا کے مصداق یہ تو مریم یعنی میری منگیتر کے گھر تک پہنچ چکی تھی جبکہ ہم کھٹمنڈو میں ایک ایک دروازہ کھٹکھٹا کر اور ہر پتھر اٹھا کر اسے تلاش کر رہے تھے۔

رات کو سونے سے پہلے میں نے اگلے روز ٹیوٹر لڑکی سے ملنے کے پروگرام کو آخری شکل دیدی۔ چونکہ یہاں پر معاملہ ایک لڑکی کا تھا اور محض اپنے شک کی بنا پر میں نے اس کی اصلیت جاننے کیلئے پوچھ گچھ کرنی تھی اس سے دوبارہ ملنا مشکل دکھائی دیتا تھا۔ کیونکہ وہ دونوں صورتوں میں میری تفتیش کے نتیجے میں مریم کو ٹیوشن دینا بند کر دیتی تھی۔ اس لئے میں نے RAPID AND SEVERE (تیز اور شدید) ایکشن لینے کا فیصلہ کیا۔ اس ایکشن کے دوران اگر وہ اصلیت اگل دیتی تو ٹھیک ورنہ مجھے دوسرا موقع ملنا اگر نا ممکن نہیں تو دشوار ضرور تھا۔ اگلی میں میں اپنے چینی ساتھیوں کے ہمراہ پہلے بازار گیا اور تھری زیرو کی بال کاٹنے کی مشین، ایک بڑی تیز قینچی، ایک داڑھی بنانے کا استرا اور درمیانی سائز کی دو خالی شیشیاں خریدیں جن میں سادہ پانی بھر لیا۔ ایک وسل (سیٹی) بھی خرید لی۔ اپنے پلان کے مطابق پوری تیاری اور ساز و سامان کے ساتھ ہم مریم کے گھر کی طرف روانہ ہوئے میں نے چینی دوستوں کو سمجھا دیا کہ وہ گھر کے باہر کھڑے رہیں اور سیٹی کی آواز سنتے ہی ڈرائنگ روم میں چلے آئیں۔ پھر جو کچھ میں سمجھا سکوں یا جیسے مریم کہے۔ اس پر فوری عمل کریں۔

میں بغیر اطلاع کئے مریم کے ڈرائنگ روم میں چلا گیا مریم اپنی ٹیوٹر سے اردو سیکھ رہی تھی۔

(جاری ہے)

غازی

رومن رسم الخط میں وہ عام بول چال کے اردو فقروں اور ان فقروں کا انگلش میں ترجمہ لکھتی اور مریم کا اردو تلفظ ٹھیک کر رہی تھی۔ جب تک وہ میری آمد کو محسوس کرتی، میں اس کے سر پر جا کھڑا ہوا تھا۔ مجھے یوں اچانک اپنے اتنے قریب دیکھ کر وہ گھبرا گئی اور دوپٹے سے اپنے چہرے کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ''میں پردہ دار ہوں''

میں نے بڑے سکون اور دھیمے لہجے میں کہا'' دیکھو تمہارا پردہ تو اب باقی نہیں رہا کیونکہ میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے اور میں مریم کا منگیتر بھی ہوں جسے تم پڑھاتی ہو میں تم سے بہت متاثر ہوں کہ تم نے مریم کو اردو زبان اور اسلامی کلچر سکھانے میں خاصی کامیابی حاصل کر لی ہے میں تو اس بات پر حیران ہوں کہ بہاری مہاجر ہوتے ہوئے بھی تم اتنی فصیح اور لکھنوی انداز میں اردو اور وہاں کا مخصوص اسلامی کلچر کیسے سیکھا'' لڑکی نے بھرپور نظروں سے مجھے دیکھا جیسے مجھے تول رہی ہو کہ میں کتنے پانی میں ہوں اور بولی'' میرے والدین دہلی میں پھاٹک حبش خاں میں رہتے تھے۔ پارٹیشن کے وقت دہلی میں فساد شروع ہوئے تو میرے والدین نے پاکستان ہجرت کرنے کا سوچا۔ میری والدہ کی ایک بہت گہری سہیلی نے انہیں مشورہ دیا کہ مغربی پاکستان کے بجائے ہم مشرقی پاکستان ہجرت کر جائیں۔ میری والدہ کی سہیلی کا نام آمنہ تھا اور ان کی شادی چٹا گانگ میں تعینات چٹا گانگ پورٹ کے ایک افسر سے ہوئی تھی جو خود بھی علی گڑھ کے رہنے والے تھے میرے والدین ہجرت کر کے چٹا گانگ میں آن بسے اور والد نے وہیں پر آمنہ آنٹی کے شوہر ایس ایم معروف کی مدد سے پورٹ پر مزدوروں کے ٹھیکے وغیرہ لینے شروع کر دیئے۔ معروف صاحب کا عہدہ بڑھتا گیا اور وہ چٹا گانگ پورٹ کے جنرل منیجر بن گئے۔ اس دوران آمنہ آنٹی کی دو چھوٹی بہنیں رضیہ آپا اور افسر باجی بھی چٹا گانگ آ گئیں۔ جہاں ان کی شادیاں دہلی کے مہاجر بجلی گھر کے ایک اعلیٰ افسر اور مرچنٹ نیوی کے ایک انجینئر سے ہو گئیں۔ میں چٹا گانگ میں ہی پیدا ہوئی اور وہیں بی اے کیا۔ میرے والد کا چٹا گانگ میں ہی انتقال ہو گیا تھا اور میری والدہ بالکل تنہا رہ گئے لیکن معروف صاحب آمنہ آنٹی اور ان کی بہنوں نے ہماری اس حد تک خبر گیری کی کہ ہمیں کبھی بھی مالی پریشانی کا احساس نہ ہونے دیا۔ 71ء کے اوائل میں جب مشرقی پاکستان میں فساد پھوٹ پڑے تو ہم نے معروف صاحب کے گھر میں ہی پناہ لی۔ معروف صاحب چونکہ سرکاری افسر تھے اس لئے انہوں نے اپنا اور رضیہ آپا کے شوہر کا تبادلہ مغربی پاکستان میں کروا لیا۔ افسر باجی شادی کے بعد پہلے ہی مغربی پاکستان جا چکی تھی۔ ہم ماں بیٹی نے سوچا کہ دہلی چلے جائیں جہاں میرے ددھیال اور ننھیال تھے۔ اب تک تو ہم دہلی میں رہے لیکن آخر کب تک خوف و ہراس کی اس زندگی بسر کرتے۔ ہم نے پاکستان آنا چاہا تو معلوم ہوا کہ جب تک کھٹمنڈو کے پاکستانی سفارتخانے میں رجسٹریشن نہ ہو ہمیں پاکستانی پاسپورٹ نہیں مل سکتا اس لئے ہم ماں بیٹی یہاں آ گئے۔ مالی طور پر ہم اپر مڈل کلاس سے تعلق رکھتے ہیں۔ میری والدہ اور والدہ کے رشتہ داروں نے بھی چلتے وقت ہمیں خاصے پیسے دیئے۔ یہاں ایک متمول کشمیری فیملی نے ہمیں اپنے گھر میں رہائش کیلئے ایک کمرہ دے دیا ہے مہاجروں کی فری ہوائی سفر کی مشکلات کو دیکھتے ہوئے ہم نے اب یہ فیصلہ کیا ہے کہ اپنے ٹکٹ خرید کر تھائی ایئر لائنز یا رائل ایئر لائنز سے پاکستان جائیں۔ ہماری ابھی تک سفارتخانے میں رجسٹریشن نہیں ہوئی ہے۔ کشمیری خاندان کے سربراہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ بہت جلد ہماری رجسٹریشن کروا کر ہمیں پاکستانی ONE WAY پاسپورٹ دلوا دیں گے اور پھر ہم پاکستان چلے جائیں گے یہاں بیکار رہنے کے بجائے میں نے سوچا کہ کچھ کام ہی کر لیا جائے اسی کوشش میں اس ریسٹورنٹ میں آئی اور آپ کی منگیتر کو ٹیوشن پڑھانے لگ گئی۔''

اسے حسن اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے کہ زندگی میں اپنی پہلی ملازمت کے دوران چٹا گانگ میں معروف فیملی سے بہت اچھی طرح نہ صرف واقف ہی تھا بلکہ مجھے ان کے گھر کے ایک ممبر حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ اس وقت معروف صاحب چٹا گانگ پورٹ کے ڈپٹی جنرل منیجر تھے ان کے بیگم کا نام آمنہ تھا اور ان کی منجھلی سالی رضیہ چٹا گانگ میں ہی ایک الیکٹرک انجینئر سے بیاہی ہوئی تھی اور سب سے چھوٹی سالی افسر بھی انہیں کے ساتھ رہتی تھی اور ان دنوں اس کی شادی نہیں ہوئی تھی اتنے بھرپور تعارف اور ریفرنس کے بعد جنہیں میں ذاتی طور پر جانتا تھا میرے لئے اس لڑکی کو اپنے ذہن میں بالکل CLEAR کر دیا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے ناحق ایک پردہ دار لڑکی کو بے پردہ کیا اور اس سے بے جا سوال پوچھے ماحول کی تلخی کو کم کرنے کیلئے میں نے سب کیلئے کافی بنانے کا کہا۔ مریم کافی بنانے چلی گئی تو بغیر کسی مقصد کے محض اس یتیم لڑکی کے خوف کو دور کرنے کیلئے میں نے اس سے پوچھا کہ معروف فیملی میں تمہارے بقول شروع میں صرف افسر ہی غیر شادی شدہ تھی اور اگرچہ تم عمر میں اس سے چھوٹی تھیں لیکن وہی تمہارے زیادہ قریب رہی ہو گی۔ لڑکی نے بتایا کہ'' جی ہاں افسر باجی مجھے بہت پیار کرتی تھیں''۔ تو تم نے وہی اسکول جوائن کیا جس میں افسر پڑھتی تھی؟'' میں نے سوال کیا'' جی ہاں، وہ نویں جماعت میں تھیں اور انہوں نے خود مجھے اپنے اسکول میں داخلہ دلوایا تھا''۔

لڑکی نے پُراعتماد سے جواب دیا۔'' تم نے بتایا ہے کہ افسر نے تمہیں جس اسکول میں داخلہ دلوایا وہاں وہ خود بھی پڑھتی تھی اور تمہارے بہت قریب بھی تھی۔ تم سے پیار بھی بہت کرتی تھی یہ تو بتاؤ کہ افسر میں کون سی ایسی بات تھی جو اسے دوسروں سے نمایاں کرتی تھی۔'' لڑکی میرا یہ سوال سن کر گھبرا گئی اور کہنے لگی کہ آپ مجھ سے یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہیں؟ میں نے کہا کہ صرف وقت گزاری کیلئے۔ اتفاق سے میں بھی معروف فیملی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم نے ان کے متعلق بالکل صحیح بتایا ہے۔ اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ افسر نے اسکول اسپورٹس میں حصہ لینے کے لئے اپنے بال بالکل مردانہ انداز میں کٹوائے تھے؟ کیوں یاد ہے نا۔'' جی ہاں بالکل یاد ہے بلکہ معروف صاحب نے اس حرکت پر افسر باجی کو بہت ڈانٹا بھی تھا۔'' لڑکی یہ جواب دیتے ہوئے اپنا لیڈیز بیگ اٹھانے کے لئے میز کی طرف بڑھی۔ میں اس کی ایک ایک حرکت دیکھ رہا تھا اس سے پہلے کہ وہ اپنا بیگ اٹھائے میں لڑکی پر جھپٹا اور اسے دھکا دے کر اس کا بیگ اٹھا لیا۔ ساتھ ہی میں نے سیٹی بجائی۔ دونوں چینی دوست بھاگتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ اسی اثنا میں مریم بھی کافی کی ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہو چکی تھی۔

(جاری ہے)

غازی

میں نے مریم کو کہا کہ چینی دوستوں کو کہے کہ پوری طرح اس لڑکی کو اپنی گرفت میں لے لیں۔مریم میں یہ بری عادت نہیں تھی کہ پہلے سوال جواب کرکے اپنی تسلی کرے اور پھر اگلا قدم اٹھائے۔میں نے جو کچھ مریم کو انگریزی میں کہا۔اس نے فوری طور پر چینی دوستوں کو کہہ دیا۔دونوں چینی آگے بڑھے تو اس لڑکی نے اچانک اپنے پاؤں سے جوڈو کا ایک چینی دوست کے چہرے پر ایسا سخت وار کیا کہ وہ وہیں گر کر بے ہوش ہوگیا۔اب یہ لڑکی میرے اور دوسرے چینی دوست کے درمیان تھی اور جوڈو کراٹے کے پینترے بدل بدل کر ہم دونوں کو بیک وقت اپنی زد پر لئے ہوئے تھی مجھے اس کا بیگ کھولنے کا بھی ابھی تک موقع نہیں ملا تھا۔میں لڑکی کی گھومتی ہوئی ٹانگ کے وار سے بچنا چاہتا تھا۔جونہی اس کا دھیان اور رخ چینی ساتھی کی طرف ہوا۔میں لڑکی کی طرف بڑھا۔وہ مجھ سے غافل نہیں تھی۔اس نے مجھے ہٹ کرنے کیلئے سیدھی ٹانگ اٹھائی۔جسے میں نے اپنے جسم کو لگنے سے پہلے ہی پنڈلی سے پکڑ لیا۔یہاں میرا لمبا قد اور اسی حساب سے بازوؤں کی لمبائی کام آگئی۔ورنہ اس کی ضرب اتنی شدید تھی کہ چینی دوست ابھی تک بے ہوش پڑا ہوا تھا۔میں نے اس کی ٹانگ پکڑی ہی تھی کہ دوسرے چینی دوست نے پیچھے سے اسے بازوؤں سے دبوچ لیا۔بے بس ہوکر وہ قالین پر گر تو گئی لیکن ہم دو مضبوط مردوں کی گرفت بھی اس پر ہلکی پڑ رہی تھی اور وہ مچھلی کی طرح تڑپتی ہوئی خود کو آزاد کرانے کی جدوجہد کر رہی تھی۔میں نے مریم کو رسی اور کپڑا لانے کا کہا تاکہ اسے باندھ دیا جائے۔ہم نے اس کی پشت پر ہاتھ باندھے اور ٹانگیں باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تاکہ اس کا چلانا بند ہو۔چینی دوست تو اپنے ساتھی کو ہوش میں لانے کی تدابیر کرنے لگا۔مریم میرے قریب آگئی۔میں نے لڑکی کا بیگ کھولا تو اس میں سے میک اپ کے سامان اور کچھ نیپالی کرنسی کے علاوہ 25بور کا لوڈ پسٹل نکلا۔

DMI نے مکمل ٹریننگ کے بعد ایک بھرپور اور چیلنج نہ ہونے والی کور اسٹوری کے ساتھ اس لڑکی اور اس کے ساتھیوں (جن کا تذکرہ بعد میں آئے گا) کو پاکستان بھیجنے کا منصوبہ بنایا تھا۔میں بھی اس کی کور اسٹوری سے بالکل مطمئن ہوگیا تھا۔بعد کے سوال میں نے محض POST SCRIPT کے طور پر پوچھے تھے۔جن کا جواب دینے میں وہ مار کھا گئی۔معروف کی سالی افسر کے بال اس کی آدھی پنڈلیوں تک آتے تھے۔اس کے بال اس قدر لمبے اور گھنے تھے کہ وہ اپنے بال خود نہیں دھو سکتی تھی بلکہ دو بنگالی ملازمائیں اس کے بال دھوتی تھیں۔وہ کبھی بھی چٹا گانگ میں نہیں پڑھی بلکہ دہلی سے ایف اے کرنے کے بعد چٹا گانگ آئی تھی۔شادی کے بعد وہ کراچی آگئی اور یہاں بھی ہماری اکثر ملاقاتیں ہوئیں۔اس کے بال اسی طرح لمبے اور گھنے تھے اور اتنے عجوبہ روزگار اور خوبصورت بالوں کو کٹوانے کا وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

یہ تو محض اتفاق تھا کہ میں معروف فیملی کو اچھی طرح اور ذاتی طور پر جانتا تھا۔ورنہ اتنی مکمل اور ٹھوس Cover Story کے ساتھ بھارتی جاسوسوں کا یہ گروپ پاکستان جانے والا تھا کہ کوئی بھی ان پر کسی قسم کا شک نہ کرتا۔میرے پاس وقت بہت کم تھا جس میں اس لڑکی (مریم نے اس کا نام جبیں بتایا تھا جو کہ ظاہر ہے کہ غلط تھا) سے کچھ اگلوا سکتا۔اس کے بیگ سے پسٹل کے ملنے سے اگر اس کے جاسوسہ ہونے میں اگر برائے نام بھی کوئی شک تھا تو وہ دور ہو چکا تھا۔چینی دوست کو جبیں نے ایسی سخت ضرب لگائی تھی کہ گو وہ اب ہوش میں تو آچکا تھا لیکن بار بار اپنا سر سہلاتا اور چینی زبان میں نہ جانے کیا اناب شناب کہے جا رہے تھا۔میں نے دوسرے چینی دوست سے بال کاٹنے کی مشین استرا، قینچی اور پانی بھری شیشیاں لے کر جبیں کے سامنے میز پر رکھ دیں اور اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا: تمہاری بدقسمتی یہ ہے کہ تم اپنی گیم شروع کرنے سے پہلے ہی پکڑی گئیں اور خوش قسمتی یہ تھی کہ پکڑنے والا ایک مسلمان ہے۔تمہارے اور تمہاری نقلی ماں اور تمہارے ساتھی مرد جس نے تمہارے باپ کا رول ادا کرنا تھا کے متعلق ہمیں بھارت سے تمہاری روانگی سے قبل ہی مکمل اطلاع مل چکی تھی۔مریم کو جب تم نے پڑھانا شروع کیا اس سے پہلے ہی ہم تمہاری اور تمہارے دونوں ساتھیوں کی مکمل نگرانی کر رہے تھے۔یہ تصویریں دیکھو۔یہ تمہارے گروپ لیڈر کی ہیں۔تم جوان ہو، خوب صورت ہو، اگر ہماری جگہ کوئی غیر مسلم ہوتا تو وہ سب سے پہلے تمہاری جوانی سے کھیلتے اور پھر تم سے پوچھ گچھ کرتے۔تمہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ تمہیں اس کے لئے تیار کر کے بھیجا گیا ہے لیکن ہمارے مذہبی اصولوں کے خلاف ہے۔لیکن ایک جاسوس کا ہم جو حشر کرتے ہیں۔شاید اس کے متعلق نہیں بتایا گیا ورنہ تم کبھی پاکستان کے خلاف جاسوسہ بننے کا سوچتی تک نہیں۔اگرچہ تمہارے متعلق سب کچھ جانتے ہیں لیکن تمہاری زبان سے سب کچھ سننے کیلئے ہمارا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ پہلے ہم تمہارے بال کاٹیں گے۔پھر تمہارے سر پر مشین چلا کر تمہیں رہے سہے بالوں سے بھی آزاد کر دیں گے۔اگر پھر بھی تم نے سچ نہ بتایا تو اس استرے سے تمہاری ناک کاٹیں گے اور پھر ان شیشیوں میں بھرے تیزاب سے تمہارے چہرے کو اتنا بھیانک بنا دیں گے کہ تم کبھی آئینہ دیکھنے کی ہمت تک نہ کر سکو گی۔اگر پھر بھی تم نے ہمیں کچھ نہ بتایا تو ہم ہار مان کر تمہیں چھوڑ دیں گے لیکن چھوڑنے سے پہلے میرے چینی ساتھی تمہارے ہاتھ پاؤں توڑ دیں گے۔تاکہ تم آئندہ کبھی کسی پر اپنے جوڈو کی کک آزما نہ سکوں۔

میں نے یہ تمام باتیں نفسیاتی طور پر اسے توڑنے اور مزاحمت نہ کرنے کے لئے کہی تھیں۔عورت کے لئے سب سے زیادہ قیمتی شے اس کا حسن ہوتا ہے۔سوائے پاکباز عورتوں کے اس قماش کی عورتیں خوبصورت دکھائی دینے اور اپنے حسن کو برقرار رکھنے کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوتی ہیں۔میں نے مریم کے ذریعے چینی ساتھیوں کو کہا کہ اس لڑکی کے ہاتھ پاؤں دوبارہ کس کے اچھی طرح باندھ دیں تاکہ جب ہم اپنا کام شروع کریں تو یہ حرکت نہ کر سکے۔میں نے یہ بات بھی محض اسے نفسیاتی طور پر توڑنے کے لئے کہی تھی تاکہ وہ ہمارے عزائم کو صحیح سمجھ کر مدافعت چھوڑ دے۔چینی دوستوں نے اس کے ہاتھ پاؤں دوبارہ کس کر باندھ دیئے اور میرے اشارے پر اسے بازوؤں سے پکڑ کر بٹھا دیا۔میں نے قینچی اٹھائی اور 6 انچ کے قریب اس کے بال کاٹ کر اس کے سامنے پھینک دیئے۔لڑکی کا منہ کپڑے سے بند تھا۔وہ بول تو نہیں سکتی تھی، غوں غوں کرنے لگی۔میں نے مزید تین چار انچ لمبے اس کے بال کاٹے اور وہ بھی اس کے سامنے پھینک دیئے۔لڑکی کی غوں غوں اور بڑھ گئی۔اب میں نے بال کاٹنے کی مشین اٹھائی جو اس لڑکی کے سامنے میز پر پڑی تھی۔میں نے ظاہراً مریم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا" مریم اس طرح تو خوامخواہ وقت ضائع ہو رہا ہے۔میرے ہاتھ میں مشین دیکھ کر خوف سے لڑکی کی آنکھیں پھیل گئیں اس نے زور زور سے اپنا سر ہلانا شروع کیا۔میں نے اس سے پوچھا" بولنا چاہتی ہو" اس نے سر ہلا کر ہاں میں جواب دیا میں نے مشین رکھ دی استرا اٹھایا اور مریم کو کہا کہ چینی دوستوں کو کہے کہ اگر اس لڑکی نے سچ نہ بولا تو میرا اشارہ کرتے ہی اس کا ایک کان کاٹ دیں۔یہ کہہ کر میں نے لڑکی کے منہ سے کپڑا نکالتے ہوئے کہا کہ بالکل مدھم آواز میں بولے۔لڑکی کی دہشت سے جو حالت ہو رہی تھی وہ ناقابل بیان ہے۔منہ سے کپڑا نکلتے ہی وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔" مجھ پر رحم کریں میں آپ کو سب کچھ بالکل سچ بتاؤں گی لیکن بھگوان کے لئے مجھ پر یہ ظلم نہ کریں" اس کے اس فقرے سے یہ تصدیق تو ہو گئی کہ وہ غیر مسلم ہے۔" یہ تو اب تم پر منحصر ہے کہ سب حقیقت بتا کر خود کو بچا لو ورنہ ہمیں مجبوراً اگلا قدم اٹھانا پڑے گا" میں نے یہ کہہ کر لڑکی کو کہا کہ اب بولنا شروع کر دو اور بولتے وقت اپنے ذہن میں یہ ضرور یاد رکھنا کہ تمہاری اصلیت سے ہم اچھی طرح واقف ہیں اور جونہی تم نے غلط بیانی سے کام لیا، میرے ایک اشارے پر تمہارا ایک کان تمہارے کٹے ہوئے بالوں پر پڑا ہوگا۔لڑکی نے بولنا شروع کیا، میں دہلی کی رہنے والی ہوں، بنگلہ دیش کبھی نہیں گئی۔اسکول کے زمانے سے ہی مجھے مسلمانوں سے اس لئے نفرت ہو گئی تھی کیونکہ آوارہ قسم کے مسلمان لڑکے اسکول آتے جاتے مجھے اور میری سہیلیوں کو تنگ کرتے اور فحش کلامی کرتے تھے۔" تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ لڑکے مسلمان تھے؟" میں نے پوچھا" وہ مسلمان ناموں سے ایک دوسرے کو مخاطب کرتے تھے۔ہم نے جب اپنی ہیڈ مسٹریس سے شکایت کی تو اس نے شیو سینا والوں کو بتایا اور اس تنظیم کا ایک مارشل آرٹ کا ماہر ہمیں تربیت دینے اور غنڈوں سے مقابلہ کرنے کی تدبیریں سکھانے کے لئے ہر روز ہمارے اسکول آنے لگ گیا۔

(جاری ہے)

غازی

میں نے 6 سال یہ تربیت اسکول اور کالج میں حاصل کی۔ مجھ میں خاصی خود اعتمادی پیدا ہوگئی تھی میں نے اس دوران کئی آوارہ اور غنڈے لڑکوں کی ایسی پٹائی کی کہ وہ دوبارہ دکھائی نہ دیئے۔ ذہنی طور پر میں شیوسینا اور آریہ ویدک کو اپنا سرپرست سمجھنے لگی۔ میں کالج میں ابھی پڑھ رہی تھی کہ شیوسینا کی میٹنگز میں باقاعدگی سے جانے لگی اور جلد ہی اس تنظیم کی باقاعدہ ممبر بن گئی۔ میرے شوق اور جذبے کو دیکھتے ہوئے شیوسینا کے اس مخصوص گروپ میں مجھے شامل کرلیا گیا جس کی میٹنگز میں ہمیں اسلحہ چلانے اور جاسوسی کی تربیت دی جاتی تھی۔ میرے پتا کا دیہانت ہو چکا تھا اور میری ماتا ایک آرٹ اسکول میں ٹیچر تھیں۔ ابتدائی تربیت کے بعد ہمیں دہلی کے نواح میں ایک فوجی کیمپ میں ایڈوانس تربیت کے لئے جانا پڑا جس میں فوجی افسران ہم سے اسلحہ چلانے کی مشق کراتے اور جاسوسی کے داؤ پیچ سکھاتے تھے۔ تربیت کے لئے مخصوص کمروں میں دیواروں پر ایسے نقشے لگے ہوتے تھے جن میں بھارت کے علاوہ برما، مشرقی اور مغربی پاکستان اور افغانستان بھی شامل تھے۔ بھارت کو چھوڑ کر باقی ملکوں پر سرخ لکیریں کھینچی ہوتی تھیں اور ہمیں بتایا جاتا تھا کہ اصل بھارت میں یہ سب ملک شامل تھے اور مہاراجہ اشوک کی حکومت برما سے افغانستان کی آخری حدوں تک تھی اب ہمیں یہ تمام علاقے اکھنڈ بھارت میں شامل کرنے ہیں۔ اسی دوران تربیت دینے والے ایک کیپٹن سے میرے تعلقات آخری حدوں سے بھی آگے بڑھ گئے۔ میں نے جب کیپٹن کو شادی پر زور دیا تو ایک دن اس کے کرنل نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور کہا کہ جسمانی لذت سے بڑھ کر ایک لذت اور بھی ہے اور وہ ہے کہ اپنے پرکھوں کی جنم بھومی کو غاصبوں سے آزاد کرانے کی کوشش۔ اس سے تمہارے پرکھوں کی آتما اور تمہارے من کو شانتی ملے گی۔ ہم تمہیں اس مقصد کے لئے ایک مشن پر پاکستان بھیجیں گے اور وہاں سے واپسی پر تمہاری شادی اس کیپٹن سے کروانے کی ذمہ داری میں لیتا ہوں۔ اپنے مشن کی تکمیل کے لئے تمہیں اپنے دماغ کے علاوہ اپنے شریر (جسم) کو بھی بھینٹ کرنا پڑے گا لیکن وطن کی سیوا میں شریر کی بھینٹ دینے کے باوجود تم ہمارے لئے پوتر اور ستی ساوتری ہوگی۔ اگر تمہیں ہماری بات منظور ہے تو ہم تمہاری ماتا کو یہ کہیں گے کہ حکومت تمہیں برطانیہ میں اعلیٰ تعلیم کے لئے بھیج رہی ہے۔ میں نے یہ بات مان لی تو مجھے ایک برس مزید تربیت اور پاکستان کے متعلق کتابوں فلموں اور سلائیڈوں اور لیکچروں سے اس قدر جانکاری دی گئی کہ اب میں بھارت سے کہیں زیادہ پاکستان کے متعلق جانتی ہوں۔ دو ماہ پہلے مجھے ایک ادھیڑ عمر مرد اور ایک عورت سے ملوایا گیا۔ پاکستان میں ہمیں ایک گروپ کی صورت میں کام کرنے کے لئے انہوں نے میرے ماتا پتا بن کر رہنا تھا۔ کھٹمنڈو میں ہم اکٹھے آئے ہیں ''ماتا'' کے ساتھ کشمیری خاندان میں رہتی ہوں۔ اور میرے ''پتا'' ایک علیحدہ فلیٹ میں رہتے ہیں کھٹمنڈو میں مجھے اپنی عملی کارکردگی دکھانے کے لئے مریم تک رسائی حاصل کرنا تھی۔ میرے ''پتا اور ماتا'' کو بھی آپ سے علیحدہ علیحدہ ملنے کا کام سونپا گیا تھا۔ یہاں ہم سب کے ذمے یہ کام تھا کہ کسی صورت بھی آپ کو یا مریم کو اعتماد میں لے کر بھارتی یا بنگلہ دیشی سفارت خانے کے اندر لے جائیں اگر میں آج پکڑی نہ جاتی تو دو تین روز تک میں مریم کے ساتھ اس کی گاڑی میں ان دونوں سفارت خانوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے پستول کی نوک پر یا جوڈو کے وار سے اسے بے ہوش کرکے سفارت خانے کے اندر لے جاتی۔ میں سائیکل سے ٹرک تک چلانے میں مہارت رکھتی ہوں میرے گروپ کو بھارت میں آپ دونوں کے متعلق اچھی طرح سے بریف کیا گیا تھا۔ یہ دونوں سفارت خانے ہماری پشت پر ہیں اور یہاں ہماری رہنمائی بھی کرتے ہیں۔

قارئین جتنے وقت میں آپ نے اس بھارتی جاسوسہ کے بیان کو پڑھا ہوگا۔ اتنا ہی یا اس سے کچھ زیادہ وقت اس نے بیان دینے میں لگایا تھا۔ میں اسے تفصیلاً صرف اس لئے تحریر کر رہا ہوں کہ بھارت اور کھٹمنڈو میں قیام کے دوران پہلی بار میں نے پوری طرح تربیت یافتہ ایسے بھارتی جاسوس گروہ کو UP-ROOT (پکڑا، ننگا) کیا تھا۔ جو خطرناک عزائم لے کر پاکستان جانے والا تھا۔ اکھنڈ بھارت اور وسیع تر بھارت کے خواب دیکھنے والے اب پہلے سے بھی زیادہ زور و شور سے اپنے مقصد کے حصول میں کوشاں ہیں اور ہماری حالت یہ ہے کہ ہم کو ہمارے دانش ور ہی بھارت سے محبت کی پینگیں بڑھانے اور بھارت کو MOST FAVOURITE NATION سمجھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ہمارے اپنے ہی بنگلہ دیش جا کر مکتی باہنی کے جہنم رسیدوں کی یادگار پر پھول چڑھاتے اور اس ندامت کا اظہار کرتے ہیں کہ ہم نے مشرقی پاکستان میں جو 16 دسمبر 71ء تک پاکستان کا مشرقی بازو تھا، پاکستان کے دشمنوں اور غداروں کی سازشوں کو کچلنے کے لئے طاقت کا استعمال کیوں کیا۔

بھارتی جاسوسہ اپنا بیان ختم کرکے سہمی ہوئی نظروں سے مجھے اس طرح دیکھ رہی تھی کہ آیا مجھے اس کے بیان پر یقین آیا بھی ہے یا نہیں ادھر میں خود کو ان سوالوں کے لئے تیار کر رہا تھا جو ہنوز تشنہ جواب تھے۔ میرے پاس بھی بہت کم وقت تھا اور یہ یقین بھی تھا کہ اس جاسوسہ کی نگرانی اور حفاظت کے لئے ریسٹورنٹ کے اردگرد کچھ لوگ ضرور ہوں گے۔

مجھے صورت حال کے یک لخت اتنے بدلنے اور گمبھیر ہونے کا قطعاً خیال نہ تھا۔ بھارت کی ایک مکمل تربیت یافتہ جاسوس لڑکی رسیوں میں جکڑی ہوئی میرے سامنے تھی۔ اس نے اپنے متعلق جو انکشاف کئے تھے ان کے مطابق یہ کوئی معمولی گروہ نہ تھا۔ اگر یہ خدانخواستہ پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے تو بہت کچھ الٹ پلٹ کر سکتے تھے۔ میرے لئے زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی عورت جاسوسہ سے تفتیش کروں۔ مجھے مرد اور عورت کے بیچ جو فطری حد ہے اسے بھی عبور نہیں کرنا تھا چونکہ بالکل غیر متوقع اور اچانک ہی سب کچھ ہوا تھا۔ اس لئے اس لڑکی اور اس کے ساتھیوں سے (اگر وہ مل جاتے) پوچھنے کیلئے میں نے کوئی سوال نامہ بھی ترتیب نہیں دیا تھا۔ اس لئے میں خود گھبرایا ہوا تھا۔ ایک جیک پاٹ (jack pot) میرے سامنے تھا۔ جس کے حصول کیلئے مجھے نہایت مناسب PLANNING کی ضرورت تھی۔ وقت بہت کم تھا اور اس گروہ کا گروپ لیڈر اور دوسری جاسوسہ ابھی تک آزاد اور میری پہنچ میں نہ تھے۔ میرے پیش نظر یہ بات بھی تھی کہ میں نہ تو پاکستان میں تھا جہاں میرا محکمہ میری مدد کر سکتا اور نہ ہی یہ بھارت تھا جہاں میں گرفتاری سے پہلے COVER میں آزادی سے سب کام کرتا تھا اور جہاں مجھے اپنے ساتھیوں بشیر کی گیرج کے لڑکوں اور ہمدردوں کا تعاون حاصل تھا۔ کھٹمنڈو میں میری اصلیت اور شہرت مجھ سے پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ یہاں پر جتنے پاکستان دشمنوں کو ہم نے جہنم رسید کیا تھا۔ گو کہ ہم نے کوئی ثبوت نہ چھوڑا تھا لیکن دشمن سفارت خانے، اپنے اور پرائے سبھی جانتے تھے کہ اس قتال کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔

وقت کی نزاکت کے پیش نظر میں نے اپنے ذہن میں فوری طور پر ایک سوالنامہ ترتیب دیا۔ میں نے مریم کو کہا کہ اپنی ٹیپ کا مائیک ہمارے درمیان رکھے اور ٹیپ پر نیا سپول چڑھا لے۔ مریم نے مجھے بتایا کہ اس کی یہ ٹیوٹر دوپہر دو بجے کھانا کھا کر واپس جاتی ہے۔ میں نے وقت دیکھا تو میرے پاس صرف دو گھنٹے اور چند منٹ تھے۔ جن میں مجھے اس لڑکی سے سوال جواب بھی کرنے تھے اور اس کے گروہ کے دونوں افراد تک بھی پہنچنا تھا۔ اس واقعے کو 23 سال بیت چکے ہیں پھر بھی اپنی یادداشت کے مطابق اس لڑکی سے اپنی تفتیش کو سوال و جواب کی صورت میں ہی نذر قارئین کر رہا ہوں۔

(س) DMI ہیڈ کوارٹر کہاں واقع ہے؟ (ج) نئی دہلی میں (س) تمہیں تربیت دینے والوں کے نام اور رینک کیا تھے؟ (ج) صحیح نام تو وہ کبھی نہیں بتاتے۔ مجھے صرف کیپٹن کا اصل نام معلوم ہے۔ کیپٹن ملہوترا (س) یہاں تمہارے گروہ میں کتنے افراد ہیں۔ ان کے نام اور ایڈریس بتاؤ؟...... اس کا جواب دینے میں لڑکی کچھ جھجکی۔ اس پر میں نے چینی دوست کو اشارہ کیا۔ اس نے لڑکی کا بایاں کان پکڑا اور استرا کھول کر کان کے قریب کر دیا۔ میرے دوسرے اشارے پر اس نے کان کاٹ کر علیحدہ کر دینا تھا۔ یہ دیکھ کر لڑکی چلائی۔ ''میں بتاتی ہوں۔ میں بتاتی ہوں۔ بھگوان کیلئے میرا کان نہ کاٹیں۔ میری ساتھی عورت کشمیری مسجد کے سامنے کشمیری فیملی کے گھر میں میرے ساتھ ہی رہتی ہے۔ اس کا کور (COVER) نام سعیدہ ہے جبکہ اصلی نام کوشلیا ہے ہمارا ساتھی مرد ہنومان ڈھوکا کی ایک بلڈنگ میں رہتا ہے وہاں ایک فلیٹ اسے بھارتی سفارت خانے نے دیا ہے''۔ ہنومان ڈھوکا میں ہی وجے کمار بھی رہتا تھا۔ میں نے لڑکی سے جب اس بلڈنگ اور فلیٹ کی تفصیل پوچھی تو معلوم ہوا کہ وجے کمار کا فلیٹ ہی اس جاسوس کو دیا گیا تھا۔ (س) تمہارا اصلی نام کیا ہے؟

(جاری ہے)

غازی

(ج) مالتی سکسینہ (س) تمہارے مرد ساتھی کا اصلی نام اور کور نام کیا ہے؟ (ج) اصلی نام تو چمن لال ہے اور کور (COVER) نام جمشید (س) پاکستان میں تمہیں کیا ٹارگٹ دیئے گئے ہیں؟ (ج) مجھے پاکستان میں HIGH BRASS آفیسرز اور ٹاپ سول بیوروکریٹس سے پاکستان کے خفیہ راز حاصل کرنے تھے (س) یہ تم کیسے کرتیں (ج) ہمیں بتایا گیا تھا کہ ان لوگوں تک میں اپنی جوانی، حسن اور اعلیٰ تعلیم کی وجہ سے بہت جلد پہنچ سکتی اور مطلوبہ معلومات حاصل کر سکتی ہوں۔ (س) تم ماتا ہاری کے متعلق کچھ جانتی ہو؟ (ج) بہت کچھ پڑھا ہے اور فلمیں بھی دیکھی ہیں۔ ہمیں ماتا ہاری کو ہی اپنا IDEAL سمجھ کر کام کرنے کی تربیت دی گئی ہے۔ (س) ماتا ہاری کا انجام بھی جانتی ہو؟ (ج) جی ہاں۔ (س) لیکن یہاں تو تم صرف اپنے کان اور ناک کٹنے کے خوف سے اپنی اصلیت بتا رہی ہو۔ (ج) اپنے سارے یا کچھ ٹارگٹ مکمل کر کے اگر مجھے مرنا بھی پڑتا تو مجھے بخوشی منظور ہوتا کیونکہ میں نے اپنے دیش کی کچھ سیوا تو کی ہوتی لیکن یہاں تو اڑنے سے پہلے ہی پکڑی گئی۔ (س) پاکستان میں کوئی خاص ٹارگٹ بھی تمہیں دیا گیا تھا؟ (ج) جی ہاں (یہاں پر مالتی نے اس شخصیت کا نام لیا جو ان دنوں حکمران پارٹی کا ایک اعلیٰ عہدیدار اور صوبائی انتظامیہ کا کرتا دھرتا تھا۔ آج کل اس کی متعدد شادیاں اس کی پہچان بن چکی ہیں) مجھے بتایا گیا تھا کہ میں بہت آسانی سے اس کو اپنے قابو میں لا سکتی ہوں۔ اس پر قابو پانے کا مطلب تھا کہ پاکستانی افواج اور سول بیوروکریسی میں میرے داخلے کے سارے دروازے کھل جاتے۔ (س) پاکستان پہنچ کر اپنی حاصل کردہ معلومات تم بھارت کیسے پہنچاتیں۔ کیا کوئی ٹرانسمیٹر بھی تم لوگ اپنے ساتھ لے جا رہے ہو؟ (ج) مجھے اور کوشلیا کو اپنی معلومات اپنے گروپ لیڈر کو دینے کا آرڈر تھا وہ الیکٹرونکس کا ماہر ہے۔ ٹرانسمیٹر بھی اس نے پاکستان میں ہی بنانا تھا۔ (س) ٹرانسمیٹر کے علاوہ کوئی اور ذریعہ؟ (ج) مقررہ وقت پر CORRIER کا گروپ لیڈر کو بھارتی ڈاک دینے اور لینے کا انتظام بھی ہے۔ (س) پاکستان میں تمہارے ہمدرد اور ضرورت پڑنے پر تمہاری مالی اور مادی مدد کرنے والوں کے نام بتاؤ۔ (ج) ایک نہیں بیسیوں نام ہیں لیکن ان کا علم صرف گروپ لیڈر کو ہے۔ (س) پاکستان میں تمہارے مشن کا DURATION (وقت) کتنا ہے؟ (ج) میرے لئے دو سال اور دوسروں کے متعلق میں نہیں جانتی۔ (س) پاکستان میں تمہارے کتنے گروپ کام کر رہے ہیں۔ ان سے تمہارا رابطہ کیسے ہوتا تھا؟ میرا یہ سوال سن کر مالتی ذرا سی مسکرائی اور بولی ''سر ہمیں تو بتایا گیا تھا کہ آپ ایک بہت منجھے ہوئے جاسوس ہیں۔ آپ کو تو یقیناً معلوم ہونا چاہئے کہ COMPARTMENTATION تو جاسوسی کا ابتدائی سبق ہے۔ ہمیں کسی دوسرے گروپ کے متعلق کچھ نہیں بتایا گیا۔ (س) اگر ہم تمہیں چھوڑ دیں تو تم کیا کرو گی (ج) میں نے اپنی جان کے خوف سے نہ صرف اپنے متعلق بلکہ اپنے گروپ کے متعلق بھی آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ آپ یقیناً ان کو بھی جالیں گے۔ DMI کو جب یہ پتہ چلے گا تو وہ مجھے یا تو مار ڈالیں گے اور یا اذیتیں دے کر بڑی لمبی مدت کیلئے جیل میں ڈال دیں گے۔ اگر آپ مجھے چھوڑ دیں تو واپس بھارت جانا تو میرے لئے ناممکن ہے۔ پاسپورٹ میرے پاس ہے نہیں کہ کسی دوسرے ملک چلی جاؤں۔ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آتا کہ ان حالات میں، میں کیا کر سکتی ہوں۔

اپنی دانست میں مالتی سے میں نے تمام ضروری معلومات حاصل کر لی تھیں میرا آخری سوال یہ تھا کہ کھٹمنڈو میں بھارتی سفارتخانے کا کون سا کارکن ان سے رابطہ کرتا ہے۔ مالتی نے بتایا کہ ابھی تک میجر باسو سے ہی رابطہ ہے لیکن وہ کرنل آنند سے بھی مل چکی ہے اور کیپٹن مان تو اس کے پیچھے ہی پڑ چکا ہے اور کئی بار کھلے بندوں اسے ڈنر اور LATE NIGHTS اکٹھے گزارنے کی دعوت دے چکا ہے۔ میں نے مریم کو دوسرے کمرے میں بلا کر کہا کہ مجھے چینی دوستوں کے ساتھ اس لڑکی کے ساتھیوں کی ''خیر خیریت'' دریافت کرنے جانا ہے۔ اس لئے فی الحال اس لڑکی کو بے ہوش کر کے تمہارے گھر میں ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ اب تک میں نے مالتی سے جو بھی گفتگو کی تھی۔ اس میں کہیں کہیں ایک آدھ انگریزی لفظ کے علاوہ باقی سب اردو میں تھی۔ یہاں میں داد دیتا ہوں مریم کے ظرف، اس کے مجھ پر بے حد اعتماد اور بھروسے کی۔ اسے ہماری گفتگو کا ایک لفظ تک سمجھ میں نہ آیا تھا۔ دوران گفتگو چینی دوستوں کو میں نے جو کہنا چاہا۔ مریم نے حرف بحرف چینیوں کو سمجھا دیا۔ اب میں نے مالتی کو اس کے گھر میں بے ہوش کر کے رکھنے کا کہا تو اس نے بغیر کوئی سوال پوچھے ALL RIGHT کہا۔ میں جانتا ہوں اور بہت سے قارئین بھی مجھ سے متفق ہوں گے کہ اگر پاکستان میں ایسی صورت حال پیش آ جاتی تو پہلے تو ''ہوم گورنمنٹ'' کے ہر معنی اور بے معنی سوال کو جو اسے مطمئن کرتا پھر اس پر تبصرے اور آخری فیصلہ بہر حال ''ہوم گورنمنٹ'' کے ہاتھ میں ہوتا لیکن آفرین ہے مریم پر کہ میرے کسی بھی کام یا عمل پر اس نے مجھ سے کبھی کوئی سوال نہیں پوچھا۔ کئی خطرناک کاموں میں بھی وہ میرے ہمراہ رہی اور اب ایک جاسوسہ کو اس کے گھر میں بے ہوش چھوڑ کر ہم جا رہے تھے تو اس نے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں کیا اور نہ ہی پوچھا کہ اردو میں مالتی سے میری کیا باتیں ہوئی تھیں۔ اس کی یہی ادا اور ذہنی ہم آہنگی نے ہی ہمیں ایک دوسرے کے اتنے قریب کر دیا تھا۔

مریم نے چینی دوستوں کو کہا۔ ایک نے ملتی کے سر پر ریوالور کے دستے سے ضرب پہنچا کر اسے بے ہوش کر دیا۔ میرے کہنے پر اس نے دو ضربات اور پہنچائیں اور اسے اسٹور میں رکھ کر گئے۔ میں نے مریم سے کہا کہ ہماری واپسی تک ہر پندرہ منٹ بعد وہ مالتی کو جا کر دیکھے اور اگر اس کے ہوش میں آنے کے آثار دکھائی دیں تو سر پر ضرب پہنچا کر پھر بے ہوش کر دے۔ میں نے مریم کو یہ بھی کہا کہ ہماری واپسی تک وہ اپنے والدین کے ہمراہ اپنے بیڈ روم میں رہیں اور گھنٹی بجنے پر دروازہ ہرگز نہ کھولیں۔ مریم کے پاس میرے دیئے ہوئے کئی ریوالور تھے۔ میں نے اسے کہا کہ ایک ریوالور لوڈ کر کے اپنے پاس رکھے اور اگر کوئی دروازہ توڑنے کی کوشش کرے تو بلا دریغ اسے گولی مار دے۔ مریم کے گھر کا کمپاؤنڈ خاصا وسیع تھا اور داخلے کے گیٹ پر NO TRESS PASSING لکھا ہوا تھا۔ بغیر اجازت حاصل کئے کمپاؤنڈ اور گھر تک آنے والوں پر گولی چلانا اس کا حق تھا۔ میں نے اسے کہا کہ واپسی پر میں تین بار وسل بجاؤں گا۔ تبھی تم دروازہ کھولنا۔ یہ ہدایات دے کر میں چینی ساتھیوں کے ہمراہ وین لے کر کشمیری مسجد کو چل دیا اب مجھے کوشلیا سے سامنا کرنا تھا وہ بھی کشمیری خاندان کے گھر میں ہی رہتی تھی۔

اس گھر کے سربراہ کا نام فصیح تھا۔ چینی دوست گھر کے باہر وین میں بیٹھے رہے۔ فصیح صاحب گھر میں نہیں تھے۔ میں نے گھر کی خواتین سے بات کرنے سے پہلے ان کے گورکھا چوکیدار سے پوچھا کہ دو مہمان خواتین کہاں رہتی ہیں۔ اسی گھر کا ایک بچہ جو ہماری بات سن رہا تھا، کہنے لگا ''اس طرف مہمان خانے کے دو کمروں میں'' میں نے بچے کو کہا مجھے سعیدہ بیگم سے بہت ضروری ملنا ہے۔ تم میرے ساتھ چل کر ان کا دروازہ کھلوا دو۔ بچے نے میرے ساتھ مہمان خانے کے ایک کمرے کے دروازے کو کھٹکھٹایا اور بولا ''آنٹی دروازہ کھولئے کوئی ملنے آیا ہے'' میں نے بچے کے کان میں کہا ''کہو امی اور ان کی ایک سہیلی ملنے آئی ہے''۔ بچے نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے یہ بات دہرا دی۔ کمرے کا دروازہ کھلا۔ میں نے پسٹل جیکٹ کی جیب میں رکھا ہوا تھا۔ کوشلیا مجھے دیکھتے ہی پیچھے ہٹی اور دروازہ بند کرنے لگی۔ میں نے زور سے دھکا دے کر دروازہ کھولا اور اسے زد میں لے کر کہا ''کوشلیا، اپنا بہروپ اب ختم کرو اور خاموشی سے میرے ساتھ چل پڑو۔ ورنہ گولیوں سے تمہیں چھلنی کر دوں گا۔ سمجھداری کا ثبوت دو اور مت بھولو کہ جب میں یہاں تک پہنچ چکا ہوں تو خالی ہاتھ واپس نہ جاؤں گا۔

(جاری ہے)

غازی

چاہے مجھے تمہاری لاش ہی لے جانی پڑے۔ کوشلیا نے اپنی شال اس حالت میں اٹھائی کہ میرے پسٹل کی نال اس کی کمر کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اسی حالت میں اس نے برقعہ پہنا اور کمرے سے باہر میرے ساتھ اس طرح آئی کہ نال اس کی کمر سے بدستور لگی ہوئی تھی۔ آخر کوشش کے طور پر اس نے برقعے کا نقاب اٹھایا تا کہ چوکیدار کو اشاروں سے کچھ سمجھا سکے۔ میں نے پسٹل کی نال کا دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”نقاب فوراً گرا دو ورنہ.....“ کوشلیا نے نقاب گرا دیا۔ وین میں اسے میں نے دونوں چینی ساتھیوں کے درمیان بٹھایا اور تیزی سے وین چلا کر مریم کے گھر کی طرف روانہ ہوا جہاں وہ ایک بے ہوش جاسوسہ کی نگرانی کر رہی تھی اور اب اسے دو کی نگرانی کرنی تھی۔

کوشلیا کو ہمراہ لئے ہم مریم کے گھر پہنچے۔ تین مرتبہ وسل بجانے پر مریم نے گھر کا دروازہ کھولا۔ وہ ہاتھ میں ریوالور لئے گھر کے کمپاؤنڈ میں کھلنے والی کھڑکی کے قریب بیٹھی کمپاؤنڈ کا جائزہ لے رہی تھی۔ ہم کوشلیا کو لئے ہوئے گھر میں داخل ہوئے اور اسے بھی اس کمرے میں لے گئے جہاں مالتی ابھی تک بے ہوش پڑی تھی۔ کوشلیا نے مالتی کو اس حالت میں دیکھا تو اس کی رہی سہی مدافعت ختم ہو گئی اور وہ جاسوسی کے سیکھے ہوئے سارے داؤ پیچ بھول گئی۔ اس نے بولنا چاہا لیکن میرے چینی دوستوں نے میرے اشارے پر اسے اس کی مہلت نہ دی۔ انہوں نے ریوالور کے دستے کی ضربوں سے اسے بھی بے ہوش کر دیا اور اس کے ہاتھوں پاؤں باندھ کر منہ میں کپڑا ڈال دیا۔ میں نے مریم کو بتایا کہ اب ہم گروپ لیڈر کے پیچھے جا رہے ہیں اور ہماری واپسی تک وہ پہلے کی طرح ان کی نگرانی اور اپنی اور والدین کی حفاظت کرے۔ میں چلنے سے پہلے مالتی کو پھر سر پر ضربیں لگا کر مزید دو تین گھنٹے کیلئے اس کے ہوش میں نہ آنے کی طرف سے مطمئن ہو گیا۔ اب ہماری منزل چمن لال کا گھر تھا۔ ہم ابھی آدھے راستے تک ہی پہنچے تھے کہ میں نے گاڑی روکی اور واپس مریم کے گھر کی طرف چل پڑا۔ ذہنی طور پر میں بہت پریشان تھا اپنے لئے نہیں بلکہ مریم کیلئے۔ اس کے گھر میں دو بے ہوش جاسوس عورتیں پڑی تھیں جو DMI اور بھارتی سفارت خانے کی کاوشوں کا شاہکار تھیں۔ مالتی کے مریم کے گھر سے بروقت نہ نکلنے اور کوشلیا کے اغوا کی خبر اگر بھارتی سفارت خانے کو ابھی تک نہیں ملی تھی تو بہت جلد ہی ملنے والی تھی۔ سفارت خانے نے یہ خبر سن کر خاموش نہیں بیٹھنا تھا۔ مجھے ان کی طرف سے فوری ردعمل کا یقین تھا۔ مالتی کی نگرانی اور حفاظت کرنے والوں نے مالتی کے مریم کے گھر سے واپس نہ آنے اور کوشلیا کو وہاں لے جانے کی رپورٹ فوراً سفارت خانے میں پہنچائی ہو گی اور اب اصولی طور پر مریم کا گھر ان کے ردعمل کا ٹارگٹ ہونا چاہئے تھا۔ اکیلی مریم ان کا کیا اور کتنی دیر مقابلہ کر سکتی تھی۔ اسی سوچ کے تحت میں نے وین واپس موڑی تھی۔ جب ہم مریم کے گھر پہنچے تو گھر کے باہر کوئی غیر معمولی آثار دکھائی نہ دیئے۔ میں نے موقع کو غنیمت جانا اور چینی دوستوں کو کہا کہ فوری طور پر دونوں عورتوں کو گاڑی کے فرش پر ڈال دیں۔ جب وہ اس کام سے فارغ ہوئے تو میں نے انہیں کہا ”گیس“ اور ہاتھ کے اشارے سے سمجھایا کہ ختم کر دو۔ مریم ابھی گھر کے اندر تھی میں نے اسے بلایا اور کہا کہ چینی دوستوں کو کہے کہ چین کے بارڈر تک جانے والی سڑک پر کم از کم پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر انہیں اسی حالت میں ایسی کھائی میں پھینک دیں جہاں کسی کی نظر نہ پڑے۔ جب مریم نے انہیں میری بات سمجھا دی تو میں نے اسے واپس گھر کے اندر جانے کا کہا۔ وہ چلی گئی تو میں نے چینی دوستوں کو وین میں پیٹرول بھرے کین کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ پہلے گیس، پھر پیٹرول اور لائیٹر جلا کر دکھایا۔ وہ میرا مقصد سمجھ گئے اور وین لے کر تیزی سے چلے گئے۔ میں گھر کے اندر گیا اور مریم کو کہا کہ ایک گیس سلنڈر اور زہریلی سوئیوں والا ڈبہ لا کر مجھے دے۔ اور پھر میرے لئے کافی لائے۔ مطلوبہ چیزیں مجھے دے کر مریم کافی بنا کر لائی۔ میں کھڑکی کے ساتھ ہی بیٹھ گیا تھا تا کہ گھر کے باہر اگر کوئی خلاف معمول حرکت ہو تو اسے دیکھ سکوں۔ کافی پیتے ہوئے مریم نے مجھ سے صرف اتنا پوچھا کہ کیا پیٹرول کا ایک کین دونوں کیلئے کافی ہو گا۔ میں حیران تھا کہ اسے میرے ارادوں کا کیسے پتا چلا۔ کیونکہ میں نے اشاروں میں اور نہایت آہستہ آواز میں چینی دوستوں کو صرف دو تین لفظ کہے تھے اور مریم اس وقت گھر کے اندر تھی۔ میرے پوچھنے پر مریم نے بتایا کہ اس نے کھڑکی سے مجھے دوستوں کو اشاروں سے سمجھاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ مزید برآں اسے مجھ سے اس حماقت کی ہرگز توقع نہیں تھی کہ پاکستان کے دشمن جاسوسوں کو میں محض اس لئے زندہ چھوڑ دوں گا کہ وہ عورتیں تھیں۔ یقین جانیئے مریم نے مجھ سے اس دن کی ساری کارروائی، تفتیش اور ان عورتوں کو چینی دوستوں کے ساتھ بھیجنے کے متعلق کوئی سوال نہیں کیا۔ اگلے روز خود میں نے اسے تمام باتیں بتائیں۔ پاکستان کے دشمنوں کو وہ اپنا دشمن اور دوستوں کو اپنا دوست سمجھتی تھی۔

چار ساڑھے چار گھنٹے کے بعد چینی دوست واپس آئے۔ تھکن سے ان کا برا حال ہو رہا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ تمام کام خوش اسلوبی سے مکمل کر کے واپس آئے ہیں مجھے مالتی اور کوشلیا کے اس انجام پر افسوس ہو رہا تھا۔ لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ پاکستان دشمنی میں وہ خود اس آگ میں کودی تھیں۔ میرے لئے دشمن ملک کے جاسوس چاہے مرد ہوں یا عورتیں، یکساں برابر تھے۔ وہ تو رہے ایک طرف، اپنے وطن کیلئے میں تو اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کو بھی تیار تھا۔ مریم نے چینی دوستوں کو کھانا کھلایا۔ میں نے مریم کے ذریعے انہیں کہا کہ اب حالات اس نہج پر پہنچ چکے ہیں جہاں ہمیں 24 گھنٹے مستعد ہوشیار اور چوکس رہنا پڑے گا۔ اس لئے ابھی سے ان تینوں کی ایک روز چھٹی اور ریسٹ ختم۔ اس لئے ان میں سے ایک جائے اور اپنے تیسرے ساتھی کو پوری طرح سے مسلح کر کے لے آئے میں نے مریم کو کہا کہ حالات کی نزاکت کے پیش نظر وہ اپنے والدین کے ہمراہ اپنا ضروری سامان اور کپڑے وغیرہ لے کر فوراً انا پورنا ہوٹل میں شفٹ کرے۔ اور جب تک حالات نارمل نہیں ہو جاتے، وہ ہوٹل میں ہی قیام کریں۔ مجھے اپنے مشن کی تکمیل کے علاوہ ان کی حفاظت بھی کرنی تھی اور یہ ضروری ہو چکا تھا کہ ہم سب اکھٹے رہیں۔ میں نے وہیں سے فون پر ہوٹل میں اپنے فلور پر دو کمرے مریم اور اس کے والدین کیلئے فوری بک کرنے اور ایک ایکسٹرا بیڈ چینی دوستوں کے کمرے میں تیسرے چینی دوست کیلئے لگوانے کا انتظام کیا۔ جتنی دیر میں چینی دوست اپنے تیسرے ساتھی کو لے کر آیا۔ مریم اور اس کے والدین نے اپنی تیاری مکمل کر لی تھی۔ مریم کے والدین کو پورا یقین تھا کہ ان حالات میں انہیں ہوٹل شفٹ کرنے کا میرا مشورہ ان کی سلامتی اور خیر خواہی کیلئے تھا۔ ویسے بھی وہ مریم کی کسی بات پر نہ تو اعتراض کرتے تھے اور نہ ہی بڑبڑاتے تھے۔ کیونکہ مریم ان کی وارث تھی اور کوئی نا سمجھ بچی بھی نہیں تھی۔ مجھ پر بھی انہیں پورا بھروسہ اور یقین تھا۔ شام کے 6 بجے تک سب ہوٹل شفٹ ہو چکے تھے۔ مریم نے کہا کہ اگر میں اجازت دوں تو وہ ہر روز صبح گھر جا کر اپنے والدین کیلئے چائنیز کھانے بنوا کر لے آیا کرے۔ میں نے اسے دو چینی دوستوں کے ہمراہ جا کر کھانا لانے کی اجازت دی۔ شام ساڑھے چھ بجے میں دو چینی دوستوں کے ساتھ چمن لال سے ملنے روانہ ہو گیا۔ آج کے دن کے واقعات کے بعد مجھے احساس ہو رہا تھا کہ یا تو چمن لال نے وہ گھر چھوڑ دیا ہو گیا ورنہ اس کی حفاظت کیلئے سفارت خانے کے گارڈز ضرور موجود ہوں گے۔

چمن لال کے گھر سے قدرے فاصلے پر میں نے وین ایک ایسی بلڈنگ کی پارکنگ میں کھڑی کر دی۔ (جاری ہے)

غازی

وہاں پہلے ہی کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ سورج کبھی کا غروب ہو چکا تھا اور اسٹریٹ لائٹیں جل رہی تھیں۔ ہم اس بلڈنگ کے بالکل سامنے پہنچ گئے جس کی دوسری منزل پر وجے کمار کے فلیٹ میں چمن لال رہتا تھا۔ نیچے ایک رکشہ کھڑا تھا۔ میں اس بلڈنگ میں اوپر جانے سے کچھ گھبراتا تھا جب وجے کمار کو ہم نے ہلاک کیا تھا تو بھاگ دوڑ میں شور شرابے کی وجہ سے کئی فلیٹوں کے دروازے کھلے اور بند ہوئے تھے۔ یقیناً وہاں رہنے والے کچھ لوگوں نے ہمیں دیکھا ہوگا۔ اب پھر اسی فلیٹ میں ہم اسی مقصد کیلئے جا رہے تھے ہمیں یہ بھی علم نہ تھا کہ وہ فلیٹ میں موجود ہوگا بھی یا نہیں اور اگر وہ فلیٹ میں ہوا بھی تو کیا اکیلا ہوگا یا اس کی حفاظت کیلئے کوئی گارڈ بھی ہوگا اس شش و پنج میں چند منٹ گزارنے کے بعد بالآخر میں نے فلیٹ میں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اکا دکا لوگ سڑک پر آ جا رہے تھے۔ رکشے والے کو وہاں سے ہٹانے کیلئے میں نے اس سے پوچھا کہ کیا رکشہ خالی ہے۔ اس نے بتایا کہ اس کی سواری اوپر گئی ہے اور اسے واپس لے کر جانا ہے اس سے مایوس ہو کر ہم نے سیڑھیاں چڑھنی شروع کیں۔ ابھی ہم پہلی اور دوسری منزل کے درمیان میں ہی تھے کہ ایک آدمی ایک بڑا سوٹ کیس اٹھائے اوپر سے نیچے آتا دکھائی دیا۔ سیڑھیاں لکڑی کی بنی ہوئی تھیں اور تنگ تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ بالکل ہمارے سامنے آ گیا تو سوٹ کیس سمیت اس کے نیچے اترنے میں ہم رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ اسے راستہ دینے کیلئے میں نے سوچا کہ ہم پہلی منزل تک واپس چلے جاتے ہیں۔ اس کی سفید داڑھی، سفید لمبے بال، سر پر جناح کیپ، پاجامہ، قمیص اور کوٹ سے میں اسے ایک بوڑھا مسلمان سمجھا۔ میرے پیچھے میرے چینی دوست تھے۔ نیچے اترنے کیلئے میں مڑنے ہی والا تھا کہ وہ بوڑھا پلٹا اور سوٹ کیس سمیت دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر کو بھاگا۔ اس کی عمر اور یہ طاقت و پھرتی میرے لئے عجوبہ تھی۔ بجلی کی طرح ایک خیال میرے دماغ میں کوندا اور میں تیزی سے اس کے پیچھے لپکا۔ میری زخمی ٹانگ اور اسی ٹانگ کے گھٹنے میں درد کی لہر دوڑ گی لیکن اس درد سے بے پروا میں نے دوسری منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی اسے جا لیا اور اسے ٹانگ سے پکڑ لیا وہ سیڑھیوں پر منہ کے بل گرا اور میرے کھینچنے کی وجہ سے دو تین سیڑھیاں نیچے کھنچا چلا آیا۔ سوٹ کیس اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ اس نے سیدھا ہو کر مجھے اپنے پاؤں سے پیچھے دھکیلنا چاہا۔ اسی اثنا میں، میں نے اس کی دوسری ٹانگ بھی پکڑ لی۔ سیڑھیوں پر اوندھے منہ گھسٹنے کی وجہ سے اس کی آدھی داڑھی چہرے سے اتر چکی تھی۔ اس کی ٹانگیں پکڑے ہوئے ہی میں نے خود کو اٹھایا اور آگے ہو کر اس پر اس طرح لیٹ گیا کہ میرا چہرہ اس کے چہرے کے بالکل سامنے آ گیا۔ چینی دوست میرے پیچھے تھے۔ میں نے چلا کر کہا ''گیس'' اور اپنے نیچے پڑے ''بوڑھے'' یعنی چمن لال کے دونوں بازو پھیلا کر اس طرح پکڑ لئے کہ اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں میری انگلیوں میں جکڑی ہوئی تھیں۔ میرے چینی دوستوں میں سے ایک ہمیں پھلانگتا ہوا چمن لال کے چہرے کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے چینی زبان میں میرے پیچھے کھڑے دوسرے ساتھی کو کچھ کہا۔ میرے پیچھے کھڑے ساتھی نے اپنے رومال سے میرے منہ اور ناک کو سختی سے بند کر دیا دوسرے ساتھی نے اپنے منہ اور ناک کو اپنے رومال سے ڈھانپا اور گیس چمن لال کے نتھنوں میں چھوڑ دی۔ یہ سارا عمل پانچ چھ سیکنڈ میں ہوا۔ میں نے اپنا سانس روک لیا تھا۔ گیس چمن لال کے نتھنوں میں گئی تو وہ پھڑ پھڑایا۔ میرا منہ ناک بند کرنے والے ساتھی نے مجھے کھینچا اور چار پانچ سیڑھیاں نیچے لا کر میرے منہ سے رومال ہٹا لیا۔ گیس چھوڑنے والا چینی دو تین سیڑھیاں اوپر چلا گیا تھا چینی دوستوں نے یہ سارا عمل مجھے اور خود کو گیس کے اثرات سے بچانے کیلئے کیا تھا۔ چمن لال سے ہماری مڈبھیڑ بالکل اتفاقیہ اور خلاف توقع تھی۔ اس نے اتنا اچھا گیٹ اپ کیا ہوا تھا کہ اگر وہ مجھے دیکھتے ہی اوپر نہ بھاگتا تو میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آتی کہ یہ ''بوڑھا مسلمان'' ہی چمن لال ہے۔ وہ مجھے جل دینے میں پوری طرح کامیاب ہو چکا تھا اور محض اپنی بدحواسی کی وجہ سے یہاں مارا گیا۔ یہاں میں یہ اعتراف بھی کرنا چاہتا ہوں کہ گومگو کی حالت میں بغیر سو فیصد یقین کے کسی کی جان لینے کا تین چار سیکنڈ میں فیصلہ کرنے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ اگر وہ چمن لال نہ ہوتا تو اس خون ناحق پر میں زندگی بھر کف افسوس ملتا رہتا۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ میرے یقین کامل میں اور پختگی آ گئی کہ موت کا وقت اور جگہ پہلے سے مقرر ہے اور یہ سب رب ذوالجلال نے طے کر رکھا ہے اگر ہمارے اور چمن لال کے ٹائمنگ میں صرف دو منٹ کا بھی فرق ہوتا تو وہ بڑی آسانی سے فرار ہو سکتا تھا لیکن اس کی موت اس بلڈنگ کی سیڑھیوں پر عین اس وقت لکھی ہوئی تھی جسے دنیا کی کوئی طاقت بدل نہیں سکتی تھی۔

میں نے چمن لال کے چہرے پر لگی آدھی داڑھی کو بھی اتار دیا۔ میرے ساتھیوں نے اسے کھڑا کیا اور دونوں طرف سے اپنے بازوؤں کے سہارے اسے لے کر سیڑھیاں اترنی شروع کیں۔ اس کا سوٹ کیس اٹھائے میں آگے آگے تھا ہم سڑک پر پہنچے تو چینی دوست سڑک کے کنارے نسبتاً اندھیری جگہ پر کھڑے ہو گئے، میں نے رکشہ والے کو دس روپے دیئے اور کہا کہ اس کی سواری بیمار ہے اور ہم اسے ڈاکٹر کے پاس لے جا رہے ہیں۔ رکشہ والا چلا گیا تو میں جلدی سے وین لے کر دوستوں کے پاس آیا۔ پچھلی سیٹ پر چمن لال کی لاش کو درمیان میں بٹھا کر دونوں دوست اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ میں نے سوٹ کیس گاڑی میں رکھا ایک پیٹرول پمپ سے میں نے وین میں پیٹرول ڈلوایا اور خالی کین بھی بھروا لیا۔ اس دوران چینی دوستوں نے اس کی جیبوں کی مکمل تلاشی لی۔ گھڑی اتاری اور اس کی جیبوں سے نکلنے والا سامان ایک رومال میں باندھ لیا اب ہماری منزل وہی جگہ تھی جہاں دونوں جاسوس عورتوں کی لاشوں کو جلایا گیا تھا۔ چمن لال کی لاش کو بھی ان کی جلی ہوئی اور ناقابل شناخت لاشوں کے ساتھ رکھ کر اور کین کا سارا پیٹرول اس پر ڈال کر ہم کھائی سے اوپر سڑک پر آ گئے اور جب تک آگ بجھ نہ گئی ہم وہیں موجود رہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان کی لاشوں کو جلا کر ہم نے اتنا تو کیا کہ ان کا انتم سنسکار (آخری رسوم) ان کے مذہب کے مطابق کیا واپسی پر ہم کشمیری خاندان کے سربراہ فصیح کے گھر گئے۔ فصیح صاحب سے ملاقات ہوئی میں نے انہیں بتایا کہ ان کی مہمان دونوں خواتین مسلمان نہیں بلکہ بھارتی ہندو جاسوسہ تھیں اور اب وہ کبھی واپس نہیں آئیں گی ان کیلئے بھی یہ بہتر رہے گا کہ اس معاملے میں بالکل خاموشی اختیار رکھیں اور مجھے ان دونوں کے کمروں کی تلاشی لینے دیں۔ فصیح صاحب پہلے تو نہیں مانے لیکن جب میں نے انہیں یہ دھمکی دی کہ میری بات نہ ماننے سے انہیں اور ان کے خاندان کو جانی نقصان پہنچ سکتا ہے اور مجھے بہر حال ان کمروں کی ابھی تلاشی لینی ہے تو وہ خاموشی سے میرے ساتھ رہے۔ مہمان خانے کی ڈپلیکیٹ چابیاں انہوں نے گھر سے منگوا لی تھیں۔ دونوں کے کمروں سے ہمیں ان کے ذاتی سامان کے علاوہ ایک چھوٹا پسٹل اور سینکڑوں گولیاں، پاکستان میں ان کے ٹارگٹ بننے والے اعلیٰ افسران کی لسٹیں اور ان کی تصاویر، پاکستان میں اپنے بہی خواہوں کے مکمل پتے اور شناختی کوڈ، لائیٹر کے سائز کے کیمرے، پاکٹ سائز ٹیپ ریکارڈ (جو یقیناً پاکستانی افسران کو بلیک میل کرنے کیلئے استعمال ہونے تھے) ملے۔ سب سے اہم اور خطرناک وہ مصنوعی لمبے ناخن تھے جو اونچی سوسائٹی کی خواتین استعمال کرتی ہیں اس وقت تو ہم نے یہ سب سامان انہی کے ایک سوٹ کیس میں ڈالا اور فصیح صاحب کو دھمکی آمیز یہ تنبیہ کر کے آ گئے کہ اگر ان عورتوں کے متعلق کوئی بھی پوچھے تو صرف یہ بتائیں کہ معمول کے مطابق وہ دونوں باہر گئی تھیں اور واپس نہیں لوٹیں۔ وہ سوٹ کیس میرے دوستوں نے گاڑی میں رکھا۔

(جاری ہے)

غازی

چلتے وقت میں نے فصیح کو ایک بار پھر تنبیہ کی اور کہا '' اس وقت تک ان عورتوں کی حقیقت کو صرف ہم جانتے ہیں یا تم ۔ اگر یہ بات کسی تیسرے تک پہنچی تو وہ یقیناً تمہاری طرف سے لیک (LEAK) ہوئی ہو گی ۔ اگر ایسی صورت پیش آئی تو اپنے اور اپنے اہل خانہ کیلئے قبریں پہلے ہی کھدوا لینا ۔ میرے متعلق تم بخوبی جانتے ہو گے کہ اپنے وطن کے دشمنوں کو ختم کرنے میں مجھے ذرا بھی ججھک محسوس نہیں ہوتی ۔ دو تین روز کے بعد ان کمروں کا سامان اٹھوا کر اپنے گودام میں رکھوا لینا ۔ اگر بھارتی سفارت خانے والے ان عورتوں کا پوچھنے آئیں تو صرف وہی بیان کرنا جو میں نے تمہیں بتایا ہے اگر وہ سامان مانگیں تو اپنے بچاؤ کیلئے یہ کہنا کہ یہ سامان مسلمان مہاجر خواتین کا ہے اس لئے صرف انہی کو اور اگر وہ چند روز مزید نہ آئیں تو پاکستانی سفارت خانے کو بھجوا دیا جائے گا ۔ اگر وہ دھمکی دیں تو پولیس کو بلوا لینا '' ۔ فصیح کاروباری کشمیری تھا ۔ میری باتیں سن کر وہ ڈر گیا اور میرے کہے پر حرف بحرف عمل کرنے کا وعدہ کیا ۔ ہم نے ایک دن میں ہی سارا مشن مکمل کر لیا تھا ۔ میں بڑے اطمینان قلب کے ساتھ اپنے ہوٹل روانہ ہوا ۔ اب ہمیں صرف بھارتی سفارت خانے کے ردعمل کا انتظار تھا اور اپنے حفاظتی انتظام کو اور مضبوط کرنا تھا ۔

ہمیں ہوٹل واپس پہنچتے پہنچتے خاصی دیر ہو گئی، مریم بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی ۔ میں نے دونوں سوٹ کیس اپنے کمرے میں رکھوائے ۔ مریم نے ڈرتے ڈرتے مجھے بتایا کہ شام کو وہ پھر چینی دوست کے ساتھ ریسٹورنٹ گئی تھی اور ہم سب کیلئے کھانا لے کر آئی ہے ۔ اس نے ریسٹورنٹ کے باہر یہ بورڈ بھی لگوا دیا کہ ریسٹورنٹ چند روز کیلئے بند رہے گا ۔ اس نے ریسٹورنٹ کے چوکیدار کے ذریعے مزید تین نیپالی چوکیدار بھی بلوائے تھے جو کل صبح انٹرویو کیلئے ہوٹل میں آئیں گے ۔ کھانے کے بعد میں نے مریم کو بتایا کہ چمن لال کو بھی ٹھکانے لگا دیا گیا ہے ۔ میں نے اسے اپنی ٹانگ کے زخم اور گھٹنے کے درد کے متعلق بھی بتایا ۔ وہ فوراً اپنے کمرے سے بام لے آئی اور میری ٹانگ پر لگا کر آہستہ آہستہ مساج کرنے لگی ۔ میں سارے دن کا تھکا ہوا تھا ۔ درد بھی ختم ہو گیا اور بہت جلد ہی میں سو گیا ۔

اگلے روز ناشتے سے فارغ ہو کر دونوں چینی ساتھیوں کی موجودگی میں ہم نے سوٹ کیس کھولے ۔ چمن کے سوٹ کیس میں سے اس کے کپڑوں کے علاوہ ٹرانسمیٹر کی کوڈ اور ڈی کوڈ کی کتاب، پسٹل، گولیاں، اسلام آباد میں بھارتی سفارت خانے میں اس سے CONTACT (رابطہ) کرنے والوں کے نام، بھارت سے ڈاک لانے اور لے جانے والے کے ساتھ پہلی میٹنگ کی جگہ دن اور وقت اور پاکستان میں بھارت کے ان ہمدردوں کے نام جن سے بوقت ضرورت ہر قسم کی مدد لی جا سکتی تھی، پاکستان کے حساس مقامات کی تصویریں، نقشے غرضیکہ جاسوسی کیلئے تمام ضروری اطلاعات موجود تھیں ۔ دو بہت چھوٹے کیمرے اور ٹیپ ریکارڈر بھی تھے ۔ سوٹ کیس میں سامان رکھتے وقت مجھ سے وہ ڈبے کھل نہ سکے تھے اس لئے انہیں بھی سوٹ کیس میں رکھ لیا تھا ۔ اب غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ڈبے نچلے حصے میں بنے ایک پیچیدہ میکنزم سے کھلتے تھے ۔ ڈبے کھولے تو دونوں میں خواتین کے بطور فیشن لگانے کے مصنوعی ناخن کے تین تین سیٹ تھے ۔ مختلف رنگوں کی نیل پالش اور تین تین ایسی شیشیاں تھیں جو شاید نیل پالش اتارنے کے محلول کی تھیں ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ پوٹاشیم سائینیڈ کا محلول تھا جو انہی ڈبوں میں موجود بہت چھوٹی سرنجوں کے ساتھ ان ناخنوں میں ڈالا جاتا تھا ۔ یہ شیشیاں سیل (SEAL) تھیں ۔ مصنوعی ناخنوں کے ہر سیٹ میں پانچ کے بجائے سات ناخن تھے ۔ ہر سیٹ کے پانچ ناخن ایک لائن میں اور دو ناخن علیحدہ الاسٹک سے مضبوط اور رنگین گتے کے ٹکڑوں سے لگے ہوئے تھے ۔

(جاری ہے)

غازی

میں حیران تھا کہ ہر سیٹ میں 5 کے بجائے 7 ناخن کیوں ہیں۔ پھر خیال آیا کہ دو فالتو ناخن شائد اس لئے ہیں کہ اگر کوئی ناخن ٹوٹ جائے تو اس کی جگہ استعمال ہو سکے۔ یہ سارے ناخن لمبے اور نوکدار تھے۔ میں نے یونہی فالتو ناخنوں میں سے ایک نکالا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اچانک ایک چینی دوست چلایا۔ ''نو۔نو''۔ اور مجھے اشارے سے کہا کہ ناخن فوراً رکھ دو۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ بہر حال میں نے ناخن رکھ دیا۔ چینی دوست نے اپنے رومال سے وہ ناخن اٹھایا، اسے اچھی طرح سے دیکھا اور سہمی ہوئی آواز میں مریم سے کچھ کہنے لگا۔ اس کی بات سن کر مریم بھی گھبرا گئی۔ میرے دونوں ہاتھ اور انگلیاں دیکھ کر اپنی تسلی کی۔ اور کہنے لگی کہ دونوں فالتو ناخنوں میں سائنیڈ کا محلول بھرا ہوا ہے۔ میں نے رومال سے ناخن پکڑ کر دیکھا تو اس کی تیز نوک میں بہت چھوٹا سا سوراخ تھا اور نوک کا سوراخ بھی اسی طرح باریک اور محسوس نہ ہونے والی تہوں سے بنا ہوا تھا۔ ناخن کے پچھلے حصے میں سوئی سے نکالے جانے والا ایک بہت چھوٹا کارک لگا تھا اور نوک کا سوراخ بھی اسی طرح کے ایک کارک سے بند تھا۔ یہ ناخن لگانے والی جب چاہتی، ناخن کے نوکیلے سرے پر لگے کارک کو ہٹا کر کسی کے جسم پر ناخن سے ذرا سے کھروچ ڈال کر سائنیڈ جسم میں داخل کر کے اسے ہلاک کر سکتی تھی۔ یہ جاسوس عورتیں اگر پاکستان پہنچ جاتیں تو اپنے ٹارگٹس اور خصوصاً عیاش افسران کو بڑی آسانی سے ہلاک کر سکتی تھیں۔ میری نگاہوں میں وہ پورا منظر گھوم گیا کہ کس طرح اور کیسے وقت وہ اپنے شکار کو نشانہ بناتیں۔ آج بھی میں جب پاکستان کے شہروں کے پوش علاقوں، خصوصاً LOUD میک اپ، ٹائٹ لباس اور لمبے ناخنوں کے ساتھ دعوت گناہ دینے کی ادائیں دکھاتی ملکی اور غیر ملکی عورتوں کو دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ ان میں کتنی بھارتی جاسوس سائنیڈ بھرے ناخنوں کے ساتھ اپنے مخصوص شکاروں کی تلاش میں ہوں گی۔ میں نے ایک چھوٹا کیمرہ، ٹیپ، ایک پسٹل اور خاصی گولیاں اپنے پاس رکھ کر ساری لسٹیں اور اور تمام سامان کا ایک مضبوط پیکٹ بنایا۔ اپنے اس ASSIGNED مشن کی کامیابی کی پوری تفصیل لکھی اور ان الفاظ پر ختم کی ALL THREE WERE FINALLY GIVEN A GOOD TREET سرخ پین سے انڈر لائن کر کے یہ پر زور درخواست بھی کی کہ اب مجھے فوری طور پر واپس آنے کی اجازت دی جائے۔ یہ سب میں نے دو روز بعد پاکستان جانے والی ڈاک میں بھیجنا تھا۔ آج ہی مہاجروں کی فلائٹ کو بھی پاکستان جانا تھا۔ حالات کی نزاکت کے پیش نظر میں مریم کو اپنے ہمراہ نہیں لے گیا اور دو چینی دوست ہوٹل میں چھوڑ کر تیسرے کے ہمراہ ایئر پورٹ چلا گیا اور حسب معمول مہاجر خاندانوں کو رخصت کیا۔ بعد دوپہر میری واپسی ہوئی۔

شام کے پانچ بجے کرنل آنند مجھ سے ملنے آیا۔ آج وہ اکیلا تھا اس کا چہرہ اترا ہوا اور سوگوار تھا اور پریشانی صاف جھلک رہی تھی۔ کافی شاپ میں رسمی جملوں کے بعد وہ سیدھا مطلب کی بات پر آ گیا۔ ''آصف صاحب۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہم ہار گئے اور جیت آپ کی رہی'' کرنل نے سر جھکائے یہ الفاظ کہے۔ گو کہ میں اس کا مطلب اچھی طرح سے سمجھ گیا تھا لیکن انجان بنتے ہوئے میں نے پوچھا ''کرنل صاحب کونسی جیت اور کیسی ہار۔ میں ریڈیو بھی بہت کم سنتا ہوں اور اخبار بھی کبھی کبھار پڑھتا ہوں۔ کیا ہمارے ملکوں کے درمیان کوئی کرکٹ یا ہاکی کا میچ ہو رہا تھا جس کی آپ بات کر رہے ہیں'' کرنل کچھ دیر اپنی بجھی بجھی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا اور پھر بولا ''آپ کا حق ہے کہ آپ مذاق اڑائیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں بڑی مشکل میں پھنس چکا ہوں'' میں نے سنجیدہ لہجہ بنا کر پوچھا ''آخر بتائیں تو کیا مشکل آن پڑی ہے اور میں کیسے آپ کی مدد کر سکتا ہوں'' کرنل آنند نے بڑے ندامت آمیز لہجے میں کہا ''آپ سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن رہے ہیں'' فی الحقیقت کرنل آنند اس وقت بڑی مشکل میں پھنسا تھا۔ مسلمان مہاجروں کے بھیس میں تین اعلیٰ تربیت یافتہ جاسوس جنہوں نے ایک لمبے عرصے کیلئے پاکستان جا کر کارنامے سرانجام دینے تھے، کل رات سے غائب تھے۔ انہیں نامعلوم زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا تھا۔ کھٹمنڈو میں میرے سوا انہیں کوئی دوسرا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جس نے انہیں غائب کیا ہو۔ کرنل آنند یقیناً انہی کے بارے میں مجھ سے پوچھنے آیا تھا لیکن شرم اور ندامت سے اس کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ وہ مجھے یہ کیسے بتاتا کہ جبیں، سعیدہ اور جمشید پاکستانی مہاجر نہیں بلکہ مالتی، کوشلیا اور چمن لال تھے اور DMI کے قابل فخر جاسوس اور برسوں کی ٹریننگ کے بعد پاکستان جا رہے تھے کہ راستے میں ہی غائب ہو گئے۔ میں نے کہا ''کرنل آنند، کھل کر اور صاف بات کیجئے۔ میرے الفاظ تھے "COL.ANAND PLEASE BE CLEAR AND COME TO THE BOTTOM LINE"

کرنل آنند نے بہت ہی مجبور ہو کر کہا ''مالتی، کوشلیا اور چمن لال کل سے غائب ہیں اور ان کا کوئی سراغ نہیں مل رہا''۔ ''لیکن میں ان میں سے کسی کو نہیں جانتا'' میں نے جواب دیا منگیتر کی ٹیوٹر تو جبیں تھی اور کل بھی وہ اسے ٹیوشن دینے آئی تھی'' میں نے جواب دیا۔ کرنل آنند پھر خاموش ہو گیا۔ آخر وہ بھی بھارتی فوج کا کرنل اور ملٹری اتاچی تھا اور میرے سامنے اپنی گھناؤنی سازش کے پردے اٹھاتے ہوئے خفت محسوس کر رہا تھا۔ ''چلئے آپ کی بات مان لیتے ہیں۔ جبیں، سعیدہ اور جمشید کل سے MISSING ہیں'' کرنل نے سر جھکائے کہا۔ یقین جانئے۔ آنند کی یہ حالت دیکھ کر مجھے روحانی خوشی ہو رہی تھی۔ اپنی بساط کے مطابق میں نے 71ء کی شکست کے بدلے سن 72ء میں ہی لینے شروع کر دیئے تھے اور آج اسی بدلے کا ایک سین میرے سامنے تھا۔ ''کرنل آنند میں ابھی بھی کچھ نہیں سمجھا۔ میری منگیتر نے مجھے بتایا تھا کہ جبیں ایک مسلمان مہاجر لڑکی ہے جو اپنی بیوہ ماں کے ساتھ پاکستان جانے کے لئے کھٹمنڈو آئی ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ایک مسلمان مہاجر لڑکی سے آپ کا کیا واسطہ ہے۔ کیا اتنی مصیبتیں اٹھانے کے بعد آپ اس یتیم لڑکی اور اس کی بیوہ ماں کو سکون سے پاکستان جانے سے بھی روکنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ میں ضمیر نام کی کوئی چیز ہے بھی یا نہیں'' میں کرنل پر برس پڑا۔ اور کرنل کا یہ حال تھا کہ اس کی گردن جھکتی ہی جا رہی تھی۔

میں کرنل آنند کو نہ تو یہ بتانا چاہتا تھا کہ تینوں بھارتی جاسوسوں کو میں نے ہلاک کیا ہے یا میں ان کے متعلق کچھ جانتا ہوں اور نہ ہی اسے ان کی طرف سے بالکل مایوس کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ ایسی صورت میں بھارتی سفارت خانہ اپنے پورے وسائل کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوتا۔ اب تک کھٹمنڈو میں تمام جارحانہ اقدام میں نے ہی کئے تھے۔ اللہ پاک کی رحمت پر یقین کامل کے علاوہ میرے مادی وسائل صرف تین چینی دوست تھے اور اب حالات ایسے نازک موڑ پر آ پہنچے تھے جہاں مجھے اپنے علاوہ مریم اور اس کے والدین کی حفاظت بھی کرنی تھی۔ ان حالات میں ان بھارتیوں سے میرا مزید الجھنا ہم سب کے لئے بہت خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ کرنل آنند کو میں امید و بیم کی کیفیت میں رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے دھیمے لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا ''تم تو واقعی بہت سنجیدہ اور پریشان دکھائی دیتے ہو، سب سے پہلے تو میں تمہیں یہ یقین دلاتا ہوں کہ جن تین پاکستانی یا بھارتی لوگوں کی تمہیں تلاش ہے، ان کے متعلق میں کچھ نہیں جانتا، ان کی گمشدگی کے متعلق اگر تمہیں بھی کوئی علم نہیں تو پھر ایک نہیں بلکہ کئی امکان ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تمہارے سفارت خانے کے کسی فرد یا تمہارے کسی نائب نے تم سے دشمنی کی وجہ سے انہیں غائب کیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی خاص مقصد سے یہ تینوں خود اپنی مرضی سے کھٹمنڈو سے چلے گئے ہوں اور تیسرا امکان یہ بھی ہو سکتا ہے شک پڑنے پر کسی پاکستانی گروپ نے ہی انہیں اغوا کیا ہو''۔ کرنل آنند پوری توجہ سے میری باتیں سن رہا تھا وہ کہنے لگا ''میرے ماتحتوں میں میجر باسو سے میری نہیں بنتی اور میں نے اس کی خفیہ رپورٹ میں اس کی ناقص کارکردگی کے متعلق تفصیلاً لکھا ہے، اپنے سفارت خانے کے تمام افراد کو میں بخوبی جانتا ہوں وہ یہ کام کرنے کے اہل ہیں۔ پاکستانی نیٹ کے متعلق اسی ہوٹل میں ہماری پہلی ملاقات میں بھی تم نے کہا تھا کہ ہم تو صرف ڈکی ہیں۔ کام تو دوسرے گروپس کرتے ہیں تمہارا تو ان سے رابطہ ہے۔ بھگوان کے لئے ان سے ان تینوں کے متعلق پوچھو، میرا سفارت خانہ ان کی رہائی کے لئے بیس لاکھ روپے فوری ادا کرنے کو تیار ہے۔ تمہیں میں یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ DMI تمہاری جرأت اور بہادری سے بہت متاثر ہے۔ اگر تم چاہو تو بھارت میں تم نے جو کچھ کیا ہے اسے بالکل بھلا کر تمہیں بھارتی شہریت کے علاوہ لاکھوں روپے اور DMI میں ہی اعلیٰ عہدہ دیا جا سکتا ہے، ایسی صورت میں، ہم تمہاری فیملی کو بھی بھارت بلوانے کے انتظامات کر سکتے ہیں جہاں تم ایک نئی اور خوش حال زندگی شروع کر سکتے ہو۔ اگر میری باتوں پر تمہیں یقین نہیں تو میں اسی ہوٹل کے فون سے تمہاری بات اپنے سفیر سے کرواتا ہوں۔ اس کی گارنٹی پر تم ہمارے سفارت خانے چلو اور اگر کسی وجہ سے تم سفارت خانے میں نہیں جانا چاہتے تو سفیر سے اس کی کوٹھی پر ہی مل لو۔ وہ تو سفارت خانے سے باہر ہے۔ سفیر سے تمہاری بات ہو جائے گی۔ تمہاری میزبانی سے وہ فخر محسوس کرے گا''۔ میں دل ہی دل میں کرنل آنند کی اس ''فراخ دلانہ'' پیشکش پر ہنس رہا تھا۔ بھارتیوں کی میزبانی سے میں DMI میں حراست کے دوران پوری طرح سے لطف اندوز ہو چکا تھا۔ جہاں تک سفیر کی رہائش گاہ کا تعلق تھا تو مجھے اچھی طرح سے علم تھا کہ کسی سفیر کی رہائش گاہ بھی جہاں جھنڈا لگا ہو، اسی ملک کا حصہ تصور ہوتی ہے۔ کرنل آنند شاید اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ جیسے اس دور کے پاکستانی حکمران اور وزارت خارجہ کے سیکریٹری لیول کے افسران بھارت سے اچھے اور دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی دھن میں دماغ اور سوچ سے عاری ہو چکے تھے، ویسے ہی سب پاکستانی بھی تھے۔

(جاری ہے)

غازی

میں نے کرنل آنند کو کہا "یہ سب باتیں تو بعد کی ہیں پہلے تو ہمیں تمہارے گمشدہ لوگوں کو تلاش کرنا ہے۔ پاکستانی گروپس سے اگر چہ میرا کوئی ڈائریکٹ رابطہ نہیں ہے لیکن میں بھرپور کوشش کروں گا کہ اگر ان کا ان لوگوں کی گمشدگی میں کوئی ہاتھ ہے تو انہیں رہا کرا دوں۔ ایک اور امکان بھی ہے اگر چہ بنگلہ دیش ایک آزاد ملک بن چکا ہے لیکن وہ مجبوراً تمہاری بالا دستی کو قبول کرتا ہے جب وہ اپنے ہم وطن اور ہم مذہبوں کے نہ بن سکے تو تمہارے کیا بنیں گے۔ شاید یہ کارستانی انہی کی ہو"۔ غرضیکہ جب کرنل آنند مجھ سے رخصت ہوا تو میں اس کے ذہن میں اپنے علاوہ کئی ایسے دوسروں کے متعلق شک وشبہات ڈال چکا تھا جو یہ کارروائی کر سکتے تھے۔ یہ میری کامیابی تھی کیونکہ بھارتی سفارت خانے کے متوقع ردعمل میں مجھے کچھ مہلت مل گئی تھی اور اس دوران میں اپنے ڈیفنس کو مزید مضبوط کرنے کی تدابیر کر سکتا تھا۔

اب میرا بیشتر وقت اپنے ہوٹل میں ہی گزرتا "دوسرے پاکستانی گروپس کی تلاش" میں دوسرے روز سے ہی میں نے دو تین گھنٹے بلا مقصد کھٹمنڈو کی سڑکوں پہ گاڑی گھمانی شروع کر دی۔ دو تین بار پاکستانی سفارت خانے بھی گیا پہلے روز ہی میں نے دیکھا کہ ایک گاڑی ہمارا پیچھا کر رہی ہے۔ اسی شام جب کرنل آنند کا فون آیا تو میں نے چھوٹتے ہی کہا کہ اگر اسی طرح تم نے آئندہ میری نقل و حرکت کی نگرانی کرنے کی کوشش کی تو میں تمہاری مشکل حل کرنے کی کوشش ختم کر دوں گا۔ میں اسے ہرگز پسند نہیں کرتا کہ کوئی سائے کی طرح مجھ سے چمٹا رہے۔ اگر آئندہ کسی نے میرا پیچھا کیا تو نہ تو وہ گاڑی سلامت رہے گی اور نہ ہی پیچھا کرنے والے۔ کرنل آنند پھنسا ہوا تھا اس نے خاموشی سے میری بات سنی اور صرف یہ کہا IT WILL BE NOT REPEATED AGAIN (آئندہ ایسا نہیں ہوگا) پھر کسی گاڑی نے میرا پیچھا نہ کیا میرے برین واشنگ کی کوشش کرنے والے اب خود CLEAN WASH (صاف) ہو رہے تھے اسی طرح چار پانچ روز گزر گئے۔ کرنل آنند باقاعدگی سے ہر شام مجھے فون کرتا اور مجھ سے پروگریس رپورٹ لیتا۔ اسی دوران میں نے مہاجروں کی ایک فلائٹ بھی بھگتائی۔ کرنل آنند کا پیمانہ صبر لبریز ہو رہا تھا، ادھر میں بھی اس ناٹک کو زیادہ جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ مجھے ایک ترکیب سوجھی میں نے محسن کو کہا کہ کسی لڑکے کے ذریعے بنگلہ دیشی سفارت خانے سے ایک آدھ بنگالی اخبار منگوا لے۔ یہ کام بڑی آسانی سے ہو گیا۔ ڈھاکے سے چھپنے والا یہ اخبار ہماری واردات سے کئی روز پہلے کا تھا میں دو چینی دوستوں کے ساتھ وہاں گیا جہاں لاشیں جلائی گئی تھیں۔ کپڑوں اور گوشت کا تو نام ونشان تک نہ تھا۔ بکھری ہوئی کچھ انسانی ہڈیاں ضرور پڑی تھیں۔ میں نے اخبار توڑ مروڑ کر ہڈیوں سے قدرے فاصلے پر ایک جھاڑی میں ایسے پھنسایا کہ یہاں آنے والے کی نظر اس پر پڑ جائے۔ یہ کام کر کے ہم واپس لوٹ آئے۔ اگلی صبح میں نے کرنل آنند کو فون کیا اور کہا کہ فوری مجھ سے آ کر ملے آدھے گھنٹے میں کرنل آنند آ گیا۔ میں نے اسے کہا کہ ابھی تک مجھے اس کے معاملے میں کوئی کامیابی تو نہیں ہوئی ہے لیکن میرے INFORMERS نے مجھے بتایا ہے کہ چین جانے والی مین روڈ پہ تقریباً پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک کھائی میں انسانی ہڈیاں اور تین کھوپڑیاں پڑی ہیں۔ انہوں نے بنگلہ دیشی سفارت خانے کی ایک گاڑی کو بھی اس طرف کئی بار جاتے دیکھا ہے۔ مجھے کچھ شک سا ہوا اور تمہیں بتا دیا۔ آگے تم جانو۔ آنند نے مجھ سے اس جگہ کی صحیح لوکیشن پوچھی تو میں نے کہا کہ یہ تو میں نہیں جانتا مجھے صرف یہی معلوم ہوا ہے کہ اس سڑک پہ پچاس کلومیٹر کے سنگ میل سے ذرا آگے بائیں جانب گہرائی میں ہڈیاں وغیرہ پڑی ہوئی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے کہا کہ اڑتی ہوئی یہ خبر بھی سنی ہے کہ تین چار روز قبل جبیں اور اس کی والدہ گورکھپور سے لکھنو جانے والی ٹرین میں دیکھی گئی ہیں۔ اس خبر کا SOURCE (ذریعہ) بھی میں تمہیں نہیں بتا سکتا کیونکہ وہ بھی ہمارا انفارمر ہے۔

اگلے روز شام کو کرنل آنند میرے ہوٹل آیا۔ اس نے بتایا کہ ہڈیاں اور کھوپڑیاں مل گئی تھیں جنہیں وہ اپنے ہمراہ سفارت خانے لے گیا۔ مردانہ جوتے کا ایک پیر بھی ملا ہے اور ایک بنگلہ دیشی اخبار بھی جو جھاڑیوں میں پھنسا ہوا تھا۔ ہم نے ہڈیاں وغیرہ دہلی بھیج دی ہیں تاکہ دانتوں کے لیبارٹری ٹیسٹ سے ہم کچھ تو آگے بڑھ سکیں۔ کرنل آنند نے اس ملاقات میں مجھے کئی بار کہا کہ میں پاکستانی گروپ سے پتہ چلاؤں کہ یہ تینوں ان کی حراست میں تو نہیں۔ نامعلوم کرنل آنند کو ان کے زندہ ہونے کا اتنا یقین کیوں تھا اس کی وجہ مجھے یہی محسوس ہوئی کہ وہ سوچتا ہوگا کہ DMI کے اتنے تربیت یافتہ اور قابل فخر تین جاسوس ایک ہی دن میں کیونکر ہلاک ہو سکتے ہیں؟ وقتی طور پر تو کرنل آنند سے میرا پیچھا چھوٹ گیا تھا مجھ پر مرتکز اس کی سوچ کو میں نے کئی حصوں میں منتشر تو کر دیا تھا لیکن یہ سب کچھ عارضی تھا بہت جلد اسے صحیح واقعے کا علم ہو جانا تھا جس کے بعد وہ بھرپور تیاری کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوتا اور اپنی ناکامی اور خجالت کا بدلہ لینے کی کوشش کرتا۔ میں اگر اکیلا ہوتا تو صرف اپنے چینی دوستوں کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتا لیکن مریم اور اس کے والدین کی وجہ سے میں نے اپنے مدافعتی حصار کو مضبوط کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگلے روز میں نے ان چاروں کمروں کی بیرونی کھڑکیوں میں گرل اور مضبوط جالی لگوائی اور آٹھ گورکھا سابق فوجی بطور چوکیدار بھرتی کیے۔ جو دو گروپوں میں بارہ بارہ گھنٹے کی ڈیوٹی دیتے دو گورکھے ہوٹل کے باہر ہمارے کمروں کی کھڑکیوں کے قریب کسی کو پھٹکنے نہ دیتے اور دو ہمارے فلور پر کسی کو ہمارے کمروں کے قریب جانے سے روکتے۔

(جاری ہے)

غازی

ہوٹل انتظامیہ نے میرے ان انتظامات پر تھوڑا بہت احتجاج بھی کیا لیکن میں نے کچھ دلائل اور کچھ پیسے دے کر ان کا منہ بند کر دیا۔ مریم جب ریسٹورنٹ جاتی تو دو چینی دوستوں کے علاوہ میں خود بھی اس کے ساتھ جاتا۔ میں نے اپنے ساتھ ایک کے بجائے دو پسٹل، بھرے ہوئے فالتو میگزین، گیس سلنڈر اور زہریلی سوئیوں کا ڈبہ رکھنا شروع کر دیا۔ ہم نے ہوٹل سے باہر جانا بھی بہت کم کر دیا تھا۔ ایک تبدیلی میں نے اور کی۔ پاکستان جانے والے مہاجروں کو روانگی کے وقت ایئرپورٹ پر الوداع کہنے اور روپے دینے کے بجائے ان کی روانگی سے ایک روز پہلے شام کو اپنے ہوٹل میں بلوا کر ہی روپے دینے شروع کر دیئے۔ وہ بھی اس طرح کہ اگلے روز جانے والے سارے مہاجر بعد دوپہر ہوٹل کے لان میں اکٹھے ہو جاتے۔ محسن ان کے ONE WAY پاسپورٹ اور جہاز کے ٹکٹ لیکر میرے کمرے میں آ جاتا۔ انہیں چیک کر کے میں روپوں کے لفافے محسن کو دیتا جنہیں وہ مہاجروں میں بانٹ دیتا۔ میرا مقصد ذاتی تشہیر یا مہاجروں سے شکریے کے الفاظ سننے کی خواہش تو تھی نہیں میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ حقدار کو اس کا حق مل جائے۔

ایک روز میں شیر پنجاب ہوٹل گیا۔ حالات کی سنگینی کے پیش نظر میرا وہاں جانا بہت کم ہو گیا تھا۔ ہرنام سنگھ نے میری اس ''بے مروتی'' کا جب بہت شکوہ کیا تو میں نے اسے بتایا کہ بھارتی سفارت خانہ میری جان لینے کے درپے ہے۔ میں موت سے تو نہیں ڈرتا لیکن حالات کچھ ایسا رخ اختیار کر چکے ہیں کہ مریم اور اس کے والدین کی حفاظت کیلئے میرا زندہ رہنا ضروری ہے۔ ہرنام سنگھ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ''بادشاہو۔ فکر کیوں کردے ہو۔ میں چار گھورکھیاں نوں جانا آں۔ بڑے بہادر تے جان تلی تے لے کر تہاڈی حفاظت کرن گے۔ میرے دو بھتیرے وی اج کل اتھے آئے ہوئے ہن۔ تے سارا دن روٹیاں توڑدے رہندے نے۔ انہاں جئی کرپان تے برچھی ساڈے پنڈ وچ کوئی نئی چلا سکدا۔ واگورو دی کرپا ہوئی تے کل سویرے توں تہاڈی سیوا واسطے تھوڈے ہوٹل پہنچ جان گے۔ تے باراں باراں گھنٹے واری تہاڈی سیوا کرن گے''۔ میں نے ہرنام سنگھ کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں نے پہلے ہی اپنی حفاظت کا انتظام کرلیا ہے اور اب اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن سردار جی جس بات پر اڑ گئے، اڑ گئے۔ باوجود میرے کئی بار منع کرنے کے اگلی صبح سردار جی کے بھیجے ہوئے دو گورکھے اور ایک جوان بھتیجا میری حفاظت کے لئے لابی میں بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔

میرے پاس اب تین چینی دوستوں کے علاوہ 14 افراد ہماری حفاظت کیلئے موجود تھے۔ میں نے ان نئے چھ افراد کو اس طرح ڈیپلائے کیا کہ ہوٹل کی چاردیواری سے لے کر ہمارے کمروں تک پہنچنے کیلئے دشمنوں کو تین حصار توڑنے پڑتے۔ میں نے ان سب کیلئے وسلیں خریدیں تاکہ اگر کوئی ناخوشگوار صورت پیدا ہو جائے تو وسل بجا کر ہمیں اور دوسرے محافظوں کو چوکنا کیا جا سکے۔ میں اپنے ان انتظامات سے مطمئن تھا۔ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے اور جو وقت مقرر ہے اسے کوئی ٹال نہیں سکتا۔ اس اٹل حقیقت کے باوجود اپنی حفاظت کرنے کا حکم بھی اللہ نے دیا ہے ورنہ رسول اللہ کافروں کی فراوانی کو دیکھتے ہوئے جنگ خندق میں خندقیں نہ کھدواتے۔

کرنل آنند کے فون آنے یک لخت بند ہو گئے تھے۔ میں نے کئی بار اسے فون کیا تو یہی جواب ملا کہ سیٹ پر موجود نہیں۔ یہ اچانک خاموشی اور لاتعلقی کسی بڑے طوفان کی آمد کا پتہ دے رہی تھی۔ بھارت میں ہندوؤں کے ساتھ رہتے ہوئے میں ان کی عادات و خصائل سے بھی واقف ہو چکا تھا۔ ہندو فطرتاً اور مذہباً آمنے سامنے لڑنے سے ہمیشہ کتراتا اور پشت پر وار کرنے کا ذہنی ہے ہم نے اپنا اسلحہ چیک کیا۔ بارودی اسلحہ کی ہمارے پاس کل ملا کر دو سو سے کم گولیاں تھیں۔ گیس سلنڈر اور زہریلی سوئیاں بھی ستر، اسی افراد کیلئے کافی تھیں لیکن ان کا کارآمد استعمال صرف اس وقت ہو سکتا تھا جب دشمن صرف چند فٹ کے فاصلے پر ہو۔ رائفل، اسٹین گن یا بندوق ہمارے پاس ایک بھی نہیں تھی۔ جس سے دشمن کو فاصلے پر روکا یا مارا جا سکے۔ میرے پاس جو بھی افرادی قوت اور اسلحہ تھا، اپنی دانست میں، میں نے اس سے بہترین نتائج حاصل کرنے کیلئے یہ DEPLOYMENT (ترتیب) کی تھی اور اس سے خاصا مطمئن بھی تھا۔

ایک روز تقریباً دس بجے مریم اپنے ریسٹورنٹ جانے کیلئے تیار ہو کر میرے کمرے میں آ گئی۔ میں کپڑے تبدیل کر رہا تھا۔ وہ کھڑکی میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ وہیں سے اس نے مجھے بتایا کہ ایک چھوٹی ٹورسٹ بس ہوٹل میں آئی ہے اور کئی ٹورسٹ بس سے اتر رہے ہیں۔ میں بھی کھڑکی کے پاس گیا۔ ٹورسٹ ابھی بس سے اتر رہے اور اپنا سامان لے رہے تھے۔ اپنے قد، شکل و صورت سے یہ سب انڈین لگتے تھے۔ مختلف سویلین لباس پہنے ان ٹورسٹوں میں ایک قدر مشترک تھی۔ سب کے بال فوجی کٹ تھے۔ حالانکہ ان دنوں فلمی کٹ اور لمبے بال رکھنے کا عام رواج تھا۔ میں انہیں بس سے اترتے دیکھتا رہا۔ یک لخت مجھے خطرہ محسوس ہوا۔ اور میں کمرے سے نکل کر کئی کئی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا ریسپشن پر جا پہنچا۔ شفٹ منیجر وہیں تھا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر منیجر سے کہا کہ فسٹ فلور پر جتنے بھی خالی کمرے ہیں۔ انہیں فوری طور پر ابھی میرے نام بک کر دے۔ منیجر میرے اس مطالبے پر حیران تھا اور کچھ پوچھنا چاہتا تھا کہ میں نے کہا "DO IT AND DO IT RIGHT NOW" (ابھی اور اسی وقت کرو) میں ہوٹل کا مستقل گاہک تھا۔ (جاری ہے)

غازی

منیجر میری اچھی یا بری شہرت سے بھی واقف تھا اس نے فوری طور پر گاہکوں کے کوائف لکھنے والے 10 کارڈ میرے سامنے رکھ دیئے۔ میں نے ہر کارڈ کے نیچے دستخط کئے اور اب صورت یہ ہوگئی کہ فسٹ فلور پر پہلے سے ہمارے چار کمروں کے علاوہ بقیہ دس کمرے بھی ہماری تحویل میں آگئے۔ اس فلور پر صرف ایک کمرہ کسی یورپین نے لے رکھا تھا۔ میں نے منیجر کو کہا کہ جب وہ کمرہ خالی ہو جائے تو اسے بھی میرے نام پر بک کر دینا۔ کارڈوں پر دستخط کرکے منیجر کو میں گیارہویں کمرے کے متعلق ہدایت دے ہی رہا تھا کہ سارے ٹورسٹ لابی میں آگئے۔ ان کے لیڈر نے کمرے بک کرنا چاہے تو اسے بتایا گیا کہ صرف گراؤنڈ فلور پر کمرے مہیا ہیں۔ لیڈر نے ریسیپشن والوں سے جھگڑنا شروع کر دیا کہ ہم نے TELEX بھیجی تھی اور یہ خصوصی ہدایت دی تھی کہ فسٹ فلور پر کمرے بک کئے جائیں تو پھر فسٹ فلور کے کمرے اوروں کو کیوں دیئے گئے منیجر نے ٹیلکس نکالی اور لیڈر کو دکھا کر کہا کہ ٹیلکس کے مطابق آپ گزشتہ شام متوقع تھے۔ ہم نے آج صبح تک انتظار کیا اور اب آپ کی آمد سے چند منٹ پہلے ہی کمرے بک کئے ہیں۔ لیڈر کہنے لگا کہ آپ ان نئے مہمانوں کو نیچے شفٹ کر دیں اور ہمیں لازماً فسٹ فلور پر کمرے دیں۔ منیجر نے جواب دیا کہ یہ کمرے مہمانوں نے نہیں بلکہ ایک ہی مہمان نے بک کئے ہیں جو سامنے صوفے پر بیٹھا ہے۔ ابھی تو ہم نے کمروں کی چابیاں بھی انہیں نہیں دی ہیں۔ میں سامنے صوفے پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ لیڈر میرے پاس آیا اور انگریزی میں کہنے لگا کہ ہم آپ کے بہت مشکور ہوں گے اگر فسٹ فلور کے کمرے آپ ہمیں دے دیں اس کی انگریزی اور عمر سے میں نے اندازہ لگایا کہ اگر یہ فوجی ہے تو کیپٹن کے عہدے کا ہوگا۔ میں نے انگریزی میں بے تکلفی سے اسے کہا ''کیپٹن مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں نے یہ کمرے بھارتی سفارت خانے کے کرنل آنند اور میجر باسو کے کہنے پر ان کے مہمانوں کیلئے بک کئے ہیں۔ کرنل آنند سے تو کئی روز سے رابطہ نہیں ہوا۔ میجر باسو نے آج صبح فون پر مجھے کہا تھا کہ شاید آنے والے مہمانوں کی ٹیلکس ہوٹل نہ پہنچی ہو۔ اس لئے میں ذاتی طور پر یہ کمرے بک کروا دوں'' میں نے بڑے اطمینان سے مسکراتے ہوئے کہا۔ لیڈر نے کہا۔ ''دراصل ہم کل شام ہی پہنچنے والے تھے لیکن ہماری بس کا ریڈی ایٹر خراب ہوگیا۔ اس لئے رات ہمیں راستے میں بسر کرنا پڑی اور اب یہاں پہنچے ہیں۔''

اینڈ تھینک یو ویری مچ۔ ہم ہی کرنل آنند کے مہمان ہیں۔ وہ ہمارے ساتھ ہی لکھنو کینٹ سے آئے ہیں اور انہیں سفارت خانے چھوڑ کر ہم سیدھے یہاں آرہے ہیں'' ساری بات تو مجھے اپنے کمرے کی کھڑکی سے ان ٹورسٹوں کے ہیئر کٹ دیکھ کر ہی سمجھ آچکی تھی۔ جو تھوڑا بہت شک تھا۔ وہ لیڈر کی باتوں سے ختم ہوگیا۔ اب تو میں محض لطف لینے کیلئے بات آگے بڑھا رہا تھا۔ میں نے کہا ''پہلے تم فون پر کرنل آنند یا میجر باسو کو یہ بتا دو کہ ان کے دوست آصف نے ان کی ہدایت کے مطابق کمرے بک کروا رکھے تھے۔ میں نے اسے بھارتی سفارت خانے کا نمبر دینا چاہا۔ تو اس نے بتایا کہ نمبر اس کے پاس ہیں وہ فون کرنے ریسیپشن کی طرف گیا۔ میں نے اوپر دیکھا تو مریم فسٹ فلور کے کھیڑار کی کھڑکی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ ذرا اونچا کرکے مجھے دکھایا۔ اس میں پسٹل تھا۔ اس نے آنکھوں سے مجھے اشارہ کیا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا تو یہ دوست نہایت مستعدی سے اپنے کوٹوں کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے تھے۔ انہوں نے جیبوں میں ہاتھوں کی حرکت سے مجھے سمجھا دیا کہ ان کے ہاتھوں میں بھی ریوالور ہیں۔ میں نے بھی اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھے پسٹل سے سیفٹی کو ہٹایا۔ دو تین منٹ ٹیلی فون پر بات کرنے کے بعد لیڈر واپس مڑا۔ میں نے اس سے پوچھا ''کیا بات ہوگئی؟ اب کمرے تمہارے اور تمہارے دوستوں کے لئے تیار ہیں''۔ "WE DONT NEED" لیڈر نے یہ کہہ کر اپنے ساتھیوں کو واپس چلنے کا کہا۔ شرمندگی اور خفت اس کے چہرے سے صاف عیاں تھی لیکن اس کی آنکھوں سے شعلے بھی نکل رہے تھے۔ جب وہ لابی سے نکلنے لگا تو میں نے اونچی آواز میں کہا CAPTIAN PAY MY REGARDS TO ANAND AND BASU (آنند اور باسو کو میرا آداب کہنا) میرے یہ الفاظ جلتی پر تیل ڈالنے کے مترادف تھے۔ لیکن وہ خاموشی سے چلے گئے۔ بزدل اور ڈرپوک قوم سے جو تھے۔ ورنہ میں یا کوئی بھی جرات مند پاکستانی ہوتا تو اس بات کا جواب گولیوں سے دیتا۔

اس گروپ کے جانے کے بعد میں نے اپنے حفاظتی حصار کو دوبارہ چیک کیا کیونکہ کرنل آنند اب ریگولر بھارتی فوج کے دس جوانوں اور افسروں کی کمک اپنے ہمراہ لایا تھا۔ کرنل آنند یا بھارتی سفارت خانے کیلئے مجھے ہلاک کرنا بہت آسان تھا لیکن وہ مجھے ہلاک نہیں بلکہ زندہ گرفتار کرکے بھارت لے جانا اور وہ مجھ سے ایسا سلوک کرنا چاہتے تھے کہ میں دنیا کیلئے عبرت کا نشان بن جاؤں موت تو مصیبتوں سے چھٹکارے کا نام ہے۔ مجھے 65ء کی پاک بھارت جنگ میں پاکستان کے 6TH LANCERS (چھٹے ٹینک اسکواڈرن) کے کرنل نذیر احمد سے بھارتیوں کا سلوک بار بار یاد آتا ہے۔ یہ ٹینک اسکواڈرن اپنی انفنٹری سے کٹ کر کھیتوں کے بیچوں بیچ آگے بڑھتا رہا اور جب سڑک پر پہنچا تو سنگ میل سے معلوم ہوا کہ امرتسر صرف پانچ میل دور ہے اس اسکواڈرن کے پاس نہ تو پیٹرول تھا اور نہ سپلائی لائن برقرار تھی۔ لامحالہ بھارتی فوج نے انہیں نرغے میں لے لیا۔

(جاری ہے)

غازی

اسکواڈرن کے بہت سے جوان تو کھیتوں میں چھپتے چھپاتے واپس بھاگ گئے اور اپنی فوج سے جا ملے ۔ کرنل نذیر کو اپنے کئی ٹینکوں اور جوانوں کے ساتھ بھارتی فوج نے گرفتار کر لیا اور دہلی لے جا کر ٹینک کے اوپر رسیوں سے باندھ کر ساری دہلی کی سڑکوں پر گھمایا گیا بھارتیوں نے میرے ساتھ تو اس سے بھی کئی گنا بدتر سلوک کرنا تھا اور شہر شہر میری ذلت اور رسوائی کرنی تھی ۔ اسی لئے کرنل آنند بھارتی سینا کے آٹھ دس آدمیوں کو انا پورنا ہوٹل میں ٹھہرانا چاہتا تھا تا کہ موقعہ ملتے ہی مجھے زندہ قابو کر کے بھارت پہنچایا جائے ۔ میں ان کی چال سمجھ گیا تھا اور اسی لئے میں نے آنے والے گروپ کیپٹن سے کہا تھا کہ ٹیلی فون پر کرنل آنند یا میجر باسو کو میرے متعلق بتا دے ۔ اب ان کا ہوٹل میں رہنا بے سود تھا لہٰذا وہ یقینی بھارتی سفارت خانے چلے گئے تھے ۔

مریم بھی اس صورت حال سے بخوبی واقف تھی ہم نے فیصلہ کیا کہ کچھ عرصے کیلئے باہر نکلنا بالکل بند کیا جائے اور ہوٹل میں قلعہ بند ہو کر رہا جائے ۔ جب یہ فیصلہ ہو گیا تو ہم چینی دوستوں کے ساتھ ریسٹورنٹ گئے ۔ مریم نے کھانا پکانے کے کچھ برتن مصالحے اور کھانوں کی کچی اشیا سے بھرا ہوا ڈیپ فریزر چینی دوستوں سے اٹھوا کر گاڑی کی چھت پر رکھوایا اور انا پورنا ہوٹل لے آئے ہوٹل انتظامیہ نے ہمارے ساتھ بڑا تعاون کیا اور ڈیپ فریزر اسٹور میں رکھوا کر اپنے وسیع کچن کے دو چولہے ہمیں دے دیئے اور مریم کی والدہ نے اپنے ریسٹورنٹ کے دو خانساموں کی مدد سے بہترین کھانے تیار کرنا شروع کر دیئے ۔ دن یونہی گزرتے جا رہے تھے اس دوران مجھے مریم کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کا موقع ملا تھا اور اس کی مجھ سے اب تک چھپی ہوئی خوبیاں بھی ظاہر ہو گئی تھیں وہ وعدے کی از حد پابند کسی حال میں بھی جھوٹ نہ بولنے والی ، انتہائی وفا شعار اور اپنے مرد کو خود پر فوقیت دینے والی نڈر اور جرأت مند عورت تھی قربانی اور خدمت کا جذبہ اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا ۔ مدھم آواز میں گفتگو کر کے وہ اپنی نسوانیت کا اظہار کرتی ، میری کسی بھی بات پر بھی وہ صرف مشورہ دیتی اور اپنی بات منوانے کیلئے بحث یا ضد نہ کرتی ۔ میرے سوا کسی مرد سے آنکھیں ملا کر بات نہ کرتی اور میری ذرا سی شوخ بات پر اس کا چہرہ حیا سے فوراً سرخ ہو جاتا ۔ میں سوچتا تھا کہ دیر سے ہی آئی لیکن میرے تصورات کے عین مطابق مجھے زندگی کی ساتھی مل گئی ہے ۔ اتنے قلیل وقت میں ہی وہ میری زبان سے نہیں بلکہ میری آنکھوں اور چہرے کے اتار چڑھاؤ سے میرے دل کا حال سمجھنے لگی ۔ ہم گھنٹوں اکٹھے بیٹھے آئندہ زندگی کے پروگرام بناتے رہتے لیکن تقدیر ہمارے مستقبل کے سہانے خوابوں اور تدبیروں پر خنداں تھی اور آخر کار 28 اپریل کا وہ منحوس دن آ ہی گیا ۔ صبح ہی ریسٹورنٹ کے چوکیدار نے آ کر بتایا کہ وہ ٹرک جس میں ریسٹورنٹ کیلئے تازہ جھینگوں کا کنٹینر لدا ہوا تھا، کھٹمنڈو سے ستر اسی کلومیٹر کے فاصلے پر ایکسل ٹوٹ جانے کی وجہ سے رکا ہوا ہے اور جھینگوں کو تازہ رکھنے کیلئے برف پانی بن کر کنٹینر سے بہہ رہی ہے ۔ مریم نے کہا کہ اگر ساری برف پگھل گئی تو جھینگے خراب ہو جائیں گے ۔ اس نے مجھ سے خراب ٹرک تک جانے اور کنٹینر لانے کی اجازت مانگی ۔ میں نے کوئی ہرج نہ سمجھتے ہوتے اسے اجازت دے دی اور اس کی حفاظت کیلئے دو چینی دوست اور چار گورکھے اپنی وین میں ہمراہ بھیج دیئے کنٹینر رکھنے کیلئے میں نے ہوٹل کی پک اپ بھی کرائے پر لے لی ۔ مریم کے ساتھ اس کی والدہ بھی اس کی گاڑی میں بیٹھ گئی تھی ۔ یہ تینوں گاڑیاں تقریباً دس بجے روانہ ہوئیں اور اندازے کے مطابق انہیں سہ پہر تین بجے تک واپس آ جانا چاہئے تھا ۔ اس روز صبح ہی سے میرا دل بلاوجہ بے چین تھا ۔ دل پر انجان سا بوجھ تھا ۔ تین بجے تک جب گاڑیاں واپس نہ آئیں تو میری بے چینی بڑھ گئی ۔ میں بار بار کمرے کی کھڑکی میں سے باہر جھانکتا اور مایوس پلٹ جاتا ۔ یونہی چار بج گئے مجھ میں اب انتظار کی مزید تاب نہ تھی ۔ میں نے رکشہ لیا اور شیر پنجاب ریسٹورنٹ جا کر ہرنام سنگھ کی گاڑی لی اور اس سڑک پر تیزی سے چل دیا ۔ جدھر مریم گئی تھی ۔ کھٹمنڈو چونکہ اونچے پہاڑوں میں گھری وادی میں واقع ہے اس لئے سورج دس بجے دکھائی دیتا اور ساڑھے چار بجے تک نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے ۔ جلد ہی سڑک وادی سے نکل کر پہاڑ تک پہنچی اور چڑھائی شروع ہوئی ۔ جگہ جگہ تنگ اور خطرناک موڑ تھے ۔ میں پورا ایکسیلیٹر دبائے اندھا دھند گاڑی چلائے جا رہا تھا ۔ ایک موڑ کے بعد مجھے اگلے موڑ کے قریب اپنی وین اور پک اپ کھڑی نظر آئی لیکن مریم کی گاڑی وہاں نہیں تھی ۔ خدشات نے یکدم سر ابھارا ۔ میں ان گاڑیوں تک پہنچا ۔ چند لوگ سڑک کے کنارے کھڑے ایک گہری کھائی میں جھانک رہے تھے ۔ میں نے دیکھا تو مریم کی گاڑی سینکڑوں فٹ گہرائی میں الٹی پڑی تھی ۔ مجھے کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی ۔ سب سمجھ آ چکا تھا ۔ میں کھائی میں اترا اور دوڑتا ، پھلانگتا ، گرتا ، پڑتا گاڑی تک پہنچا ۔ چینی دوست اور چاروں گورکھے گاڑی کو سیدھا کرنے کی کوشش کر رہے تھے ۔ چینیوں نے مجھے دیکھا تو سر جھکا لئے ، گاڑی کے اندر مریم اور اس کی والدہ کے بے جان جسم پڑے تھے ۔ گاڑی کا اسٹیرنگ اس کے سینے میں دھنسنے سے اس کا خون بہہ کر اس کے لباس سے ہوتا ہوا اس کے چہرے پر پھیل چکا تھا ۔ یہی حالت اس کی والدہ کی تھی ۔ میرا دماغ بالکل معطل ہو چکا تھا نہ تو میرے منہ سے کوئی لفظ نکلتا تھا اور نہ ہی آنکھوں سے آنسو ۔ بس ایک ہی دھن تھی کہ مریم کو اس موت کے پنجرے سے باہر نکالوں ۔ میں نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی ۔ مجھے یہ بھی پتہ نہ تھا کہ یہ دس کے نوٹ تھے یا سو کے ۔ میں نے ایک گورکھے چوکیدار کو گڈی دی اور اسے اشارے سے کہا کہ اوپر سڑک پر کھڑے لوگوں کو بلاؤ ۔ گورکھے نے بلند آواز سے اوپر والوں کو پکارا اور گڈی دکھائی ۔ اوپر کھڑے پانچ چھ آدمی بھاگتے ہوئے نیچے آئے اور سب نے مل کر گاڑی کو سیدھا کیا ۔ گاڑی کے دروازے ، چھت آگے اور پیچھے کی باڈی پچک گئی تھی ۔ سڑک سے یہاں تک پہنچتے ہوئے گاڑی نا معلوم کتنی بار الٹی اور سیدھی ہوئی ہو گی ۔ بڑی مشکل سے ان لوگوں نے دروازہ کھولا ۔ میں نے بڑی آہستگی سے مریم کے بے جان جسم کو نکالا ۔

(جاری ہے)

غازی

اس کا جسم میرے ہاتھوں پر تھا اور میں اس کے خون سے بھرے چہرے پر اپنا چہرہ رگڑتا جا رہا تھا۔ اسی طرح ہاتھوں میں اسے اٹھائے میں آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھتا گیا۔ سڑک پر آ کر میں نے مریم کو پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ میرے دونوں ہاتھ چہرہ اور لباس مریم کے خون سے سرخ ہو رہے تھے۔ مجھے اس وقت کسی اور کا خیال تھا نہ پرواہ۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اسی تیزی سے چلاتا کشمیری مسجد کے سامنے فصیح کے گھر کے کمپاؤنڈ میں گاڑی لے گیا۔ کمپاؤنڈ میں بچے کھیل رہے تھے۔ میں گاڑی سے اترا۔ خون سے لتھڑے میرے چہرے اور ہاتھوں کو دیکھ کر بچے خوف سے چیختے ہوئے گھر کی طرف بھاگے۔ گورکھا چوکیدار بھی بچوں کی چیخیں سن کر میری طرف آیا لیکن میرا حلیہ دیکھ کر دور ہی رک گیا اور اپنی کھکھڑی نکال لی۔ میری کیفیت ایسی تھی کہ کھکھڑی تو کیا چیز ہے، دنیا کا مہلک ترین ہتھیار بھی مجھے میرے ارادے سے روک نہیں سکتا تھا۔ میں نے برآمدے میں لگی کال بیل مسلسل بجانی شروع کی اور ہاتھ اس وقت تک نہیں ہٹایا جب تک فصیح باہر نہیں آ گیا۔ میرا حلیہ دیکھ کر وہ چونک اٹھا وہ سمجھا کہ میں زخمی ہوں۔ کہنے لگا کہ تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ پلٹا تو میں نے اس کے بازو کو زور سے پکڑا اور کہا "فصیح صاحب مجھے ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔ میری حقیقت اور اصلیت کو آپ یقیناً جانتے ہوں گے۔ بڑی سے بڑی مصیبت اور تکلیف کو میں نے ہنستے ہوئے اور ہمت سے جھیلا ہے۔ میں نے کبھی بھی کسی سے رحم کی بھیک نہیں مانگی۔ لیکن آج آپ کے سامنے بے یار و مددگار اور لاوارث شخص کھڑا ہے میں، ایک زندہ لاش ہوں جس کی روح ایک بے جان جسم کی صورت میں گاڑی کے اندر پڑی ہے اور آپ سے مدد کی بھیک مانگتا ہوں۔ مجھے مایوس نہ کیجئے گا"۔ فصیح صاحب آنکھیں پھاڑے میری بات سن رہا تھا، "فصیح صاحب مریم میری زندگی تھی، میری روح تھی جو مجھ سے ہمیشہ کیلئے جدا ہو چکی ہے۔ آپ کے سوا مجھے کوئی دکھائی نہیں دیتا جو مجھ لاوارث کی مدد کرے اور میری لاوارث مریم کے کفن دفن کا ابھی انتظام کرے میں آج اور جلد از جلد اس کے زخموں سے چور جسم کو اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچانا چاہتا ہوں"۔ فصیح نے چنگ وار ریسٹورنٹ میں مریم اور اس کے میرے ساتھ قرب کے متعلق یقیناً بہت کچھ سن رکھا ہو گا کیونکہ تقریباً سبھی مہاجروں کو اس بات کا علم تھا اور فصیح کے ہاں ان کا اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ فصیح نے مجھ سے صرف یہ پوچھا کہ یہ کیسے ہوا۔ میں نے جواب دیا" کار ایکسیڈنٹ"، فصیح چند لمحے خاموش رہا اور پھر بولا "اب یہ سب میری ذمہ داری ہے۔ میں فوری سبھی انتظامات کرتا ہوں" یہ کہہ کر وہ گھر کے اندر مستورات کو بتانے اور مریم کے سفر آخرت کے انتظام کرنے کا کہنے چلا گیا۔ میں گاڑی کی جانب آیا اور مریم کا سر اپنی گود میں رکھ کر نا معلوم کیا کچھ کہتا رہا۔ کیا کیا سوال میں نے اس سے نہ کئے۔ لیکن میری آنکھوں کے اشارے سمجھنے والی اور گھنٹوں مجھ سے باتیں کرنے والی مریم اب نہ تو آنکھیں کھول رہی تھی اور نہ ہی میرے کسی سوال کا جواب دیتی تھی۔ آج صرف یک طرفہ گفتگو ہو رہی تھی۔ میں نے اس کے چہرے سے خون کو صاف کرنا چاہا تو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کہہ رہی ہو، یہ خون صاف نہ کرو اور اس خون کے ساتھ کان لگا کر سنو، ہر بوند سے تمہارا ہی نام نکل رہا ہے۔ میں اسی کیفیت میں نجانے کتنی دیر مریم سے باتیں کرتا رہا کہ فصیح کی آواز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا کئی عورتیں ایک چارپائی اور بستر لئے کھڑی تھیں۔ میں نے مریم کے جسم کو اٹھایا اور بڑی احتیاط سے بستر پر لٹا دیا۔ اس کے ابھی زخم تازہ تھے اور ذرا سی بے احتیاطی سے ان میں درد اٹھ سکتا تھا۔ میں نے اس کے ماتھے کو کئی بار چوما، فصیح نے کھینچ کر مجھے الگ کیا اور کہا کہ جب تک میت کو غسل دیا جائے گا اور نماز جنازہ ہو گی تب تک قبرستان میں قبر بھی تیار ہو جائے گی۔ اس نے مجھے اپنے کپڑے لا کر دیئے اور کہا کہ غسل کر کے یہ کپڑے پہن لو تاکہ نماز جنازہ میں شرکت کر سکو۔ قارئین آج 23 سال کے بعد یہ لکھتے ہوئے میرے زخم پھر تازہ ہو چکے ہیں اور ان سے خون رسنے لگا ہے۔ میری اس کیفیت کا صاحب دل ہی احساس کر سکتے ہیں۔ رات ساڑھے دس بجے دو پیٹرومیکس گیسوں کی روشنی میں ہم دس بارہ آدمی مریم کو اس کی آخری آرام گاہ میں سپرد خاک کر کے واپس لوٹے۔ لاوارثوں کے جنازے ایسے ہی ہوتے ہیں۔

واپسی پر فصیح کے بے حد اصرار پر میں نے چائے کا ایک کپ پیا اور واپس ہوٹل آ گیا تو معلوم ہوا کہ چینی دوست مریم کی والدہ کی میت کو لے کر سیدھے چنگ وار ریسٹورنٹ گئے اور انہوں نے ہی مریم کے والد کو اس حادثے کی خبر بھی دی۔ مریم کا والد بھی اپنے گھر چلا گیا تھا۔ دوسرے روز مریم کی والدہ کو بھی مریم کے پہلو میں دفن کر دیا گیا مجھے بار بار ایک ہی خیال آتا تھا کہ مریم کار کے حادثے میں ہلاک نہیں ہوئی بلکہ اسے زہر کے انجکشنوں سے ہلاک کیا گیا ہے اور اسے یہ انجکشن دینے میں ہر اس مجاز اتھارٹی کا ہاتھ تھا جو کھٹمنڈو میں میرے قیام کو بلاوجہ طویل تر کر رہے تھے۔ کبھی میرا دل یہ کہتا کہ شاید شادی کے بعد مریم کا رویہ مجھ سے بدل جاتا یا اس کیلئے میرے جذبات اور محبت میں وہ شدت نہ رہتی جواب تھی۔ اور قدرت یہ چاہتی تھی کہ ہم دونوں اس وقت جسمانی طور پر ایک دوسرے سے جدا ہوں جب ہماری محبت اور جذبات کی شدت انتہا پر ہو۔ مریم تو چند لمحوں کی تکلیف سہہ کر ہمیشہ کیلئے آرام کی نیند سو گئی لیکن میں بدبخت اس کی یاد میں آج تک جلتے کوئلوں پر سلگ رہا ہوں۔ اس معاملے میں قدرت واقعی اس پر مہربان تھی۔

30 مئی کو مریم کے والد کے گھر میں دونوں ماں بیٹی کے قل ہوئے جس میں مہاجروں کی خاصی بڑی تعداد کے علاوہ فصیح کے گھرانے کے سبھی مرد شریک تھے۔ سب مجھ سے اور مریم کے والد سے تعزیت کر رہے تھے اور ہم دونوں ایک دوسرے کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتے اور تسلی دیتے۔ میں نے چینی دوستوں اور گورکھے پہرے داروں سے حادثے کی تفصیلات پوچھیں۔

(جاری ہے)

غازی

چینی دوستوں نے مریم کے والد کے ذریعے اور گورکھوں نے اپنی ٹوٹی ہندی میں بتایا کہ واپسی پر سب سے آگے دین میں وہ، ان کے پیچھے مریم کی گاڑی اور سب سے پیچھے ہوٹل کی پک اپ تھی۔ وہ خطرناک موڑ کاٹتے ہوئے مریم اسٹیرنگ پر شاید قابو نہ رکھ سکی اور گاڑی لڑھکتی ہوئی کھڈ میں جا گری۔ میرے کرید کرید کر پوچھنے پر بھی انہوں نے کسی تخریب کاری یا دشمن کے حملے کو خارج از امکان قرار دیا۔ جائے حادثہ پر میں نے دوبارہ جا کر حادثے کا شکار گاڑی کا تفصیلی معائنہ کیا۔ چاروں ٹائر صحیح حالت میں تھے ونڈ شیلڈ اور گاڑی کے سارے شیشے کچھ سلامت اور کچھ ٹوٹے ہوئے تھے۔

لیکن گولی کا نشان کسی شیشے پر نہ تھا۔ بریکیں بھی درست حالت میں تھیں اگر مجھے ذرا سا بھی ثبوت مل جاتا کہ اس حادثے میں دشمن کا ہاتھ ہے تو میں بھارتی سفارت خانے اور اس کے سارے عملے کا نام و نشان تک مٹا دیتا۔ حادثے میں کسی کے ملوث نہ ہونے کا یہ بھی ثبوت تھا کہ مریم کے روانہ ہوتے وقت کسی کو بھی علم نہ تھا کہ گاڑیوں میں کون تھے اور کہاں جا رہے تھے۔ جھٹکوں کے ٹرک کا ایکسل واقعی ٹوٹ گیا تھا کہیں بھی ایسا جھول دکھائی نہیں دیتا تھا جس سے یہ حادثہ دشمن کی سازش دکھائی دیتا۔ ہرنام سنگھ کو دوسرے روز پتہ چلا تو وہ میرے ہوٹل آ کر مجھ سے گلے لگ کر دیر تک چیخ چیخ کر روتا رہا۔ میری مایوسی اور دکھ انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ ریسٹورنٹ کا سارا سامان واپس بھیج کر میں نے سارے گورکھا چوکیداروں کو رخصت کر دیا، ہرنام سنگھ کے بھتیجے بھی میرے مجبور کرنے پر واپس چلے گئے۔ میں نے چینی دوستوں کو بھی واپس بھیجنا چاہا تو وہ مریم کے والد کو لے آئے اور کہا کہ وہ واپس جانے کیلئے میرے حکم یا مرضی کے پابند نہیں۔ انہیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب تک میں کھٹمنڈو میں رہوں وہ میری حفاظت کریں۔ میں نے خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیا اور سوائے محسن اور چینی دوستوں کے کسی سے بھی ملنے سے انکار کر دیتا۔ مہاجروں کیلئے روپے محسن ہی لیکر جاتا اور ان میں تقسیم کرتا۔ میں نے ایک بار پھر سارے مہاجروں میں ہزاروں روپے فی کنبہ تقسیم کیے۔ میں نے ہوٹل کے فرسٹ فلور پر بک کیے ہوئے کمرے بھی حادثے کے تیسرے روز کینسل کر دیئے۔ دل گھبرانے پر میں اچانک ہی کمرے سے باہر نکلتا اور چینی دوستوں کے بغیر ہی گاڑی لے کر جائے حادثہ پر چلا جاتا بہت سے پھول لے کر مریم کی قبر پر جا کے گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ آج جب میں اپنی ان دنوں کی حالت کا تجزیہ کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ بمبئی میں میری اپنی زندگی سے محبت کی وجہ DMI کی حراست سے فرار میں کامیابی تھی اس وقت میری زندگی کا ہر لمحہ میری کامیابی اور DMI کی شکست کا مظہر تھا۔ کھٹمنڈو میں میری زندہ رہنے کی خواہش کو مریم نے کئی گنا بڑھا دیا تھا اور اس کے انتقال نے میری اس خواہش کو یوں ختم کر دیا جیسے ایر پاکٹ میں آ کر جہاز یکدم ہزاروں فٹ نیچے چلتا اور بعض اوقات گرتے ہوئے پتھر کی طرح زمین سے ٹکرا جاتا ہے۔ میری اس حالت کی خبر چینی دوستوں نے مریم کے والد کو دی تو اس نے میرے ہوٹل آ کر مجھے قرآن پاک دیا اور کہا کہ زیادہ سے زیادہ وقت تلاوت کروں اور اس کا ثواب مریم کو بخشوں۔ میں نے تلاوت شروع کر دی اور میرے دل کا بوجھ کم ہونے لگا۔ مجھے سکون ملتا گیا اور تلاوت کا وقت بڑھتا گیا۔ یہ سچا کلام واقعی ہر دکھ اور مصیبت کو دور کرنے کی پوری قدرت رکھتا ہے۔

قارئین کرام، میرا اور مریم کا جذباتی رشتہ ہمارا ذاتی معاملہ تھا اور ''غازی'' کے سلسلے میں، میں نے ذاتی الجھنوں کو تحریر کرنے سے حتیٰ الامکان گریز کیا ہے۔ لیکن اس واقعے کو تفصیلاً تحریر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ میں قارئین کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کوئی بھی شخص کسی اعلیٰ سے اعلیٰ نظریئے اور بلند ترین مقاصد کے حصول کیلئے اگر اپنی زندگی وقف بھی کر دے اور اپنی جان داؤ پر لگا دے پھر بھی ان کی ذاتی زندگی اور فطرتی کمزوریاں اس کے دل و دماغ کے کسی گوشے میں ضرور موجود رہتی ہیں۔ اعلیٰ نظریئے اور بلند مقاصد کے حصول کی خواہش ان فطرتی کمزوریوں کو وقتی طور پر دبا دیتی ہے لیکن فنا نہیں کر سکتی۔ میری آپ بیتی پر ہی ایک نظر ڈالیں۔ اپنے وطن کی خاطر اور 71ء کی جنگ میں ہزیمت کا بدلہ لینے کی خواہش میں، میں نے دہلی، گورکھپور، بمبئی اور کھٹمنڈو میں خون کی ہولی کھیلی اور دشمن کو اتنا جانی اور مالی نقصان پہنچایا جس کی تلافی وہ مدتوں تک نہ کر سکا۔ میرے پیش نظر صرف پاکستان کا دشمن بھارت اور ازلی مکار اور چالاک بھارتی ہندو تھا جس نے ہمارے نازک وقت میں جسے ہمسائے کی طرح ہماری مدد کرنے کے بجائے موقعہ غنیمت جانتے ہوئے ہم پر کاری وار کیا تھا لیکن جب مجھے ذاتی صدمہ پہنچا تو دکھ اور درد کا اندازہ ہوا لیکن آج پاکستان میں کیا ہو رہا ہے ایک خدا، ایک رسولؐ اور ایک قرآن کے ماننے والے پاکستانی مسلمان ایک دوسرے کا بے دریغ خون بہا رہے ہیں کیا یہ خون بہانے سے پاکستان کے دشمن کم ہو رہے ہیں ہر روز بے گناہ معصوم بچے، ضعیف بوڑھوں اور بھرپور جوانوں کی لاشیں اٹھائی جا رہی ہیں۔ میں نے تو دشمن ملک میں ہندو شہریوں کی بھی جان لینے سے احتراز کیا لیکن آج اپنے ملک میں درندگی کی جو لہر اٹھی ہے اس سے کوئی بھی شہری محفوظ نہیں۔ صوبائیت، لسانیت، اور مسلک کی آڑ لے کر ہمارا ازلی دشمن بھارت ہمارے ذہنوں پر اس قدر حاوی ہو چکا ہے کہ ہم محض کٹھ پتلیاں بن کر رہ گئے ہیں جن کی تاریں بھارت کے ہاتھ میں ہیں۔ 65ء کی جنگ میں ایک نقطے پر جمع ہو جانے والی قوم آج بے شمار مصنوعی دائروں میں محصور ہو کر رہ گئی ہے۔ دنیا بھر کیلئے ہم ایک تماشہ بن کر رہ گئے ہیں پاکستانیوں کیلئے آج پاکستان کی مساجد، امام بارگاہیں، اسکول، سڑکیں، غرضیکہ ہر جگہ غیر محفوظ ہو چکی ہیں۔

(جاری ہے)

غازی

بھارت بھی یہی چاہتا ہے اور اس میں وہ خاصا کامیاب ہو چکا ہے۔ بے کار اور بد قماش لیڈروں اور سازشی سیاستدانوں کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر آج ہم اپنے وطن کی سالمیت کو بھی پس پشت ڈال چکے ہیں اور اس حقیقت کو بھی فراموش کر چکے ہیں کہ خدانخواستہ اگر پاکستان ہی نہ رہا تو پھر نہ تو ہمارا کوئی وطن ہوگا اور نہ ہی شناخت اور یہ صوبائی، لسانی اور مذہبی مسلکوں کے جھگڑے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ خدارا ہوش کے ناخن لیجئے اور اپنے دوست اور دشمن کی پہچان کریں۔

قرآن حکیم کی آیت ہے کہ جس نے کسی کا خون ناحق کیا اس نے گویا پوری انسانیت کا قتل کیا۔ قرآن کی اس سچائی کو نہ ماننے والے بھی آخر کار اس کی حقانیت کے معترف ہو گئے۔

ہیروشیما پر ایٹم بم پھینکنے والا امریکی پائلٹ بم کی ہلاکت خیزی اور تباہ کاری کی خبر پڑھ کر اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا تھا اس کا نام غالباً رابرٹ تھا۔ پاگل خانے میں وہ ایک ہی فقرہ دہراتا تھا ONE WHO KILLS A MAN, HE KILLS A WHOLE WORLD. DONT KNOW HOW MANY WORLDS I HAVE KILLED (جو ایک انسان کو ہلاک کرتا ہے۔ وہ ایک دنیا کو ہلاک کر دیتا ہے۔ نجانے میں نے کتنی دنیائیں ہلاک کی ہیں) اور رابرٹ کا یہ کہنا بالکل درست ہے، ہلاک تو ایک شخص ہوتا ہے لیکن اس کے بچے، یتیم ہو جاتے ہیں۔ ضعیف ماں باپ بے سہارا رہ جاتے ہیں۔ بیوی بیوہ ہو جاتی ہے بہنوں کا سہارا چھن جاتا ہے۔ ہلاک تو ایک انسان ہوتا ہے لیکن ایک دنیا ختم ہو جاتی ہے۔ پاکستانی مسلمانوں کا خون بہانے والے پاکستانی مسلمانوں، ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو۔ ہم نے کتنی دنیائیں ختم کی ہیں؟

دن یونہی گزرتے جا رہے تھے۔ بیشتر وقت میں اپنے کمرے میں ہی رہتا۔ ہر دوسرے تیسرے دن میں مریم کے والد کے پاس جاتا اور اسے دلاسہ دیتا لیکن بے سود اس کی تو دنیا ہی اجڑ گئی تھی۔ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے وہ میری باتیں سنتا اور مجھے گلے لگا لیتا۔ میں نے اسے بہت زور دیا کہ وہ ریسٹورنٹ اور گھر بیچ کر پاکستان چلا جائے لیکن وہ نہ مانا۔ وہ کہتا تھا کہ کھٹمنڈو میں میری بیوی اور بیٹی دفن ہیں۔ انہیں کیونکر اکیلا چھوڑ کر جاؤں جو زندگی میں میرے ساتھ تھیں۔ مرنے کے بعد بھی انہی کے ساتھ رہوں گا۔ میری ساری کوششیں رائیگاں گئیں۔ کھٹمنڈو سے جانے کی بات سن کر ہی وہ بے چین ہو جاتا اور برہمی کا اظہار کرتا۔ یہ دلوں کے معاملے تھے جنہیں دماغ سمجھ نہیں سکتا۔ میں نے بھی اسے مزید تنگ کرنا مناسب نہ سمجھا اور اس بارے میں کبھی بات نہ کی۔

جون کی 16 تاریخ صبح ہی مجھے پاکستانی ملٹری اتاچی کا فون آیا کہ آج مجھے پاکستان کیلئے روانہ ہونا ہے۔ اس لئے اپنی تیاری کرلوں اور کسی کو بھی میری روانگی کا علم نہیں ہونا چاہئے۔ میں حیران تھا کہ نہ تو میرے محکمے نے مجھے اس بارے میں کوئی اطلاع دی تھی اور نہ ہی سفیر صاحب نے کوئی اشارہ۔ پھر میری روانگی کو پوشیدہ کیوں رکھا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی پاکستان سفارت خانے کا ایک کارکن ہوٹل آیا اور مجھے سفیر صاحب کا خط دیا خط میں میری دو پاسپورٹ سائز فوٹو طلب کی گئی تھیں اور مجھے تین بجے روانگی کیلئے سفارت خانے پہنچنے کا کہا گیا تھا اور اپنی روانگی کو راز میں رکھنے کی پرزور تلقین کی گئی تھی۔ میں نے جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹ کر دو سوٹ کیسوں میں پیک کیا۔ ہوٹل کے لاکر سے تمام رقم نکالی۔ ہوٹل والوں کے پاس ابھی میرا دو ہزار سے زیادہ ایڈوانس جمع تھا اسے ویسے ہی چھوڑا اور انتظامیہ کو چند روز کیلئے کھٹمنڈو سے باہر جانے کا کہہ کر اور تینوں چینی ساتھیوں کو لیکر ہوٹل سے رخصت ہوا۔ سب سے پہلے میں مریم کی قبر پر گیا مجھ پر اتنا بڑا سانحہ گزر گیا تھا۔

لیکن میری آنکھوں سے اب تک آنسو بھی نہ نکلا تھا۔ ضبط کی کچھ ایسی عادت پڑ چکی تھی کہ اندر ہی اندر پختہ ہوتا رہتا تھا۔ لیکن مریم سے وداع ہوتے وقت ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ آنسو کی ایسی جھڑی لگی کہ تھمتے نہ تھمتی تھی۔ میری آہ و بکا سے سارا قبرستان گونج اٹھا۔ اپنے ساتھ میں اتنے پھول لایا تھا کہ مریم کی ساری قبر ان سے ڈھک گئی۔ آخری نذرانہ محبت اور فاتحہ کا ثواب پیش کر کے میں وہاں سے سیدھا شیر پنجاب ہوٹل گیا اور ہرنام سنگھ سے گلے ملتے ہوئے اسے کان میں بتایا کہ آج یہاں سے جا رہا ہوں اور میری روانگی کو وہ راز ہی میں رکھے۔ محسن بھی وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ اسے ساتھ لیا اور چنگ وار ریسٹورنٹ گیا۔ میں نے مہاجروں کیلئے روپوں کے بقیہ لفافے مریم کے والد کو دیئے کہ جانے والے مہاجروں میں تقسیم کر دے۔ محسن اور بزرگ شاعر کیلئے رکھے ہوئے 20 ہزار روپے لے کر محسن کے حوالے کئے اور پندرہ ہزار ڈالر اور بقیہ تمام کرنسی مریم کے والد کو دی۔ اپنی وین بھی بطور تحفہ اسے دینے کی تحریر لکھ دی۔ یہ روپیہ اور وین مریم کا نعم البدل تو نہ تھا لیکن بڑھاپے میں اس کے کچھ کام ضرور آ سکتا تھا۔ وہیں پر میں نے تین لفافوں میں پانچ پانچ ہزار ڈالر رکھے۔ میرے پاس اب صرف سو ڈالر رہ گئے تھے۔ وہاں سے رخصت ہو کر سفارت خانے پہنچے۔ میں نے وین باہر ہی کھڑی کی اور اپنے دو سوٹ کیس اور ایک ایئر بیگ جس میں اسلحہ، زہریلی سوئیوں والے ڈبے اور کیمرے وغیرہ رکھے تھے۔

(جاری ہے)

غازی

میں وہ بیگ لے کر سفیر صاحب کے پاس چلا گیا، وہ میرے منتظر تھے۔ انہوں نے بتایا کہ کل شام انہیں نیپالی وزارت خارجہ میں بلایا گیا تھا جہاں نیپالی وزیر خارجہ نے انہیں بھارتی وزیر خارجہ اور بھارتی سفارت خانے کے دو خط دکھائے۔ جن میں یہ تحریر تھا کہ آصف علی نام سے کھٹمنڈو میں رہنے والا سیویلین اور مہاجر نہیں بلکہ پاکستان کا جاسوس ہے جو بھارت میں فوجی تنصیبات کو تباہ کرنے اور کئی فوجیوں اور شہریوں کے قتل کا ذمہ دار ہے۔ اسے فوری طور پر بھارت کے حوالے کیا جائے دھمکی آمیز لہجے میں ایسا نہ کرنے سے نیپال کو تعلقات کی خرابی اور برے نتائج بھگتنے کا مژدہ سنایا گیا تھا۔ نیپال اپنی جغرافیائی پوزیشن کی وجہ سے ہر بات میں بھارت کا محتاج تھا۔ اس بارے میں نیپالی وزارت خارجہ کا خط بھی سفیر صاحب نے مجھے دکھایا۔ بقول اس کے نیپالی وزیر خارجہ کو اس نے بھارت کے مجھ پر لگائے ہوئے تمام الزامات کی تردید کی اور کہا کہ آصف علی ایک پرامن شہری ہے۔ دونوں ممالک کے خوشگوار تعلقات کی وجہ سے سفیر نے مجھے دو روز کے اندر نیپالی وزیر خارجہ کے حوالے کرنے کا وعدہ کیا تا کہ وہ خود میرے متعلق چھان بین کر سکے۔ واپسی پر ہمارے سفیر نے ایک بڑے اور پاکستان کے ہمدرد ملک کے سفیر سے رابطہ کیا اور آج مجھے بحفاظت کھٹمنڈو سے نکالنے کے انتظامات کئے۔ میرا ون وے پاسپورٹ اور رائل نیپال ایئر لائنز کا ٹکٹ سفیر کی ٹیبل پر پڑے تھے۔ وہ میرے حوالے کیلئے پاسپورٹ میں میرا نام ریاست علی لکھا ہوا تھا، ملٹری اتاچی بھی اس دوران وہاں آ گئے تھے۔ ٹھیک تین بجے دوست ملک کی سیاہ شیشوں والی گاڑی ہمارے سفارت خانے آ گئی۔ مجھے بتایا گیا کہ دوست ملک کے سفارت خانے کے ذریعے مجھے امیگریشن اور سامان چیک کئے بغیر جہاز پر سوار کرا دیا جائے گا۔ میں نے یہ بات سن کر اپنا ایئر بیگ بجائے اپنی ڈاک کے تھیلے میں پاکستان بھیجنے کے ہمراہ لے جانا مناسب سمجھا۔ میں سفارت خانے سے باہر گیا۔ محسن اور تینوں چینی دوستوں سے گلے ملا اور چینی دوستوں کو پانچ پانچ ہزار ڈالر کے لفافے زبردستی دے کر سیاہ شیشوں والی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ اسی سفارت خانے کا اور میرے ساتھ ہمارے سفارت خانے کا ایک ایک کارکن بیٹھا ہوا تھا۔ سفارت خانے کی گاڑی جونہی باہر نکلی، بھارتی سفارت خانے کی ایک گاڑی ذرا فاصلے پر کھڑی دکھائی دی۔ اس گاڑی میں بیٹھے میجر باسو کو میں نے فوراً پہچان لیا۔ میجر باسو کی گاڑی نے کچھ دیر ہمارا تعاقب کیا اور جب ہم ایئر پورٹ کی سڑک پر پہنچے تو وہ تیزی سے مڑ کر غائب ہو گئی۔ ہم ایئر پورٹ پر پہنچے تو ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے آدمی نے میرا پاسپورٹ اور ٹکٹ لیا۔ انہی کی ایک گاڑی وہاں پہلے سے موجود تھی۔ اس میں دو بیٹھے آدمیوں نے میرے دونوں سوٹ کیس اٹھائے۔ پندرہ منٹ کے اندر وہ شخص میرا بورڈنگ کارڈ اور ان دونوں سوٹ کیسوں کے بیگیج کارڈ لے کر آ گیا۔ اسی دوران میں نے دیکھا کہ میجر باسو اپنی گاڑی پر ایئر پورٹ آ دھمکا ہے۔ وہ ہمارا پیچھا کرتے ہوئے یقیناً اس لئے واپس پلٹا تھا تا کہ اپنے سفیر کو میری روانگی کا بتائے اور مجھے روکنے کا انتظام کرے۔ چار بجنے سے ٹھیک 10 منٹ پہلے ہماری گاڑی ایپرن پر کھڑے جہاز کے قریب پہنچی۔ مسافروں کیلئے لگائی گئی سیڑھی ہٹائی جا چکی تھی۔ میں کاک پٹ کی سیڑھی کے ذریعے جہاز میں داخل ہوا۔ گاڑی کے پاس ہی کھڑے رائل نیپال لائنز کے ایک ملازم نے میرے بورڈنگ کارڈ کا آدھا حصہ الگ کیا۔ جہاز کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں نے گاڑی کے باہر کھڑے تینوں دوستوں کو ہاتھ ہلا کر بائی بائی کیا۔ میجر باسو بھی کچھ فاصلے پر آگ برساتی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے زور زور سے ہاتھ ہلا کر گڈ بائی کہا اور اس کی طرف ایک ہوائی بوسہ بھی اچھال دیا۔

رائل نیپال ایئر لائنز کے جہاز نے کھٹمنڈو ایئر پورٹ پر ٹھیک چار بجے رن وے کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ میں کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس وقت میں حقیقتاً ڈرا ہوا تھا۔ خوف کی لہریں میرے جسم کے آر پار ہو رہی تھیں۔ میری نظریں ایئر پورٹ بلڈنگ کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک لگی ہوئی تھی۔ ہر لمحے یہی خیال گزرتا کہ اب پولیس کی جیپ نمودار ہو گی۔ پائلٹ جہاز کو ٹیکسی وے پر ہی روک لے گا اور پولیس مجھے گرفتار کر کے لے جائے گی۔ اگرچہ ایسے مرحلے پہلے بھی کئی بار مجھ پر گزر چکے تھے۔ لیکن ساڑھے تین سال مسلسل زندگی اور موت کا کھیل کھیلنے میں اب ذہنی طور پر ٹوٹ پھوٹ چکا تھا اور اب تو بات یہاں آن پہنچی تھی کہ ایک طرف آزادی، اپنا وطن، اپنا گھر اور گھر والے اور دوسری طرف تھرڈ ڈگری ٹارچر کے ساتھ اذیت ناک موت اور ان دونوں کے بیچ محض چند منٹوں کا فرق تھا۔ محض چند منٹوں کا قسمت نے زندگی کی بازی کھیلتے ہوئے مجھے ہمیشہ تین اکے دیئے لیکن ہر بار تو تین اکے نہیں ملتے اور اب تو یہ آخری داؤ تھا۔ اگر بازی الٹ پڑی تو خوف کی لہر نے مجھے ایک جھٹکا دیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سب کچھ اس قادر مطلق پر چھوڑ دیا جس کی طاقت اور قدرت کی کوئی حد نہیں۔ انسان اس کے سوا کر بھی کیا سکتا ہے۔ انسانی جدوجہد کی ایک حد ہوتی ہے اور اس کے بعد وہ مجبور، لاچار اور طلب گار ہوتا ہے۔ رب ذوالجلال وکرام کی رضا کی مجھ پر ایک غنودگی چھا گئی تھی۔ اچانک ایئر ہوسٹس کی مدھر آواز مجھے باہر لے آئی۔ سیفٹی بیلٹس کھولنے اور سگریٹ پینے کی اجازت مل گئی تھی۔ میں نے سگریٹ نکال کر سلگایا اور ایک لمبا کش لیا۔ جہاز ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں کو نیچے چھوڑتا ہوا بلند ہو رہا تھا۔ ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی دائیں طرف صاف دکھائی دے رہی تھی۔ جہاز کے اکثر مسافر یہ چوٹی دیکھنے کیلئے جہاز کی اس جانب کھڑکیوں کی طرف آ چکے تھے لیکن میرا ذہن سگریٹ کے مرغولوں کے ساتھ ماضی کی طرف جا رہا تھا۔ ساڑھے تین سال (1185 دن) اور ان 1185 دنوں میں بیتتے ہوئے ان گنت واقعات ایک تیز رفتار فلم کی طرح میرے ذہن کے پردے سے گزر گئے۔ جلد ہی پہاڑ ختم ہو گئے۔ ایئر ہوسٹس نے بتایا کہ اب ہم بنگلہ دیش پر سے گزر رہے ہیں۔

(جاری ہے)

آخری قسط

غازی

دریائے کرنافلی کا ڈیلٹا ہمارے نیچے ہے۔ڈیلٹا درجنوں پاٹوں میں تقسیم میلوں تک پھیلا ہوا تھا اور شام کے ڈھلتے ہوئے سورج کی ترچھی شعاؤں نے دریائے کرنافلی کی درجنوں شاخوں میں ایک آگ سی لگا رکھی تھی۔شاید ایسے ہی کسی منظر کی وجہ سے شیخ مجیب الرحمان کو مشرقی پاکستان کو علیحدہ کر کے بنگلہ دیش بنانے کیلئے ہمار دیش، تہمار دیش، سنار دیش کہنا پڑا۔لیکن یہ تو محض عکس تھا فریب نظر تھا جسے سچ سمجھ کر دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کو دولخت کر دیا گیا۔اس وقت بنگلہ دیش بنے کئی سال بیت چکے تھے۔لیکن مشرقی پاکستان کیلئے لفظ بنگلہ دیش میرے دماغ میں کہیں فٹ نہیں ہوتا تھا اور آج بھی یہی حال ہے کہ چاہے کتنوں کو برا لگے میں اس خطہ زمین کو سابق مشرقی پاکستان ہی کہتا ہوں۔جیسے دوری اور جدائی سے خون کے رشتے نہیں ٹوٹتے۔ویسے ہی اس خطہ زمین کو سابق مشرق پاکستان کہنے سے اپنائیت کا ایک ان دیکھا رشتہ محسوس ہوتا ہے اپنا تھا پھر سابق ہو گیا یہ رشتہ قائم رہے تو سابق پھر اپنا ہو سکتا ہے انشاءاللہ۔

ہمارے جہاز کی منزل بنکاک تھی اور مجھے بنکاک کے پاکستانی سفارت خانے سے کراچی کیلئے ہوائی ٹکٹ لینا تھا۔

بیتے دنوں کے دریچے سے میں بھارت اور کھٹمنڈو میں اپنے قیام کے ایک ایک دن کا منظر دیکھ رہا تھا۔ان میں کامیابیاں بھی تھیں اور ناکامیاں بھی، دشمن کو نقصان پہنچانے کی تسکین بھی تھی اور اسے مکمل نیست و نابود نہ کر سکنے کی تشنہ کامی بھی۔بھارتیوں پر ہماری 5 MEN ARMY کی ہیبت کا احساس برتری بھی تھا اور DMI میں حراست کے دوران ان کی مسلم دشمنی اور مکاری کے نقاب کے پیچھے اصلی گھناؤنا چہرہ دیکھنے کا موقع ملنا بھی۔دشمنوں کی سازشوں اور اپنوں کی غداری کے واقعات بھی۔مہاجروں کی بے بسی اور کسمپرسی بھی اور صاحب اختیار کی بے حسی بھی، آمگلروں کے دلوں میں مسلمانوں کی ہمدردی میں موج زن سمندر بھی اور ظاہری طور پر مسلمان لوگوں کی سنگ دلی بھی۔خود اپنی ذات کو بے خوفی ہمت اور جرات کی چٹان کی صورت میں دیکھنا بھی اور اپنے دل کے ہزاروں لاکھوں ٹکڑے دیکھ کر اپنی بے مائیگی اور لاوارث ہونے کا احساس بھی۔یہ ساڑھے تین سال مجھ پر صدیوں سے زیادہ بھاری تھے ان میں مجھے جو تجربات ہوئے اور میں نے جو کچھ دیکھا اگر انہیں تفصیلاً تحریر کرتا تو کئی ضخیم کتابیں تیار ہو جاتیں۔

تقریباً سات گھنٹے کی پرواز کے بعد ہمارا جہاز بنکاک ایئرپورٹ پر اترا۔رات میں نے ٹیکاڈور ہوٹل میں بسر کی۔اگلے روز پاکستانی سفارت خانے گیا۔انہیں میری آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔دو روز بعد PIA کی کراچی فلائٹ پر کنفرمڈ سیٹ کے ساتھ مجھے ٹکٹ دیا گیا۔

کراچی پہنچا تو جہاز کی سیڑھیوں کے ساتھ ہی میرے محکمے کا ایک افسر اور چند جوان کھڑے تھے۔ان کی معین نما حراست میں اگلے روز ہم لاہور پہنچے جہاں مجھے سی ایم ایچ (CMH) میں داخل کر دیا گیا جہاں علاج کے ساتھ ساتھ نہایت شریفانہ اور دوستانہ ماحول میں دہلی، بمبئی اور کھٹمنڈو سے میری بھیجی گئی رپورٹس کی روشنی میں انٹیرو گیشن کی گئی۔انیسویں روز مجھے ALL CLEAR (سب ٹھیک) کا مژدہ سنا کر گلے لگایا گیا۔اسی روز ہم بصیر پور کیلئے روانہ ہوئے جہاں سیف ہاؤس کے ایک سیل میں وہ غدار کور یرقید تھا جس نے مجھے DMI کے ہاتھوں پکڑوایا تھا۔مجھے زندہ سلامت دیکھ کر حیرانی اور خوف سے وہ کانپنے لگا۔سیل سے خاصی دور نہر کے قریب اسے ہماری جانب پشت کر کے کھڑا کیا گیا اور مجھے ریوالور دے کر کہا گیا کہ ساری گولیاں اس پر ختم کر دو۔غصے اور انتقام کی خواہش کے باوجود میں گولی نہ چلا سکا اور میرا ریوالور والا ہاتھ نیچے ہو گیا۔میں اپنے ساتھی افسر سے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اس کے اشارے پر ساتھ آنے والے مسلح جوانوں نے اس پر گولیوں کی ایک باڑھ ماری۔وہ غدار وہیں ڈھیر ہو گیا اور اس کی لاش نہر میں بہا دی گئی۔

اگلے روز ہم اسلام آباد پہنچے جہاں مجھے CLASS "A" سرٹیفکیٹ اور انعام سے نوازا گیا اور تین ماہ کی چھٹی دی گئی۔میں جتنے ہتھیار، گیس اور زہریلی سوئیاں ہمراہ لایا تھا وہ مجھ سے ''گورنمنٹ پراپرٹی'' کہہ کر لے لی گئی۔اسلام آباد سے ہی میں نے اپنے گھر اپنی آمد کی تار دے دی تھی۔گھر پہنچا تو والدہ نے آدھ گھنٹے تک گلے لگائے رکھا اور میرا سر، ماتھا اور چہرہ ایسے چومتی رہیں جیسے ماں اپنے شیر خوار بچے کا چومتی ہے۔میرا بیٹا شجاع جس نے میری روانگی کے وقت پہلی بار مجھے ابو ابو کہہ کر پکارا تھا اب اسکول جانے لگ گیا تھا۔میری بیوی نے میرے متعلق سب کچھ جاننے کے باوجود مجھ سے اتنا عرصہ دور رہنے کے شکوے اور پھر خانگی جھگڑوں اور اپنی بے گناہی اور ''معصومیت'' کی داستانیں شروع کر دیں۔حالانکہ میری والدہ نے اس بارے میں ایک لفظ تک مجھے نہیں کہا تھا۔دس بارہ روز میں ہی میں اس ماحول سے گھبرا کر راولپنڈی چلا آیا اور اپنے کالج کے دور کے دوستوں میں اپنا غم غلط کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔تین ماہ کی رخصت کے بعد میں نے دفتر میں حاضری دی تو مجھے راولپنڈی اور لاہور میں ایسے معمولی مشن سونپے گئے جیسے کسی ایم اے کے اسٹوڈنٹ کو پرائمری کلاس میں بٹھا دیا گیا ہو۔میں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور تین ماہ کی جدوجہد کے بعد مجھے میڈیکل گراؤنڈز پر RELEASE دے دی گئی۔ایک سال تک میرے ملک سے باہر جانے پر پابندی رہی۔اس عرصے میں، میں نے پشاور میں ایک دوست کے چین آف ہوٹلز اور ریسٹورنٹس کے جنرل مینجر کے طور پر کام کیا۔باہر جانے پر پابندی ختم ہوئی تو میں نے پاسپورٹ بنوایا اور بزنس وغیرہ پر سعودی عرب چلا گیا جہاں 7 سال سے زیادہ بطور ایئرپورٹ ایڈمنسٹریٹر میں نے مختلف ہوائی اڈوں مثلاً قصیم، ینبع، الوجھ اور خمیس مشیط پر ملازمت کی۔وہاں سے جی اکتایا تو سنگاپور چلا گیا جہاں تقریباً 8 برس ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں بطور OVER SEAS SALES DIRECTOR کام کیا اور اس دوران مجھے آسٹریلیا سے لے کر آدھا یورپ جنوب مشرقی ایشیا اور مڈل ایسٹ کے سارے ممالک جانے کا موقع ملا۔خانگی کینسر جب ناقابل علاج ہو گیا تو 89ء میں میری اپنی بیوی سے قانونی اور شرعی علیحدگی ہو گئی۔بھارت سے واپسی کے بعد میرا دوسرا بیٹا وقار بھی پیدا ہو گیا تھا۔94ء میں میری والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔بیٹوں کی ذمہ داری چونکہ مجھ پر تھی لہٰذا میں سنگاپور سے بار بار پاکستان آنے لگ گیا اور پھر ایسی لمبی چھٹی لی کہ آج تک واپس نہیں گیا۔

(ختم شد)